وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (القرآن)

گلدستۂ احادیث

حصۂ ششم

مؤلف

مفتی محمد شفیق شاہ بھائی بڑودوی

مجازِ بیعت

عارف باللہ شیخ الزماں

حضرت مولانا محمد قمر الزماں الہ آبادی مدظلہ العالی

مؤلف

مفتی محمد شفیق شاہ بھائی بڑودوی

تفصیلات

نام کتاب : گلدستۂ احادیث (حصۂ ششم)

مؤلفہ : مفتی محمد شفیق شاہ بھائی بڑودوی

تصحیح وتنقیح : قاری ناظر حسین صاحب ہتھوڑوی فلاحی مدظلہ

استاذ: دارالعلوم فلاحِ دارین ترکیسر، گجرات

معاون : مفتی محمد سالم شاہ بھائی بڑودوی

کمپیوٹر کتابت : رشید احمد آچھودی (فون: 09428689113)

طبع اوّل : ۱۴۴۲ھ مطابق: ۲۰۲۱ء

تعدادِ صفحات : ۷۷۶

کتاب مندرجۂ ذیل جگہوں پر دستیاب ہے۔

(۱) مفتی محمد شفیق شاہ بھائی بڑودوی (09825315073)

(۲) Farid Book Depot Pvt Ltd
No.2158, M P Street, Darya Ganj, Delhi 110002
Phone: +911123289786, 23289159, 23280786
Mobile: 09910518950,

اجمالی فہرستِ مضامین

عناوین	صفحہ

تفصیلی فہرستِ مضامین

عناوین .... صفحہ

(۵) باپ کی عظمت ۱۱۵

(۶) ماں کا مقام ۱۲۴

(۷) اعمالِ صالحہ میں سبقت: علامت سعادت ۱۳۵

(۸) نماز باجماعت کی اہمیت وفضیلت ۱۴۷

بحمد اللہ تم

صاحب کتاب "گلدستۂ احادیث" کا تعارف اور کتاب کی خصوصیات

از

حضرت مولانا محمد یونس بن قاری بندۂ الٰہی سورتی دامت برکاتہم

(خلیفہ حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحبؒ)

ایک زمانہ سے یہ رِواج چلا آرہا ہے کہ جلسہ کے صدر یا واعظ ومقرر کی تقریر و بیان سے قبل اس کا تعارف کرایا جاتا ہے، مقصد یہ ہوتا ہے کہ تعارف کے بعد واعظ کے وعظ و بیان کو پورے دھیان سے اور انتہائی عقیدت ومحبت وعظمت اور ذوق وشوق سے سنا جائے۔

اور یہ بھی کہیں کہیں دیکھا گیا ہے کہ کسی کتاب کے مصنف یا فتاویٰ کی کتاب کے شروع میں مصنف اور صاحب فتاویٰ کا تعارف ان کے کسی شاگرد یا ان کے معتقدین میں سے کسی نے تحریر کیا ہے۔

کسی بھی کتاب پر تقاریظ کے ساتھ مصنف کے تعارف سے استفادہ کا جذبہ اور داعیہ زیادہ ہوجاتا ہے اور بسا اوقات قاری کو اس کا خیال اور انتظار بھی رہتا ہے کہ آخر یہ واعظ یا مصنف ہیں کون؟

بنابریں صاحب وعظ حضرت مولانا مفتی محمد شفیق صاحب مدت فیوضہم کا تعارف تحریر

کرتاہوں:

نام ونسب:

محمد شفیق ابن مولانا محمد صدیق ابن الحاج الحافظ نور محمد شاہ بھائی

وطن:

بڑودا، گجرات

ولادت:

۲۱؍ربیع الآخر؍ ۱۳۹۸ھ مطابق: ۳۱؍مارچ؍۱۹۷۸ء؍بروز سنیچر بوقت عشاء واڈی، بڑودا میں ہوئی۔ آپ کے بھائی بہنوں میں ایک بہن اور دو بھائی (حافظ محمد سعید اور مفتی محمد سالم) ہیں۔

ابتدائی تعلیم:

واڈی محلّہ کا مشہور ومعروف مدرسہ ''نیّر اسلام'' میں زیر سرپرستی حضرت اقدس ولیٔ کامل، عاشق رسول حضرت علامہ ومولانا مفتی محمد صدیق صاحب قاسمی بڑودوی نوّر اللہ مرقدہٗ سابق مفتیٔ اعظم برما۔

مکتب کے اساتذہ:

خود موصوف کے دادا حضرت الحاج الحافظ نور محمد صاحبؒ (وفات مؤرخہ: ۳۰؍رجب؍ ۱۴۱۸ھ مطابق: یکم دسمبر؍۱۹۹۷ء، بروز پیر) اور دوسرے استاذ الحاج الحافظ القاری محمد انیس بن حضرت مفتی محمد صدیق صاحبؒ ہیں۔

مکتب کی تعلیم کے ساتھ ساتھ علاقہ کی سرکاری اسکول ''بمبا خانہ'' میں تیسری

جماعت تک گجراتی تعلیم حاصل کی۔

دارالعلوم کی تعلیم:

پھر بچپن ہی میں آپ کو دینی تعلیم کے شوق نے دارالعلوم بڑودا، تاندلجہ پہنچا دیا، جہاں درجۂ حفظ میں حضرت قاری یعقوب صاحب نرولویؒ (امام وخطیب نیم والی مسجد، پانی گیٹ بڑودا) کے پاس داخل ہوئے اور تیرہ سال کی عمر میں مؤرخہ: ۲۲/ ذوالقعدہ/ ۱۴۱۱ھ مطابق: ٦/ جون/ ۱۹۹۱ء بروز جمعرات تکمیل حفظ کی سعادت حاصل کی۔

اگلے سال درجۂ عالمیت میں داخلہ ہوا اور آپ فارسی اوّل سے دورۂ حدیث شریف تک اعلیٰ نمبرات سے کامیابی حاصل کرتے رہے۔

اس دوران ۱۰؍شعبان المعظم؍۱۴۱۷ھ مطابق: ۲۱؍دسمبر؍۱۹۹٦ء بروز سنیچر بدست فدائے ملت حضرت اقدس مولانا سید اسعد مدنیؒ تکمیل قراءتِ حفص کی سند حاصل کی۔

اسی سال ۳؍ربیع الثانی؍۱۴۱۷ھ مطابق: ۱۹؍اگست؍۱۹۹٦ء بروز جمعرات آپ کی حقیقی خالہ کے یہاں آپ کا رشتہ طے ہوا۔ درسِ نظامی سے فراغت ۱۲؍شعبان؍۱۴۲۰ھ کو ہوئی۔

افتاء:

اگلے سال درجۂ افتاء کے لیے دارالعلوم کنتھاریہ میں داخل ہوئے اور ۱۲؍شعبان؍ ۱۴۲۱ھ مطابق: ۲۰۰۰ء بروز جمعرات تکمیل افتاء کی سند حاصل کی۔

دارالعلوم بڑودا میں اساتذۂ کرام:

حضرت مولانا ولی اللہ ندوی بھڑکودروی صاحبؒ سے بخاری شریف جلد اوّل وغیرہ۔

حضرت مولانا احمد لولات مظاہری رویدروی صاحبؒ سے بخاری شریف جلد ثانی وغیرہ۔

بقیہ کتب حدیث حضرت مولانا محمد رفیق بڑودوی صاحب مدظلہٗ اور حضرت مولانا محمد سلیم قاسمی

بڑودویؒ سے پڑھیں، بقیہ درسی کتب اپنے والد بزرگوار حضرت مولانا محمد صدیق جامعی بڑودویؒ، حضرت مولانا مفتی مصلح الدین قاسمی بڑودوی صاحب اور حضرت مولانا اقبال رحمانی بڑودوی صاحبؒ سے اور دیگر اساتذۂ کرام سے پڑھیں۔ حضرت مولانا قاری ابراہیم بھڑکودروی مدظلہ سے تجوید کی تعلیم حاصل کی۔

ابتدائی درجات کے اساتذہ میں حضرت مولانا اسماعیل صاحب صوفی صاحبؒ کاوی، مولانا سعید صاحب دیولوی مدظلہٗ، مولانا اسماعیل صاحب بھڑکودروی، مولانا ادریس صاحب بورسدی اور قاری یوسف صاحب ٹنکاروی ہیں۔

دارالعلوم کنتھاریہ میں افتاء کے اساتذۂ کرام:

جن مفتیانِ کرام سے آپ نے افتاء کی تعلیم حاصل کی وہ یہ ہیں:

حضرت مولانا مفتی اسماعیل بھڑکودروی صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی عبداللہ کاوی صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی غلام اللہ کاوی مدظلہٗ، حضرت مولانا مفتی اسماعیل بھانا سارودی مدظلہٗ۔

نیز خارج اوقات میں قاری صادق صاحب خانپوری مدظلہٗ سے تجوید کی تعلیم بھی حاصل کی۔

بیعت:

علوم ظاہری سے رسمی فراغت کے بعد آپ مدرسہ بیت المعارف الہ آباد جا کر شیخ الزمان حضرت مولانا محمد قمر الزمان صاحب الہ آبادی مدظلہٗ سے بیعت ہوئے۔

اجازت وخلافت:

حضرت مولانا مدظلہٗ نے ۲۰؍رمضان المبارک؍۱۴۲۶ھ بروز منگل آپ کو اپنا مجازِ صحبت بنایا، پھر ۱۷؍رمضان المبارک؍۱۴۳۸ھ میں آپ کو خلافت عطا فرمائی۔

عقدِ مسنون:

۱۹؍جمادی الاخریٰ؍۱۴۲۳ھ مطابق: ۹؍ستمبر؍۲۰۰۱ء بروز سنیچر بعد نمازِ عشاء بمقام مرکز مسجد ناگرواڈا، سید پورا، بڑودا حضرت مولانا محمد قمر الزمان صاحب الہ آبادی مدظلہٗ نے بعوض مہر فاطمی آپ کا نکاح پڑھایا۔

الحمد للہ، اللہ رب العزت نے اولاد سے بھی نوازا، پہلے بیٹی طیبہ کی ولادت مؤرخہ: ۸؍جمادی الاخریٰ؍۱۴۲۴ھ مطابق: ۷؍اگست؍۲۰۰۳ء بروز جمعرات ہوئی (ان کی نسبت خواہر زادہ حافظ محمد صادق بن حافظ ضیاء الدین بومبے والا کے ساتھ کردی گئی ہے) اس کے بعد بیٹے محمد خلیق کی ولادت مؤرخہ: ۷؍محرم؍۱۴۲۶ھ مطابق: ۱۷؍فروری؍۲۰۰۵ء بروز جمعرات ہوئی (جو الحمد للہ حافظ ہے) اخیر میں محمد خلیل کی ولادت مؤرخہ: ۵؍ذوالقعدہ؍۱۴۲۹ھ مطابق: ۳؍نومبر؍۲۰۰۸ء بروز پیر ہوئی، الحمد للہ! اس وقت وہ بھی اپنے عم محترم مفتی محمد سالم صاحب کے پاس حفظ کررہے ہیں۔

تعلیم وتدریس:

درسِ نظامی سے فراغت کے بعد شوال المکرّم؍۱۴۲۳ھ مطابق: یکم جنوری؍۲۰۰۳ء میں آپ کا تقرر دارالعلوم بڑودا میں ہوا، اوّلاً درجۂ حفظ، پھر ابتدائی کتب، پھر درجۂ عربی چہارم تک کی کتب آپ کے زیر درس رہیں، بعد میں انتظامیہ میں تبدیلی ہوئی اور شعبۂ دینیات سپرد کردیا گیا، یہ سلسلہ مؤرخہ ۲۳؍شوال؍۱۴۴۱ھ مطابق: ۱۵؍جون؍۲۰۲۰ء بروز پیر انتظامیہ نے لوک ڈاؤن کا حوالہ دے کر دارالعلوم بڑودا کے تمام اساتذہ کے لیے منقطع کردیا۔ فَیَا لَلْأَسَف! إِنَّمَآ أَشْكُوْ بَثِّيْ وَ حُزْنِيْٓ إِلَى اللّٰهِ.

امامت وخطابت:

ابتداءً شہر کے ایک علاقہ فتح گنج، بڑی مسجد میں امامت وخطابت کے فرائض انجام

دیے، پھر آپ کے والد ماجد نے گھر کے قریب ایک مسجد بنام ''محمد مسجد'' کی بنیاد رکھی، جہاں ۱۰/محرم الحرام/ ۱۴۲۵ھ مطابق: یکم/ مارچ/۲۰۰۴ء سے تاحال اپنے والد محترم (اور ان کی وفات کے بعد مولانا سہیل اقبال پٹیل) کے ساتھ امامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

وعظ ونصیحت:

''محمدی مسجد'' میں ہر ہفتہ دو مجلسیں ہوتی تھیں: ایک مجلس مسائل کے لیے اتوار کے روز نمازِ فجر کے بعد، جواب کورونا کے بعد موقوف ہوگئی، دوسری مجلس درسِ حدیث کے لیے بدھ کے روز نمازِ فجر کے بعد آج بھی قائم ہوتی ہے، درسِ حدیث شریف کا یہ سلسلہ ۱۷/ ذوالحجہ/ ۱۴۲۶ھ مطابق: ۱۸/ جنوری/ ۲۰۰۶ء سے تاحال جاری ہے۔ نیز آپ کے والد ماجدؒ کی وفات کے بعد قبل الجمعہ وعظ بھی آپ کے ذمہ ہے، جو بڑودا قیام کے زمانے میں پابندی سے ہوتا ہے۔ الحمد للہ۔

اس کے علاوہ شہر اور گجرات کے مختلف علاقوں اور ملک بھر سے مدارس کے جلسوں، اصلاحی مجالس اور وعظ وخطابت کے لیے آپ کو مدعو کیا جاتا ہے۔

نیز رمضان المبارک کے عشرۂ اخیرہ میں حضرت اقدس مولانا محمد قمر الزمان صاحب الہ آبادی مدظلہٗ کے ایماء پر حضرت حافظ قاری محمد تقی صاحب مدظلہٗ نے اپنے مدرسہ سراج العلوم اُجین میں ۱۴۳۳ھ مطابق: ۲۰۱۲ء سے خانقاہی نظام کے لیے مدعو کیا، یہ سلسلہ بھی تا حال جاری ہے۔

امسال ۱۴۴۰ھ مطابق: ۲۰۱۹ء کو پہلی مرتبہ مسجد ہاجرا کڑیا کنواں، رام پورا، سورت میں درمیانی عشرہ میں خانقاہی نظام جاری کرنے کے لیے ذمہ داروں نے دعوت دی، چنانچہ درمیانی عشرہ وہاں گزارا۔ اللّٰھم زد فزد.

اسفار:

آپ نے پانچ عمرے کیے، جن میں سے چوتھا عمرہ حضرت اقدس علامہ سید

عبدالمجید ندیم صاحبؒ کی معیت ورفاقت میں کیا اور حج اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ کیا، جس کے لیے ۲/ ذوالحجہ/ ۱۴۳۸ھ مطابق: ۲۲/ اگست/ ۲۰۱۷ء بروز منگل روانگی ہوئی، ۱۳/محرم الحرام/ ۱۴۳۹ھ مطابق: ۴/ اکتوبر/ ۲۰۱۷ء بروز بدھ واپسی ہوئی۔

تقریر وبیان کی نسبت سے افریقہ، تنزانیہ (دارالسلام) کا سفر فرمایا، برطانیہ سے چار مرتبہ مدعو کیے گئے، مگر ویزا نہ ملنے کے سبب سفر نہ ہوسکا۔

تالیفات:

(۱) مرض کے احکام در احادیث خیر الانام ﷺ
(۲) گلدستۂ اطفال
(۳) گلدستۂ درود وسنت
(۴) گلدستۂ مواعظ
(۵) گلدستۂ احادیث (چھ جلدیں)
(۶) گلدستۂ مسائل حاضرہ (زیر طبع)

مختصر تعارف کے بعد عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسم با مسمّٰی بنایا ہے، ہر عالم، ولی، داعی الی اللہ امت پر شفیق ہوتا ہے، کہ وہ امت کے اعمال واخلاق اور معاشرہ کی کمزوریوں کو دیکھ کر کڑھتا ہے اور انسانوں کے قلوب سے رذائل دور کرکے ان کو مجلّٰی ومصفّٰی کرنے کی کوشش کرتا ہے، جس کے لیے کوئی تصانیف کے ذریعہ، کوئی درس وتدریس کے ذریعہ، کوئی وعظ وتقریر کے ذریعہ، کوئی دعوت وتبلیغ کے ذریعہ تو کوئی خانقاہی نظام کے ذریعہ میدانِ عمل میں آتا ہے، الحمد للہ، اللہ رب العزت نے یہ ساری خوبیاں حضرت مولانا مفتی محمد شفیق صاحب مدت فیوضہم میں جمع فرمادی ہیں۔ اللّٰھم زد فزد.

''گلدستۂ احادیث'' کی خصوصیات:

بسا اوقات واعظ کسی عنوان کے تحت ایک مضمون پر نہیں ٹھہرتا، کبھی بات سے بات

پیدا ہوتی چلی جاتی ہے، کبھی معاشرہ کی اصلاح کی خاطر ضمناً بہت سی باتیں کہنی پڑتی ہیں، اس کے برخلاف مصنف ایک عنوان کے تحت اسی سے متعلق مضامین تحریر میں لاتا ہے، جہاں تک میرا خیال ہے ”گلدستۂ احادیث“ تصنیف بھی ہے، کہ اس کے مضامین مربوط بھی ہیں اور عنوان کے مطابق بھی، نیز اس میں واعظانہ انداز بھی ہے کہ اس میں وعظ کی بہت سی خصوصیات بھی جمع کر دی گئی ہیں، جن کا ذکر اکابر حضرات نے اپنی تقاریظ میں کیا ہے۔

وہ ائمہ حضرات جو جمعہ کے دن جمعہ سے قبل زبانی بیان نہیں کر سکتے وہ جس مضمون کی ضرورت ہو دیکھ کر پڑھ لیں، تو ان شاء اللہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

اسی طرح مدارسِ عربیہ کے طلبہ انجمن میں اپنی باری پر یا سالانہ چھٹیوں میں تقریر کے مواقع پر ”گلدستۂ احادیث“ میں سے کسی مضمون کو یاد کر کے تقریر کرتے رہیں تو ان شاء اللہ ایک مدت میں بے شمار مضامین حفظ ہو جائیں گے، اور ویسے بھی مدارس کے طلبہ انجمن میں اپنی تقریر کی باری پر اس قسم کی کتابیں تلاش کرتے ہی ہیں، یہ کتاب ان شاء اللہ کافی ووافی ہوگی۔

اپنے مضمون کو طول نہ دیتے ہوئے اخیر میں یہی عرض کروں گا کہ کتاب اور اس کے مضامین، اندازِ بیان کی خوبیوں اور خصوصیات کو اکابر حضرات کی تقاریظ میں دیکھ لیا جائے۔

فقط والسلام

احقر: محمد یونس سورتی غفرلہٗ ابن قاری بندۂ الٰہیؒ

۲۲/ رمضان المبارک/ ۱۴۴۰ھ

مطابق: ۲۸/ مئی/ ۲۰۱۹ء/ بروز منگل

عرضِ مؤلف

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الإِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ، أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، الْأَعَزُّ الْأَكْرَمُ، وَ أَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَ نَبِيَّنَا وَ حَبِيْبَنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ، الدَّاعِيْ إِلَى السَّبِيْلِ الْأَقْوَمِ، صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ عَلٰى اٰلِهٖ وَ صَحْبِهٖ وَ سَلَّمَ. أَمَّا بَعْدُ......

قلم اور کتابت حصولِ علم کا سبب:

اللہ رب العالمین نے قرآنِ کریم کی پہلی وحی میں اسلام کے ارکانِ اربعہ (نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج) اور دیگر احکام دینیہ وشرعیہ کا حکم دینے کے بجائے علم اور قلم کا ذکر فرمایا:

﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَأْ وَ رَبُّكَ الْأَكْرَمُ○ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ○ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ○﴾ (العلق: ۱-۵)

علم کا ذکر تو اس لیے فرمایا کہ اسلام کے ارکانِ اربعہ و دیگر احکامِ دینیہ وشرعیہ کی ادائیگی کے لیے علم ضروری ہے، علم کے بغیر کسی بھی حکم پر عمل کرنا مشکل ہے۔ اور قلم کا تذکرہ اس لیے فرمایا کہ حصولِ علم کے لیے جتنے اسباب و ذرائع ہیں ان میں بہترین اور محفوظ ترین ذریعہ قلم (تحریر و کتابت کا آلہ) ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ مبتدی طلبہ کے لیے خواہ وہ علومِ شرعیہ کے ہوں یا علومِ عصریہ کے، حصولِ علم کی آسانی کے پیش نظر کلاس روم میں عموماً اور بعض جگہ لازماً قلم اور بلیک یا گرین بورڈ کا استعمال کیا جاتا ہے۔

قلم اور کتابت علم کی حفاظت کا سبب:

پھر اتنا ہی نہیں کہ قلم اور کتابت حصولِ علم کے آسان ترین اسباب ہیں؛ بلکہ قلم اور کتابت علم کی حفاظت کا بھی ذریعہ ہیں، اسی وجہ سے علماءِ محققین کے بقول جہاں علم کو عمل پر فوقیت حاصل ہے وہیں قلم کو علم کے باب میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے، کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ پڑھا پڑھایا ہوا بھولا جا سکتا ہے؛ لیکن لکھا ہوا محفوظ رہتا ہے، اس لیے حضرت عمرؓ سے ایک ضعیف روایت میں یہ مقولہ منقول ہے کہ "قَيِّدُوا العِلْمَ بِالكِتَابِ". (دارمی، باب من رخص فی کتابة العلم) کہ علم کو کتاب یا کتابت کے ذریعہ محفوظ کرلو۔ دیکھئے نا! آج دنیا کی وہ بے شمار مفید و بہترین کتابیں جن میں علومِ اسلامیہ، دینیہ نافعہ کے ذخائر موجود و محفوظ ہیں کیا یہ تمام کتابیں قلم اور کتابت کی برکت نہیں؟ حتیٰ کہ عصر حاضر کا یہ کمپیوٹر جس میں دنیا بھر کی مفید ترین معلومات کے علاوہ علوم کا بھی ذخیرہ محفوظ اور ہمارے سامنے میز پر موجود ہے، تو یہ کمپیوٹر کیا ہے؟ عاجز کے خیالِ ناقص میں یہ دورِ حاضر کا قلم ہی تو ہے۔

قلم اور کتابت علم کی اشاعت کے اسباب:

اسی کے ساتھ قلم اور کتابت حصولِ علم اور حفاظت علم کے مفید ترین و محفوظ ترین سبب ہونے کے علاوہ علم کی اشاعت کے بھی بہترین، محفوظ ترین اور آسان ترین ذریعہ ہیں، چنانچہ اس وقت الحمد للہ قرآن و حدیث کے جو علوم دنیا کے چپے چپے میں محفوظ، موجود اور عام ہیں تو اس کی ظاہری وجہ یہ بھی تو ہے کہ قرآنِ کریم اور احادیث طیبہ ہمارے پاس کتابی شکل میں محفوظ و موجود ہیں، اگر قرآنِ کریم کتابی شکل میں ہمارے پاس نہ ہوتا تو اس کو پڑھنا، حفظ کرنا، تدریس و تقریر اور تحریر کے ذریعہ اس کے پیغام کو عام کرنا کس قدر مشکل ہوتا۔ اسی طرح احادیث صحیحہ کی معتبر و مستند کتابیں ہمارے پاس موجود نہ ہوتیں تو ان کے علوم کو کیسے محفوظ اور عام کیا جاتا؟ غالباً قلم اور اس کی تحریر و کتابت کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر رب العالمین نے پہلی وحی کے بعد جو دوسری وحی نازل فرمائی وہ بعض علماء کے بقول سورۂ قلم کی ابتدائی آیات ہیں،

۱۷

جن میں حق تعالیٰ نے قلم اور اس کی تحریر و کتابت کی قسم کھائی، فرمایا:

﴿نٓ وَ الْقَلَمِ وَ مَا يَسْطُرُوْنَ۝﴾ (القلم: ١)

قلم اور اس کی کتابت کی قسم:

یہاں سوال یہ ہے کہ کس قلم اور اس کی کتابت کی قسم رب العالمین نے قرآنِ کریم میں کھائی؟ تو حضرات مفسرین کے بقول کائناتِ عالم میں پائے جانے والے اَقلام اور ان کی کتابت کی بنیادی طور پر تین قسمیں ہیں:

(۱) پہلی قسم وہ خاص قلم ہے جسے خالق کائنات نے (محبوبِ کائنات ﷺ کو پیدا کرنے کے بعد) تقدیر کائنات لکھنے کے لیے (محبوبِ کائنات ﷺ کی طرح) خود اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا، چنانچہ حضرت مجاہدؒ نے ابو عمرؒ سے نقل فرمایا کہ حق تعالیٰ نے ساری کائنات میں قلم، عرش، جنت عدن اور حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا، ان کے علاوہ دیگر مخلوقات کو امر "کُنْ" سے وجود عطا کیا گیا۔ (معارف القرآن: ۸/۵۸۵)

ایک حدیث قدسی میں اس کا تذکرہ اس طرح ملتا ہے کہ (نورِ محمدی کو پیدا کرنے کے بعد یا اَقلام کی اَقسام میں) حق تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا (اس کی حقیقت، نوعیت اور کیفیت تو اللہ پاک ہی کو معلوم ہے) پھر اسے (لوحِ محفوظ میں تقدیر کائنات) لکھنے کا حکم دیا، تو قلم نے تا اَبد پیش آنے والے تمام واقعات و حالات کو لکھ دیا۔

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِنَّ أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمُ، فَقَالَ لَهٗ: اُكْتُبْ، قَالَ: مَا أَكْتُبُ؟ قَالَ: اُكْتُبِ الْقَدَرَ، فَكَتَبَ مَا كَانَ وَ مَا هُوَ كَائِنٌ إِلَى الْأَبَدِ". (رواه الترمذی، و قال هذا حديث غريب إسنادا، مشكوٰة: ۲۱، باب الإيمان بالقدر) (حدیث قدسی نمبر: ۱)

روایتوں میں یہ بھی ہے کہ تقدیر الٰہی کے قلم نے لوحِ محفوظ میں سب سے پہلے کیا لکھا؟ چنانچہ امام قرطبیؒ نے سورۂ بروج کی آیت کریمہ ﴿فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ﴾ (البروج: ۲۲)

کے تحت سیدنا عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ قلم نے سب سے پہلے یہ لکھا:

" إِنِّیۡ أَنَا اللّٰهُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا، مُحَمَّدٌ رَسُوۡلِیۡ، مَنِ اسۡتَسۡلَمَ لِقَضَائِیۡ، وَ صَبَرَ عَلٰی بَلَائِیۡ وَ شَكَرَ نَعۡمَائِیۡ، كَتَبۡتُهٗ صِدِّيۡقًا وَ بَعَثۡتُهٗ مَعَ الصِّدِّيۡقِيۡنَ، وَ مَنۡ لَمۡ يَسۡتَسۡلِمۡ لِقَضَائِیۡ، وَ لَمۡ يَصۡبِرۡ عَلٰی بَلَائِیۡ، وَ لَمۡ يَشۡكُرۡ نَعۡمَائِیۡ، فَلۡيَتَّخِذۡ إِلٰهًا سِوَائِیۡ".

"بے شک میں ہی اللہ جل جلالہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، محمد میرے رسول ہیں، (صلی اللہ علیہ وسلم) جس نے میری قضا (اور فیصلے) کے سامنے سر تسلیم خم کرلیا، میری آزمائش پر صبر کیا اور میری نعمتوں کا شکر ادا کیا تو میں اسے صدیق لکھ دوں گا اور قیامت کے دِن اسے صدیقین کے ساتھ اُٹھاؤں گا، اس کے برعکس جس نے میری قضا (و فیصلے) کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا، میری آزمائش پر صبر نہیں کیا اور میری نعمتوں کا شکر ادا نہیں کیا تو اسے چاہیے کہ میرے علاوہ کسی اور کو اپنا معبود بنالے۔ (کیوں کہ ایسا شخص میرا پسندیدہ بندہ نہیں ہوسکتا، میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں)۔ العیاذ باللہ۔

(۲) قلم کی دوسری قسم فرشتوں کے وہ اَقلام ہیں جن سے وہ بہ حکم الٰہی کائناتِ عالم کے اَحکام واَحوال اور انسانوں کے اَعمال لکھتے ہیں، قرآنِ کریم نے اسے اس طرح بیان فرمایا:

﴿ وَ إِنَّ عَلَيۡكُمۡ لَحٰفِظِيۡنَ○ كِرَامًا كَاتِبِيۡنَ○﴾ (الانفطار: ۱۰-۱۱)

قرآنِ کریم کے بیان کے مطابق فرشتوں کے لکھے ہوئے یہی اَعمال نامے انسانوں کو دے کر قیامت کے دن ہر ایک سے کہا جائے گا کہ اپنی وہ کتاب (جس میں تمہارے اعمال کی تفصیلات لکھی ہوئی ہیں) خود ہی پڑھ لو۔ ﴿اِقۡرَأۡ كِتَابَكَ﴾ (اور اس وقت ہر ایک کو من جانب اللہ پڑھنے کی قدرت میسر ہوگی، اسی بنا پر کہا جائے گا کہ)

﴿ كَفٰى بِنَفۡسِكَ الۡيَوۡمَ عَلَيۡكَ حَسِيۡبًا○﴾ (بنی إسرائیل: ۱۴)

"آج تو تم خود ہی اپنا حساب لینے کے لیے کافی ہو۔" (اللهم حاسبنا حسابا يسيرا، و لا تحاسبنا حسابا عسيرا. آمين)

(۳) قلم کی تیسری قسم انسانوں کے وہ اَقلام ہیں جن سے وہ اپنے اپنے زمانوں

اور اپنی علاقائی زبانوں میں اپنے مافی الضمیر اور الفاظ وکلمات کو تحریری جامہ پہنا کر اپنے چھوٹے بڑے دینی، دنیوی اور اُخروی مقاصد میں کام لیتے ہیں، رب العالمین نے قرآنِ کریم میں جس قلم اور اس کی کتابت کی قسم کھائی ہے جمہور مفسرین کے بقول اس سے مراد وہ عظیم الشان قلم ہے جس کو رب العالمین نے اپنے دستِ قدرت سے پیدا فرمانے کے بعد تقدیر کائنات لکھنے کا حکم فرمایا۔ (کما ھو قول ابن عباسؓ)

بعض مفسرین نے اس سے مطلقاً جنس قلم مراد لی ہے، جس میں کائناتِ عالم میں پائے جانے والے ہر زمانے کے تمام اَقلام داخل ہیں، خواہ ان کی نوعیت وکیفیت مختلف ہو۔

قلم اور اس کی کتابت عظیم نعمت:

حقیقت یہ ہے کہ قلم اور اس کی کتابت بھی رب العالمین کی عظیم الشان نعمت ہے (بشرطیکہ اس کا استعمال صحیح کیا جائے) کیوں کہ قلم اور اس کی کتابت جیسا کہ عرض کیا حصولِ علم، حفاظت علم اور اشاعت علم کا آسان ترین اور بہترین ذریعہ ہے، اس کے بغیر علم کا حصول اور اس کی حفاظت واشاعت واقعی مشکل ہوتی، اس لیے مشہور تابعی حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں کہ "قلم (اور اس کی کتابت) اللہ پاک کی عظیم نعمت ہے، اگر قلم (اور اس کی کتابت اور کتابوں کا مبارک سلسلہ) نہ ہوتا تو نہ دین اسلام کی حفاظت واشاعت ہوتی، نہ دین اسلام کا قیام اور پیغام عام ہوتا، نہ زندگی کا نظام درست ہوتا۔

" الْقَلَمُ نِعْمَةٌ مِنَ اللّٰهِ عَظِيْمَةٌ، لَوْ لَا ذٰلِكَ لَمْ يَقُمْ دِيْنٌ وَ لَمْ يَصْلُحْ عَيْشٌ".

(تفسیر طبری: ۲۴/ ۵۲۷، تفسیر قرطبی: سورة علق)

اصلاح کے مخلصانہ جذبے سے قلم اُٹھا کر قدم بڑھانے والوں کی فضیلت:

صاحبو! اس نعمت الٰہی کا حق اور شکر یہ ہے کہ جن اصحابِ توفیق بندوں کو رب

العالمین نے یہ صلاحیت عطا فرمائی ہے وہ اپنا قلم اُٹھائیں، قدم بڑھائیں اور اخلاصِ نیت اور تقاضائے وقت کے مطابق کتاب وسنت کی روشنی میں مضامین، رسائل اور کتابیں لکھیں، دین حق کی دعوت اور خدمت کا یہ بھی بہترین اور مفید ترین ذریعہ اور وسیلہ ہے؛ بلکہ صدقۂ جاریہ ہے اور آخرت کا ذخیرہ ہے، کیوں کہ مؤلفین ومصنفین تو اپنی عمر طبعی گزار کر دنیا سے چلے جائیں گے؛ لیکن کتابی شکل میں ان کا علم زندہ، باقی اور ایک عالم کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بنا رہے گا۔ کہنے والے نے کیا خوب کہا ہے:

يَلُوحُ الْخَطُّ فِي الْقِرْطَاسِ دَهْرًا   وَ كَاتِبُهٗ رَمِيْمٌ فِي التُّرَابِ

واقعہ یہ ہے کہ جولوگ اصلاح کے مخلصانہ جذبے سے اپنا قلم اُٹھا کر اس دعوتی وتبلیغی میدان میں اپنا قدم بڑھاتے ہیں حق تعالیٰ ان کی جدو جہد کو ضائع نہیں ہونے دیتے، دارین میں انہیں نیک نامی، خوش حالی اور کامیابی سے ہم کنار فرماتے ہیں۔ حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ میزانِ اعمال میں جہاں اور بہت سے اعمالِ صالحہ کا وزن ہوگا وہاں حضرات مصنفین ومؤلفین کے اَقلام کی سیاہی کا بھی وزن ہوگا؛ بلکہ ان علماءِ اسلام کے اَقلام کی سیاہی شہداءِ اسلام کے خونِ شہادت سے زیادہ وزنی اور بھاری ہوگی، حدیث پاک میں ہے:

"يُوزَنُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِدَادُ الْعُلَمَاءِ وَ دَمُ الشُّهَدَاءِ، فَيُرَجَّحُ عَلَيْهِمْ مِدَادُ الْعُلَمَاءِ عَلىٰ دَمِ الشُّهَدَاءِ". (كنز العمال: ۱۰/ ۴۱، كتاب العلم من قسم الأقوال)

ہمارے علماءِ کرام اصلاح کے اسی مخلصانہ جذبے سے اس میدان میں آگے بڑھے اور بڑھتے چلے گئے، تو رب العالمین نے بھی ان کے گراں قدر مضامین ورسائل اور کتابوں کو شرفِ قبول عطا فرما کر امت کے ایک بڑے طبقے کی ہدایت کا سبب بنا دیا۔ ان کے نقش قدم پر چلنے کے لیے اس عاجز نے بھی اپنا ناقص قلم اُٹھا کر اس دعوتی وتبلیغی میدان میں قدم بڑھانے کی ادنیٰ و عاجزانہ کوشش کی، تو ربِ کریم نے اس کم ترین پر فضل عظیم فرما دیا اور احادیث طیبہ کے اصلاحی مضامین پر مشتمل پانچ گلدستوں کے بعد اب یہ چھٹا گلدستہ تیار کروا دیا۔ لك الحمد يا ربي و لك الشكر.

جو کچھ ہوا کرم سے تیرے اے کریم!   جو کچھ ہوگا تیرے کرم سے ہوگا اے کریم!

ربِ کریم! آپ کو آپ کے فضل وکرم اور رسولِ کریم ﷺ کا واسطہ، ہمارے کسی بھی استحقاق کے بغیر ان کاوشوں اور گلدستوں کو شرفِ قبول عطا فرما کر ہمارے لیے، ہمارے والدین کے لیے، ہماری اَزواج واَولاد کے لیے ہمارے اعزہ واقارب اور محسنین ومتعلقین اور مرحومین کے لیے (بالخصوص حضرت اقدس والد ماجد مولانا محمد صدیق شاہ بھائی بڑودویؒ استاذِ حدیث دارالعلوم بڑودا وخلیفہ حضرت شیخ الزمان مولانا محمد قمر الزمان الٰہ آبادی مدظلہ العالی کے لیے جو مؤرخہ: ۱۶/ربیع الآخر/۱۴۴۱ھ مطابق: ۱۱/فروری/۲۰۲۰ء بروز منگل (برین ہیمبریج) دماغی دورہ پڑنے کے بعد سے صاحب فراش اور بالکل معذوری کی حالت میں رہ کر مؤرخہ: ۶/محرم الحرام/۱۴۴۲ھ مطابق: ۲۶/اگست/۲۰۲۰ء بروز بدھ بوقت اذانِ عصر وصال فرما گئے) صدقہ جاریہ اور اپنی رحمت ورضا کا ذریعہ بنا دیجیے۔

يَا كَرِيْمُ! اِصْنَعْ بِنَا مَا أَنْتَ أَهْلُهٗ، وَ لَا تَفْعَلْ بِنَا مَا نَحْنُ أَهْلُهٗ. آمين يا رب العالمين بجاه سيد المرسلين و خاتم النبيين، و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.

محمد شفیق بن مولانا محمد صدیق شاہ بھائی بڑودوی

مؤرخہ: ۲۲/محرم الحرام/۱۴۴۲ھ

مطابق: ۱۱/ستمبر/۲۰۲۰ء

قبل الجمعہ، بزمِ صدیقی، بڑودا

مقدمہ

از

پیر طریقت حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم

الحمد لله رب العالمين، و الصلوٰة و السلام على أشرف الأنبياء و المرسلين و خاتم النبيين، سيدنا محمد و علىٰ اله و صحبه أجمعين، و بعد......

اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو مکمل دین بنایا اور اپنے فضل کا اِظہار بھی فرمایا:

﴿ اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ أَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الإِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدة : ٣)

ترجمہ: ’’آج کے دن ہم نے مکمل کر دیا تمہارے لیے تمہارا دین اور اپنی نعمت تم سب پر تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بطورِ دین پسند کیا۔‘‘

اس دین کی یہ خصوصیت و امتیاز ہے کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے اور قیامت تک آنے والے تمام مسائل کا اس میں حل اور رہنمائی کا سامان موجود ہے، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت وسماجیات، اقتصادیات، سیاسات، عائلی زندگی، انفرادی زندگی سبھی کی چھوٹی بڑی باتیں موجود ہیں، ناواقفیت وغفلت سے لوگوں میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ نت نئے مسائل کا حل ہمارے پاس نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین (آخری نبی ورسول) بنایا اور آپ کی لائی ہوئی شریعت کو تا قیامِ قیامت کے لیے بنایا اور اس کو پوری طرح رہنما بنایا اور آپ کے طور وطریق کو اُسوہ ہی نہیں اُسوۂ کاملہ سے بھی بڑھ کر اُسوۂ حسنہ بنایا، کہ جس کو اختیار کر کے اللہ تعالیٰ کی محبوبیت حاصل کی جاسکتی ہے۔

حدیث شریف کی خدمت ایک بڑا شرف اور بڑی عزت کی بات ہے، جس کی بڑے بڑے اہل علم تمنا کرتے رہے ہیں اور مقربین بارگاہِ ایزدی نے اپنی عمریں اس میں تمام کردیں۔

حدیث شریف کی خدمت درس وتدریس، تصنیف وتالیف، تحریر وتقریر، تعلیم وتبلیغ اور تفہیم سبھی طریقوں سے کی جاتی رہی ہے، جمع احادیث کا عمل اور ترجمہ وتشریح کا کام اور پھر نشر واشاعت کی کوشش یہ سب تقرب الی اللہ کا بڑا ذریعہ ہے، البتہ استحضارِ نیت اور ایمان و احتساب کی رو سے جو بھی نیک عمل کیا جائے وہ تقرب الی اللہ کا عمل بن جاتا ہے، چہ جائے کہ قرآنِ کریم وحدیث شریف کی خدمت کا عمل ہو، جس کے لیے حدیثوں میں بڑے وعدے بیان کیے گئے ہیں اور دنیا وآخرت دونوں جگہ اس کے غیر معمولی فوائد وثمرات ذکر کیے گئے ہیں، اور وہ ثواب الگ ہے کہ کسی کی رہنمائی سے کوئی نیکی کی بات دوسرے کو پہنچتی ہے اور اس سے اس کو نفع ہوتا ہے، پھر دوسرے کو بھی اس سے نفع پہنچتا ہے، رہنمائی کرنے والے کو پورا ثواب ملتا ہے کہ "الدال على الخير كفاعله"۔

پیش نظر ’’گلدستۂ احادیث‘‘ کے نام سے احادیث مبارکہ کا ترجمہ وتشریح کے ساتھ مجموعہ ایک بڑی عمدہ دینی کوشش کے طور پر انفرادی وسماجی اصلاح کے لیے ہمارے اور آپ کے سامنے ہے، جس کے لیے اس کے لائق و باتوفیق مصنف سب کی طرف سے تہنیت و شکریہ کے مستحق ہیں، ہم اس کے ذریعہ خیر کے زیادہ سے زیادہ عام ہونے اور اس خدمت کی قبولیت کے لیے دعا بھی کرتے ہیں، انہوں نے اس کارِ خیر میں مجھ ناچیز کو شریک کر کے جو عزت دی اس کے لیے بھی ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ تقبل الله سعيه و بارك فيه و نفع به الأمة.

محمد رابع حسنی ندوی
۳/ ذو الحجہ/ ۱۴۴۰ھ
مطابق: ۵/ اگست/ ۲۰۱۹ء

تقریظ

از

فقیہ العصر، محدثِ اعظم حضرت اقدس مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ

سعید احمد پالن پوری
شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند

Saeed Ahmed Palanpuri
Shaikhul Hadith & Sadarul Mudarriseen
Darul Uloom Deoband

Ref N. .... Date........................

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب مولانا محمد شفیق شاہ بھائی بڑودوی زید مجدہٗ ودام فضلہٗ کا دوسرا گلدستہ پہنچا، پہلے گلدستۂ مواعظ کی جلد اوّل پہنچی تھی، اب گلدستۂ احادیث کی پانچ جلدیں پہنچیں، گل دستہ: پھولوں کا گچھہ، پہلے مختلف مواعظ کا مجموعہ، یہ مختلف احادیث کا مجموعہ ہے، میں نے مختلف جگہ سے اس کو پڑھا، مصنف کو اُردو لکھنا آ گیا، البتہ احادیث کے ضمن میں کبھی ''لن ترانی'' پر اُتر آتے ہیں، یعنی غیر متعلق باتیں شروع کر دیتے ہیں، اس لیے کہ آپ واعظ بھی ہیں اور واعظین کا یہ شیوہ ہے۔ مولانا موصوف نے اس کتاب پر بھی تقریظ کی تمنا کی، تقریظ کے معنیٰ ہیں کتاب اور مصنف کی تعریف، مصنف تو بحمد اللہ قابل اعتماد ہیں۔ اور کتاب کے بارے میں کچھ کہنے کے لیے ضروری ہے کہ پوری کتاب کو پڑھا جائے، اب بوڑھاپے میں یہ کام مشکل ہے؛ مگر جب مصنف معتبر ہے تو کتاب بھی ان شاء اللہ معتبر ہوگی، البتہ زبان شستہ، سلیس ہے، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ ہو۔ اور عرض یہ ہے کہ آئندہ جو کتاب لکھیں وہ تقریظ کے لیے نہ بھیجیں، مشک آنست کہ خود ببوید، نہ کہ عطار بگوید، جو کتاب لکھیں اور شائع کریں وہ اپنے اعتماد پر شائع کریں، میں نے اب پڑھنا چھوڑ دیا ہے، چھپنے کے بعد ضرور بھیجیں، اپنے لوگوں کے کام کو دیکھ کر ایک خوشی ہوتی ہے۔

والسلام

سعید احمد عفا اللہ عنہٗ پالن پوری

۴؍ربیع الاول؍۱۴۴۱ھ

۲۱

تقریظ

از

حضرت مولانا عبید اللہ الاسعدی صاحب مدظلہٗ

(استاذِ حدیث: جامعہ ہتھوڑا، باندہ، یوپی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

میرا گجرات کے ایک سفر میں بڑودا شہر میں کچھ دیر قیام رہا، مولانا مفتی محمد شفیق صاحب کی میزبانی سے لطف حاصل کیا، مولانا نے اپنی ایک تصنیف اَنیق سے بھی نوازا، مولانا مدرّس بھی ہیں اور واعظ بھی، درسِ حدیث کا ایک سلسلہ ہے، جس کو ''گلدستۂ احادیث'' کے نام سے ضبط کرنے اور شائع کرنے کا بھی سلسلہ ہے، اس میں حدیث کی مناسب شرح و توضیح کے ساتھ مناسب و متعلق مفید مضامین بھی بیان کیے گئے ہیں، متعدد اکابر نے اس سلسلہ کو پسند فرمایا ہے۔

احقر نے جلد پنجم کو مختلف جگہوں سے دیکھا، مفید پایا، حق تعالیٰ مولانا کو مزید حوصلہ دے اور ان کے علوم وخدمات سے امت کو مستفید فرمائے۔ آمین۔

محمد عبید اللہ الاسعدی غفرلہٗ

تاریخ: ۲۱/ ذوالقعدۃ/ ۱۴۳۹ھ

مطابق: ۴/ ۸/ ۲۰۱۸ء

از

قاریٔ خوش الحان، واعظ شیریں بیان حضرت مولانا قاری احمد علی فلاحی دامت برکاتہم

باسمہ تعالیٰ

اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے کتاب اللہ اور رجال اللہ کا سلسلہ پہلے سے جاری رہا ہے، جس کی تکمیل نبی آخر الزمان محمد رسول اللہ ﷺ پر ہوئی۔ آپ ﷺ کو من جانب اللہ قرآن مجید جیسی مقدس ترین کتاب دی گئی، قرآن مجید کی اوّلین تفسیر حضور اکرم ﷺ کے اقوال وافعال ہیں، یہ اس امت کی ایک خصوصیت ہے کہ اس اُمت نے بہت پختگی کے ساتھ اور سندوں کی چھان بین کے ساتھ حضور اکرم ﷺ کے فرامین کی حفاظت کا اہتمام کیا ہے اور ہر دور میں آپ ﷺ کے فرامین کو امت تک پہنچانے کا کام مختلف طریقوں سے کیا ہے۔

ہمارے مخلص دوست جناب مفتی محمد شفیق صاحب بڑودوی نے بھی حضورِ اکرم ﷺ کے فرامین کا اُردو ترجمہ وتشریح امت کے ہاتھوں تک پہنچانے کا کام اپنے ذمہ لیا ہے اور اب تک اس کی چھ جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں، جو بہت ہی اچھی ترتیب اور اچھے انداز سے لکھی گئی ہیں۔

حق تعالیٰ موصوف کی محنت کو قبول فرمائے اور حدیث کی خدمت پر جو بشارتیں ہیں اللہ پاک ان کو نصیب فرمائے اور ان کی کتابوں کو اُمت کی ہدایت کا ذریعہ بنائے اور ہم سب کو استفادہ کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین۔

فقط والسلام

احمد علی غفرلہٗ

۲۲/محرم الحرام/۱۴۴۱ھ

مطابق: ۲۲/ستمبر/۲۰۱۹ء

(۱)

نرمی کی فضیلت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهَا أَنَّ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: "إِنَّ اللّٰهَ رَفِيۡقٌ يُحِبُّ الرِّفۡقَ، وَ يُعۡطِيۡ عَلَى الرِّفۡقِ مَا لَا يُعۡطِيۡ عَلَى الۡعُنۡفِ، وَ مَا لَا يُعۡطِيۡ عَلٰى مَا سِوَاهُ."

(رواہ مسلم، مشکوٰۃ: ۴۳۱/ باب الرفق والحیاء وحسن الخلق)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ خود بھی نرمی اور مہربانی فرمانے والے ہیں اور نرمی ومہربانی کو پسند فرماتے ہیں۔ (مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ چاہتے ہیں کہ بندے بھی آپس میں شدت پسندی وسختی کے بجائے نرمی ونرم مزاجی سے پیش آئیں؛ کیوں کہ) اس کی جانب سے نرمی پر جو کچھ انعام اور اجر وثواب عطا کیا جاتا ہے وہ سختی اور اس کے علاوہ پر عطا نہیں کیا جاتا۔“

نرمی ومہربانی اللہ تعالیٰ کی پیاری صفت ہے:

اللہ رب العالمین کی ذاتی صفات میں سے ایک پیاری صفت یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ لطف ومہربانی اور نرمی سے پیش آتا ہے، ارشادِ باری ہے:

﴿اَللّٰهُ لَطِيۡفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرۡزُقُ مَنۡ يَّشَآءُ ۚ وَ هُوَ الۡقَوِيُّ الۡعَزِيۡزُ۝﴾ (الشوریٰ: ۱۹)

''اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے، وہ جسے چاہتا ہے رزق دیتا ہے اور وہ قوی بھی ہے، عزیز بھی۔'' (اس لیے اس کی مہربانی کو کوئی روک نہیں سکتا)۔

اس آیت کریمہ کے تحت علامہ قرطبیؒ نے ''لَطِیْفٌ'' کی تشریح میں مختلف معانی بیان فرمائے ہیں، منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے، یہ اس کی مہربانی اور نرمی ہی کا نتیجہ ہے کہ وہ دنیا میں اپنے نیک بندوں کو بھی رزق دیتا ہے اور فجار و کفار کو بھی، وہ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو رزق دیتا ہے تو نمرود پر بھی اپنا رزق بند نہیں کرتا، وہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رزق دیتا ہے تو فرعون کو بھی رزق وہی دیتا ہے، ہاں، فرق یہ ہے کہ اپنے فرماں برداروں کو خوش ہو کر رزق دیتا ہے، جب کہ نافرمانوں کو ناراض ہو کر دیتا ہے، محروم کسی کو نہیں کرتا، یہ اس کی مہربانی نہیں تو اور کیا ہے؟

دوسرے یہ کہ بندوں کے چھوٹے چھوٹے اعمال پر بھی بڑے بڑے اجر عطا فرماتا ہے، مثلاً بدنی عبادات میں ایک نیکی پر کم از کم دس گنا اور مالی عبادات میں کم از کم سات سو گنا، بعض اعمال پر بے حساب ملتا ہے، یہ بھی اس کی مہربانی نہیں تو اور کیا ہے؟

تیسرے یہ کہ اس نے اپنے بندوں کو ان کی طاقت سے زیادہ اعمال واحکام کا مکلّف نہیں بنایا، تا کہ بندے پریشان نہ ہوں، ظاہر ہے کہ یہ بھی اس کی مہربانی کی عظیم نشانی ہے۔

چوتھے یہ کہ سوال کرنے والوں کو محروم نہیں کرتا؛ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ وہ مانگنے والوں کو ہمیشہ وہی چیز نہیں دیتا جو انہوں نے مانگی ہے؛ بلکہ وہ چیز دیتا ہے جو ان کے حق میں بہتر ہو، تو یہ بھی اس کی مہربانی کی دلیل ہے۔ نیز اس کے لطف و کرم اور مہربانی و نرمی سے نیکو کار تو مستفیض ہوتے ہی ہیں؛ مگر بدکار اور گنہگار بھی محروم نہیں رہتے۔

عاصیِ پُر معاصی کے ساتھ حق تعالیٰ کی نرمی ومہربانی:

چنانچہ کسی بزرگ نے عاصی پر معاصی پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور نرمی کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ گنہگار پر گناہوں کے باوجود چار طرح کی مہربانیاں کی جاتی ہیں:

(۱) اس کے گناہ پر فوراً پکڑ نہیں کی جاتی؛ بلکہ مہلت دی جاتی ہے، شاید بعد میں بندہ توبہ کر لے۔

فقیہ ابو اللیث سمرقندیؒ نے ایک واقعہ نقل فرمایا ہے کہ کسی بادشاہ کو ایک بزرگ سے عقیدت ہوگئی، جس کی وجہ سے اس نے یہ پیش کش کی کہ حضرت! آپ ہمارے یہاں تشریف لے آئیں، ہم آپ کے لیے قیام و طعام کا بہترین انتظام کریں گے، بزرگ نے ٹالنے کی غرض سے فرمایا کہ پہلے ایک بات کا جواب دیجیے کہ اگر آپ کے یہاں قیام کے دوران کسی وقت آپ اپنی خاص کنیز سے مجھے قابل اعتراض حالت میں دیکھ لیں تب آپ کیا کریں گے؟ بس سنتے ہی ایمانی غیرت کے سبب بادشاہ کی ساری عقیدت ختم ہوگئی، غصہ میں آگ بگولہ ہو کر کہنے لگا: ''لا حول و لا قوة إلا باللّٰه'' اگر آپ کی سوچ اس قدر گندی ہے تو پھر ہمیں آپ کی کوئی ضرورت نہیں، تب حضرتؒ نے فرمایا کہ دراصل خود مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں، کیوں کہ اس آقا کا در چھوڑ کر میں تمہارے دربار میں آنا ہرگز نہیں چاہتا جو مجھے گناہ کرتے ہوئے دیکھ کر بھی فوراً پکڑ نہیں کرتا، بلکہ مہلت اور موقع دیتا ہے، ایسے کریم مولیٰ کا در چھوڑ کر تم جیسے نادان کے یہاں میں کیوں آؤں؟ جو گناہ کے امکان پر بھی ناراض ہو جائے۔ (مستفاد از: تنبیہ الغافلین)

(۲) عموماً اس گناہ کو دنیا والوں کے سامنے ظاہر بھی نہیں کیا جاتا، تا کہ وہ بندہ رُسوا نہ ہو جائے۔

(۳) گناہ کے باوجود اس بندہ پر رزق بند نہیں کیا جاتا، ہاں، البتہ گناہوں کی وجہ سے رزق کبھی کبھی تنگ کر دیا جاتا ہے، تا کہ بندہ تنگی سے پریشان ہو کر توبہ کی طرف مائل ہو جائے اور گناہوں سے باز آجائے۔

عَنْ ثَوْبَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ مَرْفُوْعًا: '' إِنَّ الرَّجُلَ لَيُحْرَمُ الرِّزْقَ بِالذَّنْبِ يُصِيْبُهُ، وَ لَا يَرُدُّ الْقَدَرَ إِلَّا الدُّعَاءُ، وَ لَا يَزِيْدُ فِي الْعُمُرِ إِلَّا الْبِرُّ''. (كنزالعمال: ٦/٤٧٣)

(۴) گنہگار بندہ کو اس کے گناہوں کے باوجود نعمتوں سے محروم نہیں کیا جاتا، ہاں،

مگر سکونِ قلبی سے ضرور محروم کر دیا جاتا ہے، تا کہ بے چینی محسوس کر کے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر لے، غور کیا جائے تو یہ بھی اس کے لطف و کرم اور مہربانیوں کے مختلف انداز ہی ہیں۔ "صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ: ﴿اَللّٰهُ لَطِيْفٌ بِعِبَادِهٖ﴾ وَ صَدَقَ رَسُوْلُهُ النَّبِيُّ الْكَرِيْمُ: "اِنَّ اللّٰهَ رَفِيْقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ." اس سارے مضمون کو کسی عربی شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے:

مَنْ كَانَ فِيْ سَخَطِهٖ مُحْسِنًا　　فَكَيْفَ يَكُوْنُ إِذَا مَا رَضِيَ

"جو ذات اپنی ناراضی میں بھی احسان (ونرمی) کرتی ہو جب راضی ہوگی تو اس کے الطاف وعنایات کا کیا عالم ہوگا۔"

نرمی رسول اللہ ﷺ کی پاکیزہ صفت ہے:

"حق تعالیٰ اپنے بندوں پر تو نرمی اور مہربانی کا معاملہ فرماتے ہی ہیں، اپنے بندوں سے بھی یہی چاہتے ہیں کہ وہ بھی آپس میں نرمی اور مہربانی سے پیش آئیں، حدیث میں ہے: "يُحِبُّ الرِّفْقَ" اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کا آپس میں نرمی ومہربانی سے پیش آنا بہت پسند ہے، یہی وجہ ہے کہ ذاتی معاملات میں نرمی ومہربانی سے پیش آنا اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ بندوں کی پاکیزہ صفت ہے۔

چنانچہ ساری کائنات میں اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ پسندیدہ بندے سرکارِ دو عالم ﷺ ہیں، آپ ﷺ کی زندگی کھلی کتاب کے مانند ہے، ہر کوئی اسے پڑھ سکتا ہے، آپ ﷺ نے بعض شرعی امور ومعاملات کے علاوہ اپنے ذاتی امور ومعاملات میں کبھی کسی کے ساتھ سختی نہیں کی، ہر ایک کے ساتھ نرمی سے پیش آتے رہے، حالانکہ زندگی میں بار بار ایسے مواقع بھی پیش آئے جن میں حضور پاک ﷺ کو رنج وغم ہوا؛ مگر اس کے باوجود آپ ﷺ ہمیشہ ہر ایک کے ساتھ نرم مزاجی سے ہی پیش آئے۔ جیسے کہ غزوۂ اُحد کے موقع پر بعض مسلمانوں سے لغزش ہوئی کہ میدان چھوڑ کر چلے گئے، جس سے حضور ﷺ کو سخت تکلیف پہنچی؛ مگر اس کے باوجود آپ ﷺ نے ان کے ساتھ اپنی طرف سے کوئی سختی کا معاملہ

نہیں فرمایا؛ بلکہ نرمی سے پیش آئے، اسے قرآنِ پاک نے یوں بیان فرمایا:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ﴾ (آل عمران:۱۵۹)

"ان کے ساتھ آپ کی نرم مزاجی رحمت الٰہی کے سبب ہے۔"

سیرۃ النبی ﷺ کا ایک واقعہ:

عاجز کے خیالِ ناقص میں اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ نرم مزاجی خوش اخلاقی کی بڑی نشانی ہے، اور حضور پاک ﷺ تو حسن اخلاق کے سب سے اعلیٰ درجہ پر فائز تھے، اس لیے آپ ﷺ ہمیشہ دشمنوں کے ساتھ بھی نرم مزاجی سے پیش آتے رہے، سیرۃ النبی میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً مدینہ منورہ میں منافقین کا سب سے بڑا سردار عبداللہ بن ابی بن سلول ہر وقت آپ ﷺ کے خلاف سازشیں کرتا رہتا تھا، اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا، مسجد نبوی کے بالمقابل مسجد ضرار بنانے والوں میں بھی یہی پیش پیش رہا تھا، عفیفۂ کائنات سیدہ عائشہ صدیقہؓ بنت صدیقؓ پر تہمت لگانے والا بدبخت بھی یہی تھا، اگرچہ اس کی منافقت کئی مواقع پر ظاہر ہو چکی تھی، لیکن چوں کہ وہ بظاہر اپنے آپ کو مسلمان کہتا تھا اس لیے اس کے ساتھ مسلمانوں جیسا ہی برتاؤ کیا جاتا تھا، ورنہ درحقیقت وہ رئیس المنافقین تھا، اللہ تعالیٰ کی شان دیکھئے کہ اس کے بیٹے سچے پکے مسلمان تھے، جب اس کا انتقال ہو گیا تو اس کے بیٹے حضرت عبداللہؓ نے خدمت عالیہ میں آ کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے باپ کی موت ہو گئی، میری ایک درخواست یہ ہے کہ آپ اپنا مبارک کرتہ عطا فرمائیں، تا کہ اسے بطورِ کفن پہنا دیا جائے اور دوسری درخواست یہ ہے کہ آپ اس کی نمازِ جنازہ پڑھائیں، آپ ﷺ کی نرم مزاجی دیکھئے! بیٹے کی درخواست پر آپ ﷺ نے اپنے دشمن کے لیے بطورِ کفن چادر بھی عنایت فرما دی اور اس کی نمازِ جنازہ کے لیے تیاری بھی فرمالی، اس موقع پر حضرت فاروقِ اعظمؓ نے اللہ کے رسول ﷺ کا دامن پکڑ لیا اور عرض کیا: حضور! یہ ان ہی لوگوں میں سے ہے جن کے متعلق حق تعالیٰ نے ارشاد

فرمایا ہے:

﴿ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۗ إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۗ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۗ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝﴾ (التوبة: ۸۰)

”آپ ان کے لیے استغفار کریں یا نہ کریں، اگر آپ ان کے لیے ستر مرتبہ بھی استغفار کریں تب بھی اللہ تعالیٰ انہیں معاف کرنے والا نہیں، کیوں کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کا رویہ اختیار کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”حق تعالیٰ نے مجھے استغفار کرنے نہ کرنے کا اختیار دیا اور ستر مرتبہ بھی ان کے لیے استغفار کرنے پر معافی نہ ملنے کی بات کہی ہے، اگر اکہترویں مرتبہ استغفار کرنے سے معافی ہوسکتی ہے تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔“ اس کے بعد آپ ﷺ نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھا دی، تو وہ آیت کریمہ نازل ہوئی جس میں آپ ﷺ کو منافقین کی نمازِ جنازہ پڑھانے سے روک دیا گیا:

﴿ وَ لَا تُصَلِّ عَلٰٓى أَحَدٍ مِّنْهُمْ مَاتَ أَبَدًا وَّ لَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ۗ إِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ مَاتُوْا وَ هُمْ فٰسِقُوْنَ ۝﴾ (التوبة: ۸۴)

”ان منافقین میں سے کوئی مرجائے تو آپ اُن پر کبھی نمازِ جنازہ مت پڑھئے اور نہ اُن کی قبر پر کھڑے ہویئے؛ کیوں کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کا رویہ اختیار کیا اور اس حال میں مرے کہ وہ کافر تھے۔“

اس ممانعت کے بعد پھر حضور ﷺ نے کبھی کسی منافق کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھائی۔
(مستفاد از بخاری: ۲/۶۷۳، آسان ترجمۂ قرآن: ۱/۸۹۵، انوار البیان: ۲/۵۶۸)

نرمی کی ترغیب وتلقین:

جہاں تک تعلق ہے ذاتی امور میں نرمی برتنے کا تو وہ معمول آپ ﷺ کا ہمیشہ اور ہر ایک کے ساتھ رہا، نیز موقع بہ موقع آپ ﷺ دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے رہے۔

حدیث پاک میں مروی ہے کہ ایک مرتبہ کچھ یہودی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نفس کی خباثت وشرارت کے سبب انہوں نے ”السلام علیکم“ کہنے کے بجائے ”سلام“ کے لام کو حذف کرکے ”السَّامُ علیکم“ کہا، جو دراصل ایک گالی ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ تم پر موت آئے (نعوذ باللہ) سیدہ عائشہؓ وہیں موجود تھیں، یہ سن کر برداشت نہ کرسکیں، جواباً فرمانے لگیں: ”بَلْ عَلَيْكُمُ السَّامُ وَ اللَّعْنَةُ.“ (تم ہی کو موت آئے اور تم پر اللہ تعالیٰ کی لعنت وغضب ہو!) اس پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”يَا عَائِشَةُ! إِنَّ اللّٰهَ رَفِيْقٌ، يُحِبُّ الرِّفْقَ فِي الْأَمْرِ كُلِّهٖ.“ (متفق عليه، مشكوة: ۳۹۸/ باب السلام)

”اے عائشہ! (یہ سختی اور سخت کلامی مناسب نہیں؛ کیوں کہ) اللہ تعالیٰ خود بھی نرمی برتنے والے ہیں اور تمام معاملات میں نرمی کو پسند فرماتے ہیں۔“

مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے یہودیوں کی اس سخت گستاخی کے جواب میں بھی سختی کو پسند نہیں فرمایا، یہاں بھی نرمی کی ترغیب دی۔

اسی طرح ایک روایت میں ہے، سیدہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رحمت عالم ﷺ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس سے گزرے، اس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے کسی غلام پر ناراض ہوکر اس پر لعنت و ملامت کر رہے تھے، حضور ﷺ حضرت ابوبکرؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ”لَعَّانِيْنَ وَ صِدِّيْقِيْنَ؟ كَلَّا وَ رَبِّ الْكَعْبَةِ.“ (رواه البيهقي في شعب الإيمان، مشكوة: ۴۱۵/ باب حفظ اللسان من الغيبة والشتم/ الفصل الثالث)

”صدیق ہوکر لعنت و ملامت کرے؟ ربِ کعبہ کی قسم ایسا نہیں ہوسکتا۔“ لعنت و ملامت اور صدیقیت ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے، صدیق کے لیے کسی پر لعنت و ملامت کرنا بالکل مناسب نہیں؛ کیوں کہ لعنت و ملامت کرنا سختی کی علامت ہے، اور صدیق کو سخت نہیں؛ بلکہ نرم ہونا چاہیے، حضور ﷺ کے حضرت ابوبکرؓ کو سختی پر تنبیہ فرما کر نرمی کی ترغیب دینے کا اثر یہ ہوا کہ آپؓ نے اسی دن اپنے کئی غلام آزاد کردیے۔ ”فَأَعْتَقَ أَبُوْ بَكْرٍ يَوْمَئِذٍ بَعْضَ

رَقِيقِهِ، ثُمَّ جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: "لَا أَعُودُ". (أيضا)

اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے خدمت اقدس میں حاضر ہو کر وعدہ کیا کہ حضور! آئندہ میں کسی کے ساتھ بھی اپنے ذاتی امور و معاملات میں سختی نہیں کروں گا۔

نرمی اہل ایمان کی پہچان ہے:

الغرض اپنے نجی و ذاتی امور و معاملات میں نرمی برتنا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو پسند ہے، اس لیے اہل ایمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے نرم مزاج ہوں، سخت مزاج نہ ہوں، قرآنِ پاک نے اہل ایمان کی جو پہچان بیان فرمائی اس میں ایک یہ بھی ہے کہ ﴿أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِينَ﴾ (المائدة:٥٤)

''اہل ایمان ایک دوسرے کے لیے تو نرم ہوتے ہیں؛ لیکن اللہ کے باغیوں کے لیے سخت ہوتے ہیں۔''

اسی کو دوسرے مقام پر اہل ایمان کی پہچان کراتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَ الَّذِينَ إِذَآ أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ﴾ (الشوریٰ: ٣٩)

''جب ان پر زیادتی ہوتی ہے (جیسے ماب لنچنگ Mob Lynching کے ناخوش گوار مواقع میں) تو وہ (ان کا مقابلہ کرتے ہیں اور) اپنا دفاع کرتے ہیں''۔ کیوں کہ مؤمن بزدل نہیں؛ بہادر ہوتا ہے، نرم خوئی و نرم مزاجی کی عادت کوئی کمزوری کی بنا پر نہیں؛ بلکہ خوش اخلاقی کی بنا پر ہوتی ہے، وہ اہل ایمان اور مظلوموں کے لیے تو نرم مزاج ہوتا ہے؛ مگر کفار و فجار اور ظالم و جابر کے لیے لوہے کا چنا بن جاتا ہے، جسے چبانے کی کوشش کرنے والا خود اپنا ہی جبڑا توڑ لیتا ہے۔ الغرض مؤمن بندہ ظالموں کے لیے فولاد تو مؤمنوں اور مظلوموں کے لیے ریشم کی طرح نرم ہوتا ہے۔

اسی کو حدیث پاک میں فرمایا:

عَنْ مَكْحُولٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: "الْمُؤْمِنُونَ هَيِّنُونَ لَيِّنُونَ

كَالْجَمَلِ الْأَنِفِ، إِنْ قِيدَ انْقَادَ وَ إِنْ أُنِيخَ عَلَى صَخْرَةٍ اسْتَنَاخَ." (رواه البيهقي في شعب الإيمان، مشكوٰة: ٤٣٢/ باب الرفق والحياء)

''مؤمن (آپس میں ایک دوسرے کے لیے) رقیق القلب، نرم دل، نرم مزاج اور نرم طبیعت ہوتے ہیں، جیسے نکیل والا اونٹ اگر چلایا جائے تو اطاعت کرے اور اگر کسی چٹان پر بٹھائیں تو بیٹھ جائے۔'' یعنی جس طرح نکیل والا اونٹ نرمی، عاجزی اور تابع داری کی صفت سے متصف ہوتا ہے اسی طرح مؤمن کامل بھی ان صفات سے متصف ہوتا ہے۔ حضراتِ صحابہ ؓ کامل الایمان اور سچے پکے مسلمان تھے اس لیے یہ صفت ان میں بہت زیادہ نمایاں تھی، قرآنِ پاک نے ان کی شان بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَ الَّذِينَ مَعَهٗ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ (الفتح:٢٩)

''محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں وہ کفار و فجار کے لیے بڑے سخت ہیں؛ لیکن آپس میں بڑے مہربان اور رحم دل ہیں۔''

ایک نصیحت آموز واقعہ:

یہی حال تھا حضرات صلحاء کا بھی، اس سلسلہ میں تیسری صدی ہجری کے مشہور امام اور جلیل القدر محدث ابوزُرعہ ؒ کا ایک نصیحت آموز واقعہ منقول ہے، آپ ؒ شروع میں ملک شام میں پھر مصر میں قضاء کے عہدے پر فائز رہے ہیں، کہا جاتا ہے کہ آپ ؒ پہلے وہ شافعی المسلک عالم اور اِمام ہیں جنہیں منصب قضاء سپرد کیا گیا، آپ ؒ کس قدر رقیق القلب اور نرم مزاج تھے اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ ؒ کے پاس آ کر کسی نے یہ دعویٰ کیا کہ فلاں شخص پر میری اِتنی رقم واجب ہے، وہ مجھے ملنی چاہیے، آپ ؒ نے مدعا علیہ کو بلا کر پوچھا تو اس نے اقرار کرلیا، جس کی وجہ سے آپ ؒ نے مدعی کے حق میں فیصلہ کردیا اور مدعا علیہ کو حکم سنا دیا کہ وہ مدعی کو رقم ادا کردے، اس پر مدعا علیہ کی آنکھوں میں آنسو جاری ہوگئے، اِمام ابوزُرعہ ؒ نے رونے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ بات دراصل یہ ہے کہ میں جھوٹ تو بول نہیں سکتا،

اس لیے میرے ذمہ جو رقم واجب الاداء ہے اس کا تو اقرار کرلیا؛ لیکن میں ایک غریب آدمی ہوں، اس لیے میں وہ رقم ادا کرنے سے قاصر ہوں، لہٰذا آپ چاہیں تو مجھے وہ رقم ادا نہ کرنے کے جرم میں جیل بھیج دیں، مگر اس صورت میں میری اور میرے اہل خانہ کی پریشانی اور بھی بڑھ جائے گی، یہ دُکھڑا سنا کر وہ خوب رونے لگا، اُسے روتا دیکھ کر اِمام ابوزُرعہؒ بھی رونے لگے، اس کے بعد مدعی کو بلا کر آپؒ نے اپنی طرف سے قرض کی رقم ادا کردی اور اُس غریب مدعا علیہ کو آزاد کردیا۔

اس واقعہ کی جب شہرت ہوئی تو بعض شاطر اور چالاک لوگوں نے یہ وطیرہ اور طریقہ بنالیا کہ وہ اپنے خلاف قرض کا اِقرار کرتے اور جب ادائیگی کا حکم سنتے تو اپنی غریبی و مفلسی کا عذر بیان کر کے رو پڑتے اور جیل جانے پر راضی ہوجاتے، جس کی وجہ سے اِمام ابوزُرعہؒ - یہ جاننے کے باوجود کہ بعض لوگ بناوٹ کررہے ہیں- ان کی رقم اپنی طرف سے ادا فرمادیتے، ساری زندگی آپؒ کا یہی معمول رہا۔

(رفع الإصر عن قضاۃ مصر: ۱۱۹، کتاب القضاۃ للکندی: ۵۲۲، ازتراشے: ۱۳۸)

یہ لوگ اپنی نرم مزاجی کے سبب بعض اوقات دھوکہ کھا لیتے ہیں؛ لیکن کبھی کسی کو بالقصد دھوکہ نہیں دیتے، حدیث پاک میں مؤمن کی یہ پہچان بتائی گئی ہے:

”عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ”الْمُؤْمِنُ غِرٌّ كَرِیْمٌ، وَ الْفَاجِرُ خِبٌّ لَئِیْمٌ.“ (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ: ۴۳۲)

”مؤمن بھولا بھالا، کریم، باعزت، سلیم القلب اور سادہ دل ہوتا ہے، جب کہ فاسق عیار، فریب کار اور بداخلاق ہوتا ہے۔“

صاحبو! حضرات صحابہؓ وصلحاء کی یہ نرمی ونرم مزاجی والی صفت کی برکت تھی کہ خیر و بھلائی وکامیابی نے قدم قدم پر ان کے قدموں کو چوما، آج جب ہم دورِ حاضر کے مسلمانوں کا جائزہ لیں تو ہمارا حال عموماً حضرات صحابہؓ وصلحاء کے برعکس ہے، آج کے اکثر مسلمان کفار وفجار کے لیے تو نرم ہیں؛ مگر آپس میں ایک دوسرے کے لیے بڑے سخت ہیں، یہی وجہ ہے کہ آج

اکثر مسلمان خیر وخوبی اور بھلائی وکامیابی سے محروم اور دور ہیں۔ حدیث پاک میں مروی ہے:

عَنْ جَابِرٍؓ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ”مَنْ یُحْرَمِ الرِّفْقَ یُحْرَمِ الْخَیْرَ.“ (رواہ مسلم، مشکوٰۃ: ۴۳۱/ باب الرفق و الحیاء و حسن الخلق)

”نرمی سے محروم رہنے والا ہر خیر وخوبی سے محروم رہتا ہے۔“

نرمی وسختی کے نتائج:

واقعہ یہ ہے کہ آج بھی ہم نرمی والی پاکیزہ صفت کو اختیار کرلیں تو مذکورہ حدیث پاک میں یہ بشارت ہے کہ ”وَ یُعْطِيْ عَلَى الرِّفْقِ مَا لَا یُعْطِيْ عَلَى الْعُنْفِ وَ مَا لَا یُعْطِيْ عَلٰى مَا سِوَاهُ.“ نرمی اختیار کرنے والوں کو جو انعام واکرام اور اجر وثواب دیا جاتا ہے وہ سختی اور اس کے علاوہ پر نہیں دیا جاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کے مزاج، معاملات اور رویہ میں نرمی ہوتی ہے وہ خود بھی سکون اور راحت پاتے ہیں اور ان کی وجہ سے ان کے اہل خانہ، پڑوسی، رشتہ دار، متعلقین، اپنے اور پرائے سب راحت اور سکون پاتے ہیں۔ پھر یہ نرمی باہمی محبت ومودّت کا ذریعہ ہے، نیز اس سے آپس میں اکرام واحترام اور خیرخواہی و ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف جو لوگ بے جا سختی اور شدت پسندی کا رویہ اختیار کرتے ہیں وہ خود بھی پریشان ہوتے ہیں اور جن کا ان سے واسطہ پڑتا ہے وہ بھی پریشان ہوتے ہیں، ان سے نفع کم اور نقصان زیادہ پہنچتا ہے۔ پھر نرمی اور سختی کے یہ تو چند وہ دنیوی نتائج ہیں جن کا ہم اپنی روز مرّہ زندگی اور ماحول میں تجربہ ومشاہدہ کرتے ہیں، اُخروی نتائج تو الگ ہیں، جن کا تجربہ ومشاہدہ مرنے کے بعد ہی ہوگا، حدیث پاک میں نرمی وسختی کے اُخروی نتائج کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ”أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِمَنْ یَحْرُمُ عَلَى النَّارِ، وَ بِمَنْ تَحْرُمُ النَّارُ عَلَیْهِ؟ عَلٰى كُلِّ هَیِّنٍ لَیِّنٍ قَرِیْبٍ سَهْلٍ.“ (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ: ۴۳۲)

"کیا میں تمہیں اس شخص کے متعلق خبر نہ دوں جو دوزخ پر حرام اور خود دوزخ کی آگ اس پر حرام ہے؟ (پھر ارشاد فرمایا: سنو، لوگو! میں بتاتا ہوں کہ دوزح پر وہ شخص حرام ہے اور خود دوزخ بھی اس پر حرام ہے) ہر اُس شخص پر جو نرم مزاج، نرم دل، نرم طبیعت اور لوگوں سے قریب ہو۔"

حدیث پاک میں مذکور "هَيِّنٍ، لَيِّنٍ، قَرِيبٍ، سَهْلٍ" یہ چاروں الفاظ قریب المعنی ہیں، تمام رقت قلبی ونرم خوئی کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کرتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے مزاج اور رویہ میں نرم ہو اور اپنی نرم خوئی کی وجہ سے لوگوں سے خوب ملتا جلتا ہو اور ہر کسی سے ذاتی امور میں نرمی ومہربانی سے پیش آتا ہو ایسا مؤمن یقیناً جنتی ہے اور دوزخ یقیناً اس پر حرام ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ:

کرو مہربانی تم فرشِ زمیں پر خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر

غالبًا ان ہی حقائق کے پیشِ نظر ایک اور حدیث میں فرمایا گیا:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: "مَنْ أُعْطِيَ حَظَّهُ مِنَ الرِّفْقِ أُعْطِيَ حَظَّهُ مِنْ خَيْرِ الدُّنْيَا وَ الآخِرَةِ، وَ مَنْ حُرِمَ حَظَّهُ مِنَ الرِّفْقِ حُرِمَ حَظَّهُ مِنْ خَيْرِ الدُّنْيَا وَ الآخِرَةِ." (رواه البغوی فی شرح السنة، مشکوٰة: ۴۳۱/ باب الرفق و الحياء و حسن الخلق)

"جس شخص کو نرمی کی خصلت وصفت سے (منِ جانب اللہ) اپنا حصہ مل گیا تو سمجھ لو کہ اُسے دنیا وآخرت کی خیر وبھلائی سے حصہ مل گیا، اور جو شخص اپنے نرمی کے حصہ سے محروم رہ گیا وہ دارین کی خیر وبھلائی سے محروم رہ گیا۔"

حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے لطف ومہربانی سے ہمیں نرمی کی صفت سے متصف فرمائیں اور غیر شرعی وبے جاسختی وشدت پسندی سے ہمیں محفوظ فرمائیں۔ آمین۔

۸/ رمضان المبارک/ ۱۴۳۹ھ، بروز جمعرات
مطابق: ۲/ مئی/ ۲۰۱۸ء (بزمِ صدیقی، بڑودا)

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيرًا فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيرًا كَثِيرًا

۲۸

(۲)
شرک کی مذمت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "ثِنْتَانِ مُوْجِبَتَانِ، قَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَا الْمُوْجِبَتَانِ؟ قَالَ: مَنْ مَاتَ يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ النَّارَ، وَ مَنْ مَاتَ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ." (رواه مسلم، مشکوٰة: ۱۵/ کتاب الإيمان)

ترجمہ: "حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دو خصلتیں ایسی ہیں جو (یا تو جنت یا دوزخ کو) واجب کرنے والی ہیں، (آپ ﷺ نے ابتداءً ابہام والا طریقہ اس لیے اختیار فرمایا تاکہ سامعین کو توجہ سے بات سننے اور سمجھنے کا اشتیاق پیدا ہو جائے، معلوم ہوا کہ سامعین کو متوجہ کرنے کے لیے مناسب انداز اور طریقہ اختیار کرنا بھی سنت ہے) ایک شخص نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! (جنت یا جہنم کو) واجب کرنے والی وہ دو خصلتیں کونسی ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ پہلی خصلت تو یہ کہ جو شخص اس حالت میں فوت ہو جائے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا تھا (اور اسی پر اس کی موت ہوئی تو شرک کی وجہ سے اس پر جہنم واجب ہو جاتی ہے) تو ہمیشہ کے لیے اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا، اور دوسری خصلت یہ ہے کہ جو شخص اس حالت میں مر جائے کہ اس نے اللہ

تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا تھا (تو شرک سے محفوظ رہنے والا لازمی اور دائمی طور پر دوزخ سے بھی محفوظ رہے گا) اور اسے (ابتداءً یا انتہاءً) جنت میں داخل کیا جائے گا۔‘‘

شرک کی حقیقت:

دنیا میں بیوقوفوں کی کمی نہیں غالبؔ
ایک ڈھونڈو، ہزار ملتے ہیں

کسی نے اس میں ترمیم کی ہے:

دنیا میں بتوں کی کمی نہیں غالبؔ
ایک ڈھونڈو، ہزار ملتے ہیں
بلکہ سچ پوچھو تو اُدھار ملتے ہیں

اللہ رب العزت اپنی ذات، مخصوص صفات اور اختیارات میں یکتا، تنہا اور بالکل اکیلا ہے۔ ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ﴾ (الإخلاص:۱) اس حقیقت کے باوجود اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی عبادات، مخصوص صفات یا اختیارات میں کسی دوسرے کو اللہ تعالیٰ کے برابر یا شریک سمجھتا ہے تو یہ شرک ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات میں شریک کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی غیر کو اللہ تعالیٰ کے مانند سمجھنا۔ جیسے نصاریٰ کے ایک فرقہ کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے مانند سمجھنا اللہ تعالیٰ کی ذات میں شریک کرنا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام ایک ہی ہیں، یعنی وہ لوگ حلول کے قائل ہیں، حالانکہ خالق کا مخلوق میں حلول ماننا بہت بڑی گمراہی، نادانی اور سراسر کفر ہے، قرآنِ پاک کے بیان کے مطابق شرک کی یہ قسم کفر میں داخل ہے، قرآنِ پاک میں فرمایا گیا:

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ﴾ (المائدة:۷۲)

’’بالیقین جنہوں نے عیسیٰ ابن مریم کو اللہ قرار دیا انہوں نے کفر کیا۔‘‘

اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں شرک کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر کو بھی

معبود اور لائق عبادت سمجھنا، جیسے نصاریٰ کے ایک فرقہ کا یہ عقیدہ کہ معبود تین ہیں: ان میں سے ایک تو اللہ تعالیٰ ہیں، دوسرے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور تیسرے ان کی والدہ سیدہ مریم علیہا السلام ہیں۔ ظاہر ہے کہ غیر اللہ کو معبود سمجھنا بھی سراسر کفر ہے، قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا إِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ وَ مَا مِنْ إِلٰهٍ إِلَّا إِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾ (المائدة:۷۳)

’’بالیقین انہوں نے بھی کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تین معبودوں میں سے ایک معبود ہیں، حالانکہ ایک (اللہ) کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔‘‘

اللہ تعالیٰ کی صفات اور اختیارات میں شریک کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو صفات و اختیارات اللہ رب العزت کی ذات کے ساتھ خاص ہیں ان میں کسی غیر (نبی یا ولی وغیرہ) کو شریک کرنا بھی شرک ہے، مثلاً ’’عَالِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ‘‘ یعنی ماضی، حال اور مستقبل کی تمام کھلی چھپی باتوں کا علم صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، قرآنِ کریم نے حق تعالیٰ کی اس خاص صفت کا اجمالی تذکرہ اس طرح فرمایا:

﴿وَ أَنَّ اللّٰهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا﴾ (الطلاق:۱۲)

’’اس کا علم (تمام موجودات، معدومات، ممکنات اور ممتنعات غرض) ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔‘‘

اسی کو ذرا وضاحت کے ساتھ فرمایا:

﴿يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ وَ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۝﴾ (التغابن:۴)

’’وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہ ان تمام باتوں کو بھی جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو اور وہ دلوں کے راز بھی جانتا ہے۔‘‘

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ إِلَّا هُوَ ۭ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ۭ وَ مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَ لَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْأَرْضِ وَ لَا رَطْبٍ وَّ لَا يَابِسٍ إِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝﴾ (الأنعام:۵۹)

''اسی کے ہاتھ میں غیب کی چابیاں ہیں، اس کے علاوہ انہیں کوئی نہیں جانتا، اسے خشکی اور تری کی تمام چیزوں کا علم ہے اور درخت سے گرنے والے پتے پتے کا بھی اسے علم ہے، زمین کی اندھیریوں میں جو دانہ گرتا ہے اور کوئی تر یا خشک چیز جہاں بھی ہے وہ سب کتابِ مبین یعنی لوحِ محفوظ میں موجود ہے۔''

ان تمام باتوں کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، اس صفت میں اس کا کوئی شریک نہیں، اسی طرح مختارِ کل ہونا، فعال لما یرید ہونا، علی کل شيءٍ قدیر ہونا یہ سب اس کی مخصوص صفات ہیں، ان میں بھی کسی غیر کو شریک کرنا شرک ہے۔

شرک کی ابتدا غلو فی المحبۃ سے ہوئی:

غور کیا جائے تو شرک کی ابتدا غلو فی المحبۃ سے ہوئی ہے، ہر زمانہ میں جب کبھی لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے نبیوں اور ولیوں کے ساتھ محبت میں غلو سے کام لیا تو یہ محبت میں حد تجاوزی ہی شرک کا سبب بن گئی، چنانچہ امام بغویؒ کے بقول حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیانی زمانہ میں ''وَدّ، سُواع، یَغُوث، یَعُوق اور نَسر'' نامی پانچ اللہ تعالیٰ کے نیک صالح بندے گزرے، ان کے زمانے میں لوگ ان کے بڑے معتقد اور متبع تھے، ان کی یکے بعد دیگرے وفات کے بعد لوگ اُن ہی کے نقش قدم پر اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت کرتے رہے، ایک عرصہ گزر جانے کے بعد شیطان نے کسی خیر خواہ کی شکل میں آکر ان کو سمجھایا کہ اپنے جن بزرگوں کے نقش قدم پر تم عبادت کرتے ہو اگر عبادت کے وقت ان کی تصویریں بنا کر سامنے رکھ لو تو اس سے عبادت میں کمال اور خشوع وخضوع پیدا ہو جائے گا، لوگ شیطان کے فریب میں آکر اپنے بزرگوں کے مجسمے بنا کر عبادت کے وقت انہیں اپنے

سامنے رکھ کر عبادت کرنے لگے، جس سے انہیں عبادت میں ایک خاص کیفیت، حلاوت اور لذت کا احساس ہوا، یہاں تک کہ اسی حال میں یہ تمام لوگ اپنے اپنے وقت پر انتقال کر گئے اور بالکل نئی نسل نے ان کی جگہ لے لی، تو کچھ عرصہ کے بعد پھر شیطان کسی خیر خواہ کی شکل میں آیا اور اس نئی نسل کے لوگوں سے کہنے لگا کہ تمہارے باپ دادا اِن ہی مجسموں کی عبادت کیا کرتے تھے، لہٰذا تم بھی ان ہی کی عبادت کرتے رہو، یہ شیطانی سبق انہیں اِتنا پختہ یاد ہو گیا کہ باہم معاہدہ کرتے ہوئے کہنے لگے:

﴿ وَ قَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَ لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّ لَا سُوَاعًا ۙ وَّ لَا يَغُوْثَ وَ يَعُوْقَ وَ نَسْرًا ۝﴾ (نوح:۲۳)

''اپنے ان معبودوں کو بالخصوص ودّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کی عبادت کو ہرگز نہ چھوڑنا۔''

اور اس طرح محبت کے عنوان سے شرک دنیا میں آیا اور بت پرستی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ (مستفاد از: معارف القرآن: ۸/۵۶۶ تا ۵۶۷)

شرک محبت کے راستے سے آیا ہے:

اسی طرح قرآنی صداقتوں کے حوالے سے یہودیوں اور نصرانیوں کے احوال کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے نبیوں اور ولیوں کے ساتھ محبت میں اس قدر غلو سے کام لیا کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے مانند یا اللہ تعالیٰ کا اَوتار و اولاد قرار دیا، جو شرک ہے، جیسے نصرانیوں نے حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کے متعلق کہا تھا: ﴿إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ بْنُ مَرْيَمَ﴾ (المائدة:۷۲) نیز نصرانیوں کے ایک فرقہ نے حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کو ابن اللہ اور یہودیوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ قرار دیا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ

﴿قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۚ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ۝﴾ (التوبۃ: ۳۰)

''(بعض) یہودی یہ کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور (بعض) نصرانی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں، حالانکہ یہ سب ان کے منہ کی بنائی ہوئی (بے حقیقت) باتیں ہیں، یہ ان لوگوں کی سی باتیں ہیں جو ان سے پہلے کافر ہو چکے ہیں، اللہ کی مار ہو اُن پر، یہ کہاں اوندھے بہکے جا رہے ہیں۔''

قرآنِ پاک کے بیان کے مطابق انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ولیوں اور اپنے رہبروں کو بھی خدا کا درجہ دے رکھا تھا:

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (التوبۃ: ۳۱)

ان کے خیالِ باطل میں وہ بھی خدا کی طرح تھے کہ جسے چاہیں حلال کر دیں اور جسے چاہیں حرام ٹھہرائیں، ظاہر ہے کہ یہ سب محبت میں حد سے بڑھ جانے کی وجہ سے ہوا۔

اس طرح یہود و نصاریٰ بھی غلو فی المحبۃ کے سبب کفر و شرک میں مبتلا ہوئے، نیز مشرکین مکہ بھی اسی غلو فی المحبۃ کے سبب غیر اللہ کی عبادت میں مبتلا ہو گئے، چنانچہ جب انہیں اللہ تعالیٰ ہی کو معبود، مسجود، مختارِ کل، حاجت روا اور مشکل کشا مان کر خالص اسی کی عبادت کی دعوت دی گئی تو انہوں نے کہا:

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ (زمر: ۳)

''ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کا زیادہ مقرب بنا دیں۔''

ہمارے یہ معبود اللہ تعالیٰ کے پیارے ہیں، لہٰذا ہماری ان کے آگے اور ان کی اللہ تعالیٰ کے آگے، وہ ہماری سنتا نہیں اور ان کی ٹھکراتا نہیں! ظاہر ہے کہ مشرکین کی یہ گمراہ کن سوچ غلو فی المحبۃ کا نتیجہ ہے۔ آج بھی جو لوگ بزرگوں کے مزارات پر سجدے کرتے ہیں، ان کے نام کی نذر و نیاز کرتے ہیں، ان سے دعائیں اور منتیں مانگتے ہیں، ولیوں کا مرتبہ نبیوں کے

برابر اور نبیوں کا مرتبہ خدا کے برابر سمجھتے ہیں تو یہ بھی غلو فی المحبۃ کا اثر ہے۔

اس بنا پر عاجز کا خیالِ ناقص یہی ہے کہ دنیا میں شرک اکثر محبت کے راستے سے آیا ہے، اگر محبت میں آدابِ محبت کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو یہ محبت ضلالت اور شرک کا سبب بن جاتی ہے، اس لیے مولانا حالیؔ مرحوم نے کیا خوب کہا ہے:

ہو جس میں عبادت کا دھوکہ مخلوق کی وہ تعظیم نہ کر　　جو خاص خدا کا حصہ ہے، بندوں میں وہ تقسیم نہ کر

اولیاء اللہ کو سجدہ کرنے والا فرعون سے زیادہ احمق ہے:

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ فرماتے تھے کہ ''جو شخص اولیاء اللہ کو سجدہ کرے وہ اس شخص سے زیادہ احمق ہے جو فرعون کو سجدہ کرے، ظاہر ہے کہ ایک بادشاہ کے سامنے دو شخص ہوں، جن میں سے ایک تو کہتا ہے کہ میں بادشاہ ہوں اور دوسرا ہاتھ جوڑے کھڑا ہے کہ میں غلام ہوں، اب تین شخص آئے، ان میں سے ایک نے تو بادشاہ کو بادشاہ تسلیم کیا اور اس شخص کو جو بادشاہی کا دعویٰ کرتا ہے باغی سمجھا اور خود کو غلام سمجھنے والے کو غلام سمجھا تو یہ شخص منصف اور عاقل ہے، آنے والوں میں دوسرے شخص نے باغی کو بادشاہ سمجھ کر اس کی اطاعت کی اور بادشاہ کی پرواہ نہ کی، تو یہ شخص سرکش اور باغی ہے، تیسرے شخص نے غلام کو بادشاہ سمجھ لیا، تو یہ احمق ہے، کیوں کہ وہ فرعون جو ﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ کا دعویٰ کرتا تھا اس کے اس دعویٰ سے کوئی دھوکہ میں آ گیا تو اس پر اتنا تعجب نہیں، جتنا اس آدمی پر ہے جو اولیاء اللہ کو سجدہ کرنے والا ہے، اس لیے کہ وہ تو اللہ کی غلامی اور بندگی کے مقر ہیں، اس کے باوجود ان کو سجدہ کرنا بڑی حماقت ہے''۔ (مستفاد از: خطباتِ حکیم الاسلام: ۷/ ۵۰۷)

شرک بغاوت ہے:

محبت کے راستے سے آنے والا شرک بھی دراصل اللہ جل شانہٗ سے بغاوت ہے،

جولوگ اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی عبادات اور مخصوص صفات واختیارات میں کسی غیر کو شریک ٹھہراتے ہیں ان کی مثال ان باغیوں کی سی ہے جو کسی منظّم اور با قاعدہ حکومت میں رہ کر اسی حکومت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں، بغاوت کرنے والوں کے جذبات خواہ کتنے اچھے کیوں نہ ہوں؟ مگر کوئی منظّم حکومت اپنے خلاف بغاوت کو لمحہ بھر بھی برداشت نہیں کرسکتی، اسی طرح جو لوگ شرک کرتے ہیں درحقیقت وہ لوگ بھی زمین وآسمان میں اللہ تعالیٰ کی پھیلی ہوئی حکومت میں رہ کر غیر اللہ کی عبادت کر کے اس کے خلاف بغاوت کرتے ہیں، ساری نعمتیں اللہ تعالیٰ کی استعمال کریں اور عبادت غیر اللہ کی کریں تو اس بغاوت کو کیوں کر برداشت کیا جاسکتا ہے؟ یا جیسے ایک بیوی شوہر کے گھر میں رہ کر تمام چیزیں اسی کی دی ہوئی استعمال کرے؛ لیکن شوہر کے علاوہ سے دل لگائے اور یکجائی بن کر رہنے کے بجائے ہرجائی بن جائے تو یہ جرم بھی ناقابل برداشت ہے، ٹھیک اسی طرح بندہ بھی یکجائی بن کر رہنے کے بجائے ہرجائی بن جائے تو یہ جرم ناقابل برداشت ہے۔ ہمارے شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیمؒ نے فرمایا کہ ’’جو فرق زانیہ اور عفیفہ میں ہے وہی فرق مشرک اور موحّد میں ہے، کیوں کہ شرک صرف گناہ نہیں؛ بلکہ غداری بھی ہے، اور جس طرح ہم اپنے غداروں کو معاف نہیں کرتے اللہ تعالیٰ بھی اپنے غداروں کو معاف نہیں کرتا۔‘‘

شرک جرمِ عظیم ہے:

حضرت لقمانؒ نے اپنے بیٹے کو جو نصائح کیں ان میں بطورِ خاص یہ نصیحت بھی تھی:

﴿ یٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝﴾ (لقمان:١٣)

’’میرے پیارے بیٹے! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانا (نہ اعتقادیات میں، نہ عبادات واختیارات میں) بلاشبہ شرک ظلم عظیم ہے۔‘‘

ظلم کی حقیقت ’’وَضْعُ الشَّيْءِ فِيْ غَيْرِ مَحَلِّهٖ‘‘ ہے، مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کو اس کی حقیقت کے خلاف بے محل استعمال کرنا ظلم ہے، تو اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوسکتا ہے کہ بندہ

اپنے حقیقی خالق و مالک اور معبود کو چھوڑ کر اپنے جیسی مخلوق کی عبادت کرنے لگے، نیز اپنے خالق و معبود کے مرتبہ کو گھٹا کر مخلوق کے برابر کردینا اور مخلوق کے مرتبہ کو بڑھا کر خالق و معبود کے برابر کردینا ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟ اس لیے شرک جرمِ عظیم بھی ہے اور ظلمِ عظیم بھی۔

شرک کا خسارہ:

اس جرم کا پہلا نقصان تو یہ ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے مشرک کے تمام نیک اعمال اور ان کا اجر ضائع ہوجاتا ہے، قرآنِ پاک میں حق تعالیٰ نے اپنے اولوالعزم پیغمبروں کا تذکرہ کرنے کے بعد ارشاد فرمایا:

﴿ وَ لَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾ (الأنعام:٨٨)

’’اگر بالفرض یہ حضرات بھی شرک کرتے تو ان کے تمام اعمال ضائع ہوجاتے۔‘‘

ایک مقام پر خود امام الانبیاء ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

﴿ وَ لَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَ اِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝﴾ (زمر:٦٥)

’’محبوبم! ہم نے آپ کی طرف بھی اور آپ سے پہلے تمام انبیاء ورُسل کو بھی یہ وحی بھیجی کہ اگر تم نے بھی شرک کیا تو تمہارے اعمال ضائع ہوجائیں گے اور تم نقصان اٹھانے والوں میں شمار ہوں گے۔‘‘

حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب فرماتے ہیں کہ ’’ایک خسارہ یہ ہے کہ ایک شخص سرے سے کماتا ہی نہیں، یہ شخص خسارے میں ہے، لیکن دوسرا خسارہ یہ ہے کہ ایک شخص دِن بھر محنت ومزدوری کرتا ہے، سارا دن مشقت اُٹھا کر کمائی کرتا ہے، لیکن اپنی کمائی کی حفاظت نہیں کرپاتا، اور وہ گھر پہنچنے سے قبل راستے ہی میں کہیں ضائع ہوچکی ہوتی ہے، یہ دوسرا شخص پہلے کے مقابلہ میں زیادہ خسارہ میں ہے، اور اس نے زیادہ نقصان اُٹھایا ہے کہ محنت ومشقت بھی کی، لیکن اپنی محنت کی کمائی سے ضرورت کے وقت فائدہ نہیں اُٹھاسکا۔

یہی بات قرآنِ کریم نے نیکیوں کے بارے میں فرمائی ہے کہ جو شخص سرے سے نیکی نہیں کرتا وہ خسارہ میں ہے، لیکن جو بندہ نیکیاں کر کے انہیں برباد کر دیتا ہے وہ اس سے زیادہ خسارہ میں ہے، نیکی وہ کام آنے والی ہے جو آخرت کے حساب وکتاب تک انسان کے ساتھ رہے، اور جو راستے ہی میں کہیں برباد ہو جائے وہ کسی کام کی نہیں ہے، بلکہ بسا اوقات وَبال کا باعث بھی بن سکتی ہے، قرآنِ کریم نے ایسے متعدد افعال واعمال کی نشان دہی کی ہے جو نیکیوں کو برباد کر دیتے ہیں، جس طرح بعض وائرس کمپیوٹر کے پروگراموں کو خراب کر دیتے ہیں اور انسان کا کیا ہوا کام ضائع ہو جاتا ہے، بالکل اسی طرح بعض اعمال ایسے ہیں جن کے ارتکاب سے بندہ کی نیکیاں ختم ہو جاتی ہیں اور حاصل کیا ہوا ثواب برباد ہو جاتا ہے، مثلاً شرک کے بارے میں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اس سے اعمال حبط ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ اللہ رب العزت نے خود جناب نبی کریم ﷺ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

﴿لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ (الزمر:۶۵)

’’اگر آپ شرک کریں گے تو آپ کے اعمال بھی حبط ہو جائیں گے اور آپ ضرور خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔‘‘

اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدانخواستہ جناب نبی کریم ﷺ سے شرک کا صدور ممکن ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر معصوم ہوتے ہیں، ان سے شرک کے ارتکاب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس آیت کریمہ کے ذریعہ ہمیں سمجھانا مقصود ہے کہ شرک اِتنا سنگین جرم اور خطرناک وائیرس ہے کہ اگر بفرضِ محال سرورِ کائنات ﷺ سے بھی سرزد ہو جائے تو اُن کے اعمال بھی حبط ہو جائیں گے۔

مشرک اَجر وثواب اور مغفرت سے محروم رہے گا:

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ شرک ایسا عمل ہے جو نیکیوں کو برباد کر دیتا ہے، ثواب کو کھا جاتا ہے، اور بندہ کے کیے ہوئے اعمال شرک کی نحوست سے غارت ہو جاتے ہیں۔

شرک کا مرتکب اگر توبہ کے بغیر مر گیا تو وہ اللہ تعالیٰ کی معافی اور مغفرت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائے گا، قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰى إِثْمًا عَظِيْمًا﴾ (النساء:۴۸)

’’بالیقین اللہ شرک کرنے والے کو نہیں بخشے گا، اس کے علاوہ جسے چاہے گا بخش دے گا، اور مشرک بہت بڑے جرم کا مرتکب ہوا ہے۔‘‘

غور کرنے کا مقام ہے کہ حضراتِ انبیاءِ کرام علیہم السلام تو گناہوں تک سے معصوم ہوتے ہیں، شرک کی بات تو بہت دور کی ہے، شرک کا صدور ان سے نہیں ہو سکتا، اس کے باوجود ان سے یہ بات تعلیم امت کے لیے کہی گئی ہے کہ علیٰ فرض المحال اگر نبی سے بھی شرک کا صدور ہو جائے (نعوذ باللہ) تو ان کے اعمالِ صالحہ اور ان کا اَجر وثواب ضائع ہو جائے گا، تو غیر نبی کا شرک تو بدرجہ اولیٰ اس کے اعمال کے اَجر وثواب کو ضائع کر دے گا۔ الغرض شرک کا ارتکاب اعمال کے اَجر وثواب کو ضائع کر دیتا ہے۔

شرک کے علاوہ کتنے ہی جرائم کیوں نہ کیے ہوں؟ بہر حال معافی مل جائے گی، لیکن شرک اتنا خطرناک جرم ہے کہ اس جرم کا مرتکب اَجر وثواب اور معافی ومغفرت سے محروم ہو جاتا ہے، ایک حدیث قدسی میں ہے:

عَنْ أَبِيْ ذَرٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ’’يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى: مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ أَمْثَالِهَا وَ أَزِيْدُ، وَ مَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ مِثْلُهَا، أَوْ أَغْفِرُ، وَ مَنْ تَقَرَّبَ مِنِّيْ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ مِنْهُ ذِرَاعًا، وَ مَنْ تَقَرَّبَ مِنِّيْ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ مِنْهُ بَاعًا، وَ مَنْ أَتَانِيْ يَمْشِيْ أَتَيْتُهٗ هَرْوَلَةً، وَ مَنْ لَقِيَنِيْ بِقُرَابِ الْأَرْضِ خَطِيْئَةً لَا يُشْرِكُ بِيْ شَيْئًا لَقِيْتُهٗ بِمِثْلِهَا مَغْفِرَةً.‘‘ (رواه مسلم، مشكوٰة:۱۹۶/ باب ذكر الله عزّ وجل و التقرّب إليه)

(حدیث قدسی نمبر:۲)

’’حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو شخص ایک نیکی لے کر آئے گا اس کے لیے دس کے برابر

ثواب ہے، اور میں اس سے بھی زیادہ (جس قدر اخلاص ہو) ثواب عطا کرتا ہوں، اور جو شخص کوئی برائی لے کر آئے گا تو اسی کے بقدر سزا دیتا ہوں یا بخش دیتا ہوں، اور جو شخص میری اطاعت کے ساتھ ایک بالشت بھی آگے بڑھتا ہے تو میں (اپنی رحمت کے ساتھ) اس کی طرف ایک گز قریب ہوتا ہوں، اور جو بندہ میری طرف ایک گز قریب ہوتا ہے تو میں اس کی طرف دونوں ہاتھ پھیلانے کی مقدار قریب ہوتا ہوں، اور جو بندہ میری طرف چل کر آتا ہے میں اس کے پاس دوڑ کر آتا ہوں، اور جو بندہ میرے پاس زمین بھر کر گناہ لے کر آئے گا بشرطیکہ اس نے شرک نہ کیا ہو تو (میں اگر چاہوں گا تو) اس کو زمین کے برابر ہی مغفرت عطا کروں گا۔''

معلوم ہوا کہ مشرک کے علاوہ کوئی بندہ خواہ کتنا ہی بڑا گنہگار کیوں نہ ہو، اسے معافی مل سکتی ہے۔

ربِ کریم کی بخشش کا انوکھا واقعہ:

اس سلسلہ میں ربِ کریم کی بخشش کا ایک انوکھا واقعہ ایک حدیث قدسی میں بیان ہوا ہے کہ زمانۂ فترت میں (جس وقت کوئی نبی نہیں تھا اس وقت صرف توحید کافی تھی۔ مظاہر حق جدید:۲/۶۴۰) ایک شخص بہت سے گناہوں کا مرتکب تھا، جب اس کی موت کا وقت آیا تو اس نے اپنے بیٹوں کو (مغلوب الحال یا مغلوب العقل ہونے کی حالت میں) (مستفاد از: مظاہر حق جدید:۲/۶۴۰) وصیت کی کہ جب اس کا انتقال ہو جائے تو اسے جلا دیا جائے، پھر آدھی راکھ جنگل میں اور آدھی راکھ دریا میں ڈال دی جائے، اس نے یہ وصیت اس لیے کی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی شان اور قدرت سے ناواقف تھا، وہ سمجھ رہا تھا کہ عذاب اُسی کو ہوگا جو دفن کیا جائے، مرنے کے بعد اس کے بیٹوں نے وصیت پر عمل کیا، تو حق تعالیٰ نے — جو فعال لما یرید اور علی کل شيء قدیر ہے — دریا کو حکم فرمایا کہ اس کی راکھ جمع کر، اور جنگل کو بھی حکم فرمایا کہ اس کی راکھ جمع کر، دریا اور جنگل نے اس کے تمام اجزاء جمع کیے اور وہ شخص دوبارہ زندہ اور درست ہوگیا۔ ''ثُمَّ قَالَ لَهٗ: لِمَ فَعَلْتَ هٰذَا؟'' پھر حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ تو نے ایسی

وصیت کیوں کی تھی؟ ''قَالَ: مِنْ خَشْيَتِكَ يَا رَبِّ'' (متفق علیہ، مشکوٰۃ:۲۰۷) عرض کیا: اے میرے رب! تیرے ڈر سے یہ کیا تھا۔ ''وَ أَنْتَ أَعْلَمُ'' تو تو جانتا ہی ہے، بس، وہاں تو بخشش کا بہانہ چاہیے تھا، محض اِتنی سی بات پر اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرما دی۔ (حدیث قدسی نمبر:۳)

ظاہر ہے کہ گناہوں کے باوجود اس کی مغفرت صرف اسی لیے ہوگئی کہ کم از کم وہ موحد تھا، مشرک نہ تھا، مشرک تو قیامت میں مغفرت سے محروم ہی رہے گا۔

مشرک پر جنت حرام ہے:

قیامت کے دِن مشرک مغفرت سے محروم رہے گا تو اس کا مطلب صاف ہے کہ وہ جنت سے بھی محروم رہے گا، اسی کو قرآنِ پاک نے بیان کیا:

﴿إِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَأْوٰهُ النَّارُ ۖ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ أَنْصَارٍ ۝﴾ (المائدة:۷۲)

''مشرک پر جنت حرام ہے، اس کا ٹھکانہ جہنم ہے، جہاں ان ظالموں کا کوئی یار و مددگار نہ ہوگا۔''

ثابت ہوگیا کہ مشرک کے لیے جہنم یقینی ہے اور غیر مشرک کے لیے جنت یقینی ہے، اسی کو مذکورہ حدیث میں فرمایا:

''مَنْ مَاتَ يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ النَّارَ، وَ مَنْ مَاتَ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ.''

''شرک پر مرنے والا لازمی اور دائمی طور پر دوزخ میں جائے گا، جب کہ توحید پر مرنے والا لازمی اور یقینی طور پر جنت میں جائے گا۔''

ایک دوسری حدیث میں مروی ہے، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک سفر کے دوران سواری کے گدھے پر میں اللہ کے رسول ﷺ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا، اور ہمارے درمیان صرف کجاوے کی لکڑی حائل تھی، حضور ﷺ نے مجھ سے پوچھا:

"یَا مُعَاذُ ! هَلْ تَدْرِیْ مَا حَقُّ اللّٰهِ عَلیٰ عِبَادِهٖ؟ وَ مَا حَقُّ الْعِبَادِ عَلَی اللّٰهِ؟"

''اے معاذ! کیا تمہیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر اور بندوں کا اللہ تعالیٰ پر کیا حق ہے؟''

میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"فَاِنَّ حَقَّ اللّٰهِ عَلَى الْعِبَادِ اَنْ يَعْبُدُوْهُ وَ لَا يُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا، وَ حَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللّٰهِ اَنْ لَا يُعَذِّبَ مَنْ لَا يُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا." (متفق علیه، مشکوٰۃ: ١٤/ کتاب الإیمان)

''اللہ تعالیٰ کا بندوں پر حق یہ ہے کہ وہ اسی کی عبادت کریں (اس کی ذات میں، اس کی عبادات میں اور مخصوص صفات و اختیارات میں کسی کو بھی شریک نہ کریں) جب بندے اللہ تعالیٰ کا یہ حق ادا کریں گے تو پھر اللہ تعالیٰ پر بندوں کا یہ حق ہے کہ جس نے بھی شرک نہ کیا ہو اس کو اپنے (دائمی) عذاب سے بچالے۔''

خلاصہ یہ ہے کہ شرک اتنا خطرناک جرم ہے کہ اس میں معافی کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے، البتہ بندہ اگر شرک اور اس کے لوازمات سے بچ جائے تو خواہ کتنا ہی گنہگار کیوں نہ ہو معافی ضرور مل جائے گی۔

حق تعالیٰ ہماری اور ساری امت مسلمہ کی شرک اور اس کے لوازمات سے دائمی حفاظت فرمائے۔ آمین۔

١٦/ رمضان المبارک/ ١٤٣٩ھ/ قبل الجمعہ

یکم/ جون/ ٢٠١٨ء (بزمِ صدیقی، بڑودا)

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيْرًا   فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيْرًا كَثِيْرًا

(۳)

بڑوں کا بچپن

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا، وَ لَمْ يُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا، وَ يَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ."

(رواه الترمذی، مشکوٰۃ: ٤٢٣/ باب الشفقة والرحمة على الخلق/ الفصل الثانی)

''حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ شخص ہم میں سے نہیں (مراد ہماری اتباع کرنے والوں یا ہمارے طریقوں پر چلنے والوں میں سے نہیں) جو ہمارے چھوٹوں (بچوں یا عمر اور مرتبہ میں چھوٹوں) پر رحم نہ کرے اور بڑوں کی تعظیم نہ کرے، نیز امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کرے۔''

بچہ انسانی چمن کا پھول ہے:

اللہ رب العزت نے بچوں کو انسانی چمن کا بہترین پھول بنایا ہے، یہی وجہ ہے کہ عموماً پیار و محبت میں بچوں کو پھول سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ پھر یہ ایک حقیقت ہے کہ چمن اور باغ کی زینت و رونق پھولوں سے ہوتی ہے تو انسانی سماج اور گھروں کی زینت اور رونق بھی بچوں سے ہوتی ہے، پھول کے بغیر چمن ویران ہے تو بچہ کے بغیر گھر بھی ویران ہے، پھول تو

پھول ہی ہوتا ہے، جس سے ہر کوئی محبت کرتا ہے، اسی طرح بچہ تو بچہ ہی ہوتا ہے، اس سے بھی ہر کوئی محبت کرتا ہے، بالخصوص ماں باپ کو اپنے بچوں سے جو محبت ہوتی ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے، بچوں کی یہ محبت ماں باپ کو بخل اور بزدلی پر مجبور کرتی ہے، چنانچہ حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أُتِيَ بِصَبِيٍّ، فَقَبَّلَهُ، فَقَالَ:" أَمَا إِنَّهُمْ مَبْخَلَةٌ مَجْبَنَةٌ، وَ إِنَّهُمْ لَمِنْ رَيْحَانِ اللّٰهِ."

(رواه البغوی فی شرح السنة، مشکوٰة:۴۰۲ / باب المصافحة والمعانقة)

''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں ایک بچہ لایا گیا، تو آپ ﷺ نے پیار و محبت کے جذبہ سے اسے بوسہ دیا اور فرمایا کہ ''اولاد بخل اور بزدلی کا باعث ہے، اور بلاشبہ بچے اللہ کے پھول ہیں۔''

مراد یہ ہے کہ بچے اللہ تعالیٰ کا عظیم انعام وعطیہ ہیں، یا بچوں کی مثال پھول کے مانند ہے، جیسے پھول کو دیکھ کر ہر کوئی خوش ہوتا ہے اور اس سے محبت کرتا ہے اسی طرح بچوں کو دیکھ کر ہر کوئی خوش ہوتا ہے اور ان سے محبت کرتا ہے۔

بچوں سے محبت کی وجہ:

علاوہ ازیں بچوں سے محبت کی ایک دوسری وجہ ان کی معصومیت اور گناہ سے پاک ہونا بھی ہے، بچوں کو اللہ رب العالمین نے معصوم اور بے گناہ بنایا ہے، حتیٰ کہ اگر ان سے دورِ طفولیت و معصومیت میں کوئی گناہ سرزد ہو بھی جائے تو وہ لکھا نہیں جاتا۔ حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثٍ، عَنِ النَّائِمِ حَتّٰى يَسْتَيْقِظَ، وَ عَنِ الصَّبِيِّ حَتّٰى يَبْلُغَ، وَ عَنِ الْمَعْتُوْهِ حَتّٰى يَعْقِلَ."

(رواه الترمذی، مشکوٰة:۲۸۴ / باب الخلع والطلاق / الفصل الثانی)

''تین قسم کے لوگ مرفوع القلم ہیں، یعنی اُن سے قلم اُٹھا لیا گیا ہے کہ ان سے اگر کوئی گناہ سرزد ہو بھی جائے تو اسے لکھا نہیں جاتا اور قیامت میں ان سے کوئی مؤاخذہ اور محاسبہ بھی نہ ہوگا، نمبر: (۱) سونے والا، یہاں تک کہ وہ بیدار ہو جائے (۲) بچہ، یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائے (۳) بے عقل، یہاں تک کہ وہ عاقل ہو جائے۔''

علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے:

میرے بچپن کے دن بھی کیا خوب تھے اقبال
بے نمازی بھی تھا اور بے گناہ بھی

پھر اگر انسانی چمن کے ان پھولوں کی حفاظت کی جائے، مطلب یہ ہے کہ بچوں کی دورِ طفولیت و معصومیت ہی میں صحیح تعلیم و تربیت کی جائے تو آج کا بچہ مستقبل کا بڑا اور پہلے اپنے رب کا اور ثانیاً سب کا محبوب بن جائے گا۔ اس حقیقت کو قرآنِ کریم نے یوں بیان کیا:

﴿ إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴾ (مریم:۹۶)

''بالیقین جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کیے رحمٰن ان کے لیے محبت پیدا فرمادے گا۔''

یہ مضمون ایک حدیث قدسی میں بھی وارد ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" إِنَّ اللّٰهَ إِذَا أَحَبَّ عَبْدًا دَعَا جِبْرِيْلَ، فَقَالَ: إِنِّيْ أُحِبُّ فُلَانًا، فَأَحِبَّهُ، قَالَ: فَيُحِبُّهُ جِبْرِيْلُ، ثُمَّ يُنَادِيْ فِي السَّمَاءِ، فَيَقُوْلُ: إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ فُلَانًا فَأَحِبُّوْهُ، فَيُحِبُّهُ أَهْلُ السَّمَاءِ، ثُمَّ يُوْضَعُ لَهُ الْقَبُوْلُ فِي الْأَرْضِ......الخ" (رواه مسلم، مشکوٰة:۴۲۵ / باب الحبّ فی اللّٰه و من اللّٰه)
(حدیث قدسی نمبر:۴)

''جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتے ہیں (اس کے ساتھ خصوصی عنایت، رحمت اور ہدایت کا ارادہ فرماتے ہیں) تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بلا کر فرماتے ہیں کہ مجھے فلاں بندے سے محبت ہے تو تم بھی اس سے محبت کرو، پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، اور آسمانوں میں اس کی محبت کا اعلان کر دیا جاتا ہے، جس کی

وجہ سے تمام آسمان والے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، اس کے بعد زمین میں بھی اس بندہ کے لیے محبت ومقبولیت عام کر دی جاتی ہے، پھر اہل زمین بھی اس کے ساتھ دل سے محبت کرتے ہیں۔‘‘

اس بنا پر عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ بچہ اگر چہ گناہوں سے محفوظ تو نہیں ہوتا؛ لیکن بفضلہٖ تعالیٰ گناہوں سے پاک ضرور ہوتا ہے، اس لیے بھی من جانب اللہ ولیوں کی طرح بچوں کی محبت دلوں میں ڈال دی جاتی ہے۔

آج کا بچہ مستقبل کا بڑا کیسے بن سکتا ہے؟

انسان کے ایمان اور ایمانی زندگی میں بچپن (جو ولادت سے شروع ہو کر بلوغ تک رہتا ہے) کی صحیح تعلیم وتربیت اور اس سے زیادہ نیک ماحول، اچھی صحبت اور والدین کی اولاد کے حق میں کی جانے والی دعاؤں کو بہت زیادہ دخل ہے، یہ حقیقت ہے کہ جس بچے کو بچپن میں صحیح تعلیم وتربیت، اچھا ماحول اور اچھی صحبت کے ساتھ والدین کی دعائیں ملتی ہیں عموماً ایسے بچے کا بچپن سنور جاتا ہے، پھر یہی آج کا بچہ مستقبل میں بڑا بن جاتا ہے، اس لیے مشہور ہے کہ ’’بچپن کا اثر پچپن تک رہتا ہے۔‘‘ ہمارے اکابر کا بچپن اپنے دور کے بچوں سے ممتاز اور قابل رشک اس لیے بھی تھا کہ حق تعالیٰ نے اپنی خاص عنایت ورحمت سے انہیں ایسے والدین یا اولیاء عطا فرمائے تھے جنہوں نے ان کی صحیح تعلیم وتربیت کی خصوصی فکر کے ساتھ انہیں نیکی والا مبارک ماحول دیا، جس کی وجہ سے ان کے اندر بچپن ہی سے نیکی کا جذبہ پیدا ہوا، پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ آج اس کی بڑی کمی ہے۔

آج نہ تعلیم ہے نہ تربیت، نہ نیک ماحول ہے نہ دعا، پھر بچے اچھے کیسے بنیں گے؟ والدین بالخصوص مائیں اس کی فکر کریں تو اس کا بڑا اچھا ثمرہ ونتیجہ ظاہر ہوگا، بہ قولِ شاعر:

نیک ماؤں سے ہوتی ہے تعلیم وتربیت کی ابتدا
نیک ماؤں کی آغوش ہے سب سے پہلا مدرسہ

اس مدرسے میں بچہ جو کچھ سیکھتا ہے وہ زندگی بھر نہیں بھولتا۔ خواجہ نظام الدینؒ فرماتے ہیں کہ بچپن میں میری والدہ کا معمول تھا کہ جس دن کھانے کو کچھ نہ ہوتا تو والدہ فرماتیں: ’’آج ہم سب اللہ پاک کے مہمان ہیں۔‘‘ فرماتے ہیں کہ مجھے والدہ کا یہ جملہ سن کر بڑا مزہ آتا، ایک مرتبہ ایک شخص بہت سا غلہ دے گیا، جس کی وجہ سے ہمارے گھر مسلسل روٹی پکتی رہی، تو مجھ تمنا ہونے لگی کہ والدہ یہ فرماتی تھیں کہ ’’آج ہم اللہ پاک کے مہمان ہیں‘‘ تو وہ دِن کب آئے گا۔ (تاریخ دعوت وعزیمت)

اسی طرح ایک بچے نے ماں سے کہا: امی! باہر کچرے والا آیا ہے، تو ماں نے کہا کہ بیٹا! کچرے والے تو ہم ہیں، وہ تو صفائی والا ہے۔ یہ ہے تعلیم وتربیت۔

جہاں تک ماحول کی بات ہے تو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بقول: ’’إِنَّمَا الْأَخْلَاقُ بِالْأَحْوَالِ، لَا بِالتَّعْلِيْمِ‘‘. کہ اخلاقی اصلاح کا انحصار بڑی حد تک ماحول پر ہے، نہ کہ تعلیم پر۔ اس لیے اپنے بچوں کو نیکی کی تعلیم وترغیب دینے سے زیادہ خود عملی زندگی اختیار کر کے نیکی والا ماحول دیجیے، اس سے ان میں نیکی کا جذبہ پیدا ہوگا۔ خیر القرون میں اگر بچوں کے اندر نیکی کا جذبہ تھا تو اس کی بڑی وجہ نیکی کا ماحول بھی ہے۔

اس کے ساتھ ان کے لیے راتوں کو اٹھ کر خوب گڑگڑا کر قرآنی دعا کا اہتمام کیجیے:

﴿ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَامًا ﴾ (الفرقان: ۷۴)

حضرت ابن عباسؓ کے بچپن کا واقعہ:

اس سلسلہ میں حضرت ابن عباسؓ کے بچپن کا ایک واقعہ بہترین مثال ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اپنے بچپن کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے اپنی خالہ ام المؤمنین حضرت میمونہؓ کے یہاں رات گزاری، حضور ﷺ بھی اس رات ان ہی کے یہاں تھے، میں نے دیکھا کہ حضور ﷺ تشریف لانے کے بعد کچھ دیر تو اپنی زوجۂ مطہرہ سے باتیں کرنے لگے، پھر سو گئے اور رات کے اخیری حصے میں اُٹھ کر بیٹھ گئے، پھر آسمان کی طرف

نظر فرما کر سورۂ آلِ عمران کے آخری رکوع کی تلاوت کرنے لگے،اس کے بعد وضو فرما کر نمازِ تہجد میں مشغول ہو گئے۔اس کا اثر حضرت ابن عباسؓ کے بقول یہ ہوا کہ میں بھی نیند سے بیدار ہوا اور حضور ﷺ کی طرح وضو کر کے آپ ﷺ کی بائیں طرف نمازِ تہجد کے لیے کھڑا ہو گیا۔حدیث میں ہے:

"فَقُمْتُ وَ تَوَضَّأْتُ، فَقُمْتُ عَنْ يَسَارِهِ". (متفق علیه، مشکوٰة : ١٠٦/ باب صلوٰة اللیل)

چوں کہ اس وقت حضرت ابن عباسؓ چھوٹے بچے تھے،آپ کو یہ معلوم نہ تھا کہ امام کے ساتھ اگر ایک ہی شخص نماز پڑھتا ہو تو اسے دائیں طرف کھڑا ہونا چاہیے،اس لیے جب آپ حضور ﷺ کی بائیں طرف کھڑے ہو گئے تو آپ نے حضرت ابن عباسؓ کا کان پکڑ کر دائیں طرف کھڑا فرما دیا،آگے حدیث میں نمازِ تہجد کے بعد حضور ﷺ کی دعا کا بھی ذکر ہے۔

اس واقعے میں جو بات قابلِ نصیحت ہے وہ یہ کہ حضرت ابن عباسؓ نے جب حضور ﷺ کو نمازِ تہجد ادا کرتے ہوئے دیکھا تو کسی حکم کے بغیر خود ہی حضور ﷺ کے ساتھ نمازِ تہجد پڑھنے کے لیے کھڑے ہو گئے،یہ ہے گھر کے نیک ماحول کا اولاد پر اچھا اثر۔

حضرت علیؓ کا بچپن:

واقعہ یہ ہے کہ بڑوں اور بزرگوں کا بچپن بھی ہمارے لیے اُسوہ،نمونہ اور مشعلِ راہ ہے،جن کے روشن بچپن کی شعاعِ نور فگن سے بھی روشنی حاصل کر کے صلاح وفلاح کی سرمدی ویقینی منزل تک پہنچا جا سکتا ہے،اسی جذبہ کے تحت حضرات صحابہؓ اور صلحاء میں سے اپنے چند بڑوں کے بچپن کا تذکرہ کیا جاتا ہے،جن میں سے سب سے زیادہ خوش نصیب حضرت علیؓ ہیں،کیوں کہ آپؓ کو بچپن ہی سے حضور ﷺ کی سرپرستی نصیب ہوئی،وہ اس طرح کہ آپؓ کے بچپن میں قریشِ مکہ قحط کی وجہ سے سخت پریشانی میں مبتلا ہوئے،حضرت علیؓ کے والد اور حضور ﷺ کے مربی ومشفق چچا خواجہ ابو طالب کثیر العیال تھے،قحط کی وجہ سے وہ بھی

مالی تنگی میں مبتلا ہوئے،دوسری طرف حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے سیدہ خدیجہؓ کے ساتھ نکاح کی برکت سے خوش حالی عطا فرمائی تھی،جس کی وجہ سے آپؐ نے اپنے دوسرے چچا حضرت عباسؓ سے مشورہ کیا اور فرمایا کہ ابو طالب کثیر العیال ہیں،اور قحط سالی کے سبب بہت پریشان ہیں،لہٰذا ان کے ایک بیٹے کی کفالت میں اپنے ذمہ لیتا ہوں اور ایک کی کفالت آپ کریں، تاکہ ان کو سہولت اور آسانی ہو جائے،حضرت عباسؓ نے اس رائے کو پسند فرمایا اور دونوں نے جناب ابو طالب کی خدمت میں حاضر ہو کر اِس کا اظہار کیا،تو ابو طالب نے کہا کہ عقیل کو تو میرے پاس رہنے دو،دیگر بیٹوں کے بارے میں تمہیں اختیار ہے،تو اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت علیؓ کی کفالت اپنے ذمہ لی اور حضرت عباسؓ نے حضرت جعفرؓ کی۔(معلوم ہوا کہ غریب رشتہ داروں کی کفالت کرنا بھی ہمارے نبی ﷺ کا طریقہ اور سنت ہے) تب ہی سے حضرت علیؓ حضور ﷺ کی کفالت وتربیت اور صحبت میں رہے،آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کی بہترین تربیت فرما کر اپنے چچا کے احسان کا بدلہ ادا فرمایا۔

یہ آپ ﷺ کی اعلیٰ تربیت اور نبوی گھرانے کے بابرکت ماحول کا نتیجہ تھا کہ نبوت ملنے کے بعد جب رحمتِ عالم ﷺ نے اسلام کی دعوت پیش فرمائی تو اس وقت آپؓ کی عمر تقریباً دس سال تھی؛لیکن اس کے باوجود آپؓ نے فوراً دعوتِ اسلام قبول فرمائی،حتیٰ کہ اس بارے میں آپؓ نے اپنے والد جو کہ قریش میں صاحب الرائے تھے ان سے بھی رائے لینا گوارہ نہیں کیا،اس طرح آپؓ ایمان لانے میں امت کے تمام بچوں پر فوقیت لے گئے،آپؓ کی عظمت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ بچوں میں سب سے پہلے ایمان آپؓ لائے اور اُمت کے عظیم بچوں میں آپؓ کا نام سرفہرست آ گیا،نیز حضور پاک ﷺ کے ساتھ سب سے پہلے نماز پڑھنے کا شرف بھی آپؓ ہی کو حاصل ہوا،آپؓ اللہ اور رسول ﷺ کے محبّ بھی تھے اور محبوب بھی۔اگر ہم بھی یہ مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں مؤمن صادق اور متبع سنت بننا چاہیے،کیوں کہ ارشادِ باری ہے:

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ (آل عمران : ٣١)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر مؤمن صادق اپنے درجۂ ایمانی کے مطابق اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا محبّ اور محبوب ہے۔ حق تعالیٰ ہمیں اپنا اور اپنے رسول ﷺ کا کامل اور مکمل محبّ اور محبوب بنالے۔ آمین۔

حضور ﷺ نے ساری زندگی آپؓ کے ساتھ فرزند کی طرح معاملہ فرمایا، یہاں تک کہ جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو اپنی سب سے چھوٹی اور چہیتی بیٹی فاطمہؓ سے عقد نکاح کروا کر حضرت علیؓ کو اپنے داماد ہونے کا شرف بھی عطا فرمایا، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ (نکاح کے بعد) حضور ﷺ نے آپؓ کو یہ دعا دی: "جَمَعَ اللّٰهُ شَمْلَكُمَا وَ أَسْعَدَ جَدَّكُمَا وَ بَارَكَ عَلَيْكُمَا وَ أَخْرَجَ مِنْكُمَا كَثِيْرًا طَيِّبًا." (مظاهر حق جديد:٥/٦٩٦)

حضرت علیؓ ساری زندگی تقریباً حضور ﷺ کے قریب رہے، سوائے تبوک کے تمام غزوات میں شریک رہ کر رسول اللہ ﷺ کے برابر معین رہے۔

حضرت علیؓ کے فضائل ومناقب:

یہی وجہ ہے کہ حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِیْ وَقَّاصٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِعَلِيٍّ ؓ: "أَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی، إِلَّا أَنَّهٗ لَا نَبِيَّ بَعْدِیْ."

(متفق عليه، مشكوٰة: ٥٦٣/ باب مناقب علي بن أبى طالبؓ)

"حضور پاک ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ تم میرے لیے ایسے ہی ہو جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے حضرت ہارون علیہ السلام تھے، مگر فرق اتنا ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔"

علماءِ محدثین نے اس کا شانِ ورود اس طرح بیان فرمایا ہے کہ حضور ﷺ کا معمول تھا کہ جب کسی سفر یا غزوہ میں تشریف لے جاتے تو مدینہ منورہ میں اپنی واپسی تک کے لیے کسی نہ کسی کو اپنا قائم مقام اور نائب مقرر کر جاتے، چنانچہ غزوۂ تبوک کے موقع پر آپ ﷺ

نے محمد بن مسلم انصاریؓ کو مدینہ منورہ کا والی اور صوبہ دار، سباع بن عرفطہؓ کو کوتوال، عبداللہ ابن اُم مکتومؓ کو امام اور حضرت علیؓ کو اہل وعیال کا نگران مقرر فرمایا، اس پر بعض منافقوں نے حضرت علیؓ کو طعنہ دیا کہ حضور ﷺ نے آپ کو حقیر سمجھ کر اپنے اہل وعیال کی نگرانی کے لیے چھوڑا ہے، اس کا تذکرہ حضرت علیؓ نے حضور ﷺ سے کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ علی! وہ جھوٹ کہتے ہیں، بات یہ ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہِ طور پر جاتے وقت اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو قوم کی نگرانی کے لیے چھوڑا تھا اسی طرح میں بھی آپ کو اپنے اہل خانہ کی نگرانی کے لیے چھوڑ کر جاتا ہوں، کیوں کہ تم بھی میرے قرب اور نسبت کے اعتبار سے ایسے ہی ہو جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے حضرت ہارون علیہ السلام تھے، البتہ فرق یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔

حضور ﷺ کا حضرت علیؓ کو حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دینا خصوصی قرب ومحبت اور دین کی معاونت کی وجہ سے ہے۔ واللہ اعلم۔ (مستفاد از: مظاہر حق جدید: ۵/ ۶۷۵)

ایک موقع پر بعض لوگوں نے ایک سفر سے واپسی پر غلط فہمی کی بنیاد پر حضرت علیؓ کی حضور ﷺ سے شکایت کی جو صحیح نہ تھی، تو حضور ﷺ نے شکایت کرنے والوں پر ناگواری اور حضرت علیؓ پر اپنے خصوصی اعتماد وتعلق کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: إِنَّ عَلِيًّا مِنِّیْ وَ أَنَا مِنْهُ، وَ هُوَ وَلِيُّ كُلِّ مُؤْمِنٍ." (رواه الترمذى / باب مناقب على بن أبى طالبؓ، مشكوٰة: ٥٦٤)

"علی مجھ سے ہیں اور میں علی سے ہوں اور علی تو ہر مؤمن کے دوست اور ولی ہیں۔"

حضرت زید بن حارثہؓ کا بچپن:

حضرت علیؓ کی طرح حضور ﷺ کی تربیت اور صحبت میں رہنے والے بچوں میں حضرت زید بن حارثہؓ کا نام بھی سر فہرست ہے، آپؓ کا تعلق عرب کے اعلیٰ قبیلہ سے ہے، حضرت زیدؓ کو عنایت ربانی اور نوازشِ الٰہی نے انتہائی دور جگہ سے اُٹھا کر قربِ نبوی اور بیت

نبوی میں جگہ عطا فرمائی، ہوا یوں کہ ایک مرتبہ حضرت زید بن حارثہؓ بن شراحیل کلبی اپنی والدہ سعدیٰ بنت ثعلبہ کے ساتھ اپنے ننہال گئے، جہاں ان کی والدہ کی قوم بنی معن پر بنی قیس کے ایک لشکر نے حملہ کر دیا اور بہت لوٹ مار کی، اسی میں یہ لٹیرے حضرت زیدؓ کو بھی اُٹھا کر لے گئے، اس وقت آپؓ کی عمر آٹھ سال بتائی جاتی ہے، ان لوگوں نے آپؓ کو بازارِ عُکاظ میں لا کر فروخت کرنے کے لیے پیش کیا تو حکیم بن حزام بن خویلد نے آپؓ کو اپنی پھوپھی حضرت خدیجہ بنت خویلدؓ کے لیے چار سو درہم میں خرید لیا، پھر جب حضور ﷺ کا حضرت خدیجہؓ سے نکاح ہوا تو حضرت خدیجہؓ نے حضرت زیدؓ کو حضور ﷺ کی خدمت میں ہبہ کر دیا، اس طرح آپؓ بچپن ہی سے حضور ﷺ کی خدمت وصحبت میں آ گئے، اسی دور میں جب آپؓ کے کانوں میں اسلام کی دعوت پہنچی تو فوراً لبیک کہہ دیا، اور اس طرح غلاموں میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے کا شرف آپؓ کو حاصل ہوا، ایک طرف تو حضرت زید بن حارثہؓ آغوشِ نبوت میں قابلِ رَشک تربیت پا رہے تھے، لیکن دوسری طرف حضرت زیدؓ کے والدین اور خاندان والے ان کی جدائی کو لے کر سخت پریشان اور غم زدہ تھے، ان لوگوں نے آپؓ کو تلاش کرنے کے لیے زمین کا کونہ کونہ چھان مارا، اور ہر آنے جانے والے قافلے سے آپؓ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی اَنتھک کوشش کرتے رہے، آپؓ کے والد فرطِ غم میں نڈھال ہو کر ہمیشہ باچشمِ پرنم رہتے اور ہر وقت آہوں پر آہیں بھرتے رہتے اور کہتے تھے:

بَكَيْتُ عَلىٰ زَيْدٍ وَ لَمْ أَدْرِ مَا فَعَلْ — أَ حَيٌّ يُرْجىٰ أَمْ أَتىٰ دُوْنَهُ الْأَجَلُ ؟

فَوَ اللّٰهِ مَا أَدْرِيْ وَ إِنِّيْ لَسَائِلُ — أَ غَالَكَ سَهْلُ الْأَرْضِ أَمْ غَالَكَ الْجَبَلُ؟

(المستدرك على الصحيحين / باب مناقب زيد بن حارثة بن شراحيل)

”زید پر میں خوب رویا، مجھے معلوم نہیں کہ اس کے ساتھ کیا ہوا؟ آیا وہ زندہ ہے کہ اس کے واپس آنے کی اُمید کروں یا اس کا انتقال ہو گیا؟ اللہ کی قسم! (پیارے زید) تمہیں بہت زیادہ تلاش کرنے کے باوجود مجھے نہیں معلوم کہ تمہیں زمین نے ہڑپ لیا یا پہاڑوں نے

نگل لیا؟“

حضرت زیدؓ کے والد اپنے بیٹے کے غم میں اس قسم کے قصیدے مسلسل کہتے رہتے، اسی دوران جب حج کا زمانہ آیا تو ان کے قبیلۂ کلب کے کچھ لوگ بھی حج کے لیے مکہ مکرمہ آئے، جہاں ان کی ملاقات حضرت زیدؓ سے ہو گئی، حضرت زیدؓ نے ان کے ذریعہ اپنے گھر والوں کو اپنی خیر وخبر پہنچائی، جب قبیلۂ کلب کے لوگوں نے واپسی پر آپؓ کے والد کو آپؓ کی اطلاع دی تو پھر کیا تھا؟ فوراً آپؓ کے والد حارثہ بن شراحیلؒ، بڑے بھائی جبلہ بن حارثہؓ اور چچا کعب بن شراحیل حضرت زیدؓ کو چھڑانے کی غرض سے فدیہ کی ایک بڑی رقم لے کر خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے، علیک سلیک کے بعد جب آنے کا مقصد بیان کیا تو حضورِ پاک ﷺ نے حضرت زیدؓ کو بلایا، آپؓ کی ملاقات اپنے اہلِ خانہ سے ہوئی، حضور ﷺ نے کسی بھی معاوضہ کے بغیر کلی طور پر حضرت زیدؓ کو اختیار دے دیا، اس وقت حضرت زیدؓ نے عرض کیا: ”يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَ اللّٰهِ، لَا أَخْتَارُ عَلَيْكَ أَحَدًا.“ (ترمذی، مشکوٰۃ: ۵۷۱/ باب مناقب أهل بيت النبي ﷺ / الفصل الثاني) ”میں آپ کے مقابلہ میں کسی کو پسند نہیں کرتا۔“ اس جواب سے آپؓ کے والد، بھائی اور چچا وغیرہ حیران رہ گئے، کہنے لگے: ”تم عجیب ہو، غلامی کو آزادی پر ترجیح دیتے ہو؟“ ہمارے شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیمؒ کے بقول: ”یہ وہ غلامی ہے جس پر آزادی کے سارے مفہوم قربان ہو سکتے ہیں۔“

حضور پاک ﷺ باپ سے بڑھ کر شفیق تھے، بچوں پر تو بے پناہ شفقت کا معاملہ فرماتے، لوگوں کو بھی اس کی ترغیب فرماتے، یہاں تک ارشاد فرمایا کہ ”جو ہمارے چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کی عزت نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔“

آپ ﷺ نے حضرت زیدؓ کے اس فیصلہ کے بعد انہیں اپنی گود میں اُٹھا لیا اور حرم میں لے گئے، پھر فرمایا: ”لوگو! گواہ رہو کہ آج سے زید میرا غلام نہیں، بیٹا ہے، میں اس کا اور وہ میرا وارث ہے، جب حضرت زیدؓ کے والد، چچا اور بھائی نے یہ دل آویز منظر دیکھا تو بہت

خوش ہوئے اور مطمئن ہو کر واپس لوٹے، تبھی سے حضرت زیدؓ ''زید بن محمد'' کے نام سے پکارے جانے لگے، یہاں تک کہ جب قرآنِ پاک میں یہ حکم نازل ہوا:

﴿ اُدْعُوهُمْ لِآبَآئِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (الأحزاب:٥)

''تم ان (منہ بولے بیٹوں) کو ان کے والد کی طرف منسوب کر کے پکارو، یہ بات اللہ کے نزدیک بڑے انصاف والی ہے۔''

تو اس کے بعد حضرت زیدؓ کو ''زید بن محمد'' کے بجائے ''زید بن حارثہؓ'' کے نام سے پکارا جانے لگا۔

حضرت زیدؓ کے فضائل ومناقب:

بظاہر یہ ایک بڑے شرف سے محرومی کی بات تھی، جس پر دل جوئی کے لیے حق تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں ان کا نام صراحۃً ذکر فرمادیا:

﴿ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا﴾ (الأحزاب:٣٧)

''پھر جب زید نے اپنی بیوی سے اپنی ضرورت پوری کر لی تو ہم نے ان سے تمہارا نکاح کردیا۔''

قرآنِ کریم میں آپؓ کے علاوہ کسی اور صحابی کا نام صراحۃً مذکور نہیں ہے، یہ کتنے شرف وفضل کی بات ہے؟ مزید برآں حضرت زیدؓ کو حضور ﷺ سے اور حضور ﷺ کو حضرت زیدؓ سے بے پناہ محبت تھی، یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے فرمایا:

" يَا زَيْدُ! أَنْتَ مَوْلَايَ وَمِنِّي، وَأَحَبُّ الْقَوْمِ إِلَيَّ." (طبقات ابن سعد:٣/٤٣)

''اے زید! تم میرے دوست اور مجھ سے ہو اور تم مجھے سب سے زیادہ محبوب ہو۔''

خود صحابہؓ بھی حضرت زیدؓ کو ''محبوب رسول اللہ ﷺ'' کہہ کر پکارتے تھے۔

(مستفاد از: مظاہر حق جدید: ۵/۵۲۷، اولاد کی تربیت: ۳۰۵ تا ۳۱۰)

حضرت انس بن مالکؓ کا بچپن:

اسی طرح حضرت انس بن مالک خزرجی انصاریؓ بھی وہ سعادت مند بچے ہیں جنہوں نے دس سال کی عمر سے صحبت نبوی اور خدمت نبوی میں رہ کر اپنی عمر کی دس بہاریں گزاری ہیں، والد کا انتقال تو بچپن ہی میں ہو چکا تھا، جس کی وجہ سے آپؓ اپنی والدہ اُم سلیم بنت ملحانؓ کی زیر تربیت رہے، اُم سلیمؓ انصاری عورتوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والی عظیم عورت ہیں، انہوں نے اپنے بیٹے انسؓ کو بھی دارین کی عظیم سعادتوں سے مالامال کرنے کے لیے حضور ﷺ پر ایمان لانے کی تلقین کی تو سعادت مند بیٹے نے فوراً ایمان قبول کر لیا، بچپن ہی سے آپؓ کی والدہ آپؓ کو حضور ﷺ کی محبت وعظمت سے روشناس کراتی رہیں، جس کی وجہ سے آپؓ کے دل میں حضور ﷺ کی انتہائی عظمت ومحبت بیٹھ گئی، آپؓ کو حضور ﷺ کی آمد مدینہ کا شدید انتظار رہنے لگا، جب اللہ کے رسول ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو اس وقت حضرت انسؓ کی عمر دس سال تھی، حضرت انسؓ اپنی والدہ کے لیے نہایت قیمتی سرمایہ تھے، آپؓ نہایت دانشمند، ہوشمند اور سعادت مند تھے، آپؓ کی والدہ انتہائی حیاء کے ساتھ اپنے فرزند کو لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: یارسول اللہ! یہ میرا چھوٹا سا بچہ انس ہے، جس کو آپ کی خدمت کے لیے لائی ہوں، اسے اپنی خدمت کے لیے قبول فرما لیجیے اور اس کے لیے خصوصی دعا بھی فرما دیجیے! چنانچہ حضور ﷺ نے آپؓ کی والدہ کے جذبۂ صادقہ کی قدر فرماتے ہوئے حضرت انسؓ کو اپنی خدمت کے لیے قبول فرما لیا، اس دن سے حضرت انسؓ سفر وحضر میں اور آپ ﷺ کے آخری روزِ حیات تک آپ ﷺ کی خدمت میں رہے، حتیٰ کہ اس نوعمری کے باوجود غزوات میں بھی آپ ﷺ کے ساتھ بطورِ خادم شریک ہوتے رہے، حضرات صحابہؓ میں آپؓ ''خادمِ رسول ﷺ'' کے لقب سے مشہور ہو گئے، حضور ﷺ آپؓ سے اولاد کی طرح بہت زیادہ شفقت ومحبت کا معاملہ فرماتے تھے، آپؓ کو ''يَا بُنَيَّ'' ''میرے پیارے بیٹے'' کہہ کر

پکارتے تھے،تو کبھی مزاحاً آپؓ کے کان پکڑ کر ''یَـــا ذَاالْأُذُنَیْـــنِ'' کہتے ،یعنی ''اے دو کان والے''۔

(مستفاد از: مظاہر حق جدید:۵/ ۸۲۷،اولاد کی تربیت:۳۱۴ تا ۳۱۷)

حضور پاک ﷺ کی شفقت کا حال حضرت انسؓ اس طرح بیان فرماتے ہیں:

عَنْ أَنَسٍؓ قَالَ: خَدَمْتُ النَّبِيَّ ﷺ عَشْرَ سِنِیْنَ، فَمَا قَالَ لِیْ أُفٍّ، وَ لَا ''لِمَ صَنَعْتَ؟'' وَ لَا ''أَ لَا صَنَعْتَ؟'' (متفق علیه، مشکوٰة:۵۱۸ / باب فی أخلاقه و شلمائله)

''حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں (مدینہ میں) حضور ﷺ کی خدمت میں دس سال رہا، (حالانکہ اس وقت حضرت انسؓ نوعمر ہونے کی وجہ سے بہت سے کام حضور ﷺ کے منشاء کے عین مطابق نہیں کر سکتے تھے) اس کے باوجود حضور ﷺ نے کبھی ''اف'' کہہ کر نہیں ڈانٹا یہاں تک کہ کبھی یہ نہیں فرمایا کہ تو نے یہ کیوں کیا؟ اور یہ کیوں نہیں کیا؟''

حضرت انسؓ کے فضائل ومناقب:

حضرت انسؓ کو حضور کی ﷺ کی خدمت کے سبب حضور ﷺ کی محبتوں اور شفقتوں کے ساتھ دعائیں بھی ملیں، آپؓ کی والدہ نے حضور ﷺ سے دعا کی درخواست کی تو آپ ﷺ نے اُن کے اموال واولاد میں خیر وبرکت کی دعا فرمادی، حدیث میں وارد ہے:

عَنْ أُمِّ سُلَیْمٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: ''یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَنَسٌ خَادِمُكَ، اُدْعُ اللّٰهَ لَهٗ، قَالَ: اَللّٰهُمَّ أَكْثِرْ مَالَهٗ وَ وَلَدَهٗ وَ بَارِكْ لَهٗ فِیْمَا أَعْطَیْتَهٗ، قَالَ أَنَسٌ: فَوَاللّٰهِ إِنَّ مَالِيْ لَكَثِیْرٌ، وَ إِنَّ وَلَدِيْ وَ وَلَدَ وَلَدِيْ لَیَتَعَادُّوْنَ عَلٰی نَحْوِ المِائَةِ الیَوْمَ.''

(متفق علیه، مشکوٰة:۵۷۵/ باب جامع المناقب)

حضور ﷺ نے حضرت انسؓ کی والدہ کی درخواست پر دعا فرمائی کہ اے اللہ! انس کے اَموال واَولاد میں کثرت وبرکت عطا فرمائیے، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ (حضور ﷺ کی اس معجزانہ دعا کا اثر یہ ہوا کہ) واللہ! میرے اموال واولاد میں بہت زیادہ برکت ہوئی،

آج میرے بیٹے اور بیٹوں کے بیٹے سو کے قریب ہیں۔

مزید برآں یہ بھی آپ ﷺ کی دعا کا ثمرہ تھا کہ آپؓ کا باغ سال میں دو مرتبہ پھل دیتا تھا، آپؓ کے باغ کی جھاڑی پتوں (اور ریحان کے پھولوں) سے مشک کی خوشبو آتی تھی۔ بعض روایات میں حضور ﷺ کی دعا میں ''وَ أَدْخِلْهُ الجَنَّةَ'' کا اِضافہ بھی منقول ہے، اس لیے حضرت انسؓ فرماتے تھے کہ حضور ﷺ کی پہلی دو دعائیں تو قبول ہوگئی ہیں، جن کا مشاہدہ کر چکا ہوں، البتہ تیسری دعا (دخولِ جنت والی) کی قبولیت کا انتظار ہے، وہ بھی ان شاء اللہ قبول ہوگی۔ (مستفاد از: مظاہر حق جدید:۵/ ۵۲۷)

حضرت انسؓ کے متعلق حضرت ثابت بنانیؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے حضرت انس بن مالکؓ سے عرض کیا کہ کیا آپ کی آنکھیں زیارتِ نبوی سے مشرف ہیں؟ فرمایا: جی ہاں، الحمدللہ، تو میں نے آپؓ کی آنکھوں کو چوما، پھر میں نے عرض کیا کہ کیا آپ کے قدم حضور ﷺ کی خدمت اور کسی ضرورت کے لیے چلے ہیں؟ فرمایا: جی ہاں، الحمدللہ، تو میں نے ان کا بوسہ لیا، پھر میں نے عرض کیا کہ کیا آپ کے ہاتھوں نے حضور ﷺ کی خدمت کی سعادت حاصل کی ہے؟ فرمایا: جی ہاں، الحمدللہ، تو میں نے انہیں بھی چوما، اس محبت آمیز سلوک کو دیکھ کر حضرت انسؓ نے فرمایا کہ ثابت! ایک مرتبہ میں نے حضور ﷺ کے دست مبارک پر پانی بہانے کی سعادت حاصل کی، تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: بیٹے! خوب اچھی طرح سنت کے مطابق وضو کرو، اس سے تمہاری عمر میں برکت ہوگی، سلام کو خوب پھیلاؤ، اس سے تمہاری نیکیوں میں خوب اِضافہ ہوگا، قرآنِ کریم کی تلاوت بکثرت کرو، اِس سے قرآن قیامت کے دِن اِن دو انگلیوں کی طرح تمہارے ساتھ ہوگا، یہ فرماتے ہوئے آپؓ نے دو انگلیوں کو ملا کر اشارہ فرمایا۔ (تاریخ مدینہ ودمشق:۵/ ۶۹، مستفاد از: اولاد کی تربیت:۳۱۶)

دعاءِ انسؓ کی تاثیر:

شیخ جلال الدین سیوطیؒ جلیل القدر حافظِ حدیث ہیں، انہوں نے ''جمع الجوامع''

میں ابوالشیخ کی ''کتاب الثواب'' اور ابن عساکرؒ کی تاریخ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک دن حضرت انسؓ اور حجاج بن یوسف ثقفی دونوں بیٹھے ہوئے تھے، حجاج نے اپنے کسی خادم کو یہ کہا کہ ان (حضرت انسؓ) کو مختلف قسم کے چار سو گھوڑوں کا معاینہ کرایا جائے، جب وہ گھوڑے دِکھائے گئے تو حجاج نے حضرت انسؓ سے کہا کہ ''ذرا بتائیں! اپنے آقا یعنی آں حضرت ﷺ کے پاس بھی اس قسم کے گھوڑے اور ناز و نعمت کے سامان آپ نے کبھی دیکھے تھے؟'' (یہ حجاج دولت و حکومت کے نشے میں مبتلا تھا، کتبِ تاریخ میں اس جاہل کی خود پسندی کے بے شمار جملے منقول ہیں، عموماً وہ حضرات صحابہؓ پر فضیلت جتلاتے ہوئے ناگفتہ بہ اقوال و افعال کرگزرتا تھا، مذکورہ فقرہ بھی اس کی ایک مثال ہے)

آپؓ نے بے ٹوک جواب دیا: ''بخدا یقیناً میں نے آں حضرت ﷺ کے پاس اس سے بدرجہا بہتر چیزیں دیکھیں اور میں نے آں حضرت ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ گھوڑوں کی پرورش کرنے والے تین قسم کے ہوتے ہیں: ایک تو وہ شخص جو گھوڑا اس نیت سے پالتا ہے کہ راہِ خدا میں اس کے ذریعہ جہاد کرے گا، ایسے گھوڑے کا پیشاب، لید، گوشت، پوست اور خون قیامت کے دن اس کے میزانِ اعمال میں ہوگا، اور دوسرا وہ شخص جو گھوڑا اس نیت سے پالتا ہے کہ ضرورت کے وقت سواری کیا کرے اور پیدل چلنے کی زحمت سے بچے، یہ نہ ثواب کا مستحق ہے اور نہ عذاب کا، اور تیسرا وہ شخص جو گھوڑے کی پرورش نام اور شہرت کے لیے کرتا ہے، تاکہ لوگوں کے دل میں یہ بیٹھ جائے کہ فلاں شخص کے پاس اِتنے اور ایسے ایسے عمدہ گھوڑے ہیں، اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے، اور اے حجاج! تیرے یہ گھوڑے اسی تیسری قسم میں داخل ہیں''۔

یہ سن کر حجاج بھڑکا اور کہنے لگا کہ ''اے انس! تم نے آں حضرت ﷺ کی جو خدمت کی ہے، اگر اس کا لحاظ نہ ہوتا، نیز امیر المؤمنین عبدالملک بن مروان نے تمہارے بارے میں سفارش کرتے ہوئے جو خط مجھے لکھا ہے، اس کی پاسداری نہ ہوتی تو نہ معلوم آج

میں تمہارے ساتھ کیا کر گزرتا'' حضرت انسؓ نے فرمایا: ''خدا کی قسم تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور نہ تجھ میں اِتنی ہمت ہے کہ تو مجھے برے ارادے سے دیکھ سکے، کیوں کہ میں نے آں حضرت ﷺ سے چند وہ کلمات سن رکھے ہیں کہ جو شخص ان کی پابندی کرتا ہے اس کے طفیل پڑھنے والے کی مکمل حفاظت کی جاتی ہے، اس لیے میں ہمیشہ ان کلمات کی پناہ میں رہتا ہوں اور ان کلمات کی برکت سے مجھے نہ کسی سلطان کی سطوت سے خوف ہے، نہ کسی شیطان کے شر سے اندیشہ ہے'' حجاج اس کلام کی ہیبت سے بے خود اور مبہوت ہوگیا، تھوڑی دیر بعد سر اٹھایا اور (نہایت لجاجت سے) درخواست کرنے لگا: ''اے ابوحمزہ! وہ کلمات مجھے بھی سکھا دیجئے'' فرمایا: ''میں تجھے ہرگز نہ سکھاؤں گا، بخدا تو اس کا اہل نہیں''۔

جب حضرت انسؓ کے وصال کا وقت آیا اور اَبانؒ نے (جو آپؓ کے خادم تھے) حاضر ہو کر آواز دی، حضرت انسؓ نے فرمایا: ''کیا چاہتے ہو؟'' عرض کیا: ''وہی کلمات سیکھنا چاہتا ہوں جو حجاج نے آپ سے سیکھنا چاہے تھے، مگر آپ نے اس کو نہیں سکھائے تھے'' حضرت انسؓ نے فرمایا: ''ہاں، میں تجھے ضرور سکھاؤں گا، کیوں کہ تو اس کا اہل ہے، میں نے آں حضرت ﷺ کی دس برس خدمت کی اور آپ ﷺ کا انتقال اس حالت میں ہوا کہ آپ ﷺ مجھ سے راضی تھے، اسی طرح تو نے بھی میری خدمت دس سال تک کی اور میں دنیا سے اس حالت میں رخصت ہو رہا ہوں کہ میں تجھ سے راضی ہوں، صبح و شام یہ کلمات پڑھا کرو، حق سبحانہ و تعالیٰ تمام آفات سے محفوظ رکھیں گے۔

بِسْمِ اللّٰهِ عَلٰى نَفْسِىْ وَ دِيْنِىْ، بِسْمِ اللّٰهِ عَلٰى أَهْلِىْ وَ مَالِىْ وَ وَلَدِىْ، بِسْمِ اللّٰهِ عَلٰى مَا أَعْطَانِيَ اللّٰهُ، اَللّٰهُ رَبِّىْ، لَا أُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ وَ أَعَزُّ وَ أَجَلُّ وَ أَعْظَمُ مِمَّا أَخَافُ وَ أَحْذَرُ، عَزَّ جَارُكَ، وَ جَلَّ ثَنَاؤُكَ، وَ لَا إِلٰهَ غَيْرُكَ، اَللّٰهُمَّ إِنِّىْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ نَفْسِىْ وَ مِنْ شَرِّ كُلِّ شَيْطَانٍ مَّرِيْدٍ، وَ مِنْ شَرِّ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ، فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ، عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ، وَ هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، إِنَّ وَلِيِّيَ اللّٰهُ الَّذِىْ نَزَّلَ الْكِتَابَ، وَ هُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِيْنَ. (عمل

الیوم و اللیلة لابن السنی : ۲/۱۵۸، کنز العمال: ۲/۲۹۴)

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا بچپن:

حضراتِ صحابہؓ کے بعد جب ہم اپنے سلف صالحین کے روشن بچپن کا جائزہ لیتے ہیں تو کئی مثالیں ملتی ہیں، منجملہ ان کے حضرت اِمام ربانی، محبوبِ سبحانی شیخ سید عبدالقادر جیلانیؒ کے بچپن کے حالات و واقعات بہت ہی مشہور ہیں، آپؒ کی ولادت یکم رمضان ۴۷۰ھ کو گیلان میں ہوئی، سلسلۂ نسب دس واسطوں سے حضرت حسنؓ سے ملتا ہے، آپؒ کی وفات ۵۶۱ھ میں بہ عمر ۹۰ سال ہوئی۔ آپؒ یتیم ہونے کے سبب اپنی والدہ کی زیرِ تربیت رہے، بچپن ہی میں حصولِ علم کا شوق پیدا ہوگیا تو بغداد کا ارادہ فرمایا، جو اس وقت کا مدینۃ العلم تھا، جب طلبِ علم کے لیے سفر کا ارادہ کیا تو والدہ نے فرمایا: بیٹا! ایک نصیحت ہمیشہ یاد رکھنا کہ کبھی جھوٹ مت بولنا، پھر رُخصت کے وقت مصارف کے لیے چالیس درہم عطا فرمائے، اتفاق سے سفر کے دوران کچھ ڈاکوؤں نے سارے قافلے پر حملہ کر کے اسے لوٹ لیا، ان لٹیروں کا طریقہ یہ تھا کہ قافلہ کے ہر فرد سے پوچھا جاتا کہ تمہارے پاس کچھ ہے؟ ہر ایک اپنے مال و دراہم کو چھپانا چاہتا، مگر جب تلاشی لی جاتی تو جو مال نکلتا لٹیرے اس پر قبضہ کر لیتے، یہی ہر ایک کے ساتھ ہوا، یہاں تک کہ کسی نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے بھی جب پوچھا تو آپؒ نے صاف فرما دیا کہ میرے پاس چالیس دراہم ہیں جو میری والدہ نے خرچ کے لیے دیے ہیں، ڈاکوؤں کو بڑا تعجب ہوا کہ سب تو جھوٹ بول رہے ہیں اور یہ بچہ ہو کر سچ بولتا ہے، حالانکہ اگر یہ کہہ دیتا کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے، تو شکل وصورت سے اس کی تصدیق ہوتی کہ بظاہر یہ کسی مال دار گھرانے کا بچہ نہیں لگتا، مگر اس نے صاف اور سچ بتا دیا، ڈاکوؤں نے اس سچائی اور صاف گوئی کی وجہ دریافت کی تو آپؒ نے اپنی ماں کی نصیحت کا تذکرہ کیا، اس کا اثر ڈاکوؤں پر یہ ہوا کہ جب یہ بچہ اس قدر سچ بولتا ہے تو ہمیں کس قدر سچائی کا اہتمام کرنا چاہیے، چنانچہ تمام لوگ تائب ہوگئے۔ (مستفاد از: بڑوں کا بچپن: ۱۲)

خلاصہ:

خلاصہ یہ ہے کہ اولاد اللہ تعالیٰ کا عطیہ، انعام اور امانت ہے، حق تعالیٰ نے انسانی چمن کے ان معصوم پھولوں میں بے پناہ قابلیت اور صلاحیت رکھی ہے، یہ اچھا یا برا ہر طرح کا اَثر قبول کر لیتے ہیں، اب اگر خوش قسمتی سے انہیں اچھے والدین اور مربی ملیں جو انُہیں گھر، گلی، علاقہ اور معاشرہ کا اچھا ماحول بھی دیں اور ان کی صحیح تعلیم وتربیت کی مکمل فکر کریں اس تصور اور سوچ کے ساتھ کہ اولاد صرف ہمارا ہی نہیں؛ قوم کا بھی مستقبل ہے، تو بالیقین آج کے بچے مستقبل کے بڑے بنیں گے، جیسا کہ بڑوں کے روشن بچپن سے بھی یہ حقیقت واضح ہوتی ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

اولاد کی امانت گودوں میں ہے ہمارے — پالیں انہیں جگر سے، پوسیں انہیں ہنر سے
اللہ کی عبادت بہتر نہیں ہے اس سے — کہ سکھلائیں ہم سلیقہ اَولاد کو فکر سے

ضرورت ہے کہ ماں باپ اپنی اولاد کی دینی تربیت کریں نیز انہیں اَدب سکھائیں، اچھا ماحول دیں، حدیث پاک میں اس عورت کے لیے جنت کی بشارت آئی ہے جس نے اولاد کی اچھی تربیت کی خاطر جوانی میں بیوگی اور خوب صورتی کے باوجود شادی نہ کی ہو، چنانچہ وارد ہے:

عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ الْأَشْجَعِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "أَنَا وَ امْرَأَةٌ سَفْعَاءُ الْخَدَّيْنِ كَهَاتَيْنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، -وَ أَوْمَأَ يَزِيْدُ بِالْوُسْطىٰ وَ السَّبَّابَةِ- امْرَأَةٌ آمَتْ مِنْ زَوْجِهَا، ذَاتُ مَنْصِبٍ وَّ جَمَالٍ، حَبَسَتْ نَفْسَهَا عَلىٰ يَتَامَاهَا، حَتّٰى بَانُوْا أَوْ مَاتُوْا". (رواه أبوداود، مشكوٰة : ٤٢٣ / باب الشفقة و الرحمة على الخلق)

اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ عورت جو سیاہ رخسار والی ہو، اپنے شوہر سے بیوہ (یا جدا) ہو چکی ہو، جس نے اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت کی غرض سے دوسرا نکاح نہ کیا ہو، حالانکہ وہ اپنے منصب و جمال کی وجہ سے کر سکتی تھی، ایسی عورت جنت میں میرے ساتھ ہوگی۔

اسی طرح حدیث پاک میں ہے کہ ماں باپ کی طرف سے اولاد کے لیے اَدب سے بہتر کوئی عطیہ وتحفہ نہیں ہے۔

حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَيُّوبَ بْنِ مُوسٰى عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهٖ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: "مَا نَحَلَ وَالِدٌ وَلَدَهٗ مِنْ نَحْلٍ أَفْضَلَ مِنْ أَدَبٍ حَسَنٍ."

(رواه الترمذی، مشکوٰة:۴۲۳ / باب الشفقة والرحمة علی الخلق / الفصل الثانی)

’’والدین کی طرف سے اولاد کو جو کچھ دیا جاتا ہے ان میں سب سے بہترین عطیہ اَدب ہے۔‘‘

اَدب سے مراد وہ طریقۂ زندگی ہے جس پر چلنے سے رب بھی راضی ہو جائے اور مخلوق بھی راحت پا جائے، ماں باپ اپنی اولاد کو اگر یہ طرزِ زندگی سکھائیں تو بالیقین یہی اللہ تعالیٰ کے عطیہ کا شکر ہے اور اسی سے بچے مستقبل کے بڑے بن سکتے ہیں۔

حق تعالیٰ ہمارے تمام بچوں اور آئندہ آنے والی نسلوں کو اپنے مستقبل کا بڑا بنائیں اور قوم وملت کے لیے دارین میں نافع بنائے۔ آمین یا رب العالمین۔

۲/ رمضان المبارک/ ۱۴۳۹ھ/ قبل الجمعہ
مطابق: ۱۸/ مئی/ ۲۰۱۸ء
(بزمِ صدیقی، بڑودا)

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيرًا   فَصَلُّوا عَلَيْهِ كَثِيرًا كَثِيرًا

(۴)

حقیقی کامیابی کے دو یقینی نسخے: شکر اور صبر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

عَنْ صُهَيْبٍ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: "عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ، إِنَّ أَمْرَهٗ كُلَّهٗ لَهٗ خَيْرٌ، وَ لَيْسَ ذٰلِكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ، إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ، فَكَانَ خَيْرًا لَهٗ، وَ إِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ، فَكَانَ خَيْرًا لَهٗ." (رواه مسلم، مشکوٰة:۴۵۲ / باب التوکل والصبر)

’’حضرت صہیب ؓ سے مروی ہے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مؤمن (کامل) کا معاملہ بھی بڑا عجیب ہے، اس کے تمام امور (واحوال) سراسر خیر ہیں، اور یہ بات مؤمن (کی علامت ہے، اس لیے مؤمن ہی کے ساتھ خاص ہے، اس) کے سوا کسی کو حاصل نہیں، اگر اُسے کوئی خوشی اور نعمت ملے تو وہ شکر ادا کرتا ہے، جو یقیناً اس کے لیے خیر و بھلائی کا سبب بنتا ہے، اور اگر کوئی غمی یا مصیبت پہنچے تو وہ صبر کرتا ہے، تو یہ بھی اس کے لیے خیر و بھلائی کا سبب ہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ کے احکامات چند مگر انعامات بے شمار ہیں:

اللہ رب العزت صرف ہمارے خالق و مالک ہی نہیں؛ بلکہ رب اور پالنہار بھی ہیں، جس طرح ہر شخص کو اپنی پالی ہوئی بکری اور مرغی وغیرہ سے محبت ہوتی ہے اس طرح حق تعالیٰ کو بھی اپنی تمام مخلوق سے بالخصوص اشرف المخلوقات حضرت انسان سے بہت ہی زیادہ محبت ہے، یہی وجہ ہے کہ ہماری پیدائش سے پہلے ہی ہماری پرورش کے لیے اس وسیع وعریض کائنات کو پیدا فرمادیا اور اس میں ہماری تمام ضروریات اور سہولیات کا انتظام فرمادیا، اور اتنا ہی نہیں؛ بلکہ ہماری پیدائش کے بعد سے بلاکسی تفریق کے ہم پر اپنے انعامات کا ایک لامتناہی سلسلہ بھی جاری فرمادیا، یہ زندگی، یہ آزادی، یہ جوانی، یہ تندرستی، یہ آنکھوں کی بینائی، یہ کانوں کی شنوائی، یہ والدین، یہ اولاد، یہ بیوی بچے، مناصب اور عہدے وغیرہ کوئی معمولی نعمتیں اور انعامات ہیں؟ ان میں سے ہر نعمت کئی نعمتوں کی اصل، مجموعہ اور سرچشمہ ہے، اس بنا پر عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے احکام کے مقابلہ میں انعامات بہت زیادہ ہیں، احکام تو چند ہی ہیں، مگر انعامات بے شمار ہیں۔

اقبال نے توڑ دی تسبیح اس لیے، کیا گن کے نام لوں   اس خدا کا جو بے حساب دیتا ہے

ان میں بھی بہت سے عطیات، انعامات اور نعمتیں تو ایسی ہیں جو ہمیں بغیر مانگے عطا فرمائی ہیں، مثلاً یہ کہ ہم نے اس دنیا میں آنے کے لیے کوئی سوال نہیں کیا تھا، ہمارے سوال کے بغیر اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے ہمیں دنیا میں وجود عطا فرمایا، قرآنِ پاک میں ارشاد ہے:

﴿هَلْ أَتٰى عَلَى الْإِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا﴾ (الدھر: ۱)

اس کی ترجمانی کرتے ہوئے دانائے رومؒ نے فرمایا:

۴۶

ما نبودیم وتقاضائے ما نبود   لطفِ تو ناگفتۂ ما می شنود

اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت ہماری ضرورت ہے:

واقعہ یہ ہے کہ اس دنیا میں حق تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے ہمیں وجود عطا فرما کر یوں ہی نہیں چھوڑ دیا؛ بلکہ ہمارے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے ہمیں جن جن نعمتوں کی ضرورت تھی بغیر سوال کیے وہ تمام نعمتیں ہمیں عطا فرمائیں، اس حقیقت کو قرآنِ پاک نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

﴿وَ اٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ (إبراهيم: ۳۴)

”اللہ تعالیٰ نے تمہارے ہر مناسب سوال کو پورا کیا، اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت تمہاری ضرورت ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہر وہ نعمت بھی عطا فرمائی جو مانگنے کے قابل تھی؛ مگر تم نے اس کو نہ مانگا ہو، اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتیں نہیں؛ بلکہ ایک نعمت کو بھی شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے۔“

اپنے اس وجودِ خاکی میں سر سے لے کر پاؤں تک ذرا غور کیجیے، جسم انسانی میں کتنی رگیں ہیں، انہیں شمار کرنا ہمارے بس کی بات نہیں، اور بلاشبہ ہر ہر رگ ایک عظیم نعمت ہے، جیسا کہ اطباء اس کی گواہی دیتے ہیں، پھر جسم انسانی میں جتنے جوڑ ہیں ان میں سے ہر ہر جوڑ ایک بڑی نعمت ہے، نیز جن سانسوں پر جسم انسانی کی زندگی کا دارومدار ہے ان میں سے ہر سانس اللہ تعالیٰ کی زبردست نعمت ہے، جس کو شمار کرنا ممکن نہیں، علاوہ ازیں آنکھوں کی بینائی، کانوں کی شنوائی اور دل ودماغ کی سلامتی کوئی معمولی نعمتیں ہیں؟ پھر یہ تو جسم انسانی میں موجود نعمتوں کا اِجمالی تذکرہ ہے، اس کے علاوہ کائناتِ ربانی میں پھیلی ہوئی نعمتیں تو بے شمار ہیں۔

تو نے جو مانگا وہ رب نے تجھے دیا   بن مانگے بھی تیری ضرورتوں کو پورا کیا
اپنے رب کو پہچان اے غافل انسان!   فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ

سردی بڑھے تو دھوپ پھیلائے آنچل — بارش کی ہوضرورت تو آئیں گھرے بادل
یہ سب خدا کی قدرت کے ہیں نشان — فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ
امبر پہ چاند اور چمکتے ہوئے ستارے — بتاؤ تو ذرا یہ جلوے ہیں کس کے سارے
یہ سب تیرا کرم ہے اے خدائے مہربان — فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ
پھلوں سے لدی ہوئی درخت کی ٹہنیاں — برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑوں کی چوٹیاں
تعریف پیارے رب کی مل کر کرو بیان — فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ

اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت بھی ساری زندگی کی عبادت پر بھاری ہے:

قرآنِ کریم میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿ إِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ۝﴾ (بنی إسرائيل : ۳۷)

’’کان، آنکھ اور دل (وغیرہ اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتیں ہیں جن کے متعلق قیامت کے دِن) سوال (وحساب) ہوگا۔‘‘

نیز ایک مقام پر فرمایا:

﴿ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۝﴾ (التكاثر : ۸)

’’قیامت کے دِن حق تعالیٰ ہر ایک سے ہر نعمت کے متعلق سوال کریں گے۔‘‘

اب اگر دُنیا میں حق تعالیٰ کی نعمتوں کا حق اور شکر ادا کیا تھا تب تو معاملہ آسان ہوگا، لیکن اگر خدانخواستہ نعمتوں کی ناقدری وناشکری کی تھی تو معاملہ بہت دشوار ہوگا، کیوں کہ جب عبادت واطاعت کا مقابلہ نعمت سے کیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت بھی ساری زندگی کی عبادت واطاعت پر بھاری ہوجائے گی، چنانچہ حدیث قدسی میں ہے:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ:’’ يُخْرَجُ لِابْنِ آدَمَ

ثَلَاثَةُ دَوَاوِيْنَ، دِيْوَانٌ فِيْهِ الْعَمَلُ الصَّالِحُ، وَ دِيْوَانٌ فِيْهِ ذُنُوْبُهٗ، وَ دِيْوَانٌ فِيْهِ النِّعَمُ مِنَ اللّٰهِ عَلَيْهِ، فَيَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ لِأَصْغَرِ نِعَمِهٖ فِيْ دِيْوَانِ النِّعَمِ: خُذِيْ ثَمَنَكِ مِنْ عَمَلِهِ الصَّالِحِ، فَتَسْتَوْعِبُ عَمَلَهُ الصَّالِحَ، فَإِذَا أَرَادَ اللّٰهُ أَنْ يَرْحَمَ عَبْدًا قَالَ: يَا عَبْدِيْ قَدْ ضَاعَفْتُ لَكَ حَسَنَاتِكَ، وَ تَجَاوَزْتُ عَنْ سَيِّئَاتِكَ، وَ وَهَبْتُ لَكَ نِعَمِيْ‘‘.

(رواه البزار، الترغيب والترهيب: ۴/۳۹ / فصل فی ذكر الحساب وغيره) (حدیث قدسی نمبر:۵)

’’قیامت کے دِن ہر انسان کے تین دفاتر نکال کر پیش کیے جائیں گے: (۱) وہ دفتر اور رجسٹر جس میں ہر ایک کا نیک عمل لکھا ہوگا۔ (۲) وہ دفتر اور رجسٹر جس میں ہر ایک کے گناہ لکھے ہوں گے۔ (۳) وہ دفتر اور رجسٹر جس میں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتیں لکھی ہوں گی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا بندہ کے نیک اعمال کے ساتھ موازنہ ومقابلہ کیا جائے گا، حق تعالیٰ اپنی عطا کردہ نعمتوں میں سے ایک چھوٹی سی نعمت سے کہیں گے کہ تم بندہ کے نیک اعمال میں سے اپنی قیمت اور ثمن وصول کرلو، (اور بندے سے بھی کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی قیمت ادا کرو) تو وہ چھوٹی سی نعمت اس بندے کی تمام نیکیوں کو گھیر لے گی، مطلب یہ ہے کہ ادنیٰ نعمت بھی تمام عبادتوں اور اعمال کے مقابلہ میں بھاری ہوجائے گی، پھر وہ ایک طرف ہوکر کہے گی کہ میں نے ابھی اپنا پورا حق وصول نہیں کیا ہے، حالانکہ نیکیوں کا دفتر تو خالی ہوچکا ہوگا، صرف گناہوں اور نعمتوں کے دفاتر اور رجسٹر باقی رہ جائیں گے، اس وقت انسان حیران، پریشان اور بدحواس ہوکر رہ جائے گا۔ (فضل الٰہی کے سبب) حق تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ رحم وکرم کا ارادہ فرمائیں گے تو اس سے فرمائیں گے کہ اے میرے بندے! میں نے تیری نیکیوں کے اَجر وثواب کو ’’اضعافاً مضاعفہ‘‘ کئی گنا بڑھادیا ہے، گناہوں کو معاف کردیا ہے اور نعمتوں کو بخش دیا ہے۔‘‘

ظاہر ہے کہ اللہ رب العزت کا یہ فضل وکرم اُن اہل ایمان پر ہوگا جو اس کے مطیع، فرماں بردار اور شکر گزار ہوں گے۔ رزقنا اللّٰه بمنّه و فضله . آمين.

ایک عبرت آموز واقعہ:

اس سلسلہ میں ایک نہایت عبرت آموز واقعہ حضرت امام حاکم شہیدؒ نے مستدرکِ حاکم میں حضرت جابرؓ سے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے، اور اسی کو حضرت امام منذریؒ نے ''الترغیب والترہیب'' میں بھی نقل کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک عابد نے اپنے گھر بار اور کاروبار کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے سمندر کے بیچ میں ایک پہاڑ کے ٹیلے پر پناہ لی اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہوگیا، (اس رہبانیت کی ان کی شریعت میں اجازت تھی، ہمارے یہاں نہیں) حق تعالیٰ نے اس کے گزارے کے لیے اَنار کے ایک درخت اور میٹھے پانی کے چشمے کا انتظام فرمادیا، یہ عابد اَنار کھاتا، چشمہ کا پانی پیتا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتا، اسی حالت میں پانچ سو سال گزر گئے، جب اس کی موت کا وقت آیا تو اس نے حق تعالیٰ سے دعا مانگی کہ یا اللہ! مجھے سجدہ میں موت عطا فرما کر میری نعش کی حفاظت فرما، اس کی یہ دعا بھی قبول ہوگئی، روایات میں آتا ہے کہ قیامت میں اس عابد کو دربارِ الٰہی میں حاضر کرنے کے بعد کہا جائے گا کہ ''جا، میرے فضل وکرم سے جنت میں داخل ہوجا''، تو وہ عابد (اپنے دل میں) کہے گا: ''رَبِّ بَلْ بِعَمَلِیْ'' یہ جنت اگر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا صلہ اور نتیجہ ہے تو پھر میری پانچ سو سال کی بے ریا عبادت کا کیا؟ اس وقت حق تعالیٰ - جو علیم بذات الصدور ہیں - فرمائیں گے: اچھا! تجھے اپنی عبادت پر ناز ہے؟ میرا فضل وکرم نظر نہیں آتا؟ اے فرشتو! اب تو اس کی عبادت اور میری نعمتوں کا موازنہ ومقابلہ کرو، اس موقع پر حق تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں میں سے ایک نعمت آنکھوں کی بینائی ساری زندگی کی عبادت واطاعت پر بھاری ثابت ہوگی، دیگر بے شمار نعمتیں تو ابھی باقی ہوں گی، ان کا تو کوئی بدل بھی نہ رہے گا، اس سے کہا جائے گا کہ ہماری ایک نعمت تیری ساری زندگی کی عبادت کا بدل ہوگئی، باقی نعمتوں کا کیا؟ فرشتو! جاؤ! اسے جہنم میں لے جاؤ، تب اسے ہوش آئے گا اور پکار پکار کر کہے گا: ''رَبِّ! بِرَحْمَتِكَ اَدْخِلْنِيْ الْجَنَّةَ'' اے

میرے رب! اپنی رحمت سے مجھے جنت میں داخل فرمادے، بالآخر حجت تام ہوجانے کے بعد حق تعالیٰ اس عابد کو اپنے فضل وکرم سے جنت میں داخل فرمادیں گے۔''

(مستدرکِ حاکم/کتاب التوبة والانابة/حدیث نمبر: ۷۶۳۷، مستفاد از: انوارِ ہدایت: ۲۶۹)

نعمتوں کی یاددہانی شکر کی ادائیگی کے لیے ہے:

الغرض اللہ رب العالمین کی نعمتیں بے شمار ہیں، جب نعمتوں کا موازنہ عبادتوں سے ہوگا تو ان میں سے ہر نعمت ساری زندگی کی عبادت واطاعت پر بھاری ہوگی، اسی لیے کہتے ہیں کہ

بشر کا فرض ہے ہر حال میں شکرِ خدا کرنا مصیبت ہو یا راحت، اچھا نہیں گلہ کرنا

حق تعالیٰ چاہتے ہیں کہ بندے اس کی نعمتوں کو یاد رکھیں، چنانچہ قرآنِ کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حوالہ سے فرمایا:

﴿وَ ذَكِّرْهُمْ بِأَيّٰمِ اللّٰهِ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ۝﴾ (إبراهيم: ٥)

''اور اللہ تعالیٰ نے جو دن دکھائے ہیں وہ یاد دلائیں، حقیقت یہ ہے کہ جو صبر وشکر کا خوگر ہو اس کے لیے اس میں بڑی نشانیاں ہیں۔''

''اَيّٰمِ اللّٰهِ'' کے لفظی معنیٰ ہیں ''اللہ کے دن''، محاورہ میں اس سے مراد وہ دن ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے خاص خاص اور اہم اہم واقعات دکھلائے، اس سے مخصوص اور انقلابی ایام مراد ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور انعام ہیں۔

(مستفاد از: معارف القرآن: ۵/۲۳۱)

گویا حق تعالیٰ انبیاء کو حکم فرمارہے ہیں کہ میرے بندوں کو میری نعمتیں یاد دلاؤ۔ دوسرے مقام پر بندوں کو براہِ راست بھی حق تعالیٰ نے اپنی نعمتیں یاد کرنے کا حکم فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ﴾ (الفاطر:۳)

''اے لوگو! یاد کرو اللہ تعالیٰ کی اُن نعمتوں کو جو اس نے تم پر نازل کی ہیں۔''

ظاہر بات ہے کہ اِن نعمتوں کی یاد دہانی اسی لیے کرائی جا رہی ہے تاکہ ہم ان نعمتوں کا شکر ادا کر سکیں۔

شکر کی حقیقت، فضیلت اور اس کی قسمیں:

شکر کی حقیقت ہے نعمت کے اعتراف و اِظہار کے ساتھ اس کی قدر کرنا، اعتراف تو دل سے ہوگا اور اظہار زبان سے ہوگا، مطلب یہ ہے کہ بندہ کے دل میں یہ بات ہر وقت مستحضر رہے کہ جو کچھ اسے ملا ہے وہ اس کی محنت اور صلاحیت کا نتیجہ نہیں اور نہ ہی اس کا کمال ہے؛ بلکہ محض اللہ تعالیٰ کا کرم اور اس کا انعام ہے، اسے شکر قلبی کہتے ہیں، جو شکر کی پہلی قسم ہے۔ اعترافِ نعمت کے ساتھ زبان سے اس کا اظہار بھی ہو، اور موقع بموقع اللہ تعالیٰ کے انعامات کو بندہ بیان بھی کرے یا زبان پر اللہ تعالیٰ کی حمد اور شکر کے کلمات آتے رہیں، مثلاً بار بار کہے: "لَكَ الْحَمْدُ يَا رَبِّيْ وَ لَكَ الشُّكْرُ." اسے شکر لسانی کہتے ہیں، جو شکر کی دوسری قسم ہے۔

نیز اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہر نعمت کو اس کی طاعت، مرضی اور منشا کے مطابق استعمال کیا جائے، یہی دراصل نعمت کی قدر دانی اور شکر عملی ہے، جو شکر کی تیسری قسم ہے۔ شکر کی ان تینوں قسموں پر عمل کرنا اس وقت آسان ہوتا ہے جب دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف، دھیان اور استحضار ہو، اسی لیے فرمایا:

﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ (آل عمران: ۱۲۳)

''تقویٰ اختیار کرو، تاکہ تم شکر گزار بن سکو۔''

صاحبو! واقعہ یہ ہے کہ مصیبتوں میں تو اللہ تعالیٰ کو یاد رکھنا اور صبر کرنا پھر بھی آسان

ہے؛ لیکن نعمتوں میں اللہ تعالیٰ کو یاد رکھنا اور شکر ادا کرنا سب کے بس کی بات نہیں، اچھے اچھے لوگ مواقع شکر میں اللہ تعالیٰ کو بھول جاتے ہیں، اس حقیقت کو قرآنِ پاک نے اس طرح بیان فرمایا:

﴿ وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴾ (سبأ:۱۳)

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں تو ہر کوئی استعمال کرتا ہے؛ مگر ان کا حق اور شکر ادا کرنے والے بہت ہی کم لوگ ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے سے اللہ تعالیٰ شان میں اِضافہ نہیں ہو جاتا؛ بلکہ بندہ ہی کا فائدہ ہوتا ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ ﴾ (إبراهيم: ۷)

اگر تم نعمتوں کا شکر ادا کروگے تو پہلا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ نعمتیں باقی رہیں گی۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ ان کے نفع میں برکت دی جائے گی۔ تیسرا فائدہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے حفاظت ہوگی، ارشادِ ربانی ہے:

﴿ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ ﴾ (النساء: ۱۴۷)

لیکن یاد رکھو! اگر شکر گزاری پر قرآنِ کریم میں زیادتی نعمت، برکت اور عذاب سے حفاظت کا وعدہ ہے تو ناشکری پر بے برکتی، محرومی اور عذابِ الٰہی کی وعید بھی ہے، فرمایا:

﴿ وَ لَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ﴾ (إبراهيم: ۷)

دوسرے مقام پر اللہ پاک اس بستی کی مثال دیتا ہے جس کے بسنے والے اللہ تعالیٰ کے وفادار اور شکر گزار تھے، تو اللہ پاک نے بھی ان کے لیے امن، سکون اور راحتیں مہیا فرما دیں۔ فرمایا:

﴿ وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا مِنْ كُلِّ مَكَانٍ ﴾ (النحل: ۱۱۲)

ہمارے شاہ صاحب علامہ سید عبد المجید ندیمؒ نے اس کی ترجمانی اپنے منفرد انداز

میں اس طرح فرمائی کہ ''وہ پتھر اُٹھاتے تو موتی بن جاتا، مٹی کا ڈھیلا اُٹھاتے تو سونا بن جاتا؛ لیکن پھر جب وہ بے وفا اور ناشکرے بن گئے:

﴿ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللّٰهِ فَأَذَاقَهُمُ اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ۝﴾ (النحل : ١١٢)

تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ پھر ہم نے بھی ہاتھ اٹھالیا، تو خوش حالی بدحالی میں بدل گئی، پہلے مٹی سونا بن جاتی تھی، اب سونا مٹی ہونے لگا، پہلے پتھر ہیرے بن جاتے تھے، اب ہیرے پتھر ہونے لگے، پہلے امن تھا، اب خوف ہوگیا، پہلے متحد تھے، اب متفرق ہوگئے، یہ سب ناشکری کی نحوست ہے، اس لیے شکر کا راستہ اختیار کریں۔

حدیث پاک میں شکر پر روزہ دار کے اجر وثواب کی فضیلت وارد ہوئی ہے، فرمایا:

'' الطَّاعِمُ الشَّاكِرُ كَالصَّائِمِ الصَّابِرِ''. (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ : ٣٦٥)

''کھا کر شکر ادا کرنے والا اس شخص کے برابر (اجر کا حق دار) ہے جو روزہ رکھ کر صبر کرے۔''

بہر حال شکر نعمت سے ہمارا ہی نفع اور فائدہ ہوگا، لہٰذا دانائی وسمجھ داری یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کیا جائے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں:

شکرِ منعم واجب آید در خرد ۔۔۔ ورنہ بکشاید درِ خشمِ ابد

''منعم کا شکر ادا کرنا عقلاً بھی واجب ہے، ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ (اس کی رحمت و عنایت کا دروازہ بند ہوجائے) اور غصہ کا دروازہ ہمیشہ کے لیے کھل جائے۔''

صاحبو! شکایت چھوڑیئے! شکر کی عادت ڈالیے! آپ کے پاس جتنا ہے کتنے ہی بندوں کے پاس اتنا بھی نہیں ہے۔

نعمتوں کا استحضار اور ان پر شکر:

شکر ادا کرنے کا ایک آسان طریقہ تو یہ ہے کہ رات کو سونے سے پہلے بیٹھ کر ساری

نعمتوں کا استحضار کرلو کہ گھر عافیت کا ہے، الحمدللہ، بستر آرام دہ ہے، ''اللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَ لَكَ الشُّكْرُ''. میں عافیت سے ہوں، ''اللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَ لَكَ الشُّكْرُ''. بچے عافیت سے ہیں، ''اللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَ لَكَ الشُّكْرُ''. ایک ایک نعمت کا استحضار کر کے رَٹ لگاؤ۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے یہ چیز اپنے نانا سے سیکھی ہے، ایک مرتبہ میں ان کے گھر گیا تو رات کو میں نے دیکھا کہ وہ سونے سے پہلے بستر پر بیٹھے ہوئے ہیں اور بار بار ''اللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَ لَكَ الشُّكْرُ''. پڑھ رہے ہیں اور عجیب کیفیت میں یہ عمل کر رہے ہیں، میں نے پوچھا کہ حضرت! یہ کیا کر رہے ہیں؟ فرمانے لگے: ''بھائی! سارے دن تو معلوم نہیں کس حالت میں رہتا ہوں اور یہ پتہ نہیں لگتا کہ شکر ادا ہو رہا ہے یا نہیں، اِس وقت بیٹھ کر دِن بھر کی ساری نعمتوں کا استحضار کرتا ہوں اور ہر نعمت پر ''اللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَ لَكَ الشُّكْرُ''. کہتا جاتا ہوں۔''

حضرت ڈاکٹر صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ دیکھا تو اس کے بعد الحمدللہ میں نے بھی اس کو اپنے معمول میں شامل کرلیا کہ رات کو سوتے وقت سب نعمتوں کا استحضار کر کے شکر ادا کرتا ہوں۔

شکر ادا کرنے کا آسان طریقہ: اہتمامِ دعاءِ مسنون:

نبی کریم ﷺ پر قربان جائیں، آپ ﷺ نے اداءِ شکر کا آسان طریقہ بتا دیا ہے، ورنہ کہاں تک انسان شکر ادا کرے گا، بقول شیخ سعدیؒ کے ''ایک سانس پر دو شکر واجب ہیں، سانس اندر جائے اور باہر نہ آئے تو موت، اور اگر سانس باہر آئے پھر اندر نہ جائے تو بھی موت، تو ایک سانس پر دو نعمتیں ہیں، اور ہر نعمت پر ایک شکر واجب ہے، اس طرح ہر سانس پر دو شکر واجب ہوگئے، اس لیے اگر انسان اپنے سانس ہی کی نعمت کا شکر ادا کرنا چاہے تو کہاں تک کرے گا؟ ﴿وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ اس لیے سرکارِ دوعالم ﷺ نے شکر ادا کرنے کا دوسرا آسان طریقہ بہ شکل دعاءِ مسنون بتا دیا اور چند کلمات تلقین فرمادیے،

ہر مسلمان کو یہ کلمات یاد کر لینے چاہئیں:

”اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا خَالِدًا مَعَ خُلُوْدِكَ، وَ لَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا دَائِمًا لَا مُنْتَهٰى لَهٗ دُوْنَ مَشِيَّتِكَ، وَ عِنْدَ كُلِّ طَرْفَةِ عَيْنٍ وَّ تَنَفُّسِ كُلِّ نَفْسٍ“.

(رواہ الطبرانی، رقم الحدیث : ۵۵۳۸)

”اے اللہ! آپ کا شکر ہے، ایسا شکر کہ جب تک آپ ہیں اس وقت تک وہ شکر جاری رہے، اور جس طرح آپ جاوداں ہیں اسی طرح وہ شکر بھی جاوداں رہے، اور آپ کی مشیت کے آگے جس کی کوئی انتہاء نہ ہو، اے اللہ! آپ کی تعریف اور آپ کا شکر ہے آنکھ کے ہر جھپکنے کے وقت اور ہر سانس لینے کے وقت“۔

بہر حال یہ شکر کے کلمات جو نبی کریم ﷺ نے تلقین فرمائے ہیں یاد کر لینے چاہئیں اور دن رات ان کلمات کو پڑھ لینا چاہیے، ان شاء اللہ اس سے حق شکر ادا ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

اعترافِ عجز کے ساتھ شکرِ قلیل بھی کافی ہے:

پھر عقل وانصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کا شکر ادا کیا جائے، جو یقیناً مشکل کام ہے، کیوں کہ ارشادِ باری ہے:

﴿ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ۝﴾ (النحل : ۱۸)

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بے شمار ہیں، تو بے شمار نعمتوں کا بے شمار شکر بھی واجب ہے، جس سے بلاشبہ ضعیف البنیان انسان قاصر اور عاجز ہے، خود اللہ تعالیٰ کے پیغمبر نے اس کا اعتراف فرمایا ہے، روایتوں میں منقول ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ ہماری نعمتوں کا شکر ادا کرو، عرض کیا: یا اللہ! آپ کی نعمتیں تو بے شمار ہیں، ان میں کونسی نعمت پہلے ہے اور کونسی بعد میں، یہ ترتیب قائم کرنا بھی دشوار ہے، کیوں کہ ہر نعمت سے پہلے بھی نعمت ہے اور ہر نعمت کے بعد بھی نعمت ہے، (مثلاً غور کیا جائے تو زندگی سے پہلے والدین کی نعمت ہے اور

زندگی کے ساتھ عافیت اور صحت کی نعمت ہے، وغیرہ) اور اگر اس سے صرفِ نظر بھی کر لیا جائے تو جس کسی بھی نعمت کا شکر ادا کرنا ہو آپ کی توفیق کے بغیر تو ہو نہیں سکتا، اور یہ توفیق عمل بھی تو ایک نعمت ہے، جس کا شکر ادا کرنا بھی لازم ہے، لہٰذا کن کن نعمتوں کا شکر ادا کیا جائے؟ آپ کی ہر نعمت کئی نعمتوں میں لپٹی ہوئی ہے اور ایک ایک نعمت بھی کئی کئی نعمتوں کا مجموعہ و سرچشمہ ہے، اس لیے یا اللہ! حقیقت تو یہ ہے کہ میں آپ کی نعمتوں کا حق اور شکر ادا کرنے سے عاجز اور قاصر ہوں، حضرت داؤد علیہ السلام کے اس اعترافِ عجز پر ارشاد ہوا: ”اِنَّكَ الْآنَ قَدْ شَكَرْتَنِيْ.“ (مرقاۃ المفاتیح / کتاب اسماء اللّٰہ) ”اے داؤد! یہ اعتراف کر لینا بھی اداءِ شکر کے لیے کافی ہے، آپ نے جب یہ سمجھ لیا کہ ہر نعمت اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے تو یہ شکر نعمت ہی ہے۔“ سبحان اللہ۔ (مستفاد از: انوار القرآن: ۵/۲۵۲ و معارف القرآن: ۵/۲۵۶)

ہمارا رب غفور ورحیم ہے نا! اس لیے اعترافِ عجز کے ساتھ شکرِ قلیل پر بھی راضی ہو جاتا ہے اور اعترافِ عجز کو بھی اداءِ شکر کے قائم مقام قرار دیتا ہے، کیوں کہ حدیث پاک میں مروی ہے کہ جسے شکرِ قلیل کی توفیق نہیں ملتی اسے شکرِ کثیر سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے، اور جسے لوگوں کا شکر ادا کرنے کی توفیق نہیں ملتی وہ شکرِ الٰہی سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو بیان کرنا شکر اور بیان نہ کرنا ناشکری ہے۔

عَنْ نُعْمَانَ بْنِ بَشِيْرٍ رضؓ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ”مَنْ لَمْ يَشْكُرِ الْقَلِيْلَ لَمْ يَشْكُرِ الْكَثِيْرَ، وَ مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ، وَ التَّحَدِيْثُ بِنِعْمَةِ اللّٰهِ شُكْرٌ، وَ تَرْكُهٗ كُفْرٌ، وَ الْجَمَاعَةُ رَحْمَةٌ.“ (شعب الإیمان / فصل فی المکافاۃ بالصنائع)

لہٰذا اعترافِ عجز کے ساتھ شکرِ قلیل بھی کافی ہو جاتا ہے۔

شکرِ نعمت مخصوص بندوں کا خاص وصف ہے:

شیطان اس سچائی سے باخبر ہے، اس لیے اس کی ساری کاوشوں اور کوششوں کا محور و مقصد یہی رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اللہ تعالیٰ کا ناشکرا بنا دیا جائے، چنانچہ جب وہ اللہ

تعالیٰ کی ناشکری اور نافرمانی کی وجہ سے راندۂ درگاہ ہوا تو اس نے طویل مدت تک زندہ رہنے کی مہلت مانگی، جو اسے مل گئی، پھر اس نے قسم کھا کر کہا تھا کہ میں اولادِ آدم کو برابر گمراہ کرتا رہوں گا:

﴿ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمُ مِّنُ بَيُنِ أَيُدِيهِمُ وَ مِنُ خَلُفِهِمُ وَ عَنُ أَيُمَانِهِمُ وَ عَنُ شَمَآئِلِهِمُ ط وَ لَا تَجِدُ أَكُثَرَهُمُ شٰكِرِيُنَo﴾ (الأعراف : ۷)

''میں بنی آدم کو گمراہ اور ناشکرا بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کروں گا، چاروں طرف سے ان پر حملہ کروں گا، کبھی حب جاہ کا حملہ، کبھی حب باہ کا حملہ، کبھی دولت کا حملہ، کبھی عورت کا حملہ، کبھی بڑائی کا حملہ تو کبھی خود پسندی کا حملہ، غرض ہر طرح سے انہیں اپنے شکنجہ میں لاؤں گا، جس کے نتیجہ میں آپ اکثر بندوں کو ناشکرا پائیں گے۔''

اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک یہ کہ شیطان کا بنیادی داؤ انسان کو ناشکرا بنانا ہے، اور ناشکرے بندے اللہ تعالیٰ کے نافرمان ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اکثر لوگ ناشکرے ہو کر شیطان کے چیلنج کو سچ ثابت کر رہے ہیں، جب کہ شکر گزار لوگ بہت کم ہیں، جو شیطان کے چیلنج کو غلط ثابت کر رہے ہیں، یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والے لوگ بہت کم ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں کا خاص وصف ہے، جیسا کہ آیت کریمہ: ﴿ وَ قَلِيُلٌ مِّنُ عِبَادِيَ الشَّكُوُرُ﴾ (سبأ: ۱۳) اور ﴿إِلَّا عِبَادَكَ مِنُهُمُ الُمُخُلَصِيُنَ﴾ (الحجر: ۴۰) سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے۔

مؤمنین مخلصین کی علامتیں:

مذکورہ حدیث میں ان ہی مؤمنین مخلصین اور مؤمنین کاملین کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ ''عَجَبًا لِأَمُرِ الُمُؤُمِنِ، إِنَّ أَمُرَهٗ كُلَّهٗ لَهٗ خَيُرٌ، وَ لَيُسَ ذٰلِكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِمُؤُمِنٍ، إِنُ أَصَابَتُهُ سَرَّاءُ شَكَرَ، فَكَانَ خَيُرًا لَهٗ، وَ إِنُ أَصَابَتُهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ، فَكَانَ خَيُرًا لَهٗ.''

مؤمنین مخلصین کا معاملہ بھی عجیب ہے، ان کا ہر معاملہ خیر و کامیابی کا ذریعہ ہے،

۵۲

کیوں کہ ان کی علامت یہ ہے کہ وہ خوشیوں میں جشن کے بجائے شکر ادا کرتے ہیں، اور مصیبتوں میں ماتم کے بجائے صبر کرتے ہیں، وہ خوشی میں شکر کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی رضا حاصل کر لیتے ہیں، تو غمی میں صبر کے ذریعہ، اور جس مردِ مؤمن کو خوشی میں شکر اور غمی میں صبر کی توفیق مل جائے وہ کامیاب ہو جاتا ہے اور اس کا ایمان کامل ہو جاتا ہے، کیوں کہ حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنُ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنُهُ قَالَ: قَالَ رَسُوُلُ اللّٰهِ ﷺ: '' الإِيُمَانُ نِصُفَانِ، نِصُفٌ فِيُ الصَّبُرِ، وَ نِصُفٌ فِيُ الشُّكُرِ. '' (رواه البيهقي في شعب الإيمان / باب في الصبر على المصائب و عمّا تنزع إليه النفس من لذة و شهوة)

''ایمان کے دو حصے ہیں: آدھا صبر اور آدھا شکر۔''

حق تعالیٰ ہر بندہ کو اس کی طاقت کے مطابق آزماتے ہیں، کبھی خوشی میں تو کبھی غمی میں، غور کیا جائے تو دنیا میں بندہ پر پیش آنے والے حالات بھی مجموعی طور پر دو ہی طرح کے ہیں: خوشی اور غمی، اب جنہیں خوشی میں شکر کی توفیق مل جائے اور غمی میں صبر کی، تو وہ لوگ مؤمنین کاملین اور بہترین و کامیاب ترین افراد ہیں، یقینی کامیابی کے یہی دو نسخے ہیں، جو لوگ کامیاب اور کام کے ہوتے ہیں وہ خوشیوں میں اتراتے نہیں اور مصیبتوں سے گھبراتے نہیں، وہ خوشی میں شکر اور غمی میں صبر کرتے ہیں، حق تعالیٰ جنہیں اپنے فضل خاص سے نوازنا چاہتے ہیں انہیں شکر و صبر کی توفیق عطا فرماتے ہیں۔

شکر و صبر اللہ تعالیٰ کے فضل خاص کی علامات:

چنانچہ حدیث قدسی میں وارد ہے:

عَنُ أُمِّ الدَّرُدَاءِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنُهَا قَالَتُ: سَمِعُتُ أَبَا الدَّرُدَاءِ يَقُوُلُ: سَمِعُتُ أَبَا الُقَاسِمِ ﷺ يَقُوُلُ: '' إِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى قَالَ: يَا عِيُسٰى ! إِنِّيُ بَاعِثٌ مِنُ بَعُدِكَ أُمَّةً إِذَا أَصَابَهُمُ مَا يُحِبُّوُنَ حَمِدُوا اللّٰهَ، وَ إِنُ أَصَابَهُمُ مَا يَكُرَهُوُنَ احُتَسَبُوُا وَ

صَبَـرُوْا، وَ لَا حِلْمَ وَ لَا عَقْلَ، فَقَالَ: يَا رَبِّيْ ! كَيْفَ يَكُوْنُ هٰذَا لَهُمْ، وَ لَا حِلْمَ وَ لَا عَـقْـلَ؟ قَـالَ: أُعْـطِيْهِمْ مِنْ حِلْمِيْ وَ عِلْمِيْ." (رواه البيهـقـي فـي شعب الإيمان، مشكوٰة: ۱۵۳ / باب البكاء على الميت) (حدیث قدسی نمبر:۶)

"حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے (ایک مرتبہ ارشاد) فرمایا: اے عیسیٰ! میں تمہارے بعد ایک ایسی اُمت پیدا کروں گا (مراد امت محمدیہ اور اس کے مخصوص افراد ہیں) جن کی شان اور سیرت یہ ہوگی کہ جب ان کو ان کی فرمائش وخواہش کے مطابق نعمتیں ملیں گی تو وہ جذبۂ شکر سے معمور ہوکر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کریں گے اور جب ان پر ناخوش گوار حالات آئیں گے تو صبر سے کام لیں گے، حالانکہ ان میں کوئی خاص درجہ کی بردباری اور دانشمندی نہیں ہوگی، اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے از راہِ تعجب عرض کیا کہ جب ان میں بردباری اور دانشمندی نہیں ہوگی تو وہ خوشی میں شکر اور غمی میں صبر کیسے کریں گے؟ تو حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: میں انہیں (اپنے فضل خاص سے) علم وحلم کا کچھ حصہ دوں گا، جس کے نتیجے میں ان کے لیے صبر وشکر سے متصف ہونا آسان ہوجائے گا۔"

اس سے ثابت ہوا کہ صبر وشکر کی توفیق کا ملنا اللہ تعالیٰ کے فضل خاص کی علامت ہے، اللہ تعالیٰ کے اس فضل خاص یعنی شکر وصبر کو حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ بندہ دینی امور میں خود سے بلند وبہتر شخص کو دیکھے اور اس کی اقتداء کرے، اور دنیوی امور میں خود سے کمتر شخص کو دیکھے، پھر حق تعالیٰ نے جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں ان پر شکر ادا کرے۔ حدیث پاک میں وارد ہے کہ یہ دو خصلتیں جس میں ہوں گی "كَتَبَـهُ اللّٰـهُ شَـاكِرًا وَ صَـابِرًا." (رواه الترمذي، مشكوٰة:۴۴۸ / باب فضل الفقراء) حق تعالیٰ انہیں اپنے فضل سے شاکرین و صابرین میں لکھ دیں گے، اس کے بعد شاکرین وصابرین کے لیے قرآنی ہدایات وتعلیمات پر عمل کرنا آسان ہوجائے گا، ارشادِ ربانی ہے:

﴿إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ٥﴾ (إبراهيم:۵)

معلوم ہوا کہ قرآنی تعلیم وہدایات سے فیض یاب اور زندگی میں کامیاب ہونے

کے لیے شکر وصبر پر عمل ضروری ہے۔

صبر کی حقیقت اور اس کی قسمیں:

اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ من جانب اللہ نعمتیں ہمیشہ ملتی رہتی ہیں، جب کہ مصیبتیں تو کبھی کبھی پیش آتی ہیں، اس کے باجود دنیا میں انسان کو جہاں قدم قدم پر شکر کی ضرورت پڑتی ہے وہاں قدم قدم پر صبر کی بھی ضرورت پڑتی ہے، اس لیے کہ "صبر" کے لفظی معنیٰ تو روکنے کے ہیں، لیکن امام راغب اصفہانیؒ نے "مفردات القرآن" میں "صبر" کی حقیقت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ "هُوَ حَبْسُ النَّفْسِ عَلٰى مَا يَقْتَضِيْهِ الشَّرْعُ وَ الْعَقْلُ." کہ شریعت اور عقل جن چیزوں کا تقاضا کرتی ہیں انہیں انجام دینے کے لیے بندہ کا اپنے نفس کو جمانا اور ان امور کو انجام دینے کے لیے نفس کو ثابت قدم رکھنا۔

اس اعتبار سے اگر غور کریں تو صبر کی ضرورت اللہ رب العزت کی اطاعت و عبادت، اجتناب عن المعصیۃ اور مصیبت کے مواقع میں پیش آتی ہے، یہی وجہ ہے کہ علماء نے صبر کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں:

پہلی قسم صبر علی الطاعات ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت وعبادت میں اگر کوئی مشقت پیش آجائے تو اس پر صبر کرنا، مثلاً سخت سردی میں صبح صبح اُٹھ کر ٹھنڈے پانی سے نماز کے لیے وضو یا غسل کرنے، یا سخت گرمی میں روزہ رکھنے یا مال کی شدید محبت کے باوجود زکوٰۃ وصدقات وغیرہ میں خرچ کرنے پر جو تکلیف پیش آئے ان پر صبر کرنا صبر علی الطاعات ہے۔

صبر کی دوسری قسم صبر علی ترک المعصیۃ ہے، معصیت اور گناہ سے حفاظت کے لیے خواہ کتنی ہی تکلیف کا سامنا کرنا پڑے اس پر صبر کیا جائے، مثلاً نفس گناہ کا بار بار تقاضا کررہا ہے اور گناہ کا پورا پورا موقع بھی ہے کہ کوئی روکنے ٹوکنے والا بھی نہیں، ظاہر بات ہے کہ اس وقت معصیت سے بچنے میں نفس پر بڑا بوجھ پڑ سکتا ہے، لیکن اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی ناراضی و نافرمانی سے بچنے کے لیے اس تکلیف کو برداشت کرتا ہے تو اسے صبر علی ترک المعصیۃ کہتے ہیں۔

صبر کی تیسری قسم صبر علی المصیبۃ ہے، مطلب یہ ہے کہ خلافِ طبع و مزاج کوئی بات پیش آ جائے، مثلاً کوئی بیماری، کوئی پریشانی یا کوئی تنگی وغیرہ پیش آ جائے تو اس وقت حد سے زیادہ پریشان ہونے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی رضا اور ثوابِ آخرت کی نیت سے اس تکلیف کو برداشت کر لینا صبر علی المصیبۃ کہلاتا ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ قرآن و حدیث کی اصطلاح میں صابرین (صبر کرنے والے) ان ہی لوگوں کا لقب ہے جو تینوں طرح کے صبر میں ثابت قدم ہوں۔ (جو لوگ صبر کی تینوں قسموں پر عمل کرنے والے ہیں) (مستفاد از: معارف القرآن: ۱/۴۲)

صبر کے فضائل:

صبر کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ قرآنِ کریم نے دس مواقع پر مختلف انداز میں صبر کی تلقین یا تعریف کی ہے، یا کم از کم اس کا تذکرہ کیا ہے۔ (مستفاد از: راہِ عمل: ۳۸)

جہاں تک صبر کے فضائل کا تعلق ہے تو بعض روایات میں منقول ہے کہ محشر میں ندا دی جائے گی کہ صابرین کہاں ہیں؟ تو وہ لوگ جو تینوں طرح کے صبر پر قائم رہ کر زندگی سے گزرے ہیں وہ کھڑے ہو جائیں گے اور ان کو بلا حساب جنت میں داخلہ کی اجازت دی جائے گی، ابن کثیرؒ نے اس روایت کو نقل کر کے فرمایا کہ آیت کریمہ: ﴿ إِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ (الزمر: ۱۰) سے بھی اس طرف اشارہ ہوتا ہے۔
(از: معارف القرآن: ۱/۴۲)

سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ صبر کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کا اعلان فرمایا ہے: ﴿ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ (آل عمران: ۱۴۶)

علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ کی نصرت و معیت ہماری سب سے بڑی طاقت اور ضرورت ہے، کیوں کہ اگر اللہ تعالیٰ کی نصرت اور معیت ہمارے ساتھ ہے تو دنیا کی کوئی طاقت ہم پر غالب نہیں آ سکتی۔ ﴿ إِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ﴾ (آل عمران: ۱۶۰)

اور اللہ تعالیٰ کی نصرت و معیت صبر کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ (البقرۃ: ۱۵۳)

”اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعہ اللہ کی مدد حاصل کرو، بالیقین اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

دنیا میں انسان کامیاب اور راہ یاب ہونا چاہتا ہے تو قرآنِ پاک نے اس کا طریقہ بتا دیا، چنانچہ فرمایا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا ۟ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ (آل عمران: ۲۰۰)

”اے ایمان والو! صبر سے کام لو اور ایک دوسرے کو بھی صبر پر آمادہ کرو، اور (اللہ تعالیٰ راہ کی میں جد و جہد کے لیے) مستعد اور کمر بستہ رہو، تیار رہو، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو تقویٰ اختیار کرو، جب یہ کام کرو گے تو تم فلاح پاؤ گے۔“

ایک مقام پر صبر کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ فَاصْبِرْ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ (ھود: ۴۹)

”صبر سے کام لو، بلاشبہ اچھا انجام متقین کا ہے۔“

صبر پر تین بشارتیں:

صبر کرنے والوں کو بشارت دی گئی:

﴿ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ (البقرۃ: ۱۵۵)

”صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنا دیجیے۔“

اب یہ خوش خبری کن باتوں کی دی جائے تو ان کی صراحت کرتے ہوئے فرمایا کہ

﴿ أُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ۟ وَ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴾ (البقرۃ: ۱۵۷)

اس آیت کریمہ میں صبر کرنے والوں کو پہلی بشارت یہ دی گئی کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایات ہیں، دوسری بشارت یہ دگئی کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہے، اور تیسری بشارت یہ دی گئی ہے کہ یہی لوگ ہدایت پر قائم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایات سے مراد مغفرت ہے، مطلب یہ ہے کہ مصائب پر صبر کرنے والے آخرت میں اللہ تعالیٰ کی معافی اور مغفرت سے نوازے جائیں گے، اللہ تعالیٰ نے سورۂ احزاب میں جہاں مسلمان مردوں اور عورتوں کے ایمانی اوصاف واخلاق کو بیان فرمایا ان میں صفت صبر کا تذکرہ بھی فرمایا، پھر اخیر میں ان کی مغفرت کا اعلان فرمایا:

﴿ أَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ أَجْرًا عَظِيْمًا۝﴾ (الأحزاب : ۳۵)

’’ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجرِ عظیم تیار رکھا ہے۔‘‘

حدیث پاک میں بھی وارد ہے کہ معمولی مصائب پر صبر کرنا بھی گناہوں کی معافی و مغفرت اور درجات کی بلندی کا ذریعہ ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ وَ عَنْ أَبِیْ سَعِيْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: "مَا يُصِيْبُ الْمُسْلِمَ مِنْ نَصَبٍ وَ لَا وَصَبٍ وَ لَا هَمٍّ وَ لَا حُزْنٍ وَ لَا أَذًى وَ لَا غَمٍّ حَتَّى الشَّوْكَةِ يُشَاكُهَا إِلَّا كَفَّرَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ خَطَايَاهُ." (متفق علیه، مشکوٰة:۱۳٤/ کتاب الجنائز)

یعنی مسلمان کو جب کبھی جسمانی تھکاوٹ یا تکلیف اور ذہنی فکر اور دماغی رنج وغم پہنچتا ہے یا کسی کی طرف سے کوئی بھی تکلیف پہنچتی ہے حتیٰ کہ اگر کانٹا بھی چبھتا ہے (اور وہ اس جسمانی، ذہنی یا فکری تکلیف و پریشانی میں صبر سے کام لیتا ہے) تو حق تعالیٰ اس کی خطاؤں اور گناہوں کو معاف فرمادیتے ہیں۔

ایک حدیث پاک میں صبر کرنے والوں کے لیے گناہوں سے معافی کے ساتھ درجات کی بلندی کی بھی بشارت بیان کی گئی ہے:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَا يُصِيْبُ الْمُؤْمِنَ مِنْ شَوْكَةٍ فَمَا فَوْقَهَا إِلَّا رَفَعَهَا اللّٰهُ بِهَا دَرَجَةً أَوْ حَطَّ عَنْهُ بِهَا خَطِيْئَةً." (مسلم:۲/۳۱۸)

’’جب کسی مؤمن کو کانٹا چبھتا ہے یا اس سے زیادہ کوئی تکلیف پہنچتی ہے (اور وہ اس پر صبر کرتا ہے) تو یہ اس کے درجات کی بلندی یا گناہوں کی معافی کا ذریعہ بنتا ہے۔‘‘

معلوم ہوا کہ دنیوی مصائب وحالات کافروں کے لیے عذاب، گنہگاروں کے لیے گناہوں کی معافی اور نیک لوگوں کے لیے رفع درجات کا سبب ہے۔

مصائب پر صبر کرنے والوں کے لیے قرآنِ کریم نے دوسری خوش خبری یہ دی ہے کہ حق تعالیٰ صرف اُنہیں معاف ہی نہیں کرتے؛ بلکہ اُن کے ساتھ خصوصی رحمت کا معاملہ بھی فرماتے ہیں اور انہیں بے حساب اجر سے نوازتے ہیں۔

آزمائش ہے نشانِ بندگانِ محترم — جانچ ہوتی ہے ان ہی کی جن پہ ہوتا ہے کرم

چنانچہ فرمایا:

﴿ إِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ۝﴾ (الزمر : ۱۰)

’’صبر کرنے والوں کو تو بے حساب اجر دیا جائے گا۔‘‘

حتیٰ کہ حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "يَوَدُّ أَهْلُ الْعَافِيَةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حِيْنَ يُعْطَى أَهْلُ الْبَلَاءِ الثَّوَابَ، لَوْ أَنَّ جُلُوْدَهُمْ كَانَتْ قُرِضَتْ فِي الدُّنْيَا بِالْمَقَارِيْضِ." (رواه الترمذی، مشکوٰة:۱۳۷ /باب عیادة المریض)

’’قیامت کے دِن جب مصائب پر صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر وثواب دیا جائے گا تو اسے دیکھ کر مصائب سے محفوظ رہنے والے یہ تمنا کریں گے کہ کاش! ان کی کھالیں قینچیوں سے کاٹ دی جاتیں۔‘‘

یعنی انہیں بھی دنیا میں سخت سے سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑتا، پھر وہ اس پر صبر کرتے، تاکہ آج انہیں بھی بے حساب اجر سے نوازا جاتا، اس میں صبر کرنے والوں کے لیے بڑی تسلی بھی ہے اور خوش خبری بھی۔

قرآنِ کریم نے تیسری خوش خبری صبر کرنے والوں کو یہ دی کہ وہ ہدایت پر قائم ہیں، اور ظاہر ہے کہ جو لوگ راہ یاب ہیں وہ کامیاب ہیں، ان کا ٹھکانہ جنت ہے، چنانچہ قرآنِ کریم نے جنتیوں کے اَوصاف واخلاق کو بیان کرتے ہوئے سب سے پہلے صفت صبر ہی کو بیان فرمایا:

﴿الصّٰبِرِيْنَ وَ الصّٰدِقِيْنَ وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْمُنْفِقِيْنَ وَ الْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ۝﴾ (آل عمران:١٧)

”صبر کرنے والے، سچ بولنے والے، اللہ کی فرماں برداری کرنے والے، اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے اور رات کے آخری پہر میں اللہ سے مغفرت طلب کرنے والے (جنتی ہیں)۔“

ہم نے کانٹوں میں بھی گلزار کھلا رکھا ہے:

یہی وجہ ہے کہ مؤمنین کاملین نے سخت سے سخت حالات میں بھی صبر کا دامن نہیں چھوڑا۔ منقول ہے کہ عبداللہ بن محمد جہادی مہم کے سلسلے میں مصر کے ایک ساحلی علاقہ میں مقیم تھا، ٹہلتا ہوا ایک بار ساحل سمندر جا نکلا، وہاں دیکھا کہ خیمہ میں ہاتھ پاؤں سے معذور اور آنکھوں کی بینائی سے محروم ایک شخص پڑا ہوا ہے، اس کے جسم میں صرف اس کی زبان سلامت ہے، ایک طرف اس کی یہ حالت ہے، اور دوسری طرف وہ بآوازِ بلند کہہ رہا ہے:

”میرے رب! مجھے اپنی نعمتوں پر شکر کی توفیق عطا فرما، مجھے تو نے اپنی مخلوق میں سے بہت سوں پر فضیلت اور فوقیت بخشی ہے، اس فوقیت پر مجھے اپنی حمد و ثنا کی توفیق عطا فرما“۔

عبداللہ نے یہ دعا سنی تو اسے بڑی حیرت ہوئی، کہ ایک آدمی ہاتھ پاؤں سے معذور ہے، بینائی سے محروم ہے، جسم میں زندگی کی تازگی کا کوئی اثر نہیں، اور وہ اللہ تعالیٰ سے نعمتوں پر شکر کی دعا مانگ رہا ہے، اس کے پاس آکر سلام کیا اور پوچھا: ”حضرت! آپ اللہ تعالیٰ کی

کس نعمت اور فوقیت پر شکر اور حمد وثنا کی توفیق کے خواستگار ہیں؟“ معذور شخص نے جواب میں فرمایا اور خوب فرمایا: ”آپ کو کیا معلوم کہ میرے رب کا میرے ساتھ کیا معاملہ ہے، بخدا، اگر وہ آسمان سے آگ برسا کر مجھے راکھ کر دے، پہاڑوں کو حکم دے کر مجھے کچل دے، سمندروں کو مجھے غرق کرنے کے لیے کہہ دے، اور زمین کو مجھے نگلنے کا حکم دے، تو میں کیا کر سکتا ہوں؟ میرے ناتواں جسم میں زبان کی بے بہا نعمت تو دیکھئے کہ یہ سالم ہے، کیا صرف اس ایک زبان کی نعمت کا میں زندگی بھر شکر ادا کر سکتا ہوں؟“

پھر فرمانے لگے: ”میرا ایک چھوٹا بیٹا میری خدمت کرتا ہے، میں خود معذور ہوں، زندگی کی ضروریات اسی کے سہارے پوری ہوتی ہیں، لیکن وہ تین دِن سے غائب ہے، معلوم نہیں کہ کہاں ہے؟ آپ اس کا پتہ کرلیں تو مہربانی ہوگی۔“

ایسے صابر وشاکر اور محتاج انسان کی خدمت سے بڑھ کر اور سعادت کیا ہو سکتی ہے؟ عبداللہ نے بیابان میں اس کی تلاش شروع کی تو یہ دردناک منظر دیکھا کہ مٹی کے دو تودوں کے درمیان ایک لڑکے کی لاش پڑی ہوئی ہے، جسے جگہ جگہ سے درندوں اور پرندوں نے نوچ رکھا ہے، یہ اسی معذور شخص کے بیٹے کی لاش تھی، اس معصوم کی لاش اس طرح بے گور وکفن دیکھ کر عبداللہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور انہیں یہ فکر لاحق ہوئی کہ اس کے معذور والد کو اس المناک حادثہ کی اطلاع کیسے دے؟ ان کے پاس گئے اور ایک لمبی تمہید کے بعد انہیں اطلاع کر دی، بیٹے کی وحشت ناک موت سے کون ہوگا جس کا جگر پارہ پارہ نہ ہو، لیکن

جائز نہیں اندیشۂ جانِ عشق میں اے دل!   ہشیار! کہ یہ مسلکِ تسلیم و رضا ہے

خبر سن کر معذور والد کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوئے، اگر دل پر غموں کے بادل چھا جائیں تو آنکھوں سے اَشکوں کی برسات شروع ہو جاتی ہے، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے کہ غم کا غبار اَشکوں میں ڈھل کر نکل جاتا ہے، شکوہ وشکایت کے بجائے فرمانے لگے:

”حمد وستائش اُس ذات کے لیے ہے جس نے میری اولاد کو اپنا نافرمان نہیں پیدا کیا اور اسے جہنم کا ایندھن بننے سے بچایا“ پھر ”انا للہ......الخ“ پڑھا، اور ایک چیخ کے ساتھ

سعید روح نے قفسِ عنصری سے گویا یہ کہتے ہوئے آزادی حاصل کرلی کہ

اب اے خیالِ یار نہیں تابِ ضبط کی
بس اے فروغِ برقِ تجلّی کہ جل گئے
اب کیا ستائیں گی ہمیں دوراں کی گردشیں
ہم اب حدودِ سود و زیاں سے نکل گئے

ان کی اس طرح اچانک موت پر عبداللہ کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، کچھ لوگ اس طرف نکلے، انہوں نے رونے کی آواز سنی تو خیمہ میں داخل ہوئے، میت کے چہرے سے کپڑا ہٹایا تو اس سے لپٹ گئے، کوئی ہاتھ چومتا، کوئی آنکھوں کو بوسہ دیتا، ساتھ ساتھ کہے جاتے:

''ہم قربان ان آنکھوں پر جنہوں نے کبھی کسی غیر محرم کو نہیں دیکھا، ہم فدا اس جسم پر جو لوگوں کے آرام کے وقت بھی اپنے مالک کے سامنے سجدہ ریز رہتا، جس نے اپنے رب کی کبھی نافرمانی نہیں کی۔''

عبداللہ یہ صورتِ حال دیکھ کر حیران ہو رہے تھے، پوچھا: ''یہ کون ہیں؟ ان کا کیا تعارف ہے؟'' کہنے لگے: ''آپ ان کو نہیں جانتے؟'' ''یہ رسول اللہ ﷺ کے سچے عاشق اور حضرت ابن عباس؄ کے شاگرد مشہور محدث ابوقلابہؒ ہیں۔''

حدیث کا ادنیٰ طالب علم بھی حضرت ابوقلابہؒ کے نام سے واقف ہے، صبر واستقامت کے پیکر اور تسلیم ورضا کے بلند مقام کے حامل حضرت ابوقلابہؒ کی تجہیز وتکفین اور نماز وتدفین سے فارغ ہونے کے بعد عبداللہ رات کو سوئے تو خواب میں دیکھا کہ آپؒ جنت کے باغات میں سیر وتفریح کر رہے ہیں، جنت کا لباس زیبِ تن ہے اور یہ آیت تلاوت فرما رہے ہیں:

﴿ سَلٰمٌ عَلَيْكُم بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ﴾

''صبر کرنے کے سبب تم پر سلامتی ہو اور آخرت کا گھر بہترین ٹھکانہ ہے''۔

عبداللہ نے پوچھا: ''آپ وہی معذور شخص ہیں؟'' فرمانے لگے: ''جی ہاں، میں

وہی شخص ہوں، اللہ جل شانہ کے یہاں چند بلند مراتب اور درجات ایسے ہیں جن تک رسائی مصیبت میں صبر، راحت میں شکر اور جلوت وخلوت میں خوفِ خدا کے بغیر ممکن نہیں، اللہ تعالیٰ نے اسی صبر وشکر کی بدولت مجھے ان نعمتوں سے سرفراز فرمایا ہے۔''

(کتاب الثقات لابی حاتم ابن حبان: ۵/۳۳)

خلاصہ:

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کے احوال مختلف ہیں، اس لیے کہا گیا ہے کہ ''دَوَامُ الْحَالِ مِنَ الْمُحَالِ'' دنیا کے حالات کبھی یکساں نہیں ہوتے، کبھی خوشی ہے تو کبھی غمی، کبھی راحت ہے تو کبھی مصیبت، کبھی تندرستی ہے تو کبھی بیماری، کبھی خوش حالی ہے تو کبھی تنگ دستی، ان احوالِ مختلفہ میں اہل ایمان کی یہ پہچان ہے کہ وہ موافق حالات میں شکر اور مخالف حالات میں صبر سے کام لیتے ہیں۔ شکر کی وجہ سے نعمت میں اضافہ یا برکت اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے حفاظت ہوتی ہے، اور صبر کی وجہ سے مغفرت، اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت اور ہدایت پر استقامت نصیب ہوتی ہے۔ اس لیے مؤمن کے لیے ہر حال میں بہتری وکامیابی کی بشارت ہے، اگر ہم شکر وصبر کے ان فضائل وفوائد کو مستحضر رکھیں تو خوشی میں شکر اور غمی میں صبر کرنا ہمارے لیے آسان ہوجائے اور یہی حقیقی کامیابی کے دو نسخے ہیں۔

حق تعالیٰ ہم تمام کو توفیقِ عمل سے نوازے۔ آمین۔

۲۰/ شعبان المعظم/ ۱۴۳۹ھ/ بروز: پیر
۷/ مئی/ ۲۰۱۸ء (بزمِ صدیقی، بڑودا)

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيرًا فَصَلُّوا عَلَيْهِ كَثِيرًا كَثِيرًا

(۵)

باپ کی عظمت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ عَبۡدِاللّٰہِ بۡنِ عَمۡرٍو رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡھُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ:" رِضَی الرَّبِّ فِیۡ رِضَی الۡوَالِدِ وَ سَخَطُ الرَّبِّ فِیۡ سَخَطِ الۡوَالِدِ."

(رواہ الترمذی، مشکوٰۃ:۴۱۹/ باب البر والصلۃ / الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ’’اللہ رب العزت کی رضامندی والد کی رضامندی میں ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی والد کی ناراضی میں ہے۔‘‘ (یعنی جس کا ابّا راضی اس کا ربّا راضی)۔

باپ سماج کا مرکزی رُکن ہے:

حق تعالیٰ نے انسانی رشتوں میں ماں کے بعد سب سے زیادہ عظمت، اہمیت اور فضیلت باپ کو عطا فرمائی ہے، غالبًا اس کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ہماری پیدائش اور پرورش کا ابتدائی ذریعہ باپ کو بنایا ہے، چنانچہ قرآنِ پاک میں انسان کی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ إِنَّا خَلَقۡنَا الۡإِنۡسَانَ مِنۡ نُّطۡفَةٍ أَمۡشَاجٍ﴾ (الدھر : ۲)

’’ہم نے انسان کو (مرد و عورت کے) ملے جلے نطفے سے پیدا کیا۔‘‘

دوسرے مقام پر ارشاد ہوا:

﴿ فَلۡيَنۡظُرِ الۡإِنۡسَانُ مِمَّ خُلِقَ ○ خُلِقَ مِنۡ مَّآءٍ دَافِقٍ ○ يَّخۡرُجُ مِنۡ بَيۡنِ الصُّلۡبِ وَ التَّرَآئِبِ ○﴾ (الطارق : ۵-٦-۷)

’’انسان کو اپنی پیدائش میں غور کرنے کی ضرورت ہے، حق تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے انسان کو ایک اُچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیا، یہ قطرۂ آب پہلے باپ کی پشت سے منتقل ہو کر رحم مادر میں گیا، پھر وہاں سے مختلف مراحل گزار کر بہترین شکل وصورت کے ساتھ انسان کو پیدا کیا گیا۔‘‘

معلوم ہوا کہ ہماری پیدائش کے حقیقی سبب تو اللہ رب العالمین ہیں؛ لیکن ظاہری سبب پہلے باپ ہے، اس کے بعد ماں ہے، پھر رحم مادر سے باہر آنے کے بعد صورتِ حال یہ تھی کہ بالکل برہنہ اور بے شعور تھے، جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿ وَ اللّٰہُ أَخۡرَجَكُمۡ مِنۡ بُطُوۡنِ أُمَّھٰتِكُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ شَيۡئًا﴾ (النحل : ۷۸)

’’حق تعالیٰ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے اس حالت میں نکالا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے۔‘‘

واقعہ یہی ہے کہ ہمارے ربِ حقیقی تو اللہ رب العالمین ہی ہیں، لیکن ربِ مجازی والدین ہیں، ہماری پیدائش کے بعد پرورش کا ظاہری ذریعہ بھی اللہ رب العالمین نے والدین ہی کو بنایا ہے، یہی وجہ ہے کہ ماں اور باپ اپنی اولاد کی ضروریات کے علاوہ سہولیات بلکہ بعض اوقات خواہشات تک کا حسب استطاعت انتظام کرتے ہیں، حتیٰ کہ اس کے لیے اپنی جوانی اور زندگی کا بڑا حصہ خرچ کر دیتے ہیں، جس کے نتیجہ میں اولاد زندگی میں بہت کچھ حاصل کر لیتی ہے۔ یاد رکھو کہ اس میں ماں کے بعد بنیادی رول باپ کا ہوتا ہے، کیوں کہ باپ انسانی سماج اور سوسائٹی کا مرکزی رُکن اور اہم ستون ہے۔

وہ تھے محرومِ تعلیم سے، مگر تجھ کو پڑھایا ہے — پسینہ حد سے بڑھ کر بھی تیرے خاطر بہایا ہے
کھڑا رہتا ہے تو آج جو شاہوں میں سر اُٹھا کر — تیرے والد نے تجھے اس قابل بنایا ہے

اس لیے ماں کے بعد سب سے زیادہ عظمت واہمیت باپ ہی کو حاصل ہے۔

باپ کی رضامندی میں رب کی رضامندی ہے:

باپ کی عظمت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ حق تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں جن مختلف چیزوں کی عظمت شان بیان کرنے کے لیے قسمیں کھائی ہیں منجملہ ان کے ایک باپ بھی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ وَ وَالِدٍ وَّ مَا وَلَدَ۝ ﴾ (البلد : ٣)

’’اور میں قسم کھاتا ہوں باپ (مراد سیدنا آدم علیہ السلام) اور اس کی اولاد کی۔‘‘

یہاں باپ کی قسم اس لیے کھائی تا کہ اولاد کے دلوں میں اس کی عظمت اور اہمیت پیدا ہو۔ مزید باپ کی عظمت کا اندازہ یوں بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ رب العزت کی رضا سے بڑھ کر اور کوئی کامیابی نہیں، چنانچہ فرمایا:

﴿ وَ رِضْوَانٌ مِنَ اللّٰهِ أَكْبَرُ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۝ ﴾ (التوبۃ : ٧٢)

’’اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی سب سے بڑی چیز ہے، (یہ وہ چابی ہے جس سے جنت کا دروازہ کھلتا ہے، اور یہ چابی جنت والوں ہی کو نصیب ہوگی) یہی تو زبردست کامیابی ہے۔‘‘

یوں تو اللہ رب العالمین کو راضی کرنے والے اعمال مختلف ہیں، ان میں ایک آسان عمل ماں باپ کی رضا بھی ہے، مذکورہ حدیث میں اگرچہ صرف باپ ہی کا ذکر ہے، لیکن ماں اس میں بدرجۂ اولیٰ داخل ہے، کیوں کہ اس کا مقام باپ سے بھی زیادہ ہے، الغرض مذکورہ حدیث پاک میں ارشاد ہے کہ جس سے اس کا ابّا راضی ہوگیا سمجھ لو کہ اس سے اس کا اللہ بھی راضی ہوگیا، اور جس نے بلا کسی شرعی وجہ کے اپنے ابّا کو ناراض کردیا اس کے

لیے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا آسان نہیں، لہٰذا اپنے اللہ کو اگر راضی کرنا ہو تو اپنے ابّا کو بھی راضی کرلو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جنت کی چابی ہے، تو ابّا جنت کا دروازہ ہے، حدیث پاک میں وارد ہے:

’’اَلْوَالِدُ أَوْسَطُ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ، فَإِنْ شِئْتَ فَحَافِظْ عَلَى الْبَابِ أَوْ ضَيِّعْ.‘‘

(رواہ الترمذی و ابن ماجہ، مشکوۃ : ٤١٩-٤٢٠)

’’والد جنت کا درمیانی (نہایت اہم) دروازہ ہے، اب تمہاری مرضی ہے کہ چاہو تو اس کے ساتھ حسن سلوک (مراد اس کی اطاعت، خدمت اور دعا) کے ذریعہ اسے محفوظ رکھو یا پھر اسے ضائع کردو۔‘‘

یاد رکھو کہ اگر جنت میں داخل ہونے کے لیے چابی ضروری ہے تو دروازہ بھی ضروری ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کو راضی کر کے جنت کی چابی حاصل کرلو، پھر ابّا کو راضی کر کے بآسانی جنت کے درمیانی دروازہ سے داخل ہوجاؤ، اس سے بڑی کوئی کامیابی نہیں۔

باپ کی دعا اولاد کے حق میں قبول ہوتی ہے:

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ باپ کی رضا کی طرح اس کی دعا کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے، بلکہ کتاب وسنت کی روشنی میں عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اگر باپ کی رضا سے اولاد کی جہنم جنت سے بدل سکتی ہے تو اس کی دعا سے اولاد کی بگڑی ہوئی تقدیر بھی بدل سکتی ہے، باپ کی دعا اَولاد کے حق میں ایسے قبول ہوتی ہے جیسے نبی کی دعا اُمتی کے حق میں، اس لیے کہ حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ باپ کی دعا اولاد کے حق میں قبول ہوتی ہے، چنانچہ حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:’’ ثَلَاثُ دَعَوَاتٍ مُسْتَجَابَاتٍ لَا شَكَّ فِيْهِنَّ، دَعْوَةُ الْوَالِدِ، وَ دَعْوَةُ الْمُسَافِرِ، وَ دَعْوَةُ الْمَظْلُوْمِ.‘‘

(رواہ الترمذی و أبوداود وابن ماجہ، مشکوۃ : ١٩٥/ کتاب الدعوات)

"تین دعائیں (یا بددعائیں) ضرور قبول کی جاتی ہیں، ان کی قبولیت میں کوئی شک نہیں: (١) باپ کی دعا (یا بددعا اولاد کے حق میں) (٢) مسافر کی دعا (اس کے ساتھ احسان کرنے والے کے حق میں یا بددعا اس کو نقصان پہنچانے والے کے حق میں) (٣) مظلوم کی دعا (اس کے محسن، منصف اور مددگار کے حق میں اور بددعا ظالم کے حق میں) ضرور قبول ہوتی ہے، لہٰذا باپ کی رضامندی اور دعا حاصل کرنے کے لیے اس کے ساتھ حسن سلوک بہر صورت لازم ہے۔ اور حسن سلوک کا مطلب یہ ہے کہ تمام جائز اور مباح اُمور (باتوں) میں اس کی اطاعت کی جائے، اسی کے ساتھ حتی الامکان اس کی (جسمانی یا مالی) خدمت کی جائے، البتہ بہتر یہ ہے کہ باپ کی جسمانی خدمت بیٹا کرے اور ماں کی جسمانی خدمت بیٹی کرے، رہی بات مالی خدمت کی، تو ہمارے علماء نے نفقہ اور خرچ کے تحت فرمایا ہے کہ باپ اگر کمانے سے معذور اور تنگ دست ہو تو اولاد پر اس کا نفقہ واجب ہے۔

نیز زندگی میں اور موت کے بعد ان کے حق میں دعائیں کرنا بھی حسن سلوک میں داخل ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ کے ساتھ حسن سلوک کا واقعہ:

ظاہر ہے کہ اولاد کے لیے ان تمام حقوق کی ادائیگی حسن سلوک کے ساتھ اس وقت تو آسان ہے جب کہ باپ مؤمن ہو، اولاد سے محبت کرنے والا ہو، بلکہ اولاد کی ضروریات، سہولیات اور ان کی تمناؤں کا خیال رکھنے والا ہو، لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو پھر یقیناً وہ موقع اولاد کے لیے بڑی آزمائش والا ہوتا ہے، پھر شریعت اور کتاب وسنت کی تعلیم وہدایت یہی ہے کہ اس وقت بھی ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک ہی کا معاملہ کیا جائے، قرآنِ کریم نے اس سلسلہ میں سیدنا ابراہیم خلیل علیہ السلام کا بے مثال واقعہ پیش فرمایا، آپ علیہ السلام کا

وطن بابل کے علاقہ میں تھا، جہاں نمرود کی حکومت تھی، وہاں کے لوگ تو بت پرست تھے ہی، لیکن خود آپ علیہ السلام کا باپ آزر بھی مشرک اور بت پرست بلکہ بت ساز تھا، مگر آپ نے اپنے باپ کے ساتھ ہمیشہ حسن سلوک ہی کیا، حتیٰ کہ جب باپ نے اپنے حقیقی بیٹے کو قتل تک کی دھمکی دی تب بھی بیٹے ابراہیم علیہ السلام نے حسن سلوک کا دامن نہیں چھوڑا، قرآنِ کریم نے اس واقعہ کو اس طرح بیان فرمایا:

﴿ وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ إِبْرٰهِيْمَ إِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ○ ﴾ (مریم: ٤١)

"محبوبم! کتابِ مبین میں میرے ابراہیم خلیل کا واقعہ بھی پڑھ لیجیے نا، بلاشبہ وہ صدیق (ہمیشہ سچ بولنے والے، یا ان کا ظاہر وباطن یکساں اور سچا تھا اور) نبی تھے۔"

﴿ إِذْ قَالَ لِأَبِيْهِ يٰٓأَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَ لَا يُبْصِرُ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا ○ يٰٓأَبَتِ إِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ○ يٰٓأَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ إِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ○ يٰٓأَبَتِ إِنِّيْٓ أَخَافُ أَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ○ ﴾ (مریم: ٤٢-٤٣-٤٤-٤٥)

"اے میرے ابّا! یہ جن بتوں کو تم رَبّا مان بیٹھے ہو یہ تو تم سے بھی گئے گزرے ہیں، ان سے تو تمہارا مقام بہت اونچا ہے، تم تو سنتے بھی ہو، دیکھتے بھی ہو اور کچھ نہ کچھ کسی کو فائدہ بھی پہنچا سکتے ہو، لیکن یہ تو سن بھی نہیں سکتے، دیکھ بھی نہیں سکتے اور کسی بھی قسم کا کوئی فائدہ بھی نہیں پہنچا سکتے، نہ کوئی دُکھ، درد یا تکلیف دور کر سکتے ہیں، ابّا جی! اگرچہ میں آپ کا بیٹا ہوں، لیکن رب العالمین نے مجھے اپنی معرفت وہدایت کا جو علم عطا فرمایا ہے وہ تمہارے پاس نہیں، اس لیے تم اگر میری بات مان لوگے تو راہ یاب اور کامیاب ہو جاؤ گے، پدرِ من! شرک کی تمام راہیں شیطانی ہیں، اور شیطان عاصیٔ رحمٰن ہے، اے میرے والد! مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں شیطان کی دوستی آپ کے لیے رحمٰن کی گرفت کا ذریعہ نہ بن جائے، شیطانِ رجیم کی دوستی چھوڑ کر ربِ رحیم سے اپنا تعلق درست کرلو۔"

سیدنا ابراہیم خلیل علیہ السلام کی اس بصیرت اور حکمت بھری دعوت کا ان کے والد

نے کوئی اچھا اثر تو نہ لیا، اُلٹا ناراض ہو کر کہنے لگا:

﴿ قَالَ أَ رَاغِبٌ أَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَ اهْجُرْنِيْ مَلِيًّا۝﴾ (مریم : ٤٦)

”تم میرے معبودوں کے منکر ہونا! اس لیے ان کے خلاف باتیں کرتے ہو، میں تمہیں صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ تم اپنی اس حرکت (دعوت الی الہدایۃ) سے باز آ جاؤ، ورنہ میں تمہیں پتھر مار مار کے ختم کر دوں گا، اور یاد رکھو! اب تمہارا اور میرا کوئی تعلق نہیں، میں تم سے لاتعلق ہوں، لہٰذا تم مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دو۔“

باپ کی اس بد اخلاقی کا جواب آپ علیہ السلام نے کس خوش اخلاقی کے ساتھ دیا، ملاحظہ فرمائیں:

﴿ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا۝﴾ (مریم:٤٧)

”میں آپ کو (رخصتی کا) سلام کرتا ہوں، میں آپ کو ہدایت تو نہیں دے سکتا، مگر ہدایت کی دعا ضرور کروں گا، جب تک اُمید کی آخری کرن باقی رہے گی میں آپ کے لیے اپنے رب سے معافی مانگتا رہوں گا، بلاشبہ وہ مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔“

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے وطن سے ہجرت فرما کر ملک شام تشریف لے گئے۔

باپ کے ساتھ حسن سلوک بہترین نیکی اور بدسلوکی بدترین برائی ہے:

قرآنِ کریم میں اس واقعہ کے ذریعہ یہ ہدایت دی گئی ہے کہ باپ خواہ کتنا ہی برا ہو، مگر اولاد کا فرض بنتا ہے کہ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ حسن سلوک کرے، حتیٰ کہ باپ کی وجہ سے اُس کے رِشتہ داروں اور دوستوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کی ترغیب دی گئی ہے؛ بلکہ اسے

ایک حدیث پاک میں بہترین نیکی فرمایا:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ” إِنَّ مِنْ أَبَرِّ الْبِرِّ صِلَةَ الرَّجُلِ أَهْلَ وُدِّ أَبِيْهِ بَعْدَ أَنْ يُوَلِّيَ.“ (رواه مسلم، مشكوٰة: ٤١٩، باب البر والصلة)

”کسی کے والد کی وفات ہو جائے یا سفر وغیرہ کی وجہ سے موجود نہ ہوں، تو اُن کی غیر موجودگی میں اُن کے دوستوں کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرنا یہ بہترین نیکی ہے۔“

غور کیجیے! جب باپ کے دوستوں اور ملنے جلنے والوں سے حسن سلوک بہترین نیکی ہے تو خود باپ سے حسن سلوک تو بدرجۂ اولیٰ بہت بڑی اور بہترین نیکی ہوگا، اور اگر باپ کے ساتھ حسن سلوک بہترین نیکی ہے تو اس کے ساتھ بدسلوکی کرنا بدترین برائی بھی ہے، حسن سلوک کی حقیقی اور مکمل جزا اور بدسلوکی کی سزا تو آخرت ہی میں ملے گی، مگر اس کا کچھ حصہ اس دنیا میں بھی ضرور ملتا ہے، دنیا کا ہر سمجھ دار انسان اس کا مشاہدہ کرسکتا ہے کہ جن لوگوں نے اپنے ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کیا دنیا ہی میں ان کی اولاد نے ان سے کچھ زیادہ ہی اچھا سلوک کیا، اس کے برخلاف جن بدنصیب لوگوں نے اپنے والدین کے ساتھ برا سلوک کیا ان کی اولاد نے ان کے ساتھ ان سے بھی بدترین سلوک کیا۔ پھر یہ تو والدین کے ساتھ بدسلوکی کی حقیقی اور مکمل سزا نہیں ہے؛ بلکہ دنیا میں اس کا ایک معمولی حصہ اور ادنیٰ نمونہ ہوتا ہے، حقیقی اور مکمل سزا تو آخرت میں ہوگی۔ العیاذ باللہ۔

ایک عبرت ناک واقعہ:

اس سلسلہ میں امام اصمعیؒ نے ایک عبرت ناک واقعہ نقل فرمایا ہے کہ ایک بزرگ کسی ایسے شخص کی تلاش میں نکلے جو اپنے والد کا بڑا نافرمان اور ان کے ساتھ بدترین سلوک کرنے والا ہو، کسی جگہ انہوں نے دیکھا کہ ایک کنویں پر سخت دھوپ میں دوپہر کے وقت نہایت ضعیف بوڑھا شخص اپنے گلے میں رسّی ڈال کر بڑے ڈول سے پانی کھینچ رہا ہے، جس کے پیچھے ہی ایک نہایت مضبوط نوجوان شخص نگرانی کے لیے کھڑا ہے، جو ذرا سی سستی اور کوتاہی

پر اس بوڑھے کو کوڑے سے مارتا تھا، یہ عبرت ناک منظر دیکھ کر بزرگ نے نوجوان شخص کو غیرت دلائی کہ ''اس بوڑھے پر تجھے رحم نہیں آتا؟'' سن کر نوجوان کہنے لگا: ''اس میں رحم کی کیا بات ہے؟ یہ بوڑھا تو میرا باپ ہے، یہ بھی اپنی جوانی میں اسی کنویں پر کھڑا ہو کر اپنے باپ کو اسی کوڑے سے مارتا تھا، یہ بھی اپنے والد کے ساتھ وہی سلوک کرتا تھا جو آج میں اس کے ساتھ کر رہا ہوں۔'' (المحاسن للبیہقی: ۴۰۱، مستفاد از: جامع قرآنی وعظ: ۹۷)

ان حقائق کے پیش نظر یہ کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں کہ ماں باپ کے ساتھ اولاد کا سلوک ایک قرض کی حیثیت رکھتا ہے، جو آخرت سے قبل دنیا میں بھی بہر حال ضرور چکانا پڑتا ہے۔

دعا فرمائیے کہ حق تعالیٰ ہمیں اپنے والدین کے ساتھ بہترین سلوک کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہر قسم کی بدسلوکی سے ہم تمام کی حفاظت فرمائے۔ آمین۔

۲۷/ جمادی الاخریٰ/ ۱۴۳۹ھ/ بروز جمعہ، قبل المغرب

۱۶/ مارچ/ ۲۰۱۸ء (بزمِ صدیقی، بڑودا)

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيرًا　　فَصَلُّوا عَلَيْهِ كَثِيرًا كَثِيرًا

۶۲
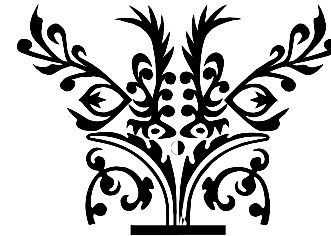
(۶)

ماں کا مقام

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَجُلٌ: ”يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ! مَنْ أَحَقُّ بِحُسْنِ صَحَابَتِيْ؟ قَالَ: أُمُّكَ، قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: أُمُّكَ، قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: أُمُّكَ، قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: أَبُوْكَ، ثُمَّ أَدْنَاكَ، أَدْنَاكَ“.

(متفق علیه، مشکوٰة:۴۱۸، باب البر و الصلة)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رحمت عالم ﷺ سے ایک شخص (ترمذی اور ابوداود کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سائل حضرت معاویہ بن حَیدہ قشیریؓ تھے) نے عرض کیا: میرے حسن سلوک کا سب سے (پہلے اور) زیادہ حق دار کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہاری ماں، عرض کیا: پھر کون؟ فرمایا: تمہاری ماں، عرض کیا: پھر کون؟ فرمایا: تمہاری ماں، عرض کیا: پھر کون؟ (تو چوتھی دفعہ میں آپ ﷺ نے) فرمایا: تمہارا باپ، اس کے بعد جو تمہارے قریبی رشتہ دار ہوں، پھر جو قریبی رشتہ دار ہوں۔ (درجہ بہ درجہ ان کا حق ہے)۔

ماں، محبت ورحمت کی علامت ہے:

اللہ رب العزت نے اپنی شانِ ربوبیت اور رحمت ومحبت کا نمونہ دُنیا کو دِکھانے کے لیے ماں کو پیدا فرمایا، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی کتنے پیار سے پرورش کرتے ہیں، ان کے ساتھ کتنی شفقت ومحبت فرماتے ہیں اور ان کی غلطیوں کو کتنی جلدی بآسانی معاف فرما دیتے ہیں اس کا واقعی اور صحیح اندازہ لگانا ہو تو ماں اور اولاد کے رشتۂ محبت میں غور کر لیجیے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ماں کسی بھی نوع اور جنس سے کیوں نہ ہو؛ اس کے دل میں اپنی اولاد کے لیے بے پناہ پیار، محبت اور شفقت ہوتی ہے، آپ جنگل کے درندوں، چرندوں اور پرندوں کے حالات میں غور کرلیں تو ان میں بھی ہر ماں کے دل میں اپنی اولاد کے لیے شفقت ومحبت کے بے پناہ جذبات پائیں گے، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک شیرنی جو درندگی کی علامت ہے؛ مگر اس میں بھی اپنے بچوں کے لیے حد درجہ اپنائیت اور محبت ہوتی ہے، اسی طرح ایک چڑیا اور بلی اپنے بچوں کی حفاظت کے لیے انسان تک سے ٹکرا جاتی ہے، حتیٰ کہ گیدڑ جو بزدلی میں ضرب المثل ہے؛ مگر اس کی مادہ بھی اپنی اولاد کے تحفظ کی خاطر انسانوں پر حملہ کر دیتی ہے، جب جنگل کے درندوں، چرندوں اور پرندوں کی ماؤں میں اس قدر ممتا اور شفقت ومحبت ہوتی ہے تو انسانوں کی ماؤں میں ممتا اور محبت وشفقت کتنی زیادہ ہوگی اس کا اندازہ لگانا کسی سمجھ دار کے لیے مشکل نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ ماں خواہ جنگلوں، سمندروں، شہروں اور دیہاتوں غرض جہاں کہیں بھی ہو اور جس حال میں بھی ہو، تندرستی میں، بیماری میں، مال داری میں یا ناداری میں بہر حال وہ محبت ورحمت کی علامت ہے۔

ماں کی ممتا کا اَثر انگیز واقعہ:

حدیث پاک میں ماں کی ممتا اور محبت وشفقت کا ایک اَثر انگیز واقعہ منقول ہے:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: جَاءَتْنِيْ مِسْكِيْنَةٌ تَحْمِلُ ابْنَتَيْنِ لَهَا، فَأَطْعَمْتُهَا ثَلَاثَ تَمَرَاتٍ، فَأَعْطَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا تَمْرَةً، وَ رَفَعَتْ إِلٰى فِيْهَا تَمْرَةً

۶۳

لِتَأْكُلَهَا، فَاسْتَطْعَمَتْهَا ابْنَتَاهَا، فَشَقَّتِ التَّمْرَةَ الَّتِيْ كَانَتْ تُرِيْدُ أَنْ تَأْكُلَهَا بَيْنَهُمَا، فَأَعْجَبَنِيْ شَأْنُهَا، فَذَكَرْتُ الَّذِيْ صَنَعَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، فَقَالَ: " إِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَوْجَبَ لَهَا بِهَا الْجَنَّةَ، أَوْ أَعْتَقَهَا بِهَا مِنَ النَّارِ".

(رواه مسلم: ۲/۳۴۰، باب فضل الإحسان إلى البنات)

حضرت عائشہؓ ایک مرتبہ کا واقعہ بیان فرماتی ہیں کہ ایک غریب مسکین عورت اپنی دو بچیوں کے ساتھ آئی تو میں نے اس عورت کو تین کھجوریں دیں، اس پیکرِ محبت وشفقت نے فوراً اپنی دونوں بچیوں کو ایک ایک کھجور کھلا دی، تیسری کھجور خود کھانے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ دونوں لڑکیوں نے پھر کھجور طلب کی، تو اس ممتا بھری ماں نے خود بھوکی رہ کر اس کھجور کے دو ٹکڑے کیے اور دونوں بچیوں کو آدھی آدھی دے دی، سیدہ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے یہ منظر دیکھ کر بڑا تعجب ہوا، جب حضور ﷺ تشریف لائے تو میں نے ممتا کی ماری ماں کا یہ اثر انگیز واقعہ حضور ﷺ کے سامنے بیان کیا، اس موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ رب العزت نے اس (ماں کی شفقت وایثار کے نتیجہ میں اس) پر جنت واجب کر دی اور اسے دوزخ سے آزادی عطا فرمائی۔ یہ حال دنیا کی ہر ماں کا ہوتا ہے۔

ماں کا مرتبہ:

غالباً یہ اسی کا ثمرہ ونتیجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ماں کو اتنا عظیم مرتبہ اور مقام عطا فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے بعد ساری مخلوق میں اِتنا بڑا مرتبہ کسی اور کو نہیں ملا، چنانچہ حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ جَاهِمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا: أَنَّ جَاهِمَةَ جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ: " يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَرَدْتُ أَنْ أَغْزُوَ، وَ قَدْ جِئْتُ أَسْتَشِيْرُكَ، فَقَالَ: هَلْ لَكَ مِنْ أُمٍّ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: فَالْزَمْهَا، فَإِنَّ الْجَنَّةَ عِنْدَ رِجْلِهَا". (رواه أحمد والنسائي، مشكوٰة: ۴۲۱)

حضرت معاویہ بن جاہمہؓ سے مروی ہے کہ میرے والد جاہمہؓ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضور! میں غزوہ میں شرکت کا ارادہ کر رہا ہوں، جس

کے لیے آپ سے مشورہ درکار ہے، فرمائیے کیا کروں؟ آپ ﷺ نے پوچھا: کیا تمہاری ماں ہیں؟ انہوں نے عرض کیا: ہاں، ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: پھر تو اپنی ماں کے پاس رہو اور ان کی خدمت کرتے رہو، اس لیے کہ جنت اس کے قدموں کے نیچے ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جیسے خلوصِ نیت کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ اور غزوہ میں شرکت حصولِ جنت کا ذریعہ ہے، اسی طرح خلوصِ نیت کے ساتھ ماں کی خدمت بھی حصولِ جنت کا ذریعہ ہے، اللہ تعالیٰ نے جنت کو ماں کے قدموں میں رکھ دیا۔ سبحان اللہ،

صاحبو! ماں سے بڑھ کر کسی کا کیا مقام ہوگا، جس کے پیروں تلے جنت ہے اس کے سر کا کیا مقام ہوگا؟

بقولِ شاعرِ مشرق:

سیرتِ فرزندہا از اُمہات — جوہرِ صدق وصفا از اُمہات
گفت آں مقصودِ حرفِ کن فکاں — زیرِ پائے اُمہات آمد جناں

اس بنا پر عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ جس گھر میں ماں ہے وہ گھر نہیں؛ جنت ہے، (بشرطیکہ اس کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے) اور جس گھر میں ماں نہیں وہ گھر نہیں؛ قبرستان ہے۔

اور ماں کی دعا دعاؤں کی ماں ہے، یعنی جو مقام تمام لوگوں میں ماں کا ہے وہ مقام تمام دعاؤں میں ماں کی دعا کا ہے۔

ماں حسن سلوک کی سب سے پہلے اور سب سے زیادہ مستحق ہے:

اگر ہمارے پاس گھر میں ماں ہے تو یہ بہت بڑی دولت ہے، اس عظیم الشان دولت کی حفاظت کرنی چاہیے، جہاں تک اس کے ساتھ حسن سلوک کی بات ہے تو اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق میں حسن سلوک کی سب سے پہلی اور سب سے زیادہ مستحق ماں ہے، کیوں کہ اس کا مرتبہ اور مقام سب سے اونچا ہے، قرآنِ کریم نے اس کی طرف متوجہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ وَ وَصَّیۡنَا الۡإِنۡسَانَ بِوَالِدَیۡهِ إِحۡسٰنًا ؕ حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ كُرۡهًا وَّ وَضَعَتۡهُ كُرۡهًا ؕ وَ حَمۡلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوۡنَ شَهۡرًا ؕ﴾ (الأحقاف : ٢٥)

اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا، (لیکن ماں کا مقام چوں کہ بہت بلند ہے، اور اپنی اولاد کے لیے جو مشقت ومصیبت ماں نے اُٹھائی ہے وہ باپ سے بہت زیادہ ہے، اس لیے باپ کے مقابلہ میں ماں حسن سلوک کی تین گنا زیادہ مستحق ہے، جیسا کہ حدیث مذکورہ میں بھی اس کی طرف اشارہ موجود ہے، کیوں کہ ماں نے اپنی اولاد کے لیے تین قسم کی ایسی تکلیفیں اُٹھائی ہیں جن کی باپ کو خبر بھی نہیں ہے: (١) ماں نے حمل کے زمانہ میں نو مہینے تک اپنے بچے کو پیٹ میں رکھا اور اس پورے زمانہ میں مختلف قسم کی بیماریوں اور مشقتوں کو برداشت کیا، بالخصوص آخری ایام میں تو صورتِ حال یہ تھی کہ کسی کروٹ آرام نہ تھا، کبھی اِس کروٹ، کبھی اُس کروٹ، تو کبھی چت لیٹتی، غرض یہ کہ حمل کا پورا زمانہ اپنی اولاد کی خاطر اضطراب اور بے چینی میں گزارا، اسی کو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ﴿ حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ كُرۡهًا ﴾ اس کی ماں نے بڑی مشقت سے اُسے (پیٹ میں) اُٹھائے رکھا، (اور جگہ دی، اب تم بھی اُسے اپنے گھر میں رکھو اور دل میں جگہ دو) (٢) اس کے بعد جب بچہ کی ولادت کا وقت آیا تو ﴿ وَ وَضَعَتۡهُ كُرۡهًا ﴾ بڑی مشقت اور مصیبت کے ساتھ اس کو جنا۔ یادرکھو کہ ماں کی یہ مشقت اولاد کی ساری زندگی کی خدمت پر بھاری ہے۔ ولادت کے وقت جاں کنی کا جو منظر ماں نے دیکھا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ (٣) پھر ولادت کے بعد جو مرحلہ آتا ہے وہ بھی کوئی معمولی نہیں ہے، فرمایا: ﴿ وَ حَمۡلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوۡنَ شَهۡرًا ﴾ ولادت کے بعد ماں نے اپنا خونِ جگر دودھ بنایا اور اولاد کو سینے سے لگا کر پلایا، اور اسی پر اکتفاء نہیں کیا؛ بلکہ اس زمانہ میں حالت یہ تھی کہ خود بھوکی رہ کر بچوں کو کھلاتی، خود پیاسی رہ کر بچوں کو پلاتی، خود جاگ کر بچوں کو سلاتی، ظاہر ہے کہ یہ تکلیفیں اور مشقتیں صرف ماں نے اپنی اولاد کی خاطر برداشت کی ہیں، اس لیے وہ باپ کے مقابلہ میں حسن سلوک کی تین گنا زیادہ مستحق ہے۔ لہٰذا اس کے ساتھ وفاداری کا معاملہ کرو، اداکاری کا نہیں۔

ماں اگر نیک نہ ہو تب بھی اس کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے:

ماں اگر خدانخواستہ نیک نہ ہو، حتیٰ کہ مشرکہ یا کافرہ ہو، تب بھی بحیثیت ماں وہ حسن سلوک کی مستحق ہے، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِيْ بَكْرٍؓ قَالَتْ:" قَدِمَتْ عَلَيَّ أُمِّيْ وَ هِيَ مُشْرِكَةٌ فِيْ عَهْدِ قُرَيْشٍ، فَقُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنَّ أُمِّيْ قَدِمَتْ عَلَيَّ وَ هِيَ رَاغِبَةٌ، أَفَأَصِلُهَا؟ قَالَ: نَعَمْ صِلِيْهَا". (متفق عليه، مشكوٰة : ٤١٨)

حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ جو سیدہ عائشہؓ کی دوسری ماں سے بڑی بہن تھیں، دورِ جاہلیت میں حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنی بیوی قتیلہ بنت عبدالعزیز یا عبدالعزیٰ کو جن کے بطن سے سیدہ اسماءؓ تھیں طلاق دے کر الگ کر دیا تھا، صلح حدیبیہ کے بعد جب کہ مکہ والوں کو مدینہ اور مدینہ والوں کو مکہ جانے کی آزادی حاصل ہوگئی تو اسی زمانہ میں حضرت اسماءؓ کی والدہ کچھ گھی اور پنیر لے کر اپنی بیٹی اسماء بنت ابوبکرؓ کے گھر آئیں، تب حضرت اسماءؓ نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میری ماں حالت شرک میں میرے پاس آئی ہیں تو کیا میں ان کے ساتھ صلہ رحمی کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کے ساتھ صلہ رحمی (اور حسن سلوک) کرو، جو ماں کا حق ہے، اسی موقع پر حق تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی جس میں ارشاد فرمایا:

﴿ لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۝ ﴾ (الممتحنة : ٨)

''حق تعالیٰ نے تمہیں ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک، احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کیا جو تم سے دین کے معاملہ میں نہیں لڑے اور تمہیں گھروں سے نہیں نکالا، یقیناً اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے''۔ (مستفاد از انوار البیان: ٥/ ٣٦٩، معارف الحدیث: ٦/ ٥٤)

حضرت ابو ہریرہؓ کا واقعہ:

حق یہ ہے کہ ماں اگر نیک نہ ہو؛ بلکہ مشرکہ ہو تب بھی اس کے ساتھ خصوصی طور پر حسن اخلاق وسلوک اور دعاؤں کا اہتمام کرنا چاہیے، کیا بعید ہے کہ حق تعالیٰ اسے حسن اَخلاق وحسن سلوک اور دعا کی برکت سے ہدایت عطا فرمادے، جیسا کہ سیدنا ابوہریرہؓ کی والدہ کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا، منقول ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کی والدہ ماجدہ جوانی ہی میں بیوہ ہوگئی تھیں؛ لیکن اولاد کی پرورش کی خاطر دوسری شادی نہیں کی، ان کے بیٹے حضرت ابوہریرہؓ ان کی بڑی تعظیم وتکریم کرتے تھے، حضرت ابوہریرہؓ اپنے قبیلہ کے سردار حضرت طفیل بن عمرو دوسیؓ کے ہاتھ پر ٦ھ میں مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے، مگر آپؓ کی والدہ اس وقت ایمان نہ لائیں، آپؓ ان کو جب اسلام کی دعوت پیش کرتے تو وہ ٹھکرا دیتیں، جو آپؓ کے لیے بڑی سخت آزمائش تھی، حتیٰ کہ ایک مرتبہ تو جب آپؓ نے اسلام کی دعوت پیش کی تو نہ صرف یہ کہ اسے ٹھکرا دیا؛ بلکہ حضور ﷺ کی شان میں نازیبا کلمات بھی کہہ گئیں، جس سے سیدنا ابوہریرہؓ کو سخت صدمہ پہنچا، آپؓ روتے ہوئے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: حضور! "اُدْعُ اللّٰهَ أَنْ يَهْدِيَ أُمَّ أَبِيْ هُرَيْرَةَ". میری والدہ کے لیے ہدایت کی دعا فرمادیجیے، حضور ﷺ نے اسی وقت دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور دعا فرمائی: " اَللّٰهُمَّ اهْدِ أُمَّ أَبِيْ هُرَيْرَةَ".

(رواه مسلم/ باب من فضائل أبي هريرة الدوسيؓ، مشكوٰة : ٥٣٥، باب في المعجزات)

اس دعا کے بعد فوراً حضرت ابوہریرہؓ دربارِ رسالت سے واپس ہوئے، اس موقع پر ہمارے شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیمؒ نے اپنے مخصوص خطیبانہ انداز میں فرمایا کہ ''ابوہریرہؓ دوڑ پڑے تو کسی نے روک کر پوچھا: ابوہریرہ! کیا بات ہے؟ فرمایا: مت روکو، مجھے جانے دو! آج میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ میں گھر پہلے پہنچتا ہوں یا میرے محبوب کی دعا؟ اور واقعی آپؓ کے گھر پہنچنے سے پہلے آقا ﷺ کی دعا پہنچ چکی تھی، گھر پہنچے تو دروازہ بند تھا اور والدہ غسل کر رہی تھیں، جب دروازہ کھلا تو غسل کی وجہ سے پانی کے قطرے موتیوں کی طرح

ٹپک رہے تھے، فرمانے لگیں: بیٹا! تمہارے گھر سے جانے کے بعد میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی کہ اللہ کے رسول ﷺ کے بغیر بھی کوئی زندگی ہے؟ میرے ضمیر نے اللہ اور اس کی رسول ﷺ کی غلامی میں آنے کا فیصلہ کرلیا، اس لیے بیٹا! تم گواہ بن جاؤ: "أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ".

صاحبو! اولاد کے لیے اس سے بڑی سعادت اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے والدین کی ہدایت کا ذریعہ بن جائے۔ جَعَلَنَا اللّٰهُ مِنْهُمْ.

والدین کے ساتھ حسن سلوک میں تین چیزیں داخل ہیں:

کتاب وسنت سے معلوم ہوتا ہے کہ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک میں تین چیزیں داخل ہیں:

(۱) ان کے لیے ساری زندگی دعائیں کرتے رہنا، قرآنِ پاک میں اس کی ترغیب دی گئی ہے: ﴿وَ قُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْرًا﴾ (بنی إسرائیل:٢٤) "ربِ کریم! جس طرح انہوں نے میرے بچپن میں مجھے پالا ہے آپ بھی ان کے ساتھ رحمت کا معاملہ فرمائیے۔" ربِ کریم! ہمارے ماں باپ نے ہماری پرورش میں جو مشقت برداشت کی ہے آپ اسے ان کے گناہوں کا کفارہ اور دخولِ جنت کا ذریعہ بنا دیجئے، ربِ کریم! ماں باپ کی دعائیں ہمارے حق میں قبول فرمالیجئے، بددعاؤں سے بچالیجئے اور ہمیں دارین میں ان کی نیک نامی و کامیابی کا ذریعہ بنادیجئے۔ غرض ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک میں پہلی چیز ان کے حق میں دعاؤں کا اہتمام کرنا کرانا ہے۔

(۲) ان کی خدمت کرنا، یوں تو ماں اور باپ دونوں ہی کی خدمت حسن سلوک میں داخل ہے، لیکن خدمت ماں کی مقدم ہے اور اطاعت باپ کی۔ (فتاویٰ عالم گیری: ٥/٣٦٥)

حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے اس بات کو اظہارِ نعمت کے طور پر خصوصیت کے ساتھ بیان فرمایا کہ ﴿وَ بَرًّا بِوَالِدَتِيْ وَ لَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا﴾ (مریم:٣٢) "حق تعالیٰ نے مجھے اپنی والدہ کا خدمت گزار اور فرماں بردار بنایا ہے، سرکش اور سنگ دل نہیں بنایا۔"

ماں کی خدمت مغفرت اور دخولِ جنت کا سبب ہے:

واقعہ یہی ہے کہ ماں کی خدمت بہت بڑی سعادت ہے، کیوں کہ حدیث پاک سے یہ مضمون ثابت ہے کہ ماں کی خدمت مغفرت اور دخولِ جنت کا سبب ہے، چنانچہ حدیث پاک میں منقول ہے:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا: أَنَّ رَجُلًا أَتَى النَّبِيَّ ﷺ، فَقَالَ: "يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنِّيْ أَصَبْتُ ذَنْبًا عَظِيْمًا، فَهَلْ لِيْ مِنْ تَوْبَةٍ؟ قَالَ: "هَلْ لَكَ مِنْ أُمٍّ؟ قَالَ: لَا، قَالَ: هَلْ لَكَ مِنْ خَالَةٍ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: فَبِرَّهَا". (رواہ الترمذی:٢/١٢)

ایک شخص نے دربارِ رسالت میں حاضر ہوکر عرض کیا: حضور! مجھ سے ایک بہت بڑا گناہ ہوگیا ہے، (اب میں اس گناہ پر شرمندہ ہوں، معافی چاہتا ہوں) تو کیا میرے لیے معافی کی کوئی گنجائش ہے؟ آپ ﷺ نے پوچھا: کیا تمہاری والدہ زندہ ہیں؟ عرض کیا: نہیں، فرمایا: اگر ماں نہیں تو خالہ زندہ ہیں؟ عرض کیا: جی ہاں، خالہ موجود ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ان کی خدمت کرو، اس کی برکت سے حق تعالیٰ تمہاری توبہ قبول فرمائے گا اور تمہاری مغفرت فرمادے گا۔

یوں تو تمام اعمالِ صالحہ میں حق تعالیٰ نے یہ خاصیت رکھی ہے کہ ان کی برکت سے گناہ (بشرطیکہ ان کا تعلق حقوق العباد سے نہ ہو) معاف ہوجاتے ہیں، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئٰتِ﴾ (ہود:١١٤) "نیکیاں گناہوں کو مٹادیتی ہیں۔" لیکن بعض اعمالِ صالحہ اور نیکیوں کو اس بارے میں غیر معمولی امتیازی شان حاصل ہے، منجملہ

ان کے ماں کی خدمت وہ نیکی بلکہ عبادت ہے جو گناہوں کی مغفرت کا سبب ہے، حتیٰ کہ ماں کی غیر موجودگی میں خالہ (اور نانی) جو ماں کے درجہ میں ہیں ان کی خدمت بھی مغفرت اور اللہ تعالیٰ کی رضا ورحمت کا سبب ہے۔

حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" دَخَلْتُ الْجَنَّةَ، فَسَمِعْتُ فِيْهَا قِرَاءَةً، فَقُلْتُ: مَنْ هٰذَا؟ قَالُوْا: حَارِثَةُ بْنُ النُّعْمَانِ، كَذَالِكُمُ الْبِرُّ، كَذَالِكُمُ الْبِرُّ، كَذَالِكُمُ الْبِرُّ، وَ كَانَ أَبَرَّ النَّاسِ بِأُمِّهٖ".

(رواه البغوی فی شرح السنة، و البیهقي فی شعب الإيمان، مشكوٰة : ٤١٩)

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے (خواب میں) دیکھا کہ میں جنت میں ہوں، اور وہاں میں نے کسی کی قراءت کی آواز سنی، تو حیرت سے دریافت کیا کہ یہ کون ہے جو یہاں جنت میں قرآن کی تلاوت کررہا ہے؟ فرشتوں نے جواب دیا کہ یہ حارثہ بن نعمانؓ ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ واقعی، ماں کی خدمت کی یہی فضیلت ہے، اور وہ لوگوں میں سب سے زیادہ اپنی ماں کے خدمت گزار اور اطاعت شعار تھے، جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو جنت میں یہ مقام عطا فرمایا۔ اس سے ماں کی خدمت واطاعت کی عظیم فضیلت ثابت ہوئی۔

ماں کی اطاعت پر امام ابوحنیفہؒ کا واقعہ:

ماں کے ساتھ حسن سلوک میں تیسری چیز تمام (جائز اور مباح امور میں) اس کی اطاعت کرنا ہے، ہمارے بزرگوں نے اس کا کتنا اہتمام کیا ہے اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت امامنا العلام امام اعظم ابوحنیفہؒ کے متعلق امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ امام صاحبؒ کی والدہ نے کسی بات پر کھائی ہوئی قسم توڑنے کا ارادہ کیا، تو اس کے کفارہ سے متعلق امام صاحبؒ سے کہنے لگیں کہ فلاں واعظ سے معلوم کرکے آؤ کہ قسم کا کفارہ کیا ہے؟ حالانکہ وہ واعظ امام صاحبؒ کے شاگردوں سے بھی کم درجہ کے تھے، مگر آپؒ کی والدہ کو بڑی

عقیدت تھی، امام صاحبؒ کی بھی کمالِ اطاعت دیکھئے! بلا چون و چرا واعظ کے پاس جاکر والدہ کا مسئلہ پیش کردیا، واعظ نے کہا کہ حضرت! مجھے تو خود اس کا جواب نہیں آتا، آپ ہی بتا دیجئے، آپؒ نے صحیح جواب بتایا تو وہ واعظ (جو امام ابو یوسفؒ کے خالو تھے اور ان کا نام ابوطالب تھا) نے عرض کیا: "قُلْ لَهَا عَنِّيْ: "إِنَّ الْجَوَابَ كَذَا وَ كَذَا". حضرت! میری جانب سے اپنی والدہ کو یہ جواب بتا دیجئے، حضرت امامؒ نے اسی طرح کیا۔ اس سے ماں کی کمالِ اطاعت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

زیادہ سعادت مندی کی بات تو یہ ہے کہ حکم سے پہلے ہی اس کی (جائز اور مباح) چاہت کو پورا کیا جائے، حضرت اُسامہ بن زیدؓ نے ایک موقع پر فرمایا:

"لَا تَسْأَلُنِيْ شَيْئًا أَقْدِرُ عَلَيْهِ إِلَّا أَعْطَيْتُهَا".

(المعجم الکبیر للطبرانی: ١/١٥٩، ماخوذ از: ماں کی عظمت: ۱۵۲)

''اس دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کی میری والدہ نے خواہش کی اور میں نے اس کو حتی الامکان پورا نہ کیا ہو۔''

یقیناً ماں کی جائز چاہت کی تکمیل ہماری بہت بڑی سعادت ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو والدین کا مطیع وفرماں بردار بنائے اور ان کے حقوق کو ادا کرنے والا بنائے۔ آمین۔

مؤرخہ: ۲۹/ جمادی الاولیٰ/ ۱۴۳۹ھ/ قبل الجمعۃ

مطابق: ۱۶/ فروری/ ۲۰۱۸ء (بزمِ صدیقی)

الحمدللہ، مؤرخہ: ۲۳/ جمادی الاولیٰ/ ۱۴۳۹ھ مطابق: ۱۰/ فروری/ ۲۰۱۸ء بروز سنیچر رات بعد نمازِ عشاء متصلاً محمد مسجد مہابلی پورم میں ماہانہ اصلاحی مجلس کی ابتداء ہوئی، جس کا یہ پہلا موضوع منتخب ہوا، حق تعالیٰ شرفِ قبولیت سے نوازے۔ آمین۔

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيْرًا فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيْرًا كَثِيْرًا

(۷)

اعمالِ صالحہ میں سبقت: علامتِ سعادت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ هُرَیۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ أَنَّ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: بَادِرُوۡا بِالۡأَعۡمَالِ سَبۡعًا، هَلۡ تَنۡتَظِرُوۡنَ إِلَّا فَقۡرًا مُنۡسِيًا، أَوۡ غِنًى مُطۡغِيًا، أَوۡ مَرَضًا مُفۡسِدًا، أَوۡ هَرَمًا مُفَنِّدًا، أَوۡ مَوۡتًا مُجۡهِزًا، أَوِ الدَّجَّالَ فَشَرٌّ غَائِبٍ يُنۡتَظَرُ، أَوِ السَّاعَةَ، فَالسَّاعَةُ أَدۡهٰى وَ أَمَرُّ". (رواه الترمذی، مشکوٰة: ٤٤١ / کتاب الرقائق / الفصل الثانی)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اعمال کو انجام دینے میں سات چیزوں سے سبقت کر جاؤ، (مطلب یہ ہے کہ جو سات چیزیں آئندہ بیان کی جارہی ہیں ان کے پیش آنے سے پہلے ابھی موقع غنیمت جان کر اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرلو) کیا تم انتظار کرتے ہو ایسے فقر کا جو بھلا دینے والا ہے (ابھی وسعت وفرصت ہے تو نیک کام کرلو، ورنہ وہ فقر بھی آسکتا ہے جس میں بندہ اپنے مآل سے بھی بے خبر ہوجاتا ہے۔ العیاذ باللہ) یا کیا تم انتظار کرتے ہو ایسی مال داری کا جو بندہ کو سرکشی میں مبتلا کردے؟ یا کیا تم ایسے مرض کا انتظار کرتے ہو جو تمہارے جسم کو خراب کردے؟ یا پھر سٹھیا دینے والے بڑھاپے کا انتظار کرتے ہو؟ یا تمہیں ناگہانی موت کا انتظار ہے؟ (موت کا کیا بھروسہ؟ ابھی زندگی اور موقع ہے، اس کی قدر کرتے ہوئے نیک اعمال کا اہتمام کرو) یا تمہیں دجال کا انتظار ہے؟

٦٨

جو اَن دیکھی چیزوں میں سب سے بدترین چیز ہے، (دجال جب ظاہر ہوگا اس وقت انسان بڑے خطرناک فتنوں میں مبتلا ہوجائے گا، کہیں ایسا نہ ہو کہ اچانک دجال آجائے اور آج جو تمہیں کچھ نیکی وبھلائی کا موقع ملا ہے وہ نہ مل پائے، لہٰذا اِسی وقت اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرلو) یا کیا تمہیں قیامت کا انتظار ہے؟ جو بڑی مصیبت اور کڑوی حقیقت ہے، (اُس وقت کسی کے لیے عمل کا کوئی موقع نہ ہوگا، لہٰذا آج کے وقت کو غنیمت جانو، اور اعمال کو بھلا دینے والی فقیری، سرکشی میں مبتلا کرنے والی مال داری، نڈھال اور بے کار کردینے والی بیماری، بدحواسی میں مبتلا کردینے والے بڑھاپے، ناگہانی موت، خروجِ دجال اور وقوعِ قیامت سے قبل آج بلکہ ابھی نیکیوں اور اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرلو، تاخیر نہ کرو، ورنہ یہ قیمتی موقع ہاتھ سے نکل جانے کے بعد سوائے حسرت کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ والعیاذ باللہ العظیم)۔

اعمالِ صالحہ میں جلدی کرنا محمود ہے:

اللہ رب العالمین نے بطورِ امتحان ہر انسان کو قوتِ فکر وعمل عطا فرما کر اس میں نیکی و بدی کی صلاحیت بھی پیدا فرمائی ہے، یہی وجہ ہے کہ نفس انسانی میں فسق وفجور کے جذبات بھی اُبھرتے ہیں اور نیکی و بھلائی کے جذبات بھی اُمنڈتے ہیں، اب یہ کسی بھی انسان کی سمجھ داری وسعادت مندی کی بات ہے کہ وہ اپنی قوتِ فکر وعمل کا صحیح استعمال کرکے بدی و برائی سے بچے اور نیکی و بھلائی کی طرف سبقت کرے اور آگے بڑھے، شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ دنیا کا ہر انسان اپنی قوتِ فکر وعمل کا غلط استعمال کرکے بدی اور برائی کی طرف بڑھے، چنانچہ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

﴿اَلشَّیۡطٰنُ یَعِدُکُمُ الۡفَقۡرَ وَ یَاۡمُرُکُمۡ بِالۡفَحۡشَآءِ﴾ (البقرة: ٢٦٨)

''شیطان تمہیں فقر ومفلسی سے ڈراتا ہے اور تمہیں بے حیائی کی ترغیب دیتا ہے۔''

اس کے برخلاف رحمان یہ چاہتا ہے کہ انسان اپنی قوتِ فکر وعمل کا صحیح استعمال کرے، اللہ تعالیٰ کی قدرت وعظمت میں غور وفکر سے کام لے، تاکہ اس کی عبادت واطاعت

کا داعیہ وجذبہ دل میں پیدا ہو، پھر جیسے ہی دل میں اس کی عبادت واطاعت اور نیکی کا جذبہ
پیدا ہو تو بلا تاخیر نیکی کی طرف بڑھے، اعمالِ صالحہ میں سبقت کرے، بلکہ ان میں سرعت سے
کام لے، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَ سَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ﴾ (آل عمران : ١٣٣)

’’(لوگو!) اپنے رب کی مغفرت اور جنت (والے اعمال) کی طرف (بڑھنے
میں) ایک دوسرے سے بڑھ کر تیزی دِکھاؤ۔‘‘

معلوم ہوا کہ اعمالِ صالحہ کی ادائیگی میں جلدی کرنا یعنی نیکی کا خیال آتے ہی اس کی
طرف جلدی سے متوجہ ہو جانا؛ بلکہ اس میں مقابلہ ومسابقہ کرنا محمود ومطلوب ہے، اور یہ
علامت سعادت ہے، اس لیے کتاب وسنت میں اس کی ترغیب دی گئی ہے۔

نیکی کا خیال اور موقع اللہ تعالیٰ کا انعام ہے:

شیطان انسان کا دشمن ہے، وہ بہت بڑا ٹیچر بھی ہے اور بہت بڑا چیٹر بھی، وہ ہر ایک
کو الگ الگ طریقہ سے گمراہ کرتا ہے، مثلاً جب کسی مسلمان بندہ کے دل میں نیکی کا خیال آتا
ہے تو شیطان عموماً اس بندے کو براہِ راست اعمالِ صالحہ نہ کرنے کا مشورہ نہیں دیتا؛ بلکہ تاخیر کا
مشورہ دیتا ہے کہ کل کر لینا، اتنی بھی کیا جلدی ہے، ساری زندگی موقع ہے، کبھی بھی کیا جا سکتا
ہے، وغیرہ، اس طرح شیطان ایک مسلمان بندہ کو اعمالِ صالحہ سے محروم کرنے کی کوشش کرتا
ہے، کسی شاعر نے ایسے ہی موقع کی ترجمانی کرتے ہوئے کیا خوب کہا ہے:

ہر شبے گویم کہ فردا ترکِ ایں سودا کنم   باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

کہ ہر رات یہ ارادہ کرتا ہوں کہ کل یہ ساری حرکتیں چھوڑ دوں گا، (توبہ کر کے گناہ
سے باز آ جاؤں گا) لیکن جب کل ہوتی ہے تو میں آج کو کل بناتا ہوں، پھر میں آج کے عمل کو
کل پر ٹال دیتا ہوں، اس طرح یہ سلسلہ روزانہ جاری رہتا ہے۔

تو اس طرح شیطان انسان کو توبہ، تلافی اور نیکی میں تاخیر کا مشورہ دے کر محروم کرنا
چاہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کتاب وسنت میں ہمیں صرف توبہ، تلافی اور نیکی کی ترغیب ہی نہیں
دی گئی؛ بلکہ اس میں سرعت اور جلدی کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے، اس کی حکمت یہ ہے کہ اگر
توبہ، تلافی اور نیکی میں تاخیر کی اور اس کو کل پر ٹال دیا تو پہلی بات یہ ہے کہ کل تو کیا؟ پل کا بھی
بھروسہ نہیں، قرآنِ پاک میں ارشاد ہے:

﴿وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا﴾ (لقمان : ٣٤)

کل کیا ہونے والا ہے؟ یہ راز اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، بقولِ شاعر:

کل نہ آئی کبھی اور نہ آئے گی کل   کل تو کیا؟ ایک پل کا بھروسہ نہیں

اور اگر کل آ بھی گئی تو کیا پتہ جو ارادۂ خیر اور توبہ، تلافی اور نیکی کا داعیہ آج اور ابھی
پیدا ہوا ہے وہ باقی بھی رہتا ہے یا نہیں، اور اگر یہ داعیہ باقی بھی رہا تو ہو سکتا ہے فرصت و
وسعت اور وہ حالات واسباب میسر نہ ہوں، اس بنا پر عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ کسی بھی
سعادت مند بندہ کے دل میں نیکی کا خیال آنا اور اس پر عمل کا موقع مل جانا بھی اللہ تعالیٰ کا
بہت بڑا انعام اور اس کا مہمان ہے، اس کی قدردانی یہی ہے کہ ارادۂ خیر پر موقع ملتے ہی عمل
کی کوشش کرنی چاہیے، اسی کو مسارعت الی الخیر کہتے ہیں، جو محمود ہے، لیکن یاد رکھو! عمل کی
ادائیگی میں جلدی کرنا اور تیزی برتنا عجلت کہلاتا ہے، جو مذموم ہے۔

حضور ﷺ کا عملی نمونہ

اس سلسلہ میں حضور پاک ﷺ کا عملی نمونہ بھی موجود ہے، چنانچہ بخاری شریف کی
روایت ہے کہ حضرت ابوسروعہ عقبہ بن حارثؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ نبی کریم
ﷺ کے پیچھے مدینہ منورہ میں نمازِ عصر پڑھی، جب آپ ﷺ نے سلام پھیرا تو آپ ﷺ
خلافِ عادت جلدی سے اُٹھے اور لوگوں کی گردنوں کو پھلانگتے ہوئے ازواجِ مطہرات میں
سے کسی کے حجرہ میں تشریف لے گئے، یعنی لوگوں کے اُٹھنے کا بھی انتظار نہیں فرمایا، آپ ﷺ

کی اس جلدی اور تیزی کو دیکھ کر حضرات صحابہؓ حیران ہوئے کہ پتہ نہیں کیا معاملہ پیش آ گیا، پھر تھوڑی دیر کے بعد حضور ﷺ حجرۂ مبارکہ سے باہر تشریف لائے تو آپ ﷺ نے محسوس کیا کہ میرے اس طرح جلدی جانے کی وجہ سے میرے صحابہؓ کو تعجب ہو رہا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ کیا بات ہو گی؟ آپ ﷺ نے حضرات صحابہؓ کی حیرانی دور کرنے کے لیے فرمایا:

"ذَكَرْتُ شَيْئًا مِنْ تِبْرٍ عِنْدَنَا، فَكَرِهْتُ أَنْ يَحْبِسَنِي، فَأَمَرْتُ بِقِسْمَتِهِ".

(رواه البخاری، مشكوٰة: ١٦٦/ باب الإنفاق و كراهية الإمساك)

کہ دراصل مجھے یاد آیا کہ گھر میں کچھ سونا رکھا ہوا ہے، تو میں نے اس بات کو ناپسند سمجھا کہ وہ سونا مجھے روک لے، مطلب یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کو خرچ کرنے میں تاخیر ہو جائے، لہٰذا سلام پھیرتے ہی میں جلدی سے اُٹھ کر گھر گیا اور جلدی سے اس کے صدقہ کا انتظام کیا۔

نیکیوں میں سبقت کی ترغیب:

حضور ﷺ نے اپنے اس عمل سے امت کو یہ سبق دیا کہ نیکی اور صدقہ وخیرات میں بالکل تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ ارشادِ باری بھی یہی ہے:

﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ (المائدة: ٤٨)

"نیکیوں اور بھلائی کے کاموں میں جلدی کرو۔"

مطلب یہ ہے کہ نیکی کا خیال آنے کے بعد موقع ملتے ہی فوراً عملی جامہ پہنانے کی پوری کوشش کرنی چاہیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں کوئی حاجت وضرورت یا ایسی حالت پیش آجائے کہ موقع ہاتھ سے نکل جائے اور چاہتے ہوئے بھی وہ عمل خیر کر نہ سکیں۔

تین اعمال میں تاخیر نہ کرنی چاہیے:

احادیث مبارکہ میں بھی اعمالِ صالحہ کے متعلق سبقت ومسارعت کی ترغیب دی گئی

ہے، مثلاً ایک حدیث میں وارد ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "بَادِرُوْا بِالْأَعْمَالِ فِتَنًا". (رواه مسلم، مشكوٰة: ٤٦٢)

"فتنوں سے پہلے نیکیوں میں جلدی کرو۔"

ایک اور حدیث میں ہے:

عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: "يَا عَلِيُّ! ثَلَاثٌ لَا تُؤَخِّرْهَا، الصَّلٰوةُ إِذَا أَتَتْ، وَ الْجَنَازَةُ إِذَا حَضَرَتْ، وَ الْأَيِّمُ إِذَا وَجَدْتَ لَهَا كُفُوًا". (رواه الترمذی، مشكوٰة: ٦١/ باب تعجيل الصلوٰة)

اے علی! تین اعمال ایسے ہیں جن کی ادائیگی میں بالکل تاخیر نہ کرو: (۱) نماز، جب اس کا وقت ہو جائے (تو اسے وقت سے بے وقت کر کے نہ پڑھو، ہر نماز کو اس کے مستحب وقت میں ادا کرو۔) (۲) جنازہ جب تیار (یا حاضر) ہو جائے (تو اس کی نماز اور تکفین و تدفین وغیرہ میں تاخیر نہ کرو۔) (۳) بے نکاح کے لیے جب کوئی مناسب رِشتہ مل جائے (تو پھر طویل عرصہ تک منگنی کا رشتہ برقرار رکھنے کے بجائے) نکاح میں جلدی کرو۔

یہ وہ تین اعمال ہیں جن میں حضور ﷺ نے جلدی کرنے کا حکم فرمایا اور تاخیر سے منع فرمایا، ان کے علاوہ مطلقاً بھی آپ ﷺ نے دیگر اعمالِ صالحہ میں مسارعت اور مبادرت کی ترغیب دی ہے، جیسا کہ حدیث مذکورہ میں ارشاد ہوا کہ "بَادِرُوْا بِالْأَعْمَالِ سَبْعًا" سات چیزیں ایسی ہیں جن کے پیش آنے کے بعد اعمالِ صالحہ کا اہتمام آسان نہیں، ان سے پہلے پہلے اعمالِ صالحہ کی ادائیگی میں سرعت وعجلت سے کام لو، ورنہ اگر وہ سات چیزیں پیش آ گئیں تو پھر عمل کرنا مشکل ہو سکتا ہے، اس لیے (۱) اللہ کی عبادت سے غفلت میں مبتلا کر دینے والی محتاجی پیش آ جائے اس سے پہلے اعمالِ صالحہ کا اہتمام کر لو۔ (۲) ایسی مال داری جو انسان کو سرکشی، عیاشی اور فحاشی میں مبتلا کر دے، اس سے پہلے پہلے اعمالِ صالحہ کا اہتمام کر لو۔ (۳) ایسی بیماری جو انسان کو معذور و مجبور کر دے اس کے پیش آنے سے پہلے پہلے اعمالِ

صالحہ کا اہتمام کرلو۔ (۴) ایسا بڑھاپا جو انسان کو بدحواس اور بدحال کردے، اس سے پہلے پہلے اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرلو۔ (۵) اچانک موت آجائے اور زندگی کا خاتمہ ہوجائے تو پھر کچھ نہیں کرسکو گے، تب کف افسوس ملتے ہوئے یہ نہ کہنا پڑے:

﴿رَبِّ لَوْلَآ أَخَّرْتَنِيْٓ إِلٰٓى أَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَأَصَّدَّقَ وَ أَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ۝﴾

(المنافقون : ۱۰)

کاش! مجھے میرے رب کی طرف سے اور مہلت اور موقع مل جائے، تاکہ میں صدقہ وخیرات اور اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرلوں۔

اس وقت کے آنے سے پہلے آج موقع ہے، لہٰذا موقع سے خوب فائدہ اُٹھاؤ اور اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرلو۔ (۶) اسی طرح جب خروجِ دجال کا زمانہ آئے گا تو وہ وقت فتنوں کا ہوگا، اُس دورِ فتن میں عمل کرنا سب کے بس کی بات نہ ہوگی، اس سے پہلے پہلے اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرلو۔ (۷) نیز وقوعِ قیامت کے بعد تو کسی کے لیے کسی عمل کی گنجائش ہی نہ ہوگی، دنیا دارالعمل اور آخرت دارالجزاء ہے، آج عمل ہے، جزا نہیں، کل جزا ہوگی اور عمل کا موقع نہیں ہوگا، لہٰذا لوگو! ان سات چیزوں کے پیش آنے سے پہلے پہلے اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرو۔

ان حقائق سے معلوم ہوا کہ اعمالِ صالحہ کا خیال آنے کے بعد موقع ملتے ہی اس میں جلدی کرنی چاہیے، تاخیر سے کام نہیں لینا چاہیے۔

اعمالِ صالحہ میں سبقت پر ایک عجیب واقعہ:

حضراتِ صحابہؓ وصلحاء نے ان باتوں اور حقائق کو سمجھا تھا، اس لیے ان کا حال یہ تھا کہ جب کبھی کسی کو اعمالِ صالحہ کا موقع مل جاتا تو وہ اس میں تاخیر نہ کرتا، ایک صحابیؓ کا نہایت عجیب واقعہ منقول ہے کہ ۳ھ میں غزوۂ اُحد کے موقع پر ایک صحابی نے حضور ﷺ سے دریافت کیا:

عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ: قَالَ رَجُلٌ لِلنَّبِيِّ ﷺ يَوْمَ أُحُدٍ: "أَ رَأَيْتَ إِنْ قُتِلْتُ فَأَيْنَ

۷۱

أَنَا؟" اگر میں جنگ میں شرکت کے بعد دشمنوں کے ہاتھ مارا جاؤں تو میرا انجام کیا ہوگا؟ اور میرا ٹھکانہ کہاں ہوگا؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "فِي الجَنَّةِ" پھر تو تم جنت میں ہوگے، یہ سننا ہی تھا کہ "فَأَلْقٰى تَمَرَاتٍ فِيْ يَدِهٖ، ثُمَّ قَاتَلَ، حَتّٰى قُتِلَ".

(متفق علیه، مشکوٰة: ۳۴۲/ باب القتال فی الجهاد)

صحابیؓ نے اپنے ہاتھ میں جو کھجوریں تھیں انہیں پھینک دیا اور دشمنوں سے مقابلہ کے لیے آگے بڑھے یہاں تک کہ جامِ شہادت نوش فرمایا۔ اندازہ لگایئے کہ ان صحابیؓ نے شوقِ شہادت اور جہاد کے لیے اتنی تاخیر بھی گوارا نہ کی کہ ہاتھ میں جو کھجوریں تھیں انہیں کھا لیتے، حالانکہ ایسی بات نہیں تھی کہ وہ شوقیہ کھجور کھا رہے تھے؛ بلکہ ان دنوں ان حضرات کو فقر و فاقہ کی وجہ سے کوئی چیز عموماً میسر نہ آتی، جب کھجور وغیرہ مل جاتی تو اسی سے بھوک مٹا لیتے، ان صحابیؓ کے پاس بھی اس وقت بھوک مٹانے کے لیے چند کھجوریں تھیں، جن سے وہ اپنی بھوک مٹا رہے تھے، لیکن جب سرکارِ دوعالم ﷺ سے جہاد فی سبیل اللہ میں شرکت اور شہادت کی فضیلت کے متعلق سنا کہ تم جنت میں جاؤ گے، تو ہاتھ میں موجود کھجوریں کھانے تک کا انتظار نہیں فرمایا، کھجوریں وہیں پھینک دیں اور دشمن سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوگئے۔ صحابیِ رسول ﷺ کا جذبہ دیکھئے کہ نیکی کا ارادہ پیدا ہونے کے بعد انہوں نے ذرہ برابر تاخیر نہیں ہونے دی۔

اعمالِ صالحہ میں سبقت پر مزید واقعات:

اعمالِ صالحہ میں سبقت پر یہی ایک واقعہ نہیں؛ بلکہ حیاۃ الصحابہ میں ایسے کئی واقعات ملتے ہیں۔ مثلاً:

(۱) اصحابِ صفہؓ کے علاوہ بھی جو غریب صحابہؓ تھے انہیں ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی کہ نیکیوں میں اضافہ کیسے ہو اور ہم بھی مالدار صحابہؓ سے اجر و ثواب میں آگے بڑھ جائیں، چنانچہ اس نیک جذبے کا اظہار ان حضرات نے آپ ﷺ کے سامنے کیا تو آپ ﷺ نے

ہر نماز کے بعد ۳۳ رمرتبہ سبحان اللہ، ۳۳ رمرتبہ الحمد للہ اور ۳۴ رمرتبہ اللہ اکبر پڑھنے کی ترغیب دی تو وہ خوش ہو گئے اور بلا تاخیر عمل شروع کر دیا؛ لیکن جب اس بات کا پتہ مال دار صحابہؓ کو چلا تو انہوں نے بھی فوراً یہ عمل شروع کر دیا، حضور ﷺ صحابہ کرامؓ کے ان جذباتِ صالحہ سے خوش ہو گئے۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ: ۸۹)

(۲) سیدنا صدیق اکبرؓ تو اعمالِ صالحہ میں سبقت کرنے والوں میں مشہور ہی تھے، منقول ہے کہ ایک مرتبہ مجلس صحابہؓ میں شرکاء سے آپ ﷺ نے پوچھا: بتاؤ! آج تم میں سے کس نے روزہ رکھا ہے؟ صدیق اکبرؓ نے عرض کیا: میں نے، پھر آپ ﷺ نے سوال کیا: آج کس نے جنازہ میں شرکت کی ہے؟ صدیق اکبرؓ نے کہا: میں نے، آپ ﷺ نے پوچھا: آج کس نے مسکین کو کھانا کھلایا؟ صدیق اکبرؓ نے کہا: میں نے، پھر آپ ﷺ نے سوال کیا: آج کس نے مریض کی عیادت کی؟ صدیق اکبرؓ نے کہا: میں نے، اس پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"مَا اجْتَمَعْنَ فِيْ امْرِءٍ إِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ". (رواہ مسلم، مشکوٰۃ: ۱۶۷)

"جس شخص میں یہ ساری خوبیاں جمع ہو جائیں وہ ضرور جنت میں جائے گا۔"

(۳) نیز منقول ہے کہ غزوۂ تبوک کی تیاری کے موقع پر حضور ﷺ نے جن حضرات صحابہؓ کو حسب قدرت واستطاعت مالی امداد کی عام ترغیب دی تو ہر مخلص نے بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیا، ان میں جود وسخا کے پیکر سیدنا عثمان غنیؓ ایک تھیلی میں ایک ہزار دینار لے کر حاضر خدمت ہوئے اور حضور ﷺ کی گود میں ڈال دیے، حضور ﷺ نے خوش ہو کر فرمایا:

"مَا ضَرَّ عُثْمَانَ مَا عَمِلَ بَعْدَ الْيَوْمِ مَرَّتَيْنِ". (مسند أحمد، مشکوٰۃ: ۵۶۱)

"آج کے بعد عثمان جو چاہیں کریں، انہیں کوئی نقصان نہ ہوگا۔"

اسی موقع پر صحابیاتؓ نے بھی اپنے زیورات بڑی فراخ دلی سے پیش کیے، تو صدیق اکبرؓ کیسے پیچھے رہ جاتے؟ فاروقِ اعظمؓ کا بیان ہے کہ اس موقع پر میں اپنے گھر گیا اور آدھا مال لے کر حاضر ہو گیا، دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ آج تو میں انفاق فی سبیل اللہ میں ابوبکرؓ سے

سبقت لے جاؤں گا؛ لیکن تھوڑی دیر میں دیکھا کہ صدیق اکبرؓ اپنے گھر کا سارا مال وسامان لے کر حاضر ہو گئے، جب حضور ﷺ نے پوچھا کہ گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا؟ تو عرض کیا:

"أَبْقَيْتُ لَهُمُ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ".

"ان کے لیے تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی کافی ہیں۔"

ہمارے شاہ صاحب علامہ سید عبد المجید ندیمؒ نے اس کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا:

پروانے کو چراغ، عنادل پھول بس — صدیقؓ کے لیے خدا اور رسول بس

صدیق اکبرؓ نے عرض کیا: حضور! جو فانی ہے وہ لایا ہوں اور جو باقی ہے وہ چھوڑ آیا ہوں، یہ مال ومتاع تو فانی ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت لازوال ہے، وہی چھوڑ کر آیا ہوں۔

اس وقت سیدنا فاروقِ اعظمؓ نے فرمایا کہ میں ساری عمر کوشش کرتا رہا؛ لیکن اعمالِ صالحہ میں صدیق اکبرؓ سے کبھی آگے نہ بڑھ سکا۔

"لَا أَسْبِقُهٗ إِلٰى شَيْءٍ أَبَدًا". (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ: ۵۵۶)

(۴) اسی طرح ایک بزرگ کا واقعہ منقول ہے، حضرت ابو الحسنؒ ایک مرتبہ پائخانہ میں تھے، وہیں ان کے دل میں صدقہ کا خیال آیا، تو خادم کو فوراً صدقہ کر دینے کا حکم دیا، اس نے تعمیل ارشاد کے بعد دریافت کیا کہ حضرت! آپ بیت الخلاء سے فراغت تک انتظار کر لیتے، فرمایا: میرے دل میں صدقہ کا ارادہ آیا تو مجھے اپنے نفس پر بھروسہ نہیں ہوا کہ وہ فراغت تک کہیں اس ارادہ میں تبدیلی پیدا نہ کر دے، اس لیے میں نے فوراً اس پر عمل کر لینا مناسب سمجھا۔ (مستفاد از: مظاہر حق جدید: ۴/ ۲۰۸)

حضرات صحابہؓ اور صلحاء کا یہ حال تھا، ہمارا حال یہ ہے کہ جب کبھی دل میں کارِ خیر کا ارادہ اور داعیہ پیدا ہوتا ہے تو عموماً سرعت وچستی سے کام لینے کے بجائے سستی سے کام لیتے ہیں اور ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں، بقولِ شاعر:

تھے وہ آبا تمہارے ہی، مگر تم کیا ہو؟ ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

اعمالِ صالحہ میں سبقت صلحاء کی علامت ہے:

اعمالِ صالحہ میں سبقت و مسارعت حضرات صحابہؓ وصلحاءِ امت کا طریقہ رہا ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم نے صالحین کی چار علامات کا تذکرہ کرنے کے بعد انہیں جو بشارت دی اس سے بھی یہی واضح ہوتا ہے، چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ۝﴾ (المؤمنون : ۵۷)

ان کی پہلی علامت یہ ہے کہ ’’وہ اپنے رب کی ہیبت سے ڈرتے ہیں‘‘۔

﴿ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ۝﴾ (المؤمنون : ۵۸)

دوسری علامت یہ ہے کہ ’’وہ اپنے رب کی آیتوں، نشانیوں اور باتوں پر ایمان رکھتے ہیں‘‘۔

﴿ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ۝﴾ (المؤمنون : ۵۹)

تیسری علامت یہ ہے کہ ’’وہ اپنے رب کے ساتھ شرک نہیں کرتے‘‘۔

﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ إِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ۝﴾ (المؤمنون:۶۰)

چوتھی علامت یہ ہے کہ وہ صدقات و خیرات کر کے بھی اس بات سے ڈرتے ہیں کہ پتہ نہیں ہمارا دیا ہوا مال اور کیا ہوا عمل عنداللہ قبولیت کے قابل بھی ہے یا نہیں؟ یعنی وہ نیکی کر کے بھی ڈرتے ہیں، اپنے عمل اور نفس پر مطمئن ہو کر بیٹھے نہیں رہتے، قرآن کہتا ہے:

﴿ أُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ هُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ۝﴾ (المؤمنون : ۶۱)

’’یہی لوگ اعمالِ صالحہ میں سبقت کرنے والے ہیں‘‘۔

حدیث پاک میں بھی یہی فرمایا کہ ’’أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ‘‘.

(رواه الترمذی، مشكوٰة : ۴۵۷)

واقعہ یہی ہے کہ یہی لوگ من جانب اللہ دارین کی خیرات و برکات کے حق دار

ہیں، قرآنِ کریم نے اُنہیں سابقین اوّلین فرما کر قیامت کے دِن قربِ الٰہی اور نعمتوں والی جنت کی خوش خبری دی ہے:

﴿ وَ السّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ۝ أُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ۝ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ۝﴾ (الواقعة : ۱۰ إلى ۱۲)

حضرات مفسرین کے بقول یہاں سابقین سے مراد توبہ و اعمالِ صالحہ میں سبقت کرنے والے ہیں۔ کما هو قول سعيد بن جبيرؒ. (مستفاد از: انوار البیان: ۲۸۰/۵)

الغرض! اعمالِ صالحہ میں سبقت و مسارعت کی ترغیب حق تعالیٰ نے دی، حضور ﷺ نے بھی اپنے قول و عمل سے اس کی ترغیب دی ہے اور یہی حضرات صحابہؓ وصلحاء کا طریقہ رہا ہے، اس لیے یہ علامت سعادت ہے، اگر ہم بھی دارین کی سعادتوں کے حق دار بننا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی اس کا اہتمام لازم ہے۔

ہمیں سب سے پہلے توبہ و تلافی میں پیش قدمی کرنی چاہیے، پھر بہ توفیق الٰہی دیگر اعمالِ صالحہ میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے، مثلاً نماز کی صف اوّل میں، سلام کرنے میں، حسب موقع اخلاص کے ساتھ مال خرچ کرنے میں، استطاعت ہونے پر حج کی ادائیگی میں، والدین اور بڑوں کی خدمت وغیرہ میں۔

حق تعالیٰ ہمیں بھی کارِ خیر کی توفیق عطا فرما کر سابق بالخیرات میں شامل فرمائے، اور اس عاجز کے ساتھ خادم زادہ محمد خلیق اور خواہرزادہ عزیز الصادق الامین کے اعتکاف کو بھی شرفِ قبولیت عطا فرمائے، آمین یا رب العالمین۔

۳۰/ رمضان المبارک/ ۱۴۳۹ھ

مطابق: ۱۵/ جون/ ۲۰۱۸ء شب جمعہ، قبل الفجر

خانقاہ قدسیہ مسجد شیخ زکریا

جامعہ سراج العلوم اُجین، ایم. پی.

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيْرًا فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيْرًا كَثِيْرًا

(۸)

نماز باجماعت کی اہمیت وفضیلت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنِ ابۡنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ:" صَلٰوةُ الۡجَمَاعَةِ تَفۡضُلُ صَلٰوةَ الۡفَذِّ بِسَبۡعٍ وَ عِشۡرِيۡنَ دَرَجَةً". (متفق عليه، مشكوٰة: ٩٥/ باب الجماعة و فضلها)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نماز باجماعت کا اجر وثواب اکیلے نماز پڑھنے سے ستائیس درجہ زیادہ ہے۔

نماز باجماعت اجتماعیت کو باقی رکھنے کی بہترین شکل ہے:

اللہ رب العالمین اپنے ماننے والوں اور فرماں برداروں کے لیے اجتماعیت کو بہت پسند فرماتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اسلامی احکام وعبادات کی ادائیگی میں اجتماعیت کو ملحوظ رکھا گیا ہے، مثلاً دیکھئے کہ ساری دنیا میں تمام مسلمانوں کو سال کے ایک ہی مہینہ میں روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا، اور سال بھر میں ایک ہی مرتبہ صاحب نصاب پر فرض ہونے والی زکوٰۃ کی وصولی اور

تقسیم کا اجتماعی نظام بیت المال کی شکل میں قائم کیا گیا، تاکہ تمام کی زکوٰۃ ایک ہی جگہ جمع ہو اور وہاں سے تمام مستحقین میں حسب ضرورت وحاجت تقسیم کی جاسکے، اسی طرح حج کہ جو استطاعت کی شرط کے ساتھ زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہے اسے بھی ایک بین الاقوامی عالمی اجتماع کی حیثیت دی گئی، کہ سارے عالم کے مسلمان بیت اللہ، پھر منیٰ، عرفات اور مزدلفہ وغیرہ میں جمع ہوکر حج کے اَرکان ادا کریں، نیز قرب وجوار میں بسنے والے عام مسلمانوں کے سالانہ اجتماع کے لیے نمازِ عیدین، ہفتہ واری اجتماع کے لیے نمازِ جمعہ اور روزانہ نمازِ پنج وقتہ کی جماعت کو مشروع فرما کر ایک طرح سے نمازیوں کے اجتماع کی صورت پیدا کی گئی، جس سے بہت سے دینی، ملی وسماجی فوائد حاصل ہوسکتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ نماز باجماعت بھی مسلمانوں کے درمیان اجتماعیت کو باقی رکھنے کی ایک بہترین شکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ جن دو شخصوں کے درمیان کسی بات کو لے کر اختلاف پیدا ہوجائے، اگر وہ دونوں مسلسل تین دن ایک ساتھ نماز باجماعت ادا کریں تو اس کی برکت سے ان کا اختلاف ان شاء اللہ اتفاق میں بدل جائے گا۔

نماز باجماعت کے فوائد:

مزید غور کیا جائے تو نماز باجماعت کے اس کے علاوہ بھی بہت سے فوائد ہیں، حالانکہ نماز باجماعت کا کوئی فائدہ نہ ہوتا تب بھی اس کا اہتمام اس لیے ضروری ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا کوئی حکم حکمت اور منفعت سے خالی نہیں، نماز باجماعت کے فوائد میں ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ دین اسلام اور اللہ رب العزت کے حکم کی تعمیل کا برسر عام اظہار کیا جاتا ہے، جس سے اللہ تعالیٰ کی رحمت خصوصیت کے ساتھ متوجہ ہوتی ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ نماز باجماعت کی وجہ سے مساجد اللہ تعالیٰ کی عبادت سے آباد ہوتی ہیں، اور مساجد کو آباد رکھنا مسلمانوں کا ملی فریضہ ہے، ارشادِ باری ہے:

﴿ إِنَّمَا يَعۡمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَ لَمۡ يَخۡشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنۡ يَّكُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُهۡتَدِيۡنَ﴾ (التوبة : ۱۸)

''اللہ تعالیٰ کی مساجد کو تو وہ لوگ آباد کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ پر اور یومِ آخرت پر ایمان لائے اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی، اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں ڈرے، تو اُمید ہے کہ وہ لوگ راہ یاب ہوں۔''

ظاہر ہے کہ جو لوگ نماز باجماعت کے لیے مسجد میں آتے ہیں وہ عموماً صرف نماز باجماعت ہی پر اکتفاء نہیں کرتے؛ بلکہ ذکر و اذکار، تلاوتِ قرآن اور تعلیمی حلقوں وغیرہ میں بھی شرکت کر کے مختلف عبادات انجام دیتے ہیں، اس طرح نماز باجماعت مختلف عبادات کا اور مساجد کی آبادی کا ذریعہ بنتی ہے۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ نماز باجماعت کا یہ نظام افرادِ امت میں پیغامِ اسلام کو عام کرنے، نیز عام لوگوں کو اہلِ علم سے دینی تعلیم و تربیت حاصل کرنے اور ایک دوسرے کی ملاقات، تعارف اور احوال سے باخبر رہنے کا ایک بہترین ذریعہ بھی ہے۔

چوتھا فائدہ یہ ہے کہ جماعت کی برکت سے سست طبع لوگوں کے لیے نماز جیسی عظیم الشان عبادت کو ادا کرنا واقعی آسان ہو جاتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ بہت سے آداب کی رعایت نہ کرنے والے لوگوں کی نمازیں اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کے ساتھ ادا ہونے کی وجہ سے قبول ہو جائیں۔

ایک سبق آموز واقعہ:

ایک بزرگ میدانِ عرفات میں تھے، ان پر کچھ غنودگی طاری ہوئی، تو ان پر یہ بات منکشف ہوئی کہ ایک فرشتہ پوچھ رہا ہے: ''اِمسال کے حجاج کی تعداد کتنی ہے؟'' دوسرے نے کہا: ''اِمسال کے حجاج کی تعداد چھ لاکھ ہے'' اُس نے پوچھا: ''ان میں سے کتنوں کا حج قبول ہوا؟'' اُس نے کہا: ''صرف چھ کا''۔ اب یہ پریشان ہوئے کہ پتہ نہیں، ان چھ میں میں

ہوں یا نہیں؟ اسی فکر میں تھے کہ یا اللہ! اتنی بڑی تعداد میں صرف چھ کا حج قبول ہوا؟ آواز آئی کہ ان چھ کے طفیل ہم نے سب کا حج قبول کر لیا ہے۔ اسی لیے نماز باجماعت رکھی گئی، کہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ نیک اور مقبول بندے ہوں ان کے طفیل پوری جماعت کی نماز قبول ہو جائے۔ (فضائل حج: ۸۵۶)

نماز باجماعت کے فضائل:

ان فوائد کے علاوہ احادیث طیبہ میں نماز باجماعت کے بہت سے فضائل بھی وارِد ہوئے ہیں، مثلاً ایک حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ اَکیلے نماز پڑھنے سے اگرچہ نماز ادا ہو جاتی ہے؛ لیکن جو نماز باجماعت ادا کی جاتی ہے (خواہ مسجد میں یا کہیں اور) اس کا اَجر پچیس گنا بڑھ جاتا ہے۔

عَنۡ اَبِيۡ هُرَيۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "صَلٰوةُ الرَّجُلِ فِيۡ الۡجَمَاعَةِ تُضَعَّفُ عَلٰى صَلٰوتِهٖ فِيۡ بَيۡتِهٖ وَ فِيۡ سُوۡقِهٖ خَمۡسًا وَ عِشۡرِيۡنَ ضِعۡفًا، وَ ذٰلِكَ اَنَّهٗ اِذَا تَوَضَّأَ، فَاَحۡسَنَ الۡوُضُوۡءَ، ثُمَّ خَرَجَ اِلَى الۡمَسۡجِدِ، لَا يُخۡرِجُهٗ اِلَّا الصَّلٰوةُ، لَمۡ يَخۡطُ خَطۡوَةً اِلَّا رُفِعَتۡ لَهٗ بِهَا دَرَجَةٌ وَ حُطَّ عَنۡهُ بِهَا خَطِيۡئَةٌ، فَاِذَا صَلّٰى لَمۡ تَزَلِ الۡمَلَائِكَةُ تُصَلِّيۡ عَلَيۡهِ مَادَامَ فِيۡ مُصَلَّاهُ: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَيۡهِ، اَللّٰهُمَّ ارۡحَمۡهُ، وَ لَا يَزَالُ اَحَدُكُمۡ فِيۡ صَلٰوةٍ مَا انۡتَظَرَ الصَّلٰوةَ".

(متفق عليه، مشكوٰة : ٦٨/ باب المساجد و مواضع الصلوٰة)

نماز باجماعت گھر یا بازار میں پڑھی جانے والی (تنہا) نماز سے پچیس درجہ زیادہ فضیلت رکھتی ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بندہ (نماز کے لیے) اچھی طرح وضو کرتا ہے اور (نماز باجماعت ادا کرنے کے لیے) مسجد کی طرف نکلتا ہے تو اس کے ہر قدم پر ایک درجہ بلند کیا جاتا ہے اور ایک گناہ مٹایا جاتا ہے، (یہ فضیلت نماز باجماعت کی برکت سے ملتی ہے) پھر نماز کے بعد جب تک بندہ اپنی جائے نماز پر بیٹھا رہتا ہے تب تک فرشتے اس کے لیے مغفرت اور رحمت کی دعائیں کرتے رہتے ہیں، نیز جب تک نمازی نماز کے انتظار میں رہتا

ہے تو یہ انتظار کا وقت بھی نماز میں شمار ہوتا ہے۔ (یہ فضیلت بھی نماز باجماعت کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے)۔

دوسری حدیث میں نماز باجماعت کا اَجروثواب ستائیس درجہ زیادہ بیان کیا گیا ہے، تو علماءِ محدثین نے اس میں تطبیق دی ہے کہ ثواب کی کمی وزیادتی کا دارومدار ایک تو اخلاصِ نیت پر ہے، یا پھر عشاء اور فجر کی نماز باجماعت دیگر نمازوں کے بالمقابل ذرا مشکل ہے، اس لیے ان دو نمازوں کو باجماعت ادا کرنے کا اَجر ستائیس درجہ زیادہ ہے، اور بقیہ نمازوں کے لیے پچیس درجہ کی زیادتی ہے۔ یا بڑی اور جامع مسجد جس میں نمازیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے وہاں نماز باجماعت ادا کرنے کا اَجروثواب ستائیس درجہ زیادہ ہے، اور محلّہ کی چھوٹی مسجد میں نماز باجماعت ادا کرنے کا اَجر پچیس درجہ زیادہ ہے۔

لیکن عاجز کے خیالِ ناقص میں اس کی بہترین تطبیق یہ ہے کہ کتاب وسنت میں مذکور متعدد اعمال کے اَجروثواب کو دیکھ کر واضح ہوتا ہے کہ اس امت پر رحمۃ للعالمین ﷺ کی برکت سے رب العالمین کی جانب سے جب انعامات اور اَجروثواب کا سلسلہ شروع ہوا تو بڑھتا ہی چلا گیا، یہاں بھی شروع میں نماز باجماعت کا اَجروثواب پچیس درجہ زیادہ تھا، جس کو بعد میں بڑھا کر ستائیس درجہ تک زیادہ کردیا گیا۔

(مستفاد از: مظاہر حق جدید: ۸۱/۷، فضائل اعمال: ۲۲۵-۲۲۶)

ایک واقعہ:

امت کے جن مخلصین کو ان باتوں پر یقین ہوتا ہے وہ اموال سے زیادہ اعمال اور ان کے اَجروثواب کی حرص میں جدوجہد کرتے ہیں، اس سلسلہ میں ایک واقعہ مشہور ہے کہ حضرت محمد بن سماعہؒ (جو حضرات صاحبینؒ کے خاص شاگرد ہیں) کا حال یہ تھا کہ چالیس سال تک کبھی ان کی نماز تو کیا؛ تکبیر اولیٰ بھی فوت نہیں ہوئی، ایک مرتبہ ان کی والدہ سخت بیمار ہوگئیں، نزع کی کیفیت طاری تھی، آپؒ قریب بیٹھ کر کلمہ تلقین فرمانے لگے، کچھ ہی دیر میں

والدہ کا انتقال ہوگیا، اسی دوران جب نماز کا وقت ہوا اور مسجد میں حاضر ہوئے تو جماعت ہو چکی تھی، اس زمانہ کا ماحول ﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ إِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ إِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ﴾ (النور: ٣٧) کا عملی نمونہ تھا، جماعت کے بعد بے نمازی کو تلاش کرنا مشکل تھا، اور گھروں میں عورتیں بھی عموماً نماز کا وقت ہوتے ہی مردوں سے پہلے نماز ادا کرلیا کرتی تھیں، لہٰذا یہ صورت بھی نہ تھی کہ مسجد کی جماعت ختم ہوجانے کے بعد گھر کی خواتین کو لے کر نماز باجماعت پڑھ لیں، اس لیے آپؒ ایک طرف تو والدہ کی وفات کے صدمہ سے پریشان تھے، مزید برآں چالیس سال کے بعد پہلی مرتبہ جماعت چھوٹ گئی۔

حالانکہ حدیث پاک میں آتا ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ تَوَضَّأَ، فَأَحْسَنَ وُضُوْءَهٗ، ثُمَّ رَاحَ، فَوَجَدَ النَّاسَ قَدْ صَلَّوْا، أَعْطَاهُ اللّٰهُ مِثْلَ أَجْرِ مَنْ صَلَّاهَا وَ حَضَرَهَا، لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَيْئًا".

(رواه أبوداود، مشكوٰة: ١٠٢/١ / باب ما على المأموم من المتابعة و حكم المسبوق)

"جس شخص نے اچھی طرح وضو کیا اور مسجد میں نماز باجماعت کی نیت سے حاضر ہوا تو وہاں جماعت ہو چکی تھی، حق تعالیٰ اس کو حسن نیت پر نماز باجماعت کا اَجروثواب عطا فرمائیں گے اور اس سے نماز باجماعت ادا کرنے والوں کے اجروثواب میں کوئی کمی بھی نہیں ہوگی۔"

چوں کہ زندگی میں پہلی بار جماعت چھوٹ گئی، اس لیے اس بات نے آپؒ کو بے حد پریشان اور نڈھال کردیا، سر پکڑ کر بیٹھ گئے، اور کوئی مناسب حل سوچنے لگے، ایک بات آپؒ کے ذہن میں آئی کہ حدیث پاک میں جماعت کی نماز کو تنہا نماز کے مقابلہ میں پچیس یا ستائیس درجہ افضل قرار دیا گیا ہے، تو میں اسی ایک نماز کو پچیس یا ستائیس مرتبہ ادا کرلیتا ہوں، تاکہ جماعت سے نماز ادا کرنے کا اجروثواب حاصل ہوجائے، چنانچہ آپؒ نے ایسا ہی کیا، لیکن والدہ کی تجہیز وتکفین کے بعد جب رات میں سوئے تو خواب میں کسی کو یہ کہتے ہوئے سنا:

" یَا مُحَمَّدُ بْنُ سُمَاعَةَ ! قَدْ صَلَّیْتَ خَمْسًا وَّ عِشْرِیْنَ صَلوٰةً، فَمَا تَصْنَعُ بِتَأْمِیْنِ الْمَلَائِکَةِ ؟"

حضرت! آپ نے نماز باجماعت کی فضیلت پانے کے لیے ایک ہی نماز کو پچیس یا ستائیس مرتبہ تو ادا کرلیا؛ مگر فرشتوں کی آمین کا کیا ہوگا؟ (یعنی ملائکہ کے آمین کہنے کی فضیلت تنہا نماز پڑھنے کی صورت میں کیسے حاصل کروگے؟)

(تہذیب التہذیب: ۱۸۲/ ۹، فوائد بہیہ، مستفاد از: فضائل اعمال: ۲۲۶)

نماز باجماعت کا عظیم الشان اَجر وثواب:

حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز باجماعت ادا کرنے والے کو فرشتوں کی معیت، رفاقت اور دعاءِ مغفرت نصیب ہوتی ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " إِذَا أَمَّنَ الْإِمَامُ فَأَمِّنُوْا، فَإِنَّهٗ مَنْ وَافَقَ تَأْمِیْنُهٗ تَأْمِیْنَ الْمَلَائِکَةِ غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ".

(متفق علیه، مشکوٰة: ۷۹/ باب القراءة فی الصلوٰة)

جب امام آمین کہے (جو ایک دعائیہ جملہ ہے، جس کے معنیٰ ہیں "اِسْتَجِبْ لَنَا" یعنی اے اللہ! ہماری دعا قبول فرما) تو تم بھی آمین کہو (اس لیے کہ اس وقت اللہ کے فرشتے بھی آمین کہتے ہیں، اب) جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہوجاتی ہے اس کے تمام اگلے (صغیرہ) گناہ معاف کردیے جاتے ہیں۔

ظاہر سی بات ہے کہ اس فضیلت کا حق دار وہی خوش نصیب بندہ ہوگا جو نماز باجماعت کا اہتمام کرے گا، جس کی طرف واقعہ میں توجہ دلائی گئی۔ یہ نماز باجماعت کی فضیلت کسی اور کو حاصل ہو یا نہ ہو، بحمد اللہ مساجد کے ائمہ ومؤذنین کو ضرور حاصل ہے۔ حق تعالیٰ قبول فرمالیں۔ آمین۔

نیز ایک اور حدیث میں نماز باجماعت کا عظیم الشان اَجر وثواب اس طرح بیان کیا

گیا ہے:

عَنْ أَبِیْ أُمَامَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " مَنْ خَرَجَ مِنْ بَیْتِهٖ مُتَطَهِّرًا إِلٰی صَلوٰةٍ مَکْتُوْبَةٍ فَأَجْرُهٗ کَأَجْرِ الْحَاجِّ الْمُحْرِمِ، وَ مَنْ خَرَجَ إِلٰی تَسْبِیْحِ الضُّحٰی لَا یَنْصِبُهٗ إِلَّا إِیَّاهُ، فَأَجْرُهٗ کَأَجْرِ الْمُعْتَمِرِ، وَ صَلوٰةٌ عَلٰی إِثْرِ صَلوٰةٍ لَا لَغْوَ بَیْنَهُمَا کِتَابٌ فِیْ عِلِّیِّیْنَ".

(رواه أحمد و أبوداود، مشکوٰة: ۷۰/ باب المساجد و مواضع الصلوٰة)

جو شخص گھر سے وضو کر کے فرض نماز (باجماعت) ادا کرنے کے لیے (مسجد کی طرف) نکلے وہ اس قدر اَجر وثواب کا مستحق ہے جس قدر اِحرام باندھ کر حج کے لیے نکلنے والا، (مطلب یہ ہے کہ ایک حاجی جیسے ہی حج کا احرام باندھتا ہے تو اس کا اجر وثواب شروع ہوجاتا ہے اور جب تک حج سے واپس نہیں لوٹتا اس کا اَجر برابر جاری رہتا ہے، اسی طرح ایک نمازی جیسے ہی نماز کے لیے تیاری اور وضو کرتا ہے تو اس کا اَجر بھی شروع ہوجاتا ہے، اور جب تک نماز سے فارغ ہوکر نہیں لوٹتا اس کا اَجر بھی برابر جاری رہتا ہے) اور جو شخص نمازِ چاشت کو ادا کرنے کے لیے نکلتا ہے اسے عمرہ کا ثواب دیا جاتا ہے، اور ایک نماز باجماعت ادا کرنا دوسری نماز باجماعت ادا کرنے تک کے درمیان ہونے والے گناہوں کا کفارہ ہے، اور اس عمل کا اجر وثواب (اس عمل کی عظمت شان کی وجہ سے) علیین (جو نیک روحوں کا مقام ہے) میں لکھا جاتا ہے۔

ترکِ جماعت پر وعید:

غالباً نماز باجماعت کے اِن ہی فوائد وفضائل کے پیشِ نظر امت مسلمہ کو خصوصیت کے ساتھ اس کا حکم دیا گیا، ارشادِ باری ہے:

﴿ وَ أَقِیْمُوا الصَّلوٰةَ وَ اٰتُوا الزَّکوٰةَ وَ ارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ۝﴾ (البقرة: ۴۳)

''اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔''

بعض علماء نے ﴿وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ ۝﴾ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ نماز

باجماعت ادا کرو۔ (انوار البیان:۱/۸۲)

نیز احادیث مبارکہ میں نماز باجماعت کی بڑی تاکید اور ترکِ جماعت پر بڑی وعید آئی ہے، مثلاً ایک حدیث میں ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ سَمِعَ الْمُنَادِيَ، فَلَمْ يَمْنَعْهُ مِنَ اتِّبَاعِهِ عُذْرٌ"، قَالُوْا: وَ مَا الْعُذْرُ؟ قَالَ: خَوْفٌ أَوْ مَرَضٌ، لَمْ تُقْبَلْ مِنْهُ الصَّلٰوةُ الَّتِيْ صَلّٰى". (رواه أبوداود، مشكوٰة: ٩٦)

"جو شخص نماز باجماعت کے لیے مؤذن کی اذان سنے اور اس کی تابعداری کرنے (یعنی جماعت میں شرکت کرنے) سے کوئی واقعی عذر اس کے لیے مانع نہ ہو (اس کے باوجود وہ شخص جماعت میں شریک نہ ہوا اور اکیلے نماز پڑھ لے) تو اس کی وہ نماز اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول نہ ہوگی۔"

دوسری ایک روایت میں ترکِ جماعت کی وعید بیان کرتے ہوئے رحمت والے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: "لَوْلَا مَا فِي الْبُيُوْتِ مِنَ النِّسَاءِ وَ الذُّرِّيَّةِ أَقَمْتُ صَلٰوةَ الْعِشَاءِ، وَ أَمَرْتُ فِتْيَانِيْ يُحْرِقُوْنَ مَا فِي الْبُيُوْتِ بِالنَّارِ". (رواه أحمد، مشكوٰة:٩٧)

"اگر گھروں میں عورتیں اور بچے نہ ہوتے تو میں نمازِ عشاء پڑھانے کے لیے کسی کو حکم دیتا، پھر اپنے نوجوانوں کو حکم دیتا کہ جو لوگ نماز کے لیے (بلا کسی شرعی عذر کے) جماعت میں حاضر نہیں ہوئے ان کے گھروں کو جلا دیں۔"

اس حدیث پاک میں حضور ﷺ نے ترکِ جماعت کرنے والوں کے گھروں کو نہ جلانے کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ گھروں میں عورتیں اور بچے بھی ہوتے ہیں، جن پر جماعت ضروری نہیں ہے، اس لیے میں اپنے حکم کو نافذ نہیں کرتا، ورنہ اگر ایسا نہ ہوتا تو جماعت ترک کرنے والوں کے گھروں کو جلا دیا جاتا۔ اس سے بغیر کسی عذر کے جماعت ترک کرنے

والوں کو نصیحت حاصل کرنی چاہیے۔

نماز باجماعت کا حکم:

اس بنا پر بعض ائمہ سلف (جن میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ بھی ہیں) اس طرف گئے ہیں کہ ہر غیر معذور مرد کے لیے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا فرض ہے، یعنی جس طرح نماز پڑھنا فرضِ عین ہے اسی طرح اس کو جماعت سے ادا کرنا بھی فرضِ عین ہے۔ اصحابِ ظواہر کے یہاں جماعت وضو کی طرح شرط ہے، جیسے بغیر وضو کے نماز صحیح نہیں، اسی طرح بغیر جماعت کے غیر معذور کی نماز صحیح نہیں۔ لیکن محققین احناف اور جمہور ائمہ نے جماعت سے متعلق تمام احادیث مبارکہ کو سامنے رکھ کر یہ رائے قائم فرمائی ہے کہ نماز باجماعت ادا کرنا واجب ہے، (یہی راجح ہے، دوسرا قول سنت مؤکدہ کا بھی ہے، تو) جن حضرات نے سنت کہا وہ اس اعتبار سے کہ اس کا واجب ہونا سنت سے ثابت ہے، البتہ اگر کوئی شرعی عذر ہو تو نماز باجماعت کا وجوب ساقط ہو جاتا ہے، جیسے کوئی شخص بیمار ہو، بہت عمر دراز ہو، ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے ہوں، یا صرف پیر کٹا ہوا ہو، ایسا مفلوج ہو کہ چل نہ سکتا ہو، بہت بوڑھا ہو، نابینا ہو، بارش ہو رہی ہو، سخت سردی ہو یا برف باری ہو رہی ہو، راستے میں کیچڑ ہو، رات بہت تاریک ہو اور روشنی کا انتظام نہ ہو، اندھیری رات میں تیز ہوا چل رہی ہو، کسی مریض کی تیمارداری میں مشغول ہو، سفر کا ارادہ ہو اور جماعت میں شرکت کی صورت میں قافلہ (یا بس، ہوائی جہاز اور ٹرین) وغیرہ چھوٹ جانے کا اندیشہ ہو، یا مال ضائع ہونے کا خطرہ ہو، پیشاب و پائخانہ کا تقاضا ہو یا سخت بھوک لگی ہو اور کھانا سامنے ہو تو ان تمام صورتوں میں جماعت چھوڑ کر اکیلے نماز پڑھنے کی اِجازت ہے۔ (ملخص فتاویٰ ہندیہ:۱/۴۳، شامی:۲/۲۹۵، مستفاد از: عمدۃ الفقہ:۳/۱۱۷)

ہمارے علماء نے فرمایا ہے کہ کوئی شخص اِن شرعی اعذار کے بغیر تنہا نماز پڑھ لے اور جماعت میں شریک نہ ہو تو اگرچہ اس کی نماز ہو جائے گی؛ مگر جماعت جو کہ سنت مؤکدہ یا واجب ہے، اس کے ترک کی وجہ سے یہ شخص مستحق عتاب ہوگا۔ اور اگر ترکِ جماعت کی

عادت بنالے تو سخت گنہگار ہوگا، خصوصاً جب ایسی صورت ہو جائے کہ محلّہ اور علاقہ والوں کے گھر میں نماز پڑھنے کی وجہ سے مسجد ویران ہو جانے کا اندیشہ ہو، تو پوری بستی کے لوگ شرعاً مستحق سزا ہوں گے۔ اور قاضی عیاضؒ نے فرمایا ہے کہ ایسے لوگ اگر سمجھانے سے باز نہ آئیں تو (اسلامی حکومت میں حاکم وقت) ان سے قتال کرے۔ (مستفاداز: گلدستۂ تفاسیر:۱/۱۸۴)

خیر القرون میں نماز باجماعت کا اہتمام:

نماز باجماعت کی اسی اہمیت کی وجہ سے خیر القرون میں اس کا بہت ہی زیادہ اہتمام کیا جاتا تھا، چنانچہ فقیہ الامت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ خیر القرون میں نماز باجماعت کا کس قدر اہتمام تھا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم نے کئی مرتبہ دیکھا کہ ترکِ جماعت کے وہی لوگ مرتکب ہوتے جو کھلے منافق ہوں، یا کوئی مریض اور معذور ہو، لیکن بعض مریض اور معذور تو ہم نے ایسے بھی دیکھے جو دو آدمیوں کے سہارے چل کر مسجد میں آتے اور جماعت میں شریک ہوتے تھے۔

اس کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ بلاشبہ حضور ﷺ نے ہم کو سنن ہدیٰ کی تعلیم دی ہے، (یعنی دین و شریعت کی ایسی باتیں بتائی ہیں جن سے ہماری ہدایت و سعادت وابستہ ہے) اور ان ہی سنن ہدیٰ میں سے ایسی مسجد میں جہاں اذان دی جاتی ہو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا بھی ہے۔ (مسلم، مشکوٰۃ:۹۶، باب الجماعۃ و فضلھا)

معلوم ہوا کہ نماز باجماعت کا اہتمام سنن ہدیٰ پر قائم ہونے کی علامت ہے، جب کہ بلا عذرِ شرعی کے اس کا ترک کرنا علامت نفاق ہے۔ (والعیاذ باللہ)۔

قرآنِ کریم نے منافقین کی علامتوں میں اسے بھی بیان کیا ہے:

﴿ وَ إِذَا قَامُوْٓا إِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَ لَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ إِلَّا قَلِيْلًا ﴾ (النساء: ۱۴۲)

یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے نماز باجماعت کا اس قدر اہتمام فرمایا کہ مرض الوفاۃ میں بھی آپ ﷺ حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے سہارے سے مسجد میں تشریف لائے اور جماعت میں شرکت فرمائی۔ (مشکوٰۃ:۱۰۲)

خیر القرون میں ایک صحابیؓ کا واقعہ منقول ہے کہ وہ رات بھر نماز پڑھتے رہے اور فجر کے وقت نیند کا غلبہ ہوا تو سو گئے، جماعت میں شریک نہ ہو سکے، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو فرمایا کہ ”اگر یہ رات بھر سوتے اور فجر کی نماز باجماعت پڑھتے تو رات بھر کی نوافل سے بہتر ہوتا۔“

”لَأَنْ أَشْهَدَ صَلٰوةَ الصُّبْحِ فِيْ جَمَاعَةٍ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ أَقُوْمَ لَيْلَةً“. (رواه مالك، مشكوٰة: ۹۷)

یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابہؓ نے بھی حتی الامکان نماز باجماعت کا اہتمام فرمایا، تندرستی میں، بیماری میں، سفر و حضر میں، حالت امن یہاں تک کہ حالت جنگ میں بھی اس کا اہتمام فرمایا، جس کی گواہی خود قرآن پاک دیتا ہے:

﴿ وَ إِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَعَكَ وَ لْيَأْخُذُوْٓا أَسْلِحَتَهُمْ ﴾ (النساء: ۱۰۲)

علامہ اقبالؒ نے اس کو یوں تعبیر کیا:

آگیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز قبلہ رُو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

حق تعالیٰ ہمیں بھی ان ہی کے نقش قدم پر چلنے اور نماز باجماعت کا اہتمام کرنے اور پوری شریعت پر عمل کی توفیق سے نوازے۔ آمین۔

۲۲/شوال المکرّم/ ۱۴۳۹ھ (بروز جمعہ، قبل المغرب)
مطابق: ۶/ جولائی/ ۲۰۱۸ء (بزم صدیقی، بڑودا)

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيْرًا فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيْرًا كَثِيْرًا

(۹)

تکبیر اولیٰ کی اہمیت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنۡ صَلّٰى لِلّٰهِ أَرۡبَعِيۡنَ يَوۡمًا فِيۡ جَمَاعَةٍ يُدۡرِكُ التَّكۡبِيۡرَةَ الۡأُوۡلٰى، كُتِبَتۡ لَهٗ بَرَاءَتَانِ، بَرَاءَةٌ مِنَ النَّارِ وَ بَرَاءَةٌ مِنَ النِّفَاقِ". (رواه الترمذی، مشکوٰۃ: ۱۰۲/ باب ما علی المأموم من المتابعة)

ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے اللہ تعالیٰ (کی رضا اور خوشنودی) کے لیے چالیس دن (مسلسل) نماز باجماعت تکبیر اولیٰ کے اہتمام کے ساتھ ادا کی تو اس کے لیے دو نجاتیں لکھی جاتی ہیں، ایک نجات (جس کا تعلق آخرت سے ہے) آگ سے (خلاصی و آزادی ہے) اور دوسری نجات (جس کا تعلق دنیا سے ہے) نفاق سے۔

تکبیر کی فضیلت:

اللہ رب العزت کی تعریف بیان کرنا اور اس کی کبریائی کا اعتقاد رکھنا اس کی رضا و خوشنودی کا ذریعہ ہے، اسی لیے رب العالمین نے رحمۃ للعالمین ﷺ کو حکم فرمایا: ﴿وَ رَبَّكَ فَكَبِّرۡ﴾ (المدثر: ۳) محبوبم! اپنے رب کی بڑائی کا اعتقاد بھی رکھیے اور اسے بیان بھی کیجیے۔

حضور ﷺ کی ہدایات وتعلیمات کے مطابق اس کے لیے آسان وبہترین جملہ کلمہ تکبیر یعنی ''اللہ اکبر'' ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سب سے بڑا ہے، ہر جگہ بڑا ہے اور ہر وقت بڑا ہے، اس کے علاوہ ہر چیز چھوٹی ہے، اس سے بڑا نہ کوئی تھا، نہ ہے، نہ ہوگا اور نہ ہوسکتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ''اللہ اکبر'' کہنا کسی کے لیے بھی مشکل نہیں، یہ کلمہ آسان بھی ہے اور افضل بھی، غالباً یہی وجہ ہے کہ اذان واِقامت اور نماز جیسی عظیم الشان عبادت میں یہ کلمہ بار بار دہرایا گیا، حدیث پاک کے مطابق چار رکعات نماز میں بائیس مرتبہ ''اللہ اکبر'' کہا جاتا ہے۔

"فَكَبَّرَ ثِنۡتَيۡنِ وَ عِشۡرِيۡنَ تَكۡبِيۡرَةً". (رواه البخاری، مشکوٰۃ: ۷۷/ باب صفة الصلوٰة)

بعض علماء کے بقول نماز کے افضل ترین عمل ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں بکثرت اللہ تعالیٰ کی تعریف، تعظیم اور تکبیر بیان کی جاتی ہے، علاوہ ازیں اذان کے ذریعہ بلانا تھا تو ''اللہ اکبر''، اقامت کے ذریعہ اس کی طرف متوجہ کرنا تھا تو ''اللہ اکبر''، نماز کو شروع کرنا تھا تو ''اللہ اکبر''، اس تکبیر مسلسل نے نماز کی فضیلت میں چار چاند لگادیے، بالخصوص نماز باجماعت میں شامل ہونے والا بندۂ مومن جیسے ہی نماز شروع کرنے کے لیے ''اللہ اکبر'' کہتا ہے تو اسے تکبیر تحریمہ یا تکبیر اولیٰ کہا جاتا ہے، جس کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ امام کی تکبیر تحریمہ کے بعد نماز میں شامل ہوجائے اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ رکعت اولیٰ کے رکوع سے قبل شامل ہوجائے۔

کتاب وسنت میں تکبیر اولیٰ کے اہتمام کی مستقل ترغیب دی گئی ہے، مثلاً ارشادِ باری ہے:

﴿وَ سَارِعُوۡۤا اِلٰى مَغۡفِرَةٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَ جَنَّةٍ﴾ (آل عمران: ۱۳۳)

''لوگو! اپنے رب کی مغفرت اور جنت کی طرف مسابقت ومسارعت کرو۔''

مطلب یہ ہے کہ ان امور واعمال کی ادائیگی کا جلدی اہتمام کرو جن کے سبب تم اپنے رب کی مغفرت اور جنت کے مستحق بن جاؤ۔ علماءِ مفسرین نے فرمایا کہ یہاں مغفرت سے اعمال واسبابِ مغفرت مراد ہیں، اور اعمال واسبابِ مغفرت کے متعلق مختلف اقوال منقول ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ اس سے مراد اسلام ہے۔ حضرت

علیؓ سے منقول ہے کہ اس سے مراد فرائض کی ادائیگی ہے۔ حضرت عکرمہؒ نے توبہ مراد لی ہے۔ حضرت ابوالعالیہؒ نے ہجرت اور ضحاکؒ نے جہاد مراد لیا ہے۔ لیکن حضرت انس بن مالکؓ اور حضرت سعید بن جبیرؒ نے اس کی تفسیر نماز کی تکبیر اولیٰ سے کی ہے، فرمایا کہ مغفرت کے قوی اسباب میں سے تکبیر اولیٰ بھی ایک اہم سبب ہے۔

تمام کا حاصل اور خلاصہ یہ ہے کہ عقائد صحیحہ، اخلاقِ عالیہ اور اعمالِ صالحہ اختیار کرو، تاکہ تم اپنے رب کی مغفرت اور جنت کے لائق بن جاؤ۔

(مستفاد از: معارف القرآن مفتی محمد شفیع صاحبؒ: ۲/۱۸۱، تفسیر کبیر: ۳/۳۶۴)

الغرض اللہ رب العزت کی مغفرت، معافی اور خوشنودی کے اسباب میں ایک اہم سبب تکبیر اولیٰ کا اہتمام بھی ہے۔

تکبیر اولیٰ سبب براءت:

تکبیر اولیٰ کا اہتمام کرنے سے اللہ تعالیٰ کی مغفرت حاصل ہو جائے گی، اور جب مغفرت نصیب ہوگئی تو پھر دخولِ جنت یقینی ہے، غالباً یہی وجہ ہے کہ آیت کریمہ: ﴿سَارِعُوْآ إِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ﴾ (ال عمران: ۱۳۳) میں مغفرت کو جنت سے مقدم بیان فرمایا، اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ مغفرتِ الٰہی کے بغیر حصولِ جنت ممکن نہیں، اگر دوزخ سے حفاظت اور دخولِ جنت کی تمنا ہے تو اس کے لیے اسبابِ مغفرت جن میں تکبیر اولیٰ بھی ہے اس کا اہتمام کرو، اس کی تائید حدیث مذکورہ سے بھی ہوتی ہے، ارشاد فرمایا:

" مَنْ صَلّٰى لِلّٰهِ أَرْبَعِيْنَ يَوْمًا فِيْ جَمَاعَةٍ يُدْرِكُ التَّكْبِيْرَةَ الْأُوْلٰى، كُتِبَتْ لَهٗ بَرَاءَتَانِ، بَرَاءَةٌ مِنَ النَّارِ وَ بَرَاءَةٌ مِنَ النِّفَاقِ".

"جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے چالیس دن مسلسل پانچوں نمازیں باجماعت تکبیر اولیٰ کے اہتمام سے ادا کیں تو اسے جہنم اور نفاق سے براءت نصیب ہوگی۔"

نفاق وہ مہلک چیز ہے جس سے حضرات صحابہؓ بہت ڈرا کرتے تھے، جو شخص جتنا پکا

مومن ہوگا وہ اتنا ہی نفاق سے ڈرے گا۔

یہاں تکبیر اولیٰ کی فضیلت میں "بَرَاءَةٌ مِنَ النَّارِ" کے بعد "بَرَاءَةٌ مِنَ النِّفَاقِ" کو بیان کرنے کی بظاہر ضرورت نہیں تھی، کیوں کہ جسے دوزخ سے براءت نصیب ہوگئی اسے نفاق سے لازمی طور پر براءت نصیب ہوگی، اور دوزخ سے مومن مخلص ہی کو براءت نصیب ہوگی، منافق کو نہیں، اس کے باوجود "بَرَاءَةٌ مِنَ النَّارِ" کے بعد "بَرَاءَةٌ مِنَ النِّفَاقِ" کو علیحدہ اس لیے بیان فرمایا کہ تکبیر اولیٰ کا اہتمام کرنے والے کے لیے دوزخ سے براءت و حفاظت کا مظاہرہ تو آخرت میں ہوگا، لیکن مومنین کو چاہیے کہ ایسے مخلص بندۂ مومن کو دنیا میں بھی نفاق سے بری سمجھیں، یہ توفیق خاص اللہ تعالیٰ اپنے مخلص بندوں ہی کو دیتے ہیں، منافق کو نہیں۔

حضرات علماءِ محدثین نے یہاں "بَرَاءَةٌ مِنَ النِّفَاقِ" کا ایک مطلب یہ بیان کیا ہے کہ تکبیر اولیٰ کا اہتمام کرنے والے مخلص کو اللہ رب العالمین اعمالِ نفاق و علاماتِ نفاق سے محفوظ فرماتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تکبیر اولیٰ کا اہتمام کرنے والے بندۂ مخلص میں کوئی دیگر خامی یا کوتاہی ہوسکتی ہے، لیکن علامت نفاق ہرگز نہیں ہوگی۔

کتاب و سنت میں منافقین کی جن علامات اور اعمالِ بد کا تذکرہ ہے ان میں: (۱) دھوکہ دہی (۲) نماز میں سستی (۳) ریاکاری (۴) ذکر اللہ کی کمی۔ منافقین کی یہ وہ چار علامتیں ہیں جن کو قرآنِ پاک کی ایک آیت میں بیان فرمایا گیا:

﴿إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَ إِذَا قَامُوْآ إِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ إِلَّا قَلِيْلًا﴾ (النساء: ۱۴۲)

ان کے علاوہ منافق کی چار بڑی علامتیں ایسی ہیں جن کا تذکرہ حدیث پاک میں ہے: (۱) جب کبھی امانت رکھی جائے تو خیانت کرے (۲) جب کبھی بولے تو جھوٹ بولے (۳) جب کبھی وعدہ کرے تو خلاف کرے (۴) جب کبھی جھگڑے تو گالی گلوچ کرے۔

" إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ، وَ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَ إِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَ إِذَا خَاصَمَ فَجَرَ". (متفق عليه، مشكوٰة: ۱۷)

تکبیر اولیٰ کا اہتمام کرنے والا ان خطرناک برائیوں سے محفوظ رہے گا اور آخرت میں اس کے مؤمن ہونے کی گواہی دی جائے گی۔

اگر ہم ذرا سی ہمت کریں اور کوشش کریں تو تکبیر اولیٰ کا اہتمام کرنے والوں کے لیے کتاب وسنت کا یہ وعدہ آج بھی ہے اور قیامت تک رہے گا۔ سچ ہے:

اللہ کی راہ اب تک ہے کھلی، آثار ونشاں سب قائم ہیں
اللہ کے بندوں نے لیکن اس راہ میں چلنا چھوڑ دیا

اسلاف کا تکبیر اولیٰ کا اہتمام:

ہمارے بزرگوں کے یہاں اس کا خوب اہتمام تھا، وہ حضرات تکبیر اولیٰ کے اہتمام میں اَذان سے قبل عموماً مسجد میں پہنچ جایا کرتے تھے، بعض بزرگوں کا تو ساری زندگی یہ معمول رہا کہ اَذان سے قبل مسجد میں موجود ہوتے، ہم اگر اَذان سے قبل حاضر نہ ہوسکیں تو کم از کم جماعت سے قبل ہی حاضر ہو جائیں، زیادہ نہ کرسکیں تو کم سے کم اس حدیث شریف پر عمل کرنے کے لیے زندگی میں ایک مرتبہ تو ضرور چالیس نمازیں مسلسل تکبیر اولیٰ کے اہتمام کے ساتھ ادا کریں، حجاجِ کرام کے لیے، بزرگوں کی خانقاہوں اور جماعت میں چلہ لگانے والوں کے لیے اس کا بہترین موقع ہے، خواص اور اہل اللہ تو عموماً اس کا اہتمام کرتے ہی ہیں، مگر عوام الناس میں جن خوش نصیب لوگوں کو اہل اللہ کے ساتھ تعلق کی برکت سے تعلق مع اللہ نصیب ہو جاتا ہے وہ بھی اس کا اہتمام کرتے ہیں۔

ایک نصیحت آموز واقعہ:

اس سلسلہ میں ایک نصیحت آموز واقعہ منقول ہے کہ سلطان شمس الدین التمشؒ کے زمانہ میں دہلی کے مشہور ومعروف بزرگ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اپنی وفات سے قبل ایک عجیب وغریب وصیت پراز نصیحت تحریر فرمائی کہ میری نمازِ جنازہ وہی شخص پڑھائے جس میں چار باتیں پائی جاتی ہوں: (۱) اس کی تکبیر اولیٰ کبھی فوت نہ ہوئی ہو۔ (۲) نمازِ تہجد کبھی نہ چھوٹی ہو۔ (۳) غیر محرم پر کبھی بھی بالقصد نظر شہوت نہ پڑی ہو۔ (۴) نمازِ

عصر سے قبل کی سنت غیر مؤکدہ بھی کبھی نہ چھوٹی ہو۔

حضرتؒ کے وصال کے بعد نمازِ جنازہ سے قبل یہ اعلان ہوا، سب نے سنا، مگر کوئی بھی آگے نہ بڑھا، بالآخر بادشاہِ وقت سلطان شمس الدین التمشؒ یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے کہ میری خواہش تو یہی تھی کہ اللہ تعالیٰ کے بعد میرے حضرتؒ کے علاوہ کسی کو میرے اس راز کا علم نہ ہوتا، لیکن حضرتؒ کی اس وصیت کی تکمیل کے لیے آج مجھے اپنا یہ راز ظاہر کرنا پڑا، لوگو! نمازِ جنازہ کے لیے تیار ہو جاؤ، الحمدللہ، مجھ میں حضرتؒ کی وصیت کے مطابق چاروں باتیں پائی جاتی ہیں۔ (مستفاد از: کتابوں کی درسگاہ: ۸۷)

تکبیر اولیٰ کا انعام:

عاجز کے خیالِ ناقص میں قربِ قیامت کے سبب آج عملی نفاق کا بہت زیادہ غلبہ ہے، جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ جو شخص ایک مرتبہ عملاً منافقت کی راہ پر چل پڑتا ہے، پھر اسے کتاب وسنت میں بیان کردہ علاماتِ نفاق (دھوکہ دہی، اعمال میں سستی، ریاکاری، ذکر اللہ کی کمی، خیانت، دروغ گوئی، وعدہ خلافی اور فحش گوئی) وغیرہ کی عادت پڑ جاتی ہے، ایسی صورت میں اگر ان اعمالِ نفاق سے خلاصی کے لیے تکبیر اولیٰ کا اہتمام کرلیا جائے تو حدیث پاک کے مطابق ان شاء اللہ اس شخص کو دنیا میں اعمالِ نفاق سے اور آخرت میں منافقین سے محفوظ رکھا جائے گا، تکبیر اولیٰ کے اہتمام کا یہ بہت بڑا انعام ہے، جو بحمد اللہ مساجد کے ائمہ و مؤذنین کو حاصل ہے۔

حق تعالیٰ ہمیں اپنی توفیق خاص سے تکبیر اولیٰ اور اپنی رضا وخوشنودی والے تمام اعمالِ صالحہ کی توفیق عطا فرمائے اور آج کی رات اس صدی کے سب سے بڑے کہے جانے والے چاند گہن کو ہمارے لیے عبرت وہدایت کا ذریعہ بنادے۔ آمین۔

۱۳/ ذوالقعدۃ/ ۱۴۳۹ھ، بروز جمعہ، قبل المغرب
مطابق: ۲۷/ جولائی/ ۲۰۱۸ء (بزم صدیقی، بڑودا)

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيرًا فَصَلُّوا عَلَيْهِ كَثِيرًا كَثِيرًا

(۱۰)

اسلام کے معاشرتی احکام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ عَبۡدِاللّٰہِ بۡنِ عَمۡرٍو رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: "اَلۡمُسۡلِمُ مَنۡ سَلِمَ الۡمُسۡلِمُوۡنَ مِنۡ لِسَانِهٖ وَ يَدِهٖ، وَ الۡمُهَاجِرُ مَنۡ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰہُ عَنۡهُ، هٰذَا لَفۡظُ الۡبُخَارِيِّ، وَ لِمُسۡلِمٍ: قَالَ: إِنَّ رَجُلاً سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ: أَيُّ الۡمُسۡلِمِيۡنَ خَيۡرٌ؟ قَالَ: مَنۡ سَلِمَ الۡمُسۡلِمُوۡنَ مِنۡ لِسَانِهٖ وَ يَدِهٖ". (مشكوٰة: ١٢/ كتاب الإيمان)

"حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کامل اور اعلیٰ درجہ کا مسلمان یا مسلمان کہلانے کا مستحق وہ شخص ہے جس کے ہاتھ اور زبان کے شر سے دوسرے مسلمان (اور انسان) محفوظ رہیں، اسی طرح کامل اور اعلیٰ درجہ کا مہاجر یا مہاجر کہلانے کا مستحق وہ شخص ہے جس نے ان تمام چیزوں کو بھی (اپنے وطن کے ساتھ) چھوڑ دیا ہو جن سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے، یہ الفاظ صحیح بخاری کے ہیں، اور مسلم شریف میں یہ الفاظ منقول ہیں کہ ایک شخص نے سرکارِ دو عالم ﷺ سے سوال کیا کہ سب سے بہترین مسلمان کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس کے ہاتھ اور زبان کے شر سے مسلمان (اور عام انسان) سلامت رہیں۔

احکامِ اسلام کے پانچ اجزاء میں معاشرتی احکام سے ہماری مجرمانہ غفلت:

اللہ رب العزت نے دنیا میں پیدا ہونے والے ہر انسان کو مختلف رشتوں اور واسطوں سے منسلک کر دیا، جوڑ دیا، جس کی وجہ سے ہر انسان کا مختلف لوگوں سے لازماً واسطہ پڑتا ہے، ان میں بہتری لانے کے لیے اسلام کے معاشرتی احکام یعنی دنیا میں رہنے سہنے اور ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ اور سلوک کے اسلامی اصول و آداب کی رعایت اور عمل ضروری ہے، اسلام نے اپنے ماننے والوں کو جہاں عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاقیات کی تعلیم دی وہاں معاشرتی احکام کی بھی تعلیم دی ہے، جن میں سے بعض کا تعلق انسان کی انفرادی زندگی سے اور بعض کا تعلق اجتماعی زندگی سے ہے، اور بعض کا تعلق دونوں سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے معاشرتی احکام بھی ایسے بے مثال ہیں کہ دنیا کی کسی بھی تہذیب میں اس کی مثال ممکن نہیں؛ اس لیے واقعہ تو یہ ہے کہ اسلامی تہذیب ہی اصل تہذیب ہے، اسلامی تہذیب کے مقابلہ میں مغربی اور غیر اسلامی تہذیب کو تعذیب سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

ہمارے علماء نے فرمایا کہ احکامِ اسلام کے بنیادی طور پر پانچ اجزاء اور شعبے ہیں: (۱) عقائد (۲) عبادات (۳) معاملات (۴) اخلاقیات (۵) معاشرت۔ پانچوں پر مکمل عمل کرنا ضروری ہے، ارشادِ باری ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا ادۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ كَآفَّةً ﴾ (البقرة: ۲۰۸)

"اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔"

کیوں کہ دین اسلام دیگر اَدیان کی طرح چند تصورات و خیالات اور چند اعمال کی پابندی کا نام نہیں؛ بلکہ اسلام ایک جامع، کامل اور مکمل ضابطۂ حیات کا نام ہے، اسلام زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے، مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے مفصل

احکام اسلام نے نہ بتائے ہوں، لہٰذا اے مسلمانو! ﴿ اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ﴾ زندگی کے تمام شعبوں اور موقعوں میں اسلام کے مکمل احکام پر عمل کرو، یہی تمہاری شان اور پہچان ہے۔

اسلام کے بعض احکام پر عمل کرنا اور بعض احکام کو عملاً چھوڑ دینا یہ تو اہل کتاب کا طریقہ ہے، اللہ رب العزت نے ان مسلمانوں کو جنھوں نے عملاً دین اسلام کو نماز و روزہ کے علاوہ چند عقائد و اعمال تک محدود کر دیا اور دین اسلام کے دیگر احکام و اجزاء کو جن کا تعلق مثلاً اخلاقیات، معاملات اور معاشرت سے ہے عملاً چھوڑ دیا، متنبہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ أَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ﴾ (البقرة : ٨٥)

''کیا تم کتاب کے بعض احکام پر ایمان رکھتے ہو اور بعض پر ایمان نہیں رکھتے ؟''

اگر تم کتابِ ہدایت اور دین و شریعت پر کامل اور مکمل ایمان رکھتے ہو تو ﴿ اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ﴾ اس کے تمام احکام پر مکمل عمل کرو، خواہ اس حکم کا تعلق عقائد سے ہو، عبادات سے ہو، اخلاقیات سے ہو، معاملات سے ہو یا معاشرت سے۔

لیکن افسوس کہ آج دین اسلام کے دیگر اجزاء واحکام کی طرف تو پھر بھی کچھ نہ کچھ توجہ ہے، لیکن معاشرتی احکام سے عموماً مجرمانہ غفلت پائی جاتی ہے۔

اسلام کے معاشرتی احکام کی اہمیت:

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے بقول اگرچہ اسلام کے معاشرتی احکام کا نمبر اسلامی عقائد وفرائض کے بعد آتا ہے، لیکن عقائد واعمال میں ہونے والی کمی وکوتاہی سے اپنا ذاتی نقصان ہوتا ہے، جب کہ معاشرتی احکام میں ہونے والی کمی وکوتاہی سے اپنے علاوہ دوسروں کا بھی نقصان ہوتا ہے، جس کی تلافی کے لیے قیامت میں اعمال پیش کرنے پڑیں گے۔ کما ورد فی الخبر عن النبي الصادق الأبر.

اس حیثیت سے دیکھا جائے تو اسلام کے معاشرتی احکام کو دیگر احکام پر بعض

حیثیت سے اہمیت حاصل ہے، غالبًا یہی وجہ ہے کہ ایک مقام پر خود حق تعالیٰ نے اسلام کے معاشرتی احکام کو عقائد واعمال سے پہلے بیان فرمایا:

﴿ وَ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَّ إِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ○ وَ الَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا ○ ﴾ (الفرقان : ٦٣-٦٤)

یہاں اسلام کے معاشرتی احکام کو پہلے بیان فرمایا اور عقائد واعمال کو بعد میں بیان فرمایا، اس سے بھی اسلام کے معاشرتی احکام کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ پھر یہ تو ان احکام و اعمال کی بات ہے جو ضروری اور فرض ہیں، جہاں تک نفل اعمال کا تعلق ہے تو بلاشبہ نفل اعمال پر اسلام کے معاشرتی احکام کو فوقیت واہمیت حاصل ہے، اس کی دلیل وہ حدیث شریف ہے جس میں رحمت عالم ﷺ کی خدمت اقدس میں دو عورتوں کا ذکر کیا گیا:

" إِنَّ فُلَانَةَ يُذْكَرُ مِنْ كَثْرَةِ صَلٰوتِهَا وَ صِيَامِهَا وَ صَدَقَتِهَا، غَيْرَ أَنَّهَا تُؤْذِيْ جِيْرَانَهَا بِلِسَانِهَا، قَالَ: هِيَ فِي النَّارِ".

''حضور! فلاں عورت (نفل) نماز، روزہ اور صدقات (نافلہ) کا بکثرت اہتمام کرتی ہے، (یہاں ''کثرت'' کا لفظ بتاتا ہے کہ اس سے مراد نوافل ہیں، کیوں کہ کثرت نوافل ہی میں ہو سکتی ہے) مگر اپنے پڑوسیوں کو زبان سے تکلیف دیتی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ پھر تو وہ دوزخی ہے۔''

صحابیؓ نے آگے دوسری عورت کے متعلق عرض کیا:

" فَإِنَّ فُلَانَةَ تُذْكَرُ قِلَّةُ صِيَامِهَا وَ صَدَقَتِهَا أَوْ صَلٰوتِهَا، وَ إِنَّهَا تَصَدَّقُ بِالْأَثْوَارِ مِنَ الْأَقِطِ، وَ لَا تُؤْذِيْ بِلِسَانِهَا جِيْرَانَهَا، قَالَ: هِيَ فِي الْجَنَّةِ". (رواه أحمد، و البيهقي في شعب الإيمان، مشكوٰة : ٤٢٤/ باب الشفقة و الرحمة على الخلق / الفصل الثالث)

''وہ (نفل) نماز، روزہ اور صدقہ کا تو بکثرت اہتمام نہیں کرتی (بلکہ فرائض و واجبات پر اکتفاء کرتی ہے، اور کبھی کبھی اگر) صدقہ کرتی بھی ہے تو پنیر کے چند ٹکڑے (یعنی معمولی صدقہ کرتی ہے) لیکن اپنے ہمسایوں کو زبان سے (بھی کبھی) تکلیف نہیں دیتی، تو

اس عورت کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ جنتی ہے۔‘‘

حسن معاشرت نفل عبادت سے بہتر ہے:

معلوم ہوا کہ حسن معاشرت نفل اعمال وعبادات سے بہتر ہے، بالفاظِ دیگر اسلام کے معاشرتی احکام کو دیگر احکام پر بعض حیثیت سے اہمیت حاصل ہے، اس لیے ان پر عمل کرنے کا اجر وثواب بھی دیگر احکام اور نفل نماز، روزہ اور صدقہ وغیرہ عبادت کی کثرت سے زیادہ ہے، جیسا کہ حسن اخلاق کے فضائل میں جو روایتیں منقول ہیں ان میں اس کا ذکر ہے، اوپر ذکر کردہ حدیث پاک سے بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص نفل عبادات کا تو زیادہ اہتمام کرتا ہے؛ لیکن حسن معاشرت سے بے پرواہ ہے اور اپنے قول وعمل سے دوسروں کو نقصان پہنچاتا ہے تو نوافل کی کثرت کے باوجود ایسا شخص اللہ تعالیٰ کا محبوب بندہ نہیں بن سکتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی پکڑ ہوسکتی ہے، جب کہ دوسرا شخص وہ ہے جو نفل اعمال وعبادات کا تو اہتمام نہیں کرتا؛ لیکن اسلام کے معاشرتی احکام پر ضرور عمل کرتا ہے، اپنے قول وعمل سے کسی کو بالارادہ اور بلاوجہ جان بوجھ کر کوئی تکلیف نہیں دیتا، تو یہ شخص اللہ تعالیٰ کا محبوب بندہ ہے۔

مذکورہ حدیث پاک سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ جب حضور ﷺ سے سوال کیا گیا کہ ’’أَيُّ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرٌ؟‘‘، مسلمانوں میں سب سے بہتر شخص کون ہے؟ تو فرمایا: جس کی زبان اور ہاتھ (مراد اس کے رہن سہن اور برتاؤ) سے کسی کو تکلیف نہ ہو۔

اسلام کے معاشرتی احکام کا اعلیٰ درجہ:

الغرض یہ حقیقت ہے کہ اسلام کے معاشرتی احکام کو دیگر بعض احکام پر فوقیت و اہمیت حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ کتاب وسنت میں مختلف مقامات پر اسلام کے معاشرتی احکام کو بالتفصیل بیان کیا گیا ہے، عاجز کے خیالِ ناقص میں مجموعی طور پر ان احکام کو عملی اعتبار سے تین درجات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: (۱) اعلیٰ (۲) اوسط (۳) ادنیٰ۔

ایک مسلمان کے لیے اسلام کے معاشرتی احکام پر عمل کے اعلیٰ درجے میں تین باتیں داخل ہیں: (۱) خندہ پیشانی (۲) شیریں کلامی وخوش گفتاری (۳) نفع رسانی۔ مطلب یہ ہے کہ وہ جب کسی سے ملے (بشرطیکہ وہ غیر محرم نہ ہو) تو خندہ پیشانی سے ملے، قرآنِ پاک میں حکم ہے:

﴿ وَ لَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَ لَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا﴾ (لقمان: ۱۸)

’’لوگوں کے ساتھ بے رُخی نہ برتو اور نہ تکبر کی چال چلو۔‘‘

جب کسی سے ملو تو خندہ پیشانی اور نرمی سے ملو، پھر جب بات چیت اور گفتگو کا موقع آئے تو ہر کسی کے ساتھ اچھی بات کرو، چنانچہ قرآنِ پاک میں فرمایا گیا:

﴿ وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ (بنی إسرائیل: ۳)

خندہ پیشانی اور شیریں کلامی کے بعد جب معاملہ آگے بڑھے تو حتی الامکان نفع رَسانی کی کوشش کرو، کیوں کہ مسلمان بہترین نبی کی بہترین امت ہے: ﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ (ال عمران: ۱۱۰) جس کا مقصد زندگی لوگوں کی نفع رَسانی ہے، اسی لیے حدیث پاک میں وارد ہے کہ ایک موقع پر رحمت عالم ﷺ سے کسی نے سوال کیا کہ حضور! ’’أُحِبُّ أَنْ أَكُوْنَ خَيْرَ النَّاسِ‘‘ میں چاہتا ہوں کہ معاشرہ میں تمام لوگوں میں سب سے بہتر بن جاؤں، تو اس کا کیا طریقہ ہے؟

فَقَالَ: " خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَنْفَعُ النَّاسَ، فَكُنْ نَافِعًا لَهُمْ".

(کنز العمال: ۱۶/ ۱۲۸/ کتاب المواعظ والرقائق و الحکم من القسم الأول)

’’فرمایا جو شخص لوگوں کے لیے نافع ہے وہ سب سے بہتر شخص ہے۔‘‘ لہٰذا اگر تم سماج کا بہترین فرد بننا چاہتے ہو تو سبھی کے لیے نفع بخش بن جاؤ، ایک سچے اور پکے مسلمان کی یہی امتیازی شان اور پہچان ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بخاری شریف کی ایک روایت میں مومن بندہ کو کھجور کے درخت کے

ساتھ تشبیہ دی گئی ہے:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰہُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ:" إِنَّ مِنَ الشَّجَرِ شَجَرَةً لَا يَسْقُطُ وَرَقُهَا، وَ إِنَّهَا مَثَلُ الْمُسْلِمِ......الخ" (رواه البخاری)

جس طرح کھجور کا درخت، اس کا تنہ، شاخیں، پتے، پھل بلکہ ہر جز دوسرے درختوں کے بالمقابل زیادہ نفع بخش ہوتا ہے، اسی طرح ایک سچا اور پکا مسلمان بھی دیگر غیر مسلم بندوں کے بالمقابل زیادہ نفع بخش ہوتا ہے، ایک مسلمان کے لیے اسلام کے معاشرتی احکام پر عمل کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ وہ اپنی دولت، صلاحیت اور طاقت سے اپنی حیثیت کے بہ قدر دوسروں کی بے غرض خدمت کرے، دوسروں کو نفع پہنچائے، حضور ﷺ نے نبوت سے پہلے بھی اور نبوت کے بعد بھی ساری زندگی اس پر عمل کر کے دنیا کے سامنے تا قیامت نمونہ پیش فرمایا، اگر ہمیں واقعی حضور ﷺ کی ذات اور ان کے طریقۂ حیات سے محبت ہے تو اس راہ پر چل کر امت کے لیے نافع اور خدمت گار بن جائیں۔ رضائے الٰہی کی نیت سے نفع رسانی کا عمل دارین میں نفع ونجات کا سبب بن سکتا ہے۔

حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰہُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ:" مَرَّ رَجُلٌ بِغُصْنِ شَجَرَةٍ عَلٰى ظَهْرِ طَرِيْقٍ، فَقَالَ:" لَأُنَحِّيَنَّ هٰذَا عَنْ طَرِيْقِ الْمُسْلِمِيْنَ، لَا يُؤْذِيْهِمْ، فَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ". (متفق علیه، مشکوٰة: ۱۶۸، باب فضل الصدقة)

ایک شخص کسی درخت کی ٹہنی کے پاس سے گزرا، جو راستے پر (اس طرح تھی کہ آنے جانے والوں کو اس سے تکلیف ہوتی تھی) اس بندے نے لوگوں کو تکلیف سے بچانے کے لیے اس ٹہنی کو دور کر دیا، اس کا یہ عمل دخولِ جنت کا سبب بن گیا۔

واقعی نفع رسانی کا چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی دخولِ جنت کا سبب بن سکتا ہے، بشرطیکہ خلوصِ نیت کے ساتھ ہو۔

اسلام کے معاشرتی احکام کا درمیانی درجہ:

لیکن لوگوں سے میل ملاپ میں تمہاری طرف سے خندہ پیشانی، شیریں کلامی اور نفع رسانی کے باوجود تمہیں لوگوں کی طرف سے قصداً یا بلا قصد کوئی نقصان اور تکلیف پہنچے تو اس وقت اسلام کے معاشرتی احکام کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اپنے ذاتی معاملات میں دوسروں سے پہنچنے والی تکلیف پر حتی الامکان چشم پوشی اور عفو و درگذر سے کام لو۔ قرآنِ کریم نے اس کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا أَلَا تُحِبُّوْنَ أَنْ يَّغْفِرَ اللّٰہُ لَكُمْ وَ اللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۝﴾ (النور: ۲۲)

جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ حق تعالیٰ ان کے ساتھ معافی اور چشم پوشی سے کام لیں تو انہیں بھی چاہیے کہ وہ حتی الامکان اپنے قصوروار کے ساتھ معافی اور چشم پوشی اور خیر خواہی سے کام لیں؛ لیکن یہ اس وقت ممکن ہے جب کہ ہم سماج کے لوگوں کے لیے سراپا محبت بن جائیں، یہ بھی سچے مسلمان کی پہچان ہے، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰہُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: " الْمُؤْمِنُ مَأْلَفٌ، وَ لَا خَيْرَ فِيْمَنْ لَا يَأْلَفُ وَ لَا يُؤْلَفُ". (رواه أحمد، مشکوٰة: ۴۲۵)

''مومن تو اُلفت ومحبت کا مرکز ہوتا ہے (مومن بندہ تمام مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی عیال سمجھ کر اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے محبت کرتا ہے، اور اس کے حسن معاشرت کی وجہ سے اس سے بھی سماج کے دوسرے لوگ محبت کرتے ہیں) اور اس مومن میں کوئی خیر وخوبی نہیں جو کسی سے اُلفت ومحبت نہ رکھے، اور نہ ہی اس سے اُلفت ومحبت کی جائے۔''

واقعہ یہ ہے کہ اُلفت ومحبت سے اجتماعیت پیدا ہوتی ہے، اس لیے جس بندہ میں یہ وصف ہوتا ہے وہ ہر ایک کے ساتھ مل جل کر رہ سکتا ہے، اور جو اس وصف سے محروم ہوتا ہے اس کا گھر والوں اور سماج کے لوگوں کے ساتھ نبھاؤ مشکل ہو جاتا ہے۔

پھر محبت کے بھی دو درجے ہیں: (۱)اعلیٰ (۲)ادنیٰ۔ محبت کا اعلیٰ درجہ اور اس کا اصل مقصد راحت ونفع پہنچانا ہے، مطلب یہ ہے کہ جس سے محبت ہے اس کے آرام وراحت کا خیال رکھا جائے، یہی اصل محبت ہے، آج کل جو لوگ محبت میں تکلیف پہنچاتے ہیں وہ محبت نہیں، جہالت ہے، ایسے لوگ محبت کے مقصد سے ناواقف ہیں، جو لوگ مقصدِ محبت سے واقف ہیں وہ قصداً اپنے محبوب کو نقصان نہیں پہنچا سکتے، اگر ایک مومن بندہ اپنی واقعی پہچان کے مطابق سراپا محبت بن جائے، جس کا اعلیٰ درجہ ہر ایک کو راحت پہنچانا ہے، تو اس کی برکت سے وہ اسلام کے معاشرتی احکام کا اعلیٰ درجہ حاصل کر کے معاشرہ کا بہترین فرد بن سکتا ہے۔

لیکن اگر محبت کے اعلیٰ درجہ پر عمل نہ ہو سکے تو کم از کم محبت کے ادنیٰ درجہ پر عمل کر کے بھی اسلام کے معاشرتی احکام کا درمیانی درجہ حاصل کر سکتے ہیں، اور محبت کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ خیر وخوبی کی جو چیزیں اپنے لیے پسند ہوں وہ دوسروں کے لیے بھی پسند کی جائیں، ایک مومن بندہ محبت کے اس ادنیٰ درجہ پر عمل کیے بغیر صحیح معنیٰ میں کامل مومن بن ہی نہیں سکتا، چنانچہ حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "وَ الَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰى يُحِبَّ لِأَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ".

(متفق عليه، مشكوٰة : ٤٢٢/ باب الشفقة و الرحمة على الخلق)

"آپ ﷺ نے قسم کھا کر یہ بات ارشاد فرمائی کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے، کوئی بندہ اس وقت تک کامل مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ امورِ خیر یعنی دنیا وآخرت کی بھلائی میں وہی چیزیں اپنے بھائیوں کے لیے پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔"

اس حدیث پاک کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جو چیزیں اپنے لیے پسند ہیں وہ دوسروں کے لیے بھی پسند کی جائیں، مثلاً ہم اپنے لیے ہدایت، راحت اور عزت وغیرہ پسند

کرتے ہیں تو کمالِ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ یہ چیزیں دوسروں کے لیے بھی پسند کریں، یہ مومن بندہ کی محبت کا ادنیٰ درجہ ہے۔

حدیث پاک کا دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ جو چیزیں ہم اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں وہ دوسروں کے لیے بھی ناپسند کریں۔ اس کی تائید دوسری ایک حدیث سے ہوتی ہے جس میں آپ ﷺ نے اعمالِ ایمان میں افضل عمل کے متعلق سوال کرنے پر جواباً ارشاد فرمایا:

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّهٗ سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ عَنْ أَفْضَلِ الْإِيْمَانِ، قَالَ: أَنْ تُحِبَّ لِلّٰهِ، وَ تُبْغِضَ لِلّٰهِ، وَ تُعْمِلَ لِسَانَكَ فِيْ ذِكْرِ اللّٰهِ، قَالَ: وَ مَاذَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ: وَ أَنْ تُحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ، وَ تَكْرَهَ لَهُمْ مَا تَكْرَهُ لِنَفْسِكَ". (رواه أحمد، مشكوٰة : ١٦/ كتاب الإيمان)

(اعمالِ ایمان میں افضل امور پانچ ہیں) (۱) جب بھی کسی سے محبت کرو تو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کرو (۲) جب بھی کسی سے عداوت ونفرت کرو تو بھی اللہ تعالیٰ کے لیے (۳) اپنی زبان ذکر اللہ میں مشغول رکھو، ذکر اللہ اطمینانِ قلب کا ذریعہ ہے، کما قال اللہ تعالیٰ: ﴿أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ (الرعد : ٢٨) (۴) جو چیز اپنے لیے پسند کرو وہ دوسروں کے لیے بھی پسند کرو (۵) اور جو چیز اپنے لیے ناپسند ہو وہ دوسروں کے لیے بھی ناپسند کرو۔

ظاہر بات ہے کہ ہم اپنے لیے ضلالت، مضرت اور ذلت وغیرہ پسند نہیں کرتے تو کمالِ ایمانی وخیر خواہی کا تقاضا یہی ہے کہ دوسروں کے لیے بھی ان چیزوں کو پسند نہ کریں، یہ لوگوں کے ساتھ محبت کا ادنیٰ اور اسلام کے معاشرتی احکام کا درمیانی درجہ ہے۔

اسلام کے معاشرتی احکام کا ادنیٰ درجہ:

اسلام کے معاشرتی احکام کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ ہم ایذا رسانی سے بچیں اور بے ضرر بن جائیں، کتاب وسنت میں اس کی جگہ جگہ ترغیب اور تاکید وارد ہوئی ہے، اور جن باتوں

سے لوگوں کو ادنیٰ ضرر اور اَذیت ہوسکتی ہے ان سے بھی منع کر دیا، مثلاً دیکھئے کہ سورۂ حجرات میں اسلام کے معاشرتی احکام وآداب بیان کرتے ہوئے اُن چھ باتوں سے منع کیا جو اَذیت اور جھگڑے کا سبب ہیں، چنانچہ ارشادِ باری ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا يَسۡخَرۡ قَوۡمٌ مِّنۡ قَوۡمٍ عَسٰٓى اَنۡ يَّكُوۡنُوۡا خَيۡرًا مِّنۡهُمۡ وَ لَا نِسَآءٌ مِّنۡ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنۡ يَّكُنَّ خَيۡرًا مِّنۡهُنَّ ﴾ (الحجرات: ۱۱)

’’اے ایمان والو! نہ تو مرد دوسرے مردوں کا مذاق اُڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ (جن کا مذاق اُڑایا جارہا ہے) وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اُڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ (جن کا مذاق اُڑایا جارہا ہے) ان سے بہتر ہوں۔‘‘

اس میں ایک تو تمسخر یعنی ایسے مذاق سے منع فرمایا جو دوسروں کی دل آزاری، دل شکنی، ایذا رسانی، تحقیر، تذلیل یا تکلیف کا ذریعہ ہو، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: "لَا تُمَارِ أَخَاكَ، وَ لَا تُمَازِحْهُ، وَ لَا تَعِدْهُ مَوْعِدًا فَتُخْلِفَهُ". (رواه الترمذی / باب ما جاء فی المراء، مشکوٰۃ: ۴۱۷، باب المزاح)

’’اپنے بھائی سے جھگڑا نہ کر اور اس سے ایسا مذاق نہ کر جس سے اُسے تکلیف ہو، اور نہ اس سے کوئی ایسا وعدہ کر جس کو تو پورا نہ کرسکے۔‘‘ (یہ چیزیں اس کے لیے اَذیت اور تکلیف کا سبب ہیں، البتہ جو مزاح ان خرابیوں اور برائیوں سے خالی ہو اس کی گنجائش ہے)۔

آگے ارشاد ہوا: ﴿ وَ لَا تَلۡمِزُوۡٓا اَنۡفُسَكُمۡ ﴾ ’’ایک دوسرے کو طعنہ نہ دو۔‘‘ یہ اَذیت کا سبب ہے، یہ باتیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نزدیک سخت ناپسندیدہ ہیں۔

حدیث پاک میں وارد ہے کہ حضرت صفیہؓ کا قد ذرا چھوٹا تھا، ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے بطورِ عیب یا طعنہ کے کہہ دیا کہ "حَسْبُكَ مِنْ صَفِيَّةَ كَذَا وَ كَذَا" ’’صفیہ کا قد تو بس اتنا سا ہے۔‘‘ اس پر حضور ﷺ نے سخت ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ

"لَقَدْ قُلْتِ كَلِمَةً لَوْ مُزِجَ بِهَا الْبَحْرُ لَمَزَجَتْهُ". (رواه أحمد و الترمذی و أبوداود، مشکوٰۃ: ۴۱۴/ باب حفظ اللسان و الغيبة و الشتم)

’’تم نے ایسی بات کہہ دی کہ اگر اسے سمندر میں ملا دیا جائے تو وہ بھی اس کی کڑواہٹ سے خراب اور کڑوا ہوجائے۔‘‘

علماء نے فرمایا ہے کہ بلاوجہ کسی کا عیب ظاہر کرنا یا طعنہ دینا خواہ زبان سے ہو، قلم سے ہو یا اشارہ سے، بہرحال ممنوع ہے۔ پھر آگے فرمایا: ﴿ وَ لَا تَنَابَزُوۡا بِالۡاَلۡقَابِ ﴾ ’’ایک دوسرے کو برے لقب سے نہ پکارو۔‘‘ جو اسے ناگوار ہو، مثلاً کسی شخص کا ایسے الفاظ سے تذکرہ کرنا جس سے اس کی تحقیر اور تذلیل ہو، مثلاً کسی کو لنگڑا، لولا، اندھا، کانا، کالا وغیرہ کہہ کر پکارنا، البتہ اگر کوئی شخص کسی ایسے نام یا لقب سے مشہور ہوجائے جو فی نفسہ تو برا ہے، مگر اس کے بغیر اسے پہچانا ہی نہ جاتا ہو تو ایسی صورت میں اس لفظ سے پکارنے یا تذکرہ کرنے کی اجازت ہے، بشرطیکہ اس سے تحقیر وتذلیل مقصود نہ ہو۔ (معارف القرآن: ۸/ ۱۱۸)

کتاب وسنت میں لوگوں کو اچھے نام اور اَلقاب سے پکارنے کی ترغیب آئی ہے، اس کے برخلاف برے نام واَلقاب سے پکارنے کی ممانعت ہے، کہ یہ اَذیت کا سبب ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آیت کریمہ میں ’’تنابز بالالقاب‘‘ سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص نے کوئی گناہ کیا، پھر اس سے توبہ کرلی (تو اس کی حوصلہ اَفزائی کرنی چاہیے، اس کے بجائے اگر کوئی شخص) توبہ کے بعد بھی اس کو اسی گناہ سے یاد کرتا رہے یا پکارتا رہے۔ مثلاً کسی شخص نے چوری، زناکاری یا شراب نوشی سے توبہ کرلی، اس کے بعد بھی اسے چور، زانی یا شرابی کہہ کر پکارنا ’’تنابز بالالقاب‘‘ میں داخل ہے۔

(مستفاد از: معارف القرآن: ۸/ ۱۱۷، انوار البیان: ۶/ ۱۷۴)

اس طرح عار دلانے پر حدیث پاک میں سخت وعید بیان ہوئی ہے:

عَنْ مُعَاذٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ عَيَّرَ أَخَاهُ بِذَنْبٍ

لَمْ يَمُتْ حَتّٰى يَعْمَلَهٗ، يَعْنِيْ مِنْ ذَنْبٍ قَدْ تَابَ مِنْهُ". (رواه الترمذي، مشكوٰة : ٤١٤)

"جس شخص نے کسی کو ایسے گناہ پر عار دلائی جس سے وہ توبہ کر چکا تھا، تو یہ عار دلانے والا اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک وہ خود اس گناہ میں مبتلا نہ ہو جائے۔"

یہ تنابز بالالقاب کی نحوست ہے، اس لیے اس کی سخت ممانعت ہے، غور کیجئے کہ جب ایسے نام سے بھی پکارنے کی ممانعت ہے جو اَذیت کا سبب ہو تو پھر جو کام اَذیت والے ہوں ان کی کہاں اجازت اور گنجائش ہو سکتی ہے؟

اس کے بعد والی آیت میں ارشادِ باری ہے:

﴿ اِجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ﴾ (الحجرات : ١٢)

"بدگمانی سے بچو۔" بلا کسی قوی دلیل کے کسی کے متعلق بدگمانی کرنا یا تہمت لگانا اَذیت اور سخت تکلیف کا سبب ہے، اس لیے اس کی بھی ممانعت ہے۔ حکم یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہر ایک کے ساتھ اچھا گمان رکھو، قیامت کے دن حق تعالیٰ حسن ظن پر تو نہیں؛ لیکن سوءِ ظن پر پکڑ فرمائیں گے، اس لیے بھی یہ ممنوع ہے۔

آگے ارشادِ باری ہے: ﴿ وَ لَا تَجَسَّسُوْا﴾ "بلا کسی خاص وجہ کے کسی کی جاسوسی نہ کرو"، کسی کی پرسنل لائف میں بلا وجہ دَخل نہ دو، عموماً اس کا نفع کم اور نقصان زیادہ ہوتا ہے، اس لیے اس سے بھی روکا گیا ہے۔

اخیر میں فرمایا: ﴿ وَ لَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا﴾ "آپس میں ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔" یہ بھی آپسی اَذیت کا سبب ہے۔ الغرض ہر وہ چیز جو ادنیٰ اَذیت کا بھی سبب ہو، کتاب وسنت میں اس کی ممانعت ہے۔

اسلام کے معاشرتی احکام اور اُن کا پیغام:

اسلام کے معاشرتی احکام کا اصل پیغام یہی ہے کہ بے ضرر بن جاؤ اور لوگوں کے ساتھ اس طرح مل جل کر رہو کہ بلا وجہ جان بوجھ کر کسی کو ادنیٰ تکلیف بھی نہ پہنچنے پائے، حضور

پاک ﷺ نے اپنے بلیغ انداز میں اس کو اس طرح بیان فرمایا کہ "اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَ يَدِهٖ" اس فرمان سے شریعت کا اصل منشا یہ ہے کہ معاشرہ کا ہر فرد دوسرے کے لیے نافع بنے، ضار نہ بنے، اس کے لیے امورِ خیر میں باہمی تعاون، نجی معاملات میں عفو و درگذر، بڑوں کا احترام، چھوٹوں پر شفقت اور ان کے اچھے کاموں کی حوصلہ اَفزائی، مصیبت زدہ لوگوں کی مدد اور ان کی غم گساری، رنجیدہ لوگوں کو تسلی، رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی اور ہر ایک کے ساتھ خوش اَخلاقی کے ساتھ پیش آنے کا اسلام نے حکم دیا ہے۔

صاحبو! اسلام کے یہ اَحکام اور پیغام عام ہو جائے اور اس پر کما حقہ عمل ہو جائے جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ ہر انسان اپنی ذات اور زبان سے، کام اور کلام سے بلا وجہ جان بوجھ کر کسی کو تکلیف نہ دے، تو یقیناً اس سے معاشرہ جنت کا نمونہ بن جائے، کیوں کہ جنت کی شان یہی ہوگی کہ وہاں ذرہ برابر بھی کسی کو کسی سے کسی طرح کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی، جیسا کہ کہا گیا ہے:

جنت آنجا کہ آزارے نباشد　　　کسے را با کسے کارے نباشد

کتاب وسنت کی تعلیمات کا خلاصہ پانچ احادیث میں:

ایک مسلمان کو ان احکام پر عمل ضرور کرنا چاہیے، اس کے بغیر وہ سچا اور پکا مسلمان بن ہی نہیں سکتا، علاوہ ازیں یہ حدیث بھی اُن پانچ احادیث میں سے ہے جن پر عمل کرنے والا مسلمان واقعی دین دار، متقی اور پرہیزگار رہے، حضرت امام ابوداودؒ کے متعلق منقول ہے کہ آپؒ نے پانچ لاکھ احادیث جمع فرمائیں، پھر ان میں سے چار ہزار آٹھ سو احادیث کو منتخب کر کے انہیں ابوداود شریف میں جمع فرمایا، ان میں چار حدیثیں ایسی ہیں گویا وہ کتاب وسنت کی ساری تعلیمات وہدایات کا خلاصہ ہے:

(١) إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ......الخ (متفق عليه، مشكوٰة : ١)

''تمام اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہے۔'' یعنی ثوابِ اعمال یا صحت اعمال کا مدار حسن نیت یا نفس نیت پر ہے، ہر عمل وعبادت کے وقت اسے مستحضر رکھا جائے تو ساری زندگی بندگی بن جائے۔

(۲) مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ. (رواه أحمد، مشكوٰة:٤١٣)

''مسلمان بندہ کے اسلام کی خوبی (اور کمالِ ایمان کی نشانی) یہ ہے کہ وہ لایعنی کو چھوڑ دے۔'' خود کو کسی ایسے کام میں مشغول رکھنا جس سے زندگی کے قیمتی اوقات ضائع ہوں مسلمان کی شان نہیں۔

(۳) لَا يُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ.

(متفق عليه، مشكوٰة : ٤٢٢)

''بندۂ مؤمن کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔'' اس پر عمل کرنے سے حقوق العباد کی ادائیگی آسان ہوجائے گی۔

(٤) الْحَلَالُ بَيِّنٌ، وَ الْحَرَامُ بَيِّنٌ، وَ بَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ......الخ

(متفق عليه، مشكوٰة : ٢٤١)

''حلال بھی کتاب وسنت میں واضح طور پر بیان کر دیا گیا اور حرام بھی، اور دونوں کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں۔'' لہٰذا جن چیزوں کو حلال اور جائز قرار دیا گیا انہیں کو اختیار کرو، اور جن چیزوں کو حرام اور ناجائز قرار دیا گیا ہے ان سے اور مشتبہ امور سے بھی بچو، اس حدیث پر عمل کرلیا جائے تو اسی کا نام تقویٰ ہے۔

حضرت شیخ محمد زکریا کاندھلویؒ نے فرمایا کہ امام ابوداودؒ کی اِن احادیث کا انتخاب ان سے پہلے حضرت امامنا العلام ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ کر چکے ہیں، لیکن امام صاحبؒ نے اِن چار احادیث کے علاوہ مزید ایک اور حدیث کا انتخاب فرمایا:

(٥) الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهِ وَ يَدِهِ. (مشكوٰة : ١٢)

''مسلمان کی پہچان یہ ہے کہ اس کی ذات اور زبان کی تکلیف سے دوسرے لوگ محفوظ رہیں۔''

حضرت شیخ زکریاؒ یہ بھی فرماتے تھے کہ اس پانچویں حدیث کو حضرت امام ابوداودؒ نے غالباً اس لیے نہیں لیا کہ اس کا مضمون اور معنیٰ حدیث نمبر:۳ یعنی "لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ ...... الخ" سے مستفاد ہو رہا ہے۔ (مقدمہ الدر المنضود:۱/ ۳۸)

اسلام کے معاشرتی احکام کی بنیاد اس پانچویں حدیث پر ہے، یہ پانچ احادیث مبارکہ ایسی عظیم الشان ہیں کہ انہیں کتاب وسنت کی تعلیمات وہدایات کا خلاصہ قرار دیا جاسکتا ہے، کسی مسلمان کے دین دار اور پرہیزگار رہونے کے لیے ان پر عمل کر لینا بھی کافی ہے۔

حق تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرما کر کامل اور مکمل مسلمان بنادیں۔ آمین۔

مؤرخہ:۳/ ذوالحجہ/ ۱۴۳۹ھ/ بروز بدھ

مطابق:۱۵/ اگست/ ۲۰۱۸ء

(بزمِ صدیقی، بڑودا)

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيرًا   فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيرًا

(۱۱)

اسلام میں پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی اہمیت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ هُرَیۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "وَ اللّٰهِ لَا یُؤۡمِنُ، وَ اللّٰهِ لَا یُؤۡمِنُ، وَ اللّٰهِ لَا یُؤۡمِنُ، قِیۡلَ: مَنۡ یَا رَسُوۡلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: الَّذِیۡ لَا یَأۡمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ". (متفق علیه، مشکوٰۃ:۴۲۲، باب الشفقة والرحمة علی الخلق)

ترجمہ : حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "اللہ کی قسم وہ شخص مؤمن (کامل) نہیں، اللہ کی قسم وہ شخص مؤمن (کامل) نہیں، اللہ کی قسم وہ شخص مؤمن (کامل) نہیں، عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! کون شخص مؤمن (کامل) نہیں ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جس ایمان والے کا پڑوسی اس کی تکلیفوں، شرارتوں اور آفتوں سے بے خوف، محفوظ اور مامون نہ ہو۔"

91

پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کا حکم:

اللہ رب العزت نے انسان میں اُنسیت ومحبت رکھی ہے، اُنسیت ومحبت اس کی فطرت وضرورت ہے، یہی وجہ ہے کہ دُنیا میں اکیلے آنے اور دُنیا سے اکیلے ہی جانے کے باوجود ہر وقت ہر انسان اکیلا اور تنہا رہنا پسند نہیں کرتا، ہر ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر ہی رہنا چاہتا ہے، انسان کے اسی جذبۂ اُنسیت ومحبت کا اثر ہے کہ دُنیا بھر میں لوگ سمٹ سمٹ کر آبادیوں کی طرف منتقل ہوتے رہے، جس کی وجہ سے دیہات قصبات میں، قصبات شہروں میں، شہر صوبوں میں اور صوبے ملکوں میں تبدیل ہوتے رہے، الغرض انسان جہاں بھی رہتا ہے عموماً اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ہی رہتا ہے، ان ساتھ رہنے والوں کو پڑوسی کہتے ہیں، اب خواہ وہ مکان یا دوکان کا دائمی پڑوسی ہو یا سفر، مجلس اور ملازمت کا عارضی پڑوسی۔

انسان کے گرد وپیش کی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کو پرسکون بنانے کے لیے حق تعالیٰ نے جہاں اور بہت سے احکام دیے ہیں وہیں ایک اہم حکم یہ بھی دیا:

﴿وَ الۡجَارِ ذِیۡ الۡقُرۡبٰی وَ الۡجَارِ الۡجُنُبِ﴾ (النساء:۳۶)

"ہر مسلمان اپنے پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرے، خواہ وہ پڑوسی قریبی رشتہ دار ہو یا اجنبی اور اپنا ہم مذہب ہو یا غیر"۔ پڑوسی ہونے کی حیثیت سے ہر ایک کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے، کیوں کہ "جار" کے معنیٰ پڑوسی کے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں اس کی دو قسمیں بیان کی گئیں، ایک "جار ذی القربی" اور دوسری "الجار الجنب"۔

علماءِ مفسرین کے بقول پہلی قسم سے مراد وہ پڑوسی ہے جو ہمارے مکان کے قریب رہتا ہے، اور دوسری قسم سے مراد وہ ہے جو مکان سے کچھ فاصلہ پر رہتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے بقول پہلی قسم سے مراد وہ پڑوسی ہے جو رشتہ دار بھی

ہو، اور دوسری قسم سے مراد وہ پڑوسی ہے جو رشتہ دار نہ ہو۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ پہلی قسم سے مراد وہ پڑوسی ہے جو مسلمان ہو، اور دوسری قسم سے مراد وہ پڑوسی ہے جو غیر مسلم ہو۔ (مستفاد از: معارف القرآن: ۲/۴۱۱)

اس تفسیر اور تشریح کے مطابق پڑوسیوں کی تین قسمیں اور درجے ہیں:

(۱) پہلی قسم وہ پڑوسی ہے جو رشتہ دار بھی ہو اور مسلمان بھی، جیسے کسی بڑے مکان یا اپارٹمنٹ میں جوئنٹ فیملی کے طور پر رہنے والے چند بھائی، کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا رشتہ دار ہونے کے ساتھ پڑوسی بھی ہے، یہ پڑوسی سب سے اعلیٰ درجہ کا ہے، جس کے ہم پر تین حقوق ہیں: ایک تو مسلمان ہونے کا، دوسرا رشتہ دار ہونے کا، اور تیسرا پڑوسی ہونے کا۔

(۲) دوسری قسم وہ پڑوسی ہے جو مسلمان ہو؛ مگر رشتہ دار نہ ہو، اس کے ساتھ ایمانی رشتہ تو ہے، خاندانی رشتہ نہیں، اس درمیانی درجہ کے پڑوسی کے دو حق ہیں: ایک تو مسلمان ہونے کا اور دوسرا پڑوسی ہونے کا۔

(۳) تیسری قسم وہ پڑوسی ہے جو مسلمان بھی نہ ہو اور رشتہ دار بھی نہ ہو، اگرچہ اس کے ساتھ ایمانی یا خاندانی رشتہ نہیں ہے؛ مگر انسانی رشتہ کی حیثیت سے اسلام میں اس پڑوسی کے ساتھ بھی حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔

پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید:

پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کا صرف حکم ہی نہیں دیا گیا؛ بلکہ اس کے ساتھ حسن سلوک کی بار بار تاکید بھی کی گئی ہے، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ عَائِشَةَ وَ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: "مَا زَالَ جِبْرِيْلُ يُوْصِيْنِي بِالْجَارِ، حَتّٰى ظَنَنْتُ أَنَّهُ سَيُوَرِّثُهُ". (متفق عليه، مشكوٰة: ۴۲۲)

''حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ ''پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کے متعلق حق تعالیٰ

کی جانب سے حضرت جبرئیل علیہ السلام مجھے برابر وصیت اور تاکید کرتے رہے، یہاں تک کہ میں خیال کرنے لگا کہ خاندانی رشتہ داروں کی طرح پڑوسی کو بھی وراثت میں شامل کرلیا جائے گا۔''

صاحبو! واقعہ یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں پڑوسی کی حیثیت بھی رشتہ دار سے کم نہیں، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ پہلا رشتہ دار پڑوسی ہے، کیوں کہ جس طرح خاندانی رشتہ داروں سے انسان کا واسطہ پڑتا ہے اسی طرح پڑوسی سے بھی ہر انسان کا مستقل واسطہ پڑتا ہے، بلکہ آج کل شہروں اور سوسائٹیوں میں لوگوں کے رہنے سہنے کا جو انداز ہے اس میں تو خاندانی رشتہ داروں کے مقابلہ میں ہر شخص کا پڑوسیوں سے واسطہ زیادہ پڑتا ہے، پڑوسیوں سے روزانہ آمنا سامنا ہوتا ہے، مگر رشتہ داروں سے نہیں، پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ پڑوسی کے ساتھ اچھے یا برے تعلق کا اثر براہِ راست انسانی زندگی پر ہوتا ہے، اس لیے کتاب وسنت میں پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔

پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کا طریقہ:

پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کا طریقہ یہ ہے کہ ہمارے ذمہ شرعاً پڑوسی کے جو حقوق ہیں وہ ادا کریں اور ساتھ ہی کچھ احسان بھی کریں، مطلب یہ ہے کہ بوقت ضرورت اپنی استطاعت و طاقت کے بقدر ان کی دینی و دنیوی ضرورت پوری کریں اور ان کی خدمت کرنے کی کوشش کریں، نیز شرعی حدود میں رہتے ہوئے ان سے ملاقات کے وقت بشاشت اور خندہ پیشانی سے پیش آئیں، ان کے احوال و خیریت معلوم کریں، اور اس بات کا خوب خیال رکھیں کہ ان کو بلا وجہ کسی بھی طرح کی کوئی ادنیٰ تکلیف و اذیت بھی نہ پہنچے، جیسا کہ حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيْمٍ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ: قُلْتُ: "يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَا حَقُّ جَارِيْ عَلَيَّ؟ قَالَ: إِنْ مَرِضَ عُدْتَهٗ، وَ إِنْ مَاتَ شَيَّعْتَهٗ، وَ إِنِ اسْتَقْرَضَكَ أَقْرَضْتَهٗ، وَ

إِنْ عُرِّيَ سَتَرْتَهُ، وَ إِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ هَنَّأْتَهُ، وَ إِنْ أَصَابَتْهُ مُصِيبَةٌ عَزَّيْتَهُ، وَ لَا تَرْفَعْ بِنَاءَ كَ فَوْقَ بِنَاءِ هٖ، فَتَسُدَّ عَلَيْهِ الرِّيحَ، وَ لَا تُؤْذِهِ بِرِيحِ قِدْرِكَ، إِلَّا أَنْ تَغْرِفَ لَهُ مِنْهَا".

(كنز العمال: ٩/١٨٤)

"حضرت بہز بن حکیمؒ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے رحمت عالم ﷺ سے عرض کیا کہ حضور! پڑوسی کا مجھ پر کیا حق ہے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر وہ بیمار ہو جائے تو اس کی خبر گیری اور عیادت کرو، اگر وہ انتقال کر جائے تو اس کی (تجہیز وتکفین اور تدفین کا اہتمام کرو، اور اگر وہ اپنی ضرورت کے لیے تم سے قرض یا مدد مانگے تو بقدرِ استطاعت اس کو قرض دو اور مدد کرو، اگر اس کے پاس ستر چھپانے کا انتظام نہ ہو تو اس کی فکر کرو، (یا اگر اس سے کوئی معصیت سرزد ہو جائے تو اس کی پردہ پوشی کرو، بلا کسی وجہ کے اس کی پردہ دری نہ کرو) اگر اسے کوئی بھلائی و خوشی ملے تو اسے مبارک بادی پیش کرو، اور اگر اسے کوئی پریشانی لاحق ہو تو اسے تسلی دو، اور اپنی عمارت کو اس کی عمارت سے اس طرح بلند نہ کرو کہ اس کے گھر کی ہوا بند ہو جائے، اور جب تمہارے گھر کوئی اچھا اور عمدہ کھانا پکے تو اس بات کی کوشش کرو کہ تمہاری ہانڈی کی مہک اس کے لیے اور اس کے بچوں کے لیے باعث اذیت و تکلیف نہ بنے، (اس کے لیے اس بات کا اہتمام کرو کہ ہانڈی کی مہک اور کھانے کی خوشبو اس کے گھر تک نہ جائے) مگر یہ کہ اس میں سے تھوڑا کچھ اس کے گھر بھی ضرور بھیج دو۔" (اس صورت میں کھانے کی خوشبو اس کے گھر تک پہنچے تو کوئی مضائقہ نہیں)۔

دیکھئے! اس حدیث پاک میں کتنی جامعیت کے ساتھ حضور ﷺ نے اپنے پڑوسی کے حقوق کی ادائیگی اور اس کے ساتھ حسن سلوک کا طریقہ بیان فرمایا۔

پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کے واقعات:

حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ "پڑوسی کا صرف یہی حق نہیں ہے کہ اسے تکلیف نہ دی جائے، بلکہ اس کا یہ بھی حق ہے کہ اس کی تکلیف کو برداشت کیا جائے۔" (احیاء: ۲/۲۱۳)

حضرات صحابہؓ وصلحاء کا یہی حال تھا، منقول ہے کہ حضرت کعب بن اُمامہؓ جب کسی کے پڑوس میں رہتے تو اس کی ضروریات کا خیال کرتے اور اس کے مصائب میں کام آتے، اور اگر اس کی کوئی چیز برباد ہو جاتی تو اس کا بدل عطا کرتے، اگر ان میں سے کوئی مرجاتا تو اس کے گھر والوں کو تسلی دیتے۔ (قصص العرب: ۱/۸۷)

حضرت ابوجہم عدویؒ کے پڑوس میں حضرت سعید بن العاصؓ رہتے تھے، جب ابو جہم کو گھر فروخت کرنے کی ضرورت پیش آئی تو انہوں نے گھر کی قیمت ایک لاکھ درہم لگائی، اور گھر کے علاوہ پڑوس کی بھی قیمت لگائی، خریدار نے تعجب سے پوچھا کہ کونسا پڑوسی؟ اور کیا کبھی کسی نے پڑوسی کی بھی قیمت لگائی ہے؟ گھر تو خریدا جا سکتا ہے، پڑوسی کو آج تک کسی نے خریدا ہے؟ فرمایا: میرے پڑوسی حضرت سعید بن العاصؓ ہیں، اگر آپ گھر کے ساتھ پڑوسی کی قیمت دینے کے لیے راضی نہیں ہیں تو مجھے اپنا بہترین پڑوسی والا گھر نہیں بیچنا ہے، میرے پڑوسی کا حال یہ ہے کہ اگر میں بیٹھا ہوتا ہوں تو وہ میرے بارے میں دریافت کرتے ہیں، جب مجھے کوئی خوشی میسر ہوتی ہے تو مبارک باد پیش کرتے ہیں، اگر میں کہیں باہر جاؤں تو وہ میرے گھر بار کی حفاظت کرتے ہیں، اگر میں کچھ مانگتا ہوں تو وہ میری ضرورت پوری کرتے ہیں، بلکہ کچھ نہ مانگوں تب بھی کچھ نہ کچھ عطا کرتے رہتے ہیں، اگر مجھ پر کوئی مصیبت آتی ہے تو اسے دور کرنے میں میری ہر ممکن مدد کرتے ہیں۔ (لہٰذا میں صرف مکان بیچ کر ایسا بہترین پڑوسی کھو دینا نہیں چاہتا)۔ (قصص العرب: ۱/۸۷، مستفاد از: مسنون معاشرت: ۲۴۷)

اسی طرح حضرت ابوحمزہ سُکَّریؒ کے متعلق منقول ہے کہ اسلام نے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی جو تعلیمات و ہدایات دی ہیں انہوں نے ان پر عمل کر کے اپنے پڑوسیوں اور محلّہ والوں کا دل جیت لیا تھا، یہی وجہ ہے کہ آپؒ بندان کے جس محلّہ میں رہتے تھے ایک طویل عرصہ رہنے کے بعد جب آپؒ نے مکان بیچ کر دوسری جگہ منتقل ہونے کا ارادہ کیا تو اس محلّہ والوں کا ایک وفد آپؒ کے پاس آیا اور آپؒ کی منت سماجت کرنے لگا کہ حضرت! آپ

ہمارا محلّہ نہ چھوڑیں، جب حضرت ابوحمزہؒ نے اپنا عذر بیان کیا تو تمام محلّہ والوں نے متفقہ طور پر یہ پیش کش کی کہ آپ کے مکان کی جو قیمت طے ہوئی ہے ہم سب مل کر وہ قیمت بطورِ ہدیہ آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں، آپ وہ قیمت لے لیں، مگر ہمیں اپنے پڑوس سے محروم نہ کریں، جب حضرتؒ نے محلّہ والوں کا یہ خلوص دیکھا تو اپنا ارادہ ملتوی فرما دیا۔

(مستفاد از: ذکر و فکر: ۲۵۵)

اسی بنا پر عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ پڑوسی کے اداءِ حقوق اور اس کے ساتھ حسن سلوک کا جو طریقہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، اگر ہر مسلمان اپنے پڑوسی کے ساتھ اسی کے مطابق برتاؤ کرے تو یقیناً اس سے سماج اور سوسائٹی میں اَمن وسکون اور عافیت ومحبت کا ماحول قائم ہوجائے، جس کی آج بہت ہی ضرورت ہے، اور اِتنا ہی نہیں؛ بلکہ ہمارا پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کا یہ برتاؤ اس کی ہدایت کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔

ایک واقعہ:

اس سلسلہ میں ایک واقعہ منقول ہے کہ حضرت بایزید بسطامیؒ کے پڑوس میں ایک غریب مجوسی رہتا تھا، ایک مرتبہ وہ کسی سفر میں گیا، رات میں اس کے گھر سے شیر خوار بچے کے رونے کی آواز آئی، تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ گھر کا مرد سفر میں ہے اور گھر میں روشنی کا انتظام نہیں ہے، اَندھیرے سے گھبرا کر بچہ رو رہا ہے، آپؒ نے فوراً گھر کا چراغ پڑوسی کے یہاں بھیج دیا، جس سے اہل خانہ خوش ہوگئے، یہ سلسلہ جاری رہا، غریب مجوسی جب سفر سے واپس لوٹا اور اسے حضرتؒ کے اس حسن سلوک کا پتہ چلا تو وہ اہل خانہ کے ساتھ حاضر ہوکر مشرف باسلام ہوگیا۔ (مستفاد از: رحمت دوعالم ﷺ اور اسلامی حقوق: ۴۹۴)

آج ضرورت ہے ان تعلیمات وہدایات پر عمل کرنے کی، تاکہ لوگوں کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کی محبت وعظمت بیٹھ جائے، اور سماج میں پھیلی ہوئی نفرت محبت سے اور خود غرضی ہمدردی سے بدل جائے، پھر یہ تو پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کا نقد نفع وثمرہ ہے،

دینی واُخروی ثمرات وفضائل تو مستقل ہیں۔

پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کے فضائل:

ایک حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: " خَیْرُ الْأَصْحَابِ عِنْدَ اللّٰہِ خَیْرُھُمْ لِصَاحِبِہٖ، وَ خَیْرُ الْجِیْرَانِ عِنْدَ اللّٰہِ خَیْرُھُمْ لِجَارِہٖ".

(رواہ الترمذی، مشکوٰۃ: ۴۲۴)

’’ساتھیوں میں بہترین ساتھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جو اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے لیے بہتر ہو، اور پڑوسیوں میں بہترین پڑوسی اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لیے بہترین ہو۔‘‘

اس حدیث پاک میں کسی بھی مسلمان کے بہترین ہونے کا معیار ساتھیوں اور پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کو قرار دیا گیا ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ جس شخص کا اپنے ساتھیوں اور پڑوسیوں کے ساتھ جس قدر اچھا سلوک ہوگا اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ اتنا ہی بہتر ہوگا۔

ایک دوسری حدیث میں وارد ہے:

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ أَبِیْ قُرَادٍؓ قَالَ: إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ تَوَضَّأَ ذَاتَ یَوْمٍ، فَجَعَلَ أَصْحَابُہٗ یَتَمَسَّحُوْنَ بِوَضُوْءِہٖ، فَقَالَ لَھُمُ النَّبِيُّ ﷺ: مَا یَحْمِلُکُمْ عَلٰی ھٰذَا؟ قَالُوْا: حُبُّ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: "مَنْ سَرَّہٗ أَنْ یُحِبَّ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ، أَوْ یُحِبَّہُ اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ، فَلْیَصْدُقْ حَدِیْثَہٗ إِذَا حَدَّثَ، وَ لْیُؤَدِّ أَمَانَتَہٗ إِذَا اُؤْتُمِنَ، وَ لْیُحْسِنْ جِوَارَ مَنْ جَاوَرَہٗ". (رواہ البیہقی فی شعب الإیمان، مشکوٰۃ: ۴۲۴)

’’ایک مرتبہ رحمت عالم ﷺ نے وضو فرمایا تو وہاں موجود حضرات صحابہؓ وضو کے بچے ہوئے پانی (یا اعضاءِ وضو سے ٹپکے ہوئے پانی) کو بطورِ برکت اپنے جسم پر ملنے لگے، تو

آپ ﷺ نے فرمایا: اس بات پر تمہیں کس چیز نے آمادہ کیا؟ صحابہؓ نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت نے، تب آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرے یا اس کے ساتھ اللہ اور اس کا رسول محبت کرے تو وہ (ان تبرکات کے پیچھے پڑنے کے بجائے اعمال کا اہتمام کرے، جن میں سے تین اعمال بطورِ خاص ہیں) (۱) ہمیشہ سچ بولے (۲) امانت میں کبھی خیانت نہ کرے (۳) اپنے پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔''

دیکھیے! اس حدیث پاک میں حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت حاصل کرنے بلکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا محبوب بننے کے لیے جو اعمال ارشاد فرمائے ان میں ایک عمل پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک بھی ہے۔

علاوہ ازیں ایک حدیث قدسی میں تو یہاں تک ارشاد ہے:

عَنْ أَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَمُوْتُ، فَيَشْهَدُ لَهٗ أَرْبَعَةٌ مِنْ أَهْلِ أَبْيَاتِ جِيْرَانِهٖ الْأَدْنِيْنَ: أَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ مِنْهُ إِلَّا خَيْرًا، إِلَّا قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالىٰ: قَدْ قَبِلْتُ قَوْلَكُمْ -أَوْ قَالَ شَهَادَتَكُمْ- وَ غَفَرْتُ لَهٗ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ".

(المستدرك على الصحيحين/ كتاب الجنائز) (حدیث قدسی نمبر: ۷)

''جو مسلمان اس حال میں انتقال کر جائے کہ اس کے پڑوس کے چار قریبی گھرانے والے (جو معتدل، منصف مزاج اور حق گو ہوں وہ) اس کے بارے میں نیکی اور بھلائی کی گواہی دیں کہ یہ مرنے والا ہمیشہ اچھے کام کرتا تھا (اور ہمارے ساتھ حسن سلوک کرتا تھا) تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے تمہارے قول یا گواہی کو قبول کیا اور اس کے وہ گناہ معاف کر دیے جو تم نہیں جانتے۔''

ظاہر ہے کہ جب انسان اپنے گھر کے قریبی پڑوسیوں سے اچھا سلوک کرے گا تب ہی تو وہ اس کا اچھائی سے تذکرہ کریں گے۔ علامہ ابن عبد البرؒ نے فرمایا کہ ''جس کے

پڑوسی، رشتہ دار اور دوست واحباب اس کے حسن سلوک کی گواہی دیں یہ اس کے کمالِ عقل و فضل کی علامت ہے۔'' اور اس حدیث پاک کے مطابق یہی چیز اس کے لیے عند اللہ مغفرت کا ذریعہ ہے، حدیث پاک میں بیان کردہ ان فضائل سے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی اہمیت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

وقتی پڑوسی کے ساتھ بھی حسن سلوک کیا جائے:

اس سے بھی آگے کی بات تو یہ ہے کہ کتاب وسنت میں جہاں مکان اور دوکان کے قریب اور دور کے دائمی پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید فرمائی گئی ہے وہیں قرآنِ کریم میں ﴿وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ﴾ (النساء: ۳۶) فرما کر وقتی اور عارضی پڑوسی کے ساتھ بھی حسن سلوک کا حکم دیا گیا، ہمارے علماء نے فرمایا ہے کہ ﴿الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ﴾ کے لفظی معنیٰ ہم پہلو ساتھی کے ہیں، اس میں وہ رفیق سفر بھی داخل ہے جو بس، گاڑی، ٹرین یا پلین وغیرہ میں ہمارے ساتھ بیٹھا ہو، نیز وہ شخص بھی داخل ہے جو کسی مجلس میں ہمارے پاس بیٹھا ہو، اور وہ شخص بھی داخل ہے جو کسی دوکان، دفتر یا کمپنی وغیرہ میں ہمارا شریک اور ہم پیشہ ہو، لہٰذا ﴿الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص تھوڑی دیر کے لیے بھی ہمارے ساتھ کسی سفر، مجلس، دفتر یا کمپنی وغیرہ میں ساتھ ہو تو یہ تھوڑی دیر کا ساتھی بھی وقتی اور عارضی پڑوسی ہے، اس کے ساتھ بھی حسن سلوک کیا جائے، جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ ہمارے کسی قول وعمل سے اُسے تکلیف نہ پہنچے، کوئی گفتگو ایسی نہ کریں جس سے اس کی دل آزاری ہو، اور کوئی کام بھی ایسا نہ کریں جس سے اسے اذیت ہو، مثلاً سگریٹ پھونک کر دھواں اس کے منہ کی طرف نہ چھوڑیں، یا پان کھا کر اس کی طرف پیک نہ ڈالیں، اسی طرح سیٹ اور کرسی وغیرہ پر اس طرح نہ بیٹھیں جس سے اس کی جگہ تنگ ہو جائے، وغیرہ۔

(مستفاد از: معارف القرآن: ۲/۴۱۳)

قرآنِ کریم کا کمال تو دیکھیے! ایک ہی لفظ ﴿الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ﴾ میں وقتی

پڑوسی کے ساتھ بھی حسن سلوک کا حکم دے کر ان تمام باتوں سے منع فرمادیا جو پڑوسی کے لیے کسی بھی اَذیت یا تکلیف کا سبب بنیں۔

پڑوسی کے ساتھ بدسلوکی کی مذمت:

پڑوسی سے متعلق کتاب وسنت کی اِن تمام ہدایات وتعلیمات کے باوجود اگر کوئی اس کے ساتھ حسن سلوک کے بجائے بدسلوکی کرتا ہے تو احادیث مبارکہ میں اس کے لیے بڑی سخت وعید بھی وارد ہوئی ہے، مذکورہ حدیث پاک میں پڑوسی کو اَذیت وتکلیف دینے والے کے متعلق سرکارِ دو عالم ﷺ نے تین مرتبہ قسم کھا کر اس کے ایمان کی نفی فرمائی ہے، حضرات محدثین نے فرمایا کہ اس حدیث میں اور اس جیسی دیگر احادیث میں ”لَا یُؤْمِنُ“ سے ایمان کی قطعی نفی مراد نہیں ہے، بلکہ کمالِ ایمان کی نفی مقصود ہے، اور اس طرح ناقص کو کالعدم قرار دے کر اس کی نفی کردینا تقریباً ہر زبان کا عام محاورہ ہے، مثلاً ہماری زبان میں بھی کسی برے اور غلط کار آدمی کے متعلق کہہ دیا جاتا ہے کہ ”اس میں تو انسانیت ہی نہیں ہے“ یا کہہ دیتے ہیں کہ ”وہ سرے سے آدمی ہی نہیں ہے“ حالانکہ مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ اچھا اور معقول آدمی نہیں ہے، تو اسی طرح احادیث طیبہ میں بھی ایمان کے نقص کو ”لَا إِیْمَانَ“ یا ”لَا یُؤْمِنُ“ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، تربیت ونصیحت کے لیے یہی طرزِ بیان مناسب اور بہتر بھی ہے۔ (معارف الحدیث: ۱/۱۳۹)

ایک حدیث میں پڑوسی کو تکلیف دینے والے کے متعلق ارشاد ہے:

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ لَا یَأْمَنُ جَارُهُ بَوَائِقَهُ". (رواه مسلم، مشكوٰة: ٤٢٢)

”پڑوسی کے ساتھ بدسلوکی کرنے والا، اسے اَذیت اور تکلیف دینے والا (اوّل مرحلہ میں یا عذاب سے پہلے یا معافی کے بغیر) جنت میں داخل نہیں ہوگا۔“

ان حقائق سے معلوم ہوا کہ پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کمالِ ایمان کی پہچان اور

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کا سبب ہے، جب کہ بدسلوکی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی ناراضی کا سبب ہے، کسی نے عجیب بات کہی ہے کہ آپ کا پڑوسی اگر فاسق یا کافر ہے تو اس کا حساب وہ خود دے گا، لیکن اگر وہ بھوکا سوگیا اس حال میں کہ آپ شکم سیر ہیں تو اس کا حساب آپ کو دینا ہوگا۔

حق تعالیٰ ہمیں پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے اداءِ حقوق کی توفیق عطا فرما کر ہمیں روزِ قیامت اپنے محبوب ﷺ کا پڑوس عطا فرمائیں۔ آمین۔

یوم عرفہ/ ۱۴۳۹ھ/ بروز: منگل
۲۱/ اگست/ ۲۰۱۸ء (بزمِ صدیقی، بڑودا)

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيْرًا — فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيْرًا كَثِيْرًا

(١٢)

اسلام میں مہمان نوازی کی اہمیت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ هُرَیۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنۡ كَانَ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ فَلۡيُكۡرِمۡ ضَيۡفَهٗ، وَ مَنۡ كَانَ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ فَلَا يُؤۡذِ جَارَهٗ، وَ مَنۡ كَانَ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ فَلۡيَقُلۡ خَيۡرًا أَوۡ لِيَصۡمُتۡ". (وَ فِیۡ رِوَايَةٍ بَدَلَ الۡجَارِ: وَ مَنۡ كَانَ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ فَلۡيَصِلۡ رَحِمَهٗ".)

(متفق عليه، مشكوٰة: ٣٦٨، باب الضيافة)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رحمتِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جو شخص اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے اپنے مہمان کا اکرام کرنا چاہیے، اور جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے پڑوسی کو (کسی طرح کی ادنیٰ) تکلیف (بھی جان بوجھ کر بلا شرعی وجہ کے ہرگز) نہ دے اور جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ یا تو بھلی بات کہے یا پھر خاموش رہے، اور ایک روایت میں لفظ "جار" کے بجائے "فَلۡيَصِلۡ رَحِمَهٗ" کے الفاظ وارد ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ اپنے رشتہ داروں کے

ساتھ صلہ رحمی کا معاملہ کرے۔ (یعنی مہمان اور پڑوسی کا اکرام، زبان کا صحیح استعمال اور صلہ رحمی کا اہتمام، ان چار اعمال کے بغیر کوئی بھی مؤمن کامل ایمان والا نہیں ہوسکتا، ہر مسلمان کو یہ افعال انجام دینے ہی چاہیے)۔

دُنیا میں ہر انسان اللہ تعالیٰ کا مہمان ہے:

اللہ رب العزت نے اس دُنیا کو اپنے بندوں کے لیے عارضی طور پر مہمان خانہ بنا دیا، دُنیا میں آنے والا ہر انسان اللہ تعالیٰ کا مہمان ہے، اور مہمان اسے کہتے ہیں جو کچھ عرصہ کے لیے کسی کے یہاں آکر ٹھہرے، چنانچہ کچھ ہی عرصے کے لیے یہاں قیام ہے، جس میں حق تعالیٰ نے اس مہمان خانے میں سبھی مہمانوں کی ضیافت اور ضروریات کا مکمل انتظام فرما دیا ہے، قرآنِ کریم نے اسے یوں بیان فرمایا:

﴿وَ مَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزۡقُهَا وَ يَعۡلَمُ مُسۡتَقَرَّهَا وَ مُسۡتَوۡدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِیۡ كِتٰبٍ مُّبِيۡنٍ﴾ (هود: ٦)

"روئے زمین پر چلنے والا کوئی جاندار (خواہ وہ انسان ہو یا کوئی اور مخلوق) ایسا نہیں جس کا رزق اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ نہ لے رکھا ہو، وہ اس کے مستقل ٹھکانے کو بھی جانتا ہے اور عارضی ٹھکانے کو بھی، ہر بات ایک واضح کتاب میں درج ہے۔"

رحمِ مادر سے مقامِ موت تک کونسی مخلوق کہاں ہے؟ اسے ہر ایک کا علم ہے، اور وہ اپنے علم کے مطابق اپنی ہر مخلوق کو اس کا مقرر کیا ہوا رزق پہنچاتا ہے۔

دوسرے ایک مقام پر ارشاد ہے:

﴿وَ كَاَيِّنۡ مِّنۡ دَآبَّةٍ لَّا تَحۡمِلُ رِزۡقَهَا ۖ اَللّٰهُ يَرۡزُقُهَا وَ اِيَّاكُمۡ ۖ وَ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ﴾ (العنكبوت: ٦٠)

"اور کتنے ہی جانور ایسے ہیں جو اپنا رزق اپنے ساتھ اُٹھائے نہیں پھرتے (بلکہ وہ جہاں کہیں جاتے ہیں وہیں اللہ تعالیٰ ان کے مقدر کے رزق کا انتظام فرما دیتے ہیں) اللہ

تعالیٰ انہیں اور تمہیں بھی رزق دیتا ہے، اور وہی ہے جو ہر بات سنتا ہر بات جانتا ہے۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ۝ ﴾ (الذریات:۵۸)

''بلاشبہ اللہ ہی رَزاق ہے مستحکم قوت والا۔''

علماء نے فرمایا کہ رزق کی دو قسمیں ہیں: ایک رزقِ حقیقی، جس پر ضروریاتِ زندگی کا دارو مدار ہوتا ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ دوسری قسم رزقِ مجازی، اس کے لیے انسانوں کو اَسبابِ عادیہ کا پابند فرمایا ہے۔

الغرض یہ مقدر کا رزق کیا ہے؟ دراصل اللہ رب العزت کی مہربانی اور میزبانی ہی تو ہے، اللہ رب العزت خود ہی اپنے بندوں کی میزبانی ومہمانی فرماتے ہیں اور بندوں سے بھی اس عمل کو پسند فرماتے ہیں۔

مہمان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم:

یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کو جن لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ان میں مہمان بھی شامل ہیں، چنانچہ ارشادِ باری ہے:

﴿ وَ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَّ بِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ الْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (النساء : ۳۶)

اس آیت کریمہ میں حق تعالیٰ نے اپنی عبادت کے علاوہ والدین، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، دائمی اور عارضی پڑوسیوں، مسافروں، مہمانوں اور ماتحتوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم فرمایا۔

اس آیت کریمہ میں ''ابن السبیل'' سے مراد مسافر بھی ہے اور مہمان بھی، صاحب

معالم التنزیل فرماتے ہیں کہ ''اکثر حضرات نے اس کو مہمان پر محمول کیا ہے۔''

(معالم التنزیل:۱/۴۳۵، مستفاد از: انوار البیان:۱/۶۰۹)

حقیقت یہ ہے کہ مسافر کے عموم میں مہمان بھی آ ہی جاتا ہے، کیوں کہ عموماً مہمان مسافر ہی ہوتا ہے، لیکن اگر مہمان مسافر نہ ہو تب بھی اس کے ساتھ حسن سلوک کا حکم ہے، حتیٰ کہ حضور ﷺ کا تو یہ حال تھا کہ آپ کے یہاں مشرکین واعداءِ دین بھی مہمان ہوتے تھے تو آپ ﷺ ان کی مہمان نوازی اور میزبانی میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتے تھے، آپ ﷺ اہل ایمان کو بھی مہمان کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید فرماتے تھے۔

حدیث مذکورہ میں آپ ﷺ نے جن چار اعمال کی تاکید فرمائی ہے ان میں مہمان کا اکرام اور اس کے ساتھ حسن سلوک بھی ہے، فرمایا:

''مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهٗ''.

''جو شخص بھی اللہ تعالیٰ اور روزِ جزاء پر ایمان رکھتا ہو اسے مہمان کا اکرام ضرور کرنا چاہیے۔''

اس میں مہمان کے ساتھ حسن سلوک کی ترغیب دینے کے لیے ایسا پیارا انداز اختیار فرمایا جیسا کہ ایک باپ اپنے بیٹے کو کسی خاص اور نہایت اہم کام کی ترغیب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ ''اگر تو میرا بیٹا ہے تو یہ کام ضرور کر۔'' اسی طرح یہاں آپ ﷺ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ اگر تم واقعی مؤمن ہو تو تمہیں اپنے مہمانوں کا اکرام، پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک، بھلی بات یا خاموشی اور رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی وغیرہ اعمال تو انجام دینے ہی چاہیے، ان اعمال کے بغیر کوئی بھی مؤمن کامل الایمان نہیں ہوسکتا۔

مہمان کا استقبال:

جہاں تک مہمان کے اکرام اور اس کے ساتھ حسن سلوک کی بات ہے تو اس کے متعلق علماءِ امت نے کتاب وسنت کی روشنی میں مستقل احکام بیان کیے ہیں، منجملہ ان کے ایک حکم یہ ہے کہ آنے والے مہمان کا اپنی حیثیت کے مطابق استقبال کرے، اور عاجز کے

خیالِ ناقص میں مہمان کے استقبال کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ ملاقات کے وقت فرحت و مسرت اور بشاشت کا اظہار کیا جائے۔ بقولِ شاعر:

اے بادِ صبا! ہشیار ذرا، مہمان جو آنے والے ہیں
کلیاں نہ بچھا نا راہوں میں، ہم پلکیں بچھانے والے ہیں

کہا جاتا ہے کہ مہمان کے سامنے اظہارِ فرحت و بشاشت ضیافت سے بھی بہتر ہے۔ امام اوزاعیؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ مہمان کے ساتھ حسن سلوک اور اس کا اکرام کیا ہے؟ تو فرمایا کہ ''خندہ روئی اور خوش گفتاری۔'' یعنی مہمان کا استقبال خوشی خوشی کیا جائے اور اس کے ساتھ اچھی طرح بات چیت کی جائے۔

اس کی اہمیت کا اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ عشاء کے بعد بلا ضرورت گفتگو کی حدیث پاک میں ممانعت فرمائی گئی ہے:

" وَ كَانَ يَكْرَهُ النَّوْمَ قَبْلَهَا وَ الحَدِيْثَ بَعْدَهَا". (رواه البخاری، مشکوٰة:٦٠)

''آپ ﷺ عشاء سے پہلے سونا اور عشاء کے بعد گفتگو کرنا پسند نہیں فرماتے تھے۔''

البتہ اگر نیند کا غلبہ ہو اور عشاء کی نماز ضائع ہونے کا خطرہ نہ ہو تو عشاء سے پہلے سونے کی اجازت ہے، اور عشاء کے بعد دینی و علمی گفتگو کی بھی اجازت ہے۔
(مظاہر حق:۱/۵۵۲)

علامہ شامیؒ نے اس کی استثنائی صورتوں میں مہمان کے ساتھ گفتگو اور بات چیت کو بھی شامل فرمایا ہے۔ (رسالہ ریاض الجنۃ/صفحہ:۹/اپریل/۲۰۱۱ء)

البتہ گفتگو میں مہمان کے مزاج و مذاق کی رعایت ضرور کرے، مہمان کے دل کو ٹھیس پہنچانے والی اور اس کی طبیعت کو مکدر کر دینے والی باتوں سے اجتناب کرے، نیز مہمان کے سامنے کسی پر غصہ نہ کرے، علاوہ ازیں جہاں تک ہو سکے اپنی پریشانی کا اظہار نہ کرے۔

مہمان نوازی بلا تاخیر اور بذاتِ خود کرے:

مہمان کے اکرام اور اس کے ساتھ حسن سلوک کے متعلق دوسرا حکم یہ ہے کہ مہمان نوازی بلا تاخیر اور بذاتِ خود کرے، اگر مہمان از خود بلا اطلاع تشریف لائیں تو بلا تکلف کھانے کے بارے میں دریافت کر لے اور ما حضر پیش کر دے، لیکن اگر مہمان کی اطلاع پہلے سے ہو یا خود دعوت دے کر انہیں بلایا ہو تو پر تکلف کھانے کا اہتمام کرنا چاہیے، اگر چند مہمانوں میں سے کچھ آئے ہوں اور کچھ نہ آئے ہوں تو موجودہ لوگوں کو ان کے انتظار کی زحمت نہ دی جائے، چنانچہ ابو الضیفان (مہمان والے) حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کا واقعہ قرآن نے بیان فرمایا کہ ان کے یہاں جب چند فرشتے انسانی شکل میں پہنچے تو دعا و سلام کے بعد تھوڑی ہی دیر میں ان کے سامنے بچھڑے کا گوشت تیار کر کے پیش کر دیا:

﴿ وَ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ إِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ أَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍo﴾ (هود : ٦٩)

ایک حدیث قدسی میں وارد ہے:

كَانَ إِبْرَاهِيْمُ خَلِيْلُ الرَّحْمٰنِ أَوَّلَ النَّاسِ ضَيَّفَ الضَّيْفَ، وَ أَوَّلَ النَّاسِ اخْتَتَنَ، وَ أَوَّلَ النَّاسِ قَصَّ شَارِبَهٗ، وَ أَوَّلَ النَّاسِ رَأَى الشَّيْبَ، فَقَالَ: يَا رَبِّ! مَا هٰذَا؟ قَالَ الرَّبُّ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى: وَقَارٌ يَا إِبْرَاهِيْمُ، قَالَ: رَبِّ زِدْنِيْ وَقَارًا."
(رواه مالك، مشكوٰة:٣٨٥/ باب الترجل) (حدیث قدسی نمبر:۸)

''حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام پہلے وہ انسان تھے جنہوں نے مہمان نوازی فرمائی، آپ ہی وہ پہلے انسان تھے جنہوں نے ختنہ کیا، آپ ہی وہ پہلے انسان تھے جنہوں نے مونچھیں کاٹیں اور آپ ہی کو سب سے پہلے بڑھاپا آیا، تو آپ نے اس کے متعلق حق تعالیٰ سے دریافت کیا، تو ارشاد ہوا کہ اے ابراہیم! یہ بڑھاپا وقار کی علامت ہے، اس پر آپ نے درخواست کی کہ اے اللہ! میرے وقار کو اور بڑھا دے۔''

بہرحال حضرت خلیل علیہ السلام نے بلا تاخیر مہمانوں کے سامنے کھانا پیش فرمادیا، بعد میں پتہ چلا کہ آنے والے مہمان انسان کی شکل میں فرشتے ہیں، جو نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں، اس سے علماء نے ایک ادب تو یہ بیان فرمایا کہ مہمان نوازی میں بلاوجہ تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔

حضرت امام غزالیؒ نے حاتم اصم کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ یوں تو دنیوی امور میں جلد بازی ناپسندیدہ ہے، کیوں کہ جلد بازی شیطان کا کام ہے، مگر پانچ مواقع ایسے ہیں جن میں جلدی کرنا مسنون ہے: (۱) مہمان نوازی میں (۲) میت کی تجہیز و تکفین میں (۳) بالغ ہونے کے بعد (یا مناسب رشتہ مل جانے کے بعد) نکاح کرنے میں (۴) قرض کی ادائیگی میں (۵) گناہ کے بعد توبہ کرنے میں۔

دوسرا ادب علماء نے یہ بیان فرمایا کہ میزبان خادم کے بجائے بذاتِ خود مہمان کی خدمت کرے، یہ سنت بھی ہے، چنانچہ احیاء العلوم میں حضرت ابوقتادہؓ کی ایک روایت ہے کہ شاہِ حبشہ نجاشی کا وفد جب حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے بہ نفسِ نفیس وفد کے اراکین کی خدمت فرمائی، صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ زحمت نہ فرمائیں، ہم ان کی خدمت کے لیے کافی ہیں، تو فرمایا کہ نہیں، کیوں کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے میرے اصحاب کی تعظیم و تکریم کی تھی جب وہ ہجرت کر کے حبشہ گئے تھے، میں ان کی مہمان نوازی اور ضیافت کا بدلہ خود خدمت کر کے ادا کرنا چاہتا ہوں۔ معلوم ہوا کہ اپنے مہمان کی بذاتِ خود خدمت کرنا بھی سنت ہے۔

حضرت امام شافعیؒ جو حضرت امام مالکؒ کے شاگرد ہیں، آپؒ جب پہلی مرتبہ اپنے اُستاذِ محترم امام مالکؒ کے یہاں تشریف لے گئے تو اُستاذِ محترم نے اپنے شاگرد کے خود ہاتھ دُھلائے اور فرمایا: تم میرے اس طرزِ عمل سے گھبراؤ نہیں، اس لیے کہ مہمان کی خدمت فرض ہے۔ (اور یہ خدمت خود انجام دینا سنت ہے)۔ (المستطرف: ۱۸۴)

بہرکیف خدمت خود کرے یا خادم سے کروائے، اس کی رعایت ضرور کرے کہ اگر

مختلف انواع کے کھانے ہوں اور دسترخوان پر گنجائش بھی ہو تو کھانے کی تمام انواع کو ایک ساتھ رکھ دیا جائے، ورنہ ترتیب کو ملحوظ رکھا جائے، کہتے ہیں کہ طبی اعتبار سے پھل کو پہلے پیش کرنا بہتر ہے، کیوں کہ پھل زود ہضم ہوتا ہے، اور ایسی غذا کا معدہ میں پہلے پہنچانا زیادہ مناسب ہوتا ہے، نیز مہمان کو بلاتکلف انواعِ طعام بتادے، تاکہ سب کے لیے گنجائش رہے، یا حسبِ خواہش کھالے۔

اسی کے ساتھ میزبان کے لیے یہ بھی مستحب ہے کہ مہمان سے کھانے کی درخواست کرے، البتہ تکلیف دہ حد تک اِصرار نہ کرے، کیوں کہ کھانے کا تعلق رغبت سے ہے، ترغیب سے نہیں۔

علاوہ ازیں میزبان اور مہمان ساتھ کھاتے ہوں تو بہتر یہ ہے کہ میزبان مہمان سے پہلے ہاتھ نہ روکے، یہ چیز مہمان کے لیے تکلف یا تکلیف کا سبب ہے اور اکرام کے خلاف ہے۔

مہمان کے قیام کا انتظام کرنا:

مہمان کے اکرام اور اس کے ساتھ حسن سلوک سے متعلق تیسرا حکم یہ ہے کہ اگر مہمان کا ارادہ قیام کا ہو تو اس کے لیے بخوشی ایسی مناسب جگہ کا انتخاب کرے جس میں ضروریات مثلاً بیت الخلاء اور غسل خانہ کا بھی انتظام ہو، اسے قبلہ کی سمت اور باہر آنے جانے کا راستہ بھی بتادے، تاکہ بوقتِ ضرورت دقت پیش نہ آئے، نیز اگر مہمان کے پاس اپنی سواری ہو تو اسے بھی کسی محفوظ جگہ رکھنے کا بندوبست کرے، قیام کے دوران مہمان کے اکرام میں کوئی کسر نہ چھوڑے۔

صاحبو! جو لوگ مہمان کی آمد کو باعث برکت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سمجھتے ہیں ان کے لیے بھوکے پیاسے رہ کر اور تکلیف اُٹھا کر بھی مہمان کے لیے طعام و قیام کا انتظام کرنا آسان ہو جاتا ہے، جیسا کہ صحابہؓ اور صلحاء کا حال تھا، اور اہل ایمان کو بھی اس کی ترغیب دی گئی ہے۔

مہمان ومیزبان کے شرعی احکام:

حدیث پاک میں حضرت ابوشریح کعبیؓ سے مروی ہے کہ ''جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے تو مہمان کا اکرام کرنا ہی چاہیے، اور مہمان کے اکرام میں تکلف واعزاز کا زمانہ تو ایک دِن ایک رات ہے، جب کہ مہمانی کا زمانہ تین دِن تین رات ہے، اس کے بعد میزبان کی جانب سے صدقہ ہے، اور مہمان کے لیے جائز نہیں کہ میزبان کے یہاں اتنا قیام کرے جو اس کے لیے تنگی کا باعث بن جائے۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ: ٣٦٨)

علماء نے فرمایا کہ میزبان کے ذمہ مہمان کی ایک روز کی مہمانی تو واجب ہے، جس میں قدرے تکلف سے کام لیا جائے، البتہ دوسرے اور تیسرے دن کی مہمانی مستحب ہے، جس میں ماحضر پیش کر دیا جائے۔ (مظاہر حق جدید: ٤/ ١٢٩)

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ میزبان کے یہاں تین دن سے زیادہ مہمان کو قیام نہ کرنا چاہیے، خواہ وہ سسرال ہو یا میکہ، بالخصوص اُن علاقوں میں جہاں مہمان کو ایک دو دن قیام کرانا بھی قدرت سے باہر ہو، ہاں، البتہ اگر خود میزبان کی طرف سے اصرار ہو اور مہمان کو بھی یقین ہو کہ ہمارا قیام میزبان پر گراں نہیں گزرے گا تو پھر کوئی حرج نہیں۔

مہمان کو اِکرام کے ساتھ رُخصت کرنا:

مہمان کے اکرام اور حسن سلوک کا آخری اور چوتھا حکم یہ ہے کہ جب مہمان واپس ہونے لگیں تو اِکرام کے ساتھ انہیں رُخصت کیا جائے، جس میں ایک تو یہ ہے کہ مہمان کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا جائے، اگر مہمان کی جانب سے کوئی ناگوار بات پیش آئی ہو تو اس کا اظہار مہمان کے سامنے بھی اور اس کے جانے بعد بھی نہ کرے، (البتہ بعد میں اگر مناسب ہو تو نصیحت اور خیر خواہی کے انداز میں متوجہ کیا جا سکتا ہے)۔

مہمان نوازی میں اگر دانستہ یا نادانستہ کوئی کمی یا کوتاہی ہو جائے تو کھلے طور پر

معذرت پیش کر کے عفو و درگذر کی درخواست کرے، اخیر میں جب مہمان جانے لگیں تو مہمان کو گھر کے دروازے تک جا کر رُخصت کرے۔ ابن ماجہ کی ایک مرفوع روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مہمان کی مشایعت (مہمان کو رُخصت کرنے کے لیے جانا) سنت ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مِنَ السُّنَّةِ أَنْ يَخْرُجَ الرَّجُلُ مَعَ ضَيْفِهٖ إِلٰى بَابِ الدَّارِ". (رواه ابن ماجه، مشكوٰة: ٣٧٠)

ان آداب واحکام سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام میں مہمان نوازی کی کس قدر اہمیت ہے، اس سلسلہ میں اسلامی ہدایات وتعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ مہمان کی آمد باعث برکت اور سبب رحمت ہے، جیسا کہ ابن ماجہ کی حدیث ہے۔ (مشکوٰۃ: ٣٧٠)۔

قرآنِ کریم میں مہمان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم ہے، اس لیے مہمان کا اکرام اور اس کی خدمت بھی عبادت اور رضاءِ الٰہی کا سبب ہے۔

بقولِ شاعر

شکر اللہ کا کر، غمگین نہ ہو مہمان سے
کہ رزق اپنا کھا رہا ہے تیرے دسترخوان سے

حق تعالیٰ ہمیں ان تمام باتوں پر توفیق عمل سے نوازیں اور اس دنیا کے عارضی مہمان خانہ میں ہمیں اپنی دائمی رضا سے نوازیں۔ آمین یارب العالمین۔

١٧/محرم الحرام/١٤٤٠ھ/ بروز: جمعہ قبل المغرب
مطابق: ٢٨/ دسمبر/ ٢٠١٨ء (بزم صدیقی، بڑودا)

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيْرًا   فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيْرًا كَثِيْرًا

(۱۳)
ٹریفک کے اسلامی اصول اور راستے کے حقوق

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

عَنْ أَبِي سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: "إِيَّاكُمْ وَ الْجُلُوْسَ بِالطُّرُقَاتِ، فَقَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَا لَنَا مِنْ مَجَالِسِنَا بُدٌّ نَتَحَدَّثُ فِيْهَا، قَالَ: فَإِذَا أَبَيْتُمْ إِلَّا الْمَجْلِسَ، فَأَعْطُوا الطَّرِيْقَ حَقَّهٗ، قَالُوْا: وَ مَا حَقُّ الطَّرِيْقِ؟ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ: غَضُّ الْبَصَرِ، وَ كَفُّ الْأَذىٰ، وَ رَدُّ السَّلَامِ، وَ الْأَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ، وَ النَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ". (متفق عليه، مشكوٰة: ۳۹۸/ باب السلام)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”تم اپنے آپ کو راستے میں بیٹھنے سے بچاؤ، بعض صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! راستوں میں بیٹھنا ہماری ضرورت اور مجبوری ہو تو کیا حکم ہے؟ کیوں کہ وہیں ہماری ضروری باتیں ہوا کرتی ہیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: پھر تم راستے کا حق ادا کرو، صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! راستے کا حق کیا ہے؟ فرمایا: نگاہ کا جھکانا، (تاکہ کوئی تکلیف دہ چیز تمہیں نظر آئے تو

تم ہٹا سکو، یا غیر محرم سے اپنی نگاہ بچا سکو) اور گزرنے والوں کو تکلیف سے بچانا، سلام کا جواب دینا، (یہاں سلام کے جواب کا ذکر اس لیے ہے کہ سلام کرنا گزرنے والے کے لیے مسنون ہے) اور لوگوں کو بھلی بات بتانا اور بری بات سے روکنا۔“ (یہ راستے کے حقوق ہیں)۔

ٹریفک کے قواعد کی خلاف ورزی نقصان دہ ہے:

اللہ رب العزت نے اپنی اس وسیع و عریض کائنات میں ایک جگہ سے دوسری جگہ مختلف مقاصد کے تحت جانے کے لیے فضاؤں، جنگلوں اور زمینوں میں چھوٹے بڑے، تنگ اور کشادہ راستے بنائے ہیں۔

﴿الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا وَّ سَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا﴾ (طٰہٰ: ۵۳)

جن راستوں پر چل کر ایک جگہ سے دوسری جگہ بآسانی پہنچا جا سکتا ہے، جیسا کہ ہم اور آپ آئے دن زمینی راستوں پر اس کا مشاہدہ کرتے ہیں، پھر راستہ اگر اونچ نیچ سے محفوظ، صاف ستھرا اور کشادہ ہو، نیز اس پر ٹریفک کے مفید قواعد کے مطابق چلا جائے تو عموماً دور کی منزل بھی قریب ہو جاتی ہے اور فاصلے گھٹ جاتے ہیں، اس کے برخلاف راستہ کتنا ہی صاف ستھرا اور کشادہ کیوں نہ ہو، مگر اس پر چلنے کے قواعد نہ ہوں یا اس راستہ پر چلنے والے ٹریفک کے مفید قواعد کی خلاف ورزی کریں تو پھر قریب کی منزل بھی دور ہو جاتی ہے اور جو فاصلہ منٹوں میں طے ہونا تھا اس کے لیے گھنٹے لگ جاتے ہیں، نیز یہ بات راستہ چلنے والوں کے لیے یا سوار اور سواری کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے، چنانچہ آج کل روزانہ جو سڑک حادثات پیش آتے ہیں، جن میں جانی و مالی نقصان ہوتا ہے عموماً وہ تمام ٹریفک کے قواعد کی خلاف ورزی کے سبب پیش آتے ہیں، اور عاجز کے خیالِ ناقص میں ٹریفک کے قواعد کی خلاف ورزی کی ایک وجہ تو سرکاری نظام کا ڈھیلا پن ہے، لیکن دوسری بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ عموماً لوگ ٹریفک کے قواعد کی شرعی اہمیت سے ناواقف ہیں، اسی لیے اس کی خلاف ورزی محض ملکی و سرکاری گناہ سمجھتے ہیں؛ حالانکہ یہ دینی اور شرعی اعتبار سے بھی ممنوع ہے اور کئی

گناہوں کا مجموعہ ہے۔

ٹریفک کے قواعد کی خلاف ورزی شرعاً بھی گناہ ہے:

حکومت نے ٹریفک کے جو اصول وقواعد مقرر کیے ہیں کہ گاڑی دائیں یا بائیں کونسی جانب چلائی جائے اور کونسی جانب نہ چلائی جائے؟ اسی طرح کس راستے پر کس رفتار سے گاڑی چلائی جائے؟ نیز گاڑی کس مقام پر ٹھہرائی جائے؟ اور کس مقام پر نہ ٹھہرائی جائے؟ یہ سب انتظامی نوعیت کے وہ قوانین ہیں جن کا مقصد ہماری جان اور سواری کی حفاظت ہے، اور ظاہر ہے کہ جان و مال کی حفاظت ایک شرعی فریضہ ہے، لہٰذا حکومت حفاظتی نقطۂ نظر سے جو قوانین بنائے (بشرطیکہ وہ خلافِ شرع نہ ہوں) شرعاً ان کی پابندی ضروری ہے اور خلاف ورزی کرنا گناہ ہے، اس لیے کہ حکومت کے بنائے ہوئے قانون کی حیثیت حکم حاکم کی ہے، اور قرآنِ کریم میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ﴾ (النساء:٥٩)

اہل ایمان کو رب العالمین نے اپنی اور اپنے رسول ﷺ کی اطاعت کے ساتھ اصحابِ اختیار (مراد حکام) کی اطاعت کا بھی حکم فرمایا۔

حضرت شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہٗ کے بقول اس اطاعت سے مراد یہی ہے کہ حکام عمومی مصلحتوں کی بنیاد پر جو قواعد مقرر کریں (بشرطیکہ وہ شریعت کے خلاف نہ ہوں) ان کی پابندی کی جائے گی، ایسے قواعد کی پابندی بھی شرعاً ضروری ہے۔ (ذکر و فکر:١٨٦)

الغرض حکومت نے ٹریفک کے جو اصول وقواعد مقرر کیے ہیں وہ بھی اسی نوعیت کے ہیں (جن کو اصولِ فقہ کی اصطلاح میں ''مصالح مرسلہ'' کہا جاتا ہے) اس لیے حکم حاکم کی وجہ سے ملک کے تمام باشندوں پر ان کی پابندی شرعی نقطۂ نظر سے ضروری ہوگی، اور ان کی خلاف ورزی میں حکم حاکم کی نافرمانی اور قانون شکنی کا گناہ پایا جائے گا۔

ٹریفک کے قواعد کی خلاف ورزی وعدہ خلافی بھی ہے:

اس کے علاوہ حکومت کی جانب سے بنائے ہوئے ٹریفک کے مفید قواعد کی خلاف ورزی کرنے میں وعدہ خلافی کا گناہ بھی پایا جاتا ہے، وہ اس طرح کہ جب کوئی شخص سڑک پر گاڑی چلانے کا لائسنس لیتا ہے تو وہ متعلق حاکم اور افسر سے فارم پر دستخط کرکے گویا تحریری اور زبانی بلکہ عملی طور پر بھی وعدہ کرتا ہے کہ وہ سڑک پر گاڑی چلاتے وقت تمام مقررہ قواعد کی پابندی کرے گا، اگر لائسنس کی درخواست دیتے وقت ہی وہ متعلق حکام کو یہ بتادے کہ وہ ٹریفک کے اصول وقواعد کی رعایت نہیں رکھ سکے گا، تو ظاہر ہے کہ اُسے کبھی بھی لائسنس نہیں مل سکتا، جس کسی کو بھی لائسنس دیا جاتا ہے وہ اسی وعدہ کی بنیاد پر دیا جاتا ہے، چنانچہ اس کے بعد اگر کوئی شخص ٹریفک کے قواعد کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس میں وعدہ خلافی کا گناہ بھی ہوگا۔

قرآنِ کریم نے اہل ایمان کو ہر طرح کا مباح عہد و پیمان پورا کرنے کا حکم فرمایا ہے:

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ﴾ (المائدة : ١)

یاد رکھو! مؤمن ہر اس وعدہ کا پابند ہوتا ہے جو خلافِ شرع نہ ہو، خواہ وہ وعدہ کسی سے بھی کیا ہو، وعدہ کو پورا کرنا ایمانی تقاضا ہے، اور وعدہ خلافی کرنا گناہِ کبیرہ ہے، وعدوں کے متعلق بھی قیامت میں سوال کیا جائے گا، جیسا کہ قرآنِ کریم میں ارشاد ہوا:

﴿ وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ﴾ (بنی إسرائیل : ٣٤)

''عہد و پیمان کو مکمل طور پر نبھاؤ، بلاشبہ عہد و پیمان کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔''

الغرض ٹریفک کے مفید قواعد کی خلاف ورزی سے قبل اس بات کو نہ بھولیں کہ اس میں نقضِ عہد کا گناہ بھی پایا جاتا ہے۔

ٹریفک کے قواعد کی خلاف ورزی میں ایذا رسانی کا گناہ بھی ہے:

حقیقت یہ ہے کہ حکومت کی جانب سے ٹریفک کے بنائے ہوئے قواعد کی خلاف

ورزی کرنے میں کسی نہ کسی کا نقصان ضرور ہوتا ہے، اور بسا اوقات تو اسی بنا پر حادثات پیش آتے ہیں، جن میں کبھی کبھی کسی بے گناہ کی جان تک چلی جاتی ہے، یا پھر کوئی اور جسمانی نقصان پہنچتا ہے، یا کم از کم ذہنی اَذیت تو ضرور ہوتی ہے، اور قرآنِ پاک کے حکم کے مطابق کسی کو بلا وجہ جان بوجھ کر نقصان پہنچانا بالخصوص کسی مسلمان کو یہ بہت بڑا جرم ہے، ارشادِ باری ہے:

﴿ وَ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّ إِثْمًا مُّبِيْنًا ﴾ (الأحزاب : ۵۸)

"اور جو لوگ مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کو بغیر گناہ کیے ایذاء پہنچاتے ہیں وہ لوگ بہتان اور صریح گناہ کا بار اُٹھاتے ہیں۔"

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ "مذکورہ آیت: ﴿وَ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّ إِثْمًا مُّبِيْنًا﴾ سے کسی مسلمان کو بغیر وجہ شرعی کے کسی قسم کی ایذاء اور دُکھ پہنچانے کی حرمت ثابت ہوئی، اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَ يَدِهٖ......الخ" (متفق عليه، مشكوٰة : ۱۲) **(معارف القرآن: ۷/۲۲۹)**

ایک سچے، پکے اور کامل الایمان مسلمان کی پہچان یہ ہے کہ اس کی زبان اور ہاتھ سے کسی دوسرے مسلمان کو کسی طرح کا کوئی ادنیٰ نقصان بھی جان بوجھ کر نہ پہنچنا چاہیے، یہاں مسلمانوں کی تخصیص اس لیے ہے کہ اسلامی معاشرہ میں ایک مسلمان کا واسطہ اکثر مسلمان ہی کے ساتھ پڑتا ہے، اس لیے خصوصیت کے ساتھ مسلمان کا ذکر کیا گیا، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غیر مسلم کو ایذاء پہنچانا جائز ہے۔

یا پھر یہ خصوصی حکم ابتداءً تھا، بعد میں عمومی حکم تمام لوگوں کے لیے نازل ہوا، جس میں "مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ" کے بجائے "مَنْ سَلِمَ النَّاسُ" (رواه ابن حبان، مرقاة: ۱/۷۲)

کا ذکر ہے۔

الغرض یہ صحیح ہے کہ ہم اپنے عمل سے ہر کسی کو تو خوش نہیں کر سکتے؛ لیکن ہر کسی کو اپنی ذات سے پہنچنے والے نقصان سے تو بالیقین بچا سکتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ شرعاً کسی بھی انسان خصوصاً مسلمان کو بلا وجہِ شرعی جان بوجھ کر جانی، مالی اور ذہنی نقصان پہنچانا حرام ہے، اور ٹریفک کے قواعد کی خلاف ورزی کرنے میں ایذاء رسانی یعنی دوسروں کو نقصان پہنچانے کا گناہ بھی پایا جاتا ہے۔

ٹریفک کے قواعد کی خلاف ورزی میں حق تلفی کا گناہ بھی ہے:

اگر ٹریفک کے قواعد کی خلاف ورزی میں کسی کو بظاہر کوئی نقصان نہ پہنچے تب بھی اس میں حق تلفی یعنی ایک مشترکہ سڑک کے ناجائز استعمال کرنے کا گناہ تو ضرور پایا جاتا ہے، اور ہمارے یہاں اسلامی فقہ کی ہر کتاب میں یہ اصول لکھا ہے کہ جو راستہ پرائیویٹ اور ذاتی نہ ہو؛ بلکہ عام اور مشترک ہو اس پر چلنا اور گاڑی چلانا اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ دوسروں کو کسی طرح کی اَذیت و تکلیف نہ دی جائے اور ان کی حق تلفی بھی نہ کی جائے، اس احتیاط کے بغیر عام اور مشترک سڑک کا استعمال جائز نہیں، اگر بے احتیاطی سے سڑک کا استعمال کرنے کے نتیجہ میں کوئی حادثہ پیش آ گیا تو مشترکہ سڑک کے ناجائز استعمال کے گناہ کے علاوہ اُس حادثہ کے نتیجہ میں ہونے والے نقصان کا سارا تاوان بھی شرعی نقطۂ نظر سے اس شخص کے ذمہ عائد ہوتا ہے جس نے بے احتیاطی کے ساتھ سڑک کا استعمال کیا، یہ حقیقت ہے کہ بعض اوقات کسی ایک مشترکہ سڑک کا ناجائز استعمال کرنے کی وجہ سے سینکڑوں لوگوں کا راستہ بند ہو جاتا ہے اور آمد و رفت میں حرج لازم آتا ہے، مثلاً ہائی وے کے ایک حصہ میں اگر کسی وجہ سے ٹریفک رُک گیا، تو بعض جلد باز قسم کے لوگ تھوڑی دیر انتظار کی زحمت گوارا کرنے کے بجائے سڑک کے اُس حصہ سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں جو آنے والے ٹریفک کے لیے مخصوص ہے، جس کے نتیجہ میں آنے والی گاڑیوں کا راستہ بھی رُک جاتا ہے، پھر گھنٹوں

تک ٹریفک اس طرح جام ہو جاتا ہے کہ ''نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن''، اس قسم کی بے قاعدگی درحقیقت ''فســاد فــی الأرض'' کی تعریف میں بھی آتی ہے، سینکڑوں انسانوں کو کرب وعذاب میں مبتلا کرنے کا گناہ اس شخص پر ہے جس نے غلط سمت میں گاڑی لے جا کر اِس صورتِ حال سے لوگوں کو دوچار کیا۔

ٹریفک کے قواعد پر عمل کے لیے راستے کے چھ حقوق ادا کیے جائیں:

ان حقائق سے معلوم ہوا کہ ٹریفک کے قواعد کی خلاف ورزی محض ملکی وسرکاری قانون کے خلاف ہی نہیں؛ بلکہ شرعی اور دینی اعتبار سے بھی چار گناہوں کا مجموعہ ہے، ایک تو اس میں قانون شکنی کا گناہ ہے، دوسرے عہد و پیمان کو توڑنے کا گناہ ہے، تیسرے ایذاءرَسانی یعنی کسی کو جانی، مالی یا ذہنی نقصان پہنچانے کا گناہ ہے، اور چوتھے حق تلفی یعنی مشترکہ سڑک کے ناجائز استعمال کا گناہ ہے، جن کا ارتکاب ہم میں سے اکثر و بیشتر لوگ دِن رات بلا تامل کرتے رہتے ہیں اور خیال تک نہیں ہوتا کہ ہم سے یہ گناہ سرزد ہو رہے ہیں، ضرورت ہے کہ ہم ان حقائق کو مدنظر رکھیں اور خود میں ایک اچھی تبدیلی لائیں، اس سے ہمیں دُنیا کا کوئی قانون نہیں روکتا، اس کے لیے کتاب وسنت کی تعلیمات اور زریں ہدایات کو پیش نظر رکھیں، خصوصاً سرکارِ دو عالم ﷺ کے اس فرمانِ عالی شان کو جس میں آپ ﷺ نے راستے کے حقوق ارشاد فرمائے ہیں:

(۱) ان میں پہلا حق ''غَضُّ البَصَرِ'' یعنی نگاہ نیچی رکھنا، اس کا ایک مقصد تو یہی ہے کہ غیر محرم سے ہماری نگاہیں محفوظ رہ سکیں، اسی کا دوسرا فائدہ یہ بھی ہے کہ جب نگاہ جھکی ہوئی ہوگی تو راستے میں کوئی تکلیف دہ چیز نظر آسکے گی جس کے نقصان سے تم بچ جاؤ گے، پھر ایک کامل مؤمن کی شان یہ ہے کہ وہ دوسروں کے حق میں نفع بخش ہوتا ہے، نقصان دہ نہیں، جب اس کی نظر میں کوئی راستے کی تکلیف دہ چیز آئے گی تو وہ فوراً اسے ہٹائے گا، جس سے دوسرے لوگ بھی نقصان سے محفوظ رہیں گے۔

(۲) دوسرا حق ہے: ''کَفُّ الأَذیٰ'' یعنی گزرنے والوں کو جانی، مالی یا ذہنی غرض ہر طرح کی چھوٹی یا بڑی تکلیف سے بچانا، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے؛ بلکہ حدیث پاک میں اسے صدقہ فرمایا گیا ہے۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ:۱۶۷) اور ایک حدیث میں تو اسے ایمان کا ایک درجہ قرار دیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: ''وَ أَدْنَــاهَــا إِمَــاطَةُ الْأَذیٰ عَنِ الطَّــرِيْقِ''.

(متفق عليه، مشکوٰۃ : ۱۲، كتاب الإيمان)

یوں تو اس میں تمام تکلیف دہ چیزیں داخل ہیں، خواہ وہ گندگی اور نجاست ہو، یا کچھ اور، جیسے: راستہ میں پیشاب یا پاخانہ کرنا یا ڈالنا، یا قربانی کے اَیام میں زائد اور ناپاک چیزیں راستے میں ڈالنا، اسی طرح غلط سمت (رونگ سائڈ) پر گاڑی چلانا، راستہ کے بیچ میں بلا کسی معقول مجبوری کے گاڑی کھڑی کر دینا، پٹرول اور ڈیزل کے بجائے کیروسین سے گاڑی چلانا، بغیر ضرورت کے ہارن بجانا، یا مکروہ آواز والی ہارن گاڑی میں لگا کر اسے استعمال کرنا، گاڑی چلنے کے دوران بلند آواز سے گانا یا نعت وغیرہ سننا بھی اس میں داخل ہے، کیوں کہ یہ تمام چیزیں راہ گیر کے لیے اَذیت کی باعث ہیں، ان سب سے گزرنے والوں کو بچاؤ، یہ کوئی معمولی بات نہیں؛ بلکہ نہایت پسندیدہ عمل ہے، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَبِیْ ذَرٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ''عُرِضَتْ عَلَيَّ أَعْمَالُ أُمَّتِيْ حَسَنُهَا وَ سَيِّئُهَا، فَوَجَدْتُ فِيْ مَحَاسِنِ أَعْمَالِهَا الْأَذیٰ يُمَاطُ عَنِ الطَّرِيْقِ، وَ وَجَدْتُ فِيْ مَسَاوِیْ أَعْمَالِهَا النُّخَاعَةَ تَكُوْنُ فِي الْمَسْجِدِ لَا تُدْفَنُ''.

(رواه مسلم، مشکوٰۃ: ٦٩)

''میرے سامنے میری اُمت کے اچھے اور برے اعمال پیش کیے گئے، تو میں نے اپنی امت کے اچھے اعمال میں راستہ سے تکلیف دہ چیز ہٹانے کو پایا، اور امت کے برے اعمال میں مسجد میں تھوکنا اور اسے صاف نہ کرنے کو پایا۔''

بہر حال راستہ کا دوسرا حق تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا ہے، یہ ایمان کا تقاضا اور اللہ کے رسول ﷺ کے نزدیک پسندیدہ عمل ہے۔

(۳) تیسرا حق: سلام کا جواب دینا، اس کا ظاہری مطلب تو یہی ہے کہ کوئی راہ گیر تمہیں سلام کرے تو اس کے سلام کا جواب دو، لیکن اگر ٹریفک کے پس منظر میں غور کیا جائے تو بعض لوگ ٹریفک میں مخالف سمت میں ڈرائیونگ کر کے دوسرے لوگوں کے لیے تنگی و تکلیف کا باعث بنتے ہیں، یا بار بار ہارن بجا کر لوگوں کی دقت میں اضافہ کرتے ہیں، یا ایسی جگہ گاڑی روک دیتے ہیں جس سے دوسروں کو بڑی مشقت پیش آتی ہے، یا رات کے وقت بغیر ضرورت سامنے والے پر تیز روشنی ڈال کر اسے پریشان کرتے ہیں، اس قسم کی غلطیاں تو خود کرتے ہیں، پھر اپنی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے اُلٹا دوسروں کو سب وشتم کا نشانہ بناتے ہیں، اس وقت اگر دوسرا بھی یہی طرزِ عمل اختیار کرے تو اس سے یقیناً ماحول قابل لاحول بن جائے، لیکن اگر عین اسی موقع پر ہم ارشادِ باری ﴿إِذَا خَاطَبَهُمُ الجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا﴾ کے مصداق بن کر صبر وتحمل اور کلمہ خیر کہتے ہوئے گزر جائیں تو ماحول کو کشیدگی سے محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو جائیں۔

(۴-۵) چوتھا اور پانچواں حق: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، کیوں کہ حضور پاک ﷺ کا سچا اور پکا اُمتی ہر وقت اور ہر جگہ داعی ہے، اس کی ذمہ داری ہے کہ اپنے قول و عمل سے جب بھی اور جہاں بھی موقع مل جائے ضرور دعوت کا فریضہ ادا کرے، اور یقیناً ان زریں ہدایات پر عمل بھی مستقل ایک دعوت ہی ہے، ہم اُن پر عمل پیرا ہو کر دنیا کو بتا سکتے ہیں کہ ہمارا دین اور اس کے احکام مسجد اور مدرسہ کی چہار دیواری تک محدود نہیں ہیں، بلکہ ان کا تعلق ساری زندگی اور اس کے تمام شعبوں سے ہے، جن پر عمل کرنے سے آخرت سے قبل دنیا میں بھی جنت کا سکون مل سکتا ہے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے اندر تبدیلی لانے کے لیے ان روشن تعلیمات وزریں ہدایات پر عمل کریں اور دوسروں کو بھی قول وعمل سے اس کی دعوت دیں، چنانچہ راستے کا (٦) چھٹا حق اگلی روایت میں "إرشاد السبيل" بیان فرمایا، جس کا ظاہری مفہوم تو راستہ بھٹکنے والے کو راستہ دکھانا ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص راستہ بھٹک گیا ہے اور وہ تم سے مدد چاہتے ہوئے صحیح راستہ معلوم کرنا چاہتا ہے تو تم

خاموشی اختیار مت کرلو، یا جلدی جلدی اور بے تکے انداز سے راستہ نہ بتاؤ، بلکہ پوری خوش اخلاقی کے ساتھ اس کی ایسی صحیح رہنمائی کرو جس سے اسے مطلوبہ راستہ سمجھ میں آجائے، اور اگر تمہارے پاس وقت میں گنجائش ہو تو اس کو ساتھ لے کر مطلوبہ راستے یا مقام تک پہنچا دو، آپ کا یہ عمل اللہ تعالیٰ ضائع نہیں فرمائیں گے، بلکہ اس پر صدقہ کا ثواب دیا جائے گا، ایک حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَبِيْ ذَرٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "تَبَسُّمُكَ فِيْ وَجْهِ أَخِيْكَ صَدَقَةٌ، وَ أَمْرُكَ بِالمَعْرُوْفِ صَدَقَةٌ، وَ نَهْيُكَ عَنِ المُنْكَرِ صَدَقَةٌ، وَ إِرْشَادُكَ الرَّجُلَ فِيْ أَرْضِ الضَّلَالِ لَكَ صَدَقَةٌ، وَ نَصْرُكَ الرَّجُلَ الرَّدِيْئَ البَصَرِ لَكَ صَدَقَةٌ، وَ إِمَاطَتُكَ الحَجَرَ وَ الشَّوْكَ وَ العَظْمَ عَنِ الطَّرِيْقِ لَكَ صَدَقَةٌ، وَ إِفْرَاغُكَ مِنْ دَلْوِكَ فِيْ دَلْوِ أَخِيْكَ لَكَ صَدَقَةٌ". (رواه الترمذي، مشكوٰة:١٦٩ / ١ / باب فضل الصدقة)

"تمہارا اپنے بھائی سے مسکرا کر ملنا، لوگوں کو حسب موقع بھلائی کی باتیں بتانا، برائیوں سے روکنا، راستہ بھول جانے والے کی رہبری کر دینا، نابینا یا کم دیکھنے والے کی مدد کرنا، راستہ سے پتھر، کانٹا اور ہڈی وغیرہ ہٹا دینا، نیز تمہارا اپنے ڈول سے اپنے بھائی کے ڈول میں پانی ڈال دینا بھی صدقہ ہے۔"

یعنی جس طرح حلال مال صحیح جگہ خرچ کرنا صدقہ ہے اسی طرح نیک اعمال کا اہتمام کرنا بھی صدقہ ہے، یہاں حضور ﷺ نے ان کی سات وہ شکلیں بیان فرمائیں جنہیں عموماً معمولی سمجھ کر لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں، حالانکہ ان اعمال پر بھی اللہ پاک صدقہ کا ثواب عطا فرماتے ہیں، اس لیے ان اعمال کو معمولی سمجھ کر چھوڑ نہیں دینا چاہیے، جن میں ایک عمل راستہ بھٹک جانے والے کی صحیح رہبری کرنا ہے، اور اسی میں یہ بھی داخل ہے کہ جو لوگ راہِ حق سے بھٹک گئے ہیں، جنہوں نے اسلام کی روشن تعلیمات اور زریں ہدایات کو فراموش کر دیا ہے انہیں اپنے قول وعمل سے راستہ دِکھانا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ راستے کے یہ جو چھ حقوق حضور ﷺ نے ارشاد فرمائے ہیں اگر انہیں

کما حقہ ادا کیا جائے تو اس سے ٹریفک کے قواعد پر بہترین طریقہ پر عمل ہوسکتا ہے، علاوہ ازیں اس کے دینی واُخروی ثمرات تو اپنی جگہ پر حاصل ہوں گے ہی۔

راستے کے حقوق سے متعلق ہمارے پاس جو روشن تعلیمات اور زرّیں ہدایات ہیں ان پر یورپ اور مغربی ممالک نے عمل کر کے دُنیا میں اپنی ایک اچھی پہچان بنالی، جب کہ ہم نے انہیں پس پشت ڈال دیا، جس میں ہمارا ملکی وملی اور دینوی واُخروی نقصان ہے۔

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو   تو کجا بہر تماشا می روی؟

حق تعالیٰ ہم سبھی کو حضور ﷺ کی تمام تعلیمات پر کما حقہ عمل کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

۱۹/ ذوالحجہ/ ۱۴۳۹/ بروز: جمعہ
مطابق: ۳۱/ اگست/ ۲۰۱۸ء (بزمِ صدیقی، بڑودا)

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيرًا   فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيرًا كَثِيرًا
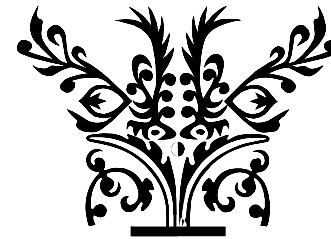
(۱۴)

مزدوروں کے حقوق اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی اہمیت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ أَبِيْ ذَرٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِخْوَانُكُمْ جَعَلَهُمُ اللّٰهُ تَحْتَ أَيْدِيْكُمْ، فَمَنْ جَعَلَ اللّٰهُ أَخَاهُ تَحْتَ يَدَيْهِ، فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَأْكُلُ، وَ لْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ، وَ لَا يُكَلِّفْهُ مِنَ الْعَمَلِ مَا يَغْلِبُهُ، فَإِنْ كَلَّفَهُ فَلْيُعِنْهُ عَلَيْهِ".

(متفق عليه، مشكوٰة: ۲۹۰، باب النفقات و حق المملوك)

ترجمہ: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ (تمہارے خادم، ملازم اور مزدور بھی انسانی یا ایمانی رشتہ سے) تمہارے بھائی ہیں، حق تعالیٰ نے انہیں (دنیوی نظام کو چلانے اور تمہارے امتحان کے لیے) تمہارے ماتحت رکھا ہے، لہٰذا جس شخص کے تحت کوئی خادم یا ملازم ہو تو اسے چاہیے کہ جو چیز خود کھاتا ہے وہی اسے بھی کھلائے اور جو چیز وہ خود پہنے اسے بھی پہنائے اور اسے ایسے کام کی تکلیف نہ دے جو وہ نہ کر سکے، اور اگر کسی وجہ سے ایسا کوئی کام اس کے سپرد کرنا پڑے تو پھر اس کام میں اس کی مدد ضرور کرے۔

اسلام میں کوئی طبقہ اور پیشہ حقیر نہیں:

اللہ رب العزت نے اس کارخانۂ عالم کے انتظام کو چلانے اور دنیا والوں کے امتحان کے لیے خود انسانوں کے درمیان فرقِ مراتب رکھا ہے، جس کی وجہ سے کوئی حاکم ہے تو کوئی محکوم، کوئی خادم ہے تو کوئی مخدوم، کوئی مالک ہے تو کوئی مزدور، کوئی امیر ہے تو کوئی فقیر، لیکن اسلام کی نظر میں بحیثیت انسان تمام ہی طبقات کے لوگ یکساں عزت وحرمت کے مستحق ہیں اور تمام حسن سلوک اور ادائِ حقوق کے پابند ہیں، اسلام کی نظر میں کوئی طبقہ اور پیشہ حقیر نہیں ہے، اسلام کی روشن تعلیمات اور زرّیں ہدایات کے مطابق مزدور سماج کا مظلوم و مجبور طبقہ نہیں؛ بلکہ نہایت اہم حصہ اور طبقہ ہے، اور مزدوری کوئی بے عزتی کا پیشہ نہیں؛ بلکہ رزقِ حلال کا بابرکت ذریعہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی ظاہری چمک دَمک بڑی حد تک مزدوروں کے دَم قدم کی برکت ہے، یہ جو بلند قامت عمارتیں، صاف شفاف سڑکیں، بل کھاتی ہوئی نہریں، سرسبز و شاداب کھیتیاں، حسین وجمیل بستیاں، حتیٰ کہ روٹی، کپڑا اور مکان بھی کسی نہ کسی حد تک اُن ہی کے خون پسینے سے حاصل ہوتے ہیں۔

گھر جا کے بچوں کو چپکے سے کھلایا ہوگا
ان کو کیا معلوم کہ کس حال میں کمایا ہوگا

اس حقیقت کے باوجود یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ ہر زمانہ میں سماج کا مزدور طبقہ عموماً مختلف قسم کی مجبوریوں، محرومیوں اور بے انصافیوں کا شکار رہا ہے، جس کا بہترین حل یہ ہے کہ اسلام نے دیگر شعبوں اور طبقوں کی طرح مزدوروں کے لیے جو اخلاقی اور قانونی ہدایتیں دی ہیں اپنے قول وعمل کے ذریعہ انہیں عام کیا جائے۔

مزدوری رزقِ حلال کا بابرکت ذریعہ

اور انبیاء علیہم السلام کا پاکیزہ طریقہ ہے:

اس سلسلہ میں اسلام نے سب سے پہلے تو یہ بات واضح فرمادی کہ محنت ومزدوری کوئی گری پڑی چیز نہیں ہے، انبیاء کرام علیہم السلام کا پاکیزہ طریقہ اور رزقِ حلال کا بابرکت ذریعہ ہے، اور بے کار رہ کر دوسروں کے سہارے پلنے اور جینے سے بہت بہتر یہ ہے کہ بندہ جائز محنت ومزدوری کر کے حلال کی روٹی کمائے اور اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر عزت کے ساتھ زندگی گزارے، طبقۂ انسانی کا سب سے بہترین طبقہ حضرات انبیاءِ کرام علیہم السلام ہیں، انہوں نے بھی رزقِ حلال کے لیے محنت ومزدوری کی ہے، ایک حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِی هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: "مَا بَعَثَ اللّٰهُ نَبِيًّا إِلَّا رَعَى الْغَنَمَ، فَقَالَ أَصْحَابُهٗ: وَ أَنْتَ؟ فَقَالَ: نَعَمْ، كُنْتُ أَرْعَىٰ عَلَىٰ قَرَارِيْطَ لِأَهْلِ مَكَّةَ". (رواه البخاری، مشکوٰة: ۲۵۸، باب الإجارة)

"اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی انبیاء بھیجے تمام نے بکریاں چرائیں، صحابہؓ نے عرض کیا: حضور! آپ نے بھی بکریاں چرائی ہیں؟ فرمایا: ہاں، میں چند قیراط پر اہل مکہ کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔"

قرآنِ کریم میں حضرت موسیٰ اور حضرت شعیب علیہما السلام کا واقعہ مذکور ہے، جن دِنوں حضرت شعیب علیہ السلام کو کسی ملازم ومزدور کی ضرورت تھی، ان ہی دِنوں ان کی ملاقات حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوگئی، ایک مزدور کو دو صفات سے متصف ہونا چاہیے: ایک تو کام کرنے کی قوت وصلاحیت اور دوسرے کام کو حسن وخوبی اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ متعینہ وقت پر پوری امانت داری کے ساتھ انجام تک پہنچانا، یہ دونوں خوبیاں حضرت موسیٰ علیہ السلام میں مکمل طور پر پائی جاتی تھیں، جس کا اندازہ حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحب زادی کو ان کے حسن معاملہ واخلاق سے ہوگیا تھا، اس لیے انہوں نے اپنے والد سے عرض کیا:

﴿ يٰٓأَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِيْنُ○﴾ (القصص:٢٦)

’’ابا جان! آپ انہیں مزدوری پر رکھ لیجیے، بہترین مزدور جسے آپ رکھیں گے وہ ہوگا جو طاقت ور اور امانت دار ہو۔‘‘

الغرض حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مزدوری پر رکھ لیا گیا اور آپ نے بھی رزقِ حلال کے حصول کے لیے حضرت شعیب علیہ السلام کے یہاں آٹھ یا دس سال مزدوری فرمائی۔

’’إِنَّ مُوسٰى عليه السلام آجَرَ نَفْسَهٗ ثَمَانِيَ سِنِيْنَ أَوْ عَشْرًا عَلٰى عِفَّةِ فَرْجِهٖ وَ طَعَامِ بَطْنِهٖ‘‘. (ابن ماجه)

بعد میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ایمان داری سے متاثر ہوکر حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی بیٹی سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نکاح فرما دیا، جیسے حضرت خدیجہؓ نے حضور پاک ﷺ کی امانت داری سے متاثر ہوکر نکاح کیا تھا۔

معلوم ہوا کہ مزدوری کوئی بے عزتی کا پیشہ نہیں؛ بلکہ حضرات انبیاءِ کرام علیہم السلام کا مبارک طریقہ اور رزقِ حلال کا پاکیزہ ذریعہ ہے۔

مزدوروں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید:

مزدوروں کو احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں، اور لوگوں کو بھی چاہیے کہ مزدوروں کو اہمیت دیں، غالبًا اسی لیے حضور ﷺ نے غلاموں، خادموں اور مزدوروں کے اخلاقی و قانونی حقوق بیان فرما کر ان کی ادائیگی کی اپنے مرض الوفات اور زندگی کے آخری لمحات میں نماز جیسے اہم اسلامی رُکن کے ساتھ تاکید و تلقین اور وصیت فرمائی، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ فِيْ مَرَضِهٖ: ’’الصَّلٰوةَ وَ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ‘‘.

(رواه البيهقي، و أحمد و أبوداود، مشكوٰة: ٢٩١، باب النفقات و حق المملوك)

حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ نے اپنے مرض الوفات میں نماز کے اہتمام کے ساتھ غلاموں کے ساتھ حسن سلوک اور اداءِ حقوق کی تاکید فرمائی۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ عربوں میں دورِ جاہلیت سے غلاموں کا رِواج چلا آرہا تھا اور اس وقت غلاموں سے ذاتی خدمت اور محنت و مزدوری کا مشقت والا کام لیا جاتا تھا، اس لیے قرآن و حدیث میں اوّل تو غلاموں کو آزاد کرنے کی تاکید آئی ہے، اور جو غلام ماتحتی میں ہیں ان کے ساتھ حسن سلوک کی ترغیب دی گئی، کتاب و سنت میں غلاموں کے متعلق جو ہدایات ہیں ان کے تحت علماءِ محدثین نے فرمایا کہ آج ان کے مصداق دورِ حاضر کے خادم، ملازم اور مزدور بھی ہیں، مطلب یہ ہے کہ جو اخلاقی اور قانونی ہدایات غلاموں کے متعلق تھیں ملازموں اور مزدوروں کے متعلق بھی وہی ہیں، اُس زمانہ میں جو کام اور خدمات غلاموں سے لیے جاتے تھے اِس وقت تقریباً وہی کام اور خدمات ملازموں اور مزدوروں سے لیے جاتے ہیں، چونکہ جاہلیت قدیمہ کی طرح جاہلیت جدیدہ کے پڑھے لکھے جاہل بھی اپنے خادموں، ملازموں اور مزدوروں کو غلاموں سے کم نہیں سمجھتے، اس لیے جو احکام اور حقوق غلاموں کے متعلق بیان ہوئے ہیں ان میں غلام، ملازم اور مزدور بھی داخل ہیں۔

مزدوروں کے اَخلاقی حقوق:

حدیث مذکورہ میں مزدوروں کے تین اَخلاقی حقوق بیان کرتے ہوئے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’إِخْوَانُكُمْ جَعَلَهُمُ اللّٰهُ تَحْتَ أَيْدِيْكُمْ‘‘ لوگو! اپنے خادموں، ملازموں اور مزدوروں کو کمتر اور خود کو بہتر نہ سمجھو، سماجی و انسانی حیثیت سے وہ بھی تمہارے بھائی ہیں، وہ تو اللہ تعالیٰ نے دنیا کا نظام چلانے اور تمہارا امتحان لینے کے لیے انہیں تمہارے ماتحت رکھا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اپنے ملازموں، مزدوروں اور ماتحتوں کے ساتھ جو چاہو برتاؤ کرو، تمہارا اَخلاقی فریضہ ہے کہ ان کے ساتھ اپنے بھائیوں کی طرح برتاؤ کرو۔

دوسری روایت میں وارد ہے:

"أَكْرِمُوْهُمْ كَرَامَةَ أَوْلَادِكُمْ، وَ أَطْعِمُوْهُمْ مِمَّا تَأْكُلُوْنَ".

(مشكوٰة: ۲۹۲/ باب النفقات و حق المملوك/ الفصل الأول)

''اپنی اولاد کی طرح اپنے غلاموں، ملازموں اور مزدوروں کا اکرام کرو اور اُن کو وہی کھلاؤ جو تم کھاتے ہو۔''

حدیث مذکورہ میں بھی دوسرا اخلاقی حق یہی ارشاد ہے:

"فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَأْكُلُ، وَ لْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ".

''جو تم کھاتے، پیتے اور پہنتے ہو وہی ان کو کھلاؤ، پلاؤ اور پہناؤ۔''

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اپنے غلاموں، ملازموں، ڈرائیوروں اور مزدوروں کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلاؤ، خصوصاً وہ خادم وملازم جو تمہارے یہاں کھانا پکانے پر مامور ہیں یا ان کا کھانا تمہارے ذمہ ہے تو انہیں اپنے ساتھ بٹھا کر کھلاؤ، اس میں عار محسوس نہ کرو، جیسا کہ متکبرین کا طریقہ ہے، کیوں کہ انسانی برادری کے لحاظ سے وہ تمہارے بھائی ہیں، اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ساتھ میں بٹھا کر کھلانے سے برکت بھی ہوگی، کیوں کہ دسترخوان پر جتنے کھانے والے زیادہ ہوں گے کھانے میں اسی قدر برکت ہوگی، جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ ''افضل کھانا وہ ہے جس میں بہ کثرت ہاتھ پڑیں۔'' (مظاہر حق جدید: ۳/۵۰۰)

دوسرا مطلب یہ ہے کہ کسی وجہ سے خادموں اور ملازموں کو اپنے ساتھ کھلایا نہ جا سکے تو بعد میں بھی ان کو وہی کھانا کھلاؤ جو تم نے خود کھایا ہے، یہ نہ ہو کہ تم تو نہایت لذیذ، مزہ دار اور عمدہ کھانا کھاؤ اور بچا کھچا، بدمزہ کھانا ملازموں کو کھلاؤ، حتیٰ کہ ائمہ حدیث نے لکھا ہے کہ اگر کوئی مالک بخل یا زہد کی وجہ سے بہت معمولی غذا کھاتا ہو اور معمولی کپڑے پہنتا ہو تب بھی اس کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے خادموں اور ملازموں کو اس پر مجبور کرے۔ (مظاہر حق: ۵/۴۹۹)

ملازمین اور خادمین کا تیسرا اخلاقی حق یہ بیان فرمایا کہ "وَ لَا يُكَلِّفُهُ مِنَ الْعَمَلِ مَا يَغْلِبُهُ" ان کی استطاعت اور قدرت کے مطابق ان سے کام لیا جائے، اس سے زیادہ نہیں، مطلب یہ ہے کہ ان سے اتنا کام نہ لیا جائے کہ وہ تھک کر نڈھال ہو جائیں، یا ان کی

صحت خراب ہو جائے، یا کم عمر بچوں، کمزوروں اور عمر دراز لوگوں سے ان کی طاقت وقدرت سے زیادہ کام لیا جائے، یہ طریقہ ظالمانہ ہے اور قانوناً بھی جرم ہے، لہٰذا مشقت والے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹائے اور ان کا تعاون کرے۔

علاوہ ازیں اگر کبھی بتقاضائے بشریت کسی خادم یا ملازم سے کوئی غلطی وکوتاہی ہو جائے تو چوتھا اخلاقی حق یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے چشم پوشی اور درگذر سے کام لیا جائے، معمولی غلطیوں اور کوتاہیوں پر ان کی گرفت نہ کی جائے، انہیں ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں پر کھری کھری نہ سنائی جائے اور نہ ہی ان کے ساتھ بے جا سختی کی جائے، خصوصاً جب کہ وہ خادم وملازم نیک اور متقی ہو تو اس کے ساتھ خصوصی رعایت کی جائے، حدیث شریف میں عام خادم و ملازم کو بھی دِن میں ستر مرتبہ معاف کر دینے کی ترغیب وارد ہوئی ہے۔ (ابوداود، مشکوٰۃ: ۲۹۲) پھر نیک اور نمازی کے متعلق کیا خیال ہے؟ اور اگر کسی وجہ سے رعایت کرنا اور چشم پوشی سے کام لینا مناسب نہ ہو تو اعتدال میں رہتے ہوئے تنبیہ کر دے، جس کا مقصد تادیب ہو، تعذیب نہ ہو۔

ان تمام مراحل کے بعد بھی کوئی خاطر خواہ اثر نہ ہو تو پھر عزت کے ساتھ رُخصت کر دیا جائے، جس کی طرف حدیث پاک میں اشارہ ملتا ہے:

"فَمَنْ لَمْ يُلَائِمْكُمْ فَبِيْعُوْهُ، وَ لَا تُعَذِّبُوْا خَلْقَ اللّٰهِ".

(رواه أبوداود، و أحمد، مشكوٰة: ۲۹۲)

مزدوروں کے قانونی حقوق:

یہ تو مزدوروں اور ملازموں کے اخلاقی حقوق ہیں، جہاں تک ان کے قانونی حقوق کی بات ہے تو یہ حقیقت ہے کہ ایک ملازم ومزدور کے سامنے سب سے پہلا سوال ان کی تنخواہ اور مزدوری کا ہوتا ہے، جو اس کا قانونی حق ہے، اس سلسلہ میں شریعت مطہرہ نے پہلا حق یہ بیان کیا کہ کسی بھی ملازم ومزدور کی تنخواہ واُجرت اور کام کی نوعیت پہلے ہی سے متعین کر دی جائے، اسے مبہم نہ رکھا جائے، حدیث پاک میں کسی بھی مزدور سے کام واُجرت متعین کیے

بغیر کام لینے سے منع فرمایا گیا:

عَنْ أَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهٰی عَنِ اسْتِئْجَارِ الْأَجِیْرِ، حَتّٰی یُبَیَّنَ لَهٗ أَجْرُهٗ". (رواه أحمد)

دوسرا حق یہ ہے کہ ملازم اور مزدور کی تنخواہ واُجرت ان کی قابلیت وضرورت کے لحاظ سے متعین کی جائے، قرآنِ کریم نے دودھ پلانے والی عورت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم بچے کی ماں کے علاوہ کسی اور عورت سے دودھ پلواتے ہو تو چونکہ وہ تمہارے بچے کو اپنے جسم کا خون جلا کر دودھ پلاتی ہے اور اس کی پرورش کرتی ہے اس لیے تمہارا فرض ہے کہ اپنی گاڑھی کمائی سے اس کی ضروریاتِ زندگی کا خیال رکھو اور اس بارے میں دونوں کو ایک دوسرے کی تکلیف کا خیال ہونا چاہیے، چنانچہ فرمایا:

﴿ وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرة : ٢٣٣)

’’اور جس باپ کا وہ بچہ ہے اُس پر واجب ہے کہ معروف طریقہ پر ان ماؤں کے کھانے اور لباس کا خرچ اُٹھائے، (ہاں) کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاتی‘‘۔

یعنی قرآنِ پاک نے معروف طریقہ پر اُجرت دینے کا حکم فرمایا، معروف کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو وہ اُجرت اِتنی زیادہ ہو کہ اُجرت دینے والے کی قدرت سے باہر ہو اور نہ اِتنی کم ہو کہ اُجرت پانے والے کی ضروریات بھی پوری نہ ہوسکیں۔ (اسلامی فقہ: ٢/٥٤٢)

آج تقریباً ہر جگہ حتیٰ کہ مساجد، مدارس اور دینی اِداروں میں بھی اس قرآنی تعلیم کو عموماً نظر انداز کردیا جاتا ہے، جس کی نحوست یہ ہے کہ صبح سے شام تک محنت ومزدوری کرنے والا اِتنا نہیں کما پاتا جتنا ایک فقیر چند گھنٹوں میں بھیک مانگ کر کما لیتا ہے، محنت ومزدوری کرنے والوں کے ساتھ تو ایک ایک پائی کا حساب کرتے ہیں اور بھکاریوں کو دس، بیس بلکہ سو پچاس دے کر سمجھتے ہیں کہ ہم نے جنت کما لی، یہ نہیں سوچتے کہ ہمارے اس طرزِ عمل سے

بھیک مانگنے والوں کی تو حوصلہ اَفزائی ہوتی ہے، جب کہ محنت ومزدوری کرنے والوں کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے، سماج میں تبدیلی لانے کے لیے اس طرزِ عمل میں بھی تبدیلی لانا ضروری ہے، ملازموں اور مزدوروں کی ضروریاتِ زندگی کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کی تنخواہ اور اُجرت متعین کرنا ضروری ہے، بلکہ صاحبو! پیشہ ور فقیروں کو دس، بیس اور سو، پچاس روپئے دینے سے بہتر یہ ہے کہ محنت ومزدوری کرنے والوں کو ان کے حق سے زیادہ دیا جائے۔

تیسرا حق یہ ہے کہ ملازم اور مزدور کی تنخواہ اور اُجرت مقررہ وقت پر ادا کر دی جائے، خواہ مخواہ ٹال مٹول نہ کی جائے، حدیث پاک میں تو حضور ﷺ نے وقت مقررہ سے پہلے اُجرت ادا کرنے کی ترغیب دی ہے:

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" أَعْطُوا الْأَجِیْرَ أَجْرَهٗ قَبْلَ أَنْ یَجِفَّ عَرَقُهٗ". (رواه ابن ماجه، مشكوٰة: ٢٥٨، باب الإجارة)

’’آپ ﷺ نے فرمایا کہ مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کردو۔‘‘

مزدوروں کے حقوق ضائع کرنے والوں کے لیے وعید:

جن لوگوں کے دلوں میں خوفِ خدا اور فکرِ عقبیٰ نہیں ہے ان کا حال یہ ہے کہ وہ ملازموں کی تنخواہ اور مزدوروں کی اُجرت کو بروقت ادا نہیں کرتے، ہمیشہ دو چار دن گزرنے کے بعد ہی ادا کرتے ہیں، اگر کوئی مصیبت کا مارا ہوا مطالبہ کرے تو برس پڑتے ہیں، تعجب تو اس پر ہے کہ یہ ظالمانہ ومجرمانہ حرکت بعض کمپنیوں اور فیکٹریوں کے علاوہ دینی اِداروں اور مساجد و مدارس میں بھی دیکھی جاتی ہے، انہیں اس وعیدِ شدید سے ڈرنا چاہیے جس میں نبی پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: ثَلَاثَةٌ أَنَا خَصْمُهُمْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ، رَجُلٌ أَعْطٰی بِیْ ثُمَّ غَدَرَ، وَ رَجُلٌ بَاعَ حُرًّا، فَأَكَلَ

ثَمَنَهٗ، وَ رَجُلٌ اسْتَأْجَرَ أَجِيرًا، فَاسْتَوْفٰى مِنْهُ، وَ لَمْ يُعْطِهٖ أَجْرَهٗ".

(رواه البخاري، مشكوٰة: ۲۵۸، باب الإجارة) (حدیث قدسی نمبر:۹)

یہ حدیث قدسی ہے، حضور ﷺ نے حق تعالیٰ کا ارشاد نقل فرمایا کہ تین آدمی ایسے ہیں کہ قیامت کے دِن میں خود ان کا فریق ہوں گا، ایک تو وہ آدمی جس نے مجھے عہد دیا پھر دھوکہ دیا (یا میرے نام کی قسم کھائی، منت مانی اور پورا نہ کیا) دوسرا وہ آدمی جس نے کسی آزاد آدمی کو پکڑ کر اغواء کر کے بیچ دیا اور اس کی قیمت کھا گیا، (اگر قیمت وصول نہ کرے تب بھی وہ اس وعید میں داخل ہے۔ مظاہر حق جدید:۳/۱۹۱) تیسرا وہ آدمی جس نے کسی کو مزدوری پر لگایا پھر اس مزدور سے کام تو پورا لیا مگر مزدوری نہیں دی۔

مزدوری نہ دینے کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں کہ ملازم اور مزدور کی مزدوری اور تنخواہ نہ دی جائے؛ بلکہ اس میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ ملازم جس تنخواہ اور مزدور جس اُجرت کا حق دار تھا یا اس ملازمت اور مزدوری پر جتنی تنخواہ و اُجرت اسے دینی چاہیے تھی وہ نہ دے اور ان کی مجبوری اور خاموشی سے فائدہ اُٹھا کر کم سے کم اُجرت و تنخواہ پر کام لیا جائے، ایسے تمام ذمہ داران اس وعید شدید میں مزدوروں اور ملازموں کے حقوق ضائع کرنے کی وجہ سے داخل ہیں۔ العیاذ باللہ العظیم۔

مزدوروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے والوں کے لیے بشارت:

ظاہر ہے قیامت کے دن خود حق تعالیٰ جن لوگوں کے خلاف فریق اور مد مقابل ہوں ان کے لیے تو نجات کی کوئی صورت ہی نہ ہوگی، جن لوگوں کے ماتحت ملازمین اور مزدور کام کرتے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ اسلام نے مزدوروں اور ملازموں کے جو حقوق متعین کیے انہیں ادا کریں؛ بلکہ ان کے ساتھ حقوق سے بڑھ کر حسن سلوک کا معاملہ کریں، حدیث پاک میں ان لوگوں کے لیے بڑی بشارت وارد ہوئی ہے جو مزدوروں کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں:

عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: "ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ يَسَّرَ اللّٰهُ حَتْفَهٗ، وَ أَدْخَلَهٗ جَنَّتَهٗ، رِفْقٌ بِالضَّعِيفِ، وَ شَفَقَةٌ عَلَى الْوَالِدَيْنِ، وَ إِحْسَانٌ إِلَى الْمَمْلُوكِ". (و فى الترمذى : "سَتَرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ كَنَفَهٗ"، مشكوٰة: ۲۹۱)

"جس شخص میں تین باتیں پائی جائیں اللہ تعالیٰ اس کی موت آسان فرما دیں گے اور اسے اپنی جنت میں داخل فرما دیں گے، ایک کمزور کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنا، (خواہ وہ جسمانی، ذہنی، علمی، عملی غرض جس اعتبار سے بھی کمزور ہو، بہر حال اس کے ساتھ سختی کرنے کے بجائے جہاں تک ممکن ہو نرمی کی جائے) دوسری بات والدین کے ساتھ شفقت کرنا (اس میں ان کی جائز ضرورتیں پوری کرنا، ان کی خدمت اور اطاعت داخل ہے) تیسری بات مملوک، ملازم اور خادم کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنا۔ حاصل یہ ہے کہ ان کے اداءِ حقوق کے علاوہ ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔"

اندازہ لگائیے کہ یہ عمل کتنا مبارک ہے کہ اس کی بدولت موت آسان ہو جاتی ہے، پھر بعد الموت دخولِ جنت بھی آسان ہے، واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی ان روشن تعلیمات اور زرّیں ہدایات پر عمل کر لیا جائے تو سماج اور حکومت کے بہت سے معاشی و معاشرتی مسائل خود بہ خود حل ہو جائیں۔

حق تعالیٰ ہمیں توفیق عمل عطا فرما کر ہم کمزوروں کے ساتھ دارین میں رِفق و یسر کا معاملہ فرمائیں۔ آمین۔

۱۶/صفر المظفر /۱۴۴۰ھ

مطابق: ۲۶/اکتوبر/۲۰۱۸ء

بروز: جمعہ، قبل المغرب (بزمِ صدیقی، بڑودا)

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيرًا   فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيرًا كَثِيرًا

(۱۵)

رحمۃ للعالمین ﷺ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ هُرَیۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهٗ قَالَ: إِنَّمَا أَنَا رَحۡمَةٌ مُهۡدَاةٌ". (رواه الدارمی و البیهقی، مشکوٰۃ:۵۱۸، باب أسماء النبي ﷺ و صفاته، الفصل الثالث)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "بلاشبہ میں ہدیہ بھیجی ہوئی رحمت ہوں"۔

"رحمۃ للعالمین" آپ کی سیرت کا عنوان:

اللہ رب العزت کی پاکیزہ صفات میں رحمت تمام صفات پر غالب اور دنیا کی تمام مخلوقات پر سایہ فگن ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَ رَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ کُلَّ شَیۡءٍ﴾ (الأعراف: ۱۵۶)

"میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے"۔

یہ اسی کا اثر ہے کہ دنیا کی تمام مخلوقات اس کی نعمتوں سے مستفیض ہو رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی، یہاں تک کہ قیامت کے دن بھی کفار و مشرکین کے علاوہ تمام مجرمین کو اسی

صفت رحمت سے معاف کر دیا جائے گا، تو جس طرح اللہ تعالیٰ کی صفات میں صفت رحمت سب پر غالب ہے، اسی طرح ہمارے آقا جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے مقدس اَوصاف میں رحمت کا وصف بھی تمام اَوصاف پر غالب ہے، اگرچہ حق تعالیٰ نے ہمارے آقا ﷺ کو مختلف اَوصاف سے متصف فرما کر مبعوث فرمایا اور ہر وصف آپ ﷺ کی کسی نہ کسی خوبی و کمال ہی کا مظہر ہے، لیکن آپ ﷺ کا رحمۃ للعالمین ہونا ایک ایسا منفرد اور مخصوص وصف ہے جو تمام اَوصاف کا جامع ہے، آپ ﷺ کی ساری زندگی اسی کی تفسیر و تعبیر ہے، آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو اگر کسی جامع عنوان سے معنون کیا جائے تو عاجز کے خیالِ ناقص میں وہ عنوان ہے "رحمۃ للعالمین"۔ خود حق تعالیٰ نے آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو اسی عنوان سے قرآنِ پاک میں بیان فرمایا ہے:

﴿وَ مَآ أَرۡسَلۡنٰكَ إِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ﴾ (الأنبیاء: ۱۰۷)

"اور ہم نے تمہیں سارے جہانوں کے لیے رحمت ہی رحمت بنا کر بھیجا ہے"۔

مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ بذاتِ خود سارے جہانوں کے لیے رقیق القلب، رحم دل، ہمدرد اور سراپا رحمت ہیں، یا آپ ﷺ کی حیات، ہدایات اور تعلیمات سارے جہاں کی مخلوقات کے لیے دنیا و آخرت میں رحمت ہیں، یا پھر سب رحمت ہیں، اللہ تعالیٰ رب العالمین ہیں تو ہمارے آقا ﷺ رحمۃ للعالمین ہیں، یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کسی خاص خطے یا طبقے کے لیے نہیں؛ بلکہ سب کے لیے ہے، تو آپ ﷺ کا رحمت ہونا بھی سب کے لیے ہے، اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت سے ساری مخلوق کو فائدہ پہنچا تو آپ ﷺ کی شانِ رحمت سے بھی ساری مخلوق کو فائدہ پہنچا ہے اور پہنچے گا، اور یہ دعویٰ کوئی بلا دلیل نہیں، بلکہ کتاب و سنت میں اس کے کئی دلائل موجود ہیں۔

مخلوقات کے لیے رحمت:

مثلاً دیکھئے! ساری کائنات جس میں تمام مخلوقات آباد ہیں اہل ایمان کی وجہ سے

قائم ہے، حدیث پاک میں وارد ہے:

" لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يُقَالَ فِي الْأَرْضِ : "اَللّٰهُ، اَللّٰهُ".

(رواه مسلم، مشکوٰۃ : ٤٨٠)

اور یہ حقیقت ہے کہ ایمان کی دولت اہل ایمان کو حضور ﷺ کی بدولت ملی ہے، اس اعتبار سے کائنات کی ساری مخلوق کے لیے آپ ﷺ کا رحمت ہونا ظاہر ہے، نیز آپ ﷺ نے اپنی حیات وہدایات اور قول وعمل کے ذریعہ انسانوں کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی اُن تمام مخلوقات کے ساتھ شفقت ومحبت اور حسن سلوک کی تلقین بلکہ تاکید فرما کر ساری مخلوق کو نفع وفائدہ پہنچایا، ایک حدیث پاک میں ارشاد ہے:

عَنْ أَنَسٍ وَ عَبْدِاللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَا: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ، فَأَحَبُّ الْخَلْقِ إِلَى اللّٰهِ مَنْ أَحْسَنَ إِلٰى عِيَالِهٖ".

(رواه البيهقي، مشكوٰة: ٤٢٥، باب الشفقة و الرحمة على الخلق)

''کائنات کی ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے، (جس طرح تم اپنے قبیلے اور کنبے سے محبت کرتے ہو اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی اپنی ساری مخلوق سے محبت کرتا ہے، اور جیسے تم اپنے کنبہ کے لیے ضروریات کے کفیل ہو، اُن کا انتظام کرتے ہو ایسے ہی حق تعالیٰ بھی اپنی مخلوقات کے کفیل ہیں، سب کی ضروریات کا انتظام کرتے ہیں، اور اگر تم اپنے کنبہ سے محبت کرنے والے کے ساتھ محبت کرتے ہو) تو حق تعالیٰ بھی اس سے بہت محبت کرتے ہیں جو اس کی مخلوقات کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرے، آپ ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعہ کائنات کی ساری مخلوقات کے ساتھ شفقت ومحبت اور حسن سلوک کی ترغیب وتاکید فرمائی، اس طرح آپ ﷺ مخلوقات کے لیے رحمت ثابت ہوئے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَ مَآ أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ (الأنبياء : ١٠٧)

حیوانات کے لیے رحمت:

اللہ پاک کی بے شمار مخلوقات میں حیوانات یعنی چرندے، پرندے، درندے اور تمام کیڑے مکوڑے بھی ہیں، آفتابِ نبوت کے طلوع ہونے سے پہلے جب ساری کائنات میں ضلالت و جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی تب بے زبان جانوروں کے ساتھ مختلف طریقوں سے زیادتیاں کی جاتی تھیں، مثلاً زمانۂ جاہلیت میں بہ طورِ تفریح بے زبان جانوروں کو لڑانے کا رِواج تھا، بدقسمتی سے آج بھی بعض ممالک میں ''بُل فائٹنگ'' کے نام سے بیلوں کی لڑائی کا اہتمام قومی جشن کے طور پر کیا جاتا ہے، اور اس ہلاکت خیز لڑائی کو لوگ بڑے جوش وخروش سے دیکھتے ہیں، نیز عیدالاضحیٰ کے موقع پر قربانی کے جانوروں کو لڑانا، مرغ بازی، تیتر بازی اور کبوتر بازی کے علاوہ ہمارے ملک میں اُتران اور دیوالی جیسے تہواروں میں بے شمار پرندوں اور جانوروں کی ہلاکت واقع ہوتی ہے، آپ ﷺ نے ان تمام طریقوں سے منع فرمادیا، جن سے جانوروں کو بلاوجہ تکلیف ہو، چنانچہ فرمایا:

" اِتَّقُوا اللّٰهَ فِي هٰذِهِ الْبَهَائِمِ الْمُعْجَمَةِ، فَارْكَبُوْهَا صَالِحَةً وَ اتْرُكُوْهَا صَالِحَةً". (رواه أبوداود، مشكوٰة:٢٩٢، باب النفقات و حق المملوك)

''بے زبان جانوروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو، (بلاضرورت جانوروں کو مشقت میں نہ ڈالو، جن جانوروں کو اللہ تعالیٰ نے تمہاری سواری ہی کے لیے پیدا فرمایا ہے ان پر بھی) بھلے طریقے سے سواری کرو یعنی ان پر اس حالت میں سواری کرو کہ وہ قوی ہوں اور سواری کے قابل ہوں، اور اس حالت میں چھوڑو جب وہ بھلے ہوں''۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عبداللہ اپنے والد سے نقل فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ حضور ﷺ کے ساتھ کسی سفر میں تھے، آپ ﷺ قضاءِ حاجت کے لیے گئے ہوئے تھے، ہم نے ایک قمری (پرندہ) دیکھی، جس کے دو چوزے تھے، ہم نے دونوں کو پکڑ لیا، تو ان کی ماں پر مارنے لگی، آپ ﷺ تشریف لائے اور فرمایا:

"مَنْ فَجَعَ هٰذِهٖ بِوَلَدِهَا؟ رُدُّوْا وَلَدَهَا إِلَيْهَا".

(رواه أبوداود، مشكوٰة:٣٠٧، باب قتل أهل الردة و السعاة بالفساد)

''کس نے اس پرندے کو اس کے بچے چھین کر ستایا ہے؟ اس کو اس کے بچے لوٹا دو''۔

یعنی محض اپنی تفریح کے لیے پرندوں اور جانوروں کو قید کرنے سے منع فرما دیا، نیز ایک حدیث پاک میں مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے سفر کے دوران چیونٹیوں کا ایک غول دیکھا، جس کو رُفقاءِ سفر نے جلا دیا، آپ ﷺ نے ناراضی کا اِظہار کرتے ہوئے دریافت فرمایا:

"مَنْ حَرَّقَ هٰذِهٖ؟ قُلْنَا: نَحْنُ، قَالَ: إِنَّهٗ لَا يَنْبَغِيْ أَنْ يُعَذِّبَ بِالنَّارِ إِلَّا رَبُّ النَّارِ". (رواه أبو داود: ٢/٤١٧، مشكوٰة:٣٠٧)

''کس نے ان کو جلایا؟ رُفقاءِ سفر نے جواب دیا کہ ہم نے جلایا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ آگ کے رب کے علاوہ کسی دوسرے کو آگ کا عذاب دینے کا حق نہیں''۔

علاوہ ازیں رحمۃ للعالمین ﷺ نے ایک موقع پر بے زبان جانوروں کے متعلق یہ تاکید فرمائی کہ دورانِ سفر ہریالی میں جانور کو چرنے کا موقع دیا جائے اور خشک سالی میں جانور کو تیز بھگایا جائے، تاکہ منزل پر پہنچ کر جانور کو چارہ اور پانی جلد حاصل ہو سکے، نیز فرمایا کہ جب تم رات میں کہیں قیام کرو تو راستہ سے ہٹ کر ٹھہرو، کیوں کہ یہ رات میں جانوروں کی گزرگاہ اور حشرات الارض کا ٹھکانہ ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم سے اُنہیں یا اُن سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچ جائے، چنانچہ ارشادِ نبوی ہے:

إِذَا سَافَرْتُمْ فِي الْخِصْبِ فَأَعْطُوا الْإِبِلَ حَظَّهَا مِنَ الْأَرْضِ، فَإِذَا سَافَرْتُمْ فِي السَّنَةِ فَبَادِرُوْا بِهَا نِقْيَهَا، وَ إِذَا عَرَّسْتُمْ بِاللَّيْلِ فَاجْتَنِبُوا الطَّرِيْقَ، فَإِنَّهَا طُرُقُ الدَّوَابِّ وَ مَأْوَى الْهَوَامِّ بِاللَّيْلِ". (رواه مسلم : ٢/١٤٤)

ان واقعات اور ہدایات سے آپ ﷺ کا حیوانات اور بے زبان جانوروں کے لیے رحمت ہونا ثابت ہوتا ہے، اس لیے فرمایا: ﴿وَ مَآ أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ اور

"إِنَّمَا أَنَا رَحْمَةٌ مُّهْدَاةٌ".

واقعہ یہ ہے کہ جس طرح آسمان سے برسنے والی بارش سے ہر مخلوق فیض یاب ہوتی ہے اسی طرح رحمۃ للعالمین ﷺ کی بارانِ رحمت سے ہر مخلوق فیض یاب ہوئی، حالی مرحوم نے کیا خوب کہا ہے:

رہا اس سے محروم آبی نہ خاکی ہری ہوگئی ساری کھیتی خدا کی

انسانیت کے لیے رحمت:

غور کیا جائے! جس ذاتِ اقدس کی طرف سے کائنات کی ساری مخلوقات و حیوانات کے ساتھ رحم و کرم کی ایسی تلقین و تاکید کی گئی ہو اس کی تعلیمات و ہدایات اور رحمت و عنایت سے انسانیت کیسے محروم رہ سکتی ہے؟ آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے انسانیت دَم توڑ رہی تھی، ہلاکت کے آخری کنارے پر تھی، قرآن کے بیان کے مطابق: ﴿وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ﴾ (آل عمران:١٠٣) لوگ ایک دوسرے کی جان کے دشمن اور خون کے پیاسے تھے، آپ ﷺ نے کلامِ الٰہی کے حوالے سے دنیا والوں کو انسانی جان کی قدر و قیمت و اہمیت بتائی، چنانچہ فرمایا:

﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۖ وَ مَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَآ أَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا﴾ (المائدة:٣٢)

کسی بھی انسان کو ناحق قتل کرنا ساری انسانیت کو قتل کرنے کے برابر جرم ہے، اور کسی معصوم اور مظلوم کی جان بچالینا ساری انسانیت کو بچانے کے برابر اہمیت رکھتا ہے، اسی کے ساتھ آپ ﷺ نے انسانیت کو قرآنِ کریم کی روشنی میں ایک ایسی تدبیر بتائی جس پر عمل کرنے سے آپسی دشمنی دوستی میں بدل سکتی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَ بَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ﴾ (حمٓ السجدة : ٣٤)

لوگو! برائی کا بدلہ اگر بھلائی سے دیا جائے تو دشمنی دوستی سے بدل جائے۔ علاوہ ازیں انسانیت کی صلاح وفلاح کے لیے آپ ﷺ نے حکم الٰہی سنایا کہ

﴿ تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ۪ وَ لَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ﴾ (المائدة:۲)

نیکی، بھلائی اور خوبی کے کاموں میں ایک دوسرے کا ساتھ دو، اس کے برخلاف گمراہی و برائی کے کسی بھی کام میں کوئی کسی کا ساتھ بالکل نہ دے۔

اس قسم کی اور بھی آپ ﷺ کی بہت سی ہدایات وتعلیمات ہیں جو انسانیت کے حق میں واقعی رحمت ہیں، اس لیے فرمایا: ﴿وَ مَآ أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ اور "إِنَّمَا أَنَا رَحْمَةٌ مُهْدَاةٌ".

انسانیت کے مختلف طبقات کے لیے رحمت:

آپ ﷺ نے اِتنے ہی پر اکتفاء نہیں فرمایا بلکہ انسانیت کے مختلف کمزور طبقات مثلاً غلاموں، قیدیوں، بیواؤں، بیٹیوں اور یتیموں کی طرف خصوصی طور پر توجہ دلا کر ان کے ساتھ رحم وکرم اور حسن سلوک کی تاکید فرمائی، اس لیے کہ دورِ جاہلیت میں غلاموں، مزدوروں اور قیدیوں کے ساتھ جانوروں سے زیادہ بدتر سلوک کیا جاتا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ غلاموں کی خوراک اور لباس مالکوں کے ذمہ ہے، اور فرمایا کہ غلاموں سے ان کی طاقت سے زیادہ کام نہ لیا جائے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " لِلْمَمْلُوْكِ طَعَامُهٗ وَ كِسْوَتُهٗ، وَ لَا يُكَلَّفُ مِنَ الْعَمَلِ إِلَّا مَا يُطِيْقُ".

(رواه مسلم، مشكوٰة: ۲۹۰، باب النفقات و حق المملوك)

ایک موقع پر فرمایا کہ تمہارے غلام بھی انسانی رشتہ سے تمہارے بھائی ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے بطورِ امتحان تمہارے ماتحت رکھا ہے، لہٰذا جو کھانا تم کھاتے ہو وہی ان کو بھی کھلاؤ اور جس طرح تم صاف ستھرا اور مکمل لباس پہنتے ہو اسی طرح ان کو بھی پہناؤ اور ان پر زیادہ

بوجھ نہ ڈالو۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ:۲۹۰)

ایک موقع پر غلاموں سے ہونے والی کوتاہیوں اور غلطیوں سے متعلق فرمایا کہ دن میں کم از کم ستر مرتبہ اُنہیں معاف کردو۔

"قَالَ: اُعْفُوْا عَنْهُ كُلَّ يَوْمٍ سَبْعِيْنَ مَرَّةً". (رواه أبوداود و الترمذي، مشكوٰة:۲۹۲)

آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے بلا جرم اپنے غلام کو مارا تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اس غلام کو آزاد کردے: "فَإِنَّ كَفَّارَتَهٗ أَنْ يُعْتِقَهٗ". (متفق عليه، مشكوٰة:۲۹۳، كتاب العتق)

اتنا ہی نہیں؛ بلکہ غلاموں اور قیدیوں کو آزاد کرنے والے کو جنت کی بشارت بھی سنائی۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ:۲۹۳، کتاب العتق)

ایک مرتبہ کسی دیہاتی نے خدمت اَقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا: حضور! مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجئے جو مجھے جنت میں داخل کرا دے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم نے سوال بہت چھوٹا اور مختصر سا کیا؛ لیکن بات نہایت اہمیت والی دریافت کی، پھر فرمایا: "أَعْتِقِ النَّسَمَةَ وَ فُكَّ الرَّقَبَةَ". (رواه البيهقي، مشكوٰة:۲۹۳) تم اپنے ذاتی غلام کو یا اپنی طرف سے کسی بھی غلام کو آزاد کردو، یا غلامی وقید سے آزادی دلانے کے لیے تم معاون بن جاؤ۔

جہاں تک بیواؤں کی بات ہے تو رحمۃ للعالمین ﷺ کی بعثت سے قبل بیواؤں کی دوبارہ شادی اور انہیں باوقار زندگی دینے کا کوئی تصور ہی نہیں تھا، اِن حالات میں آپ ﷺ نے خود بھی بیواؤں سے نکاح فرمائے اور حضرات صحابہؓ کو بھی اس کی تاکید فرمائی، اور اس طرح بیواؤں کو دوبارہ نکاح میں لا کر ایک باعزت اور باوقار زندگی عطا فرمائی۔ حقیقت یہ ہے کہ بیواؤں کی مدد کا اس سے بہتر اور باعزت طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے ساتھ نکاح کیا جائے یا کرایا جائے، چنانچہ آپ ﷺ نے اسی طریقہ کو اختیار فرمایا۔

نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ بیواؤں اور مسکینوں کے لیے تگ ودَو کرنے والا، ان کی ضروریاتِ زندگی کے لیے کوشش وانتظام کرنے والا ایسا ہے جیسے مجاہد فی سبیل اللہ پر خرچ

کرنے والا یا جیسے کوئی رات بھر نمازیں پڑھے اور دن بھر روزہ رکھے۔

عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " السَّاعِیْ عَلَى الْأَرْمِلَةِ وَ الْمِسْكِيْنِ كَالسَّاعِیْ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، وَ أَحْسِبُهٗ قَالَ: كَالْقَائِمِ لَا يَفْتُرُ وَ كَالصَّائِمِ لَا يُفْطِرُ". (متفق علیه، مشکوٰة: ٤٢، باب الشفقة والرحمة على الخلق)

نبوی معاشرے کی ایک بیوہ کا واقعہ:

بیواؤں کے بارے میں اس طرح کی ہدایات وترغیبات کا اثر مدنی معاشرے پر کیا ہوا تھا اُسے ایک واقعے سے سمجھیں:

غزوۂ موتہ سے واپسی کا منظر ہے کہ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا مجاہدین کی واپسی کی خبریں سن رہی ہیں، اپنے پیارے شوہر حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھی ہیں، اپنے بچوں کو بھی تیار کر لیا ہے، دور سے آہٹ کی آواز سنائی دے رہی ہے، لیکن جب یہ دیکھتی ہیں کہ یہ جعفر نہیں، بلکہ نبی پاک ﷺ کی ذاتِ اقدس ہے، حضرت اسماء رضی اللہ عنہا آثار ہی سے سمجھ جاتی ہیں کہ ان کی زندگی کے ہم سفر، ہجرت کے ساتھی اور پیارے شوہر حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ اُن سے بچھڑ چکے ہیں۔

یہی معاملہ ہمارے معاشرے میں ہوتا تو حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کو پوری زندگی بچوں کے ساتھ تنہا حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا؛ لیکن وہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے تربیت یافتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا وسعت ظرفی والا دور تھا، ایک مسلمان بیوہ کو کیسے ان حالات میں در در کے دھکے کھانے کے لیے اَکیلا چھوڑ دیا جاتا؟ یارِ غار، انبیاءِ کرام علیہم السلام کے بعد سب سے اَفضل شخصیت یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اُنہیں اپنی زوجیت میں لے لیا اور بچوں کو باپ جیسی شفقت اور محبت میسر ہوئی، اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک بیٹا بھی عطا فرمایا، پھر کچھ عرصہ بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وصال ہو گیا، حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے غسل دلوایا۔

دو دفعہ بیوہ ہونا ہمارے تنگ معاشرے کے لیے تو اَن ہونی بات ہے، وہ غیرت مند حضرات ان باتوں سے خوب واقف تھے، اس لیے مسلمان عورت کو فوراً معاشرتی دھارے میں ہم آہنگ کر لیا جاتا تھا، تاکہ اسے تنِ تنہا نفسیاتی اور جذباتی جنگ نہ لڑنی پڑے۔

اس دفعہ آگے بڑھنے والا غیرت کا پیکر کوئی اور نہیں؛ بلکہ شیرِ خدا، ابوتراب، فاتح خیبر حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، آپ رضی اللہ عنہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے چھوٹے بھائی بھی تھے، آپ رضی اللہ عنہ نے صرف بھتیجوں کی کفالت ہی نہیں کی؛ بلکہ فرزند ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھی اُسی محبت سے پالا جیسے اپنے بھتیجوں کو پالا۔

(مستفاد از سیر الصحابہ: ۱۴۸/۱۰)

یہ کیسا معاشرہ تھا جو ایسی عورت کے حقوق کا بھی محافظ تھا، یہ سن کر رَشک آتا ہے، ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں پیدا ہونے کی خواہش تو کرتے ہیں اور ان جیسا بننا بھی چاہتے ہیں؛ لیکن جب نفس پر زد آتی ہے تو خاموشی کی چادر اوڑھ لیتے ہیں۔

بیوہ اور اس کے بچوں کو تحفظ دینا اُس معاشرہ میں ایسا عام تھا کہ اس کے لیے کوئی تقریر کرنے، کوئی مہم چلانے اور کوئی حکمت عملی بنانے کی ضرورت نہیں تھی، جب کہ ہمارا معاشرہ اور ہمارے رویے؟ الامان والحفیظ!!!

ایک اور واقعہ:

ایک اور پاک باز صحابیہ حضرت عاتکہ رضی اللہ عنہا کی مثال پیش کرنا چاہوں گا، آپ کا پہلا نکاح حضرت عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہ سے ہوا، آپ رضی اللہ عنہا بہت خوبصورت تھیں، اور اس جوڑے کی محبت عرب میں ایک مثال بن گئی تھی، حضرت عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہ نے ایک دِن محبت میں آ کر ان سے عہد کروا لیا کہ اگر میں تمہاری زندگی میں وفات پا گیا تو تم دوسرا نکاح نہیں کرو گی، پھر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کچھ عرصہ بعد شہید ہو گئے؛ لیکن اس معاشرہ میں بیوہ خاتون کو تنہا چھوڑنے کی مثال محیر العقول تھی، اس لیے بڑوں کے سمجھانے پر آپ رضی اللہ عنہا نکاحِ ثانی کے لیے راضی ہو گئیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو آپ رضی اللہ عنہا کے چچا زاد بھائی بھی تھے، انہوں نے حضرت عاتکہ رضی اللہ عنہا کو

اپنے نکاح میں لے لیا، کچھ عرصہ بعد حضرت عمرؓ بھی شہید ہوگئے، عدت پوری ہونے کے بعد یکے از عشرۂ مبشرہ صحابی حضرت زبیر بن عوامؓ نے نکاح کا پیغام بھیجا، اور اب حضرت عاتکہؓ ان کے نکاح میں آگئیں، کچھ عرصہ بعد حضرت زبیرؓ نے بھی جامِ شہادت نوش فرمایا۔

آپ رضی اللہ عنہا کے بارے میں عرب میں مشہور ہوگیا تھا کہ جسے شہادت کی تمنا ہو وہ آپ رضی اللہ عنہا سے نکاح کرلے، اسی مناسبت سے آپؓ کو شہداء کی زوجہ کہا جاتا تھا۔ اس عظیم مثال کا ہم اپنے معاشرے سے مقابلہ کرلیں!

اللہ، اللہ، وہ کیسا زندہ دِل معاشرہ تھا، اور ہمارا معاشرہ کتنا تنگ نظر اور تنگ دل ہے، ایسا معاشرہ جہاں بیوہ کو تن تنہا حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے، جن مشکلات ومصائب کے پہاڑ تلے، مردوں کی غلط نظروں اور عورتوں کے طعنوں کے ساتھ یہ خواتین زندگی گزارتی ہیں اس کی تفصیل ہم اپنے اِردگرد، اپنے خاندان یا اپنے محلّہ کی کسی بھی بیوہ سے سن سکتے ہیں۔

ہم کب تک تن آسانیوں، مصلحتوں اور بے جا خوف کا شکار رہیں گے؟ صرف صحابہ کرامؓ کے دور کی بات کرنے یا ان کی مثالیں دینے سے اس دور کے ثمرات اور برکات حاصل نہیں ہوں گے، بلکہ انہیں عملی طور پر ہر شعبے میں رَفتہ رَفتہ نافذ کرنے سے یہ سب کچھ حاصل ہوگا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہماری طرح گفتار کے غازی نہیں؛ بلکہ کردار کے غازی تھے۔

رہی بات بیٹیوں کی، تو دورِ جاہلیت میں ان کی پیدائش کو ذلت سمجھا جاتا تھا، قرآن کہتا ہے:

﴿ وَ إِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ ۝﴾ (النحل:۵۸)

لڑکیوں کو زمین میں زندہ دفن کردیا جاتا تھا، یا پھر ذلیل اور رُسوا کیا جاتا تھا، ایسے سنگین وقت میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے دو بیٹیوں (اور طبرانی میں ایک کا بھی

ذکر ہے) پرورش وتربیت کی، یہاں تک کہ وہ بلوغ کی عمر کو پہنچیں، تو وہ قیامت کے دن میرے ساتھ اس طرح ہوگا جیسے شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی ہے۔

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتّٰى تَبْلُغَا، جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَنَا وَ هُوَ هٰكَذَا، وَ ضَمَّ أَصَابِعَهٗ". (رواہ مسلم، مشکوٰۃ:۴۲۱)

جہاں تک معاملہ ہے یتیموں کا تو دورِ جاہلیت میں وہ نہایت عاجزی، بےکسی اور بےبسی کی زندگی گزار رہے تھے آپ ﷺ نے لوگوں کو ان کی طرف متوجہ کیا اور فرمایا کہ جو شخص کسی یتیم کی کفالت کرے گا وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "أَنَا وَ كَافِلُ الْيَتِيْمِ لَهٗ وَ لِغَيْرِهٖ فِي الْجَنَّةِ هٰكَذَا، وَ أَشَارَ بِالسَّبَّابَةِ وَ الْوُسْطٰى، وَ فَرَّجَ بَيْنَهُمَا شَيْئًا". (رواہ البخاری، مشکوٰۃ: ۴۲۲)

چھ اہم اعمال پر جنت میں حضور ﷺ کی معیت کی بشارت:

علماء نے کتاب وسنت کی روشنی میں چھ اعمال ایسے ذکر فرمائے ہیں جن پر عمل کرنے سے جنت میں حضور پاک ﷺ کی معیت نصیب ہونے کی بشارت دی گئی ہے:

(۱) بیٹی کی بہترین دینی تربیت، جیسا کہ مسلم شریف میں حضرت انسؓ کی روایت سے معلوم ہوا۔ (۲) یتیم کی کفالت، جیسا کہ بخاری میں حضرت سہل بن سعدؓ کی روایت سے ثابت ہوا۔ (۳) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَأُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ﴾ (النساء: ۶۹)

(۴) حضور ﷺ سے محبت مع اتباعِ سنت، حدیث میں ہے:

"مَنْ أَحَبَّ سُنَّتِيْ فَقَدْ أَحَبَّنِيْ، وَ مَنْ أَحَبَّنِيْ كَانَ مَعِيَ فِي الْجَنَّةِ." (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ: ۳۰، کتاب الاعتصام بالسنۃ)

"جس نے میری سنت سے محبت کی (اس کا اتباع کیا) اس نے مجھ سے محبت کی

(کیوں کہ حضور ﷺ سے محبت کی بڑی علامت اتباعِ سنت ہے) اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔"

(۵) سجدوں (یعنی نوافل) کی کثرت، حضرت ربیعہ بن کعبؓ نے جب حضور ﷺ سے جنت میں آپ کی معیت کا سوال کیا تو ارشاد فرمایا کہ " فَأَعِنِّيْ عَلٰى نَفْسِكَ بِكَثْرَةِ السُّجُوْدِ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٨٤)

(٦) سچائی اور امانت داری کے ساتھ تجارت، حدیث پاک میں مروی ہے:

عَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍؓ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "التَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْأَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَاءِ". (رواه الترمذي، مشكوٰة:٢٤٣)

پوری سچائی اور امانت داری سے تجارت کرنے والا شخص انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔

" اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ الْفَوْزَ فِي الْقَضَاءِ، وَ نُزُلَ الشُّهَدَاءِ، وَ عَيْشَ السُّعَدَاءِ، وَ مُرَافَقَةَ الْأَنْبِيَاءِ، وَ النَّصْرَ عَلَى الْأَعْدَاءِ، إِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَاءِ". (الحزب الأعظم)

اس موقع پر یاد رکھیں کہ قرآن وحدیث میں جن اعمال پر جنت میں حضور ﷺ کی معیت کی بشارت آئی ہے تو اس سے مراد ایک خاص معیت، قربت، صحبت اور زیارت ہے، مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص جنت کے اپنے درجے میں رہتے ہوئے حسب ضرورت وموقع رحمۃ للعالمین ﷺ کی ملاقات وزیارت کا شرف پا سکے گا، جس طرح دنیا میں آپ ﷺ کی ملاقات وزیارت سے حضراتِ صحابہؓ مشرف ہوتے تھے، تو یہ بھی بہت بڑی بات ہے۔ (مستفاد از: مرقاۃ شرح مشکوٰۃ: ۹/۲۵۱)

الغرض یہ وہ حقائق ہیں جن سے حضور ﷺ کا انسانیت کے مختلف طبقات کے حق میں رحمت ہونا ثابت ہوتا ہے، اس لیے حق تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَ مَآ أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾

کفار کے لیے دنیا میں رحمت:

آپ ﷺ اپنی امت کے کفار کے لیے بھی دنیا میں اس اعتبار سے رحمت ثابت ہوئے کہ آپ ﷺ سے پہلے جب حضرات انبیاءِ کرام علیہم السلام کی اُمتیں ایمان قبول نہ کرتیں اور حق کا انکار کرتیں تو ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آجاتا اور نبی کی موجودگی ہی میں سبھی منکرین وکافرین کو ہلاک کردیا جاتا تھا، قرآنِ کریم نے ایک جگہ ان کا اجمالی طور پر ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ أَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْأَرْضَ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ أَغْرَقْنَا ۚ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ۝﴾ (العنكبوت : ٤٠)

"ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ کے سبب پکڑ لیا، ان میں سے بعض پر ہم نے تیز ہوا بھیج دی"، جو آندھی کی صورت میں آئی اور اُنہیں ہلاک کر دیا، یہ قومِ عاد کے ساتھ ہوا، یہ ہوا اُن پر سات رات اور آٹھ دِن مسلط رہی، جیسا کہ سورۃ الحاقہ میں بیان فرمایا ہے، "اور بعض کو چیخ نے پکڑ لیا" اس سے قومِ ثمود مراد ہے، کمافی سورۃ ھود، پھر فرمایا: ﴿ وَ مِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْأَرْضَ﴾ "اور ہم نے بعض کو زمین میں دھنسا دیا" اس میں قارون کی ہلاکت کی طرف اشارہ ہے، جس کا ذکر سورۂ قصص کے آخر میں ہے۔ ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ أَغْرَقْنَا﴾ "اور بعض کو ہم نے غرق کر دیا" اس میں فرعون اور اس کی قوم کی ہلاکت کا ذکر ہے۔ ﴿ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ "اور اللہ نے تو ان پر ظلم نہیں فرمایا"، یعنی اس نے کسی کو بغیر گناہ کے عذاب نہیں دیا، لیکن لوگوں نے خود ہی حق کا انکار کر کے اپنے اوپر ظلم کیا اور اس کے نتیجے میں وہ ہلاک ہوئے۔

یہ سب پچھلی اُمتوں کے کفار کے ساتھ ہوا، لیکن اس امت کے کفار پر حق تعالیٰ نے دنیا میں اس طرح کا کوئی بھی عمومی عذاب نازل نہیں فرمایا، حالانکہ اس امت کے کفار بھی اپنی

بداعمالیوں میں پچھلی اُمتوں کے مقابلہ میں کچھ پیچھے نہیں تھے، بلکہ دوقدم آگے ہی تھے، رحمۃ للعالمین ﷺ کو کفار نے کچھ کم نہیں ستایا، جس طرح ممکن ہوا تکلیفیں دیں، اس لیے ایک موقع پر رحمۃ للعالمین ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " لَقَدْ أُخِفْتُ فِيْ اللّٰهِ، وَ مَا يُخَافُ أَحَدٌ، وَ لَقَدْ أُوْذِيْتُ فِيْ اللّٰهِ، وَ مَا يُؤْذىٰ أَحَدٌ".

(رواه الترمذي، مشكوٰة:٤٤٨، باب فضل الفقراء)

"مجھے اللہ تعالیٰ کی خاطر جتنا ڈرایا گیا اتنا کسی اور کو نہیں ڈرایا گیا، اور مجھے اللہ تعالیٰ کی خاطر جتنی تکلیفیں دی گئیں اتنی کسی اور کو نہیں دی گئیں۔"

طائف کا واقعہ اس کی واضح دلیل ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اہلِ طائف کی بدسلوکیوں کے بعد جب آپ سے پیش کش کی گئی کہ اگر آپ چاہیں تو اس بد بخت بستی کو دو پہاڑوں کے درمیان پیس دیں، تب آپ ﷺ نے فرمایا:

" بَلْ أَرْجُوْ أَنْ يُخْرِجَ اللّٰهُ مِنْ أَصْلاَبِهِمْ مَنْ يَعْبُدُ اللّٰهَ وَحْدَهٗ، وَ لَا يُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا". (متفق عليه، مشكوٰة : ٥٢٣)

"اگر یہ لوگ ایمان نہیں لائے تو مجھے اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی نسلوں اور پشتوں میں مؤمنین اور موحدین پیدا فرمادیں۔"

حضرت حفیظ جالندھریؒ نے فرمایا:

اگر یہ لوگ آج اسلام پر ایمان نہیں لاتے — خدائے پاک کے دامن رحمت میں نہیں آتے
مگر نسلیں ضرور ان کی اسے پہچان جائیں گی — درِ توحید پر اِک روز آکر سر جھکائیں گی
میں ان کے حق میں کیوں قہرِ الٰہی کی دعا مانگوں — بشر ہیں، بے خبر ہیں، کیوں تباہی کی دعا مانگوں

طائف کے علاوہ غزوۂ اُحد کے موقع پر بھی آپ ﷺ پر پتھر برسائے گئے، مگر رحمۃ للعالمین ﷺ نے پھر بھی کفار کے لیے ہلاکت کے بجائے ہدایت کی دعا مانگی، ایک حدیث

پاک میں وارد ہے:

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ:" كَأَنِّيْ أَنْظُرُ إِلىٰ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يَحْكِيْ نَبِيًّا مِنَ الْأَنْبِيَاءِ، ضَرَبَهٗ قَوْمُهٗ، فَأَدْمَوْهُ، وَ هُوَ يَمْسَحُ الدَّمَ عَنْ وَجْهِهٖ، وَ يَقُوْلُ:" اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِيْ، فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٤٥٤)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ گویا میں اب بھی یہ دیکھ رہا ہوں کہ حضور ﷺ نے انبیاء میں سے کسی نبی کا ذکر فرمایا کہ جب ان کی قوم نے ان کو مارا اور لہولہان کر دیا، وہ نبی اپنے چہرے سے خون پونچھ رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ "اے اللہ! میری قوم کو اس بدسلوکی پر عذاب نہ دے، ان کی مغفرت فرمادے، اس لیے کہ وہ ناواقف ہیں۔"

محدثین کے بقول یہ واقعہ حضرت نوح علیہ السلام کا ہے، یا رحمۃ للعالمین ﷺ کا ہے، آپ ﷺ نے تواضعاً اس واقعہ کو ابہام اور اجمال کے ساتھ بیان فرمایا، بظاہر یہی قول راجح ہے۔

حضرت حفیظؒ فرماتے ہیں:

دعا مانگی: الٰہی! قوم کو چشم بصیرت دے — الٰہی! رحم کر ان پر، انہیں نورِ ہدایت دے
جہالت ہی نے رکھا ہے صداقت کے خلاف ان کو — بچارے بے خبر، انجان ہیں، کردے معاف ان کو

نیز ابولہب کی بیوی اُم جمیل آپ ﷺ کی راہوں میں کانٹوں والی لکڑیاں بچھا دیتی؛ مگر اس کے باوجود کبھی آپ ﷺ نے بددعا نہیں فرمائی، سورۂ لہب میں اس کا تذکرہ ہے۔

کسی شاعر نے کہا ہے:

راہ میں جس نے کانٹے بچھائے، گالی دی، پتھر برسائے — ان پر چھڑکی پیار کی شبنم، صلی اللہ علیہ وسلم
آئینۂ اَلطافِ الٰہی، رحمت جس کی لا متناہی — چشمِ کرم، اے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم

ایک موقع پر حضرات صحابہؓ نے آپ ﷺ کے ساتھ کفار ومشرکین کی بدسلوکیوں کو دیکھ کر عرض کیا کہ حضور! آپ ان بدبختوں کے لیے ہلاکت کی دعا فرما دیجئے، تو آپ ﷺ

نے فرمایا کہ نہیں، اللہ تعالیٰ نے مجھے لعنت اور ہلاکت کا ذریعہ بنا کر نہیں بھیجا، بلکہ رحمت کا ذریعہ بنا کر بھیجا ہے۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ؓ قَالَ: قِيلَ: "يَا رَسُولَ اللّٰهِ! أُدْعُ عَلَى الْمُشْرِكِينَ، قَالَ: إِنِّي لَمْ أُبْعَثْ لَعَّانًا، وَ إِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَةً". (رواه مسلم، مشكوٰة:۵۱۹)

اس سے آگے کی بات یہ ہے کہ ایک مرتبہ خود مشرکین مکہ میں سے ابوجہل اور نضر بن حارث وغیرہ نے اپنی ضلالت وشقاوت کا ثبوت دیتے ہوئے کہہ بھی دیا:

﴿ اَللّٰهُمَّ إِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝﴾ (الأنفال:۳۲)

"اے اللہ! یہ قرآن اور دین وایمان سب برحق ہیں اور واقعی تیری طرف سے ہیں تو ہمارے انکار پر آسمانی عذاب کیوں نہیں آتا؟"

تو چونکہ آپ ﷺ ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ پچھلی اُمتوں کی طرح اس امت پر بھی دنیا میں ایسا عمومی عذاب آئے جس سے بیک وقت ساری اُمت ہلاک ہو جائے، تو حق تعالیٰ نے آپ ﷺ کی تمنا کے موافق یہ فیصلہ فرمایا:

﴿ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ أَنْتَ فِيهِمْ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ۝﴾ (الأنفال : ۳۳)

"جب تک آپ ان میں موجود ہیں، یا آپ کے بعد جب تک اُمت کے گنہگار استغفار کا اہتمام کریں گے اللہ تعالیٰ کا عمومی عذاب نازل نہیں ہوگا۔"

آپ ﷺ اپنے زمانہ کے مشرکین وکفار کے علاوہ قیامت تک کے کفار کے لیے یہی خواہش رکھتے تھے کہ ان پر بھی ان کے کفر وشرک کے باوجود اللہ تعالیٰ کا عمومی عذاب نازل نہ ہو۔

ایک حدیث پاک میں وارد ہے، حضرت سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رحمۃ

للعالمین ﷺ کا گذر ایک مرتبہ انصار کے قبیلہ بنومعاویہ کی مسجد کے پاس سے ہوا، آپ ﷺ نے اس میں دو رکعات نماز ادا فرمائی، پھر ایک طویل دعا مانگی، جس میں بطورِ خاص تین دعائیں فرمائیں، جن میں سے دو قبول ہوئیں، اور ایک سے روک دیا گیا، آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگی کہ "أَنْ لَا يُهْلِكَ أُمَّتِي بِالسَّنَةِ" "میری امت کو قحط سالی سے بیک وقت ہلاک نہ فرما" یہ دعا قبول ہوگئی، دوسری دعا یہ مانگی کہ "أَنْ لَا يُهْلِكَ أُمَّتِي بِالْغَرَقِ" "میری اُمت کو غرقِ آب نہ فرما" یہ دعا بھی قبول ہوئی، البتہ تیسری دعا جو مانگی کہ "میری اُمت کا آپس میں جنگ وجدال نہ ہو" اس سے منع کر دیا گیا، یہ دعا اللہ رب العزت نے اپنی خاص حکمت سے مسترد فرما دی۔ (مسلم، مشکوٰۃ:۵۱۲)

ان حقائق سے ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ نے آپ ﷺ کی برکت سے آپ کے زمانہ اور قیامت تک کے کفار وفجار سے عمومی عذاب ہٹا لیا، اور اس طرح انہیں توبہ کی مہلت مل گئی، اس اعتبار سے آپ ﷺ کفار کے لیے دنیا میں رحمت ثابت ہوئے، اس لیے فرمایا: ﴿وَ مَآ أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِينَ﴾ اور "إِنَّمَا أَنَا رَحْمَةٌ مُهْدَاةٌ".

مؤمنین کے لیے دُنیا میں رحمت:

جہاں تک اُمتِ محمدیہ کے مؤمنین کی بات ہے تو قرآن نے خود ہی فرما دیا کہ ﴿بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝﴾ (التوبة:۱۲۸) مؤمنین کے لیے تو آپ ﷺ بڑے ہی شفیق ومہربان ہیں۔ حق تعالیٰ نے ﴿وَ مَآ أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِينَ﴾ میں تو آپ ﷺ کی رحمت عامہ کو بیان فرمایا، جس میں کفار بھی داخل ہیں، لیکن ﴿بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝﴾ میں آپ ﷺ کی رحمت خاصہ کو بیان فرمایا، جس سے اُمت کے مؤمنین کو فائدہ اور نفع پہنچا، چنانچہ آپ ﷺ کی برکت ورحمت خاصہ سے اُمت مسلمہ کو خصوصی فضائل ملے، نیز اُمت مسلمہ پر سخت اَحکام نازل نہ ہونا بھی آپ ﷺ کی رحمت خاصہ کا اثر ہے، مثلاً پچھلی اُمتوں کے لیے مالِ غنیمت کا استعمال جائز نہیں تھا، لیکن اِس امت کے لیے مالِ غنیمت کو

حلال کردیا گیا: ﴿فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا﴾ (الأنفال: ٦٩)

پچھلی اُمتوں کی عبادتیں مخصوص جگہوں اور عبادت گاہوں کے علاوہ ادا نہیں ہوسکتی تھیں، لیکن حق تعالیٰ نے اس امت کے لیے روئے زمین کی تمام پاک جگہوں کو جائے نماز بنا دیا، نیز پچھلی اُمتوں کے لیے پانی کے علاوہ پاکی حاصل کرنے کا اور کوئی طریقہ نہیں تھا، لیکن اس اُمت کے لیے طہارت کے لیے بوقتِ ضرورت تیمّم کی اجازت ہے، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " فُضِّلْنَا عَلَى النَّاسِ بِثَلَاثٍ، جُعِلَتْ صُفُوْفُنَا كَصُفُوْفِ الْمَلَائِكَةِ، وَ جُعِلَتْ لَنَا الْأَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِدًا، وَ جُعِلَتْ تُرْبَتُهَا لَنَا طَهُوْرًا، إِذَا لَمْ نَجِدِ الْمَاءَ". (رواه مسلم، مشكوٰة: ٥٤)

''ہمیں دیگر امم پر جو فضیلتیں ملیں ان میں سے یہ ہے کہ ہماری نماز (یا جہاد) کی صفوں کو فرشتوں کی صفوں کی طرح باعظمت قرار دیا گیا اور ہمارے لیے تمام زمین کو مسجد قرار دیا گیا، نیز زمین کی مٹی کو ہمارے لیے پاکی حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا گیا۔

بنی اسرائیل کے لیے حکم یہ تھا کہ اگر کپڑے وغیرہ میں ناپاکی لگ جائے تو اتنے حصے کو کاٹ دیا جائے، یہی اس کی پاکی کا طریقہ تھا۔

" إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَوْلُ قَرَضُوْهُ بِالْمَقَارِيْضِ". (أبوداود، مشكوٰة: ٤٤)

لیکن اس اُمت کے لیے یہ ہے کہ پانی وغیرہ سے اگر دھولیا تب بھی پاکی حاصل ہو جائے گی۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہِ طور پر جانے کے بعد بنی اسرائیل نے جب بچھڑے کی عبادت شروع کردی، تو انہیں توبہ کا حکم دیتے ہوئے ارشاد ہوا:

﴿ فَتُوْبُوْآ إِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْآ أَنْفُسَكُمْ ط ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ط فَتَابَ عَلَيْكُمْ ط إِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُO﴾ (البقرة: ٥٤)

تم اپنے رب کی بارگاہ میں توبہ کرو، اور توبہ کی قبولیت کی شرط یہ ہے کہ آپس میں

ایک دوسرے کو قتل کرو، یہ ایک وقتی تکلیف ہے، جس کا سہہ لینا تمہارے لیے دوزخ کی تکلیف کے مقابلہ میں بہت آسان اور بہتر ہے۔ یہ ان کی توبہ تھی، لیکن اُمتِ محمدیہ کی توبہ کیا ہے؟ اپنے گناہوں پر ندامت اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ، اگر گناہ کا تعلق حقوق اللہ یا حقوق العباد سے ہو تو اس کو ادا کردینا، یہ اس امت کی توبہ ہے، جو بہت آسان ہے، الغرض آپ ﷺ کی رحمت خاصہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اُمت کے لیے احکام میں آسانی فرما دی، اور اتنا ہی نہیں، بلکہ اجر وثواب میں بہت زیادہ اِضافہ وزیادتی بھی فرما دی، مثلاً بدنی عبادات میں ایک نیکی کا اجر دس گنا بڑھا دیا، چنانچہ فرمایا:

﴿ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ أَمْثَالِهَا﴾ (الأنعام: ١٦٠)

مالی عبادات کا اُجر سات سو گنا کردیا، جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ﴾ (البقرة: ٢٦١)

اور اخلاص کے کمال پر بعض اعمال کا اجر وثواب اضعافاً مضاعفۃ فرما دیا:

﴿ وَ اللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ط وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌO﴾ (البقرة: ٢٦١)

جب کہ بعض مخصوص اعمال کا ثواب بےحساب فرمادیا، جیسے صبر کے متعلق ارشاد ہے:

﴿ إِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍO﴾ (الزمر: ١٠)

مزید برآں رحمۃ للعالمین ﷺ نے رب العالمین کی بارگاہ میں ایک مرتبہ یہ درخواست کی کہ ''یا اللہ! میں بھی ایک بشر ہوں، ممکن ہے کبھی بتقاضائے بشریت غصے میں کسی مؤمن کو سخت جملہ کہہ دیا ہو، یا کوئی اور تکلیف پہنچا دی ہو، یا اس پر لعنت و ملامت کی ہو، اگر ایسا ہوا ہے تو آپ اپنی رحمت سے یہ چیزیں زحمت کے بجائے رحمت میں تبدیل فرما دیجیے اور قیامت میں بعد کے بجائے قرب کا ذریعہ بنا دیجیے۔''

حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِنِّيْ اتَّخَذْتُ عِنْدَكَ عَهْدًا لَنْ تُخْلِفَنِيْهِ، فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ، فَأَيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ آذَيْتُهٗ، شَتَمْتُهٗ، لَعَنْتُهٗ، جَلَدْتُهٗ، فَاجْعَلْهَا لَهٗ صَلَاةً وَ زَكَاةً وَ قُرْبَةً تُقَرِّبُهٗ بِهَا إِلَيْكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ". (متفق عليه، مشكوٰة المصابيح: ۱۹۴، كتاب الدعوات)

ظاہر ہے کہ اعمال واحکام میں آسانی اور اَجر وثواب میں زیادتی کے ساتھ یہ دعاءِ رحمت آپ ﷺ کی رحمت خاصہ کا اثر ہے، اس لیے آپ ﷺ کی رحمت عامہ کو تو ﴿وَمَآ أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ اور "إِنَّمَا أَنَا رَحْمَةٌ مُّهْدَاةٌ" میں بیان فرما کر آپ ﷺ کی رحمت عامہ کی وجہ سے دنیا میں کفار کو عمومی عذاب سے محفوظ فرما دیا، تو رحمت خاصہ کے ذریعہ آخرت میں مؤمنین کو دائمی عذاب سے محفوظ فرما دیا۔

قیامت میں کفار کے لیے رحمت:

کتاب وسنت کے ان حقائق سے واضح ہو گیا کہ آپ ﷺ واقعی رحمۃ للعالمین ہیں، ساری کائنات کی مخلوقات کے لیے آپ ﷺ کی ذات وحیات اور آپ ﷺ کی ہدایات وتعلیمات رحمت ہیں یا رحمت کا سبب ہیں۔ رہی بات آخرت کی، تو وہاں کفار کے لیے آپ ﷺ کی شانِ رحمت کا ظہور شفاعت کبریٰ کی شکل میں ہوگا، جو تمام مخلوق کے حق میں حساب وکتاب شروع کرنے سے متعلق ہوگی، نیز اس شفاعت کی اجازت صرف رحمۃ للعالمین ﷺ کو دی جائے گی، آپ ﷺ کے علاوہ کسی بھی نبی یا فرشتہ کو اس کی جرأت نہیں ہوگی، اس شفاعت سے اہلِ محشر طویل وقوف کی تکلیف سے نجات پائیں گے۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے:

روزِ قیامت اللہ، اللہ، سب کی زباں پر نفسی نفسی
چھوڑ کے دامن جائیں کہاں ہم؟ صلی اللہ علیہ وسلم
اَرض وسما میں آیۂ رحمت، روزِ جزا میں سایۂ رحمت
اس کے لواءِ حمد کا پرچم، صلی اللہ علیہ وسلم

علاوہ ازیں بعض کفار کے لیے آپ ﷺ کی شفاعت کی برکت سے عذاب میں تخفیف کردی جائے گی، جیسا کہ ابوطالب کے متعلق منقول ہے۔ (بخاری، مشکوٰۃ: ۵۰۲)

البتہ آپ ﷺ کی شفاعت کے بعد جو عذاب طے ہو جائے گا پھر اس میں کسی قسم کی کوئی تخفیف نہیں ہوگی، اسی کو قرآن پاک میں فرمایا گیا: ﴿لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ﴾ (البقرة: ۱۶۲)

قیامت میں مؤمنین کے لیے رحمت:

جب آپ ﷺ کی شفاعت کی برکت سے قیامت میں کفار کو فائدہ ہوگا تو مؤمنین کو کیوں نہیں؟

دوستاں را کجا کنی محروم؟ کہ تو با دشمناں نظر داری

قیامت کے دِن آپ ﷺ کا مؤمنین کے لیے مختلف اعتبار سے رحمت ہونا ثابت ہے، مثلاً آپ ﷺ اُمت کے گنہگار مؤمنین کے حق میں شفاعت فرمائیں گے، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: "شَفَاعَتِيْ لِأَهْلِ الْكَبَائِرِ مِنْ أُمَّتِيْ". (رواه الترمذي، مشكوٰة: ۴۹۴)

''میری شفاعت میری اُمت کے مرتکبین کبائر کے لیے ہوگی۔''

ایک اور حدیث میں وارد ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: "أَسْعَدُ النَّاسِ بِشَفَاعَتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَنْ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، خَالِصًا مِنْ قَلْبِهٖ أَوْ نَفْسِهٖ". (رواه البخاري، مشكوٰة: ۴۸۹)

''قیامت کے دِن میری شفاعت کا سب سے زیادہ فائدہ اسی شخص کو ہوگا جس نے خالص دل کی گہرائیوں سے ''لا الٰہ الا اللہ'' کہا ہوگا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کے دن ہر مخلص مؤمن کو حضور ﷺ کی شفاعت

سے فائدہ ہوگا، ایک حدیث میں وارد ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" لِكُلِّ نَبِيٍّ دَعْوَةٌ مُسْتَجَابَةٌ، تَعَجَّلَ كُلُّ نَبِيٍّ دَعْوَتَهٗ، وَ إِنِّیْ اخْتَبَأْتُ دَعْوَتِیْ شَفَاعَةً لِأُمَّتِیْ إِلٰی يَوْمِ الْقِيَامَةِ، فَهِيَ نَائِلَةٌ -إِنْ شَاءَ اللّٰهُ- مَنْ مَاتَ مِنْ أُمَّتِیْ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا".

(رواہ مسلم، مشکوٰۃ: ۱۹٤)

''ہر نبی کے لیے ایک ایسی دعا ہوتی ہے جو قبول کی جاتی ہے، چنانچہ ہر نبی نے اپنی اس دعا کو نقد مانگ لیا، لیکن میں نے اپنی اس دعا کو اُمت مسلمہ کی شفاعت کی خاطر قیامت کے دِن کے لیے محفوظ رکھا ہے، ان شاء اللہ میری اس دعا (شفاعت) سے ہر اس مؤمن کو جس نے شرک نہیں کیا ہوگا ضرور فائدہ ہوگا۔''

اور اس طرح آپ ﷺ مؤمنین کے لیے قیامت میں رحمت ثابت ہوں گے، مولانا جلال الدین رومیؒ نے فرمایا:

بر محمدی رَسانم صد سلام — آں شفیع مجرماں یوم القیام

''اُن محمد ﷺ پر سینکڑوں سلام ہوں جو قیامت میں مجرموں کے شفیع ہوں گے۔''

صاحبو! بالیقین اہل ایمان قیامت میں یا تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بخشے جائیں گے، یا رحمۃ للعالمین ﷺ کی شفاعت سے۔ اللّٰھم اجعلنا منھم.

قیامت میں آپ ﷺ کی رحمت بشکل شفاعت:

احادیث مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں آپ ﷺ کی شانِ رحمت کا ظہور بشکل شفاعت ہوگا، آپ ﷺ کی شفاعت سے بروزِ قیامت ہر عام وخاص کو فائدہ ہوگا، علماء نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دِن رحمۃ للعالمین ﷺ دس طرح شفاعت فرمائیں گے:

(۱) پہلی شفاعت کبریٰ، جو میدانِ محشر کی ہولناکیوں سے نجات اور خلاصی کے لیے فرمائیں گے، جس سے ساری انسانیت کو نفع ہوگا، اور یہ شفاعت ساری انسانیت کے حق میں

رحمت ثابت ہوگی، حدیث پاک میں مذکور ہے کہ قیامت کے دن لوگ شفاعت کی اُمید پر حضرت آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے، مگر آپ منع فرمائیں گے، پھر حضرت نوح علیہ السلام کے پاس جائیں گے، تو وہ بھی منع کردیں گے، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جائیں گے، تو وہ بھی منع کردیں گے، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے، تو وہ بھی منع کردیں گے، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے، تو وہ بھی منع فرما دیں گے، اخیر میں رحمۃ للعالمین ﷺ کے پاس جائیں گے تو آپ ﷺ شفاعت فرمائیں گے، آپ ﷺ سے کہا جائے گا: "اِشْفَعْ، تُشَفَّعْ" (بخاری، مشکوٰۃ: ۴۸۸) ''آپ شفاعت کیجئے، آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔''

(۲) دوسری شفاعت اُمت کے خاص مؤمنین کو بلا حساب وکتاب جنت میں داخل کرانے کے لیے ہوگی، حدیث پاک میں ہے کہ آپ ﷺ کی شفاعت کے بعد حکم ہوگا:

"يَا مُحَمَّدُ! أَدْخِلْ مِنْ أُمَّتِكَ مَنْ لَا حِسَابَ عَلَيْهِمْ". (متفق عليه، مشكوٰة: ٤٨٩)

''اپنی اُمت کے اُن خاص لوگوں کو جن کا کوئی حساب نہیں جنت کے باب الایمن سے داخل کردو۔''

(۳) تیسری شفاعت ان لوگوں کے لیے ہوگی جن کی نیکیاں اور برائیاں دونوں برابر ہوں گی، رحمۃ للعالمین ﷺ ان کے لیے شفاعت فرمائیں گے ﴿خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَيِّئًا﴾ (التوبة: ١٠٢) یہ لوگ بھی آپ ﷺ کی شفاعت سے جنت میں داخل ہوجائیں گے۔ (مظاہر حق جدید: ۵/۱۳۷)

(۴) چوتھی شفاعت ان اہل ایمان کے حق میں ہوگی جو اپنی بداعمالیوں کے سبب جہنم کے مستحق ہوں گے، ان کی سزائیں کمی کرانے کے لیے آپ ﷺ شفاعت فرمائیں گے۔

(۵) پانچویں شفاعت اُمت کے اہل ایمان کے لیے جہنم سے نجات دِلانے کے لیے ہوگی، ایک حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" أَتَانِیْ آتٍ

مِنْ عِنْدِ رَبِّیْ، فَخَیَّرَنِیْ بَیْنَ أَنْ یُدْخِلَ نِصْفَ أُمَّتِیْ الْجَنَّةَ وَ بَیْنَ الشَّفَاعَةِ، فَاخْتَرْتُ الشَّفَاعَةَ، وَ هِيَ لِمَنْ مَاتَ لَا یُشْرِكُ بِاللّٰهِ". (رواه الترمذی، مشکوٰۃ: ٤٩٤)

”میرے پاس میرے رب کی طرف سے ایک فرشتہ آیا اور اس نے من جانب اللہ مجھے دو چیزوں کا اختیار دیا: (۱) یا تو آدھی اُمت کو جنت میں داخل کر دیا جائے۔ (۲) یا پھر پوری اُمت کے حق میں شفاعت کا اختیار دیا جائے۔ تو میں نے شفاعت کو پسند کیا، لہٰذا میری شفاعت سے مشرک کے سوا ہر شخص کو ضرور فائدہ ہوگا۔“

(۶) چھٹی شفاعت جنت کا دروازہ کھلوانے کے لیے ہوگی۔ (مسلم، مشکوٰۃ: ۵۱۱، باب فضائل سید المرسلین)

(۷) ساتویں شفاعت اہل ایمان کے رفع درجات کے لیے ہوگی۔

(۸) آٹھویں شفاعت ان مؤمنین کے لیے ہوگی جن کی موت مدینہ میں ہوئی ہو، ایک حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنِ اسْتَطَاعَ أَنْ یَمُوْتَ بِالْمَدِیْنَةِ فَلْیَمُتْ بِهَا، فَإِنِّیْ أَشْفَعُ لِمَنْ یَمُوْتُ بِهَا". (رواه الترمذی، مشکوٰۃ: ٢٤٠)

”جو شخص مدینہ میں مر سکتا ہو تو وہ مدینہ ہی میں مرے، اس لیے کہ میں مدینہ میں مرنے والوں کے لیے شفاعت کروں گا۔“

مطلب یہ ہے کہ جس کی عمر زیادہ ہو جائے یا جسے کشف وغیرہ کے ذریعہ اپنی موت کا اندازہ ہو جائے، تو ایسے شخص کو حتی الامکان موت کے انتظار میں مدینہ میں مقیم ہو جانا چاہیے۔ (اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا شَهَادَةً فِیْ سَبِیْلِكَ، وَ اجْعَلْ مَوْتَنَا فِیْ بَلَدِ رَسُوْلِكَ، آمین)

(۹) نویں شفاعت روضۂ اقدس کے زائرین کے لیے ہوگی، حدیث میں ہے:

"مَنْ زَارَ قَبْرِیْ، وَجَبَتْ لَهٗ شَفَاعَتِیْ".

(رواه ابن خزیمة فی صحیحه، معارف الحدیث: ٤/٤٩٤)

”جو شخص ایمان (وآدابِ اخلاص) کے ساتھ میری قبر کی زیارت کرے گا اس کے لیے میری شفاعت واجب ہوگی۔ (رزقنا اللّٰه بمنّه و فضله، آمین)

(۱۰) دسویں شفاعت دائمی عذاب پانے والوں کے عذاب میں تخفیف کرانے کے لیے ہوگی۔ (مستفاد از: مظاہر حق جدید: ۵/۱۳۷) اللّٰهم ارزقنا شفاعة حبیبك محمد ﷺ. آمین.

ان حقائق سے واضح ہو گیا کہ آپ ﷺ واقعی رحمۃ للعالمین ہیں، اس لیے فرمایا: ﴿وَ مَآ أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ اور "إِنَّمَا أَنَا رَحْمَةٌ مُهْدَاةٌ".

سچ کہا ہے:

آئے دنیا میں بہت پاک مکرم بن کر — کوئی آیا نہ مگر رحمتِ عالم بن کر

اگر ہماری یہ چاہت ہے کہ آپ ﷺ کی رحمت سے ہمیں دارین میں نفع حاصل ہو، تو ضروری ہے کہ ہم آپ ﷺ کی ہدایات وتعلیمات سے وابستہ ہو جائیں۔

حق تعالیٰ ہمیں توفیقِ عمل عطا فرما کر دارین میں اپنی اور اپنے حبیب پاک ﷺ کی رحمت کا حق دار بنا دیں۔ آمین۔

۱۴/ ربیع الاول/ ۱۴۴۰ھ/ بروز: جمعہ
مطابق: ۲۳/ نومبر/ ۲۰۱۸ء (بزمِ صدیقی، بڑودا)

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِیْرًا — فَصَلُّوْا عَلَیْهِ كَثِیْرًا كَثِیْرًا

تو کجا من کجا

از: مظفر وارثی

تو امیر حرم، میں فقیر عجم — تیرے گن اور یہ لب، میں طلب ہی طلب
تو عطا ہی عطا، میں خطا ہی خطا — تو کجا من کجا، تو کجا من کجا
تو ہے احرامِ انوار باندھے ہوئے — میں درودوں کی دستار باندھے ہوئے
کعبۂ عشق تو، میں تیرے چار سو — تو اثر، میں دعا، تو کجا من کجا
میرا ہر سانس تو خوں نچوڑے میرا — تیری رحمت مگر دل نہ توڑے میرا
کاسۂ ذات ہوں، تیری خیرات ہوں — تو سخی، میں گدا، تو کجا من کجا
تو حقیقت ہے، میں صرف احساس ہوں — تو سمندر، میں بھڑکی ہوئی پیاس ہوں
میرا گھر خاک پر، اور تیری رہ گزر — سدرۃ المنتہیٰ، تو کجا من کجا
ڈگمگاؤں جو حالات کے سامنے — آئے تیرا تصور مجھے تھامنے
میری خوش قسمتی، میں تیرا اُمتی — تو جزا، میں رضا، تو کجا من کجا
دوریاں سامنے سے جو ہٹنے لگیں — جالیوں سے نگاہیں لپٹنے لگیں
آنسوؤں کی زبان ہے میری ترجمان — دل سے نکلے صدا: تو کجا من کجا
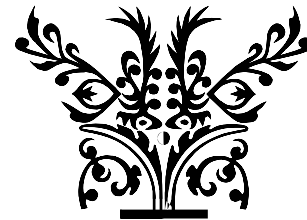
(۱۶)

متقیوں کے چند اَوصاف

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ أَبِي هُرَيۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "يَنۡزِلُ رَبُّنَا تَبَارَكَ وَ تَعَالىٰ كُلَّ لَيۡلَةٍ إِلَى السَّمَاءِ الدُّنۡيَا حِيۡنَ يَبۡقىٰ ثُلُثُ اللَّيۡلِ الاٰخِرُ، يَقُوۡلُ: "مَنۡ يَدۡعُوۡنِيۡ فَأَسۡتَجِيۡبَ لَهٗ؟ مَنۡ يَسۡئَلُنِيۡ فَأُعۡطِيَهٗ؟ مَنۡ يَسۡتَغۡفِرُنِيۡ فَأَغۡفِرَ لَهٗ؟

(متفق علیه، مشکوٰۃ: ۱۰۹، باب التحریض علی قیام اللیل)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ رب العزت (کا حکم یا اس کی رحمت یا اس کا فرشتہ) ہر رات آخری حصہ میں آسمانِ دنیا پر نازل ہو کر فرماتا ہے کہ کون مجھے پکارتا ہے (مجھ سے دعا کرتا ہے) کہ میں اس کی دعا قبول کروں، کون مجھ سے سوال کرتا ہے کہ میں اسے عطا کروں، اور کون مجھ سے مغفرت طلب کرتا ہے کہ میں اس کی مغفرت کردوں۔"

اللہ تعالیٰ کے پیاروں کی بنیادی نشانی:

اللہ رب العزت نے قرآنِ کریم میں اپنے پیاروں کی بنیادی نشانی تقویٰ اور پرہیزگاری بیان فرمائی ہے: ﴿إِنۡ أَوۡلِيَآؤُهٗ إِلَّا الۡمُتَّقُوۡنَ ۝﴾ (الأنفال: ۳۴) لیکن تقویٰ

دل کی ایک خاص پوشیدہ کیفیت کا نام ہے، جیسا کہ حدیث پاک میں ہے کہ "التقویٰ ھٰھُنَا". (رواہ مسلم، مشکوٰۃ:۴۲۲) اور دل کی اس خاص پوشیدہ کیفیت کا علم اللہ رب العزت کے علاوہ کسی کو نہیں ہوتا، اس لیے حق تعالیٰ نے خود ہی اپنے پیاروں اور متقیوں کے چند اوصاف بیان فرما کر قرآن پاک کے ذریعہ ان کی پہچان کرادی، چنانچہ آخرت میں حق تعالیٰ اپنے پیاروں اور متقیوں کو جو انعامات عطا فرمائیں گے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ إِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ○﴾ (الذاریات:۱۵)

متقی لوگ بلاشبہ باغوں اور چشموں میں اس طرح رہیں گے کہ

﴿ اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ○﴾ (الذاریات:۱۶)

کہ ان کا پروردگار اُنہیں جو کچھ دے گا اسے وصول کر رہے ہوں گے، (اس لیے کہ) وہ لوگ اس سے پہلے ہی نیک عمل بحُسن وخوبی اَنجام دیتے تھے، ان کی زندگی کا مقصد نیکی، پرہیزگاری اور اللہ تعالیٰ کی بندگی تھا، وہ نیکی کے کاموں میں پیش پیش رہا کرتے تھے، یعنی نیک لوگوں کی بنیادی پہچان نیکی کا اہتمام ہے، اب نیکی کے کام تو بے شمار ہیں، اور دنیا کے بے شمار لوگ ان میں سے بہت سے کاموں کو اَنجام دیتے ہیں، پھر ان کی کیا خصوصیت؟ تو فرمایا کہ بے شک نیکی کے بے شمار کام بے شمار لوگ اَنجام دیتے ہیں؛ لیکن چند اَعمال و اَوصاف ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے پیارے اور متقی بندوں کی خاص پہچان ہیں۔

شب بیداری:

ان میں سے پہلا وصف ہے شب بیداری، چنانچہ فرمایا:

﴿ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ○﴾ (الذاریات : ۱۷)

''وہ رات کے وقت کم سوتے ہیں۔'' یعنی شب بیداری کرتے ہیں، اس کے دو مطلب حضرات مفسرین نے بیان فرمائے ہیں:

ایک تو یہی کہ رات کا اکثر حصہ جاگ کر اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی عبادات و

مناجات میں گزارتے ہیں، وہ رات میں آرام کم کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے حضور نماز وغیرہ میں قیام زیادہ کرتے ہیں، خود حضور پاک ﷺ کے متعلق مروی ہے کہ آپ ﷺ اتنا طویل قیام فرماتے کہ پاؤں مبارک پر وَرم آجاتا تھا۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ:۱۰۹)

آپ ﷺ کی زندگی کی تمام راتیں شاہد ہیں کہ آپ ﷺ نے ہمیشہ اس کا اہتمام فرمایا، امت کو بھی اس کی تلقین فرماتے رہے، کیوں کہ رات کی حیات تہجد کی نماز ہے، نیز یہ مفتاح الحسنات اور مغلاق السیئات ہے، یہ وہ نماز ہے جس کی اَذان مسجد میں نہیں؛ دل میں ہوتی ہے۔ فرض نماز کی ندا "حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ" کی صورت میں بندوں کے واسطے سے آتی ہے تو نمازِ تہجد کی ندا بندوں کے رَب کی جانب سے "مَنْ يَدْعُوْنِيْ" کی صورت میں آتی ہے، فرض نماز کی ندا تو ہر کوئی سنتا ہے، جب کہ نمازِ تہجد کی ندا مخصوص اور متقی بندے ہی سنتے ہیں، فرض نماز میں کسی نہ کسی درجے میں رِیا کاری کا شبہ ہے، جب کہ نمازِ تہجد میں عموماً یہ شبہ نہیں ہوتا، فرض نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد میں اس نیت سے بھی جاتے ہیں کہ لوگوں سے ملاقات اور بات چیت ہوگی، جب کہ نمازِ تہجد کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے رب سے راز و نیاز ہو جائے، نمازِ پنج وقتہ مؤمنین کی نشانی ہے، جب کہ نمازِ تہجد متقین کی نشانی اور اللہ کے پیاروں کی بنیادی پہچان ہے۔

ایک واقعہ:

یہی وجہ ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ اور صلحاءِ کاملین کے یہاں اس کا اہتمام تھا، چنانچہ بخاری شریف (۱/۲۶۴) میں حضرت سلمانؓ اور حضرت ابوالدرداءؓ کا واقعہ منقول ہے کہ ان دونوں کے درمیان حضور ﷺ نے مواخات قائم فرمائی تھی، ایک مرتبہ حضرت سلمان فارسیؓ اپنے اس نبوی بھائی حضرت ابوالدرداءؓ کے یہاں ملاقات کے لیے تشریف لائے، اتفاق سے وہ اس وقت گھر موجود نہیں تھے، ان کی اہلیہ محترمہ کو نہایت خستہ حالت میں پایا، وہ پوچھنے پر کہنے لگیں کہ تمہارے بھائی ابوالدرداء تارک الدنیا بن گئے ہیں اور مجھے بھی انہوں

نے دنیا کا ایک حصہ سمجھ رکھا ہے، انہیں دنیا سے اور مجھ سے کوئی تعلق نہیں رہا، دِن بھر روزہ رکھتے ہیں اور رات بھر نماز پڑھتے ہیں، یہ ان کا دِن رات کا معمول ہے، حضرت سلمان فارسیؓ کو بڑا تعجب ہوا، تھوڑی دیر میں حضرت ابوالدرداءؓ گھر تشریف لائے، علیک سلیک کے بعد جب کھانا حاضر کیا گیا تو حضرت ابوالدرداءؓ نے اپنے بھائی حضرت سلمان فارسیؓ سے فرمایا کہ آپ بلا تکلف کھانا کھائیں، میرا تو روزہ ہے، حضرت سلمانؓ نے فرمایا کہ میں آپ کے بغیر کھانا نہیں کھاؤں گا، تو انہوں نے اپنا نفلی روزہ توڑ دیا اور کھانے میں شرکت کرلی، پھر جب رات کا وقت ہوا تو ایک کمرہ میں حضرت سلمانؓ کو سلا کر خود عبادت میں مشغول ہونے کی نیت سے جانے لگے، تو حضرت سلمانؓ نے اُنہیں روک لیا اور فرمایا: ابھی قیام کے بجائے آرام کرو، حضرت ابوالدرداءؓ بادلِ ناخواستہ سوگئے، تھوڑی دیر بعد آرام کے بعد پھر اُٹھے تاکہ اللہ تعالیٰ کے حضور قیام کریں، تو حضرت سلمانؓ نے پھر اُنہیں پکڑ کر سلا دیا، چنانچہ پھر سوگئے، جب رات کا تہائی حصہ گزر گیا تو اب حضرت سلمانؓ خود بھی اُٹھے اور حضرت ابوالدرداءؓ کو بھی اُٹھایا اور دونوں نے قیام کیا، فارغ ہونے کے بعد حضرت سلمانؓ نے فرمایا کہ اللہ کے بندے! تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے، ہر حق والے کو اس کا حق ادا کیا کرو، پھر صبح حضور ﷺ کی خدمت میں سارا قصہ سنایا، تو حضور ﷺ نے حضرت سلمانؓ کی تائید فرمائی۔

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رات کا قیام ان کا کتنا محبوب عمل تھا، کہ اُنہیں کہنا پڑتا تھا کہ ساری رات قیام کے بجائے کچھ آرام بھی کرلیا کرو، کہ اپنے نفس کا بھی حق ہے: "وَ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقٌّ". اور اب کہنا پڑتا ہے کہ ساری رات آرام کے بجائے کچھ قیام بھی کر لو، کہ اپنے رب کا بھی حق ہے: "وَ لِرَبِّكَ عَلَيْكَ حَقٌّ".

اور واقعہ یہ ہے کہ ساری رات آرام کرنے کے بعد اگر اخیر کا کچھ حصہ قیام کر لیا جائے تب بھی کافی ہے، اس لیے کہ مفسرین کے بقول ﴿كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا

يَهْجَعُوْنَ ۝﴾ کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ساری رات سوئے نہیں رہتے؛ بلکہ کچھ حصہ اللہ تعالیٰ کے حضور قیام اور راز و نیاز میں بھی گزارتے ہیں۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ یہاں حرفِ "مَا" نفی کے لیے ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ رات کا تھوڑا حصہ ان پر ایسا بھی گزرتا ہے جس میں وہ سوتے نہیں، اس حصہ میں وہ آرام کے بجائے قیام کرتے ہیں۔

اس مفہوم کے مطابق جو لوگ رات کا تھوڑا سا حصہ بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزارتے ہیں وہ بھی اس آیت کریمہ کے مصداق ہیں، حتیٰ کہ حضرت انسؓ اور حضرت ابوالعالیہؒ تو ان لوگوں کو بھی اس کا مصداق قرار دیتے ہیں جو مغرب وعشاء کے درمیان کا وقت نماز، تلاوت اور ذکر واَذکار میں گزارتے ہیں۔ (ہمارے مدارس کے طلبہ واساتذہ کے لیے جو مغرب سے عشا تک پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہیں یہ بڑی تسلی کی بات ہے، کاش! ہم اس استحضار کے ساتھ مذاکرہ ومطالعہ کیا کریں!)۔ (مستفاد از: معارف القرآن: ۱۵۹/۸)

شب بیداری کے فضائل:

مبارک ہیں وہ لوگ جو کسی بھی درجہ میں شب بیداری کا اہتمام کرتے ہیں، احادیث مبارکہ میں ان کے متعلق بڑے فضائل آئے ہیں، ایک حدیث قدسی میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نے اپنے رب کو خواب میں بہترین صورت میں دیکھا، تو میرے رب نے دریافت کیا کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ مقربین فرشتے کس مسئلہ میں بحث کررہے ہیں؟ حضور ﷺ نے لاعلمی کا اظہار کیا، تب حق تعالیٰ نے حضور ﷺ کے دونوں شانوں کے درمیان اپنا ہاتھ رکھا، جس کی ٹھنڈک کو آپ ﷺ نے اپنے سینے میں محسوس کیا اور آپ ﷺ نے وہ باتیں جان لیں جو آسمان وزمین میں ہیں، گویا وہی بات ہوئی جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو پیش آئی تھی، جس کا تذکرہ قرآن پاک میں ہے، آپ ﷺ نے آیت قرآنی ﴿وَ كَذٰلِكَ نُرِیْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝﴾ تلاوت فرمائی، یعنی (اور اس طرح ہم ابراہیم کو زمین وآسمان کی سیر کراتے

رہے تا کہ وہ یقین کرنے والوں میں شامل ہو جائیں)۔

(آگے ترمذی کی روایت میں ہے) حق تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ کس مسئلہ میں ملأ اعلیٰ والے بحث کرتے ہیں؟ حضور ﷺ نے اب کی بار عرض کیا کہ وہ کفارات ہیں، ان میں (۱) نماز کے بعد (اللہ تعالیٰ کی عبادت و اعتکاف وغیرہ کی غرض سے) مسجد میں ٹھہرنا (۲) نماز با جماعت کے لیے مسجد پیدل جانا۔ (حدیث قدسی نمبر:۱۰)

شرح نووی میں لکھا ہے کہ ”جماعت کھڑی ہونے کے بعد مسجد میں آنے والا ”ظالم لنفسه“ میں داخل ہے اور اَذان کے بعد مسجد میں آنے والا ”منهم مقتصد“ میں داخل ہے، لیکن اَذان سے پہلے مسجد میں آنے والا ”سابق بالخيرات“ میں داخل ہے“۔ (مستفاد از: شرح الاربعین:۲۰۶)

(۳) ناگواری کے باوجود سنت کے مطابق وضو کرنا۔ وضو مؤمن کا لباس ہے، اور لباس انسان کی پہچان ہوتا ہے، لہٰذا ہمیشہ باوضو رہنا سچے مسلمان کی پہچان ہے، یہ سکونِ زندگی کا سبب ہے، جو بھی یہ تین کام کرے گا وہ خیر کے ساتھ جیئے گا اور خیر کے ساتھ مرے گا، اور گناہ (صغیرہ) سے ایسے پاک ہو جائے گا جیسے آج ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا۔

اس کے بعد حق تعالیٰ نے حضور ﷺ کو نماز کے بعد اس دعا کی تاکید فرمائی:

”اللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَسْأَلُكَ فِعْلَ الخَيْرَاتِ، وَ تَرْكَ المُنْكَرَاتِ، وَ حُبَّ المَسَاكِيْنِ، فَإِذَا أَرَدْتَ بِعِبَادِكَ فِتْنَةً فَاقْبِضْنِیْ إِلَيْكَ غَيْرَ مَفْتُوْنٍ“.

یعنی اے اللہ! میں تجھ سے نیکیاں کرنے، برائیوں سے بچنے اور مساکین سے محبت کا سوال کرتا ہوں، اور جب تو اپنے بندوں کو کسی آزمائش میں مبتلا کرنے کا ارادہ کرے تو مجھے بغیر فتنہ و آزمائش کے اپنی طرف اُٹھا لے۔ (اس حال میں کہ میں کسی آزمائش میں مبتلا نہ کیا گیا ہوں)۔

اس کے بعد حق تعالیٰ نے یا حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ تین اعمال جو درجات کی

بلندی کا سبب ہیں وہ یہ ہیں: (۱) سلام کو رِواج دینا (۲) غریبوں اور بھوکوں کو کھانا کھلانا (۳) رات کے وقت جب لوگ سوئے ہوئے ہوں تب نماز پڑھنا۔ (ترمذی، مشکوٰۃ:۶۹)

دوسری حدیث میں وارد ہے کہ تین اعمال کرنے والے اِتنے مبارک ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اُن پر ہنسی آتی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ان اعمال پر بہت ہی خوش ہوتے ہیں:

عَنْ أَبِیْ سَعِيْدٍ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ”ثَلَاثَةٌ يَضْحَكُ اللّٰهُ إِلَيْهِمْ: الرَّجُلُ إِذَا قَامَ بِاللَّيْلِ يُصَلِّیْ، وَ القَوْمُ إِذَا صَفُّوْا فِی الصَّلٰوةِ، وَ القَوْمُ إِذَا صَفُّوْا فِیْ قِتَالِ العَدُوِّ“. (مشکوٰۃ:۱۰۹، باب التحريض على قيام الليل)

(۱) جو لوگ رات میں نمازِ تہجد کے لیے قیام کرتے ہیں (۲) جو لوگ نماز کی صفیں بناتے ہیں (۳) جو لوگ دین کے دشمنوں کے لیے جہاد کی صفیں بناتے ہیں۔ حق تعالیٰ کو جس طرح قیام لیل بہت پسند ہے اسی طرح نماز کی صفیں اور جہاد کی صفیں بھی بہت ہی زیادہ پسند ہیں، اللہ پاک کو یہ تین اعمال خوش کرتے ہیں، ان اعمال کا اہتمام کرنے والے لوگ اللہ تعالیٰ کی نظرِ عنایت و رحمت کے حق دار ہیں، منجملہ ان کے ایک عمل قیامِ لیل بھی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں اور متقیوں کا خاص عمل ہے۔

آہِ سحر گاہی:

دوسرا وصف اللہ تعالیٰ کے محبوب و مقبول بندوں کا آہِ سحر گاہی ہے، یعنی رات کے آخری حصہ میں اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے گناہوں کی معافی مانگنا، اللہ تعالیٰ ایسے متقی بندوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

﴿وَ بِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ (الذاريات: ۱۸)

”وہ رات کے آخری حصہ میں سحری کے وقت استغفار کرتے ہیں۔“

مطلب یہ ہے کہ رات کا اکثر حصہ یا کچھ حصہ عبادت میں گزارنے کے باوجود وہ استغفار کرتے ہیں۔

عاجز کے خیالِ ناقص میں اس کی دو وجہیں ہیں:

(۱) چونکہ ان بندوں کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے، اس لیے وہ اپنی عبادت کو اس کے شایانِ شان نہیں سمجھتے، وہ عبادت کر کے بھی اتنے ڈرتے ہیں جتنے عام لوگ معصیت کے بعد بھی نہیں ڈرتے، وہ عبادت کر کے بھی رات کے اخیری پہر میں روتے ہیں اور کہتے ہیں: "مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ، مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ". ربِ کریم! ہم سے تیری نہ معرفت کا حق ادا ہوسکا، نہ عبادت کا، اس لیے ہم معافی چاہتے ہیں، ہمیں معاف فرما دیجیے، وہ رات میں اللہ تعالیٰ کے حضور ایسے تڑپتے اور روتے ہیں جیسے سانپ کا ڈسا ہوا تڑپتا اور روتا ہے، وہ زبانِ حال سے عرض کرتے ہیں کہ

رات ہوتے ہی چراغوں کو بجھا دیتا ہوں   دِل ہی کافی ہے الٰہی! تیری یاد میں جلنے کے لیے

(۲) وہ اس راز سے باخبر ہوتے ہیں اور حدیث قدسی پر ان کا یقین کامل ہوتا ہے کہ رات کا یہ آخری پہر اللہ تعالیٰ کے حضور اس کی رحمت ومغفرت کی طلب اور دعا کی قبولیت کا ہے، چنانچہ مذکورہ حدیث میں ارشاد ہے کہ حق تعالیٰ روزانہ رات کے آخری پہر میں اپنی شان کے مطابق آسمانِ دنیا پر تشریف لاتے ہیں، یا اپنی رحمت یا خاص فرشتے کو نازل فرماتے ہیں، اور یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ "مَنْ يَدْعُوْنِيْ فَأَسْتَجِيْبَ لَهٗ؟" کوئی ہے دعا کرنے والا کہ میں اس کی دعا قبول کروں، "مَنْ يَسْأَلُنِيْ فَأُعْطِيَهٗ؟" کوئی ہے میرے لامحدود خزانوں سے لینے والا، کہ میں اسکا دامن مراد بھر دوں، "مَنْ يَسْتَغْفِرُنِيْ فَأَغْفِرَ لَهٗ؟" ہے کوئی مغفرت کا طلبگار کہ میں اس کے زندگی بھر کے گناہ معاف کردوں۔ (حدیث قدسی نمبر: ۱۱)

ظاہر ہے کہ یہ موقع تو حق تعالیٰ اپنے لطف وکرم سے تمام ہی بندوں کو عنایت فرماتے ہیں؛ مگر اس سے فائدہ اور نفع اللہ تعالیٰ کے محبوب اور متقی بندے ہی اُٹھاتے ہیں، اس لیے فرمایا کہ ﴿وَ بِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ (الذاریات: ۱۸) جب دنیا والے سوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے اپنے رب کے سامنے روتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں

سے یہی چاہتے ہیں، اس لیے ہر ایک کو ہر رات یہ موقع دیا جاتا ہے، حدیث پاک میں ہے:

"إِنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ يَدَهٗ بِاللَّيْلِ لِيَتُوْبَ مُسِيْءُ النَّهَارِ، وَ يَبْسُطُ يَدَهٗ بِالنَّهَارِ لِيَتُوْبَ مُسِيْءُ اللَّيْلِ، حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا". (رواہ مسلم، مشکوٰۃ: ۲۰۳)

"حق تعالیٰ ہر رات اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے اور بندوں کو توبہ کا موقع دیتا ہے، تاکہ دن میں گناہ کرنے والا رات میں اور رات میں گناہ کرنے والا دن میں توبہ کرلے۔"

ایک بزرگ سے کسی نے شب قدر کے متعلق دریافت کیا تو عجیب جواب دیا:

اے خواجہ! چہ جوئی ز شب قدر نشانی   ہر شب شب قدر است اگر قدر بدانی

رات کی قدر کرلو، تو تمہارے لیے ہر رات شب قدر کے مانند ہے، جو لوگ رات کی قدر کرتے ہیں وہ خود گراں قدر بن جاتے ہیں۔

اسی کو علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو   کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اس موقع سے ہم بھی فائدہ اُٹھائیں اور اپنے تمام گناہوں سے راتوں کی تنہائیوں میں معافی مانگیں، توبہ واستغفار کا اہتمام کریں، ہم اسی کے مکلّف ہیں، بقولِ شاعر:

نیکیاں تیری ترازو میں تلیں یا نہ تلیں   گناہوں کے داغ دُھلیں یا نہ دُھلیں
آج ہی کرلے تو گناہوں سے توبہ   اللہ جانے کل تیری آنکھ کھلے یا نہ کھلے

ہمارا کام ہے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرنا، اللہ تعالیٰ کا کام ہے مغفرت عطا کرنا، وہ غفار ہے، طلب گار کو کبھی محروم نہیں کرتا، اس راز سے اہل اللہ واقف ہوتے ہیں، اس لیے وہ آہِ سحر گاہی کا اہتمام کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس لیے فرمایا: ﴿وَ بِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ (الذاریات: ۱۸)

عبادت کے ساتھ سخاوت وفیاضی کا اہتمام:

اللہ تعالیٰ کے متقی بندوں کا تیسرا وصف فیاضی اور سخاوت ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَ فِیۡۤ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَ الۡمَحۡرُوۡمِ﴾ (الذاریات: ۱۹)

''ان کے مال ودولت میں سائلوں اور محروموں کا (باقاعدہ) حق ہوتا ہے''۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہ محبوب ومقبول بندے صرف جسمانی عبادات پر اکتفاء نہیں کرتے؛ بلکہ مالی عبادات کا بھی اہتمام کرتے ہیں، یہ عبادت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو خوش کرتے ہیں اور فیاضی وسخاوت کے ذریعہ بندوں کو، وہ کسی کو اپنی عطا سے محروم نہیں کرتے۔

یہاں سائل سے مراد وہ ضرورت مند ہے جو زبان سے اپنی ضرورت کا سوال اور اِظہار کردے، اور محروم سے مراد وہ لوگ ہیں جو ضرورت مند ہونے کے باوجود غیرت کے سبب کسی کے سامنے اپنی ضرورتوں کا اِظہار پسند نہیں کرتے، ایسے باغیرت لوگوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر دینے کا حکم ہے: ﴿ تَعۡرِفُهُمۡ بِسِيۡمٰهُمۡ﴾ (البقرۃ: ۲۷۳)

اللہ تعالیٰ کے یہ پیارے بندے کسی مانگنے والے کا انتظار نہیں کرتے، بلکہ ضرورت مندوں کو خود تلاش کرکے ان کی مدد کرتے ہیں، اسی لیے حدیث پاک میں حکم ہے کہ بہ وقت مجبوری سوال کرنا ہو تو صالحین سے کرو:

'' وَ إِنۡ كُنۡتَ سَائِلاً لَا بُدَّ فَاسۡأَلِ الصَّالِحِيۡنَ''. (رواہ أبوداود، مشکوٰۃ: ۱۶۳)

کیوں کہ صالحین مالِ حلال سے سخاوت کریں گے اور رُسوا نہیں کریں گے۔ غالبًا اسی لیے قرآنِ کریم نے ﴿ وَ فِیۡۤ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ﴾ فرما کر ایک عجیب بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے یہ محبوب بندے اپنی سخاوت کو اپنا کمال اور احسان نہیں سمجھتے؛ بلکہ ضرورت مندوں کا حق سمجھ کر ان کا تعاون کرتے ہیں، اور ضرورت مندوں کو اپنا محسن سمجھتے ہیں

کہ ان کی وجہ سے ہمیں سخاوت کا موقع ملا۔

حضرت عبداللہ بن مبارک ؒ کا واقعہ:

منقول ہے کہ حضرت عبداللہ بن مبارک ؒ جب کبھی رقہ شہر جاتے تو ایک نوجوان آکر آپ ؒ سے ملتا اور بہت سے مسائل میں رہبری حاصل کرتا، ایک مرتبہ جب جانا ہوا تو وہ نوجوان ملنے نہیں آیا، پوچھنے پر کسی نے بتایا کہ اس پر بہت قرض ہوگیا تھا اور جب وہ ادا نہ کرسکا تو جس کا قرض تھا اس نے نوجوان کو گرفتار کرادیا اور اب وہ جیل میں ہے، آپ ؒ کو سن کر بڑا دُکھ ہوا، مزید تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ نوجوان کے ذمے فلاں شخص کے دس ہزار کا قرض ہے، آپ ؒ اس شخص کو تلاش کرکے اس کے گھر گئے اور فرمایا کہ ہمارے ایک دوست نے تم سے قرض لیا تھا جسے وہ ادا نہ کرسکا اور آج وہ جیل میں ہے، میں وہ قرض ادا کرنا چاہتا ہوں؛ لیکن ایک شرط ہے کہ میرے جیتے جی تم کسی کو اس کی اطلاع نہیں کروگے کہ یہ قرض کس نے ادا کیا، اس نے شرط منظور کرلی، آپ ؒ نے اسے دس ہزار دیے اور مقروض کو جیل سے رہا کروادیا۔

رہائی کے بعد جب وہ نوجوان حضرت عبداللہ بن مبارک ؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ؒ نے غائب ہونے کی وجہ دریافت کی، نوجوان نے سارا معاملہ بتایا اور کہا کہ ایسا لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غیب سے کسی فرشتے کو بھیج کر میرا قرض ادا کروادیا اور میں آپ کے سامنے حاضر ہوں، آپ ؒ نے فرمایا: بہت خوب، اب تم اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، میں بھی تمہارے لیے بڑی فکر میں تھا۔

وہ نوجوان کہتا ہے کہ جب تک حضرت عبداللہ بن مبارک ؒ حیات تھے مجھے پتہ ہی نہ چلا، آپ ؒ کی وفات کے بعد یہ راز ظاہر ہوا کہ میرا قرض حضرت عبداللہ بن مبارک ؒ نے ادا فرمایا تھا۔ (تاریخ بغداد)

درحقیقت سخاوت بھی وہ عمل ہے جس پر آخرت میں تو اجر عظیم ہے ہی، لیکن دُنیا میں بھی سخی لوگوں کو خوب نوازا جاتا ہے، کیوں کہ ربِ کریم کی شانِ کریمی سے یہ بات بعید ہے کہ

سخی تو سخاوت کا معاملہ نقد کرے اور حق تعالیٰ جو سخیوں کے سخی ہیں وہ اس کا اَجر اُدھار رکھیں، حق تعالیٰ سخیوں کو ان کی سخاوت کا اَجر دُنیا میں بھی ضرور عطا فرماتے ہیں۔

تین قسم کے لوگوں سے اللہ تعالیٰ محبت کرتے ہیں:

بلا شبہ یہ وہ اوصاف ہیں جو عام لوگوں میں نہیں ہو سکتے، یہ بہت خاص لوگوں کے اوصاف ہیں، جن میں یہ پائے جاتے ہیں وہ بالیقین اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے اور متقی ہیں، ایک حدیث قدسی سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جس میں فرمایا: "ثَلَاثَةٌ يُحِبُّهُمُ اللّٰهُ، وَ ثَلَاثَةٌ يُبْغِضُهُمُ اللّٰهُ". تین قسم کے لوگ ایسے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ محبت رکھتے ہیں، اور تین قسم کے لوگ ایسے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں، جن تین قسم کے لوگوں سے اللہ تعالیٰ کو محبت ہے ان میں ایک وہ شخص ہے جس نے کسی سائل کو لوگوں سے اللہ تعالیٰ کے لیے مانگتے ہوئے دیکھا، مگر کسی نے اس کی حاجت پوری نہیں کی، یہ سخی خاموشی سے اُٹھا اور اُس نے سائل کی ضرورت کو خاموشی اور خلوص کے ساتھ پورا کر دیا، دوسرا وہ مسافر جو کسی قافلہ کے ساتھ سفر کر رہا تھا، رات میں سارے قافلے والے تو خوابِ غفلت میں مست ہو گئے، مگر اللہ تعالیٰ کا یہ محبوب بندہ آرام چھوڑ کر قیام اور یادِ مولیٰ میں مشغول ہو گیا، کبھی نماز، کبھی آہ و زاری اور کبھی تلاوتِ قرآن کرتا ہے، تیسرا وہ شخص جو اسلامی لشکر کے ساتھ میدانِ جہاد میں دشمنانِ دین سے مقابلہ کرتے ہوئے برابر جمارہا، یہاں تک کہ اُس نے جامِ شہادت نوش کر لیا، یا پھر فتح یاب ہو گیا، اور جن تین قسم سے لوگوں سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں ان میں ایک "الشیخ الزانی" بوڑھا (یا شادی شدہ) ہونے کے باوجود زنا کرنے والا (والعیاذ باللہ) دوسرا "الفقیر المختال" فقیر ہونے کے باوجود تکبر کرنے والا، اور تیسرا "الغنی الظلوم" مال دار ہو کر ظلم کرنے والا۔ (ترمذی، مشکوٰۃ: ۱۷۰، باب فضل الصدقۃ) (حدیث قدسی نمبر: ۱۲)

حق تعالیٰ اپنے کرم سے ہمیں رذائل سے محفوظ فرما کر متقی بندوں کے اوصاف سے متصف فرمائیں اور مرشدی حضرت شیخ الزمان اور تمام مشائخ کے فیوض و برکات سے ہمیں مستفیض فرما کر قیامت میں ان ہی کے ساتھ حشر فرمائیں۔

اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَيْبَ شَيْخِيْ، وَ لَا تُذْهِبْ بَرَكَةَ عِلْمِهٖ عَنِّيْ.

اے اللہ! میرے شیخ کے عیب کو مجھ سے چھپا دے اور ان کے علم کی برکت مجھ سے ختم نہ فرما۔ آمین۔

۲۲/ ربیع الاول/ ۱۴۴۰ھ

مطابق: یکم دسمبر/ ۲۰۱۸ء

نزیل: مکتبہ شیخ محمد قمر الزمان

دار المعارف الاسلامیہ، کریلی

الٰہ آباد، یو. پی.

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيْرًا ‏ فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيْرًا كَثِيْرًا
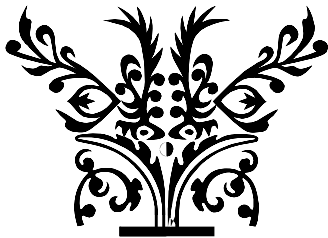
(۱۷)

عرشِ عظیم کے سایہ میں چند خوش نصیب بندے

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ أَبِيۡ هُرَيۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "سَبۡعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِيۡ ظِلِّهٖ يَوۡمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهٗ، إِمَامٌ عَادِلٌ، وَ شَابٌّ نَشَأَ فِيۡ عِبَادَةِ اللّٰهِ، وَ رَجُلٌ قَلۡبُهٗ مُعَلَّقٌ بِالۡمَسَاجِدِ إِذَا خَرَجَ مِنۡهُ حَتّٰى يَعُوۡدَ إِلَيۡهِ، وَ رَجُلَانِ تَحَابَّا فِي اللّٰهِ، اجۡتَمَعَا عَلَيۡهِ وَ تَفَرَّقَا عَلَيۡهِ، وَ رَجُلٌ ذَكَرَ اللّٰهَ خَالِيًا فَفَاضَتۡ عَيۡنَاهُ، وَ رَجُلٌ دَعَتۡهُ امۡرَأَةٌ ذَاتُ حَسَبٍ وَّ جَمَالٍ، فَقَالَ: "إِنِّيۡ أَخَافُ اللّٰهَ"، وَ رَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ، فَأَخۡفَاهَا، حَتّٰى لَا تَعۡلَمَ شِمَالُهٗ مَا تُنۡفِقُ يَمِيۡنُهٗ."

(متفق علیه، مشکوٰة : ٦٨/ باب المساجد و مواقع الصلوٰة / الفصل الأول)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سات آدمی ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دِن اپنے (عرش کے) سایہ میں رکھے گا، اور اس دِن اللہ تعالیٰ کے سایہ کے علاوہ اور کوئی سایہ نہیں ہوگا، انصاف کرنے والا حاکم، وہ

جوان جو اپنی جوانی میں عبادت کرے، وہ شخص جس کا دل مسجد سے معلق رہے (نماز اور مسجد کی آبادی کے سلسلہ میں فکرمند رہے) جب مسجد سے نکلے یہاں تک کہ پھر دوبارہ مسجد میں لوٹ کر آجائے، وہ دو آدمی جو آپس میں اللہ تعالیٰ کے لیے محبت کرتے ہوں، اسی کے سبب ان کا اجتماع اور جدائی ہوتی ہو، اور وہ آدمی جو تنہائی میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرکے روتا ہو، اور وہ آدمی جو اس قدر پوشیدہ طور پر صدقہ کرے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی علم نہ ہو کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا ہے؟"

عرشِ عظیم کی وسعت:

اللہ تبارک وتعالیٰ کائنات کی تمام مخلوقات کے خالق و مالک ہیں، یہ ساتوں زمینیں اور ساتوں آسمان بھی اسی کے مملوک ومخلوق ہیں، اور ان کے مابین سورج، چاند، ستارے اور جو کچھ بھی ہے ان سب کے خالق بھی اللہ تعالیٰ ہی ہیں، اس کی مخلوقات سے اس کی قدرت، طاقت اور عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ماہرین فلکیات کی تحقیق کے مطابق آفتاب زمین سے دس لاکھ گنا بڑا ہے، لیکن دیکھئے کہ آسمان میں وہ ذرا سی جگہ لیے ہوئے ہے، پھر اس سے بڑے بڑے ستارے موجود ہیں، یہ سب اپنی وسعت کے باوجود آسمان کی تھوڑی سی جگہ میں نظر آتے ہیں، اس سے آسمان کی وسعتوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، لیکن قرآنِ پاک میں حق تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ان ساتوں زمینوں اور آسمانوں سے بہت بڑی ہماری کرسی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿وَسِعَ كُرۡسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡأَرۡضَ﴾ (البقرة : ٢٥٥)

"اس کی کرسی (اس سے مراد یا تو حقیقت میں کرسی ہے، یا پھر سلطنت وحکومت، قدرت وعظمت اور علم کی وسعت مراد ہے) میں آسمانوں اور زمینوں کی وسعت ہے"۔

مطلب یہ ہے کہ اس کی کرسی میں آسمان وزمین اور ان کے مابین جتنی بھی مخلوقات ہیں سب سما سکتے ہیں۔ (اس موقع پر یاد رکھیں کہ حق تعالیٰ نشست و برخاست اور زمان ومکان سے پاک ہے، قرآنِ کریم کی اس آیت کو بھی علماء نے متشابہات میں شمار فرمایا ہے، جن کا حکم

یہ ہے کہ ان کا جو بھی معنیٰ اور مفہوم اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہے اس پر ایمان لانا ضروری ہے)۔

غور کیجیے کہ جب اس کی کرسی اتنی بڑی ہے تو پھر اس کا عرش جس کے سامنے کرسی ہے اور جس پر حق تعالیٰ اپنی شان کے مطابق جلوہ افروز ہیں، جسے خود حق تعالیٰ نے عظیم فرمایا تو وہ کتنا بڑا ہوگا!

(روح المعانی: ۳/۹ میں) حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ اگر ساتوں آسمان اور ساتوں زمینوں کو الگ الگ پھیلا دیا جائے تب بھی کرسی کے مقابلہ میں سب مل کر ایسے ہوں گے جیسے جنگل میں کوئی چھوٹی سی گول چیز پڑی ہو۔

پھر صاحب روح المعانی نے فرمایا کہ ابن کثیرؒ، ابن جریرؒ اور بیہقیؒ نے بروایت حضرت ابوذر غفاریؓ نقل کیا ہے کہ انہوں نے آں حضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ کرسی کیا اور کیسی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، ساتوں آسمان اور زمینوں کی مثال کرسی کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے ایک بڑے میدان میں کوئی حلقۂ انگشتری ڈال دیا جائے۔'' اور بعض دیگر روایات میں ہے کہ عرش کے مقابلے میں کرسی کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک بڑے میدان میں انگوٹھی کا حلقہ پڑا ہوا ہو۔

(مستفاد از: معارف القرآن: ۱/۵۶۰)

جس کا رب اس کا سب:

صاحبو! جب ہمارے رب کا عرش اتنا بڑا ہے تو خود رب العرش العظیم کتنا بڑا ہوگا؟ اس کے باوجود جو لوگ اسے چھوڑ کر غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں، اُن سے اپنی نذر و نیاز اور حاجات مانگتے ہیں ان سے زیادہ نادان اور کون ہوسکتا ہے؟ ان ہی کے متعلق ارشاد ہے:

﴿ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۚ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴾ (التوبة: ۱۲۹)

''ان حقائق کے باوجود بھی اگر لوگ رُوگردانی کریں اور حق کو قبول نہ کریں تو آپ

کہہ دیجیے کہ میرے لیے اللہ ہی کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور وہ عرشِ عظیم کا مالک ہے۔''

سورۂ توبہ کی اِن دونوں آیتوں کے متعلق حدیث پاک میں وارد ہے کہ جو شخص ہر صبح و شام سات مرتبہ پڑھے، اس کے دنیا و آخرت کے اہم کاموں میں اللہ تعالیٰ کافی ہوگا۔

(ابوداود/کتاب الادب، از: معارف القرآن: ۴/۴۹۶)

کیوں کہ جب بندہ رب العرش العظیم سے رجوع ہوجائے اور اس کی بندگی کو مقصد زندگی بنا کر اس سے رابطہ اور کنیکشن قائم کر لیتا ہے اور رب کو اپنا بنا لیتا ہے تو پھر ''جس کا رب اس کا سب''۔ رب العالمین نے فرمایا:

﴿ وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ ﴾ (المائدة: ٦٦)

ہمارے شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیمؒ نے اس کی ترجمانی کرتے ہوئے اپنے منفرد انداز میں فرمایا کہ ''تم میرے بن جاؤ، میری مخلوق تمہاری بن جائے گی، آسمان بھی تم پر مہربان ہوگا، زمین بھی تمہاری خدمت گار بن جائے گی، پھر تم رِزق کو نہیں؛ رِزق تمہیں ڈھونڈے گا۔''

بقول خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ:

جو تو میرا تو سب میرا، فلک میرا زمیں میری
جو تو نہیں میرا، تو کوئی شئ نہیں میری

یقیناً جو اپنے رب سے رابطہ اور تعلق درست کر لیتے ہیں تو نتیجۃً ان کے تمام معاملات درست اور صحیح ہوجاتے ہیں۔ اَللّٰهُمَّ كُنْ لَنَا وَاجْعَلْنَا لَكَ. آمین.

اگر دنیا میں کوئی وقتی و عارضی پریشانی ہے بھی تو موت ان شاء اللہ ان تمام پریشانیوں کا خاتمہ کر دے گی، اور قیامت کا دن جو کہ بے ایمانوں کے لیے سب سے بڑی مصیبت و پریشانی کا دن ہوگا وہی دن اہل ایمان کے لیے سب سے بڑی خوشی کا ہوگا، کیوں

کہ اس دن یہ خوش نصیب لوگ عرشِ عظیم کے سایہ (اس سے بھی مراد یا تو حقیقت میں سایہ ہے، یا پھر اللہ تعالیٰ کی حفاظت، نصرت، رحمت اور راحت مراد ہے) میں ہوں گے۔

ہر باعمل مخلص مؤمن عرشِ عظیم کے سایہ میں ہوگا:

مختلف احادیث طیبہ میں مؤمنین مخلصین کے مختلف اعمالِ صالحہ کے متعلق یہ فضیلت وارد ہوئی ہے کہ وہ قیامت کے دِن عرشِ عظیم کے سایے میں (اللہ تعالیٰ کی حفاظت و رحمت میں) ہوں گے، بعض علماء نے فرمایا کہ تقریباً چالیس اعمالِ صالحہ ایسے ہیں جن میں سے کسی بھی عمل صالح کا اگر اہتمام کیا جائے تو قیامت کے دِن عرشِ عظیم کا سایہ نصیب ہوگا۔

اس بنا پر عاجز کا خیالِ ناقص یہی ہے کہ ان شاء اللہ العزیز قیامت کے دن ہر باعمل مخلص مؤمن عرشِ عظیم کے سایہ میں ہوگا۔

امامِ عادل:

مذکورہ حدیث میں جن سات خوش نصیب لوگوں کا ذکر ہے ان میں پہلا خوش نصیب ہے امامِ عادل، انصاف کرنے والا (مسلمان) حاکم، یہاں امام سے مراد حاکم اور ذمہ دار ہے، خواہ اس کی حکومت اور ذمہ داری کا دائرہ مختصر ہو یا وسیع، کسی مسجد، مدرسہ، ادارہ، علاقہ، شہر اور صوبہ وغیرہ تک محدود ہو یا اس سے آگے پھیلا ہوا ہو، اپنے ماتحتوں کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ کرنے والا حاکم اور ذمہ دار قیامت کے دِن عرشِ عظیم کے سایہ میں ہوگا۔

ایک حدیث میں سیدہ عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''(اے میرے صحابہ!) کیا تم جانتے ہو کہ قیامت کے دن عرشِ عظیم کے سایہ میں سبقت لے جانے والے حضرات کون ہوں گے؟ حضراتِ صحابہؓ نے اپنے معمول کے مطابق عرض کیا کہ ''اَللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ أَعْلَمُ'' اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں، تب آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ تین قسم کے لوگ ہوں گے: (۱) ''اَلَّذِيْنَ إِذَا أُعْطُوا الْحَقَّ قَبِلُوْهُ.''

۱۳۵

جب ان کے سامنے دینِ حق (یا اس کا علم یا اس کا حکم) پیش کیا جاتا ہے تو وہ اسے قبول کرتے ہیں، (اپنی ضد اور انانیت پر بے جا اصرار نہیں کرتے) (۲) ''وَ إِذَا سُئِلُوْهُ بَذَلُوْهُ.'' جب ان سے (دین) حق کے سیکھنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو وہ علم کی تعلیم و تبلیغ میں بخل سے کام نہیں لیتے، یا جب ان سے کلمۂ حق اور سچ کہنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو وہ کسی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے، یا ان کے ذمہ کسی کا کوئی حق باقی ہو اور جب اس کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو وہ اس حق کو ادا کرنے کا مکمل اہتمام کرتے ہیں، یا ان کے اموال میں جو ضرورت مندوں کا حق ہے اس کا جب سوال کیا جاتا ہے تو وہ مال خرچ کرتے ہیں، بخل سے کام نہیں لیتے۔ (۳) ''وَ حَكَمُوْا لِلنَّاسِ كَحُكْمِهِمْ لِأَنْفُسِهِمْ''. (جب انہیں کسی معاملہ میں جج اور فیصل بنایا جاتا ہے تو) لوگوں کے حق میں بھی ویسا ہی فیصلہ کرتے ہیں جیسا اپنے متعلق کرتے ہیں۔''

(مسند احمد، مشکوٰۃ: ۳۲۲/ کتاب الامارۃ)

یہی مؤمنین مخلصین اور کاملین کی پہچان ہے، اور حق تعالیٰ نے اسی کا حکم فرمایا ہے:

﴿ يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوْ عَلٰٓى أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَ الْأَقْرَبِيْنَ﴾ (النساء: ۱۳۵)

''اے ایمان والو! انصاف قائم کرنے والے بنو، اللہ کے خاطر گواہی دینے والے (بنو) خواہ وہ (عدل و انصاف اور) گواہی تمہارے خلاف پڑتی ہو یا والدین اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف ہو۔''

یہاں اہل ایمان کو عدل و انصاف قائم کرنے اور حق کے مطابق گواہی دینے کی تاکید فرمائی گئی ہے، خواہ اس کی وجہ سے انہیں یا ان کے والدین اور رشتہ داروں کو نقصان اُٹھانا پڑے۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے ہوا:

﴿ يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى أَلَّا تَعْدِلُوْا﴾ (المائدة: ۸)

"اے ایمان والو! ایسے بن جاؤ کہ اللہ تعالیٰ (کے احکام کی پابندی) کے لیے ہر وقت تیار ہو (اور) انصاف کی گواہی دینے والے بنو، اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں ناانصافی پر آمادہ نہ کرے۔"

اصل بات یہ ہے کہ انسان کو عدل وانصاف اور سچی گواہی سے دو چیزیں روکتی ہیں: (۱) اپنی اور رشتہ داروں کی بے جا طرف داری (۲) کسی قوم کی بے جا دشمنی۔ قرآن نے دونوں باتوں کی وجہ سے ظلم کرنے سے روکا اور ہر حال میں ہر ایک کے ساتھ عدل وانصاف کرنے کا حکم دیا۔ اگر عدل اور حق کو قائم کرنے کی وجہ سے دنیوی نقصان بھی برداشت کرنا پڑے تو یقین جانو کہ یہ دنیوی نقصان اُخروی نفع کا باعث ہوگا، چنانچہ قیامت کے دِن انصاف کرنے والوں کے لیے حدیث پاک میں عرشِ عظیم کے سایہ میں سبقت کی بشارت ہے۔

عدل اور تقویٰ لازم وملزوم ہیں:

پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر حال میں ہر ایک کے ساتھ عدل وانصاف کے تقاضا کو پورا کرنا اس وقت آسان ہوتا ہے جب دل میں خوفِ خدا اور تقویٰ ہو، یہی وجہ ہے کہ عدل کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِعۡدِلُوۡا ۟ هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰى﴾ (المائدة : ٨)

"انصاف کرو، اس لیے کہ انصاف تقویٰ سے بہت قریب ہے۔"

علماء نے فرمایا ہے کہ عدل وتقویٰ لازم وملزوم ہیں، عدل انسان کو تقویٰ کی طرف اور تقویٰ عدل کی طرف کھینچتا اور متوجہ کرتا ہے، واقعہ یہی ہے کہ جن حکمرانوں اور ذمہ داروں کے دل میں خوفِ خدا اور تقویٰ ہوتا ہے وہ ہر حال میں ہر ایک کے ساتھ عدل وانصاف کے تقاضوں پر عمل کرتے ہیں، اس سلسلہ میں حضور ﷺ، خلفاءِ راشدین اور ان کے علاوہ مسلم عادل حکمرانوں اور ذمہ داروں کی عدل وانصاف کے واقعات پر مشتمل ایک روشن تاریخ ہے۔

عادل مسلمان حکمرانوں کے واقعات:

(۱) مثلاً منقول ہے کہ ایک کامل الایمان مسلمان بادشاہ جن کا نام ہے سلطان ملک شاہ، ایک مرتبہ اصفہان کے جنگل میں شکار کھیل رہے تھے، اس دوران ان کا کسی گاؤں میں قیام ہوا، جہاں ایک غریب بیوہ کی ایک گائے تھی، اس کے دودھ سے اس کے تین بچوں کی پرورش ہوتی تھی، سلطان ملک شاہ کے کچھ لوگوں نے جنگل میں اس گائے کو پایا تو ذبح کیا اور کھا گئے، غریب بڑھیا کو جب خبر ہوئی تو وہ بدحواس ہوگئی اور کسی طرح بادشاہ کے پاس پہنچنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہی، اسے معلوم ہوا کہ سلطان ملک شاہ زندور (اصفہان کی مشہور نہر) سے گزرنے والا ہے، تو یہ بڑھیا نہر کے اس پل پر جا کر سلطان کا انتظار کرنے لگی، جب سلطان پل پر آیا تو بڑھیا نے بڑی ہمت اور جرأت سے کہا کہ "اے ارسلان کے بیٹے! میرا انصاف نہر کے اِس پل پر کرے گا یا پل صراط پر؟ جو جگہ پسند ہو انتخاب کرلے، بادشاہ حیران ہوگیا، فوراً گھوڑے سے اُتر کر بڑھیا سے کہا: اماں جی! پل صراط کی تو طاقت نہیں، میں اسی پل پر فیصلہ کرنا چاہتا ہوں، کہو! کیا بات ہے؟ بڑھیا نے سارا قصہ سنایا تو سلطان نے بہت افسوس کیا اور ایک گائے کے عوض اسے ستر گائیں عطا کر کے مالا مال کر دیا، بڑھیا نے خوش ہو کر دعائیں دیں۔ (مستفاداز: حکایتوں کا گلدستہ: ۱۱۳، مؤلفہ مولانا اسلم شیخوپوریؒ)

آہ! کیا زمانہ تھا، کہنے والے کتنے آزاد خیال اور سننے والے کیسے عالی حوصلہ تھے، اگر موجودہ تہذیب وشائستگی کے زمانہ میں کوئی شخص اس طرح حاکم کی سواری روک لے اور ایسی آزادانہ گفتگو کرے تو اس کا ٹھکانہ یا تو پاگل خانہ ہوگا یا قید خانہ۔

(۲) اسی طرح سلطان محمود غزنویؒ (متوفی: ۴۲۱ھ مطابق: ۱۰۳۰ء) کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ سو رہے تھے کہ اچانک آنکھ کھل گئی، پھر کوشش کے باوجود نیند نہیں آئی، خیال ہوا کہ شاید کوئی مظلوم فریاد لایا ہو، یا کوئی فقیر بھوکا ہو، تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ قریب کی مسجد میں ایک شخص سجدہ میں رو رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ

اے کہ از غم نہ دیدہ خواری   از غمِ ما کجا خبر داری؟
خفتہ ماندی چو بختِ ما ہمہ شب   تو چہ دانی ز رنج بیداری

کہہ رہا تھا کہ سلطان کا دروازہ تو بند ہے، لیکن اللہ سبحان کا دروازہ تو کھلا ہے، محمود غزنوی تو سویا ہے، لیکن معبودِ ازلی تو جاگتا ہے، محمود یہ سن کر اس کے بالکل قریب ہوگیا اور کہا: اللہ کے بندے! تو محمود کی شکایت کرتا ہے، حالانکہ محمود خود تجھے تلاش کر رہا ہے، بتا تجھے کس نے ستایا؟ یہ سن کر وہ شخص رونے لگا اور عرض کیا: حضور! ایک درباری کے ہاتھوں ستایا ہوا ہوں، مگر اس کا نام نہیں جانتا، اس نے میری عزت خاک میں ملا دی، وہ آدھی رات کو مستی کے عالم میں میرے گھر آتا ہے اور میری شریک زندگی کی عصمت کو داغدار کرنے کی کوشش کرتا ہے، اگر آپ نے اپنی تلوار کے آب سے اس داغ کو نہ دھویا تو پھر سن لیجیے کہ کل قیامت کے دن میرا ہاتھ ہوگا اور آپ کا گریبان ہوگا، یہ سن کر محمود کی مذہبی غیرت جوش میں آگئی، بولا: کیا اس وقت بھی وہ ملعون وہیں ہے؟ اس نے کہا: شاید اب چلا گیا ہوگا، لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہ پھر آئے گا، محمود نے کہا: جب کبھی آئے مجھے فوراً اطلاع کرو، اس کے تین بعد وہ شخص پھر شکایت لے کر آیا، محمود نے فوراً تلوار لی اور اس کے گھر کا رُخ کیا اور موقع پر اس زانی اور ظالم کو پا کر سلطان محمودؒ نے تلوار کا بھرپور وار کیا اور اس کا خاتمہ کر دیا، اس کے بعد محمودؒ نے مصلّٰی بچھا کر دو رکعات شکرانہ کی ادا کیں، پھر صاحب خانہ سے فرمایا کہ اگر کچھ کھانے کو ہو تو لاؤ، عرض کیا: حضور! ایک چیونٹی حضرت سلیمان علیہ السلام کی کیا خاطر داری کر سکتی ہے، لیکن ما حضر حاضر کرتا ہوں، اس کے بعد اس نے سوکھی روٹی کے چند ٹکڑے پیش کیے جن کو سلطان نے بڑی رغبت سے کھا کر اس کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا: معاف کرنا، تمہیں بے وقت کھانے کی تکلیف دی، لیکن بات یہ ہے کہ جب سے تم نے ظلم کی داستان سنائی تب سے میں نے قسم کھائی تھی کہ جب تک اس ملعون کا سر قلم نہ کر دوں گا روزہ افطار نہ کروں گا، اس کے بعد فرمایا: مجھے اس زانی و ظالم کے متعلق یہ اندیشہ تھا کہ کہیں میرے بیٹوں میں سے کوئی نہ ہو، اگر وہ زانی اور ظالم میرا بیٹا بھی ہوتا تو چوں کہ انصاف کی تلوار رشتوں کو نہیں پہچانتی میں اس کی گردن اُڑا

دیتا، میں اپنے ارادہ میں پختہ اور سچا تھا، لیکن الحمدللہ ان میں سے کوئی نہ نکلا، اس پر میں نے مزید اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

(مستفاد از: جوامع الحکایات ولوامع الروایات: ۹۴، بحوالہ: ہندوستان کی بزمِ رفتہ کی سچی کہانیاں: ۲/۴)

اقبالؒ نے کہا ہے:

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا   لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

یہی وہ ایمانی اوصاف ہیں جن سے متصف ہونے والے لوگ ''امامِ عادل'' کے مصداق اور قیامت کے دن عرشِ عظیم کے سایہ کے مستحق ہیں۔ اللّٰهم اجعلنا منهم. آمين.

شَابٌّ نَشَأَ فِيْ عِبَادَةِ اللّٰهِ:

دوسرا وہ خوش نصیب ''شَابٌّ نَشَأَ فِيْ عِبَادَةِ اللّٰهِ'' وہ نوجوان ہے جس کی جوانی عبادتِ الٰہی اور یادِ خداوندی میں گزری ہو، یوں تو ساری زندگی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی کے لیے ہی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۝﴾ (الطور: ۵۶)

لیکن جوانی کی عبادت کی خاص اہمیت اور فضیلت ہے، ہمارے شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیمؒ فرماتے تھے کہ جوانی کا ایک سجدہ بڑھاپے کے ستر سجدوں سے افضل ہے، کیوں کہ زندگی کے چار دور ہیں: (۱) بچپن (۲) جوانی (۳) اُدھیڑ عمر (۴) بڑھاپا۔ ان میں سے بچپن میں اور جوانی کے بعد کے دور میں انسان عموماً کمزور ہو جاتا ہے، علاوہ ازیں بچپن میں بچہ احکامِ شریعت کا مکلّف اور پابند بھی نہیں ہوتا، اور بڑھاپے میں حوصلہ، ہمت اور طاقت نہیں ہوتی، اس لیے زندگی کا قیمتی زمانہ ہی جوانی ہے، ارشادِ باری ہے:

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَيْبَةً﴾ (الروم: ۵۴)

''اللہ وہ ہے جس نے تمہیں کمزوری کی حالت (مراد ایامِ طفولیت) میں پیدا کیا،

پھراس کمزوری کے بعد توانائی (مراد جوانی) عطا فرمائی، پھر اس توانائی (اور جوانی) کے بعد کمزوری اور بڑھاپا (کہولت اور شیخوخت کی شکل میں) دیا۔

تجھے پہلے بچپن نے برسوں کھلایا — جوانی نے پھر تجھ کو مجنوں بنایا
بڑھاپے نے پھر آ کے کیا کیا ستایا — اَجل تیرا کر دے گی بالکل صفایا

الغرض زندگی کا سب سے بہترین زمانہ جوانی کا ہے، یہ زمانہ زندگی کا موسم بہار ہے، جیسے موسم بہار میں درخت کی شاخیں اور ٹہنیاں ہری بھری اور شاداب ہوتی ہیں، اسی طرح جوانی کے زمانہ میں بھی اعضاءِ جسم پر بہار، صحیح سالم اور ذمہ داریوں کو نبھانے پر قادر ہوتے ہیں، حوصلے اور ارادے بھی جوان ہوتے ہیں، اور جسمانی طاقت و دِماغی صلاحیت بھی عروج پر ہوتی ہے، نیز جوانی کا زمانہ افضل ہونے کے ساتھ طویل بھی ہوتا ہے، اس لیے بچپن کا دور ختم ہوتے ہی بالغ ہونے کے بعد جوانی شروع ہو جاتی ہے، پھر حضرت امام شافعیؒ کے بقول جوانی کی عمر تیس سال تک ہے، لیکن حضرت امامنا العلام امام اعظم ابوحنیفہؒ کے یہاں جوانی کی عمر چالیس سال تک رہتی ہے۔ (مظاہر حق: ۳/۲۶۴) اس لیے جوانی زندگی کا طویل اور بہترین زمانہ ہے، حکم ہے کہ جوانی کی قدر بڑھاپے سے پہلے کرو، اور اس کی قدر یہی ہے کہ جوانی میں عبادات کا اہتمام اور معاصی سے اجتناب کیا جائے، کیوں کہ جوانی کی عبادت اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے، حدیث پاک میں فرمایا گیا کہ جس نے اپنی جوانی میں عبادت کا اہتمام کیا ہوگا حق تعالیٰ ایسے جوان کو قیامت کے دن عرشِ عظیم کا سایہ عطا فرمائیں گے۔

لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ جوانی میں توفیق عبادت عموماً ان ہی کو نصیب ہوتی ہے جن کی یا تو بچپن میں اچھی تربیت ہوتی ہے یا پھر انہیں جوانی میں اہل اللہ کی صحبت نصیب ہوتی ہے، اچھی تربیت اور اہل اللہ کی صحبت کے نتیجہ میں جوانی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزرتی ہے اور جوانی میں ہی فکر آخرت پیدا ہو جاتی ہے، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "خَيْرُ شَبَابِكُمْ مَنْ تَشَبَّهَ

بِكُهُوْلِكُمْ، وَ شَرُّ كُهُوْلِكُمْ مَنْ تَشَبَّهَ بِشَبَابِكُمْ". (رواه الطبراني في المعجم الأوسط)

''بہترین جوان وہ ہے جو بوڑھوں کے مانند (سنجیدہ اور فکر آخرت میں غرق) ہو، اور بدترین بوڑھا وہ ہے جو جوان کے مانند (بے فکر) ہو۔''

ہمارے بزرگوں کی جوانی طوفانی و دیوانی نہیں تھی، بلکہ بہترین، قابل رَشک اور نورانی تھی، انہوں نے ولایت کے اکثر درجات کو جوانی میں حاصل کر لیا تھا۔ ہمارے حضرت شیخ الزمان حضرت مولانا محمد قمر الزمان صاحب مدظلہ فرماتے ہیں کہ ولایت کے حصول کا اصل زمانہ جوانی ہے۔

شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں:

در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبراں ست — وقت پیری گرگ ظالم می شود پرہیز گار

''جوانی میں توبہ و استغفار انبیاءِ کرام علیہم السلام کا معمول رہا ہے، بڑھاپے میں تو خون خوار بھیڑیا بھی (کمزوری کے سبب) شکار چھوڑ دیتا ہے۔''

ایک نوجوان اللہ والے کا عبرت آموز واقعہ:

اس سلسلہ میں بھی ہمارے بزرگوں کے نہایت عبرت آموز واقعات ہیں، ایک نوجوان اللہ والے کا واقعہ ہے، ابو منصور بن عمارؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک اللہ والے نوجوان کو دیکھا کہ خائفین جیسی عبادت جوانی میں کر رہے ہیں، مجھے بڑا رَشک آیا، میں نے ان سے ملاقات کی، دورانِ گفتگو میں نے قرآنِ کریم کی ان آیاتِ مبارکہ کا ذکر کیا جن میں فرمایا گیا:

﴿ كَلَّا ۖ إِنَّهَا لَظٰى ۝ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝﴾ (المعارج: ۱۵-۱۶)

قیامت کے دن انسان نجات حاصل کرنے کے لیے سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جائے گا، مگر ایمان (و اعمال) کے بغیر ہرگز نجات حاصل نہ کر سکے گا، اس کا ٹھکانہ دوزخ

ہے، جو ایک بھڑکتی ہوئی آگ ہے، جو منہ اور سر کی کھال اُتار کر رکھ دے گی۔ العیاذ باللہ۔

یہ سنتے ہی نوجوان اللہ والے بے ہوش ہو گئے، کچھ دیر کے بعد جب ہوش آیا تو مزید قرآن سنانے کا مطالبہ کیا، حضرت ابومنصورؒ نے انہیں سورۂ تحریم کی ایک آیت کریمہ سنائی جس میں فرمایا گیا:

﴿ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَ اَھْلِیْکُمْ نَارًا﴾ (التحریم : ٦)

جس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو نارِ دوزخ سے بچاؤ، جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ (یہاں آدمی سے مراد تو بے ایمان ہیں، جن کی پہچان دوسرے مقام پر اس طرح بیان فرمائی گئی:

﴿ وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَھَنَّمَ کَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ۖ لَھُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ بِھَا ز وَ لَھُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِھَا ز وَ لَھُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِھَا ط اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ ط اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْغٰفِلُوْنَ۝﴾ (الأعراف : ۱۷۹)

اور پتھر سے مراد وہ بت جن کی پوجا کی جاتی تھی۔)

یہ سن کر اس اللہ والے نے چیخ ماری اور زمین پر گر پڑے، قریب جا کر دیکھا تو روح پرواز کر گئی تھی اور ان کے سینہ پر یہ آیت کریمہ لکھی ہوئی پائی:

﴿ فَھُوَ فِیْ عِیْشَۃٍ رَّاضِیَۃٍ ۝ فِیْ جَنَّۃٍ عَالِیَۃٍ۝﴾ (الحاقۃ : ۲۱-۲۲)

حضرتؒ فرماتے ہیں کہ میں نے رات کو خواب میں دیکھا کہ نوجوان سونے کے قیمتی تخت پر ہے اور سر پر ایک قیمتی تاج ہے، جب حال پوچھا تو فرمایا: میرے رب نے مجھے اصحابِ بدر والا اجر عطا فرمایا، کیوں کہ اصحابِ بدر کفار کی تلوار سے شہید ہوئے اور میں جبار کی تلوار سے شہید ہوا۔

عاجز نے حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھیؒ کے مزار پر یہ شعر لکھا ہوا دیکھا، جو اس واقعہ کا گویا ترجمان ہے:

آتشِ عشق نے جلا ڈالا زندگی ہم نے مر کے پائی ہے

یہی لوگ "شَابٌّ نَشَأَ فِیْ عِبَادَةِ اللّٰهِ" کے مصداق اور قیامت میں عرشِ عظیم کے مستحق ہیں۔

رَجُلٌ قَلْبُهٗ مُعَلَّقٌ بِالْمَسَاجِدِ :

تیسرا خوش نصیب "رَجُلٌ قَلْبُهٗ مُعَلَّقٌ بِالْمَسَاجِدِ" جس کا دل مسجد سے لگا ہوا ہو، اگر جسم مسجد میں ہو تب بھی دِل مسجد میں لگا ہوا رہے، اور اگر جسم مسجد سے باہر بازار یا گھر وغیرہ میں ہو تب بھی دِل مسجد میں لگا ہوا رہے، مطلب یہ ہے کہ ایک نماز ادا کر لی، پھر اپنی ضروریات اور کام کاج میں مشغول ہو گئے، لیکن دل میں دوسری نماز کا فکر اور انتظار رہے، اور جیسے ہی نماز کا وقت ہو فوراً مسجد کی طرف متوجہ ہو جائے، جیسے مساجد کے مؤذنین اور ائمہ وغیرہ، ظاہر ہے کہ جس کا یہ حال ہو وہ مسجد کی نماز اور جماعت سے کیسے غافل رہ سکتا ہے؟ ان ہی کی شان میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ رِجَالٌ لا لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰهِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ اِیْتَآءِ الزَّکٰوةِ ص یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ وَ الْاَبْصَارُ۝﴾ (النور : ۳۷)

اس آیت کریمہ میں حق تعالیٰ نے مسجد سے تعلق رکھنے والے اور مساجد کو اللہ تعالیٰ کی عبادت سے آباد رکھنے والوں کی پہچان کروائی ہے، فرمایا کہ وہ ایسے لوگ ہیں جنھیں ان کی خرید وفروخت اور لین دین اللہ تعالیٰ کے ذکر سے، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کرتی، اور ان اعمال کے اہتمام کے باوجود وہ قیامت کی ہولناکی سے ڈرتے ہیں، اس کے سب سے پہلے مصداق حضرات صحابہؓ تھے۔

ایک نصیحت آموز واقعہ :

اس سلسلہ میں تفسیر قرطبی میں ایک واقعہ منقول ہے کہ عہدِ رسالت میں دو صحابی تھے،

ایک تجارت کرتے اور دوسرے صنعت وحرفت، یعنی لوہار کا کام کرتے تھے اور تلواریں بنا کر بیچا کرتے تھے، پہلے صحابی کی تجارت کا حال یہ تھا کہ اگر سودا تولنے کے وقت اذان کی آواز کان میں پڑ جاتی تو وہیں ترازو کو پٹک کر نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے اور مسجد کی جانب چل پڑتے، دوسرے صحابی کا حال یہ تھا کہ اگر گرم لوہے پر ہتھوڑے کی ضرب لگا رہے ہوتے اور کان میں اذان کی آواز آتی تو وہیں مونڈھے کے پیچھے ہتھوڑا ڈال کر نماز کے لیے مسجد کی جانب چل دیتے، ان کی شان میں حق تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔

(مستفاد از: معارف القرآن: ۶/۴۳۰)

مسجد اللہ تعالیٰ کا گھر ہے، مسجد سے تعلق اللہ تعالیٰ سے تعلق کی علامت ہے، مسجد میں آنے والا اللہ تعالیٰ کا مہمان ہے، میزبان کے اکرام و برتاؤ اور اس کے ساتھ حسن سلوک کے اعتبار سے مہمان کی تین قسمیں ہیں:

(۱) پہلی قسم اس مہمان کی ہے جس کے آنے پر میزبان خوش ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ مہمان ہمارے گھر زیادہ قیام کرے۔

(۲) دوسری قسم اس مہمان کی ہے جس کے آنے پر میزبان کو خاص خوشی نہیں ہوتی، اس لیے وہ چاہتا ہے کہ جلدی سے مہمان چلا جائے۔

(۳) تیسری قسم اس مہمان کی ہے جس کو میزبان اپنے گھر برداشت ہی نہیں کرتا، سخت ناراضی کے سبب بلاتا ہی نہیں۔

مسجد جو کہ اللہ تعالیٰ کا گھر ہے اس کا معاملہ بھی بالکل اسی طرح ہے کہ اس میں آنے والا اللہ تعالیٰ کا مہمان ہوتا ہے، لہٰذا صاحبو! اگر مسجد میں آنے کے بعد ہمارا دل ذکر اللہ اور نماز وغیرہ میں خوب لگے اور مسجد سے باہر نکلنے کو دل نہ چاہے تو سمجھ لو کہ ہمارا شمار عنداللہ مہمان کی پہلی قسم میں ہے، اور اگر مسجد میں آنے کے بعد دل ہی نہیں لگتا، جی چاہتا ہے کہ جلدی سے گھر، آفس یا بازار وغیرہ چلے جائیں تو سمجھ لو کہ ہمارا شمار عنداللہ مہمان کی دوسری قسم میں ہے،

اور اگر خدانخواستہ کسی کو مسجد میں آنے کی توفیق ہی نہیں ہوتی تو اس کے لیے بہت محرومی کی بات ہے، کیوں کہ اس کا شمار عنداللہ مہمان کی تیسری قسم میں ہے۔ والعیاذ باللہ۔

جو لوگ ہر حال میں مسجد سے تعلق رکھتے ہیں ان کے لیے بڑے فضائل وارد ہوئے ہیں، ایک حدیث میں جو حضرت جابرؓ سے مروی ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عَنْ جَابِرٍؓ ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ أَظَلَّهُ اللّٰهُ تَحْتَ ظِلِّ عَرْشِهٖ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهٗ، اَلْوُضُوْءُ عَلَى الْمَكَارِهِ، وَ الْمَشْيُ إِلَى الْمَسَاجِدِ فِي الظَّلَامِ، وَ إِطْعَامُ الْجَائِعِ". (كنز العمال : ٩/٤٣٢)

تین خصلتیں جس شخص میں ہوں گی حق تعالیٰ اسے قیامت میں عرشِ عظیم کا سایہ عطا فرمائیں گے: (۱) تکلیف یا تنگی کے باوجود (سنت کی مکمل رعایت کے ساتھ) وضو کرنا (۲) تاریکی کے باوجود مساجد کی طرف نماز کے لیے جانا (۳) بھوکے کو (اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے) کھانا کھلانا۔ اللّٰهم اجعلنا منهم.

رَجُلَانِ تَحَابَّا فِي اللّٰهِ اِجْتَمَعَا عَلَيْهِ وَ تَفَرَّقَا عَلَيْهِ:

چوتھے وہ دو خوش نصیب "تَحَابَّا فِي اللّٰهِ اِجْتَمَعَا عَلَيْهِ وَ تَفَرَّقَا عَلَيْهِ" جن کا آپسی تعلق اور محبت اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہو، کوئی دنیوی غرض اس محبت میں داخل نہ ہو، اسی محبت کی بنیاد پر وہ جمع اور جدا ہوتے ہوں، وہ "الحب فی اللہ" اور "البغض فی اللہ" کے مصداق ہوں، خواہ وہ استاذ اور شاگرد ہوں، پیر اور مرید ہوں، امام اور مقتدی ہوں، یا کوئی بھی دو مسلمان ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ دلوں میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اُلفت و محبت کا پیدا ہو جانا یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام و احسان ہے، حق تعالیٰ نے اسے بطورِ انعام و احسان بیان فرمایا:

﴿ وَ أَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ ط لَوْ أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ ط إِنَّهٗ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ○﴾ (الأنفال : ٦٣)

''اہلِ ایمان کے دلوں میں آپسی محبت واُلفت بھی اللہ تعالیٰ ہی نے اپنے فضل وکرم سے پیدا فرمادی، اگر آپ وہ سب کچھ خرچ کردیتے جو زمین میں ہے تب بھی ان کے درمیان محبت پیدا نہیں کر سکتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان محبت پیدا کردی، بلاشبہ اللہ تعالیٰ غلبہ والا حکمت والا ہے۔''

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں دلوں کا جڑ جانا وہ انعام اور احسان ہے کہ دنیا کی کوئی دولت اس کی قیمت نہیں بن سکتی، اور جب آپس میں اللہ تعالیٰ کے لیے محبت کرنا اللہ تعالیٰ کا انعام واحسان ہے تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے ساتھ یہ انعام حاصل نہیں کیا جاسکتا، یہ انعام ایمان اور ایمانی اعمال کی بنیاد پر حاصل ہوتا ہے، حضرات صحابہؓ وصلحاء کا ایمان بہت قوی اور زندگی ایمانی اعمال والی تھی، اس لیے ان کے درمیان بے مثال اُلفت ومحبت تھی، ان کے درمیان اگر رائے کا اختلاف تھا بھی تو وہ ایک دوسرے کے خلاف جھگڑے کا سبب نہیں بنا اور حق واضح ہونے کے بعد اختلاف اتفاق میں بدل گیا۔

ایک واقعہ:

اس سلسلہ میں ایک نصیحت آموز واقعہ ہے کہ حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ جب مرض الوفات میں مبتلا ہوئے تو چراغ دہلوی حضرت شاہ نصیر صاحبؒ ان کی عیادت کے لیے تشریف لائے، خادم نے شاہ عبدالحق صاحبؒ کو اطلاع دے کر اجازت چاہی تو فرمایا کہ شاہ نصیر سے کہہ دو کہ تم چوں کہ سماع سے رغبت رکھتے ہو، اس لیے میں تم سے ملنا نہیں چاہتا، خادم نے شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ کا یہ پیغام شاہ نصیر چراغ دہلویؒ کو پہنچایا، تو وہ بھی ناراض نہیں ہوئے، بلکہ خادم کے ذریعہ کہلوا دیا کہ آئندہ کے لیے سماع سے توبہ کرتا ہوں، جب خادم نے ان کا یہ جواب شاہ عبدالحق صاحبؒ کو سنایا تو آپؒ بیٹھ گئے اور سر سے عمامہ اُتار کر خادم سے فرمایا: ''اب ان کے راستہ میں یہ عمامہ بچھا دو، تاکہ اس پر قدم رکھ کر وہ تشریف لائیں''۔

سچ ہے کہ:

فرصت زندگی کم ہے محبت کے لیے   لاتے ہیں لوگ وقت کہاں سے نفرت کے لیے

یہی لوگ دراصل اس حدیث پاک کے مصداق ہیں جس میں فرمایا: ''وَ رَجُلَانِ تَحَابَّا فِي اللّٰهِ اِجْتَمَعَا عَلَيْهِ وَ تَفَرَّقَا عَلَيْهِ'' اور یہی لوگ عرشِ عظیم کے سایہ کے مستحق ہیں۔

ایک حدیث قدسی میں وارد ہے:

'' اَلْمُتَحَابُّوْنَ فِيْ جَلَالِيْ لَهُمْ مَنَابِرُ مِنْ نُوْرٍ يَغْبِطُهُمُ النَّبِيُّوْنَ وَ الشُّهَدَاءُ''.

(رواه الترمذی، مشکوٰة: ۴۲۶) (حدیث قدسی نمبر:۱۳)

اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے محبت کرنے والے نور کے منبروں پر عرشِ عظیم کے سایہ میں ہوں گے، جس دن اس کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا، ان کے اس عظیم مرتبہ ومقام پر حضرات انبیاء اور شہداء بھی رشک (تعریف) کریں گے۔

(یا پھر یہاں رشک کا مطلب یہ ہے کہ بالفرض اگر حضرات انبیاء وشہداء کسی پر رشک کرتے تو یہ لوگ ہیں جن کے مقام پر رشک کیا جاتا)۔ (مظاہر حق جدید: ۴/۵۷۸)

وَ رَجُلٌ ذَكَرَ اللّٰهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ:

پانچواں خوش نصیب ''وَ رَجُلٌ ذَكَرَ اللّٰهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ'' وہ شخص ہے جو تنہائی میں اللہ تعالیٰ کو یاد کر کے اس کے خوف یا ملاقات کے شوق میں روئے۔

اللہ تعالیٰ کے خوف اور ملاقات کے شوق میں رونا تو بہر حال پسندیدہ عمل ہے؛ لیکن مجمع میں اگر یہ عمل ہو تو ریا کاری کا خطرہ ہے، جب کہ تنہائی میں خلوص ہوتا ہے، اس لیے تنہائی میں اللہ تعالیٰ کو یاد کر کے رونے والے بندے اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہیں، نیز خلوت معصیت کا بڑا سبب بھی ہے، لوگوں کے سامنے تو عموماً لوگ گناہوں سے بچتے ہیں، لیکن خلوت اور تنہائی میں اچھے خاصے دین دار لوگ بھی گناہوں سے کم بچ پاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جب خلوت

میں گناہ کا موقع ہو تب ارتکابِ معاصی کے بجائے اپنے گناہوں کو یاد کر کے رونا، یا خلوت میں اللہ تعالیٰ کو یاد کر کے اس کی ملاقات کے شوق میں رونا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔

اسی کے ساتھ حدیث پاک میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دو قطرے اور دو قدم بہت پسند ہیں: (۱) گنہگار کی آنکھ سے نکلنے والا اَشک ندامت (۲) شہید کے جسم سے نکلنے والا خون کا قطرہ، اور قدموں میں: (۱) جہاد فی سبیل اللہ کی طرف بڑھنے والا قدم (۲) فرائض کی ادائیگی میں اُٹھنے والا قدم۔ (ترمذی، مشکوٰۃ:۳۳۴)

یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کو وہ بندہ بہت پسند ہے جو جلوت (مجمع) میں خندہ پیشانی یعنی لوگوں کے ساتھ ہنستے مسکراتے چہرے کے ساتھ پیش آئے، اور خلوت (تنہائی) میں اللہ تعالیٰ کے سامنے گریہ وزاری کرے، منقول ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہر وقت خندہ پیشانی سے پیش آتے، جب کہ ان کے خالہ زاد بھائی حضرت یحییٰ علیہ السلام ہر وقت گریہ وزاری کرتے رہتے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اپنی کتاب منبہات میں یہ روایت نقل فرمائی ہے کہ ایک مرتبہ حق تعالیٰ نے دونوں کی طرف وحی بھیجی، جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ تم خلوت میں تو اس طرح رہو جس طرح حضرت یحییٰ رہتے ہیں، اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کے پاس وحی بھیجی کہ تم جلوت میں اس طرح رہو جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام رہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جلوت میں خندہ پیشانی اور خلوت میں گریہ و زاری سے رہو، ہم لوگوں کو تو ہنستے ہوئے اچھے لگتے ہیں اس لیے ان کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنے کا حکم ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ کو روتے ہوئے اچھے لگتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے تنہائی میں رونے کا حکم ہے، اب جو لوگ اللہ تعالیٰ کے خوف یا ملاقات کے شوق میں روتے ہیں، قیامت کے دن جب یہ خوش نصیب لوگ جنت اور اس کی نعمتوں کا قریب سے مشاہدہ کریں گے تو کہا جائے گا:

﴿ هٰذَا مَا تُوعَدُونَ لِكُلِّ أَوَّابٍ حَفِيظٍ ﴾ (ق : ۳۲)

”یہی وہ جنت ہے جس کا وعدہ ہر اَوّاب اور حفیظ سے کیا گیا تھا۔“

حضرات مفسرین کے بقول ”اَوّاب“ کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ”اَوّاب“ وہ شخص ہے جو خلوت میں اپنے گناہوں کو یاد کرے اور اللہ پاک سے مغفرت طلب کرے۔ (معارف القرآن: ۸/۱۴۷)

ان کا خلوت میں گناہوں پر اَشک ندامت بہا کر مغفرت طلب کرنا حق تعالیٰ کو اس قدر پسند ہے کہ ان کا ایک آنسو بھی نارِ دوزخ کو بجھانے کے لیے کافی ہے، کیوں کہ حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَا مِنْ عَبْدٍ مُؤْمِنٍ يَخْرُجُ مِنْ عَيْنَيْهِ دُمُوْعٌ، وَ إِنْ كَانَ مِثْلَ رَأْسِ الذُّبَابِ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ، ثُمَّ تُصِيْبُ شَيْئًا مِنْ حُرِّ وَجْهِهٖ، إِلَّا حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ".

(رواه ابن ماجه، مشكوٰة: ٤٨٥، باب البكاء و الخوف)

”جس بندے کی آنکھ سے مکھی کے سر کے برابر بھی آنسو (اللہ تعالیٰ کے خوف یا اس کی ملاقات کے شوق سے) نکل کر اس کے چہرے کے ظاہری حصہ کو چھوئیں (مطلب یہ ہے کہ وہ آنسو آنکھ سے نکل کر چہرے پر گریں) تو حق تعالیٰ اس پر دوزخ کو حرام کر دیں گے۔“

غور کرنے کا مقام ہے، حدیث پاک میں یہ نہیں فرمایا کہ "حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ النَّارَ" (اللہ اس پر دوزخ کو حرام فرما دیں گے) بلکہ یہ فرمایا کہ "حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ" (اس رونے والے مؤمن بندہ کو دوزخ پر حرام فرما دیں گے) اس کا مطلب یہ ہے کہ بالفرض ایسے مؤمن کو کسی وجہ سے دوزخ میں ڈالا بھی جائے تو دوزخ پر حرام ہے کہ اس کو جلائے یا اَذیت پہنچائے۔

وَ رَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ حَسَبٍ وَ جَمَالٍ فَقَالَ: إِنِّىْ أَخَافُ اللّٰهَ:

چھٹا خوش نصیب ”وَ رَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ حَسَبٍ وَ جَمَالٍ، فَقَالَ: إِنِّىْ أَخَافُ اللّٰهَ“ وہ شخص جس کو عالی حسب و نسب والی خوب صورت عورت دعوتِ معصیت دے، اور وہ بندہ خشیت الٰہی کی وجہ سے انکار کر دے، اس کی بدکاری کی پیش کش کو ٹھکرا دے، حالانکہ بدکاری اور دل کو للچانے والی دعوت کسی خوب صورت عورت کی طرف سے ملے تو فطرۃً انسان اس کی طرف مائل ہو ہی جاتا ہے، ”إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبِّى“، حضرت یوسف علیہ السلام کی بھری جوانی میں جب یہ معاملہ پیش آیا اور زلیخا نے دعوتِ معصیت دیتے ہوئے کہا: ﴿هَيْتَ لَكَ﴾ آجاؤ، انتظار نہ کرو، تو اس وقت آپ نے پوری قوتِ ایمانی کے ساتھ جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ﴾ (یوسف:۲۳) اللہ کی پناہ، یہ کام میں کبھی نہیں کر سکتا۔

بلاشبہ یہ مرحلہ بہت ہی نازک ہوتا ہے، ﴿وَ إِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝﴾ (البقرة: ٤٥) لیکن جن کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہو ان کے لیے کوئی مشکل نہیں، کیوں کہ دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہو تو کسی بھی انسان کے لیے عین گناہ کے موقع پر بھی گناہ سے بچنا آسان ہو جاتا ہے، انسان کو اگر کوئی چیز جرائم سے بچا سکتی ہے تو وہ ہے خوفِ خدا، پولس کا ڈنڈا اور حکومت کا قانون وقتی طور پر انسان کو گناہ سے دور رکھ سکتے ہیں، لیکن گناہوں سے حفاظت کے لیے خشیت الٰہی اور خوفِ خداوندی کی ضرورت ہوتی ہے، اگر انسان میں یہ چیز ہے تو اس کے لیے تنہائی میں بھی گناہ سے بچنا آسان ہوتا ہے۔

چنانچہ حکیم ترمذیؒ کا واقعہ ہے کہ جوانی کے عالم میں ان پر ایک عورت یکطرفہ عاشق ہو گئی اور ان کی تلاش و طلب میں رہنے لگی، اتفاق سے ایک مرتبہ کسی باغ میں آپ کو تنہا پا کر اپنی خواہش کا اظہار کر دیا، اب اس وقت آپ گناہ کرنا چاہتے تو بظاہر کوئی رُکاوٹ نہ تھی، کیوں کہ باغ چہار دیواری سے بند تھا، پھر دعوتِ معصیت بھی عورت کی طرف سے تھی، لیکن

اس موقع پر آپ نے صاف فرما دیا: ”إِنِّىْ أَخَافُ اللّٰهَ“ اور گناہ سے بچنے کی غرض سے باغ کی دیوار سے کود پڑے، واقعہ یہ ہے کہ بندہ جب گناہ سے بچنا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے بند راستے بھی کھول دیتے ہیں، بشرطیکہ انسان گناہ سے بھاگ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر لے، پھر اللہ تعالیٰ کی نصرت اجتناب عن المعاصی کا سبب بن جاتی ہے، حکیم ترمذیؒ کے ساتھ ایسا ہی ہوا، لیکن اس واقعہ کے ایک عرصہ کے بعد ایک روز بڑھاپے میں یہ وسوسہ آیا کہ اگر میں اس دن اس عورت کی دِل شکنی نہ کرتا، اس کی خواہش پوری کر دیتا اور بعد میں توبہ کر لیتا، تو گناہ بھی معاف ہو جاتا اور اس کی دل شکنی بھی نہ ہوتی، اس وسوسہ سے آپ بہت پریشان ہو گئے اور رونے لگے، اسی حالت میں نیند کا غلبہ ہوا تو خواب میں جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی زیارت ہوئی، آپ ﷺ نے تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ”غم نہ کرو، تمہارا مرتبہ و مقام اللہ تعالیٰ کے یہاں اس وسوسہ کی وجہ سے کم نہیں ہوا، رہی بات اس وسوسہ کی، تو یہ زمانہ وسوسوں کا ہے، کیوں کہ میرے زمانہ سے دور ہے، اور تمہاری جوانی کا زمانہ میرے زمانہ سے قریب تھا، خوفِ الٰہی کا غلبہ تھا اس لیے تم گناہ اور اس کے وسوسہ سے محفوظ رہے۔“ (رہے سلامت تمہاری نسبت)

یقیناً یہ لوگ اس حدیث پاک کے مصداق اور قیامت میں عرشِ عظیم کے سایہ کے مستحق ہیں۔ اللّٰهم اجعلنا منهم.

وَ رَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ، فَأَخْفَاهَا، حَتّٰى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهٗ مَا تُنْفِقُ يَمِيْنُهٗ:

ساتواں خوش نصیب ”رَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ، فَأَخْفَاهَا، حَتّٰى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهٗ مَا تُنْفِقُ يَمِيْنُهٗ“ وہ شخص ہے جو مصارفِ خیر اور صدقہ کے مواقع میں اس قدر اخلاص کے ساتھ صدقہ کرتا ہے کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہ ہو کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا صدقہ کیا، مطلب یہ ہے کہ اس اخلاص کے ساتھ صدقہ کرے کہ اس کے کسی عزیز اور قریب کو بھی

خبر نہ ہو، حتیٰ کہ جو شخص اس کے بائیں ہاتھ کے مانند ہر وقت ساتھ اور قریب ہو اس مخلص کے نفلی صدقہ کی خبر اسے بھی نہ ہو، صدقہ خواہ علانیہ کیا جائے یا پوشیدہ، اگر مالِ حلال سے اخلاص کے ساتھ کیا جائے تو یہ بہر حال گناہوں سے معافی اور رضاءِ الٰہی کا بہترین ذریعہ ہے، لیکن اگر صدقہ میں اِخفاء ہو تو عموماً اس میں اخلاص زیادہ ہوتا ہے، عام حالات میں یہی حکم ہے، الا یہ کہ کوئی خاص شرعی حکمت پیش نظر ہو، تب صدقہ میں اظہار کی گنجائش ہے، (لیکن اس وقت بھی تصاویر بنانے کی قطعاً اجازت نہیں، یہ گناہ بھی ہے اور اس میں غرباء کی عزتِ نفس بھی مجروح ہوتی ہے، لہٰذا اس بدترین رسم کو ختم کرنا چاہیے)۔

علماء نے صدقاتِ نافلہ میں اخفاء اور اداءِ زکوٰۃ میں اظہار کو افضل قرار دیا ہے؛ لیکن قرآنِ کریم نے مطلقاً صدقات میں اخفاء کو افضل کہا ہے، حدیث پاک کے عموم سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، الغرض حسب ضرورت و مصلحت علانیہ وخفیہ ہر طرح صدقہ کا اہتمام کیا جائے، حق تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَ إِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ يُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۚ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ (البقرة: ۲۷۱)

”اگر تم صدقات وخیرات کو ظاہر کر کے دو تب بھی اچھا ہے، لیکن اگر چھپا کر دو تو یہ زیادہ بہتر ہے، اور اللہ (اس کی برکت سے) تمہارے گناہوں کو مٹا دے گا، اور اللہ تمہارے تمام اعمال کی خبر رکھنے والا ہے۔“

ایک عبرت ناک واقعہ:

جو لوگ چھپنے سے زیادہ چُھپنے کا اہتمام کرتے ہیں اور نہایت خاموشی کے ساتھ صدقات وخیرات کا انتظام کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے عمل کو ہرگز ضائع نہیں ہونے دیتا، ان کے اس مخلصانہ صدقہ سے جہاں ان کا دینی واُخروی نفع ہوتا ہے وہاں اس کی برکت سے دوسرے کو بھی اللہ تعالیٰ خیر وبرکت سے نواز دیتے ہیں۔

حدیث پاک میں ایک عبرت ناک واقعہ منقول ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک مال

دار شخص نے اپنے دل میں خاموشی کے ساتھ صدقہ کرنے کی نیت کی، پھر رات کی تاریکی میں کسی مستحق کو دینے کی نیت سے چلا، اس نے رات کے اندھیرے میں صدقہ کر دیا، مگر جب صبح ہوئی تو لوگوں میں چرچا ہوا کہ رات میں کسی نے چور کو صدقہ دیا، اس نے اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہوئے اپنے دل میں کہا کہ اے اللہ! تو میری نیت سے واقف ہے، میں تو کسی ضرورت مند کو صدقہ کرنا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے دوبارہ ارادہ کیا کہ آج پھر رات میں صدقہ کروں گا، پھر رات کو صدقہ لے کر نکلا تو ایک عورت مل گئی، جسے اس نے مستحق سمجھ کر صدقہ دے دیا، جب صبح ہوئی تو لوگوں میں باتیں ہونے لگیں کہ رات میں کسی نے زانیہ کو صدقہ دیدیا، اس شخص نے یہ سن کر اللہ تعالیٰ کی حمد کی اور عرض کیا: اے اللہ! میری نیت کو تو تو جانتا ہی ہے، میں تو کسی مستحق کو صدقہ دینا چاہتا تھا، اس نے پھر ارادہ کیا اور رات کی تاریکی میں صدقہ لے کر نکلا، ایک شخص ملا تو اسے غریب سمجھ کر صدقہ دے دیا، لیکن صبح میں پھر شور ہوا کہ رات میں کسی نے مال دار کو صدقہ دے دیا، اس نے پھر اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کرتے ہوئے عرض کیا: یا اللہ! تو میری نیت کو اچھی طرح جانتا ہے، اس مخلص کو وقت کے نبی کے ذریعہ یا خواب کے ذریعہ یہ بشارت دی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے تمام صدقات کو قبول کر لیا اور ان صدقات کی برکت سے چور کو چوری سے، زانیہ کو زنا سے اور مال دار بخیل کو بخل سے توبہ کی توفیق عطا فرما دی۔ (مشکوٰۃ: ۱۶۵، باب الانفاق وکراہیۃ الامساک)

سب سے پہلے عرشِ عظیم کا سایہ حاصل کرنے والا:

اخلاص واخفاء کے ساتھ کیا ہوا صدقہ کبھی ضائع نہیں ہوتا، آج اس کی بہت ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ نے جنہیں مال دیا ہے انہیں چاہیے کہ اسے ضرورت مندوں بالخصوص جو لوگ ضرورت مند اور تنگ دست ہونے کے باوجود ظاہر نہیں کرتے، انہیں خود جا جا کر ڈھونڈیں، پھر نظریں جھکا کر خاموشی کے ساتھ اِمداد کر کے اُلٹے قدم واپس آ جائیں، ان کا یہ عمل کوئی جانے نہ جانے، اللہ تعالیٰ تو ضرور جانتا ہے، اور اس طرح کا عمل اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے، چنانچہ طبرانی کی ایک حدیث میں ہے:

" إِنَّ أَوَّلَ النَّاسِ يَسْتَظِلُّ فِيْ ظِلِّ اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَجُلٌ أَنْظَرَ مُعْسِرًا، أَوْ تَصَدَّقَ عَلَيْهِ".

''سب سے پہلا شخص جو قیامت کے دِن عرشِ عظیم کا سایہ حاصل کرے گا وہ ایسا شخص ہوگا جس نے کسی تنگدست کو مہلت دی ہوگی یا اس کو صدقہ دیا ہوگا۔'' تاکہ وہ اپنا قرض اُتار سکے۔ اللّٰھم اجعلنا منھم.

نوٹ: ان سطور کا مطالعہ کرنے والے ہر ساتھی سے دست بستہ التجاء ہے کہ اس عاجز کے لیے اس کے والدین، اولاد، ازواج، اعزہ واقرباء اور محسنین ومرحومین کے لیے دارین میں کامیابی کی دعا فرما کر ممنون فرمائیں۔

۴/ رمضان/ ۱۴۴۰ھ/ قبل الجمعہ
مطابق: ۱۰/ مئی/ ۲۰۱۹ء (بزمِ صدیقی، بڑودا)

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيْرًا — فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيْرًا كَثِيْرًا

(۱۸)

ازدواجی زندگی کو کامیاب کیسے بنائیں؟

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ : لِمَالِهَا، وَ لِحَسَبِهَا، وَ لِجَمَالِهَا، وَ لِدِيْنِهَا، فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ، تَرِبَتْ يَدَاكَ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٢٦٧/ كتاب النكاح)

ترجمہ : حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کسی عورت سے چار چیزوں کی بنیاد پر نکاح کیا جاتا ہے: (۱) یا تو اس کی مال داری کی وجہ سے (جیسا کہ یہودیوں کا طریقہ ہے) (۲) یا تو شرافت نسبی کی وجہ سے (جیسا کہ مشرکین کا طریقہ ہے) (۳) یا تو خوب صورتی کی وجہ سے (جیسا کہ نصاریٰ کا طریقہ ہے) (۴) یا پھر دین داری کی وجہ سے (جو مسلمانوں کا طریقہ ہے) (اگر شادی کو شاندار اور سدا بہار بنانا چاہتے ہو تو) تم دین داری کی بنیاد پر نکاح کرو۔
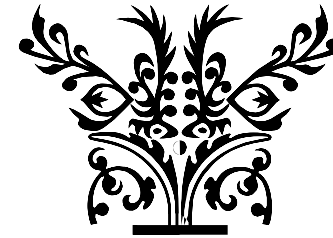
شادی کی خوشی میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی ملحوظ رکھی جائے:

اللہ رب العزت جب کسی انسان کو اس کی مطلوب ومحبوب اور پیاری وپسندیدہ چیز عطا فرماتے ہیں یا دل کی مراد وتمنا پوری فرماتے ہیں تو اس وقت اس کے دل میں ایک خاص قسم کی کیفیت ولذت پیدا ہوتی ہے، جسے فرحت، مسرت اور خوشی کہا جاتا ہے، یوں تو ہر انسان کی زندگی میں من جانب اللہ خوشیوں کے مختلف مواقع آتے ہیں، لیکن شادی کی شکل میں جو خوشی آتی ہے وہ نہایت شاندار اور یادگار رہتی ہے، بلکہ شادی کرنے والا ہر امیر وغریب اپنی حیثیت کے مطابق اور اکثر لوگ اپنی حیثیت سے بھی بڑھ کر مختلف طریقوں سے شادی کو شاندار اور یادگار بنانے کی کوشش کرتے ہیں، اور آج کمپٹیشن کے دور میں تو ہر شخص اس موقع پر ایک دوسرے سے بڑھ کر حصہ لے رہا ہے، شاندار ڈیکوریشن ہو، شاندار شامیانہ ہو، شاندار مہمانی ہو، وغیرہ، جس کی وجہ سے عموماً آج کل شادی شاندار اور یادگار تو بن جاتی ہے، لیکن سدا بہار نہیں بنتی، بعض اوقات شادی کی یہ شاندار اور یادگار خوشی ''چار دن کی چاندنی پھر وہی اندھیری رات'' کا مصداق بن جاتی ہے، کیوں کہ یہ شادی چند دنوں، مہینوں یا سالوں کے بعد خانہ خرابی کا سبب بن جاتی ہے، یا پھر زوجین کے والدین کے لیے شادی کی یہ خوشی قرض کی وجہ سے زندگی بھر کے غم کا سبب بن جاتی ہے۔

لیکن اگر شادی کی اس خوشی میں جہاں ہر کسی کو خوش رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے وہاں اگر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی رضامندی وخوشنودی کو بھی ملحوظ رکھا جائے تو واقعہ یہ ہے کہ شادی کی خوشی شاندار اور یادگار بنے نہ بنے سدا بہار ضرور بن جائے گی، کیوں کہ اس صورت میں یہ شادی خانہ آبادی اور دارین کی کامیابی کا ذریعہ بنتی ہے، حضرات صحابہؓ و صلحاء کے یہاں شادی ہماری طرح شاندار اور یادگار تو نہ ہوتی تھی؛ البتہ سدا بہار ضرور ہوتی

تھی، اس لیے کہ وہ اپنی شادی کی خوشی میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی خوشی کو بہر حال پیش نظر رکھتے تھے، اگر ہم بھی اپنی اور اپنی اولاد کی شادی کو واقعی اور شاندار اور سدا بہار بنانے کے خواہش مند ہیں (اور عاجز کے خیالِ ناقص میں وہ شادی سدا بہار ہے جس کے بعد گھر آباد اور آخرت کامیاب ہو جائے) تو ہمیں اس موقع پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔

شادی سے پہلے دو ہدایتیں:

شادی کی خوشی میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی کو ملحوظ رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس سلسلہ میں شریعت اسلامیہ نے ہمیں جو ہدایات وتعلیمات دی ہیں ان پر عمل کیا جائے، شریعت چاہتی ہے کہ ہر کسی کی شادی واقعی شاندار اور سدا بہار بنے، اس کے لیے بنیادی طور پر دو ہدایتیں شادی سے پہلے کے لیے دیں، دو ہدایتیں عین شادی کے موقع کے لیے دیں اور دو ہدایتیں شادی کے بعد کے لیے دیں، شادی سے پہلے جب رشتۂ نکاح کے انتخاب کا مرحلہ آئے تو اس وقت کے لیے جو دو ہدایتیں دی گئی ہیں ان میں ایک تو کفو اور برابری کی ہے، دوسری دین داری کی ہے، کفو اور برابری کا مطلب یہ ہے کہ جن دو میاں بیوی کے درمیان رشتۂ نکاح طے کیا جا رہا ہے ان میں جہاں تک ممکن ہو دینی، معاشی اور معاشرتی اعتبار سے برابری کو پیش نظر رکھا جائے، البتہ یہ بات مستحب ہے کہ عمر، عزت، شرافت اور مال ودولت میں بیوی خاوند سے کم ہو، لیکن حسن وجمال اور اخلاق وعادات میں بیوی خاوند سے بڑھ کر ہو، تاکہ میاں بیوی کے درمیان فکر وخیال، عادات واَطوار اور رہن سہن میں حتی الامکان یکسانیت اور مناسبت پیدا ہو جائے اور نکاح کے بعد میاں بیوی کا یہ رشتہ استوار، خوشگوار اور سدا بہار بن جائے، اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو پھر عموماً بے جوڑ نکاح میں مقصد نکاح فوت ہو جاتا ہے، اس لیے شریعت نے اس کی طرف توجہ دلائی اور خود صاحب شریعت، نبیٔ رحمت جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " تَخَيَّرُوْا لِنُطَفِكُمْ، وَ انْكِحُوْا الْأَكْفَاءَ، وَ أَنْكِحُوْا إِلَيْهِمْ". (رواه ابن ماجه / باب الأكفاء)

’’اپنے نطفوں کے لیے اچھے رِشتہ کا انتخاب کرو اور برابری والوں میں نکاح کرو اور کراؤ‘‘۔

اس کے علاوہ شادی سے پہلے رشتۂ نکاح قائم کرنے کے وقت شریعت نے دوسری ہدایت یہ دی کہ دین داری کو ترجیح دی جائے، اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ کفو، برابری اور برادری میں بھی دین داری والے رِشتہ کو ترجیح دی جائے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر دو جگہ سے نکاح کا پیغام آیا یا دو جگہ رشتۂ نکاح ہوسکتا ہے، ایک تو کفو اور برادری میں، اور دوسرا غیر برادری میں، تو ان دونوں میں جو رشتہ دین داری والا ہو اسی کو ترجیح دی جائے، حدیث مذکورہ میں اسی کی ترغیب دی گئی، چنانچہ فرمایا: "فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ، تَرِبَتْ يَدَاكَ" شادی کو شاندار اور سدا بہار اور خانہ آبادی و دارین کی کامیابی کا ذریعہ بنانا چاہتے ہو تو دین داری کی بنیاد پر نکاح کرو، حضرات انبیاء، صحابہؓ اور صلحاء کا یہی طریقہ اور طرزِ عمل رہا ہے۔

علماءِ محققین نے فرمایا ہے کہ حضرات انبیاء و رُسل میں سوائے حضرت یحیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے تمام نے نکاح کیے، ارشادِ باری ہے:

﴿ وَ لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً ﴾ (الرعد:۳۸)

’’ہم نے آپ سے پہلے رسولوں کو بھیجا ہے، اور ہم نے ان کے لیے بیویاں اور اولاد کا سلسلہ جاری فرمایا‘‘۔

نیز فرمانِ نبوی ہے:

" أَرْبَعٌ مِنْ سُنَنِ الْمُرْسَلِيْنَ : الْحَيَاءُ، وَ التَّعَطُّرُ، وَ السِّوَاكُ، وَ النِّكَاحُ". (رواه الترمذی، مشکوٰة : ٤٤)

’’چار چیزیں رسولوں کی سنّتیں ہیں: حیاء، خوشبو لگانا، مسواک کرنا اور نکاح کرنا‘‘۔

حضرت یحیٰ علیہ السلام نے تو اس لیے نکاح نہیں فرمایا کہ حق تعالیٰ نے آپ کو ’’حصور‘‘ (جس کو قدرت کے باوجود نکاح کی رغبت نہ ہو) بنایا تھا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس لیے نکاح نہیں فرمایا کہ آپ کے دور میں آپ کے لائق پاک باز خاتون کوئی نہ تھی۔ (شامی:۴/۵۶) (قیامت سے قبل جب تشریف لائیں گے تو نکاح بھی فرمائیں گے)۔

رِشتۂ نکاح میں دین داری کو ترجیح دینا حضرات انبیاء وصلحاء کا طریقہ ہے:

معلوم ہوا کہ صرف نکاح کر لینا ہی حضرات انبیاء و رسل علیہم السلام کا طریقہ نہیں؛ بلکہ اس میں دین داری کو ترجیح دینا بھی حضرات انبیاء علیہم السلام و صلحاء کا طریقہ رہا ہے، ان کے یہاں نیک رِشتہ نہ ملنے کی وجہ سے تو نکاح کو مؤخر کیا گیا، لیکن دین داری والا رِشتہ ملنے کے بعد نکاح میں تاخیر نہیں ہوتی تھی، خود سید الانبیاء ﷺ نے اپنی لختِ جگر، نورِ نظر خاتونِ جنت سیدہ فاطمہؓ کا نکاح سیدنا علی کرّم اللہ وجہہ سے طے فرما کر اس سلسلہ میں ایک بہترین نمونہ قائم کر دیا، کیوں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کو حق تعالیٰ نے سیدہ خدیجہؓ سے نکاح کے بعد نہایت خوشحال اور مال دار بنا دیا تھا، جس کو قرآنِ پاک میں اس طرح بیان فرمایا:

﴿ وَ وَجَدَكَ عَآئِلاً فَأَغْنٰى ﴾ (الضحیٰ : ۸)

محبوبم! ہم نے آپ کو نادار پایا تو سیدہ خدیجہؓ سے رشتۂ نکاح کے بعد ایسا تونگر بنا دیا کہ ہمارے علاوہ ہر ایک سے آپ کو بے نیاز کر دیا۔

اس طرح سیدہ فاطمہؓ تو مکہ کے مال دار اور خوشحال گھرانے سے تھیں، جب کہ سیدنا علیؓ اس وقت غریب تھے، لیکن حضور ﷺ نے ان کی دین داری کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی لاڈلی سے نکاح کر دیا۔ (اس وقت حضرت علیؓ کی عمر ۲۱ سال اور حضرت فاطمہؓ کی عمر ۱۵ سال تھی)

اسی طرح جب ہم اپنے شاندار ماضی کی طرف دیکھتے ہیں تو ہمارے بزرگوں اور

بادشاہوں میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً بزرگوں میں حضرت سعید بن المسیبؒ کا واقعہ ہے کہ ان کی خدمت میں تن کے غریب من کے غنی حضرت عبداللہ بن وداعہؒ بکثرت حاضر ہوا کرتے تھے، ایک مرتبہ چند روز حاضر نہ ہو سکے، کئی روز کے بعد جب حاضر ہوئے تو حضرت سعیدؒ نے وجہ دریافت کی، عرض کیا کہ میری بیوی کا انتقال ہو گیا، جس کی وجہ سے مشاغل میں پھنسا رہا، آپؒ نے اظہارِ تعزیت کے بعد سوال کیا کہ اب نکاح (ثانی) کے متعلق کیا خیال ہے؟ کہا: حضرت! مجھ غریب سے کون شادی کرے گا؟ فرمایا: مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، تمہارا نکاح ہم خود کریں گے، اور واقعی آپؒ نے اپنی خوب صورت اور نیک سیرت بیٹی کا نکاح نہایت معمولی مہر پر حضرت عبداللہ بن وداعہؒ سے کر دیا، حالانکہ یہ رِشتہ بادشاہِ وقت نے اپنے بیٹے اور ولی عہد ولید کے لیے بھی مانگا تھا، مگر حضرت سعیدؒ نے عذر پیش کر دیا اور ایک غریب مگر دین دار سے بیٹی کا نکاح کر دیا، پھر خود ہی رات کے وقت بالکل خلافِ معمول اپنے اُس داماد کے گھر جا کر بیٹی کو ان کے حوالہ کر دیا۔ (حلیۃ لابی نعیم: ۲/۱۶۷، از: فضائل ذکر: ۱۵۴)

اس قسم کا دوسرا واقعہ شاہ شجاع کرمانیؒ کا ہے، جو بادشاہِ وقت تھے، انہوں نے اپنی شاہزادی کا نکاح ایک نیک نمازی سے کر دیا تھا۔ (تذکرۃ الاولیاء: ۱۷۸)

رِشتۂ نکاح میں دین داری کو ترجیح دینے کی برکت:

واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ حضرات انبیاء وصلحاء کے طریقہ پر عمل کرتے ہوئے رِشتۂ نکاح میں دین داری کو ترجیح دیتے ہیں وہ عموماً نکاح کے بعد ایک دوسرے کا استعمال کرنے کے بجائے ایک دوسرے کا خیال کرتے ہیں، اداءِ حقوق وحسن سلوک کا اہتمام کرتے ہیں، حق تعالیٰ ان کی شادی کو شاندار اور سدابہار بنا دیتے ہیں، کتاب وسنت میں بھی اس کا اشارہ ملتا ہے، چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ (النور: ۳۲)

یعنی یہ بات ممکن ہے کہ حق تعالیٰ اس نکاح کی برکت سے تمہاری تنگ دستی کو

کشادگی سے بدل دے، اور حدیث پاک میں نیک نیتی سے نکاح کرنے والے کے لیے نصرتِ الٰہی کی خوش خبری آئی ہے، فرمایا:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: "ثَلَاثَةٌ حَقٌّ عَلَى اللّٰهِ عَوْنُهُمْ، الْمُكَاتَبُ الَّذِيْ يُرِيْدُ الْأَدَاءَ، وَ النَّاكِحُ الَّذِيْ يُرِيْدُ الْعَفَافَ، وَ الْمُجَاهِدُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ". (رواه الترمذي، مشكوٰة: ۲۶۷)

’’تین قسم کے لوگ ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی ضرور مدد فرماتے ہیں: (۱) وہ مکاتب (غلام) جو بدلِ کتابت (اپنی آزادی کا معاوضہ) ادا کرنے کی نیت رکھتا ہو (۲) اپنی عفت وعصمت کی حفاظت کی نیت سے نکاح کرنے والا (۳) مجاہد فی سبیل اللہ۔‘‘

ایک اور حدیث میں ہے:

"مَنْ تَزَوَّجَ لِلّٰهِ تَوَّجَهُ اللّٰهُ تَاجَ الْمُلْكِ". (رواه أبوداود و الترمذي، مشكوٰة: ۳۷۵)

’’جس شخص نے رضاءِ الٰہی حاصل کرنے کی نیت سے نکاح کیا (مال داری، شرافت نسبی اور خوبصورتی کی بنیاد پر نہیں؛ بلکہ دین داری کی وجہ سے نکاح کیا) تو حق تعالیٰ اسے عزت وعظمت کا مقام عطا فرمائیں گے۔‘‘

اس قسم کے فوائد وبرکات کے حصول کے لیے بھی شریعت نے رشتۂ نکاح میں دین داری کو ترجیح دینے کی ترغیب دی ہے، اور یہی دانائی کا تقاضا بھی ہے، کیوں کہ

حسن صورت چند روزہ، حسن سیرت مستقل
اس سے خوش ہوتی ہیں آنکھیں، اس سے خوش ہوتا ہے دل

شادی کے وقت دو ہدایتیں:

شادی کے موقع کے لیے ایک ہدایت تو یہ ہے کہ اس میں اظہارِ خوشی تو ہو، لیکن خدا فراموشی نہ ہو، مطلب یہ ہے کہ شادی کی خوشی تو ضرور مناؤ، اس لیے کہ شادی کا مطلب ہے خوشی، لہٰذا اس موقع پر شرعی حدود میں رہتے ہوئے اظہارِ خوشی کا ہر مناسب طریقہ اختیار کیا جا

سکتا ہے، مثلاً اظہارِ خوشی کے لیے کچھ لائٹنگ وغیرہ کا انتظام کیا جائے، اسی طرح شادی کے سہرے وغیرہ پڑھے جائیں، یا اظہارِ خوشی کا ہر وہ طریقہ و رِواج جس میں خلافِ شرع کوئی بات نہ پائی جائے اس کی اجازت ہے، بس اتنا خیال رہے کہ شرعی حدود میں رہتے ہوئے اظہارِ خوشی تو ہو، لیکن اس بہانے ریاکاری، فضول خرچی اور خدا فراموشی نہ ہو، سب کو راضی کرنے کی فکر میں رب کو ناراض نہ کیا جائے، اگر شادی کا موقع بار بار نہیں آتا تو اس موقع پر رب کو راضی کرنے کا موقع بھی بار بار نہیں آتا، بدقسمتی سے اس وقت شادی کے موقع پر اظہارِ خوشی کے بہانے فضول خرچی اور بہت سی غیر شرعی رسوم انجام دی جاتی ہیں، جس نے ہماری شادیوں کو بڑا مشکل اور مہنگا بنا دیا ہے، جب کہ شریعت ہماری اِن مشکلات کو آسان کرنا چاہتی ہے، اس کے لیے شادی کے موقع پر دوسری ہدایت سادگی اختیار کرنے کی ہے، حدیث میں وارد ہے:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: "إِنَّ أَعْظَمَ النِّكَاحِ بَرَكَةً أَيْسَرُهُ مَؤُونَةً". (رواه البيهقي في شعب الإيمان، مشكوٰة: ۲۶۸)

"بلاشبہ سب سے زیادہ برکت والا نکاح وہ ہے جس کی محنت و مشقت (حرج و خرچ) کم ہو۔"

حرج کم ہونے کا مطلب تو یہ ہے کہ شادی سادگی کے ساتھ کی جائے، اور خرچ کم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس شادی اور نکاح میں مہر بھی زیادہ نہ ہو، اور بعد میں بیوی کے اخراجات و مطالبات بھی زیادہ نہ ہوں، وقت پر جو کچھ بھی حق وحلال کامل جائے اس پر راضی ہو جائے۔ شریعت نے شادی میں سادگی کی ترغیب اس لیے بھی دی کہ یہ سماج کے ہر فرد کی ضرورت ہے، اگر اسے مشکل بنا دیا گیا تو غریب کے لیے نکاح نہایت دشوار ہو جائے گا جس کے نتیجے میں زنا کا دروازہ کھل جائے گا، لہٰذا شریعت نے شادی میں سادگی کی ترغیب دے کر سب کے لیے آسانی پیدا کر دی، اگر کوئی شخص شرعی ہدایات کے مطابق شادی کرنا چاہے تو صرف چھ اعمال ہیں، جن کے انجام دینے سے شادی بآسانی ہو جاتی ہے، ان میں دو فرض،

ایک واجب اور تین مسنون اعمال ہیں، فرض تو زوجین کا برضا و رغبت ایجاب و قبول کرنا، اور دو شرعی گواہوں (دو مسلمان عاقل، بالغ مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں) کا موجود ہونا ہے، اور مہر واجب ہے، جب کہ خطبۂ نکاح، نکاح کے بعد چھوہاروں کی تقسیم، پھر حسب حیثیت دعوتِ ولیمہ (دولہے کی جانب سے، نہ کہ دولہن کی جانب سے) سنت ہے۔

صاحبو! یاد رکھو کہ شریعت نے شادی کو عملاً آسان اور زنا کو بہ طورِ سزا بہت مشکل بنایا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ جس سماج میں شادی آسان ہوگی وہاں زنا واقعی مشکل ہوگا، چنانچہ عہد نبوت میں شرعی ہدایات کے مطابق بالغ ہونے کے بعد فوراً مناسب رشتہ تلاش کر کے نکاح کر دیا جاتا تھا، دوسرے نکاح سادگی کے ساتھ نہایت آسانی سے ہوا کرتا تھا، تیسرے اگر بعد میں طلاق یا وفات کے بعد کوئی مرد یا عورت بے نکاح ہو جاتے تو فوراً نکاحِ ثانی کا اہتمام کیا جاتا تھا، اس کے باوجود بھی اگر کبھی کبھار زنا ہو جاتا تو حد نافذ کی جاتی، جس کی وجہ سے عہد نبوت میں زنا نہایت ہی مشکل تھا۔

عہد رسالت میں زنا کے صرف دو ہی واقعات کی تصدیق ہوتی ہے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ خود انہوں نے آ کر گناہ کا اعتراف کیا، چار گواہ تو مل ہی نہ سکے۔
(السنن الکبریٰ للبیہقی: ۸/۲۱۴)

جب کہ آج ان شرعی ہدایات کا اہتمام نہ ہونے کی وجہ سے سماج میں زنا آسان اور عام ہو گیا ہے، اس سے حفاظت و نجات کا راستہ یہی ہے کہ نکاح اور شادی کے سلسلہ میں شریعت نے جو ہدایات دی ہیں ان پر عمل کیا جائے، اور شادی کی عمر ہوتے ہی یعنی لڑکا اور لڑکی کے بالغ ہونے کے بعد برابری اور دین داری والا رشتہ تلاش کر کے شرعی حدود میں رہتے ہوئے سادگی کے ساتھ نکاح کر دیا جائے، پھر زوجین ایک دوسرے کے حقوق کی ادئیگی کے ساتھ حسن سلوک کا بھی اہتمام کریں، اس کے باوجود بعد میں خدانخواستہ طلاق یا وفات کا ناخوش گوار واقعہ پیش آ جائے تو نکاحِ ثانی کا اہتمام کیا جائے۔ (اس کے بعد بھی اگر زنا کا صدور ہو

تو اسلامی حکومت میں حاکم وقت شرعی حد نافذ کرے)۔

شادی کے بعد دو ہدایتیں:

الغرض! جب نکاح اور شادی ہو جائے تو اس کے بعد شریعت نے پہلی ہدایت تو اداءِ حقوق کی دی ہے، ارشادِ باری ہے:

﴿وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (البقرة: ۲۲۸)

مطلب یہ ہے کہ میاں بیوی کے ایک دوسرے پر حقوق ہیں جنہیں ادا کیا جائے، بیوی کے حقوق ادا کرنا شوہر کے ذمہ فرض ہے، اور شوہر کے حقوق ادا کرنا بیوی کے ذمہ فرض ہے، اور جب ہر ایک اپنے فرائض ادا کرنے کا اہتمام کرے گا تو دوسرے کے حقوق خود بخود ادا ہو جائیں گے، بیوی کے حقوق میں بنیادی طور پر مہر، مکان اور بنیادی ضروریات جیسے لباس، خوراک اور اَدویات وغیرہ کا انتظام کرنا ہے، جب کہ شوہر کے حقوق میں بنیادی طور پر (شوہر کی جائز امور یا جن کے مطالبہ کا شوہر کو حق حاصل ہے ان میں شوہر کی) اطاعت، گھربار اور مال کی حفاظت کے علاوہ اپنی عصمت وعزت کی حفاظت کرنا ہے، نیز شوہر کے تقاضائے فطرت (شہوت) کا خیال رکھنا ہے۔

شادی کے بعد دوسری ہدایت حسن سلوک کی ہے، اداءِ حقوق تو قانونی ذمہ داری ہے، لیکن ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک کرنا اخلاقی ذمہ داری ہے، میاں بیوی کا رشتہ نہایت اہم ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ حق تعالیٰ نے سب سے پہلے میاں بیوی کا رشتہ ہی پیدا فرمایا، اور دنیا کے سارے رشتے اسی رشتہ کی برکت ہیں۔

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً﴾ (النساء: ۱)

اس کا تقاضا یہ ہے کہ ایک مرتبہ یہ رشتہ قائم ہونے کے بعد حتی الامکان دائم رہنا چاہیے، اس کے لیے اداءِ حقوق کے ساتھ حسن سلوک کی بھی ضرورت ہے۔

ازدواجی زندگی کو کامیاب بنانے کی دس نبوی ٹپس:

اس عاجز کے خیالِ ناقص میں ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ازدواجی زندگی کو شاندار بنانے کی نبوی ٹپس استعمال کی جائیں جن میں دس باتیں شامل ہیں:

(۱) ایک دوسرے کے لیے چہرے پر مسکراہٹ سجائے رکھنا، بالخصوص ملاقات کے وقت، حدیث پاک میں ہے کہ ملاقات کے وقت مسکرا کر ملنا بھی (بشرطیکہ غیر محرم نہ ہو) صدقہ ہے۔

عَنْ أَبِيْ ذَرٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "تَبَسُّمُكَ فِيْ وَجْهِ أَخِيْكَ لَكَ صَدَقَةٌ". (ترمذی، مشکوٰۃ: ۱۶۸ / باب فضل الصدقة)

جب عام لوگوں کو اس کی ترغیب دی گئی ہے تو زوجین تو اس کے بدرجۂ اولیٰ حق دار ہیں، کیوں کہ بیوی اپنے شوہر کی اور شوہر اپنی بیوی کی مسکراہٹ کا سب سے زیادہ حق دار ہے۔

(۲) ایک دوسرے کے لیے صاف ستھرا رہنا اور زیب وزینت کا اہتمام کرنا۔ حدیث پاک میں وارد ہے کہ جب حضور ﷺ گھر تشریف لاتے تو مسواک کا اہتمام فرماتے۔

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا دَخَلَ بَيْتَهُ بَدَأَ بِالسِّوَاكِ". (رواه مسلم / باب السواك، مشکوٰۃ: ۴۴ / باب السواك)

معلوم ہوا کہ زوجین کو چاہیے کہ ایک دوسرے کے لیے منہ وغیرہ صاف رکھنے کا اہتمام کریں، نیز حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: "إِنِّيْ أُحِبُّ أَنْ أَتَزَيَّنَ لِلْمَرْأَةِ كَمَا أُحِبُّ أَنْ تَتَزَيَّنَ لِيْ".
(مصنف ابن أبی شیبة، بیهقی)

''میں اپنی بیوی کے لیے اسی طرح بن سنور کر رہنا پسند کرتا ہوں، جس طرح میں پسند کرتا ہوں کہ وہ میرے لیے بن سنور کر رہے۔'' یعنی دونوں ایک دوسرے کے لیے زیب و

زینت اختیار کریں۔

(۳) ایک دوسرے کو (کبھی کبھی اصل نام کے علاوہ) پیار بھرے نام اور اچھے اَلقاب سے پکارے، جیسے حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ کبھی پیار سے سیدہ عائشہؓ کو "یَا عَائِش" کہہ کر پکارتے تھے۔ (بخاری / باب من دعا صاحبه فنقص من اسمه حرفا، مشکوٰة:۵۷۳/ باب مناقب أزواج النبی ﷺ)

اسی طرح حضور ﷺ کو کبھی سیدہ عائشہؓ نے "یَا رَسُوْلَ اللّٰہ" اور سیدہ خدیجہؓ نے کبھی "یَا ابْنَ عَبْدِاللّٰہِ" کہہ کر پکارا ہے۔

لہٰذا زوجین کو چاہیے کہ کبھی کبھی ایک دوسرے کو اچھے نام ولقب سے پکاریں، مثلاً بیوی کو کبھی "پیاری، گوری، رانی، حتیٰ کہ بڑھیا کو بھی کہے کہ "گڑیا"۔ اسی طرح شوہر کو میرے سرتاج، میرے گوہر اور دلبر وغیرہ کہہ کر پکارے۔

(۴) ایک دوسرے کے جائز جذبات کا خیال رکھنا، نیز ایک دوسرے کے ساتھ حسب موقع ہنسنا کھیلنا، حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ سیدہ عائشہؓ کو حضور ﷺ کے ساتھ دوڑ لگانے کی خواہش ہوئی، تو آپ ﷺ نے اس موقع پر حضرات صحابہؓ کو آگے بڑھ جانے کا حکم دیا، پھر حضرت عائشہؓ کے ساتھ دوڑ لگائی، اس موقع پر حضرت عائشہؓ دوڑ میں سبقت کر گئیں، دوسری مرتبہ جب حضرت عائشہؓ کا جسم بھاری ہوگیا تھا تو اس دوڑ میں حضور ﷺ سبقت فرماگئے۔

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا أَنَّهَا كَانَتْ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِيْ سَفَرٍ، فَسَابَقْتُهُ، فَسَبَقْتُهُ عَلٰى رِجْلَيَّ، فَلَمَّا حَمَلْتُ اللَّحْمَ سَابَقْتُهُ، فَسَبَقَنِيْ، فَقَالَ: هٰذِهٖ بِتِلْكَ السَّبْقَةِ". (رواه أبو داود، مشکوٰة : ۲۸۱/ باب عشرة النساء)

نیز جب حضرت جابرؓ نے کسی ثیبہ سے شادی کرنے کے بعد اطلاع دی تو آپ ﷺ نے فرمایا: "هَلَّا بِكْرًا تُلَاعِبُهَا وَ تُلَاعِبُكَ". (متفق علیه، مشکوٰة:۲۶۷)

"کسی کنواری سے شادی کرتے، تاکہ تم اس کے ساتھ اور وہ تمہارے ساتھ کھیلتی

اور ہنسی مذاق کرتی، تم اسے ہنساتے اور وہ تمہیں ہنساتی۔

(۵) حسب موقع ایک دوسرے کی گود میں سر رکھ کر سونا (بالخصوص ایامِ مخصوصہ میں جب صحبت کی اجازت نہیں ہوتی) حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَتَّكِئُ فِيْ حِجْرِيْ، وَ أَنَا حَائِضٌ، ثُمَّ يَقْرَأُ الْقُرْآنَ". (متفق علیه، مشکوٰة : ۵۶/ باب الحيض)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ میری گود میں سر رکھ کر قرآن پڑھتے تھے، حالانکہ اس وقت میں حالت حیض میں ہوتی تھی۔

نیز حسب موقع ایک دوسرے کے ساتھ غسل کرنا، حدیث پاک میں ہے:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: كُنْتُ أَغْتَسِلُ أَنَا وَ النَّبِيُّ ﷺ مِنْ إِنَاءٍ بَيْنِيْ وَ بَيْنَهٗ وَاحِدٍ، فَيُبَادِرُنِيْ حَتّٰى أَقُوْلَ : دَعْ لِيْ، دَعْ لِيْ، قَالَتْ : وَ هُمَا جُنُبَانِ". (متفق علیه، مشکوٰة : ۵۶ / باب الحيض)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں اور رسول اللہ ﷺ ایک برتن سے جو میرے اور حضور ﷺ کے درمیان ہوتا غسل کرتے، آپ میری نسبت جلدی پانی لیتے، حتیٰ کہ میں کہتی: "میرے لیے پانی چھوڑیے، میرے لیے پانی چھوڑیے"۔

(۶) ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھانا، حتیٰ کہ حسب موقع ایک دوسرے کے منہ میں لقمہ دینا، یا ایک دوسرے کی کھائی اور پی ہوئی جگہ سے کھانا پینا۔ حدیث پاک میں ہے:

"حَتَّى اللُّقْمَةِ تَرْفَعُهَا إِلٰى فَمِ امْرَأَتِكَ". (متفق علیه، مشکوٰة : ۲۶۵، باب الوصایا)

حق تعالیٰ (تمہارے ہر صحیح مصرف میں خرچ کرنے پر بشرطیکہ اس میں ریا کاری اور ایذا رسانی نہ ہو) ثواب عطا فرماتے ہیں، حتیٰ کہ اس لقمہ پر بھی ثواب عطا فرماتے ہیں جو تم اپنی بیوی کے منہ میں رکھتے ہو۔

اس کے ظاہری مفہوم سے یہ معلوم ہوا کہ کبھی کبھی ایک دوسرے کے منہ میں لقمہ دینا

چاہیے، خصوصاً جب کسی وجہ سے ناراضی پیدا ہو جائے، اسی طرح حدیث میں وارد ہے:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا كُنْتُ أَشْرَبُ وَ أَنَا حَائِضٌ، ثُمَّ أُنَاوِلُهُ النَّبِيَّ ﷺ، فَيَضَعُ فَاهُ عَلَىٰ مَوْضِعِ فِيَّ، فَيَشْرَبُ، وَ أَتَعَرَّقُ الْعَرْقَ وَ أَنَا حَائِضٌ، ثُمَّ أُنَاوِلُهُ النَّبِيَّ ﷺ، فَيَضَعُ فَاهُ عَلَىٰ مَوْضِعِ فِيَّ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٥٦ / باب الحيض)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں ایامِ مخصوصہ کے دوران پانی پی کر حضور ﷺ کو پینے کے لیے دیتی، تو آپ ﷺ اپنا منہ میرے منہ کی جگہ پر رکھ کر پانی پیتے، اور میں دانتوں کے ذریعہ ہڈی سے گوشت نوچتی جب کہ میرے مخصوص ایام ہوتے، پھر وہ ہڈی حضور ﷺ کو دیتی، تو آپ ﷺ میرے منہ والی جگہ پر اپنا منہ رکھتے" (اور تناول فرماتے)۔

نیز حدیث پاک میں وارد ہے کہ آپ ﷺ کھانے میں کبھی عیب نہ لگاتے، خواہش ہوتی تو کھا لیتے، ورنہ چھوڑ دیتے، حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: مَا عَابَ النَّبِيُّ ﷺ طَعَامًا قَطُّ، إِنِ اشْتَهَاهُ أَكَلَهُ، وَ إِلَّا تَرَكَهُ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٣٦٤)

(۷) گھریلو اور ذاتی کام میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانا اور ساتھ دینا، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنِ الْأَسْوَدِ قَالَ: سَأَلْتُ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا " مَا كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَصْنَعُ فِيْ بَيْتِهٖ ؟ قَالَتْ: كَانَ يَكُوْنُ فِيْ مِهْنَةِ أَهْلِهٖ". (رواه البخاري، مشكوٰة : ٥١٩)

سیدہ عائشہؓ سے حضور ﷺ کی گھریلو مصروفیات کے متعلق جب دریافت کیا گیا تو فرمایا: آپ ﷺ گھر کے کام میں مشغول رہتے تھے، حضور ﷺ مخدوم بننے کے بجائے خادم بننا پسند فرماتے تھے، اپنی شان بان میں رہنے کے بجائے گھر کا ایک فرد بن کر رہنا پسند کرتے تھے۔

(۸) جہاں تک ہو سکے ایک دوسرے کی بشری خامیوں کو نظر انداز کریں اور خوبیوں

کو پیش نظر رکھیں، کسی ایک ہی ناپسندیدہ بات کے پیچھے نہ پڑ جائیں، اگر کوئی بات ناپسندیدہ ہو تو اسے نظر انداز کر کے پسندیدہ بات کو پیش نظر رکھیں، قرآن پاک میں حکم ہے:

﴿ وَ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَإِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى أَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّ يَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴾ (النساء : ١٩)

"اپنی عورتوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ، اس معاملہ میں تم ابتدا کرو، اگر بمقتضائے طبیعت کوئی بات ناگوار ہو تو اسے برداشت کر لو اور یہ سمجھو کہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کسی ایسی چیز میں کوئی بڑی منفعت رکھ دیں جو تمہیں ناپسند ہو۔"

اس کی تلقین حدیث پاک میں بھی ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" لَا يَفْرَكُ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً، إِنْ كَرِهَ مِنْهَا خُلُقًا رَضِيَ مِنْهَا آخَرَ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٢٨٠)

"کوئی مؤمن مرد کسی مؤمنہ سے بغض نہ رکھے، اگر اسے اس کی کوئی ایک عادت ناپسند ہے تو ہو سکتا ہے دوسری کوئی عادت و خوبی پسند آجائے۔"

ہر چھوٹی چھوٹی بات کی پوچھ تاچھ نہ کرتے رہیں، سیٹھ بن کر نہ رہیں، شوہر بن کر رہیں۔ بقولِ شاعر:

جہاں سوال ہی سوال ہوتا ہے، وہاں محبتوں کا زوال ہوتا ہے
کسی کو اپنا بنانا ہنر ہی سہی؛ لیکن کسی کے بن کے رہنا کمال ہوتا ہے

اپنی بیوی کو اپنا بنانے کے بجائے خود کو اس کا اچھا شوہر بنانے کی فکر کرو، بیوی بھی شوہر کو اپنا بنانے کے بجائے خود کو اچھی بیوی بنانے کی کوشش کرے۔

(۹) ایک دوسرے کے حسن سلوک پر شکریہ ادا کرنا، حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ". (رواه الترمذي، مشكوٰة : ٢٦١ / باب العطايا)

"جو شخص لوگوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا"۔

جب عام لوگوں کا شکر ادا کرنا ضروری ہے تو میاں بیوی کا ایک دوسرے کے حسن سلوک پر شکر ادا کرنا بدرجۂ اولیٰ ضروری ہے۔

(۱۰) گھر سے باہر جاتے وقت حسب موقع ایک دوسرے کا بوسہ لینا، بالخصوص میکے کا سفر ہو تو اس کا ضرور اہتمام کیا جائے۔

حدیث پاک میں وارد ہے:

"عَنْ عُرْوَةَ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا : "قَبَّلَ النَّبِيُّ ﷺ بَعْضَ نِسَائِهٖ، ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الصَّلٰوةِ، وَ لَمْ يَتَوَضَّأْ". (ترمذی، باب ترك الوضوء بعد القبلة)

"حضور ﷺ نے اپنی ازواج میں سے ایک زوجہ کا بوسہ لیا، پھر آپ ﷺ نماز کے لیے نکلے اور وضو نہیں فرمایا۔"

اس سے معلوم ہوا کہ گھر سے نکلتے وقت اس سنت پر حسب موقع عمل کر لیا جائے۔

یقیناً ازدواجی زندگی کو شاندار و جاندار بنانے کی یہ دس نبوی ٹپس ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عمل سے نوازیں۔ آمین۔

۲۳/ جمادی الاخریٰ/ ۱۴۴۰ھ

مطابق: یکم مارچ/ ۲۰۱۹ء

بروز جمعہ، قبل المغرب (بزمِ صدیقی بڑودا)

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيْرًا   فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيْرًا كَثِيْرًا

(۱۹)

مال کی حقیقت اور مواقعِ خیر میں خرچ کرنے کی فضیلت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ مُطَرِّفٍ عَنْ أَبِيْهِ قَالَ: أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ وَ هُوَ يَقْرَأُ "أَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ"، قَالَ: يَقُوْلُ ابْنُ اٰدَمَ : مَالِيْ مَالِيْ، قَالَ: وَ هَلْ لَكَ يَا ابْنَ اٰدَمَ ! إِلَّا مَا أَكَلْتَ فَأَفْنَيْتَ، أَوْ لَبِسْتَ فَأَبْلَيْتَ، أَوْ تَصَدَّقْتَ فَأَمْضَيْتَ". (راوه مسلم، مشكوٰة : ٤٤٠)

ترجمہ: حضرت مطرف اپنے والد (حضرت عبداللہ بن شخیرؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ میں دربارِ رسالت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ اس وقت سورۂ تکاثر کی تلاوت فرما رہے تھے، (جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "ایک دوسرے سے بڑھ کر (دنیا کی دولت) حاصل کرنے کی ہوس نے تمہیں غفلت میں ڈال رکھا ہے، یعنی دنیا سمیٹنے کی دُھن میں لگ کر تم آخرت کو بھولے ہوئے ہو) یہاں تک کہ تم قبرستانوں میں پہنچ جاتے ہو، ہرگز ایسا نہیں (ہونا) چاہیے، تمہیں عن قریب سب پتہ چل جائے گا، پھر سن لو کہ ہرگز ایسا نہیں (ہونا) چاہیے، تمہیں عن قریب سب پتہ چل جائے گا، ہرگز نہیں، اگر تم یقینی علم کے ساتھ یہ بات جانتے ہوتے

(تو ایسا نہ کرتے) یقین جانو! تم دوزخ کو ضرور دیکھو گے (جو لوگ جنت میں جائیں گے انہیں بھی دوزخ دِکھائی جائے گی، تاکہ انہیں جنت کی صحیح قدر معلوم ہو جائے (اسی کو دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَ إِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا﴾ (مریم : ٧١)
تم میں سے ہر ایک دوزخ (کے پل) سے گزرنے والا ہے، یہ تیرے رب نے طے کر دیا ہے) پھر یقین جانو کہ تم اسے بالکل یقین کے ساتھ دیکھ لوگے، پھر تم سے اس دِن نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ (کہ ان نعمتوں کا کیا حق ادا کیا؟) (اس سورۂ مبارکہ کی تلاوت کے بعد) آپ ﷺ نے فرمایا کہ آدمی کہتا رہتا ہے: میرا مال، میرا مال، حالانکہ اے انسان! تیرا مال تو وہی ہے جو تو نے کھایا اور ختم کر دیا، اور پہنا اور پرانا کر دیا، یا صدقہ کر کے آگے بھیج دیا (رہا وہ مال جو تو نے دنیا میں چھوڑا وہ تو ورثاء کا ہے، تیرا کہاں؟)

مال فتنہ بھی ہے اور فضل بھی:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ کریم میں ''مال'' کو کہیں پر فتنہ اور کہیں پر فضل وخیر قرار دیا ہے، ارشاد ہے:

﴿وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ (الأنفال : ٢٨)

''اور یہ بات جان رکھو کہ تمہارے اموال واولاد تمہارے لیے فتنہ ہیں''۔

فتنہ کے معنیٰ آزمائش وامتحان کے بھی آتے ہیں اور عذاب یا سبب عذاب کے بھی، یہاں تینوں معنیٰ کی گنجائش ہے، مال واولاد امتحان وآزمائش کے لیے ہے، اگر ان کی محبت اللہ تعالیٰ سے غفلت اور اس کی معصیت کا سبب بن جائے تو یہ اموال واولاد عذاب یا سبب عذاب ہے۔ (العیاذ باللہ)

اور اگر ایسا نہیں ہے تو یہ اموال واولاد اللہ تعالیٰ کا فضل، انعام اور خیر ہے، جیسے قرآنِ کریم نے ایک مقام پر مال کو فضل فرمایا:

﴿لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ﴾ (التوبة : ٧٥)

تو دوسرے مقام پر خیر فرمایا:

﴿مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ﴾ (البقرة : ٢١٥)

اس سے معلوم ہوا کہ مال فتنہ بھی ہے اور خیر وفضل بھی۔

پھر قرآنِ کریم میں مال واولاد دونوں ہی کو فتنہ کہا، لیکن مال کو اولاد سے مقدم بیان فرمایا، جس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ مال کا فتنہ اولاد سے بھی بڑھ کر ہے، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ كَعْبِ بْنِ عِيَاضٍ ؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: "إِنَّ لِكُلِّ أُمَّةٍ فِتْنَةً، وَ فِتْنَةُ أُمَّتِي الْمَالُ". (رواه الترمذي، مشكوٰة : ٤٤٢)

''ہر امت کے لیے ایک فتنہ ہوتا ہے، اور میری امت کا فتنہ مال ہے''۔ مطلب یہ ہے کہ میری امت کو اللہ تعالیٰ مال کے ذریعہ آزمائیں گے، کہ امت مال کے مکاسب ومصارف میں احکامِ شریعت کی رعایت کرتی ہے یا نہیں؟ اب اگر کوئی شخص مال کے مکاسب (کمائی کے طریقوں) اور مصارف (خرچ کرنے کے طریقوں) میں احکامِ شریعت کی رعایت کرتا ہے تو اس کے لیے یہ مال فضل وخیر ہے، ورنہ فتنہ وہلاکت کا ذریعہ ہے۔

کسب مال کے غیر شرعی طریقوں کی ممانعت ومذمت:

مکاسب مال یعنی حصولِ مال کے جتنے بھی غیر شرعی، ناجائز اور حرام طریقے ہیں قرآنِ کریم نے اہل ایمان کو ہلاکت دارین سے بچانے کے لیے ان سے منع فرما دیا، چنانچہ ارشادِ باری ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ (النساء : ٢٩)

''اے ایمان والو! اپنے آپس کے مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ''۔

اس میں حصولِ مال کی تمام ناجائز شکلوں کی ممانعت بھی ہے نیز خود اپنے مال کو ناجائز طریقے پر خرچ کرنے کی ممانعت بھی داخل ہے۔

اس کے باوجود جو لوگ اس ممانعت کی پرواہ نہیں کرتے اور حصولِ مال کے لیے غیر شرعی اور ناجائز طریقے اختیار کرتے ہیں ان کے لیے بڑی سخت مذمت اور وعید آئی ہے، ارشادِ باری ہے:

﴿ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّ ظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا﴾ (النساء : ۲۷)

قرآنی (ممانعت و) ہدایت کے باوجود اگر کوئی شخص اس کے خلاف ورزی کرے گا اور جان بوجھ کر تعدی وظلم کی راہ سے کسی کا مال ناحق لے لے گا، یا کسی کو ناحق قتل کردے گا، تو ہم عنقریب اس کو جہنم میں داخل کردیں گے۔ (معارف القرآن: ۲/۳۷۷)

مطلب یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں حصولِ مال کے غیر شرعی و ناجائز طریقوں کی ممانعت کے باوجود اگر کوئی شخص اس کی پرواہ نہیں کرے گا تو آخرت میں اس کی سزا جہنم ہوگی۔ اسی کو حدیث پاک میں یوں بیان کیا گیا:

عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ، وَ كُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ كَانَتِ النَّارُ أَوْلٰى بِهٖ".

(رواه أحمد و الدارمي و البيهقي، مشكوٰة : ۲۴۲)

"جنت میں وہ گوشت (جسم والا) داخل نہ ہوگا جو حرام مال سے پلا ہو، اور جس نے حرام مال سے غذا پائی ہوگی اس کے لیے دوزخ کی آگ ہی مناسب ہے"۔

ایسا شخص اوّل مرحلہ میں یا عذابِ دوزخ کے بغیر جنت میں داخل نہ ہوگا۔ (إلا من رحم ربی)۔ یہ تو حصولِ مال کے غیر شرعی طریقوں کی ممانعت و مذمت کا ذکر ہے۔

صرفِ مال کے غیر شرعی طریقوں کی ممانعت و مذمت:

قرآن و حدیث میں مصارفِ مال یعنی مال خرچ کرنے کے غیر شرعی طریقوں کی

بھی ممانعت و مذمت آئی ہے، چنانچہ آیت کریمہ: ﴿لَا تَأْكُلُوْٓا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ﴾ کے تحت علماء نے فرمایا کہ اس میں مصارفِ مال کے تمام غیر شرعی اور ناجائز طریقوں کی بھی ممانعت داخل ہے، کیوں کہ آیت کریمہ میں ﴿لَا تَأْكُلُوْٓا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ﴾ کا لفظ آیا ہے، جس کے معنیٰ ہیں "اپنے مال آپس میں"، اس میں یہ بات تو باتفاقِ مفسرین داخل ہے کہ کوئی شخص دوسرے کا مال ناجائز طریقے پر نہ کھائے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ کوئی شخص اپنا ہی مال ناجائز طور پر کھائے، مثلاً ایسے کاموں میں خرچ کرے جو شرعاً گناہ یا اسراف ہیں، یہ بھی آیت کی رو سے ممنوع اور ناجائز ہے۔ (معارف القرآن: ۲/۳۷۷)

دوسرے مقام پر قرآنِ کریم نے ان لوگوں کے متعلق ارشاد فرمایا جو صرف مال جمع کرتے ہیں (خواہ جائز طریقوں ہی سے کیوں نہ ہو؟) لیکن اسے مصارفِ خیر میں خرچ نہیں کرتے، یعنی جو لوگ مال دار تو ہیں؛ مگر دل دار نہیں، ان کے متعلق ارشاد فرمایا:

﴿ وَ الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيْمٍ ۝﴾ (التوبة : ۳۴)

"اور جو لوگ سونے چاندی (اور مال و دولت) کو جمع کر کر کے رکھتے ہیں اور اس کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنادو"۔

اس وعید میں وہ لوگ داخل ہیں جو مال و دولت جمع کرتے چلے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ذمہ جو مالی حقوق عائد کیے ہیں (جن میں سب سے اہم حق زکوٰۃ ہے) وہ ادا نہیں کرتے۔

اصل بات یہ ہے کہ مال کے مکاسب و مصارف دونوں میں ہم احکامِ شریعت کے پابند ہیں، یہی وجہ ہے کہ قیامت کے دن جو پانچ سوال ہوں گے ان میں مال کے مکاسب و مصارف دونوں سے متعلق سوال ہوگا کہ "مِنْ أَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَ فِيْمَا أَنْفَقَهٗ" (ترمذی،

مشکوٰۃ:۳ ٤ ٤) یعنی کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ اگر غیر شرعی طریقوں سے مال کمایا اور غیر شرعی مصارف میں خرچ کیا تب بھی یہ مال فتنہ، عذاب اور ہلاکت کا سبب ہوگا۔

اور اگر شرعی طریقوں سے کما کر غیر شرعی مصارف میں خرچ کیا تب بھی یہ مال فتنہ، عذاب اور ہلاکت کا سبب ہوگا، اس لیے کہ اس کے حلال کا حساب ہوگا اور حرام پر عذاب ہوگا۔

پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ مال خواہ کسی بھی طرح کمایا اور جمع کیا جائے بہر حال مرنے کے بعد نہ ساتھ آئے گا نہ کام آئے گا، جیسا کہ حدیث پاک میں ہے کہ مرنے کے بعد عمل ساتھ آئے گا، جب کہ مال اور اہل وعیال یہیں رہ جائیں گے۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ: ۴۴۰)

مال کے صحیح مکاسب ومصارف اختیار کرنے کی فضیلت:

البتہ اگر مال کے مکاسب ومصارف صحیح ہیں تو یقیناً یہ مال دارین میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا فضل وانعام اور سبب خیر ہے، اس لیے حکم ہے کہ اپنے مال کے مکاسب ومصارف کو صحیح کرلو، تاکہ یہ مال تمہارے لیے دارین میں اللہ تعالیٰ کے فضل وانعام اور خیر وبھلائی کا ذریعہ بن جائے۔

جہاں تک مکاسب کی بات ہے تو ارشادِ باری ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ﴾ (البقرة : ۱۷۲)

اس آیت کریمہ میں اہل ایمان سے حلال کمائی کھانے کا مطالبہ کیا گیا۔ عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ رزقِ حلال کی طلب اور کوشش بھی عبادت ہے، حدیث پاک میں ہے کہ جو شخص رزقِ حلال اس لیے تلاش کرتا ہے تاکہ وہ سوال کی ذلت سے بچے اور اپنے ذمہ عائد حقوق ادا کرے، نیز پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کرے تو یہ شخص قیامت کے دن اس حالت میں آئے گا کہ اس کا چہرہ چودہویں کے چاند کی طرح چمکدار ہوگا۔ (مشکوٰۃ: ۴۴۰)

اس کے علاوہ جو لوگ اکل حلال کے لیے کسب حلال کا اہتمام کرتے ہیں انہیں من

جانب اللہ نیک اعمال کی توفیق بھی ملتی ہے اور ان کے اعمال قبول بھی ہوتے ہیں، کیوں کہ اکل حلال اور نیک اعمال میں بڑی مناسبت ہے، اسی لیے حق تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو اس کا حکم (دے کر ہمیں جو ترغیب دی اس میں) فرمایا:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا﴾ (المؤمنون : ۵۱)

’’پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک اعمال کرو‘‘۔ یہاں پاکیزہ چیزیں کھانے کا حکم اس لیے ہے کہ ہر پاکیزہ چیز اللہ تعالیٰ نے حلال کردی ہے، پھر نیک اعمال کا حکم دیا، کیوں کہ جب حلال اور پاکیزہ رزق بطن میں جاتا ہے تو باطن روشن اور منوّر ہو جاتا ہے، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ دل میں نیکی کے جذبات وخیالات پیدا ہوتے ہیں، اس طرح رزقِ حلال کے بعد نیک اعمال کی توفیق ہوتی ہے، اس کے بعد بندہ جو بھی عمل کرتا ہے حق تعالیٰ اسے قبول فرماتے ہیں۔

حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ رزقِ حرام کی وجہ سے بندہ قبولیت اعمال سے محروم ہو جاتا ہے، جب کہ رزقِ حلال قبولیت اعمال کا سبب ہے، مال کے مکاسب اگر صحیح ہوں گے تو مصارف بھی عموماً صحیح ہوں گے، اور اگر مکاسب غلط ہوں گے تو مصارف بھی عموماً غلط ہوں گے، بقولِ شاعر:

جو مال ہم کماتے ہیں میں اس کی بات کرتا ہوں　　یہ جس راستہ کا ہے صفتیں اس کی لاتا ہے

حرام خوروں کو نہ نیک اعمال کی توفیق ہوتی ہے نہ نیک جگہوں میں مال خرچ کرنے کی توفیق ہوتی ہے، اگر وہ کرتے بھی ہیں تو اس میں اخلاص نہیں ہوتا، اس لیے بھی وہ قبولیت اعمال سے محروم رہتے ہیں، الغرض مال کے مصارف کا دارو مدار بڑی حد تک اس کے مکاسب پر ہے، مکاسب صحیح ہیں تو مصارف بھی صحیح ہوں گے، اور اگر مال کے مصارف صحیح ہیں تو وہ مال عند اللہ قابل قبول ہوگا، پھر بقولِ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سات مصارف ایسے ہیں جن میں مال خرچ کرنا عبادت ہے: (۱) زکوٰۃ (۲) صدقاتِ واجبہ (۳) صدقاتِ

نافلہ (۴) حج وعمرہ (۵) جہاد فی سبیل اللہ (۶) دینی ضروریات، مثلاً مساجد، مدارس وغیرہ کی تعمیر اور غرباء ومساکین وغیرہ پر خرچ کرنا (۷) گھریلو ضروریات، مثلاً بیوی بچوں وغیرہ کے نفقات۔ عموماً مال اِن ہی سات مصارف میں خرچ کیا جاتا ہے۔

مال کو مصارفِ خیر میں خرچ کرنے کی ترغیب وفضیلت:

حق تعالیٰ نے مال کو مصارفِ خیر میں خرچ کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

﴿ الشَّيۡطٰنُ يَعِدُكُمُ الۡفَقۡرَ وَ يَاۡمُرُكُمۡ بِالۡفَحۡشَآءِ ۚ وَ اللّٰهُ يَعِدُكُمۡ مَّغۡفِرَةً مِّنۡهُ وَ فَضۡلًا ﴾ (البقرة : ۲۶۸)

عجیب بات یہ ہے کہ جب مصارفِ خیر یعنی بھلائی اور نیکی کے کاموں میں مال خرچ کرنے کا موقع آتا ہے تو شیطان فقیری اور مفلسی سے ڈراتا ہے، لیکن فحاشی اور عیاشی میں ان کا خیال تک آنے نہیں دیتا، جس کی وجہ سے شیطان کے فرمان بردار بے دریغ اپنے اموال فحاشی وعیاشی اور ریاکاری میں خرچ کرتے ہیں، جب کہ حق تعالیٰ اپنے وفادار بندوں سے امورِ خیر میں خرچ کرنے پر مغفرت اور فضل وبرکت کا وعدہ فرماتا ہے، چنانچہ جو لوگ مال کو مصارفِ خیر میں خرچ کرتے ہیں ان کے لیے بدنی عبادات سے زیادہ اجر وثواب کا وعدہ فرمایا ہے، کیوں کہ بدنی عبادات پر تو کم از کم دس گنا کا وعدہ فرمایا ہے:

﴿ مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِهَا ﴾ (الأنعام : ۱۶۰)

لیکن مالی عبادات یعنی مال کو مصارفِ خیر میں خرچ کرنے پر کم از کم سات سو گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ کا وعدہ فرمایا ہے:

﴿ مَثَلُ الَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنۡۢبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ فِيۡ كُلِّ سُنۡۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَ اللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنۡ يَّشَآءُ ﴾ (البقرة : ۲۶۱)

بشرطیکہ مصارفِ خیر میں جو مال خرچ کیا جاتا ہے وہ حلال ہو اور خرچ کرنے والے میں اخلاص ہو، تو پھر اس کا ثواب سات سو گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے، حدیث پاک میں

وارد ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ تَصَدَّقَ بِعَدْلِ تَمْرَةٍ مِنْ كَسْبٍ طَيِّبٍ، وَ لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ إِلَّا الطَّيِّبَ، فَإِنَّ اللّٰهَ يَتَقَبَّلُهَا بِيَمِيْنِهٖ، ثُمَّ يُرَبِّيْهَا لِصَاحِبِهٖ كَمَا يُرَبِّيْ أَحَدُكُمْ فَلُوَّهٗ، حَتّٰى تَكُوْنَ مِثْلَ الْجَبَلِ". (متفق عليه، مشكوٰة: ۱۶۷)

"جو شخص (صورت یا قیمت کے لحاظ سے) اپنی حلال کمائی سے کھجور کے برابر خیرات کرتا ہے اور حق تعالیٰ حلال کے علاوہ قبول بھی نہیں کرتا، تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے دائیں ہاتھ سے قبول کرتا ہے، پھر اس کے اجر کو اس طرح پالتا ہے جیسے تم میں سے کوئی اپنے بچھڑے کو پالتا ہے، حتیٰ کہ اس کا اجر پہاڑ کے برابر ہوجاتا ہے۔"

یعنی جس طرح بچھیرے کو بڑی محبت سے پال کر بڑا کیا جاتا ہے (اور کرنا بھی چاہیے) اسی طرح حق تعالیٰ اخلاص کے ساتھ حلال مال مصارف خیر میں لگانے والے کا مال قبول فرما کر اس کے اَجر وثواب کو بہت زیادہ بڑھاتے ہیں۔

قلیل اعمال پر اجرِ عظیم کا وعدہ حضور ﷺ کی دعاؤں کا ثمرہ ہے:

صاحبو! امت محمدیہ کے قلیل اعمال پر اجرِ عظیم کا وعدہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کے بعد رحمت عالم ﷺ کی دعاؤں کا ثمرہ ونتیجہ ہے، منقول ہے کہ جب آیت کریمہ ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ ......الخ﴾ نازل ہوئی تو رحمت عالم ﷺ نے عرض کیا: "رَبِّ زِدْ أُمَّتِيْ" یعنی اے میرے رب! میری امت کے اجر وثواب میں مزید اضافہ فرما دیجیے، اس پر دوسری آیت کریمہ ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا......الخ﴾ (البقرة: ۲۴۵) نازل ہوئی، جس میں حق تعالیٰ نے اپنی رضا کے لیے مالِ حلال کو مصارفِ خیر میں خرچ کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے استفہام کا طریقہ اختیار فرمایا (جو ترغیب کا بہت عمدہ طریقہ ہے) کہ کون ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرضِ حسن دے۔ (مستفاد از: انوار البیان: ۱/ ۳۴۵)

آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کو قرض دینے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ضرورت مند بندوں کو قرض دیا جائے، جس کا اجر حدیث کے مطابق صدقہ سے بھی دوگنا ہے:

''مَا مِنْ مُسْلِمٍ يُقْرِضُ مُسْلِمًا مَرَّةً إِلَّا كَانَ كَصَدَقَتِهِ مَرَّتَيْنِ''. (ابن ماجه)

''جو بندہ کسی مسلمان کو ایک مرتبہ قرض دیتا ہے تو حق تعالیٰ اسے دو مرتبہ صدقہ کرنے کے برابر اجر وثواب عطا فرماتے ہیں۔'' (معارف القرآن:۱/ ۵۴۵)

اللہ تعالیٰ کو قرض دینے کا دوسرا مطلب اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنا اور صدقہ کرنا ہے، صدقہ کو قرض سے تعبیر اس لیے فرمایا کہ جس طرح قرض کو ادا کرنا ضروری ہے اسی طرح صدقہ کا اجر دینا بھی اللہ تعالیٰ نے از راہِ فضل اپنے ذمہ ضروری فرمالیا ہے، لہٰذا صدقہ کرنے والوں کو خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں کہ صدقہ سے مال میں کمی ہو جائے گی، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَبِي كَبْشَةَ الْأَنْمَارِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: ''ثَلَاثٌ أُقْسِمُ عَلَيْهِنَّ، مَا نَقَصَ مَالُ عَبْدٍ مِنْ صَدَقَةٍ، وَ لَا ظُلِمَ عَبْدٌ مَظْلَمَةً صَبَرَ عَلَيْهَا إِلَّا زَادَهُ اللّٰهُ بِهَا عِزًّا، وَ لَا فَتَحَ عَبْدٌ بَابَ مَسْئَلَةٍ إِلَّا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْهِ بَابَ فَقْرٍ''.

(رواه الترمذی، مشکوٰۃ : ۴۵۱)

''حضور پاک ﷺ فرماتے ہیں کہ تین باتیں ایسی ہیں جن کی صداقت وحقانیت پر میں خود قسم کھا سکتا ہوں، پھر پہلی بات فرمائی کہ صدقہ وخیرات یعنی مال کو مصارفِ خیر میں خرچ کرنے سے کبھی کمی واقع نہیں ہوتی، صدقہ سے دولت کم نہیں ہوتی، دوسری بات یہ کہ جس بندہ پر ظلم ہوا، پھر بدلہ لینے کی طاقت کے باوجود اس نے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے صبر کر لیا تو اس کی عزت میں کمی واقع نہیں ہوتی، ظلم پر صبر کرنے اور معاف کرنے سے عزت کم نہیں ہوتی، تیسری بات یہ ہے کہ جس بندہ نے سوال کا دروازہ کھولا (بلا ضرورت لوگوں سے مانگتا رہتا ہے) اس کے فقر میں کمی واقع نہیں ہوتی، بلا وجہ مانگنے سے ضرورت میں کمی نہیں ہوتی، لہٰذا لینے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے دینے کا مزاج بناؤ۔''

مال کو مصارفِ خیر میں خرچ کرنے نہ کرنے کے اعتبار سے امت کے تین طبقات:

ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ کے نازل ہونے کے بعد مال کو مصارفِ خیر میں خرچ کرنے نہ کرنے کے اعتبار سے امت میں تین قسم کے طبقات ہو گئے:

(۱) پہلا طبقہ ان بدنصیب لوگوں کا ہے جنہوں نے آیت کریمہ کے نازل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے کہا کہ محمد کا رب ہمارا محتاج ہے اور ہم غنی ہیں۔ روایت ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ یہودیوں کے ایک مجمع میں تشریف لے گئے، فنحاص نامی ان کا ایک لیڈر خطاب کرتے ہوئے کہنے لگا کہ اے ابوبکر! ہم تو اللہ کے محتاج نہیں، لیکن اللہ ہمارا محتاج ہے، اگر وہ غنی ہوتا تو ہم سے قرض کیوں مانگتا؟ یہ بات سن کر حضرت صدیق اکبرؓ برداشت نہ کر سکے اور اسے ایک زوردار طمانچہ رسید کر دیا، فنحاص نے دربارِ رسالت میں شکایت کر دی، جب صدیق اکبرؓ سے تحقیق کی گئی تو آپؓ نے اقرار کرتے ہوئے فرمایا کہ حضور! اس بدبخت نے اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کی ہے، جی تو چاہتا ہے کہ بقیہ قسطیں بھی مکمل کرلوں اور اس کی طبیعت درست کر دوں، اس پر وہ یہودی صاف مکر گیا اور قسم کھا کر کہنے لگا کہ میں نے اللہ کی شان میں گستاخی ہرگز نہیں کی، حضور ﷺ نے حضرت صدیق اکبرؓ سے گواہ طلب کیے، تو حضرت صدیقؓ کی صداقت کی شہادت دیتے ہوئے حق تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی:

﴿لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوٓا إِنَّ اللّٰهَ فَقِيرٌ وَّ نَحْنُ أَغْنِيَآءُ م سَنَكْتُبُ مَا قَالُوا وَ قَتْلَهُمُ الْأَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ لا وَّ نَقُولُ ذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ۝﴾ (آل عمران:۱۸۱)

''یقیناً اللہ تعالیٰ نے ان بدنصیبوں کا قول بھی سنا جنہوں نے کہا کہ اللہ فقیر ہے اور ہم تونگر ہیں، ان کے اس قول کو ہم لکھ لیں گے اور ان کا بے قصور انبیاء کا قتل کرنا بھی، اور ہم ان سے کہیں گے کہ تم جلا دینے والا عذاب چکھو۔''

(۲) دوسرا طبقہ ان بخیلوں کا ہے جنہوں نے آیت کریمہ میں مال کو مصارفِ خیر میں خرچ کرنے کی ترغیب کی طرف کوئی توجہ نہیں دی، قرآنِ کریم میں ایسے لوگوں کے لیے بھی بڑی سخت وعید بیان فرمائی گئی ہے:

﴿ وَ الَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بَعَذَابٍ أَلِيْمٍ۝﴾ (التوبة : ٣٤)

(۳) تیسرا طبقہ ان سخیوں کا ہے جنہوں نے آیت کریمہ پر عمل کیا اور اپنے اموال کو مصارفِ خیر میں خوب خرچ کیا، جن کے لیے سات سو گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ عطا کا حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا، واقعہ یہ ہے کہ جن خوش نصیب لوگوں کو وعدۂ ربانی پر یقین ہوتا ہے ان کے لیے مال کو مصارفِ خیر میں خرچ کرنا آسان ہوجاتا ہے۔

ایک واقعہ:

روایت ہے کہ آیت کریمہ کے نازل ہونے کے بعد حضرت ابوالدحداح انصاریؓ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کرنے لگے: حضور! کیا اللہ تعالیٰ نے ہم سے قرض طلب کیا ہے؟ ارشاد فرمایا: جی ہاں (اس کریم نے اپنے محتاج بندوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا مطالبہ فرمایا ہے) اگر تم نے ایسا کیا تو تمہارے لیے جنت ہے، فوراً حضرت ابوالدحداح انصاریؓ نے فرمایا: حضور! میں مدینہ میں کھجور کے دو باغوں کا مالک ہوں، اس کے علاوہ میری ملکیت میں کچھ بھی نہیں، آپ گواہ بن جائیے کہ میں نے یہ دونوں باغ اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقہ کر دیے، آپ ﷺ بہت خوش ہوئے، لیکن فرمایا کہ ان میں سے ایک اللہ تعالیٰ کے راستے میں صدقہ کرو اور دوسرا اپنے اہل وعیال کی ضروریات کے لیے رکھو، اس پر حضرت ابوالدحداحؓ نے عرض کیا: پھر ان میں جو سب سے عمدہ باغ ہے جس میں کھجور کے چھ سو درخت ہیں اس کو میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں صدقہ کرتا ہوں، آپ ﷺ نے انہیں جنت کی دعا دی: "كَمْ مِنْ عِذْقٍ رَدَاحٍ وَ دَارٍ فَيَّاحٍ لِأَبِي الدَّحْدَاحِ فِي الْجَنَّةِ".

(کھجوروں سے لبریز بے شمار درخت اور کس قدر کشادہ محلات ابوالدحداح کے لیے تیار ہیں)۔

(تفسیر قرطبی، از معارف القرآن: ۱/۵۴۲)

الغرض جو خوش نصیب حضرات اپنے اموال کو مصارفِ خیر میں خرچ کرتے ہیں حق تعالیٰ ان کے اجر وانعام کو ضائع نہیں کرتا؛ بلکہ بہت زیادہ بڑھا کر عطا کرتا ہے، اور اصل مال تو حدیث کے مطابق وہی ہے جو "أَكَلْتَ فَأَفْنَيْتَ، أَوْ لَبِسْتَ فَأَبْلَيْتَ، أَوْ تَصَرَّفْتَ فَأَمْضَيْتَ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٤٤٠) جو کھا کر ختم کردیا، پہن کر بوسیدہ کردیا، یا مصارفِ خیر میں خرچ کرکے اللہ تعالیٰ کی بینک میں جمع کردیا۔ رہا وہ مال جو ہمارے پاس جمع ہے تو قرآن نے اس کے بارے میں کہا ہے:

﴿ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ﴾ (النحل : ٢٦)

"تمہارے پاس جو کچھ ہے سب فانی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے پاس جو کچھ ہے باقی ہے۔"

لہٰذا عافیت اسی میں ہے کہ ضروریات سے زائد مال کو مصارفِ خیر میں خرچ کرکے اللہ تعالیٰ کے پاس جمع کردیا جائے، تاکہ یہ مال آخرت میں ذخیرہ اور اجرِ عظیم کا ذریعہ بن جائے۔

حق تعالیٰ عافیت کے ساتھ برکت والی زندگی عطا فرماکر ہمیں اپنے اموال کو مصارفِ خیر میں خرچ کرنے کی توفیق عطا فرمائیں اور دارین میں اسے اپنی رضا کا ذریعہ بنائیں۔ آمین یارب العالمین۔

۲۷/ شعبان/ ۱۴۴۰ھ، قبل الجمعہ مطابق: ۳/ مئی/ ۲۰۱۹ء

بمقام: ویڈی باغیچہ، انجار، کچھ، گجرات

برمکان جناب حاجی عبدالحمید (محمد) اور حاجی محمد الطاف صاحب

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيْرًا فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيْرًا كَثِيْرًا

(۲۰)

تلاوتِ قرآنِ کریم سننے کی اہمیت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ هُرَیۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَا أَذِنَ اللّٰهُ لِشَيۡءٍ مَا أَذِنَ لِنَبِيٍّ حَسَنِ الصَّوۡتِ بِالۡقُرۡآنِ يَجۡهَرُ بِهٖ".

(متفق علیه، مشکوٰة: ۱۹۰/ کتاب فضائل القرآن)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی چیز پر اس طرح کان نہیں لگاتا جس طرح اس نبی کی آواز پر لگاتا ہے جو قرآنِ کریم کو خوش الحانی کے ساتھ بآوازِ بلند پڑھتا ہے۔

تلاوتِ قرآن سننے کا حکم:

اللہ رب العزت نے اپنے آخری رسول جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اہل ایمان کو قرآن کے تعلق سے ایک حکم تو یہ دیا کہ قرآن پڑھو، چنانچہ فرمایا:

﴿ اُتۡلُ مَآ أُوۡحِيَ إِلَيۡكَ مِنَ الۡكِتٰبِ ﴾ (العنکبوت: ۴۵)

قرآن کو تجوید کی رعایت اور احسانی کیفیت کے ساتھ پڑھنا حکم الٰہی ہے، دوسرا حکم قرآن کے تعلق سے یہ دیا کہ قرآن سنو، چنانچہ فرمایا:

﴿ وَ إِذَا قُرِئَ الۡقُرۡاٰنُ فَاسۡتَمِعُوۡا لَهٗ وَ أَنۡصِتُوۡا لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴾ (الأعراف: ۲۰۴)

جب کبھی قرآنِ کریم پڑھا جائے، خواہ نماز میں ہو یا غیر نماز میں، مسجد میں ہو یا مکان میں، اسے خوب دھیان اور توجہ سے سنو اور خاموش رہو، تا کہ رحمت الٰہی کے حق دار بن جاؤ۔ جس طرح قرآن پڑھنے کا حکم دیا گیا اسی طرح اسے سننے کا بھی حکم دیا گیا ہے، اس کی اہمیت اس قدر ہے کہ بندہ جب قرآن کی تلاوت کرتا ہے تو خود حق تعالیٰ اس کی تلاوت کو بڑی توجہ سے سنتے ہیں، اس لیے عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی تلاوت احسانی کیفیت کے ساتھ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی تلاوت تجوید کی رعایت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو سنانے کی نیت سے کی جائے، تلاوت کے وقت یہ نیت کی جائے کہ حق تعالیٰ نے اپنے آخری رسول ﷺ کے ذریعہ ہمیں قرآن پڑھ کر سنانے کا حکم دیا ہے، اس لیے ہم قرآن کریم صرف پڑھ نہیں رہے ہیں؛ بلکہ اپنے رب کو پڑھ کر سنا رہے ہیں اور ہمارا رب بھی ہماری تلاوت کو بڑی محبت سے سن رہا ہے، اس نیت سے تلاوت کی لذت ہی کچھ اور ہے۔

تلاوتِ قرآن کو سننا اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کا پسندیدہ عمل ہے:

واقعہ یہ ہے کہ تلاوتِ قرآن کو سننا حق تعالیٰ کا، اس کے رسول ﷺ اور فرشتوں کا پسندیدہ عمل ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام آوازوں میں سب سے ناپسندیدہ آواز گانے اور میوزک کی ہے، جب کہ سب سے پسندیدہ آواز تلاوتِ قرآنِ کریم کی ہے، حدیث مذکورہ میں ہے کہ جب صاحب قرآن ﷺ تلاوتِ قرآن فرماتے تو حق تعالیٰ بہت ہی توجہ کے ساتھ اسے سنتے، خود صاحب قرآن ﷺ بھی کبھی کبھی اپنے اصحاب کو قرآن سنانے کا حکم

فرماتے، چنانچہ عہدِ نبوت کے قاریٔ خوش الحان حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو منبر پر بیٹھے ہوئے حکم دیا کہ مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ، ابن مسعودؓ نے تعجب سے عرض کیا: حضور! آپ تو خود صاحبِ قرآن ہیں، آپ سے بہتر کون قرآن پڑھ سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "إِنِّیْ أُحِبُّ أَنْ أَسْمَعَهٗ مِنْ غَيْرِیْ". (متفق علیہ، مشکوٰۃ: ۱۹۰) فرمایا کہ مجھے یہ پسند ہے کہ اپنے علاوہ کسی سے قرآن سنوں، لہٰذا تم سناؤ، چنانچہ ابن مسعودؓ نے تعمیلِ ارشاد میں سورۂ نساء کی تلاوت شروع کی، آپ ﷺ حبِ الٰہی میں ڈوب کر کلامِ الٰہی کو سنتے رہے، یہاں تک کہ جب حضرت ابن مسعودؓ آیت کریمہ ﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ......الخ﴾ (النساء: ۴۱) پر پہنچے، جس میں ارشادِ باری ہے کہ تمام انبیاءِ کرام قیامت کے دن اپنی اپنی امتوں کے اچھے برے اعمال پر گواہی دیں گے، اور خود حضور ﷺ کو بھی اپنی امت کے لوگوں پر گواہ بنا کر پیش کیا جائے گا۔ (آسان ترجمۂ قرآن: ۱/۲۶۶)

یہ سن کر حضور ﷺ کو اپنی امت کے گنہگار یاد آ گئے اور آپ ﷺ مزید سننے کی تاب نہ لا سکے۔

اسی طرح حضرت اُسید بن حُضیرؓ کے واقعہ میں ہے کہ ایک رات جب وہ سورۂ بقرہ کی تلاوت کر رہے تھے تو اسے سننے کے لیے فرشتے آسمان سے اتر آئے، جنہیں دیکھ کر ان کا گھوڑا شوخی کرنے لگا اور بدکنے لگا۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ: ۱۸۴)

معلوم ہوا کہ تلاوتِ قرآن کو سننا اللہ تعالیٰ کا حکم ہونے کے ساتھ خود اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ اور فرشتوں کا پسندیدہ عمل بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ دن رات کی پانچ نمازوں میں سے تین نمازیں ایسی ہیں جن میں حکم ہے کہ قرآنِ کریم کو آواز سے پڑھا جائے، تاکہ تمام نمازی اسے خاموش رہ کر خوب اچھی طرح سن سکیں۔

ابن کثیرؒ نے آیت کریمہ: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمْ ......الخ﴾ (التوبة: ۴۵) کے تحت بہ حوالہ طبرانی نقل فرمایا ہے کہ تین اوقات ایسے ہیں جن میں حق تعالیٰ کو بندوں کا

خاموش رہنا پسند ہے: (۱) تلاوتِ کلام اللہ (۲) جہاد فی سبیل اللہ (۳) بہ وقت جنازہ۔

تلاوتِ قرآن سننے کے آداب:

ہمارے علماء نے جس طرح قرآنِ کریم کی تلاوت کے آداب بتلائے اسی طرح تلاوتِ قرآن کو سننے کے بھی آداب بتائے ہیں۔ مثلاً: (۱) باوضو ہو کر سنیں (۲) سنتے وقت دل میں کلامِ الٰہی کی عظمت ہو (۳) سکون و وقار کے ساتھ بیٹھ کر خاموشی سے سنیں (۴) دورانِ سماع کوئی لغو کام اور کلام نہ کریں (۵) آیت سجدہ سن کر حسبِ موقع سجدۂ تلاوت کریں (۶) (تراویح وغیرہ میں) سننے پر کوئی معاوضہ نہ لیں (۷) پڑھنے والا اگر غلط پڑھے تو حسبِ موقع سننے والا لقمہ دے۔

تلاوتِ قرآن سننے کا اجر دوگنا ہے:

الغرض جس طرح قرآنِ کریم کو پڑھنے کا حکم ہے اسی طرح تلاوتِ قرآن کو سننے کا بھی حکم ہے، اور جس طرح قرآنِ کریم کی تلاوت نہایت مبارک عمل ہے اسی طرح اسے سننا بھی نہایت مبارک عمل ہے، بلکہ حضرت امام دارمیؒ نے تو اپنی سنن میں قرآنِ کریم کو سننے کی فضیلت پر ایک باب قائم کیا ہے، جس میں حضرت خالد بن معدان کا قول نقل کیا:

"إِنَّ الَّذِیْ يَقْرَأُ الْقُرْآنَ لَهٗ أَجْرٌ، وَ إِنَّ الَّذِیْ يَسْتَمِعُ لَهٗ أَجْرَانِ". (سنن الدارمی / كتاب فضائل القرآن / باب من فضل من استمع إلى القرآن)

"فرمایا کہ جو بندہ قرآنِ کریم کی تلاوت کرتا ہے اس کے لیے ایک اجر ہے اور جو بندہ اسے بہ غور سنے اس کے لیے دو اجر ہیں۔"

مطلب یہ ہے کہ قرآن پڑھنے سے زیادہ اس کے سننے پر اجر ہے، علماءِ محدثین نے اس کی مختلف وجوہ بیان کی ہیں:

ایک وجہ یہ ہے کہ مطلقاً قرآنِ کریم کی تلاوت تو فرض نہیں، نفل ہے، لیکن جب

قرآن کی تلاوت کی جائے تو اسے پوری توجہ کے ساتھ سننا فرضِ عین ہے۔ (الا یہ کہ کوئی شخص کسی ضروری مشغولی کی وجہ سے نہ سن سکے، بلکہ ایسی جگہوں اور موقعوں پر بآوازِ بلند تلاوت درست نہیں جہاں لوگوں کے لیے سننا مشکل ہو) اور یہ ظاہر ہے کہ فرض کا ثواب نفل سے زیادہ ہوتا ہے، لہٰذا قرآنِ کریم کی تلاوت سے زیادہ ثواب قرآنِ کریم کے سننے پر دیا جاتا ہے۔

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ تلاوتِ قرآن سیکھنے کا بنیادی ذریعہ ہی اسے سننا ہے، قرآن سیکھنے کے لیے پہلے اسے سننا ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت ابتداء میں حضور ﷺ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ جلدی سے پڑھتے جاتے، تاکہ کوئی لفظ رہ نہ جائے، لیکن وحی کو سننا، سمجھنا پھر اسے دہرانا یہ کام آسان نہ تھا، اس لیے حق تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ﴾ (القيامة : ١٢)

”میرے محبوب! آپ اس قرآن کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں، بس آپ تو اچھی طرح سنتے رہیں۔“

﴿ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ﴾ (القيامة : ١٣)

”یقین رکھو! اس کو یاد کروانا اور پڑھوانا ہماری ذمہ داری ہے۔“

﴿ فَإِذَا قَرَأْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ﴾ (القيامة : ١٤)

”جب ہم (جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے قرآن) پڑھ رہے ہوں تو تم اس کی پیروی کرو“۔

﴿ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ (القيامة : ١٥)

”پھر اس کے مفہوم کو سمجھانا بھی ہماری ذمہ داری ہے“۔

تمہارا کام ہے اسے اچھی طرح سننا۔ معلوم ہوا کہ قرآنِ کریم کو سیکھنے کا بنیادی ذریعہ اسے سننا ہے، اس سے بھی قرآنِ کریم کو سننے کی اہمیت واضح ہوگئی۔

قرآن سن کر قلوب متاثر ہوتے ہیں:

علاوہ ازیں قرآنِ کریم کی تاثیر بھی مسلم ہے، قرآن پڑھنے اور سننے سے انسانی قلوب ضرور متاثر ہوتے ہیں، لیکن چوں کہ قرآنِ کریم کے مفہوم کا سمجھنا پڑھنے کے مقابلہ میں سننے کے ذریعہ زیادہ آسان ہوتا ہے اس لیے پڑھنے سے زیادہ سننے سے دل متاثر ہوتا ہے، بالخصوص اس وقت جب کہ قرآنِ کریم کی تلاوت تجوید کی رعایت اور احسانی کیفیت کے ساتھ کی جائے اور پوری توجہ اور خاموشی کے ساتھ سنا جائے، پھر ایسی تلاوت کو سن کر دلوں میں ایک صالح انقلاب پیدا ہوتا ہے، ورنہ کم از کم اس سے دل ضرور متاثر ہوتے ہیں، چنانچہ سیرۃ النبی ﷺ میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں کہ حضور ﷺ کی تلاوت کو سن کر لوگ ہدایت پا گئے، اور اگر کسی بدبخت کو ہدایت نہ بھی ملی تو کم از کم وقتی طور پر اس کا دل ضرور متاثر ہوا اور اس کے کفر وضلالت میں ضرور کمی آئی۔

قرآن سن کر متاثر ہونے والوں کے واقعات:

(۱) حضرت جبیر بن مطعمؓ کا واقعہ ہے، وہ خود فرماتے ہیں کہ میں مسلمان ہونے سے قبل ایک مرتبہ بدر کے قیدیوں کو متعلق گفتگو کرنے کے لیے حضور ﷺ کے پاس مدینہ منورہ پہنچا، اس وقت آپ ﷺ مغرب کی نماز میں سورۂ طور کی تلاوت فرما رہے تھے اور آپ ﷺ کی آواز مسجد سے باہر تک آرہی تھی، جسے میں (حیرانی کے ساتھ) سن رہا تھا، جب آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی:

﴿ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ۝ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ۝﴾ (الطور : ۷-۸)

”تیرے رب کا عذاب (بے ایمان پر) واقع ہوگا، جسے کوئی دفع نہ کر سکے گا“۔

سن کر میرے دل پر اس قدر اثر ہوا کہ گویا میرا دل خوفِ عذاب سے پھٹ جائے گا بس میں فوراً دربارِ رسالت میں حاضر ہوا اور اسلام قبول کر لیا۔ (قرطبی، از: معارف القرآن: ۸/۱۸۰)

(۲) اسی طرح حضور ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو ۷ھ میں مہاجرین حبشہ نے بھی مدینہ کا ارادہ کیا، تو حضرت نجاشی نے انہیں بخوشی اجازت دی اور ساتھ ہی ساتھ ستر افراد پر مشتمل ایک وفد بھیجا، یہ وفد جب خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو حضور ﷺ نے انہیں سورۂ یٰسین شریف پڑھ کر سنائی، سن کر سب کے سب رونے لگے اور اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور انہوں نے اسی وقت اسلام قبول کر لیا، قرآنِ پاک میں اس کی منظر کشی بایں طور کی گئی:

﴿ وَ إِذَا سَمِعُوا مَآ أُنْزِلَ إِلَى الرَّسُوْلِ تَرىٰٓ أَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ﴾ (المائدة : ۸۳) (معارف القرآن : ۲/۲۱۷)

یقیناً حضور ﷺ کی تلاوت نے دلوں کی تاریکی کو روشنی سے بدل دیا، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے فرمایا ہے:

وَ فِيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ يَتْلُوْ كِتَابَهٗ   إِذَا انْشَقَّ مَعْرُوْفٌ مِنَ الْفَجْرِ سَاطِعُ
أَرَانَا الْهُدىٰ بَعْدَ الْعَمٰى فَقُلُوْبُنَا   بِهٖ مُوْقِنَاتٌ أَنَّ مَا قَالَ وَاقِعُ
يَبِيْتُ يُجَافِيْ جَنْبَهٗ عَنْ فِرَاشِهٖ   إِذَا اسْتَثْقَلَتْ بِالْمُشْرِكِيْنَ الْمَضَاجِعُ

(بخاری : ۱/۱۵۵/ کتاب التہجد)

”ہم میں اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے ہیں جب صبح صادق طلوع ہوتی ہے، آپ ﷺ نے ہمیں اس کتابِ ہدایت کے ذریعہ ہدایت کا راستہ بتایا گمراہی کے بعد، اب ہمارے قلوب اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ جو کچھ آپ ﷺ نے فرمایا وہی حق ہے، آپ ﷺ تو اس حالت میں رات گزارتے ہیں کہ پہلو بستر سے جدا ہوتا ہے، جب کہ مشرکین بستروں میں سوئے رہتے ہیں“۔

تلاوت کی سماعت سے محروم رکھنے کے لیے مشرکین کے تین منصوبے:

آپ ﷺ کی تلاوت میں بلا کی کشش تھی، کافروں کے قلوب بھی آپ ﷺ کی تلاوت کو سن کر متاثر ہو جاتے تھے، اسی لیے ابتداءِ اسلام میں قریش مکہ نے قرآنِ کریم سے متعلق تین طرح کے منصوبے بنائے:

(۱) پہلا منصوبہ یہ بنایا کہ بآوازِ بلند تلاوت پر پابندی لگا دی جائے، کیوں کہ تلاوت کو سن کر لوگ مشرف باسلام ہو جاتے تھے، اس لیے ابتداءِ اسلام میں بلند آواز سے تلاوت کرنا جرم تھا، اس جرم کی پاداش میں خود حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ کو کئی مرتبہ اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا، اس ضمن میں حضرت صدیق اکبرؓ کا واقعہ پیش آیا جو بخاری/ کتاب الانبیاء/ باب الہجرۃ میں منقول ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا۔

(۲) دوسرا منصوبہ یہ بنایا کہ انہوں نے آپس میں یہ معاہدہ کیا کہ جب کبھی قرآن پڑھا جائے تو ہم میں سے کوئی بھی اسے ہرگز نہ سنے، لیکن اس معاہدہ پر تو ان کے سردار تک بھی قائم نہ رہ سکے، منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ حرم کعبہ میں رات کے وقت قرآنِ کریم کی تلاوت فرما رہے تھے، جب قرآنِ پاک صاحبِ قرآن کی زبان سے پڑھا جائے تو کیوں کر قلوب متاثر نہ ہوں؟ قریش مکہ کے تین سردار ابوجہل، ابوسفیان اور اخنس بن شریق ایک دوسرے سے چھپتے چھپاتے حضور ﷺ کی تلاوت کو سننے کے لیے کھڑے ہو گئے اور قرآن سنتے رہے، ابن کثیرؒ کے قول کے مطابق یہ واقعہ تین راتوں تک مسلسل پیش آیا، اس طرح یہ منصوبہ بھی ناکام ہوا۔ (السيرة النبوية لابن هشام:۳۳۷، الخصائص الكبرىٰ : ۱/۱۹۲)

(۳) تیسرا منصوبہ یہ بنایا کہ جب قرآن پڑھا جائے تو وہاں جا کر شور مچائیں اور لوگوں کو قرآن سننے سے روک دیں، کہتے تھے:

﴿ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَ الْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ۝﴾ (فصلت : ۲۶)

لیکن

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک رکھی ہے   اتنا ہی یہ اُبھرے گا جتنا کہ دباؤ گے

یہ منصوبہ بھی ناکام ہوا۔ جب یہ تمام تدابیر اور منصوبے بیکار ہو گئے تو اب انہوں نے تخویف کے بجائے ترغیب کا راستہ اختیار کیا، جس کے لیے انہوں نے ایک بہت ہی سنجیدہ سردار عتبہ بن ربیعہ کو بات چیت کے لیے حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا، اس نے آ کر آپ ﷺ کے سامنے چند تجاویز پیش کیں کہ محمد! تبلیغ اسلام (اور تلاوتِ قرآن) سے تمہارا مقصد شہرت، دولت، حکومت یا عورت ہے تو ہم اس کی تکمیل کے لیے تیار ہیں، شرط اتنی ہے کہ آپ تبلیغ اسلام (اور تلاوتِ قرآن) کا کام ترک کر دیں، جواباً آپ ﷺ نے اخلاص میں ڈوب کر سورۂ حٰمٓ السجدہ کی ابتدائی آیتوں کی تلاوت فرمائی، سن کر وہ بیحد متاثر ہوا اور خاموشی کے ساتھ واپس آ گیا۔ (معارف القرآن: ٧/٦٢٨)

اہل ایمان کی پانچ صفات:

صاحبو! جب قرآنِ پاک سے کافروں کے قلوب بھی متاثر ہوتے ہیں تو اہل ایمان کے قلوب تو بدرجہ اولیٰ متاثر ہوں گے، حق تعالیٰ نے اہل ایمان کی جو پانچ صفات قرآنِ پاک میں بیان فرمائی ہیں ان میں ایک صفت یہ بھی ہے کہ قرآن کی تلاوت کو سن کر ان کے ایمان میں ترقی ہوتی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ ﴾

پہلی صفت یہ ہے کہ خوفِ الٰہی سے ان کے قلوب بھر جاتے ہیں، اس لیے جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کا ذکر آتا ہے تو ان کے دل کانپ جاتے ہیں۔

بعض علماء نے فرمایا کہ یہاں ذکر اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد سے مراد یہ ہے کہ ارتکابِ معاصی کے وقت جب اللہ تعالیٰ کی یاد آ جاتی ہے تو ان کا دل سہم جاتا ہے اور کانپ جاتا ہے اور خوفِ الٰہی کی وجہ سے وہ گناہ سے بچ جاتے ہیں۔ (معارف القرآن: ٤/١٧٨)

مؤمنین کی دوسری صفت:

﴿ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ إِيْمَانًا ﴾

تلاوتِ قرآن کو سن کر ان کی ایمانی کیفیت میں ترقی اور زیادتی ہوتی ہے، تلاوتِ قرآن کو سن کر ان کا نورِ ایمان بڑھ جاتا ہے۔ بے ایمان میوزک سن کر جھومتے ہیں تو اہل

ایمان قرآن سن کر جھومتے ہیں، اونگھتے نہیں، قرآنِ پاک کی سماعت ان کی تھکاوٹ کا بہترین علاج ہوتا ہے، چنانچہ منقول ہے کہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ جب حکومت ہند کے وزیر تعلیم تھے تو ایک مرتبہ ٢٩/ ربیع الآخر/ ١٣٧٠ھ کو دیوبند تشریف لائے، دار العلوم کا معاینہ کرنے کے بعد جب تھک گئے تو فرمایا: ''میری اس تھکاوٹ کا علاج یہ ہے کہ قاری صاحب سے قرآن سنا دیا جائے''۔ (مستفاد از: اتحاف الطلبۃ: ٦٩)

مؤمنین کی تیسری صفت:

﴿ وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ ﴾

ان کا بھروسہ اسباب پر نہیں، مسبب الاسباب پر ہوتا ہے، وہ دنیوی اسباب تو ضرور اختیار کرتے ہیں؛ مگر بھروسہ اللہ تعالیٰ پر رکھتے ہیں۔

مؤمنین کی چوتھی صفت:

﴿ اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ ﴾

''وہ نماز کو ہر حال میں قائم کرتے ہیں۔'' کیا امیری، کیا غریبی، کیا بیماری، کیا تندرستی، کیا فرصت، کیا مشغولی، کبھی نماز نہیں چھوڑتے۔

مؤمنین کی پانچویں صفت:

﴿ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ ﴾ (الأنفال: ٢)

''اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے رزق میں سے خرچ کرتے ہیں۔'' کیوں کہ ان کا یقین ہوتا ہے کہ مانگنے اور سوال کرنے والوں کو اگر دنیا دیتی ہے تو دینے والوں کو دنیا والا دیتا ہے، اس لیے وہ سخی ہوتے ہیں، بخیل نہیں ہوتے، یہی حضرات اصلی اور قرآنی مؤمن ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ کے پاس بلند درجات، مغفرت اور عزت کی روزی ہے۔

حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ پانچوں صفات ہم میں کامل اور مکمل طور پر پیدا فرما دیں۔ آمین یا رب العالمین۔

١٧/ شعبان/ ١٤٤٠ھ (بزمِ صدیقی، بڑودا)

مطابق: ٢٣/ اپریل/ ٢٠١٩ (بروز منگل)

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيْرًا فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيْرًا كَثِيْرًا

(۲۱)

زنا کی مذمت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ هُرَيۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِذَا زَنَى الۡعَبۡدُ خَرَجَ مِنۡهُ الۡإِيۡمَانُ، فَكَانَ فَوۡقَ رَأۡسِهٖ كَالظُّلَّةِ، فَإِذَا خَرَجَ مِنۡ ذٰلِكَ الۡعَمَلِ رَجَعَ إِلَيۡهِ الۡإِيۡمَانُ". (رواه الترمذی و أبوداود، مشکوٰۃ : ۱۸ / باب الکبائر و علامات النفاق)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب بندہ زنا کرتا ہے تو اس وقت اس سے (نورِ) ایمان نکل جاتا ہے اور اس کے سر پر سایہ بن کر معلق ہو جاتا ہے (معلوم ہوا کہ یہ جرم ایک کامل مؤمن کر ہی نہیں سکتا، یا پھر جس وقت وہ اس کا مرتکب ہوتا ہے تب وہ کامل مؤمن نہیں رہتا، جب تک سچی پکی توبہ نہ کرلے) جب وہ اس بدکاری سے فارغ (تائب) ہو جاتا ہے تو (بفضلہٖ تعالیٰ وہ نورِ) ایمان واپس آجاتا ہے۔

گناہ سے بچنا بھی عظیم عبادت ہے:

اللہ رب العزت کے احکام پر اخلاصِ نیت اور اتباعِ سنت کے ساتھ عمل کرنا

عبادت ہے، خواہ ان احکام کا تعلق اوامر سے ہو یا نواہی سے، یعنی فرائض و واجبات پر عمل کرنے کے ساتھ ہو یا محرمات ومکروہات سے بچنے کے ساتھ ہو، اس اعتبار سے اگر سچ بولنا عبادت ہے تو موقع پر جھوٹ سے بچنا بھی عبادت ہے، اگر حفظ امانت عبادت ہے تو خیانت سے بچنا بھی عبادت ہے، اگر ایفاءِ عہد عبادت ہے تو وعدہ خلافی و بے وفائی سے بچنا بھی عبادت ہے، اگر دوسروں کی خدمت کرنا اور راحت پہنچانا عبادت ہے تو انہیں تکلیف اور نقصان سے بچانا بھی عبادت ہے، اگر حدودِ شریعت میں رہتے ہوئے تجارت، صنعت اور زراعت عبادت ہے تو دھوکہ، سود اور رشوت وغیرہ سے بچنا بھی عبادت ہے، اگر صلہ رحمی عبادت ہے تو قطع رحمی سے بچنا بھی عبادت ہے، اگر شرعی ہدایات کے مطابق نکاح کرنا عبادت ہے تو زنا کاری سے بچنا بھی عبادت ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر نیکیوں کا اہتمام کرنا عبادت ہے تو گناہوں سے بچنا بھی عظیم الشان عبادت ہے، حدیث پاک میں ارشاد ہے: "اِتَّقِ الۡمَحَارِمَ، تَكُنۡ أَعۡبَدَ النَّاسِ". (ترمذی، مشکوٰۃ: ٤٤٠) ''محرمات، منکرات، منہیات اور معاصی سے بچو، سب سے بڑے عبادت گزار بن جاؤ گے۔''

گناہ سے بچنا بھی اللہ کی رضا ورحمت کا سبب ہے:

اس کے علاوہ گناہ سے بچنا مغفرت اور دخولِ جنت کا سبب بھی ہے، جیسا کہ قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿ إِنۡ تَجۡتَنِبُوۡا كَبَآئِرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ نُكَفِّرۡ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ وَ نُدۡخِلۡكُمۡ مُّدۡخَلًا كَرِيۡمًا ۝﴾ (النساء : ۳۱)

''اگر تم ان بڑے گناہوں سے بچو جن سے تمہیں روکا گیا ہے تو ہم تمہارے سیئات (چھوٹے گناہوں) کو معاف کر دیں گے اور تمہیں عزت کے مقام (جنت) میں داخل کریں گے۔''

گویا حق تعالیٰ اپنے بندوں یہ اسکیم پیش کرتے ہیں، جس کا مطب یہ ہے کہ اگر ہم

کوشش کے باوجود تمام گناہوں سے نہ بچ سکیں؛ پھر بھی بڑے بڑے گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرلیں تب بھی ہم اللہ تعالیٰ کی رضا ورحمت اور مغفرت ودخولِ جنت کے لائق بن سکتے ہیں۔

حدیث پاک میں اس کی ایک مثال بھی ملتی ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ سے ایک واقعہ سات مرتبہ سنا کہ بنی اسرائیل میں ''کِفل'' نامی ایک شخص بدکاری کا عادی تھا، اس نے ایک مرتبہ کسی مجبور عورت کو ساٹھ اشرفی دے کر بدکاری پر آمادہ کیا، عین بدکاری کے وقت اس مجبور عورت نے روتے ہوئے اپنی مجبوری (اور خوفِ الٰہی) کا ذکر کیا تو کِفل اس گناہ سے باز رہا، پھر اس نے سچی توبہ کر لی، اتفاق سے اسی رات اس کا انتقال ہوگیا، تو صبح اس کے دروازہ پر لکھا تھا: "إِنَّ اللّٰهَ قَدْ غَفَرَ لِلْكِفْلِ". ''اللہ پاک نے (اجتناب عن المعصیہ کی برکت سے) کفل کی مغفرت فرما دی۔'' (ترمذی، مشکوۃ: ٢/٦٧)

اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اُمتی گناہ سے بچ کر اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رضا و رحمت کا حق دار بن سکتا ہے تو حضور ﷺ کا اُمتی بدرجۂ اولیٰ بن سکتا ہے۔

حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ يَضْمَنْ لِيْ مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ، وَ مَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ، أَضْمَنْ لَهُ الْجَنَّةَ". (رواه البخاري، مشكوٰة : ٤١١)

جو شخص اپنی حرام گوئی، حرام خوری اور حرام کاری سے حفاظت کرلے حضور ﷺ اس کے لیے جنت کی ضمانت اور ذمہ داری لے رہے ہیں۔

نیز حدیث پاک میں ہے کہ قیامت میں جن لوگوں کو عرشِ الٰہی کا سایہ نصیب ہوگا ان میں ایک بندہ وہ بھی ہے جسے بدکاری کا موقع تو ملا؛ لیکن وہ خوفِ الٰہی سے بچ گیا۔

"وَ رَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ حَسَبٍ وَّ جَمَالٍ، فَقَالَ: إِنِّيْ أَخَافُ اللّٰهَ".

(متفق عليه، مشكوٰة : ٦٨)

خوفِ الٰہی سے متعلق ایک انتہائی شاندار دل چسپ اور سبق آموز واقعہ:

اس سلسلے میں انتہائی شان دار، دل چسپ اور سبق آموز واقعہ منقول ہے کہ امام شافعیؒ کے زمانے میں ایک خلیفہ نے اپنی بیوی کو عجیب طریقے سے طلاق دے دی، اور یہ طلاق بعد ازاں فقہ کا بہت بڑا مسئلہ بن گئی، بادشاہ اپنی ملکہ کے ساتھ بیٹھا تھا کہ ہنسی مذاق میں اُس نے ملکہ سے پوچھ لیا کہ تمہیں میری شکل کیسی لگتی ہے؟ ملکہ جو بادشاہ کی عزیز ترین بیگم تھی وہ مذاق کے موڈ میں بولی: ''مجھے آپ شکل سے جہنمی لگتے ہیں۔'' یہ فقرہ سننے کے بعد بادشاہ کو غصہ آ گیا اور بولا: ''میں اگر جہنمی ہوں تو تمہیں تین طلاق دیتا ہوں! ملکہ نے یہ سنا تو اُس نے رونا پیٹنا شروع کر دیا، بادشاہ کو بھی کچھ دیر بعد اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔

اگلے دِن بادشاہ سلامت نے ملک کے تمام علماء، مفتی صاحبان اور اماموں کو دربار میں بلا لیا اور اُن سے پوچھا کہ کیا اِس طریقے سے میری بیوی کو طلاق ہو چکی ہے؟ سب کا باری باری یہی کہنا تھا کہ ہاں، آپکی بیوی کو طلاق ہو چکی ہے اور شریعت کی روشنی میں ملکۂ عالیہ اب آپ کی زوجہ نہیں رہیں۔

لیکن اِس محفل میں ایک نوجوان مفتی بھی موجود تھے، وہ ایک طرف ہو کر بالکل خاموش بیٹھے رہے، بادشاہ نے اُن سے بھی یہی سوال پوچھا تو انہوں نے عرض کیا: جناب! یہ طلاق نہیں ہوئی، کیوں کہ آپ نے مشروط طور پر کہا تھا کہ اگر میں جہنمی ہوں تو میں تمہیں تین طلاق دیتا ہوں، اور ابھی تک یہ طے نہیں ہوا کہ آپ جہنمی ہیں یا نہیں، آپ کو اگر کوئی شخص جنتی ہونے کی گارنٹی دے دے تو آپ کی یہ طلاق واقع نہیں ہوگی۔

بادشاہ سلامت نے جوشیلے انداز میں پوچھا: ''لیکن مجھے اِس چیز کی گارنٹی کون دے گا؟'' وہاں موجود تمام علماءِ کرام نے اِس سوال کے جواب پر اپنے سر جھکا لیے کہ دنیا میں

کون شخص جنتی ہے اور کون جہنمی ہے؟ اِس کی کوئی گارنٹی نہیں دے سکتا۔

اُس نوجوان مفتی نے جب تمام علماءِ کرام کو خاموش دیکھا تو وہ بادشاہ سلامت سے مخاطب ہوا: بادشاہ سلامت! میں آپ کو یہ گارنٹی دے سکتا ہوں؛ لیکن اِس کے لیے میں آپ سے ایک سوال پوچھوں گا، اگر آپ کا جواب ''ہاں'' ہوا تو میں آپ کو جنتی ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دوں گا۔ بادشاہ نے کہا: ہاں، پوچھو! نوجوان مفتی نے پوچھا: کیا آپ کی زندگی میں کبھی کوئی ایسا موقع آیا تھا کہ آپ گناہ پر قادر تھے؛ لیکن آپ نے صرف اللہ تعالیٰ کے خوف سے وہ گناہ چھوڑ دیا تھا؟ بادشاہ نے سر اُٹھایا اور کہا: ہاں، ایک بار ایسا ہوا تھا، میں اپنی خوابگاہ میں داخل ہوا اور وہاں ایک نوکرانی صفائی کر رہی تھی، وہ لڑکی انتہائی خوبصورت تھی، میں بھٹک گیا، میں نے دروازہ اندر سے بند کرلیا اور غلط نیت سے اُس لڑکی کی طرف بڑھا تو اُس نے رونا شروع کر دیا اور وہ چلاّ کر بولی: ''اے بادشاہ! اللہ سے ڈرو، وہ آپ سے زیادہ طاقتور ہے۔'' میں نے جب یہ سنا تو مجھ پر اللہ تعالیٰ کا خوف طاری ہوگیا، میں اگرچہ بادشاہ تھا، وہ لڑکی میرے کمرے میں تھی، میں نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی ہوئی تھی، اور اُس وقت دنیا کی کوئی طاقت مجھے بُرائی سے نہیں روک سکتی تھی؛ لیکن میں نے صرف اللہ تعالیٰ کے خوف سے دروازہ کھول دیا اور اُس لڑکی کو جانے کی اجازت دے دی۔

یہ سب سن کر وہ نوجوان مفتی مسکرایا اور اُس نے قرآن پاک کی سورۂ والنّٰزعٰت کی آیت تلاوت کی:

﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ○ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى○﴾ (النّٰزعٰت: ۴۰-۴۱)

ترجمہ: جو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈر گیا اور اُس نے اپنے نفس کو خواہشات میں پڑنے سے بچالیا تو ایسے شخص کا ٹھکانہ جنت ہی ہے۔

اِس کے بعد نوجوان نے بادشاہ سلامت سے کہا: میں آپ کو گارنٹی دیتا ہوں کہ آپ

جنتی بھی ہیں، اور آپ کی طلاق بھی نہیں ہوئی۔

عزیز دوستو! مسلمان ہونے کے ناطے ہم ہر وقت جنت کے متلاشی رہتے ہیں؛ لیکن ہم اِس واقعے سے اندازہ لگائیں کہ جنت تو ہر وقت ہمارے سامنے موجود ہوتی ہے، اور اِس کے لیے صرف ایک چیز کی ضرورت ہے، اور وہ یہ کہ ہم خوفِ خدا کی وجہ سے ہر اُس گناہ سے توبہ کریں جس کو کرنے کی ہم میں طاقت اور قدرت موجود ہو۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ہر وقت اپنے عذاب کا استحضار اور اپنا خوف نصیب فرمائیں اور ہر قسم کے گناہ سے بچنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

الغرض گناہ سے بچنا بھی ایک عظیم الشان عبادت اور اللہ تعالیٰ کی رضا و رحمت، اس کی مغفرت اور دخولِ جنت کا بڑا سبب ہے، نیز یہ دارین میں عذابِ الٰہی سے حفاظت کا ذریعہ بھی ہے، بقولِ شاعر:

مصلیٰ ہمارا ہے تختِ شاہی	خدا کا ذکر ہے طاقت ہماری
ہمارا حسن ہے ترکِ مناہی	ہماری فوج ہے اخلاقِ حسنہ

گناہ سے ایمان کا اثر و نور اور نیکی کا نفع کم یا ختم ہو جاتا ہے:

صاحبو! اگر اوامر پر عمل ضروری ہے تو نواہی سے بچنا بھی ضروری ہے، ورنہ نواہی اور گناہ کی وجہ سے ایمان کا اثر و نور اور نیکی کا نفع کم یا ختم ہو جاتا ہے، جیسے گاڑی یا کمرے میں ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے اے.سی. چلایا جائے؛ لیکن تمام کھڑکیاں کھلی رکھی جائیں یا کمرے میں انگیٹھی جلا دی جائے تو اے.سی. کا اثر نہیں ہوتا، اسی طرح اگر کوئی بندہ نیکیوں کا اہتمام تو کرے؛ لیکن گناہوں سے اجتناب نہ کرے تو نیکی کا اثر اور نفع نہیں ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے جہاں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت

کا حکم دیا وہیں اپنے اعمال کو ضائع نہ کرنے کی ہدایت بھی دی:

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ لَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَکُمْ﴾ (محمد : ۳۳)

حضرات علماءِ مفسرین کے بقول شرکِ جلی اور خفی یعنی ریا کاری اور بعض کبیرہ گناہوں کی وجہ سے بندوں کے اعمالِ صالحہ باطل ہوجاتے ہیں۔ یعنی ان کا ثواب ختم ہوجاتا ہے۔ (مستفاد از: انوار البیان: ۱۳۴/۵)

چنانچہ قرآنِ کریم اور احادیث مبارکہ میں مختلف برائیوں کے نقصانات اور ان پر وعید کا تذکرہ فرمایا گیا، مثلاً شرک کے متعلق فرمایا:

﴿ وَ لَوْ اَشْرَکُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ٥﴾ (الأنعام : ۸۸)

''اگر بالفرض حضرت انبیاء بھی شرک کرتے تو ان کے اعمال ضائع ہوجاتے، معلوم ہوا کہ شرک سے اعمال کا اَجر ضائع ہوجاتا ہے، اسی طرح ریا کاری کے متعلق حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن یہ اعلان ہوگا:

''مَنْ کَانَ اَشْرَكَ فِیْ عَمَلٍ عَمِلَهٗ لِلّٰهِ اَحَدًا فَلْیَطْلُبْ ثَوَابَهٗ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ''. (رواه أحمد، مشکوٰة : ۴۵۴)

''جس نے اپنا کوئی بھی عمل غیر اللہ (کو دکھانے اور خوش کرنے) کے لیے کیا تھا، تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے عمل کا ثواب بھی اسی سے لے لے۔'' (کیوں کہ ریا کاری کی وجہ سے اس کا اجر ضائع ہوگیا)۔

اسی طرح بعض کبائر سے بھی اجر ضائع ہوجاتا ہے، جیسے حسد کے متعلق ارشاد ہے:

''یَأْکُلُ الْحَسَنَاتِ کَمَا تَأْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ''. (رواه أبوداود، مشکوٰة: ۴۲۸)

''حسد کا گناہ نیکیوں (کے اثر و نفع) کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ سوکھی لکڑی کو جلا دیتی ہے''۔

اسی طرح حدیث پاک میں لوگوں کے درمیان فتنہ و فساد پھیلانے کے نقصان کو ذکر کیا گیا:

''فَسَادُ ذَاتِ الْبَیْنِ هِیَ الْحَالِقَةُ''. (رواه أبوداود، مشکوٰة : ۴۲۷)

اس سے اعمال کا حسن و کمال اور اَجر و ثواب اس طرح ختم ہوجاتا ہے جس طرح استرے سے بال مونڈے جاتے ہیں۔

نیز حدیث مذکورہ میں زنا کے نقصان کو بتایا گیا کہ اس سے ایمانی اثر و نور ختم ہوجاتا ہے، غور کیجئے کہ بعض گناہ تو وہ ہیں جن سے اعمال بے اثر ہوجاتے ہیں لیکن زنا وہ گناہ ہے جس سے سیدھا ایمان پر اثر پڑتا ہے، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ زنا کتنا بڑا اور خطرناک جرم ہے، یہ ایسا گناہ ہے کہ ایمان کے ساتھ اس کا کوئی جوڑ ہی نہیں، یہ سراسر کافرانہ عمل ہے۔

زنا شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ ہے:

زنا کی قباحت کا اندازہ یوں بھی لگایا جاسکتا ہے کہ قرآنِ کریم میں زنا کو شرک اور قتل ناحق کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، چنانچہ ارشادِ باری ہے:

﴿ وَ الَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ وَ لَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لَا یَزْنُوْنَ﴾ (الفرقان : ۶۸)

جس کا مطلب یہ ہے کہ شرک اور قتل ناحق کے بعد اگر کوئی جرم سب سے بڑا ہے تو وہ زنا ہے، ان گناہوں کے مرتکب کو قیامت میں دوگنا عذاب ہوگا، کیوں کہ یہ تینوں گناہ بہت بڑے ہیں، چنانچہ حدیث پاک میں ہے کہ جب آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ شرک، اس کے بعد فرمایا کہ قتل، پھر فرمایا کہ زنا۔ (مشکوٰۃ: ۱۶)

معلوم ہوا کہ سب سے بڑا گناہ شرک ہے، پھر قتل ناحق ہے، پھر زنا ہے۔ چوں کہ

زنا قتل کا ایک بڑا ذریعہ بھی ہے، اس لیے ابن کثیرؒ نے آیت کریمہ: ﴿وَ لَا تَقْرَبُوا الزِّنَا﴾ کے تحت ایک روایت ذکر کی ہے، جس میں زنا کو شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ قرار دیا گیا:

عَنِ الْهَيْثَمِ بْنِ مَالِكٍ الطَّائِيِّ مَرْفُوْعًا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: "مَا مِنْ ذَنْبٍ بَعْدَ الشِّرْكِ أَعْظَمُ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ نُطْفَةٍ وَضَعَهَا رَجُلٌ فِيْ رَحِمٍ لَا يَحِلُّ لَهٗ". (أخرجه ابن أبي الدنيا، تفسير ابن كثير: ۳۷۹/۲)

فرمایا کہ شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ زنا ہے، (اور زنا کا مطلب یہ ہے کہ) زانی اپنا نطفۂ حلال کسی ایسے رحم میں ڈالے جو اس کے لیے حلال نہیں ہے۔

زنا سے اللہ تعالیٰ کو غیرت آتی ہے:

یہی وجہ ہے کہ جس طرح شرک سے اللہ تعالیٰ کی غیرت کو جوش آتا ہے اسی طرح جب زانی زنا کرتا ہے تب بھی اللہ تعالیٰ کو بہت غیرت آتی ہے، چنانچہ اس مضمون کو رحمت عالم ﷺ نے سورج گہن کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے قسم کھا کر فرمایا:

"يَا أُمَّةَ مُحَمَّدٍ! وَاللّٰهِ مَا مِنْ أَحَدٍ أَغْيَرُ مِنَ اللّٰهِ أَنْ يَزْنِيَ عَبْدُهٗ، أَوْ تَزْنِيَ أَمَتُهٗ". (متفق عليه، مشكوٰة: ۱۳۰/ باب صلوٰة الخسوف)

"اے محمد ﷺ کی امت! اللہ کی قسم! اللہ سے زیادہ غیرت مند کوئی نہیں ہے جب اس کا کوئی بندہ یا بندی زنا کرتے ہیں"۔ اس بدکاری کی وجہ سے جس طرح تمہیں زانی اور زانیہ سے غیرت آتی ہے (غیرت کا مطلب ہے اپنے حق میں کسی کی شرکت کو برا ماننا، ظاہر ہے کہ عورت پر اس کے شوہر اور مرد پر اس کی بیوی کا حق ہے، جب زنا کے ذریعہ زانی اور زانیہ ایک دوسرے کے حق میں شرکت کرتے ہیں تو کوئی بھی سنجیدہ انسان اسے برداشت نہیں کرتا، تو جس طرح تمہیں یہ بدکاری برداشت نہیں اور تمہیں اس سے غیرت آتی ہے) اس سے کہیں زیادہ غیرت اس بدکاری کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو آتی ہے۔

زنا کا دنیوی و اُخروی عذاب:

یہ اسی غیرت کا اثر ہے کہ زنا کی وجہ سے دُنیا اور آخرت دونوں میں عذاب دیا جاتا ہے، حدیث پاک میں وارد ہے کہ جس قوم میں زنا عام ہو جاتا ہے (اور اس کے سدباب کی کوئی فکر نہیں کی جاتی) وہاں اللہ تعالیٰ کا عمومی عذاب، قحط سالی اور گرانی کی شکل میں نازل ہوتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِؓ قَالَ: "سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: "مَا مِنْ قَوْمٍ يَظْهَرُ فِيْهِمُ الزِّنَا إِلَّا أُخِذُوْا بِالسَّنَةِ". (رواه أحمد، مشكوٰة: ۳۱۳)

اسی طرح حضور ﷺ کو ایک مرتبہ خواب میں مختلف گناہوں کی سزائیں دکھائی گئیں، جس میں زنا کی سزا یہ دکھائی گئی کہ ایک گڑھا جو تنور کی طرح اوپر سے تنگ اور نیچے سے کشادہ ہے، اس میں آگ بھڑک رہی تھی، جب آگ کی بھڑک اوپر کو اٹھتی تو جو لوگ اس آگ کے اندر تھے وہ شعلوں کے ساتھ اوپر آ جاتے، آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ "فَهُمُ الزُّنَاةُ". "یہ لوگ زناکار ہیں۔" (بخاری، مشکوٰۃ: ۳۹۵)

ایک اور حدیث میں وارد ہے:

"يَا مَعْشَرَ النَّاسِ! اِتَّقُوا الزِّنَا، فَإِنَّ فِيْهِ سِتَّ خِصَالٍ، ثَلَاثٌ فِي الدُّنْيَا، وَثَلَاثٌ فِي الْآخِرَةِ، أَمَّا الَّتِيْ فِي الدُّنْيَا: فَيُذْهِبُ الْبَهَاءَ، وَيُوْرِثُ الْفَقْرَ، وَيُنْقِصُ الْعُمُرَ، وَأَمَّا الَّتِيْ فِي الْآخِرَةِ: فَسَخَطُ اللّٰهِ، وَسُوْءُ الْحِسَابِ، وَعَذَابُ النَّارِ".
(الزواجر عن اقتراف الكبائر: ۲۱۸/۲، كنز العمال: الجزء الخامس)

"اے لوگو! زنا سے (بہر صورت) بچو، بے شک اس میں چھ برائیاں (عذاب) ہیں، تین دنیا میں اور تین آخرت میں، دنیا کی برائی یہ ہے کہ زنا چہرے کی رونق ختم کر دیتا ہے، فقر پیدا کرتا ہے اور عمر کو گھٹا دیتا ہے، آخرت کی برائی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب بنتا ہے، برے حساب اور جہنم کے عذاب کا باعث ہے۔"

ایک دوسری حدیث میں ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: مَا ظَهَرَ الْغُلُوْلُ فِيْ قَوْمٍ إِلَّا أَلْقَى اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ، وَ لَا فَشَا الزِّنَا فِيْ قَوْمٍ إِلَّا كَثُرَ فِيْهِمُ الْمَوْتُ، وَ لَا نَقَصَ قَوْمٌ الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ إِلَّا قُطِعَ عَنْهُمُ الرِّزْقُ، وَ لَا حَكَمَ قَوْمٌ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا فَشَا فِيْهِمُ الدَّمُ، وَ لَا خَتَرَ قَوْمٌ بِالْعَهْدِ إِلَّا سُلِّطَ عَلَيْهِمُ الْعَدُوُّ". (رواه مالك فى الموطأ / باب ما جاء فى الغلول، مشكوٰة: ٤٥٩، باب تغير الناس)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب کسی قوم میں خیانت آجاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اُن کے دلوں میں رُعب ڈال دیتے ہیں، اور جب کسی قوم میں زنا پھیل جاتا ہے تو ان میں موت کی کثرت ہوجاتی ہے، اور جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے اللہ تعالیٰ ان کے رزق کو منقطع کر دیتے ہیں، اور جس قوم میں ناحق فیصلے ہوتے ہیں ان میں خون ریزی پھیل جاتی ہے، اور جو قوم عہد کو توڑ دیتی ہے ان پر دُشمن مسلط کر دیا جاتا ہے۔

زنا بہت ہی بڑا جرم ہے:

ان حقائق سے واضح ہوگیا کہ زنا بہت ہی بڑا اور بہت ہی بُرا جرم ہے، خواہ وہ کسی بھی درجہ میں ہو، مثلاً کسی شادی شدہ اجنبی عورت سے کیا جائے یا غیر شادی شدہ اجنبی عورت سے، محرم سے کیا جائے یا غیر محرم سے، زنا کرنے والا جوان ہو یا بوڑھا، عوام ہوں یا خواص، بہرحال زنا بہت بڑا اور بہت بُرا جرم ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے جہاں مطلقاً فواحش سے روکا، وہیں خاص طور پر زنا سے مستقلاً روکا، ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَ لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ ﴾ (الأنعام: ١٥١)

''لوگو! بے حیائی کے جتنے بھی ظاہری و باطنی علانیہ اور پوشیدہ طریقے ہیں ان کے پاس بھی مت جاؤ۔''

ظاہر ہے کہ اس میں زنا کی ممانعت بھی داخل ہے، لیکن زنا کی شدید قباحت اور

مذمت کے پیش نظر اس کے متعلق مستقل ارشاد فرمایا:

﴿ وَ لَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَ سَآءَ سَبِيْلًا ﴾ (بنی إسرائيل: ٣٢)

''زنا کے قریب بھی مت جاؤ، یہ بڑی بےحیائی اور بدترین راستہ ہے۔''

آیت کریمہ میں زنا کے متعلق تین باتیں ارشاد فرمائیں: پہلی یہ کہ زنا کے قریب بھی مت جاؤ، مطلب یہ ہے کہ جو کام اور کلام تمہیں زنا کے قریب کر دے ایسے تمام کاموں اور باتوں سے دور رہو، مثلاً عورتوں کا بے پردہ اور بن سنور کے گھر سے باہر نکلنا، مرد و زن کا بلا شرعی ضرورت کے ایک جگہ تنہائی یا مجمع میں جمع ہونا، اجنبی کی طرف شہوت کی نظر سے یا فحش مناظر دیکھنا، بلا ضرورت اجنبی مرد و عورت کا ایک دوسرے سے بات چیت کرنا، ایک دوسرے کے تصورات اور خیالات میں گم ہو جانا، خود لذتی یا مشت زنی وغیرہ وہ اسباب و وسائل ہیں جو کسی بھی انسان کو زنا کے قریب کر سکتے ہیں، اس لیے قرآنِ کریم میں حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ﴿لَا تَقْرَبُوا الزِّنَا﴾ فرما کر ان سے روک دیا۔

اور عاجز کا خیالِ ناقص تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حلالی بنانے کے لیے زنا اور اس کے اسباب و وسائل کو حرام فرما دیا تو یہ بھی اس کا احسان و انعام ہی ہے۔

حق تعالیٰ نے آگے دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ ﴿إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً﴾ زنا اور اس کے تمام اسباب و وسائل فحش اور بے حیائی والے ہیں، اور بے حیا لوگ ہی اس برائی و بدکاری کا ارتکاب کرتے ہیں، باحیا لوگ اس بدکاری سے خوفِ الٰہی کے سبب بچ جاتے ہیں۔

چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام باحیا تھے، اس لیے جب ان کے سامنے اس بدکاری کی پیشکش ہوئی تو آپ نے صاف منع فرما دیا، آپ علیہ السلام نے فرمایا:

﴿مَعَاذَ اللّٰهِ﴾ (یوسف: ٢٣)

''اللہ کی پناہ، یہ کام میں ہرگز نہیں کرسکتا۔''

ایک عبرت آموز واقعہ:

اسی طرح منقول ہے کہ خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کا ایک مؤذن تھا، جو قصر خلافت میں پانچ وقت اذان دیا کرتا تھا، ایک مرتبہ خلیفہ کی لونڈی نے اس کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ شکایت کی کہ آپ کا مؤذن مجھے غلط نگاہ سے دیکھتا ہے، خلیفہ سلیمان بہت باغیرت تھا، اس نے مؤذن کو سزا دینا چاہا، چنانچہ اس نے لونڈی کو حکم دیا کہ تم خوبصورت کپڑے پہن کر بن سنور کر اس کے پاس جاؤ اور کہو کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں اور مجھے اس کا اقرار ہے، امیر المومنین سے بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں؛ کیونکہ ان کو کیا علم کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ اس قسم کی گفتگو سکھا کر خلیفہ نے لونڈی کو مؤذن کے پاس بھجوا دیا اور کہا کہ وہ جو جواب دے مجھے بتانا۔

لونڈی نے اپنے آپ کو بنایا، سنوارا اور مؤذن کے پاس چلی گئی، اس نے اس مفہوم کی گفتگو مؤذن سے کی تو مؤذن نے فوراً چہرہ آسمان کی طرف کرلیا اور کہا:

''اے میرے بزرگ و برتر رب! تیرا خوبصورت پردہ کدھر ہے کہ میں اس میں چھپ جاؤں؟''

پھر لونڈی سے کہا کہ ''دوبارہ میرے پاس نہ آنا، عنقریب ہمیں ایک ایسی ہستی کے سامنے پیش ہونا ہے جو دھوکہ نہیں کھا سکتی۔''

مؤذن کا یہ دوٹوک جواب سننے کے بعد لونڈی خلیفہ سلیمان کے پاس آئی اور مؤذن کی گفتگو سے آگاہ کیا، خلیفہ اس مؤذن کے تقویٰ سے بڑا متاثر ہوا، اس نے مؤذن کو بلوایا اور کہا کہ ہم اپنی اس لونڈی سے تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں اور اخراجات کے لیے پچاس ہزار درہم کا عطیہ بھی دیتے ہیں۔

مؤذن نے عرض کیا: امیر المومنین! میں نہایت احترام کے ساتھ آپ کے ہبہ اور عطیہ کو واپس کرتا ہوں، مجھے اس سے دور ہی رکھیں۔

اللہ کی قسم! جب میری پہلی نظر اس پر پڑی تو وہ مجھے بڑی خوبصورت لگی اور میرے دل میں اس کی چاہت پیدا ہوئی؛ مگر اس کے ساتھ ہی میرے دل میں رب کا خوف پیدا ہوگیا، تب میں نے اپنی چاہت کو فراموش کردیا، اس کا خیال اپنے دل سے نکال دیا اور اپنی چاہت کو رب العزت کے پاس بطورِ ذخیرہ جمع کروادیا۔

اب اگر میں آپ کا عطیہ اور ہبہ قبول کرتا ہوں تو مجھے رب السماوات والارض سے شرم محسوس ہورہی ہے کہ جس چیز کو میں نے بطورِ ذخیرہ اس کے پاس جمع کروایا ہے اس کو واپس لے لوں، یہ ناممکن ہے۔ خلیفہ نے اپنی پیش کش کو دہرایا؛ مگر مؤذن نے قطعی انکار کردیا۔

سلیمان بن عبدالملک اس واقعہ سے بڑا متعجب ہوا اور متعدد بار اس نے اپنے ساتھیوں سے اس کا ذکر کیا۔ (''سنہری کرنیں'' صفحہ:۲۰۲ تحریر: محمد سرور بٹ)

واقعہ یہی ہے کہ جس شخص میں ذرّہ برابر بھی شرم وحیا ہوتی ہے وہ تو آج بھی زنا کے اسباب و وسائل سے دور رہتے ہیں، جب انہیں زنا کی پیشکش کی جاتی ہے: "هَيْتَ لَكَ" کہہ کر، تو جواباً عرض کرتے ہیں: "مَعَاذَ اللّٰهِ"، اس حیا سوز بدکاری سے اللہ تعالیٰ کی پناہ۔

اس نے کہا: مائی ڈیئر! کم ہیئر میں نے کہا: نو، پلیز

اس نے کہا: کیا وجہ؟ میں نے کہا: خوفِ خدا

آگے تیسری بات ارشاد فرمائی: ﴿وَ سَآءَ سَبِيْلًا﴾ یہ بہت برا راستہ ہے، یہ وہ راستہ ہے جس کی دنیا میں تو کوئی منزل ہی نہیں، البتہ آخرت میں اس کی منزل دوزخ ہے (العیاذ باللہ)۔ حضرت لقمان حکیمؒ نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ بیٹا! زنا سے بچنا، کیوں کہ اس کے شروع میں ڈر ہے تو اخیر میں ندامت و حسرت بھی ہے۔

زنا سے بچنے کی تدابیر:

دارین کی عافیت اسی میں ہے کہ زنا اور اس کے لوازمات، مقدمات، محرکات اور وسائل واسباب سے بچا جائے، نیز یہ عزم رکھا جائے کہ

آرزوؤں کا خون ہو یا حسرتیں برباد ہوں
اب تو اس دل کو بنانا ہے تیرے قابل مجھے

اسی کے ساتھ زنا سے بچنے کی تدابیر اختیار کی جائیں، مثلاً بالغ ہونے کے بعد مناسب رِشتہ تلاش کر کے شادی کی جائے، شادی اور نکاح کو آسان بنا دیا جائے، شادی کے بعد اگر طلاق یا وفات کا ناخوش گوار واقعہ پیش آجائے تو نکاحِ ثانی کا اہتمام کیا جائے، اسی کے ساتھ حتی الامکان زنا کے اسباب ووسائل سے بچا جائے، کبھی ایسے حالات پیش آجائیں اور خواہشاتِ نفسانی اس بدکاری پر مجبور کریں تو اس موقع پر قرآن وحدیث میں زنا کی جو مذمت اور وعیدِ شدید آئی ہے اسے یاد کیا جائے، بالخصوص نبوی نسخے کا تصور کیا جائے، جس کا تذکرہ حدیث پاک میں ہے کہ حضرت ابوامامہؓ فرماتے ہیں کہ ایک نوجوان دربارِ رسالت میں آکر زنا کی اجازت طلب کرنے لگا، اس کی جسارت صحابہ کرامؓ کو نہایت ناگوار گزری، مگر رحمت عالم ﷺ نے اسے اپنے قریب کیا اور فرمایا کہ ”کیا تم یہ کام اپنی ماں، بیوی، بیٹی، بہن، پھوپھی اور خالہ وغیرہ کے لیے پسند کرتے ہو؟“ عرض کیا: ”ہرگز نہیں“ فرمایا: ”پھر لوگ بھی تو اپنی ماں، بیوی، بیٹی، بہن، پھوپھی اور خالہ وغیرہ کے لیے اس کو پسند نہیں کرتے، اور جس کسی سے بھی یہ بدکاری کی جائے وہ یا تو کسی کی ماں یا بیوی یا بیٹی یا بہن یا پھوپھی اور خالہ ضرور ہوگی“، نوجوان عرض کرنے لگا: ”حضور! میرے لیے دعا فرما دیں، تو آپ ﷺ نے اس کے سینہ پر ہاتھ رکھ کر یہ دعا فرمائی:

”اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ ذَنْبَهٗ، وَ طَهِّرْ قَلْبَهٗ، وَ حَصِّنْ فَرْجَهٗ“. (مسند أحمد، شعب الإيمان: ٤/ ٣٦٢، ابن كثير : ٣/ ٣٨)

”اے اللہ! اس کا گناہ معاف فرما دیجئے، دل پاک فرما دیجئے اور شرمگاہ کو محفوظ فرمائیے۔“

راوی فرماتے ہیں کہ اس کے بعد اس نوجوان کا یہ حال ہو گیا کہ اس کی نگاہ کسی بھی بدعملی کی طرف اُٹھتی ہی نہیں تھی۔ لہٰذا زنا سے بچنے کی ان تدابیر کے ساتھ دعا کا اہتمام بھی کیا جائے۔

حق تعالیٰ اپنے کرم سے ہماری اور اہل خانہ کی تمام منکرات ومنہیات سے حفاظت فرمائیں۔ آمین۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ ذُنُوْبَنَا، وَ طَهِّرْ قُلُوْبَنَا، وَ حَصِّنْ فُرُوْجَنَا. آمين يا رب العالمين.

٩/ شعبان/ ١٤٤٠ھ
مطابق: ١٤/ اپریل/ ٢٠١٩ء
بروز اتوار (بزمِ صدیقی، بڑودا)

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيْرًا　　فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيْرًا كَثِيْرًا
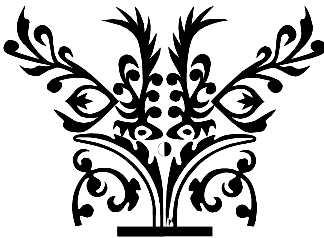
(۲۲)

رحمتِ باری تعالیٰ کی وسعت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ هُرَيۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَمَّا قَضَى اللّٰهُ الۡخَلۡقَ كَتَبَ كِتَابًا، فَهُوَ عِنۡدَهٗ فَوۡقَ عَرۡشِهٖ: "إِنَّ رَحۡمَتِيۡ سَبَقَتۡ غَضَبِيۡ"، وَ فِيۡ رِوَايَةٍ: "غَلَبَتۡ غَضَبِيۡ". (متفق عليه، مشكوٰة: ٢٠٦)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے (میثاق کے دن یا مطلقاً) مخلوق کو پیدا کرنے کا ارادہ اور فیصلہ کیا تو (پہلے ایک قانون اور ضابطہ کی) کتاب لکھی (مراد یہ ہے کہ فرشتوں کو یا قلم کو لکھنے کا حکم فرمایا، وہ کتاب چوں کہ عظیم الشان ہے اس لیے) حق تعالیٰ کے پاس عرش کے اوپر ہے، اس میں لکھا کہ ’’بلا شبہ میری رحمت میرے غضب پر سابق ہے، یا غالب ہے۔‘‘

دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سب کے لیے عام ہے:

اللہ تعالیٰ صرف رب المسلمین، رب المؤمنین اور رب الاولیاء والمتقین ہی نہیں؛ بلکہ رب العالمین ہے: ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ﴾ (الفاتحة: ١) قرآنِ کریم نے اعلان کر دیا کہ وہ تمام جہانوں میں جتنی بھی مخلوقات ہیں سب کا رب ہے، جس طرح ہمارے رب کی

ربوبیت سب کے لیے ہے اسی طرح رحمت بھی سب کے لیے ہے، اس کی ربوبیت بھی بہت وسیع ہے اور رحمت بھی بہت وسیع ہے، قرآنِ پاک میں حق تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَقُلۡ رَّبُّكُمۡ ذُوۡ رَحۡمَةٍ وَّاسِعَةٍ﴾ (الأنعام: ١٤٧)

’’محبوبم! اعلان کر دیجیے، میرے بندوں کو بتا دیجیے کہ تمہارا رب بہت ہی وسیع رحمت کا مالک ہے‘‘۔

ہم اس کی وسعت رحمت کے چار نمونے اور مثالیں پیش کرتے ہیں، منجملہ ان کے ایک یہ کہ دنیا کی کوئی بھی مخلوق اس کی ربوبیت کی طرح رحمت سے محروم نہیں، یہی وجہ ہے کہ دنیا میں اس کا عذاب سب کے لیے عام نہیں ہے؛ لیکن اس کی رحمت سبھی کے لیے عام ہے، فرمایا:

﴿قَالَ عَذَابِيۡۤ أُصِيۡبُ بِهٖ مَنۡ أَشَآءُ وَ رَحۡمَتِيۡ وَسِعَتۡ كُلَّ شَيۡءٍ﴾ (الأعراف: ١٥٦)

ہر گنہگار کو عذابِ الٰہی میں مبتلا تو نہیں کیا جاتا؛ لیکن ہر گنہگار کو دنیا میں رحمت الٰہی سے فیض یاب ہونے کا موقع ضرور دیا جاتا ہے، کیوں کہ حدیث مذکورہ کے مطابق اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے اور اس کی رحمت اس کے عذاب پر غالب ہے، اس کے غضب کے مقابلہ میں اس کی رحمت بہت ہی زیادہ وسیع ہے۔

کراماً کاتبین کو بندہ کی نیکی و بدی کے متعلق حکم:

رحمت باری تعالیٰ کی وسعت کا دوسرا نمونہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کے تمام احوال و اعمال سے باخبر ہونے کے باوجود خاص حکمت کے تحت (قیامت میں اتمامِ حجت کے لیے) اس نے ہر انسان کے لیے دنیا میں دو فرشتے رات کو اور دو فرشتے دن کو مقرر کیے ہیں، جو بندہ کے تمام احوال و اعمال اور افعال و اقوال لکھنے کے لیے ہر وقت موجود اور تیار رہتے ہیں (سوائے قضاءِ حاجت اور میاں بیوی کے تعلق کے وقت) ان میں سے ایک دائیں طرف ہے جو اس کی نیکیاں لکھتا ہے اور دوسرا اس کی بائیں طرف ہے، جو برائیاں لکھتا

ہے، قرآن پاک میں فرمایا:

﴿ وَ إِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ○ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ○ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ○﴾ (الانفطار: ۱۰-۱۲)

"حق تعالیٰ نے تم پر معزز فرشتوں کو مقرر کیا ہے، جو تمہارے اعمال کو لکھنے والے ہیں اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ جانتے ہیں۔"

حتیٰ کہ آیت کریمہ کے تحت تفسیر قرطبی میں مذکور ہے کہ جب انسان نیکی یا بدی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کی خوشبو یا بدبو سے پتہ چل جاتا ہے۔

اب رحمت باری تعالیٰ کی وسعت دیکھئے کہ ایک حدیث قدسی میں ان فرشتوں کے متعلق وارد ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ: "إِذَا هَمَّ عَبْدِيْ بِسَيِّئَةٍ فَلَا تَكْتُبُوْهَا عَلَيْهِ، فَإِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوْهَا سَيِّئَةً، وَ إِذَا هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا، فَاكْتُبُوْهَا حَسَنَةً، فَإِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوْهَا عَشْرًا".

(رواه مسلم: ۳۳۴ / باب إذا همّ العبد بحسنة كتبت، و إذا همّ بسيئة لم تكتب) (حدیث قدسی نمبر:۱۴)

"حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب میرا بندہ گناہ کا ارادہ کرے تو اس کو فوراً نہ لکھو، پھر اگر وہ (نفس و شیطان کی شرارت سے) گناہ کر لے تو اس کا ایک ہی گناہ لکھو، اس کے برخلاف جب میرا بندہ کسی نیکی کا ارادہ کرے تو فوراً ارادۂ خیر پر بھی ایک نیکی لکھ لو، اور اگر وہ اس نیکی والے عمل کو انجام دے دے تو اس کے لیے (کم از کم) دس گنا اجر لکھ لو۔" یہ ہے اس کی وسعت رحمت کا دوسرا نمونہ۔

بندہ کی توبہ سے رب العالمین کی خوشی:

اس کی وسعتِ رحمت کا تیسرا نمونہ یہ ہے کہ بندے نے خواہ کتنے ہی بڑے بڑے گناہ کیے ہوں؛ بلکہ ساری زندگی گناہوں میں گزار دی ہو؛ لیکن بندہ جب اپنے گناہوں پر شرمندہ ہو کر سچی اور پکی توبہ کر لیتا ہے تو حق تعالیٰ نہ صرف یہ کہ بندہ کی مغفرت کر دیتا ہے؛

بلکہ بندہ کی توبہ سے رب العالمین کو بہت ہی زیادہ خوشی ہوتی ہے، حدیث میں ہے کہ بندہ کی توبہ سے حق تعالیٰ کو اس شخص سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے جو اپنی سواری پر کھانے پینے کا سامان ساتھ لے کر کسی لمبے سفر پر جا رہا تھا، درمیان سفر وہ کسی ایسے بے آب و گیاہ میدان میں پہنچا جہاں دور دور تک نہ کوئی انسان تھا نہ کھانے پینے کا سامان، یہ شخص تھکا ہارا کسی جگہ اپنی سواری کو روک کر آرام کرنے لگا، جب وہ بیدار ہوا تو کیا دیکھتا ہے کہ سواری غائب ہے، کیوں کہ سواری پر تمام کھانے پینے اور ضرورت کا سامان تھا، اس لیے جب وہ سواری غائب ہوگئی تو یہ شخص بہت ہی زیادہ پریشان ہوگیا، پریشان ہو کر اِدھر اُدھر تلاش کرتا رہا اور پھرتا رہا، بالآخر مایوس ہو کر موت کا انتظار کرنے لگا، اسی حالت میں اسے نیند آ گئی، اللہ کی شان، اب کی بار جب نیند سے بیدار ہوا تو اپنی اس گم شدہ سواری کو موجود پایا، سواری کیا ملی اسے تو زندگی مل گئی، لہٰذا وہ بہت ہی زیادہ خوش ہوگیا، خوشی میں مدہوش ہو کر کہنے لگا: "اَللّٰهُمَّ أَنْتَ عَبْدِيْ وَأَنَا رَبُّكَ" "اے اللہ! تو میرا بندہ اور میں تیرا رب ہوں" مطلب یہ ہے کہ وہ بہت بڑی چوک کر بیٹھا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کو بندہ اور خود کو رب کہا۔

حدیث پاک میں ہے کہ جس طرح کسی کی سواری گم (اور زندگی سے مایوس) ہو جانے کے بعد جب دوبارہ سواری (اور زندگی) کے مل جانے سے اسے جتنی خوشی ہوتی ہے حق تعالیٰ کو اپنے بندہ کی توبہ سے اس سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے۔

"لَلّٰهُ أَشَدُّ فَرَحًا بِتَوْبَةِ عَبْدِهٖ حِيْنَ يَتُوْبُ إِلَيْهِ مِنْ أَحَدِكُمْ إِذَا كَانَ عَلٰى رَاحِلَتِهٖ بِأَرْضِ فَلَاةٍ، فَانْفَلَتَتْ مِنْهُ، وَ عَلَيْهَا طَعَامُهٗ وَ شَرَابُهٗ، فَأَيِسَ مِنْهَا، فَأَتٰى شَجَرَةً، فَاضْطَجَعَ فِيْ ظِلِّهَا، قَدْ أَيِسَ مِنْ رَاحِلَتِهٖ، فَبَيْنَا هُوَ كَذٰلِكَ، إِذَا هُوَ بِهَا قَائِمَةٌ عِنْدَهٗ، فَأَخَذَ بِخِطَامِهَا، ثُمَّ قَالَ مِنْ شِدَّةِ الْفَرَحِ: اَللّٰهُمَّ أَنْتَ عَبْدِيْ وَ أَنَا رَبُّكَ، أَخْطَأَ مِنْ شِدَّةِ الْفَرَحِ". (رواه مسلم، مشكوٰة: ۲۰۳)

چار اعمال سیئات کو حسنات سے بدلنے کا سبب ہیں:

یہ بھی تو رحمت باری تعالیٰ کی وسعت ہی ہے، علاوہ ازیں چوتھا نمونہ رحمت باری تعالیٰ کی وسعت کا یہ ہے کہ چار اعمال اتنے مہتم بالشان ہیں جن کا اہتمام کرنے سے حق تعالیٰ نہ صرف یہ کہ بندہ کی مغفرت فرما دیتے ہیں بلکہ اس کی سیئات کو حسنات سے بدل دیتے ہیں، حالانکہ ان اعمال سے صرف مغفرت مل جاتی تب بھی بہت بڑی بات تھی، کیوں کہ مغفرتِ باری تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی نعمت اور دولت نہیں ہے۔ اسی لیے حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب سب سے بڑی حکومت وسلطنت کا حق تعالیٰ سے سوال کیا تو اس سے پہلے آپ نے حق تعالیٰ سے مغفرت طلب کی:

﴿قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَ هَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ﴾ (ص:۳۵)

تا کہ دنیا کو پتہ چل جائے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مغفرت کا مل جانا ساری دنیا کی حکومت وسلطنت سے بھی بڑی دولت ہے، جس کا حق تعالیٰ نے چار اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرنے والے کے لیے وعدہ فرمایا ہے۔

(۱) توبہ کی وجہ سے سیئات کو حسنات سے بدل دیا جاتا ہے:

ان چار عظیم الشان اعمال پر اللہ تعالیٰ نے صرف مغفرت ہی نہیں؛ بلکہ سیئات کو حسنات سے بدل دینے کی بشارت بھی عطا فرمائی ہے، ان میں سے پہلا عمل توبہ اور اس پر ثابت قدم رہنا ہے، ''توبہ'' کے معنیٰ ہیں پلٹ آنا اور رجوع کرنا، مطلب یہ ہے کہ بندہ اگر کفر وشرک اور ضلالت ومعصیت میں مبتلا ہے تو کفر سے ایمان کی طرف، شرک سے توحید کی طرف، ضلالت سے ہدایت کی طرف اور معصیت سے طاعات کی طرف پلٹ آئے، پھر توبہ کے تقاضا کو پورا کرتے ہوئے اس پر ثابت قدم رہنا، توبہ کا تقاضا یہ ہے کہ جس قسم کے بھی گناہ

میں مبتلا ہے اسے فوراً چھوڑ دے، اس کے علاوہ اگر گناہ حقوق اللہ سے متعلق ہو تو بدنی اور مالی عبادات میں کوتاہی کی صورت میں اس کی قضا لازم اور ضروری ہے، جیسے بدنی عبادات میں نماز وروزہ، اور مالی عبادات میں زکوٰۃ اور قربانی وغیرہ، لیکن حقوق اللہ میں کوتاہی کا تعلق مالی اور بدنی عبادات کے علاوہ سے ہو، مثلاً جھوٹ بولا، شراب پی لی، تو اس کے لیے اس گناہ پر شرمندہ ہونا اور آئندہ اس گناہ کے نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرنا بھی کافی ہے، اور اگر گناہ کا تعلق بندہ کے حقوق سے ہو، جیسے کسی کو جسمانی، مالی یا روحانی اَذیت پہنچائی تو جسمانی اور مالی اَذیت کی تلافی اور روحانی اَذیت میں معافی ضروری ہے، اس طرح توبہ کے بعد پھر اس توبہ پر ثابت قدم رہنا لازم ہے، جس کے لیے برے ماحول سے محفوظ رہنا اور اعمالِ صالحہ میں مشغول رہنا ضروری ہے، ورنہ توبہ کا مقصد حاصل نہیں ہوگا، واقعہ یہ ہے کہ جب بندہ اس طرح توبہ کر کے اس کے تقاضوں پر عمل کرتے ہوئے اس پر ثابت قدم رہتا ہے تو حق تعالیٰ اس توبہ کی برکت سے بندہ کی سیئات کو حسنات سے بدل دیتا ہے، چنانچہ ارشادِ باری ہے:

﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ (الفرقان : ۷۰)

جس بندہ نے توبہ کر لی، پھر توبہ کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اس پر ثابت قدم رہا، تو حق تعالیٰ وعدہ فرماتے ہیں کہ اس کی سیئات کو حسنات سے بدل دیا جائے گا، یہ اس کی وسعتِ رحمت نہیں تو اور کیا ہے۔

(۲) شرک سے بچتے ہوئے اعمالِ صالحہ کا اہتمام سیئات کو حسنات سے بدل دیتا ہے:

دوسرا عظیم الشان عمل شرک سے بچتے ہوئے اعمالِ صالحہ کا بہ کثرت اہتمام کرنا ہے، قرآنِ کریم نے اس کی ترغیب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْ لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ أَحَدًا٥﴾ (الكهف : ١١٠)

”جو شخص اپنے رب سے (اس کا محبوب اور مقرب بن کر) ملنے کی آرزو رکھتا ہے اسے چاہیے کہ وہ اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔“

کیوں کہ شرکِ اصغر و اکبر حبطِ اعمال کا سبب ہے، اس لیے مطلب یہ ہے کہ شرک (اصغر و اکبر) سے بچتے ہوئے نیک اعمال کا بہ کثرت اہتمام کرے؛ بلکہ اس میں ایک دوسرے سے سبقت کرنی چاہیے۔ ارشادِ باری ہے:

﴿ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ (البقرة : ١٤٨)

”نیک کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔“ جب انسان نیک کاموں میں آگے بڑھ چڑھ کر حصہ لے گا تو اس کی نیکیاں برائیوں پر غالب آجائیں گی اور حق تعالیٰ اپنی وسعتِ رحمت سے نیکیوں کی کثرت کی وجہ سے سیئات کو حسنات سے بدل دیتے ہیں، چنانچہ تفسیر قرطبی میں آیت کریمہ ﴿إِلَّا مَنْ تَابَ......الخ﴾ (الفرقان: ٧٠) کے تحت حضرت ابو ہریرہؓ کا ایک قول نقل کیا گیا ہے، جس میں ارشاد ہے:

” قَالَ أَبُوْ هُرَيْرَةَ:“ ذٰلِكَ فِي الآخِرَةِ فِيمَنْ غَلَبَتْ حَسَنَاتُهٗ عَلٰى سَيِّئَاتِهٖ، فَيُبَدِّلُ اللّٰهُ السَّيِّئَاتِ حَسَنَاتٍ“. (تفسير القرطبي/ الفرقان : ٧٠)

قیامت کے دن جس بندہ کی نیکیاں برائیوں پر غالب ہوں گی تو حق تعالیٰ اپنی وسیع رحمت سے اس کی سیئات کو حسنات سے بدل دیں گے، ظاہر ہے کہ اس سے بڑی کامیابی کوئی نہیں، قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿ إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ٥ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ٥﴾ (الصّٰفّٰت: ٦٠-٦١)

”بے شک یہی بڑی کامیابی ہے، ایسی ہی کامیابی کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے۔“

(۳) اخلاص کے ساتھ ذکر اللہ کے لیے جمع ہونا سیئات کو حسنات سے بدل دیتا ہے:

تیسرا عمل ذکر اللہ کے لیے اخلاص کے ساتھ جمع ہونا، ذکر اللہ کے لیے جمع ہونے میں احکامِ الٰہی کی ادائیگی کی جتنی بھی اجتماعی شکلیں ہیں وہ سب داخل ہیں، جیسے (۱) نماز باجماعت کے لیے اجتماع (۲) طوافِ بیت اللہ کے لیے اجتماع (۳) مساجد وغیرہ میں وعظ و نصیحت کے لیے اجتماع (۴) مدارس وغیرہ میں درس و تدریس کے لیے اجتماع، اگر یہ عمل محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہو تو اس کی برکات سے سیئات کو حسنات سے بدل دیا جاتا ہے، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَنَسٍؓ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ:” مَا مِنْ قَوْمٍ اجْتَمَعُوْا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ لَا يُرِيْدُوْنَ بِذٰلِكَ إِلَّا وَجْهَهٗ، إِلَّا نَادَاهُمْ مُنَادٍ مِنَ السَّمَاءِ أَنْ قُوْمُوْا مَغْفُوْرًا لَكُمْ، قَدْ بُدِّلَتْ سَيِّئَاتُكُمْ حَسَنَاتٍ“. (مسند أحمد)

”جو لوگ ذکر اللہ کے لیے جمع ہوتے ہیں اور ان کا مقصد رضاءِ الٰہی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا، تو آسمان سے ایک منادی یہ ندا کرتا ہے کہ تم بخش دیے گئے ہو اور تمہاری سیئات کو حسنات سے بدل دیا گیا، یہ کیا ہے؟ رحمت باری تعالیٰ کی وسعت ہی تو ہے۔

(۴) حقوقِ رمضان کی ادائیگی کے ساتھ نمازِ عید ادا کرنا سیئات کو حسنات سے بدل دیتا ہے:

چوتھا عمل حقوقِ رمضان کی ادائیگی کے ساتھ نمازِ عید ادا کرنا، حقوقِ رمضان میں دن میں صیام رات میں (تراویح کا) قیام، پھر اللہ پاک توفیق دیں تو عشرۂ اخیرہ میں اعتکافِ مسنون کے ساتھ شب قدر کی عبادت کا اہتمام کرنا ہے۔

علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ قلب انسانی پر چار چیزوں کے برے اثرات مرتب ہوتے ہیں: (۱) کثرتِ طعام (۲) کثرتِ کلام (۳) کثرتِ منام (۴) کثرتِ اختلاط بالانام۔ (لوگوں کے ساتھ بلا کسی خاص وجہ کے بہ کثرت ملنا جلنا)

رمضان المبارک میں ان چاروں کا علاج ہوسکتا ہے، بشرطیکہ حقوقِ رمضان کی ادائیگی کا اہتمام کیا جائے، صیام کے ذریعہ کثرتِ طعام کا علاج ہوتا ہے، تلاوتِ قرآنِ کریم کے ذریعہ کثرتِ کلام کا علاج ہوتا ہے، تراویح میں قیام کے ذریعہ کثرتِ منام کا علاج ہوتا ہے اور اعتکاف کے ذریعہ اختلاط بالانام کا علاج ہوتا ہے۔ (زاد المعاد: ۸۲/۲)

اس طرح رمضان گزارنے والوں کو عید کی نماز کے بعد مزدوری میں مغفرت کے ساتھ یہ انعام دیا جاتا ہے کہ ان کی سیئات کو حسنات سے بدل دیا جاتا ہے۔

حدیث قدسی میں ہے:

عَنْ أَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِذَا كَانَ لَيْلَةُ الْقَدْرِ نَزَلَ جِبْرَئِيْلُ فِيْ كَبْكَبَةٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ يُصَلُّوْنَ عَلٰى كُلِّ عَبْدٍ قَائِمٍ أَوْ قَاعِدٍ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ عَزَّ وَ جَلَّ، فَإِذَا كَانَ يَوْمُ عِيْدِهِمْ يَعْنِيْ يَوْمَ فِطْرِهِمْ بَاهٰى بِهِمْ مَلَائِكَتَهٗ، فَقَالَ: يَا مَلَائِكَتِيْ! مَا جَزَاءُ أَجِيْرٍ وَفّٰى عَمَلَهٗ؟ قَالُوْا: رَبَّنَا! جَزَاؤُهٗ أَنْ يُوَفّٰى أَجْرَهٗ، قَالَ: مَلَائِكَتِيْ! عَبِيْدِيْ وَ إِمَائِيْ قَضَوْا فَرِيْضَتِيْ عَلَيْهِمْ، ثُمَّ خَرَجُوْا يَعُجُّوْنَ إِلَيَّ بِالدُّعَاءِ، وَ عِزَّتِيْ وَ جَلَالِيْ وَ كَرَمِيْ وَ عُلُوِّيْ وَ ارْتِفَاعِ مَكَانِيْ لَأُجِيْبَنَّهُمْ، فَيَقُوْلُ: ارْجِعُوْا، قَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ، وَ بَدَّلْتُ سَيِّئَاتِكُمْ حَسَنَاتٍ، قَالَ: فَيَرْجِعُوْنَ مَغْفُوْرًا لَهُمْ".

(رواه البيهقي في شعب الإيمان، مشكوٰة: ۱۸۲) (حدیث قدسی نمبر: ۱۵)

جب شب قدر آتی ہے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام فرشتوں کے لشکر کے ساتھ اُترتے ہیں اور ہر اس بندے کے لیے دعاءِ مغفرت کرتے ہیں جو کھڑے کھڑے اللہ تعالیٰ کی عبادت (جیسے نماز، طواف وغیرہ) میں مشغول ہو، یا بیٹھے بیٹھے اللہ تعالیٰ کی عبادت (جیسے ذکر اللہ یا تلاوتِ کلام اللہ وغیرہ) میں مشغول ہو، پھر جب ان بندوں کی عید کا دِن ہوتا ہے تو حق

تعالیٰ (اپنے اُن بندوں پر جنھوں نے رمضان المبارک میں صیام و قیام اور شب قدر میں عبادت کا اہتمام کرتے ہوئے نمازِ عید کو ادا کیا) اُن پر فرشتوں کے سامنے فخر کرتے ہیں جنھوں نے تخلیق آدم علیہ السلام کے وقت طعنہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ

﴿أَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ﴾ (البقرة: ۳۰)

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے فرشتو! اس مزدور کا اجر کیا ہے جس نے اپنا فرض ادا کیا اور اپنی ذمہ داری پوری کی، جنھوں نے رمضان کے دِن میں صیام، رات میں تراویح کا قیام اور شب قدر میں عبادت کا اہتمام کیا؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: باری تعالیٰ! اس کا بدلہ تو یہی ہے کہ اس کو پورا پورا اجر دیا جائے، اس پر حق تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ سنو! میرے بندے اور بندیوں میں سے جنھوں نے میرا فرض ادا کیا، میرے احکام پر عمل کیا، میری مرضی کو اپنی مرضی پر ترجیح دی، پھر وہ اپنے گھروں سے رمضان کے بعد عید گاہ کی طرف دعاء کے لیے گڑگڑاتے چلاتے نکلے، میری عزت کی قسم، میری عظمت کی قسم، میرے لطف و کرم کی قسم، میرے علوِ شان اور بلندیٔ رُتبہ کی قسم، میں ان کی دعائیں ضرور قبول کروں گا، پھر حق تعالیٰ اپنے ان مبارک بندوں سے فرماتے ہیں کہ اپنے گھروں کی طرف اس حالت میں لوٹو کہ میں نے تمہاری مغفرت کر دی اور تمہاری سیئات کو حسنات سے بدل دیا، اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان عید گاہ سے اپنے گھروں کی طرف اس حالت میں واپس ہوتے ہیں کہ ان کے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔

یہ بھی تو رحمتِ الٰہی کے وسیع ہونے کی عظیم دلیل ہے کہ ان چار اعمال کی برکت سے سیئات کو حسنات سے بدل دیا جاتا ہے۔

سیئات کو حسنات سے بدلنے کا مطلب:

سیئات کو حسنات سے بدلنے کے متعلق علماءِ محققین سے چار مختلف اقوال منقول ہیں:

پہلا قول یہ ہے کہ بندے نے کفر و شرک اور فسق و فجور کے زمانے میں جو سیئات

اور برائیاں کی تھیں ان کو تو بالکل ہی مٹا دیا جاتا ہے؛ لیکن نیکیوں کے اجر و ثواب کو باقی رکھا جاتا ہے، یہ بھی اس کی وسعتِ رحمت کی علامت ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ان اعمال کے اہتمام کے بعد اس کا حال بدل دیتے ہیں، وہ اس طرح کہ اب سیئات سے اجتناب اور حسنات کے اہتمام کی توفیق عطا کی جاتی ہے، پہلے بدکاری و بداخلاقی میں مبتلا تھا، اب حسنِ اعمال اور حسنِ اخلاق کی توفیق دی جاتی ہے، پہلے اگر ملک و ملت اور امت کے لیے نقصان دہ تھا تو اب اسے نفع بخش بنا دیا جاتا ہے، پہلے وہ اللہ تعالیٰ، اس کے ملائکہ اور مخلوق کے درمیان مبغوض تھا، اب وہ محبوب بنا دیا جاتا ہے، یہ بھی رحمتِ الٰہی کے وسیع ہونے کی بڑی نشانی ہے۔

تیسرا قول حضرت شیخ زکریاؒ نے یہ نقل فرمایا کہ حق تعالیٰ اسے برائیوں پر توبہ کی توفیق عطا فرماتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ اپنے ہر ایک گناہ کو یاد کر کے بار بار ندامت کا اظہار اور توبہ و استغفار کرتا ہے، جس سے اس کی حسنات میں اضافہ ہوتا ہے۔
(فضائل اعمال: ۳۲۸)

اس دل پہ خدا کی رحمت ہو جس دل کی یہ حالت ہوتی ہے
ایک بار خطا ہو جاتی ہے، سو بار ندامت ہوتی ہے

چوتھا قول یہ ہے کہ ان اعمال کی برکت سے واقعی بندہ کی سیئات کو حسنات سے یعنی برائیوں کو نیکیوں سے بدل دیا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہر گناہ کو معاف کر دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ نیکی کا ثواب دیا جاتا ہے۔ سبحان اللہ، رحمت باری تعالیٰ کی وسعت کا کیا کہنا!

ہمارے شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیمؒ فرماتے تھے:

بحرِ عصیاں سے کبھی ہم نے کنارہ نہ کیا — تیری رحمت نے میرے مالک یہ گوارا نہ کیا
ہم نے تو جہنم کی بہت کی تدبیر — تیری رحمت نے میرے مالک گوارا نہ کیا

اس کی تائید ایک حدیث قدسی سے بھی ہوتی ہے، حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت

ہے، حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میں اس شخص کو جانتا ہوں جو سب سے اخیر میں جنت میں داخل ہونے والا ہے اور سب سے اخیر میں جہنم سے نکالا جانے والا ہے، یہ وہ آدمی ہوگا کہ قیامت کے دن اس پر اس کے چھوٹے چھوٹے گناہ پیش کیے جائیں گے، بڑے گناہ ایک طرف رکھ دیے جائیں گے، اس کو کہا جائے گا کہ تو نے فلاں فلاں دن فلاں فلاں گناہ کیا تھا؟ وہ ہاں میں جواب دے گا، انکار کی اسے طاقت نہ ہوگی، وہ بیچارہ اس بات سے ڈر رہا ہوگا کہ ابھی تو بڑے گناہ بھی پیش کیے جائیں گے، اتنے میں اس سے کہا جائے گا کہ "فَإِنَّ لَكَ مَكَانَ كُلِّ سَيِّئَةٍ حَسَنَةً". (مسلم، مشکوٰة: ۴۹۲) جا! تیری ہر برائی کو معاف کر کے اس کے بدلے میں تیرے لیے ایک نیکی ہے، وہ بندہ رحمت باری تعالیٰ کی وسعت دیکھ کر عرض کرے گا کہ ابھی تو میرے بہت سے اعمال ایسے ہیں کہ میں انہیں یہاں نہیں دیکھ رہا ہوں (لہٰذا اور گناہ بھی پیش کیے جائیں اور ان کے بدلے میں بھی نیکیاں عطا کی جائیں، چنانچہ ایسا ہی ہوگا) یہ فرما کر حضور ﷺ کو ہنسی آ گئی، حتیٰ کہ آپ ﷺ کی ڈاڑھیں مبارک نظر آنے لگیں۔ (حدیث قدسی نمبر: ۱۶)

حق تعالیٰ اپنی وسیع رحمت سے ہمیں ان اعمال کی توفیق عطا فرمائیں جن کی برکات سے سیئات کو حسنات سے بدل دیا جاتا ہے۔ آمین یا رب العالمین۔

شب براءۃ/ ۱۴۴۰ھ/ قبل الفجر
مطابق: ۲۱/ اپریل/ ۲۰۱۹ء/ اتوار
(بزمِ صدیقی، بڑودا)

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيرًا — فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيْرًا كَثِيْرًا

(۲۳)

نوافل کے فضائل

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ هُرَيۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: سَمِعۡتُ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوۡلُ: " إِنَّ أَوَّلَ مَـا يُحَاسَبُ بِهِ العَبۡدُ يَوۡمَ القِيَامَةِ مِنۡ عَمَلِهٖ صَلَاتُهٗ، فَإِنۡ صَلُحَتۡ فَقَدۡ أَفۡلَحَ وَ أَنۡجَحَ، وَ إِنۡ فَسَدَتۡ فَقَدۡ خَابَ وَ خَسِرَ، فَإِنِ انۡتَقَصَ مِنۡ فَرِيۡضَتِهٖ شَيۡءٌ قَالَ الرَّبُّ تَبَارَكَ وَ تَعَالىٰ: أُنۡظُرُوۡا هَلۡ لِعَبۡدِیۡ مِنۡ تَطَوُّعٍ ؟ فَيُكَمَّلُ بِهَا مَا انۡتَقَصَ مِنۡ فَرِيۡضَةٍ، ثُمَّ يَكُوۡنُ سَـائِرُ عَمَلِهٖ عَلىٰ ذٰلِكَ، وَ فِیۡ رِوَايَةٍ : ثُمَّ الزَّكوٰةُ مِثۡلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ تُؤۡخَذُ الۡأَعۡمَالُ عَلىٰ حَسَبِ ذٰلِكَ". (رواه أبوداود، و أحمد، مشكوٰة : ۱۱۷/ باب صلوٰة التسبيح)

ترجمہ : حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ میں نے رحمت عالم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کے دن بندے کے اعمال میں سب سے پہلے نماز کا حساب لیا جائے گا، (دیگر روایات میں ہے کہ بندے سے سب سے پہلے خونِ ناحق یعنی قتل کا حساب لیا جائے گا، تو ان میں تطبیق اس طرح ہے کہ حقوق اللہ میں سب سے پہلے نماز کا حساب ہوگا، جب کہ حقوق العباد میں خونِ ناحق کا حساب سب سے پہلے ہوگا، واللہ اعلم) پس اگر نماز صحیح نکل آئی تو وہ کامیاب اور بامراد ہوگا، اور اگر وہ خراب نکلی (یعنی اداء میں، یا خشوع وخضوع

میں کمی رہی) تو نقصان وخسران میں رہے گا (العیاذ باللہ) البتہ اگر فرائض (خواہ نماز ہو یا روزہ یا زکوٰۃ یا حج وغیرہ) میں کوئی کمی رہ گئی ہوگی تو حق تعالیٰ فرشتوں سے فرمائیں گے کہ دیکھو! میرے بندے کے پاس کچھ نوافل بھی ہیں جن سے فرض کی تکمیل کی جائے؟ پھر اگر نوافل ہوں گے تو فرض نماز (روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ) کی کمی کو مکمل کیا جائے گا، اس کے بعد اسی طرح بقیہ اعمال یعنی روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ کا حساب ہوگا۔

نوافل تقرب الی اللہ اور تعلق مع اللہ کا ذریعہ ہیں:

اللہ رب العالمین اپنے ہر بندے سے قریب ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ نَحۡنُ أَقۡرَبُ إِلَيۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِيۡدِ۝﴾ (ق : ۱۶)

لیکن ہر بندہ اپنے مولیٰ سے قریب نہیں ہے، البتہ جو بندہ ایمان واخلاص کے ساتھ فرائض ونوافل کا اہتمام کرتا ہے اسے اللہ تعالیٰ کا قرب نصیب ہوجاتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

﴿ وَ اسۡجُدۡ وَ اقۡتَرِبۡ۝﴾ (العلق : ۱۹)

اور اللہ رب العزت کا تقرب اور اس کا تعلق فلاحِ دارین کا اصل سبب اور ذریعہ ہے، تقرب الی اللہ اور تعلق مع اللہ کے بغیر فلاحِ دارین ممکن نہیں ہے، یوں تو بندہ اللہ رب العزت کا تقرب اور تعلق مختلف عبادات واعمال کے ذریعہ حاصل کرسکتا ہے، لیکن چوں کہ عبادات واعمال میں سب سے پہلے حق تعالیٰ نے نماز فرض فرمائی ہے، اس لیے تقرب الی اللہ اور تعلق مع اللہ کا سب سے بہترین ذریعہ اور وسیلہ نماز ہے۔

فرض ہے، واجب ہے، سنت ہے، عبادت ہے نماز
طاعتیں جتنی ہیں اُن میں عین طاعت ہے نماز

مؤمن پر دِن رات میں پانچ نمازیں تو فرض ہیں، لیکن فرائض کے علاوہ مختلف اوقات کی نمازیں بھی ہیں جو نوافل کہلاتی ہیں، نوافل کے اصل معنیٰ زوائد کے ہیں، اس کا

دائرہ بڑا وسیع ہے، اس میں سنن مؤکدہ، سنن غیر مؤکدہ اور اوقاتِ مختلفہ کی نفل نمازیں سب
داخل ہیں، احادیث طیبہ میں فرائض کے علاوہ بقیہ نمازوں کو نوافل کہا گیا ہے، قرآنِ پاک
میں نوافل کی ترغیب دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَ مِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَ أَدْبَارَ السُّجُوْدِ۝﴾ (ق: ۴۰)

''اور رات کو اپنے رب کی تسبیح بیان کیجئے اور سجدہ کے بعد بھی''۔

مفسرین نے فرمایا ہے کہ ﴿وَ مِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ﴾ سے قیامِ لیل یعنی رات میں
نماز پڑھنا مراد ہے، اور ﴿وَ أَدْبَارَ السُّجُوْدِ﴾ سے مراد ایک قول کے مطابق نماز کے بعد
تسبیحات پڑھنا ہے۔ اور دوسرے قول کے مطابق اس سے مراد فرائض کے بعد نوافل پڑھنا
ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہی تفسیر منقول ہے۔ (روح المعانی، انوار البیان: ۱۹۳)

نیز حدیث قدسی سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح فرض نمازیں تقرب الی اللہ اور
تعلق مع اللہ کا ذریعہ ہیں، اسی طرح فرائض کے بعد نوافل بھی تعلق مع اللہ کا ذریعہ ہیں۔

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّ اللّٰهَ تَعَالىٰ قَالَ:
"مَنْ عَادىٰ لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ". (رواه البخاری، باب التواضع) (حدیث قدسی نمبر: ۱۷)

''جو شخص میرے کسی ولی اور دوست کو (جسمانی یا قلبی) تکلیف پہنچاتا ہے میں اس
سے اعلانِ جنگ کرتا ہوں''۔ یہی اعلان قرآنِ پاک میں سود خوروں کے لیے بھی کیا گیا:

﴿فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ﴾ (البقرة: ۲۷۹)

اس لیے اہل اللہ کی ایذا رسانی اور سود خوری یہ دونوں بدترین اور سنگین ترین گناہ
ہیں، العیاذ باللہ۔

"وَ مَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِيْ بِشَيْءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ".

اور جن عبادات و اعمال کے ذریعہ میرا بندۂ مؤمن میرا قرب اور نزدیکی حاصل کرتا
ہے ان میں محبوب ترین عبادات و اعمال وہ ہیں جن کو میں نے (اوامر و نواہی کے ذریعہ)

فرض کیا ہے۔

"وَ مَا يَزَالُ عَبْدِيْ يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى أُحِبَّهٗ، فَإِذَا أَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ
سَمْعَهُ الَّذِيْ يَسْمَعُ بِهٖ، وَ بَصَرَهُ الَّذِيْ يُبْصِرُ بِهٖ، وَ يَدَهُ الَّتِيْ يَبْطِشُ بِهَا، وَ رِجْلَهُ الَّتِيْ
يَمْشِيْ بِهَا، وَ إِنْ سَأَلَنِيْ لَأُعْطِيَنَّهٗ، وَ لَئِنِ اسْتَعَاذَنِيْ لَأُعِيْذَنَّهٗ، وَ مَا تَرَدَّدْتُ عَنْ
شَيْءٍ أَنَا فَاعِلُهٗ تَرَدُّدِيْ عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ، يَكْرَهُ الْمَوْتَ، وَ أَنَا أَكْرَهُ مَسَاءَتَهٗ".

(رواه البخاری، مشکوٰۃ: ۱۹۷/ باب ذکر الله و التقرب إليه)

''میرا بندہ نوافل کے ذریعہ برابر (مسلسل) مجھ سے قریب ہوتا رہتا ہے، یہاں
تک کہ میں اس کو قرب و محبوبیت کا وہ مقام عطا کرتا ہوں (گویا) میں اس کا کان بن جاتا
ہوں جس سے وہ سنتا ہے، آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، ہاتھ بن جاتا ہوں جس
سے وہ پکڑتا ہے، پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔

عاجز کے خیالِ ناقص میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی محبت کا اس قدر
غلبہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے حواسِ خمسہ و دیگر اعضاء سے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہی کے کام
کرتا ہے، اس کی زندگی سراپا بندگی اور آیت قرآنی: ﴿إِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ
مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَ بِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَ أَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۝﴾
(الأنعام: ۱۶۲-۱۶۳) کی عملی تصویر بن جاتی ہے۔

پھر اگر وہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں اسے (وہ یا اس سے بہتر) ضرور دیتا ہوں، اور
اگر وہ کسی چیز سے میری پناہ میں آتا ہے تو میں ضرور اسے اپنی پناہ میں لے لیتا ہوں، اور میں
اپنی اس عنایت کے سبب جو اس بندہ کے شامل حال ہوتی ہے اس کی زندگی ختم کرنے میں
تردد کرتا ہوں، کیوں کہ موت اس کے لیے کوئی پسندیدہ چیز نہیں ہوتی، لیکن موت سے چھٹکارا
بھی نہیں، لہٰذا طے شدہ وقت کے مطابق وہ معاملہ تو ہوتا ہی ہے۔

معلوم ہوا کہ کوئی بندۂ مؤمن بارگاہِ الٰہی میں محبوبیت، مقبولیت اور قربت کا خاص
مقام حاصل کرنا چاہے تو اسے فرائض کے علاوہ نوافل کا بھی اہتمام کرنا ہوگا۔

تقرب الی اللہ کے دو بہترین ذریعے:

تقرب الی اللہ کے یہ دو بہترین ذریعے ہیں، ان کے بغیر اللہ تعالیٰ کا قرب ممکن ہی نہیں، اگر واقعی بندہ اپنے مولیٰ کا قرب حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کا پہلا، اصل اور بنیادی ذریعہ اہتمامِ فرائض مع اجتنابِ محرمات ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تعلق اور قرب حاصل کرنے کے لیے فرائض و واجبات کا اہتمام کرنا۔ اور چوں کہ تمام منکرات ومحرمات سے بچنا بھی فرض ہے اس لیے ان سے اجتناب لازم اور ضروری ہے، اسی سے تعلق مع اللہ اور تقرب الی اللہ نصیب ہوگا، جس کو حدیث قدسی میں اس طرح بیان فرمایا:

"وَ مَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِیْ بِشَیْیءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ".
(حدیث قدسی نمبر:۱۸)

تقرب الی اللہ کے اس ذریعے کو اختیار کرنے کے بعد بندے کو اپنے مولیٰ سے محبت نصیب ہوجاتی ہے۔ (جو چاہے تجربہ کرلے) اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اس کی معرفت، عبادت اور اطاعت کا بڑا سبب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ کی محبت (اہتمامِ فرائض و واجبات مع اجتنابِ منکرات ومحرمات کے ذریعہ) حاصل ہوجاتی ہے تو اس کے لیے اللہ پاک کی عبادت و اطاعت آسان ہوجاتی ہے اور اسی میں ترقی کر کے بندہ معرفت الٰہی کا وہ مقام حاصل کرلیتا ہے جس کو حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اس طرح بیان فرمایا کہ

تیرا آئینہ عالم رنگ و بو ہے　　　جدھر دیکھتا ہوں تو ہی تو ہے

قربِ الٰہی کا دوسرا بڑا اہم ذریعہ اہتمامِ نوافل مع اجتنابِ مشتبہات ومکروہات ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تعلق وتقرب حاصل کرنے کے لیے جہاں فرائض و واجبات کا اہتمام مع اجتنابِ منکرات ومحرمات ضروری ہے وہاں یہ بھی ہے کہ بندہ نوافل کا اہتمام کرے اور مشتبہات ومکروہات سے اجتناب کرے۔

حدیث قدسی میں ہے:

"وَ مَا يَزَالُ عَبْدِیْ يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ".

قربِ الٰہی کا یہ وہ ذریعہ ہے جس سے بندہ بہت ہی اعلیٰ مقام اور انعام حاصل کرلیتا ہے۔ اور وہ ہے اللہ پاک کی محبت، یعنی قربِ الٰہی کے پہلے ذریعے سے تو بندے کو اپنے مولیٰ سے محبت حاصل ہوجاتی ہے؛ لیکن دوسرے ذریعے سے اللہ پاک خود اُس سے محبت کرنے لگتا ہے، اسی کو حدیث قدسی میں اس طرح فرمایا کہ "حَتّٰی أُحِبَّهُ". سبحان اللہ! اس سے اونچا مقام اور انعام اور کیا ہوسکتا ہے کہ بندہ اپنے مولیٰ کا محبوب بن جائے۔

امام تفسیر ابن کثیرؒ نے بعض حکماء کا یہ قول نقل فرمایا کہ

"لَيْسَ الشَّأْنُ أَنْ تُحِبَّ، وَ إِنَّمَا الشَّأْنُ أَنْ تُحَبَّ". (تفسیر القرآن الکریم: ۱۰/ ۳۳۶)

کمال یہ نہیں کہ تم کسی سے محبت اور عشق کرو (وہ تو دنیا کرتی ہے، دنیا میں عاشقوں کی کمی نہیں) اصل کمال یہ ہے کہ تم محبّ سے محبوب اور عاشق سے معشوق بن جاؤ، لوگوں کو تم سے محبت اور عشق ہوجائے۔ اور یہ اس وقت ہوگا جب تم اللہ پاک کے (اہتمامِ فرائض و واجبات، اجتنابِ منکرات ومحرمات اور اہتمامِ نوافل و اجتنابِ مشتبہات ومکروہات کے ذریعہ) محبوب بن جاؤ؛ کیوں کہ حدیث قدسی میں یہ بھی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے سے محبت کرنے لگتے ہیں تو اسے اپنی مخلوق میں محبوبیت ومقبولیت عطا فرماتے ہیں۔

نیز حدیث قدسی میں یہ بھی ہے کہ جس بندے کو اللہ پاک کی محبت کا مقام مل جاتا ہے تو وہ مستجاب الدعوات بن جاتا ہے، فرمایا:

"وَ إِنْ سَأَلَنِیْ لَأُعْطِيَنَّهٗ، وَ لَئِنِ اسْتَعَاذَنِیْ لَأُعِيْذَنَّهٗ". (رواہ البخاری، مشکوٰۃ: ۱۹۷)

پھر کہنا چاہیے کہ نوافل کا یہ تو نقد دنیوی فائدہ ہے۔

نوافل تکمیل فرائض کا ذریعہ ہیں:

نوافل کا دوسرا بہت بڑا فائدہ اور نفع یہ ہوگا کہ نوافل تکمیل فرائض کا ذریعہ ہوں گی، مطلب یہ ہے کہ فرائض کی ادائیگی میں اگر کوئی کمی وکوتاہی رہ گئی تو اس کی کمی نوافل کے ذریعہ پوری کردی جائے گی، جیسا کہ مذکورہ حدیث قدسی میں ارشاد ہے:

"إِنَّ أَوَّلَ مَا يُحَاسَبُ بِهِ العَبْدُ يَوْمَ القِيَامَةِ مِنْ عَمَلِهِ صَلَاتُهُ".

قیامت کے دن بندوں سے حقوق اللہ کے متعلق سوالات ہوں گے، ان میں سب سے پہلے نماز کے متعلق سوال وحساب ہوگا۔

"فَإِنْ صَلُحَتْ فَقَدْ أَفْلَحَ وَ أَنْجَحَ، وَ إِنْ فَسَدَتْ فَقَدْ خَابَ وَ خَسِرَ".

پھر اگر نماز اچھی اور پوری نکل آئی تو وہ شخص کامیاب اور بامراد ہوگا، لیکن اگر نماز ہی میں خامی اور کمی رہ گئی تو وہ شخص ناکام اور نامراد ہوگا۔

"فَإِنِ انْتَقَصَ مِنْ فَرِيْضَتِهِ شَيْءٌ قَالَ الرَّبُّ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى: اُنْظُرُوْا هَلْ لِعَبْدِيْ مِنْ تَطَوُّعٍ ؟ فَيُكَمَّلُ بِهَا مَا انْتَقَصَ مِنْ فَرِيْضَةٍ". (حدیث قدسی نمبر:۱۹)

البتہ اگر نماز کی ادائیگی یا خشوع وخضوع میں کچھ کمی رہ گئی ہوگی تو حق تعالیٰ کی جانب سے ارشاد ہوگا کہ دیکھو! میرے بندے کے پاس کچھ نوافل ہیں؟ اگر ہیں تو فرائض کی کمی نوافل سے پوری کردی جائے، اب جن خوش نصیب بندوں کے پاس نوافل کا ذخیرہ ہوگا ان کے فرائض کی تکمیل تو نوافل کے ذریعہ کردی جائے گی، لیکن اگر کسی نے فرائض ہی پر اکتفاء کیا ہوگا، نوافل کا اہتمام نہ کیا ہوگا تو اس کا معاملہ دشوار ہوسکتا ہے۔

نوافل کے سلسلہ میں ایک غلط سوچ کی اصلاح:

صاحبو! یاد رکھو کہ نوافل اور مستحبات کرنے کے اعمال ہیں، جیسے مکروہات بچنے کے لیے ہیں، یہ مزاج اور سوچ کہ فلاں عمل نفل اور مستحب ہے، لہٰذا چھوڑ دو اور فلاں عمل مکروہ

ہے، لہٰذا کرلو، یہ غلط ہے، کیوں کہ نوافل کا حضور پاک ﷺ نے اگرچہ ہمیشہ اہتمام تو نہیں فرمایا، کبھی کبھی امت کی آسانی کے لیے چھوڑ بھی دیا ہے، تاکہ آپ ﷺ کے اہتمام کی وجہ سے وہ عمل امت پر ضروری نہ ہوجائے، اس لیے سنت غیر مؤکدہ جسے نفل بھی کہتے ہیں اس کی تعریف یہ ہے کہ حضور ﷺ نے کبھی کبھی چھوڑ دیا ہو، جب کہ بدقسمتی سے آج ہمارا حال یہ ہے کہ ہم ان کا اہتمام کبھی کبھی کرتے ہیں، بلکہ بعض لوگ تو کبھی بھی ان کا اہتمام نہیں کرتے، یہ دراصل اسی غلط سوچ کا نتیجہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ نوافل کبھی کبھی چھوٹ جائیں تو تقرب الی اللہ اور تعلق مع اللہ میں ان شاء اللہ کوئی زیادہ فرق نہیں آئے گا، ورنہ یہ کہ ان کا اہتمام ہی نہ کیا جائے یا کبھی کبھی ان پر عمل کیا جائے تو ایسی صورت میں تعلق مع اللہ اور تقرب الی اللہ کیسے حاصل ہوسکتا ہے؟ حالانکہ تقرب الی اللہ اور تعلق مع اللہ کے لیے اہتمامِ نوافل تو کجا خود کو مٹانا پڑے تب بھی سودا سستا ہے کہ اس راہ میں خود کو مٹانا بھی پانا ہے۔

تو کو اِتنا مٹا کہ تو نہ رہے ۔۔۔ تیری ہستی کا رنگ و بو نہ رہے

''ہو'' میں اِتنا کمال پیدا کر ۔۔۔ کہ ''ہو'' تو رہے، تو نہ رہے

تقرب الی اللہ اور تعلق مع اللہ میں کمال نیز فرائض میں بھی کمال پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ اور وسیلہ نوافل ہیں۔

نوافل درجاتِ عالیہ کا ذریعہ ہیں:

یوں تو نوافل میں فرائض کے علاوہ تمام نمازیں داخل ہیں، خواہ وہ سنت مؤکدہ ہو یا غیر مؤکدہ یا مستحب اور نفل، لیکن زیادہ تر اس کا اطلاق ان نمازوں پر ہوتا ہے جو سنن غیر مؤکدہ اور نفل کہلاتی ہیں، ذخیرۂ احادیث طیبہ میں مختلف نوافل کے جو فضائل منقول ہیں مجموعی طور پر ان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نوافل کا اہتمام دخولِ جنت اور اس کے عالی درجات کے حصول کا ذریعہ ہے، اس سے بڑی کامیابی کیا ہوسکتی ہے کہ قیامت کے دِن بندہ کو عذابِ الٰہی سے بچا کر جنت میں داخل کردیا جائے۔

﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ أُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ﴾ (آل عمران : ۱۸۵)

لہٰذا ضروری ہے کہ فرائض پر اکتفاء کرنے کے بجائے نوافل کا بھی اہتمام کیا جائے۔ ذیل میں نوافل کے مختلف فضائل ذکر کیے جاتے ہیں:

وِتر کی فضیلت:

نمازِ وتر کا درجہ فرائض سے تو کم لیکن سنن مؤکدہ سے زیادہ ہے، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ بُرَيْدَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ:" الوِتْرُ حَقٌّ، فَمَنْ لَمْ يُوْتِرْ فَلَيْسَ مِنَّا، الوِتْرُ حَقٌّ، فَمَنْ لَمْ يُوْتِرْ فَلَيْسَ مِنَّا، الوِتْرُ حَقٌّ، فَمَنْ لَمْ يُوْتِرْ فَلَيْسَ مِنَّا". (رواه أبو داود، مشكوٰة : ۱۱۳)

''نمازِ وتر برحق ہے، جو شخص وتر ادا نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔'' (یہ بات آپ ﷺ نے تین مرتبہ ارشاد فرمائی، اسی وجہ سے احناف کے یہاں وتر واجب ہے)۔

حدیث پاک میں وتر کی فضیلت بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عَنْ خَارِجَةَ بْنِ حُذَافَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَ قَالَ:" إِنَّ اللّٰهَ أَمَدَّكُمْ بِصَلوٰةٍ هِيَ خَيْرٌ لَكُمْ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ، الوِتْرُ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ فِيْمَا بَيْنَ صَلوٰةِ العِشَاءِ إِلىٰ أَنْ يَطْلُعَ الفَجْرُ". (رواه الترمذی و أبو داود، مشكوٰة : ۱۱۲)

''ایک دن حضور ﷺ کاشانۂ نبوت (اپنے دولت کدہ) سے باہر تشریف لائے اور حضرات صحابہؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ حق تعالیٰ نے ایک اور نماز (فرائض کے علاوہ) کے ذریعہ تمہاری امداد فرمائی، جو تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بھی بہتر ہے (جن کو تم اہل عرب دنیا کی عزیز ترین دولت سمجھتے ہو) وہ نماز وتر ہے، حق تعالیٰ نے اسے تمہارے لیے نمازِ عشاء کے بعد سے طلوعِ فجر سے پہلے تک مقرر فرمایا ہے۔''

لہٰذا عشاء کے بعد سے طلوعِ صبح صادق سے پہلے تک کبھی بھی نمازِ وتر پڑھ سکتے

۱۸۳

ہیں، اس میں وتر کی ترغیب دیتے ہوئے اسے دنیا کے اعلیٰ ترین مال سے افضل قرار دیا گیا۔

سنن مؤکدہ کی فضیلت:

اس کے بعد دِن رات میں بارہ رکعات سنن مؤکدہ ہیں، حدیث پاک میں ان کی بڑی زبردست فضیلت وارد ہوئی ہے:

عَنْ أُمِّ حَبِيْبَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" مَنْ صَلّٰى فِيْ يَوْمٍ وَ لَيْلَةٍ ثِنْتَيْ عَشْرَةَ رَكْعَةً بُنِيَ لَهُ بَيْتٌ فِي الجَنَّةِ، أَرْبَعًا قَبْلَ الظُّهْرِ، وَ رَكْعَتَيْنِ بَعْدَهَا، وَ رَكْعَتَيْنِ بَعْدَ المَغْرِبِ، وَ رَكْعَتَيْنِ بَعْدَ العِشَاءِ، وَ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ صَلوٰةِ الفَجْرِ". (رواه الترمذی، مشكوٰة : ۱۰۳/ باب السنن و فضائلها)

''حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص دِن رات میں بارہ رکعات (فرائض کے علاوہ نمازوں) کا اہتمام کرے گا اس کے لیے جنت میں ایک گھر تیار کیا جائے گا (وہ بارہ رکعات جو سنن مؤکدہ ہیں ان کی تفصیل یہ ہے) چار رکعات ظہر کی فرض نماز سے پہلے، دو رکعات ظہر کے بعد، دو رکعات مغرب کی فرض نماز کے بعد، دو رکعات عشاء کی فرض نماز کے بعد اور دو رکعات فجر کی فرض نماز سے پہلے''۔

اس میں سنن مؤکدہ کا اہتمام کرنے پر دخولِ جنت بلکہ جنت میں محل کی بشارت دی گئی ہے، کیوں کہ جنت میں مکانات نہیں؛ محلات ہوں گے، لہٰذا جنت میں گھر کا مطلب محل ہے۔ واللہ اعلم۔

سنن غیر مؤکدہ کی فضیلت:

جہاں تک سنن غیر مؤکدہ کا تعلق ہے تو ظہر کی فرض نماز کے بعد دو رکعات سنت مؤکدہ کے علاوہ حدیث میں چار رکعات کا بھی ذکر ہے:

" مَنْ حَافَظَ عَلىٰ أَرْبَعِ رَكْعَاتٍ قَبْلَ الظُّهْرِ وَ أَرْبَعٍ بَعْدَهَا حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى

النَّارِ". (رواه أحمد و الترمذی و أبوداود والنسائی و ابن ماجه، مشکوٰة : ١٠٤)

''جو شخص ظہر کی فرض سے پہلے چار رکعات اور اس کے بعد چار رکعات (دو سنت کے بعد مستقل چار یا دو سنت کے علاوہ دو نفل) بلا ناغہ پڑھے تو حق تعالیٰ اس پر دوزخ کی آگ (مطلقاً یا اَبدی طور پر) حرام کردیتے ہیں۔''

اس لیے ظہر کی فرض کے بعد دو رکعات سنت کے علاوہ نفل پڑھنا بھی مستحب ہے، اس کے بعد عصر سے پہلے بھی چار رکعات سنن غیر مؤکدہ ہیں، اس کے متعلق حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "رَحِمَ اللّٰهُ امْرَأً صَلّٰى قَبْلَ الْعَصْرِ أَرْبَعًا". (رواه أحمد و الترمذی و أبوداود، مشکوٰة : ١٠٤)

''اللہ کی رحمت اس بندہ پر ہو جو عصر کی فرض سے قبل چار رکعات پڑھے''۔

اس میں عصر سے قبل چار رکعات جو سنن غیر مؤکدہ ہیں ان کا اہتمام کرنے والے کے لیے حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت اور برکت کی دعا فرمائی ہے۔ اگر وقت میں گنجائش یا رغبت نہ ہو تو بجائے چار کے دو رکعات بھی پڑھی جاسکتی ہیں، خود حضور ﷺ سے کبھی کبھی عصر سے پہلے دو رکعات پڑھنا ثابت ہے:

عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: "كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُصَلِّيْ قَبْلَ الْعَصْرِ رَكْعَتَيْنِ". (رواه أبوداود، مشکوٰة : ١٠٤)

ظہر کی فرض اور سنت مؤکدہ کے بعد دو رکعات پر دوزخ سے حفاظت اور عصر کی فرض سے قبل کی سنت پر برکت کی بشارت وارد ہوئی ہے۔

مغرب کے بعد نوافل کے فضائل:

نمازِ مغرب کے بعد دو رکعات سنت مؤکدہ ہیں، جن کا ذکر حضرت اُمِ حبیبہؓ کی

روایت میں آچکا، ان دو رکعات کے بعد دو، چار، یا چھ رکعات نوافل کا بڑا ثواب ہے، بعض روایات میں بیس تک کا بھی ذکر ہے، اسے عام طور پر ''صلوٰۃ الاوابین'' کہا جاتا ہے۔

(درِمختار: ٦٣٠)

اگرچہ حدیث پاک میں صلوٰۃ الاوابین ''صلوٰۃ الضحیٰ'' کو کہا گیا ہے، الغرض بعد مغرب جو نوافل ہیں ان کی تعداد میں مختلف روایات منقول ہیں، لہٰذا حسب گنجائش و رغبت جتنی چاہیں پڑھیں، ایک حدیث مرفوع میں وارد ہے:

عَنْ مَكْحُوْلٍ يَبْلُغُ بِهٖ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: "مَنْ صَلّٰى بَعْدَ الْمَغْرِبِ قَبْلَ أَنْ يَتَكَلَّمَ رَكْعَتَيْنِ - وَفِيْ رِوَايَةٍ: "أَرْبَعَ رَكْعَاتٍ"- رُفِعَتْ صَلَاتُهٗ فِيْ عِلِّيِّيْنَ". (مرسلا) (رزین، مشکوٰة : ١٠٥)

''جو شخص نمازِ مغرب کے بعد گفتگو سے پہلے دو رکعات اور ایک روایت کے مطابق چار رکعات نماز پڑھے تو اس کی یہ نماز علیین میں (خصوصی اعزاز کے ساتھ) پہنچادی جاتی ہے۔'' (جو نیک لوگوں کی اَرواح و اعمال کا مستقر ہے)۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ صَلّٰى بَعْدَ الْمَغْرِبِ سِتَّ رَكَعَاتٍ لَمْ يَتَكَلَّمْ فِيْمَا بَيْنَهُنَّ بِسُوْءٍ، عُدِلْنَ لَهٗ بِعِبَادَةِ ثِنْتَيْ عَشْرَةَ سَنَةً". (رواه الترمذی، و قال : هذا حديث غريب، مشکوٰة : ١٠٤)

''جو شخص نمازِ مغرب کے بعد چھ رکعات نماز پڑھے اور ان کے درمیان فحش گفتگو نہ کرے تو ان کا ثواب بارہ سال کی عبادت (نافلہ) کے برابر ہوگا، ان چھ رکعات کے متعلق حضرت میرک شاہ کا قول ہے کہ حضرت عمار بن یاسرؓ نمازِ مغرب کے بعد چھ رکعات پڑھتے تھے۔'' (مظاہر حق جدید: ١/٨٨٢)

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، آپؓ فرماتے ہیں:

"رَأَيْتُ حَبِيبِيْ ﷺ يُصَلِّيْ بَعْدَ الْمَغْرِبِ سِتَّ رَكْعَاتٍ، وَ قَالَ: "مَنْ صَلّٰى بَعْدَ الْمُغْرِبِ سِتَّ رَكْعَاتٍ، غُفِرَتْ لَهٗ ذُنُوْبُهٗ، وَ إِنْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ".

(المعجم الأوسط للطبرانی)

"میں نے اپنے حبیب ﷺ کو دیکھا کہ آپ مغرب کے بعد چھ رکعات پڑھتے اور فرماتے تھے کہ جو شخص ان چھ رکعات کو پڑھے اس کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں، اگرچہ وہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں۔"

محقق اسلام حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ فرماتے ہیں کہ "مغرب کے بعد دو رکعات تو سنت مؤکدہ ہیں، ان کے علاوہ مزید چار رکعات پڑھی جائیں تو چھ ہوجائیں گی اور بندہ گناہوں کی مغفرت کی اس بشارت کا مستحق ہوجائے گا جو اس حدیث میں دی گئی ہے۔"

(معارف الحدیث: ۳/۳۲۶، اسلامی فقہ: ۱/۲۴۹)

ایک اور روایت میں ہے:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ صَلّٰى بَعْدَ الْمَغْرِبِ عِشْرِيْنَ رَكْعَةً، بَنَى اللّٰهُ لَهٗ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ". (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ: ۱۰۴)

"جو بندہ مغرب کے بعد بیس رکعات پڑھے گا حق تعالیٰ اس کے لیے جنت میں گھر بنائیں گے۔"

نمازِ عشاء کے فرض سے پہلے حضور ﷺ سے کوئی سنت ثابت نہیں ہے۔ (اسلامی فقہ: ۱/۲۴۵) اس لیے جو چار رکعات پڑھی جاتی ہیں ان کی حیثیت نفل کی ہے، کیوں کہ حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "بَيْنَ كُلِّ أَذَانَيْنِ صَلٰوةٌ". (متفق علیہ، مشکوٰۃ: ۶۵)

آپ ﷺ نے ہر اذان اور تکبیر کے درمیان نماز کی ترغیب دی ہے (بشرطیکہ کوئی مانع نہ ہو) اس لیے عشاء سے قبل چار رکعات نماز مستحب اور قربِ الٰہی کا سبب ہے۔ علاوہ ازیں نمازِ وتر کے بعد بھی دو رکعات نفل ثابت ہیں، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُصَلِّيْ بَعْدَ الْوِتْرِ رَكْعَتَيْنِ".

(رواہ الترمذی، مشکوٰۃ: ۱۱۳)

اور بعض روایات میں ان کو بیٹھ کر پڑھنا بھی ثابت ہے، لہٰذا دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں، مگر کھڑے ہوکر پڑھنا افضل ہے، یہ دو رکعات تہجد کا بدل ہوں گی، جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

رات کی نوافل کے فضائل:

رات میں نمازِ عشاء اور نمازِ فجر کے درمیان اور کوئی نماز فرض نہیں ہے، اس لیے اگر عشاء اوّل وقت ہی میں پڑھ لی جائے یا کچھ دیر کے بعد بھی پڑھی جائے تو عشاء کے بعد سے فجر تک بہت زیادہ وقت نماز، اللہ کی یاد اور مناجات سے بظاہر خالی رہ جاتا ہے، حالانکہ رات کا وقت نوافل کے لیے دِن کے بالمقابل اس لحاظ سے بہتر ہوتا ہے کہ فضاء میں جیسا سکون رات کے سناٹے میں ہوتا ہے ایسا دوسرے کسی وقت میں عموماً نہیں ہوتا، اس میں جس یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ نوافل کا اہتمام ہوسکتا ہے دیگر اوقات میں مشکل ہے، دوسرا یہ کہ رات کی نوافل میں عموماً اِخفاء ہوتا ہے، اس لیے اِخلاص بھی زیادہ ہوتا ہے، جس سے اس کا اَجر و ثواب بہت بڑھ جاتا ہے، علاوہ ازیں رات کے وقت بستر چھوڑ کر نیند قربان کرتے ہوئے نماز اور مناجات کا اہتمام کرنا نفس کی ریاضت و مشقت کا سبب بھی ہے، تو یہ بھی رات کی نوافل کے فضائل میں اضافہ کا سبب ہے، قرآنِ پاک نے ان حقائق کو اس طرح بیان فرمایا:

﴿إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْأً وَّ أَقْوَمُ قِيْلًا﴾ (المزمل: ۶)

"بے شک رات کے وقت (سوکر) نماز (اور مناجات) کے لیے اُٹھنا ایسا عمل

ہے جو نفس کو بہت زیادہ دبانے اور کچلنے والا ہے اور (اس وقت نماز اور تلاوت ومناجات نیز دعا واذکار میں) جو بات بھی نکلتی ہے وہ ٹھیک اور دل سے نکلتی ہے۔“

اس لیے ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ دن کے مقابلہ میں رات کی نوافل افضل ہیں، اس میں بندے کو اپنے رب سے زیادہ قرب حاصل ہوتا ہے، حدیث پاک میں وارد ہے:

”أَقْرَبُ مَا يَكُوْنُ الرَّبُّ مِنَ العَبْدِ فِيْ جَوْفِ اللَّيْلِ“. (ترمذی، مشکوٰۃ: ١٠٩)

”اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے سب سے زیادہ قریب رات کے اخیری حصہ میں ہوتے ہیں۔“

عاجز کے خیالِ ناقص میں اس کا مطلب یہ ہے کہ دِن کی نوافل سے بندہ اللہ تعالیٰ کے قریب ہوتا ہے، تو رات کی نوافل سے خود رب العالمین اپنے بندوں کے قریب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سب سے مقرب بندے جناب محمد رسول اللہ ﷺ، آپ کے صحابہؓ اور صلحاء رات میں آرام کم کرتے تھے اور نوافل وغیرہ میں قیام زیادہ کرتے تھے۔ قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ۝﴾ (الذریات: ١٧)

”وہ بندے رات کو کم آرام کرتے تھے۔“

ہمارے شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیمؒ نے فرمایا:

جلتا ہے جن کا خون چراغوں میں رات بھر
ان غمزدوں سے پوچھ کبھی قیمت سحر

حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: ”أَفْضَلُ الصَّلٰوةِ بَعْدَ الْمَفْرُوْضَةِ صَلٰوةٌ فِيْ جَوْفِ اللَّيْلِ“. (رواه أحمد، مشكوٰة: ١١٠)

فرض نماز کے بعد سب سے افضل نماز رات کی ہے، ایک حدیث میں رات کی

نوافل یعنی نمازِ تہجد کی چار خصوصیتیں ذکر فرمائی گئی ہیں:

(۱) ”دَأْبُ الصَّالِحِيْنَ قَبْلَكُمْ“. تم سے پہلے صالحین کا شعار اور طریقہ رہا ہے، اس میں ترغیب اس طرح ہے کہ نمازِ تہجد جب اُمم سابقہ کے صالحین کا طریقہ رہا ہے تو تم تو خیر الامم ہو، تمہیں تو بدرجۂ اولیٰ اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

(۲) ”قُرْبَةٌ لَكُمْ إِلٰى رَبِّكُمْ“. قربِ الٰہی کا خاص وسیلہ ہے، اہتمامِ تہجد کے بغیر تقرب الی اللہ آسان نہیں۔

(۳) ”مَكْفَرَةٌ لِلسَّيِّئَاتِ“. گناہوں کا کفارہ اور معافی کا ذریعہ ہے، دِن کے گناہِ صغیرہ ان شاء اللہ رات کی نوافل سے معاف ہوجائیں گے۔

(۴) ”مَنْهَاةٌ عَنِ الْإِثْمِ“. اجتناب عن المعاصی کے لیے بھی معین ہے۔

(ترمذی، مشکوٰۃ: ١٠٩)

نمازِ تہجد کی اور بھی خصوصیات اور فضائل احادیث میں منقول ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کو ایک میدان میں جمع کیا جائے گا، پھر ایک منادی من جانب اللہ یہ اعلان کرے گا: ”أَيْنَ الَّذِيْنَ كَانَتْ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ؟“ کہاں ہیں وہ لوگ جن کے پہلو (اس وقت میں جو لوگوں کے سونے کا خاص وقت ہوتا ہے تب) بستروں اور خوابگاہوں سے جدا رہتے تھے، وہ اس وقت جب کہ لوگ خوابِ غفلت میں مست ہوتے یادِ مولیٰ میں مشغول رہتے، اور نماز ومناجات کے ذریعہ اپنے رب کو اُمید وخوف کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ پکارتے، دعائیں کرتے، اس سے مراد نمازِ تہجد کا اہتمام کرنے والے ہیں، بعضوں نے مغرب سے عشاء تک نماز وتلاوت میں مشغول رہنے والوں کو نیز عشاء اور فجر باجماعت ادا کرنے والوں کو بھی اس میں شامل کیا ہے۔ (مستفاد از: انوار البیان: ٣٥٩)

اس اعلان کے بعد

”فَيَقُوْمُوْنَ، وَ هُمْ قَلِيْلُوْنَ، فَيَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِسَابٍ، ثُمَّ يُؤْمَرُ بِسَائِرِ

النَّاسِ إِلَی الحِسَابِ". (رواه البیهقی فی شعب الإیمان، مشکوٰۃ : ٤٨٧)

ایک مختصر جماعت کھڑی ہوگی جنہیں بلا حساب و کتاب جنت میں داخل کر دیا جائے گا، پھر بقیہ لوگوں کے لیے حساب و کتاب کا حکم ہوگا۔

پس معلوم ہوا کہ رات کی نوافل کا سب سے بڑا ثمرہ اور صلہ بلا حساب و کتاب دخولِ جنت اور اللہ تعالیٰ کی قربت ہے۔ اب رہی بات رات کی نوافل کی تعداد کی، تو اس کی رکعات متعین نہیں ہیں، جس قدر آسانی ہو، دو، چار، چھ یا آٹھ رکعات پڑھ سکتے ہیں، حضور ﷺ عموماً آٹھ رکعات پڑھتے تھے، اور کبھی دو رکعات بھی ادا فرمائی ہیں۔ ہمارے علماء نے فرمایا ہے کہ دن میں اگر نفل نماز پڑھی جائے تو ایک سلام میں دو یا چار رکعات سے زیادہ کی نیت نہیں کرنی چاہیے، البتہ رات میں دو، چار اور زیادہ سے زیادہ آٹھ رکعات تک کی ایک سلام میں نیت کرسکتا ہے، لیکن دو رکعات کی نیت بہتر ہے۔ اسی طرح دن کی نوافل میں آہستہ قراءۃ واجب ہے، جب کہ رات میں اختیار ہے، چاہے تو آہستہ قراءۃ کرے یا آواز سے، اگر قریب میں کوئی سویا ہوا نہ ہو تو آواز سے پڑھنا افضل ہے۔ (مستفاد از: اسلامی فقہ: ۲۵۱ بتغیر)

نمازِ اشراق و چاشت کے فضائل:

پھر جس طرح نمازِ عشاء کے بعد سے لے کر طلوعِ صبح صادق تک کے طویل وقفہ میں کوئی نماز فرض تو نہیں؛ لیکن نمازِ تہجد کی ترغیب دی گئی، اسی طرح نمازِ فجر سے لے کر ظہر تک کے طویل عرصہ میں کوئی نماز فرض تو نہیں ہے، البتہ اس درمیان ''صلوٰۃ الضحیٰ'' کے عنوان سے کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ بارہ رکعات کی ترغیب آئی ہے، اب اگر یہ نماز طلوعِ آفتاب کے تھوڑی ہی دیر بعد جب سورج ایک نیزہ بلند ہو جائے اور مکروہ وقت کے ختم ہونے کے بعد پڑھی جائے تو اسے اِشراق کہا جاتا ہے، اس کی کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ چھ رکعات ہیں۔
(مظاہر حق جدید: ۱/۹۶۲)

اس کے متعلق حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ مُعَاذِ بْنِ أَنَسٍ الجُهَنِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ قَعَدَ فِيْ مُصَلَّاهُ حِيْنَ يَنْصَرِفُ مِنْ صَلَاةِ الصُّبْحِ حَتّٰى يُسَبِّحَ رَكْعَتَيِ الضُّحٰى، لَا يَقُوْلُ إِلَّا خَيْرًا، غُفِرَ لَهٗ خَطَايَاهُ، وَ إِنْ كَانَتْ أَكْثَرَ مِنْ زَبَدِ البَحْرِ".

(رواه أبوداود، مشکوٰۃ : ١١٦)

''جو شخص نمازِ فجر پڑھ کر اپنی جگہ بیٹھا رہے، حتیٰ کہ اشراق کی دو رکعات پڑھ لے، تو اس کے تمام صغیرہ گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں، اگرچہ وہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں۔''

ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ ''نمازِ فجر کے بعد بیٹھنا بطورِ تمثیل ذکر کیا گیا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ دنیوی کاموں میں مشغول نہ ہو، لہٰذا اگر بندہ دینی امور مثلاً تعلیم و تعلم ذکر و اذکار، تلاوت اور طواف وغیرہ میں مشغول ہو جائے، یا کسی پریشانی یا ریاکاری کے وسوسہ کی وجہ سے مصلیٰ سے اٹھ کر خلوت اور گھر میں چلا جائے اور وہاں نمازِ اشراق ادا کرے تو اس کی بھی گنجائش ہے۔'' (مستفاد از: مظاہر حق جدید: ۱/۹۶۶)

ایک دوسری حدیث میں ہے:

عَنْ بُرَيْدَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: "فِي الإِنْسَانِ ثَلَاثُ مِائَةٍ وَ سِتُّوْنَ مَفْصِلًا، فَعَلَيْهِ أَنْ يَتَصَدَّقَ عَنْ كُلِّ مَفْصِلٍ مِنْهُ بِصَدَقَةٍ، قَالُوْا: وَ مَنْ يُطِيْقُ ذٰلِكَ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ! قَالَ: النُّخَاعَةُ فِي المَسْجِدِ تَدْفِنُهَا، وَ الشَّيْءُ تُنَحِّيْهِ عَنِ الطَّرِيْقِ، فَإِنْ لَمْ تَجِدْ فَرَكْعَتَا الضُّحٰى تُجْزِئُكَ".

(رواه أبوداود، مشکوٰۃ : ١١٦)

''انسان کے جسم میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں، انسان پر (بطورِ شکر بہتر ہے کہ وہ اس عظیم نعمت کا) صدقہ ادا کرے، صحابہؓ نے عرض کیا: حضور! اس کی کون طاقت رکھتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مسجد میں پڑا ہوا تھوک (یا کیچڑ) صاف کر دینا بھی صدقہ ہے، اسی طرح راستہ سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا بھی صدقہ ہے، اور اگر اس کا موقع نہ ہو تو پھر اشراق کی دو رکعات پڑھ لینا بھی کافی ہے۔'' اس پر حق تعالیٰ صدقہ کا ثواب عطا فرماتے ہیں۔

یہ نماز اگر سورج بلند ہونے اور گرمی پیدا ہو جانے کے بعد پڑھی جائے تو اسے ''چاشت'' کی نماز کہا جاتا ہے، اس کی کم از کم دو اور مذہب مختار کے مطابق چار، جب کہ زیادہ سے زیادہ بارہ رکعات ہیں، اس کے متعلق حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" مَنْ حَافَظَ عَلٰی شُفْعَةِ الضُّحٰی غُفِرَتْ لَهٗ ذُنُوْبُهٗ، وَ إِنْ کَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ".

(رواه أحمد و الترمذی و ابن ماجه، مشکوٰة : ۱۱۶)

''جس شخص نے دو رکعات نمازِ چاشت کا اہتمام کرلیا اس کے تمام (صغیرہ) گناہ معاف کردیے جائیں گے، اگرچہ وہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہی کیوں نہ ہوں؟''

ایک اور حدیث میں ہے:

عَنْ أَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" مَنْ صَلَّی الضُّحٰی ثِنْتَيْ عَشْرَةَ رَکْعَةً بَنَی اللّٰهُ لَهٗ قَصْرًا مِنْ ذَهَبٍ فِيْ الْجَنَّةِ".

(رواه الترمذی، و قال : هذا حدیث غریب، مشکوٰة : ۱۱۶)

''جو شخص چاشت کی بارہ رکعات پڑھتا ہے حق تعالیٰ اس کے لیے جنت میں سونے کا محل بناتے ہیں۔''

آخرت میں متقیوں کا مقام جنت ہے، جب قیامت میں متقیوں کے لیے جنت کا فیصلہ ہو جائے گا تو قرآن کہتا ہے کہ فوراً جنت ان کے پاس بالکل قریب کر دی جائے گی:

﴿ وَ أُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِیْنَ غَیْرَ بَعِیْدٍ﴾ (ق : ۳۱)

یعنی متقیوں کو جنت میں داخل ہونے کے لیے کسی سوار پر سوار ہونے یا چلنے کی مشقت بھی نہیں ہوگی، پھر جب یہ لوگ جنت میں داخل ہو جائیں گے تو کہا جائے گا:

﴿ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِکُلِّ أَوَّابٍ حَفِیْظٍ﴾ (ق : ۳۲)

''یہ جنت کی نعمتوں ولذتوں کا وعدہ ہر اس شخص کے لیے ہے جو اَوّاب (بہت زیادہ

اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا) اور حفیظ (اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی یعنی احکامِ شریعت کی حفاظت کرنے والا) ہو۔''

تفسیر قرطبی میں حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک روایت ہے، جس میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص شروع دن میں چار رکعات (اشراق) کی پڑھ لے، وہ ''اَوّاب'' اور ''حفیظ'' ہے۔ (از: معارف القرآن: ۸/ ۱۴۷)

اور ظاہر ہے کہ نمازِ اشراق کا اہتمام کرنے والا جب ''اَوّاب'' اور ''حفیظ'' ہے تو وہ اس قرآنی بشارت وفضیلت کا بھی مصداق ہوگا۔

خاص حالات میں پڑھی جانے والی نوافل کے فضائل:

یہ اُن نوافل کے فضائل ہیں جن کا تعلق خاص اوقات سے تھا، ان کے علاوہ بھی نوافل ہیں جن کا تعلق خاص اوقات سے تو نہیں؛ البتہ خاص حالات سے ہے، جیسے وضو کے بعد دو رکعات نماز پڑھنا، جس کو عرفِ عام میں ''تحیۃ الوضوء'' کہا جاتا ہے، اسی طرح دخولِ مسجد کے وقت جب موقع ہو اور مکروہ وقت نہ ہو تو دو رکعات نماز پڑھنا، جس کو ''تحیۃ المسجد'' کہتے ہیں، اسی طرح کوئی دینی یا دنیوی حاجت وضرورت پیش آجائے تو دو رکعات نماز پڑھنا، جس کو ''صلاۃ الحاجۃ'' کہتے ہیں، اسی طرح کبھی خدانخواستہ کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو دو رکعات نماز پڑھ کر توبہ کرنا، جس کو ''صلوٰۃ التوبۃ'' کہتے ہیں، اسی طرح کوئی اہم معاملہ درپیش ہو، جس کا انجام معلوم نہ ہو، اس موقع پر دو رکعات نماز پڑھے، جس کو ''صلوٰۃ الاستخارۃ'' کہتے ہیں، نیز کبھی کسی وقت فرصت ورغبت ہو تو ایک خاص طریقہ پر چار رکعات نماز پڑھی جائے، جس کو ''صلوٰۃ التسبیح'' کہتے ہیں، اسی طرح سورج وچاند گہن کے وقت، نیز بارش طلب کرتے وقت نماز پڑھنا، ان میں سے ہر ایک کے مستقل فضائل احادیث طیبہ میں وارد ہیں۔

تحیۃ الوضوء کی فضیلت:

تحیۃ الوضوء سے متعلق حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِبِلَالٍؓ عِنْدَ صَلَاةِ الْفَجْرِ:" يَا بِلَالُ! حَدِّثْنِيْ بِأَرْجٰى عَمَلٍ عَمِلْتَهٗ فِي الْإِسْلَامِ، فَإِنِّيْ سَمِعْتُ دَفَّ نَعْلَيْكَ بَيْنَ يَدَيَّ فِي الْجَنَّةِ، قَالَ: مَا عَمِلْتُ عَمَلًا أَرْجٰى عِنْدِيْ أَنِّيْ لَمْ أَتَطَهَّرْ طُهُوْرًا فِيْ سَاعَةٍ مِنْ لَيْلٍ وَ لَا نَهَارٍ إِلَّا صَلَّيْتُ بِذٰلِكَ الطُّهُوْرِ مَا كُتِبَ لِيْ أَنْ أُصَلِّيَ". (متفق عليه، مشكوٰة : ۱۱۶)

''رحمت عالم ﷺ نے ایک دن نمازِ فجر کے بعد حضرت بلالؓ سے ارشاد فرمایا کہ تمہیں اپنے جس عمل کے متعلق سب سے زیادہ اُمید ہو وہ بتاؤ، کیوں کہ میں نے تمہارے جوتوں یا چپلوں کی چاپ اور آواز جنت میں اپنے آگے آگے سنی ہے۔'' (یہ یا تو آپ ﷺ کو خواب میں دِکھایا اور سنایا گیا، یا پھر شب معراج میں، نیز حضرت بلالؓ کا آپ ﷺ سے آگے چلنا ایسا ہی ہے جیسا کہ خادم کا اپنے مخدوم سے آگے چلنا)۔
(مظاہر حق جدید: ۱/ ۹۶۸)

حضرت بلالؓ نے عرض کیا کہ حضور! مجھے اپنے اعمال میں سب سے زیادہ جس عمل سے اُمید ہے وہ یہ ہے کہ دن رات میں کبھی وضو کیا تو اس کے بعد دو رکعات نماز ضرور پڑھی (خواہ فرض، خواہ سنت، خواہ نفل)۔

سیدنا بلالؓ کو اِتنا اونچا مقام تحیۃ الوضوء کی برکت سے ملا، لہٰذا حسب موقع اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

تحیۃ المسجد کی فضیلت:

اسی طرح مسجد میں داخل ہونے کے بعد اگر موقع ہو اور مکروہ وقت نہ ہو تو دو

رکعات نماز پڑھنا بیت اللہ کے علاوہ تمام مساجد کا حق ہے (البتہ بیت اللہ میں طواف کرنے کا حکم ہے، اگر اس کا موقع نہ ہو تو وہاں بھی دو رکعات نماز پڑھ لے) ہمارے یہاں تو یہ نفل ہے، البتہ امام شافعیؒ کے یہاں قبل الجلوس واجب ہے، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَبِيْ قَتَادَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ:" إِذَا دَخَلَ أَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ، فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ أَنْ يَجْلِسَ". (متفق عليه، مشكوٰة : ۶۸)

''جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں داخل ہو تو (اس کے لیے مستحب ہے کہ) بیٹھنے سے پہلے دو رکعات نماز پڑھ لے''۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:

عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَتَوَضَّأُ، فَيُحْسِنُ وُضُوْءَهٗ، ثُمَّ يَقُوْمُ، فَيُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ مُقْبِلًا عَلَيْهِمَا بِقَلْبِهٖ وَ وَجْهِهٖ إِلَّا وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ۳۹)

''جو مسلمان بندہ اچھی طرح وضو کرے، (مسواک کے اہتمام اور سنت کی رعایت کے ساتھ) پھر کھڑے ہو کر (خواہ قیام حقیقۃً ہو یا حکمًا، مراد حالت عذر میں بیٹھ کر نماز پڑھنا حکماً قیام ہی ہے) دل اور چہرہ سے متوجہ ہو کر (یعنی ظاہر و باطن دونوں کی توجہ اور خشوع و خضوع کے ساتھ) دو رکعات نماز پڑھے تو اس کے لیے جنت واجب ہو جاتی ہے''۔

علماءِ محدثین نے فرمایا کہ اس حدیث میں جن دو رکعات پر جنت کی فضیلت کا ذکر ہے اس سے مراد یا تو تحیۃ الوضوء ہے یا تحیۃ المسجد۔ (مظاہر حق جدید: ۱/ ۳۴۹)

صلوٰۃ الحاجۃ کی فضیلت:

جب کسی کو کوئی جائز حاجت و ضرورت دینی یا دنیوی اعتبار سے پیش آئے تو اسے دو رکعات صلوٰۃ الحاجۃ پڑھنی چاہیے، کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ بندوں کی تمام حاجات اللہ تعالیٰ ہی پوری کرنے والے ہیں، خواہ ان حاجات کا تعلق بندوں سے ہو یا خود اللہ تعالیٰ سے، ان

شاءاللہ اس نماز کی برکت سے اسے اپنے مقصد میں کامیابی نصیب ہوگی، اس کا طریقہ یہ ہے کہ حاجت کے وقت اچھی طرح وضو کر کے دو رکعات نماز پڑھے، پھر درودِ پاک اور حدیث میں مذکور دعا کا پوری دلجمعی کے ساتھ اہتمام کرے، یہ عمل بزرگوں کا محبوب بھی ہے اور مجرب بھی۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ أَبِيْ أَوْفٰى رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " مَنْ كَانَتْ لَهٗ حَاجَةٌ إِلَى اللّٰهِ أَوْ إِلٰى أَحَدٍ مِنْ بَنِيْ اٰدَمَ فَلْيَتَوَضَّأْ، فَلْيُحْسِنِ الْوُضُوْءَ، ثُمَّ لِيُصَلِّ رَكْعَتَيْنِ، ثُمَّ لِيُثْنِ عَلَى اللّٰهِ تَعَالٰى، وَ يُصَلِّ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ، ثُمَّ لِيَقُلْ: " لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ، سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، أَسْأَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ، وَ عَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ، وَ الْغَنِيْمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ، وَ السَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ إِثْمٍ، لَا تَدَعْ لِيْ ذَنْبًا إِلَّا غَفَرْتَهٗ، وَ لَا هَمًّا إِلَّا فَرَّجْتَهٗ، وَ لَا حَاجَةً هِيَ لَكَ رِضًا إِلَّا قَضَيْتَهَا، يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ". (رواه الترمذی و ابن ماجه، مشكوٰة: ۱۱۷)

''جس شخص کو کوئی حاجت اور ضرورت پیش آجائے، خواہ اس کا تعلق براہِ راست اللہ تعالیٰ سے ہو یا بظاہر بندہ سے، بہر صورت اسے چاہیے کہ وہ خوب اچھی طرح سنت کے مطابق وضو کرے، اس کے بعد دو رکعات (نمازِ حاجت) پڑھے، پھر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور نبی پاک ﷺ پر درود پڑھ کر اللہ تعالیٰ کے حضور اس طرح دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ بڑے حلم والا اور کریم ہے، پاک اور مقدس ہے، وہ اللہ جو عرشِ عظیم کا مالک ہے، تمام تعریفیں اسی کے لیے ہیں جو سارے جہانوں کا رب ہے، اے اللہ! میں تجھ سے ان اعمال و احوال کا سوال کرتا ہوں جو تیری رحمت کا موجب اور وسیلہ اور تیری مغفرت و بخشش کا پکا ذریعہ بنیں، اور تجھ سے طالب ہوں ہر نیکی سے فائدہ اُٹھانے کا اور حصہ لینے کا، اور ہر گناہ و معصیت سے سلامتی و حفاظت کا، اے اللہ! میرے سارے گناہ بخش دے اور میری ہر فکر و پریشانی دور کر دے، اور میری ہر حاجت جس سے تو راضی ہو اسے پورا کر دے، اے ارحم الراحمین! تمام مہربانوں سے زیادہ مہربان''۔

صلوٰۃ التوبۃ کی فضیلت:

اللہ پاک نے ہر بندہ میں نیکی و بدی کی صلاحیت رکھی ہے، یہی وجہ ہے کہ بندہ کبھی نیکی کرتا ہے تو کبھی بدی، نیکی کو من جانب اللہ سمجھتے ہوئے اس سے خوش ہو اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے، اور اگر کبھی بدی سرزد ہو جائے تو نادِم اور شرمندہ ہو کر دو رکعات نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرے اور اپنے گناہوں کی معافی و تلافی کی فکر کرے، اگر ایسا کیا تو ان شاء اللہ بندہ کو گناہوں کی معافی مل ہی جائے گی، حدیث پاک میں ہے:

عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: حَدَّثَنِيْ أَبُوْبَكْرٍ وَ صَدَقَ أَبُوْبَكْرٍ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ:" مَا مِنْ رَجُلٍ يُذْنِبُ ذَنْبًا، ثُمَّ يَقُوْمُ فَيَتَطَهَّرُ، ثُمَّ يُصَلِّيْ، ثُمَّ يَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ، إِلَّا غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ، ثُمَّ قَرَأَ: ﴿وَ الَّذِيْنَ إِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوْٓا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ﴾ (آل عمران: ۱۳۵)

(رواه الترمذی و ابن ماجه، مشكوٰة: ۱۱۷)

''جس شخص سے کوئی گناہ ہو جائے، پھر وہ (شرمندہ ہو کر) اٹھے اور (فوراً توبہ کرنے کے لیے) وضو کرے اور دو رکعات نماز پڑھے اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرے تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور معاف فرما دیتے ہیں، اس کے بعد حضور ﷺ نے وہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی جس میں حق تعالیٰ نے اپنے ان بندوں کو مغفرت اور جنت کی بشارت دی ہے جنہوں نے گناہ اور معصیت کی عادت نہیں بنالی؛ بلکہ ان کا حال یہ ہے کہ جب ان سے کوئی چھوٹا بڑا گناہ ہو جاتا ہے تو فوراً نادم و شرمندہ ہو کر توبہ و تلافی کا اہتمام کرتے ہیں، جس کا بہترین طریقہ حدیث پاک میں یہ بتایا کہ اچھی طرح وضو کر کے دو رکعات صلوٰۃ التوبۃ پڑھے، پھر اللہ تعالیٰ سے ندامت کے ساتھ مغفرت طلب کرے، تو حق تعالیٰ ایسے بندوں کو مایوس نہیں کرتے بلکہ معاف فرما دیتے ہیں''۔

جہاں تک تعلق ہے ''صلوٰۃ الاستخارۃ'' کا، تو اس عاجز نے اپنی تالیف (گلدستۂ

احادیث: ۵/ ۳۴۶) میں اس کی اہمیت وفضیلت لکھی ہے، فلیراجع ثم.

صلوٰۃ التسبیح کی فضیلت:

رہی بات ''صلوٰۃ التسبیح'' کی، تو کتب احادیث میں اس کی ترغیب وتلقین کے ساتھ تعلیم بھی آئی ہے، اس کی چار رکعات حضور ﷺ نے اپنے محبوب چچا حضرت عباسؓ کو سکھائی ہیں، حافظ ابن حجرؒ نے اپنی کتاب ''الخصال المکفرۃ'' میں ابن جوزیؒ کا رد کرتے ہوئے صلوٰۃ التسبیح کی روایات اور ان کی سندی حیثیت پر تفصیل سے کلام فرمایا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ کم از کم حسن یعنی صحت کے لحاظ سے دوم درجہ کی ضرور ہیں، اور بعض تابعین اور تبع تابعین حضرات سے جن میں حضرت عبداللہ بن مبارکؒ جیسے جلیل القدر امام بھی ہیں صلوٰۃ التسبیح کا پڑھنا اور لوگوں کو اس کی ترغیب دینا بھی ثابت ہے، اور یہ صلحاءِ امت کا معمول بھی رہا ہے، اس کے دو طریقے منقول ہیں:

(۱) پہلا طریقہ جو حدیث ابن عباسؓ میں منقول ہے کہ چار رکعات کی نیت کرے اور ہر رکعت میں قراءۃ سے فارغ ہوکر رکوع سے قبل پندرہ مرتبہ پڑھیں: ''سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ أَکْبَرُ'' پھر دس مرتبہ رکوع میں یہ تسبیح، پھر قومہ میں دس مرتبہ، پھر پہلے سجدہ میں دس مرتبہ، پھر پہلے جلسہ میں دس مرتبہ، پھر دوسرے سجدہ میں دس مرتبہ، پھر دوسرے سجدہ کے بعد کھڑے ہونے سے پہلے دس مرتبہ، چاروں رکعات میں اسی طرح پڑھیں، اس ترتیب سے ہر رکعت میں یہ کلمہ پچھتر مرتبہ پڑھا جائے گا، اور کل یہ تسبیح تین سو بار ہوجائے گی۔

(۲) دوسرا طریقہ جو امام ترمذیؒ نے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے نقل کیا ہے وہ اس طرح ہے کہ تکبیر تحریمہ اور ثنا کے بعد پندرہ مرتبہ ''سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ أَکْبَرُ'' پڑھیں، پھر قراءۃ سے فارغ ہوکر دس مرتبہ، پھر رکوع میں دس مرتبہ، پھر قومہ میں دس مرتبہ، پھر سجدہ، جلسہ اور سجدۂ ثانیہ میں دس دس مرتبہ یہ تسبیح پڑھیں، سجدۂ ثانیہ کے

بعد جلسۂ استراحت کی ضرورت نہیں۔ یعنی اس طریقے میں دوسرے سجدہ کے بعد یہ کلمہ کسی رکعت میں بھی نہیں پڑھا جائے گا، اس طرح یہ بھی ہر رکعت میں مجموعی طور پر پچھتر اور چاروں رکعات میں ملا کر تین سو مرتبہ ہوگا۔

بہر حال صلوٰۃ التسبیح کے یہ دونوں طریقے منقول اور معمول بہا ہیں، پڑھنے والے کے لیے دونوں طریقوں پر عمل کی گنجائش ہے، اس کی فضیلت یہ ہے کہ نماز کے ذریعہ گناہوں کی معافی کا تذکرہ قرآن میں ہے:

﴿أَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ ۭ إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾ (هود: ١١٤)

لیکن اس تاثیر میں صلوٰۃ التسبیح کا جو خاص مقام اور درجہ ہے اس کو حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"إِذَا فَعَلْتَ ذٰلِكَ غَفَرَ اللّٰهُ لَكَ ذَنْبَكَ أَوَّلَهٗ وَ آخِرَهٗ، قَدِيْمَهٗ وَ حَدِيْثَهٗ، خَطَأَهٗ وَ عَمَدَهٗ، صَغِيْرَهٗ وَ كَبِيْرَهٗ، سِرَّهٗ وَ عَلَانِيَتَهٗ". (رواه أبوداود و ابن ماجه و البيهقي في الدعوات الكبير و روى الترمذي عن أبي رافع نحوه، مشكوٰة: ١١٧)

اس نماز کی برکت وفضیلت یہ ہے کہ حق تعالیٰ اس سے بندہ کے اگلے، پچھلے، پرانے، نئے، دانستہ، نادانستہ، صغیرہ، کبیرہ، پوشیدہ اور علانیہ تمام ہی گناہوں کو معاف فرما دیتے ہیں، اور سنن ابی داود کی ایک روایت میں ذکر ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمروؓ کو صلوٰۃ التسبیح کی تلقین کرنے کے بعد ارشاد فرمایا:

"وَ إِنَّكَ لَوْ كُنْتَ أَعْظَمَ أَهْلِ الْأَرْضِ ذَنْبًا غُفِرَ لَكَ بِذٰلِكَ".

اگر بالفرض تم دنیا کے سب سے بڑے گنہگار ہوں گے تو بھی اس کی برکت سے حق تعالیٰ تمہاری مغفرت ضرور فرمادیں گے۔

صلوٰۃ الکسوف والخسوف:

اللہ رب العالمین نے اپنی قدرت سے سورج اور چاند کو روشنی عطا فرمائی، صبح میں روشن ہونے والے سورج اور رات میں منور ہونے والے چاند کے چھپنے کا مشاہدہ تو ہم اور آپ روزانہ کرتے ہیں؛ لیکن قیامت کے نفخۂ اولیٰ کے وقت انہیں حق تعالیٰ مکمل طور پر بے نور کر دیں گے، جیسا کہ فرمایا:

﴿ إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ۝﴾ (التكوير : ١)

دنیا میں قیامت کا منظر یاد دلانے اور اپنی قوتِ قاہرہ کا مشاہدہ کرانے کے لیے کبھی کبھی حق تعالیٰ موجودہ دنیا کے سورج اور چاند کو بے نور کر دیتے ہیں، جسے ہم اور آپ سورج گہن اور چاند گہن کہتے ہیں، حدیث پاک میں وارد ہے:

" إِنَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ايَتَانِ مِنْ ايَاتِ اللّٰهِ، لَا يَخْسِفَانِ لِمَوْتِ أَحَدٍ، وَ لَا لِحَيَاتِهٖ". (متفق عليه، مشكوٰة : ١٣٠)

"سورج اور چاند بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہیں، ان میں گہن نہ کسی کے مرنے سے ہوتا ہے اور نہ کسی کے زندہ رہنے یا پیدا ہونے سے ہوتا ہے، اللہ پاک ہی کے حکم سے یہ روشن ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے بے نور ہوتے ہیں۔"

کبھی حق تعالیٰ اپنے بندوں کو اپنی قدرت وطاقت کا مشاہدہ کرانے اور ڈرانے کے لیے اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاتے ہیں، جیسا کہ فرمایا:

﴿ وَ مَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ إِلَّا تَخْوِيْفًا۝﴾ (بنى إسرائيل : ٥٦)

سورج اور چاند گہن بھی ایسی ہی نشانیاں ہیں، لہٰذا اس موقع پر ہمیں اپنے گناہوں سے ڈرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے در پر آ جانا چاہیے، حدیث پاک میں ان مواقع پر چار کاموں کی ترغیب دی گئی ہے: (۱) نمازِ کسوف وخسوف (۲) دعا، توبہ واستغفار (۳) ذکر واذکار (۴) صدقہ وخیرات۔

" فَإِذَا رَأَيْتُمْ شَيْئًا مِنْ ذٰلِكَ فَافْزَعُوْا إِلٰى ذِكْرِهٖ وَ دُعَائِهٖ وَ اسْتِغْفَارِهٖ".
(متفق عليه، مشكوٰة : ١٣٠)

دوسری روایت میں ہے:

" فَادْعُوا اللّٰهَ، وَ كَبِّرُوْا، وَ صَلُّوْا، وَ تَصَدَّقُوْا". (متفق عليه)

سورج گہن کی نماز کو "صلوٰۃ الکسوف" اور چاند گہن کی نماز کو "صلوٰۃ الخسوف" کہتے ہیں، جس وقت سورج گہن ہو اور مکروہ وقت نہ ہو تو دو رکعات عام نفل کی طرح اس نیت سے پڑھی جائیں جن کو باجماعت ادا کرنا اور طویل قیام، رکوع اور سجدے کے ساتھ ادا کرنا مسنون ہے، اگر جماعت کا موقع نہ ہو تو دو یا اس سے زیادہ بھی پڑھ سکتے ہیں، عورتوں کے لیے یہی بہتر ہے، اس کی نہ اذان ہے، نہ اقامت، البتہ اعلان ہے، نیز امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کی قراءت آہستہ افضل ہے، جہر کی گنجائش ہے، البتہ چاند گہن کے وقت بغیر جماعت کے نماز پڑھنا مسنون ہے، جب تک سورج اور چاند میں گہن باقی رہے تب تک نماز، دعا، استغفار اور ذکر واذکار میں مشغول رہنا مستحب ہے۔ اخلاص کے ساتھ یہ اعمال ان شاء اللہ اللہ تعالیٰ کی رضا ورحمت کا ذریعہ ثابت ہوں گے۔

علاوہ ازیں طلب بارش کے لیے آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کے ہمراہ عیدگاہ جا کر دو رکعات نماز پڑھائی، جس میں بآوازِ بلند قراءت فرمائی، پھر دعا کی۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ:۱۳۱) اس نماز کو "صلوٰۃ الاستسقاء" کہتے ہیں۔

حق تعالیٰ اپنے کرم سے دارین میں ہمیں اپنا قرب عطا فرمائیں، محرومی سے حفاظت فرمائیں اور ان خوش نصیب بندوں میں ہمیں بھی داخل فرما دیں جو ان کے مقرب و محبوب ہیں۔ آمین یارب العالمین۔

مؤرخہ: ۱۷/شوال/۱۴۴۰ھ
مطابق: ۲۱/جون/۲۰۱۹ء
بروز: جمعہ/قبل المغرب (بزمِ صدیقی، بڑودا)

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيْرًا   فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيْرًا كَثِيْرًا

(۲۴)

دو قابلِ رَشک طبقے

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَا حَسَدَ إِلَّا عَلَى اثْنَتَيْنِ، رَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ الْقُرْآنَ، فَهُوَ يَقُوْمُ بِهٖ اٰنَاءَ اللَّيْلِ وَ اٰنَاءَ النَّهَارِ، وَ رَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ مَالًا، فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ اٰنَاءَ اللَّيْلِ وَ اٰنَاءَ النَّهَارِ".

(متفق علیه، مشکوٰة : ۱۸۴/ کتاب فضائل القرآن)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''دو اشخاص وافراد اور دو طبقے ایسے ہیں کہ ان پر حسد بمعنیٰ رَشک کی اجازت ہے، ایک تو وہ جسے اللہ رب العالمین نے قرآنِ کریم کی (تلاوت، تعلیم، تدریس، تبلیغ اور کسی بھی طرح کی قرآنی خدمت کی مصروفیت سے) مالا مال کیا ہو اور وہ دِن رات کے اکثر اوقات اسی میں (خلوص کے ساتھ) مشغول رہتا ہو، اور دوسرا وہ شخص جسے اللہ رب العالمین نے مال (حلال) عطا کیا ہو، اور وہ (اخلاص) کے ساتھ دِن رات کے اکثر اوقات مصارفِ خیر میں خرچ کرتا رہتا ہو۔''

۱۹۳

رَشک کی حقیقت:

اللہ رب العالمین حاکم مطلق بھی ہیں ﴿أَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَحْكَمِ الْحٰكِمِينَ○﴾ (التین:۸) اور زبردست حکیم بھی ہیں ﴿إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ○﴾ (النساء:۵۶) وہ اپنی شانِ حاکمیت سے جسے، جب، جو اور جتنا چاہتے ہیں عطا کرتے ہیں، اور چوں کہ وہ زبردست حکمت والے بھی ہیں اس لیے یہ ایک یقینی حقیقت ہے کہ اس حاکم مطلق نے جسے، جب، جو اور جتنا بھی دیا بہتر ہی دیا، اور اگر کبھی کسی کو کوئی چیز عطا نہیں کی تو اس میں بھی اس کے لیے بہتری ہے، جس شخص کے دل میں اس حقیقت کا یقین راسخ ہو جاتا ہے وہ عطاءِ الٰہی پر راضی رہتا ہے اور محرومی پر ناراض نہیں ہوتا، نہ ہی کسی کی نعمت کو دیکھ کر حسد کرتا ہے، کیوں کہ اس کا یہ یقین ہوتا ہے کہ دنیا میں جس کسی کو جو کچھ ملا وہ اللہ رب العالمین کی عطا اور اس کی حکمت کاملہ کا تقاضا ہے، لہٰذا کسی کے لیے من جانب اللہ ملی ہوئی نعمت کے متعلق زوال کی تمنا کرنا فضول ہے، اور شرعاً اس کی اِجازت بھی نہیں، ہاں، البتہ کسی کی نعمت پر رَشک کرنے کی گنجائش ہے۔

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ حسد کرنا ایک مؤمن کامل کے شایانِ شان نہیں، یہ منافق کی پہچان ہے، منافق حسد کرتا ہے اور مؤمن رَشک کرتا ہے، حسد کی ممانعت ہے، جب کہ رَشک کی اجازت ہے؛ بلکہ اس کی ترغیب بھی آئی ہے۔ رَشک کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ صاحب نعمت کو دیکھ کر خوش ہو جائے اور اپنے لیے بھی اس جیسی نعمت کے ملنے کی تمنا اور دعا کرے، لیکن صاحب نعمت کے متعلق زوالِ نعمت کا خیال تک دل میں نہ لائے۔ رَشک کرنا دنیوی امور اور نعمتوں میں تو مباح ہے جب کہ دینی امور اور نعمتوں میں مستحب ہے۔

صاحبِ قرآن قابلِ رَشک ہے:

دینی امور اور نعمتوں میں بھی یوں تو بہت سے لوگ صاحب فضل وکمال اور قابل

رَشک ہیں، مثلاً جو صاحبِ توفیق اور مخلص لوگ رات کے اکثر اوقات اللہ تعالیٰ کی عبادت، اس کی یاد اور مناجات میں، دعوت و تبلیغ یا خدمتِ خلق میں مشغول رہتے ہیں، یقیناً یہ لوگ بھی قابلِ رَشک ہیں، لیکن حدیث مذکورہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امت میں سب سے زیادہ رَشک کے قابل اگر کوئی ہے تو وہ دو اشخاص و افراد اور دو طبقے: (۱) مخلص صاحبِ قرآن (۲) مخلص سخی ہیں۔ ارشاد ہے:

"رَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ الْقُرْاٰنَ، فَهُوَ يَقُوْمُ بِهٖ اٰنَاءَ اللَّيْلِ وَ اٰنَاءَ النَّهَارِ".

صاحبِ قرآن سے مراد وہ شخص یا وہ طبقہ ہے جسے اللہ رب العالمین نے قرآنِ کریم پڑھنے یا پڑھانے یا قرآنِ کریم کے درس و تدریس، یا قرآنِ کریم کے احکام و پیغام کی اشاعت و حفاظت کی صلاحیت و توفیق عطا فرمائی ہو، اور یہ صاحبِ قرآن دن رات کے اکثر اوقات اسی قرآنی خدمت میں خلوص سے مشغول رہتا ہو، کلامِ الٰہی کا حق اور تقاضا یہی ہے، یہ چیز صاحبِ قرآن کو اللہ تعالیٰ کا ولی بنا دیتی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ۝﴾ (آل عمران:۷۹)

"اللہ والے بن جاؤ، کیوں کہ تم جو کتاب پڑھاتے ہو اور جو کچھ پڑھتے رہتے ہو اس کا تقاضا و نتیجہ یہی ہونا چاہیے"۔ اگر واقعی اس کے مطابق عمل ہوا تو تمہیں تعلق مع اللہ نصیب ہوگا، پھر تم اللہ تعالیٰ کے ولی اور دارین میں قابلِ رَشک بن جاؤ گے۔

صاحبِ قرآن کون؟

اس کے سب سے پہلے مصداق صاحبِ قرآن جناب محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، آپ کی بعثت کا مقصد ہی تلاوتِ قرآن، تزکیۂ اخلاق اور تعلیم کتاب و حکمت تھا اور اسی میں آپ ﷺ دن رات کے اکثر اوقات مشغول رہتے تھے، بالخصوص نزولِ قرآن کے ابتدائی دور میں صاحبِ قرآن ﷺ دن رات کے اکثر اوقات تلاوتِ قرآن، تعلیمِ قرآن اور اس کی تبلیغ و اشاعت میں مشغول رہتے تھے، اس کے باوجود کفارِ مکہ کی غالب اکثریت ایمان نہ لائی

تو آپ ﷺ ان کی گمراہی پر غمزدہ رہتے، مزید برآں بعض روایات میں ہے کہ جب مشرکین نے دیکھا کہ صاحبِ قرآن ﷺ خوب زیادہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور قرآنِ پاک کی تلاوت و دعوت میں جد و جہد کر رہے ہیں تو طعنہ دیتے ہوئے کہنے لگے کہ نزولِ قرآن کے بعد یہ تو اچھی خاصی مصیبت میں پڑ گئے، اس پر حق تعالیٰ نے سورۂ طٰہٰ کی ابتدائی آیات نازل فرمائیں، جن میں ارشاد ہوا:

﴿ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى۝ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى۝﴾ (طٰہٰ:۲-۳)

"میرے محبوب! ہم نے آپ پر قرآن اس لیے تو نہیں اُتارا کہ آپ مشقت میں مبتلا ہو جائیں"۔ کفارِ مکہ اگر تعلیماتِ قرآنی کو قبول نہ کریں تو آپ غمزدہ نہ جائیں، کیوں کہ قرآن سے وہی لوگ نصیحت حاصل کر سکتے ہیں جن کے دل میں اللہ تعالیٰ کا ڈر رہتا ہے۔

(مستفاد از انوار البیان: ۱۹۱/۴-۱۹۲)

حضور پاک ﷺ اس حوالے سے بھی قابلِ رَشک ہیں، حضور ﷺ کے بعد اس کے بہترین مصداق حضرات صحابہؓ ہیں، حضرات صحابہؓ بھی دن رات کے اکثر اوقات قرآنِ کریم کی تلاوت و تعلیم اور اس کے احکام و پیغام کی دعوت و تبلیغ میں مشغول رہتے تھے، چنانچہ ارشادِ باری ہے:

﴿ اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَ يَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ﴾ (الزمر: ۹)

"کیا وہ شخص جو رات کے اوقات سجدے اور قیام کی حالت (عبادت) میں گزارتا ہوا اور آخرت سے ڈرتا ہوا اور اپنے رب سے اُمید بھی رکھتا ہو (اور جو اس کے برعکس ہو برابر ہو سکتے ہیں؟)"

اس میں قیام اللیل، فکرِ آخرت اور اللہ تعالیٰ سے خوف اور رحمت کی اُمید رکھنے والوں کا تذکرہ ہے، مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ حضرات صحابہؓ کے بارے میں نازل

ہوئی، کیوں کہ ان کا حال یہ تھا کہ دن کے علاوہ رات کے اوقات میں بھی وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور قرآنِ پاک کی تلاوت وغیرہ میں مشغول رہتے تھے۔

تفسیر ابن کثیر میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اس آیت کریمہ میں صلحاءِ اُمت کے جو تین اوصاف بیان ہوئے وہ تمام صحابہؓ میں موجود تھے، پھر حضرت عثمانؓ کا حال تو یہ تھا کہ آپ رات کے وقت بکثرت تہجد پڑھتے اور اس میں قرآنِ کریم کی لمبی تلاوت کیا کرتے تھے، یہاں تک کہ کبھی کبھی ایک ہی رات میں پورا قرآن ختم فرما لیتے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر: ۳/۳۱۴)

اور یاد رکھو! ختم قرآن مغفرت، نزولِ رحمت، فرشتوں کی شرکت اور دعا کی قبولیت کا ذریعہ ہے۔

ختم قرآن کے آداب:

اس موقع پر ختم قرآن کے آداب بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) ختم قرآن کے دن روزہ رکھنا مستحب اور مستحسن ہے، بشرطیکہ اس دن روزہ رکھنا شرعاً ممنوع نہ ہو۔

(۲) شب جمعہ کو ختم قرآن اولیٰ ہے۔

(۳) دِن یا رات کے اوّل وقت میں ختم قرآن مستحب ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی روایت میں ہے کہ جس نے شروع دن میں ختم کیا تو شام تک فرشتے اس کے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں، اور جس نے رات میں ختم کیا اس کے لیے صبح تک فرشتے دعا کرتے ہیں، اس بنا پر حضرت عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ موسم سرما میں شروع رات میں اور موسم گرما میں شروع دن میں ختم کرنا مستحب ہے، تا کہ طویل وقت تک فرشتوں کی دعا ملتی رہے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ ختم قرآن اگر نوافل میں پڑھنے کا معمول ہو تو فجر کی سنتوں میں اور شروع رات میں مغرب کی سنت میں بہتر ہے۔

(۴) ختم کے وقت گھر والوں اور احباب کو جمع کرنا بہتر ہے، کیوں کہ یہ دعا کی قبولیت اور نزولِ رحمت کا موقع ہے، جس میں جمع ہونا پسندیدہ ہے۔

ختم کے بعد فوراً شروع کر دینا مستحب ہے، جس کا طریقہ یہ ہے کہ سورۂ ناس پڑھ لینے کے بعد سورۂ فاتحہ اور الٓمٓ سے ﴿هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ تک پڑھ لے۔

حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کا معمول نقل کرتے ہیں کہ

"كَانَ إِذَا قَرَأَ قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ افْتَتَحَ مِنَ الْحَمْدِ، ثُمَّ قَرَأَ مِنَ الْبَقَرَةِ إِلىٰ أُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ، ثُمَّ دَعَا بِدُعَاءِ الْخَتْمَةِ، ثُمَّ قَامَ". (الإتقان فی علوم القرآن)

ختم قرآن کے وقت دعا قبول ہوتی ہے، حضرت عرباض بن ساریہؓ سے مروی ہے:

"مَنْ خَتَمَ الْقُرْآنَ فَلَهٗ دَعْوَةٌ مُسْتَجَابَةٌ". (المعجم الكبير للطبرانی)

''جس نے قرآن ختم کیا اس کی دعا قبول ہوتی ہے۔'' نیز ایک حدیث میں ہے:

"إِنَّ لِصَاحِبِ الْقُرْآنِ عِنْدَ كُلِّ خَتْمٍ دَعْوَةً مُسْتَجَابَةً". (كنز العمال)

''صاحب قرآن کے لیے ہر ختم کے موقع پر دعا قبول ہوتی ہے۔''

ایک حدیث میں ہے:

"مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ، ثُمَّ دَعَا، أَمَّنَ عَلىٰ دُعَائِهٖ أَرْبَعَةُ الْاٰفِ مَلَكٍ". (سنن الدارمی)

''جس شخص نے قرآن پڑھا (اور ختم کیا) پھر دعا کی، تو اس کی دعا پر چار ہزار فرشتے آمین کہتے ہیں۔''

صاحب قرآن ﷺ اور حضرات صحابہؓ کے بعد اس کے بہترین مصداق اُمت کے وہ مخلص علماء اور طلبہ ہیں جو قرآنِ کریم کی تعلیم وتعلم، تدریس وتفہیم اور اس کے احکام وپیغام کی اشاعت وحفاظت میں دِن رات کے اکثر اوقات خلوص کے ساتھ مشغول رہتے ہیں، بلاشبہ

یہ حضرات اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے نزدیک قابل رَشک ہیں، اُنہیں دیکھ کر خوش ہونا چاہیے، ان کی خدمت کو اپنی عین سعادت سمجھنا چاہیے اور ان کی طرح بننے کی تمنا و دعا کرنی چاہیے۔ آج دنیا میں کوئی ان کا مقام سمجھے یا نہ سمجھے، کل قیامت کے دن سب کو سمجھ میں آجائے گا۔

اُمت کے شرفاء واہل اللہ، اہل قرآن ہیں:

صاحبو! اُمت کا ایک بڑا طبقہ وہ بھی ہے جو دن رات کے اکثر اوقات اتباعِ شہوت اور ارتکابِ معصیت میں مبتلا رہتا ہے، جب کہ علماء و طلبہ قرآنِ کریم کی تعلیم و تدریس، اس کی دعوت و تبلیغ اور افہام و تفہیم میں مشغول ہیں، صاحبو! ان کی یہ قرآنی خدمت و مشغولیت بھی قرآن سے تعلق اور محبت کی علامت ہے، اور قرآن سے رغبت و محبت اللہ سے محبت اور تعلق کی دلیل ہے، اس لیے یہی لوگ دراصل قابل رَشک اور اُمت کے شرفاء، صلحاء اور اہل اللہ ہیں، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "أَشْرَافُ أُمَّتِيْ حَمَلَةُ الْقُرْآنِ، وَأَصْحَابُ اللَّيْلِ". (رواه البيهقي، مشكوٰة: ۱۱۰)

"میری امت کے شرفاء قرآن والے اور رات (میں اللہ تعالیٰ کی عبادت و مناجات اور ذکر واذکار و تلاوت میں مشغول رہنے) والے ہیں"۔

ایک اور حدیث میں ہے:

عَنْ أَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِنَّ لِلّٰهِ أَهْلِيْنَ مِنَ النَّاسِ، قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَنْ هُمْ؟ قَالَ: هُمْ أَهْلُ الْقُرْآنِ، أَهْلُ اللّٰهِ وَ خَاصَّتُهٗ". (رواه ابن ماجه: ۱/۱۹/ باب فضل من تعلم القرآن و علّمه)

"لوگوں میں سے بعض لوگ حق تعالیٰ سے اس قدر قریب ہیں جیسے گھر کے لوگ قریب ہوتے ہیں، حضرات صحابہؓ نے عرض کیا: حضور! وہ خوش نصیب جو رب العالمین کے

قریب رہتے ہیں کون ہیں؟ فرمایا: اہل قرآن ہیں۔ (جو دن رات کے اکثر اوقات قرآن پڑھنے پڑھانے، سیکھنے سکھانے، سمجھنے سمجھانے اور اس کی ہدایات و تعلیمات پر عمل کرنے کرانے میں خلوص کے مشغول رہتے ہیں) یہ اہل اللہ اور اللہ تعالیٰ کے خاص لوگ ہیں، دنیا میں بھی یہ لوگ قابل رَشک ہیں، اور آخرت میں تو ضرور لوگ ان پر رَشک کریں گے، کیوں کہ یہ لوگ عرشِ عظیم کے سایہ میں ہوں گے، حدیث پاک میں ہے کہ قیامت میں وہ شخص بھی عرشِ الٰہی کے سایہ میں ہوگا۔

"وَ رَجُلٌ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ فِيْ صِغَرِهٖ وَ هُوَ يَتْلُوْهُ فِيْ كِبَرِهٖ". (شعب الإيمان)

جو بندہ بچپن میں قرآن سیکھ کر بڑی عمر تک اس کی تلاوت کرتا رہا، یعنی زندگی کا بڑا حصہ اور دن کے اکثر اوقات قرآن کی تلاوت اور اس کی کسی بھی طرح کی خدمت میں خلوص کے ساتھ مشغول رہا تو یہ بندہ دارین میں قابل رَشک ہوگا۔ اللّٰھم اجعلنا منھم.

منقول ہے کہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ علومِ قرآنیہ و شرعیہ پر بڑی گہری نظر کے باوجود حافظ قرآن نہ تھے، شاہ جیؒ سے کسی نے اس سلسلے میں سوال کیا تو فرمایا: بچپن میں تو والدین نے اس طرف متوجہ نہ کیا، اب ممکن نہ رہا، اس لیے کہ قرآنِ کریم کی جو آیت پڑھتا ہوں معارفِ قرآن کا ایک طوفان سا اُمنڈ آتا ہے، الفاظ ذہن سے نکل جاتے ہیں اور معانی و مطالب کی وادیوں میں گم ہوجاتا ہوں۔ (تصویر انور: ۶۸، اتحاف الطلبۃ: ۷۹)

ایک قابل رَشک صاحبۂ قرآن عورت کا واقعہ:

اس سلسلہ میں الحمدللہ اُمت کے مردوں سے خواتین بھی کچھ پیچھے نہیں؛ بلکہ پیش پیش رہی ہیں، چنانچہ ایک قابل رَشک صاحبۂ قرآن عورت کا واقعہ مشہور ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے فرمایا کہ سفرِ حج کی کسی منزل پر میں سویا ہوا تھا، میں نے دیکھا کہ ایک سوار میرے قریب آیا، میں نے سلام کیا، اُدھر سے جواب ملا: ﴿سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ﴾ (یٰس: ۵۸) پتہ چلا کہ کوئی عورت ہے جو قرآن کی زبان میں سلام

کا جواب دینا چاہتی ہے، عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ میں نے پوچھا: محترمہ! کہاں سے آرہی ہو؟ عورت نے جواب میں کہا: ﴿وَ أَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ﴾ (البقرة:١٩٦) میں سمجھ گیا کہ حج وعمرہ سے آرہی ہے، میں نے پوچھا: یہاں کیسے؟ عرض کرنے لگیں: ﴿مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلاَ هَادِيَ لَهٗ﴾ (الأعراف:١٨٦) میں سمجھ گیا کہ یہ راستہ بھٹک گئی ہے، میں نے پوچھا کہ کہاں جانا چاہتی ہو؟ عرض کیا: ﴿سُبْحَانَ الَّذِيْٓ أَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصٰى﴾ (إسرائيل:١) میں سمجھ گیا کہ وہ بیت المقدس جانا چاہتی ہے، پھر پوچھا کہ کتنے دِنوں سے راستہ بھٹک گئی ہو؟ کہنے لگیں: ﴿ثَلاَثَ لَيَالٍ سَوِيًّا﴾ (مريم:١٠) مسلسل تین راتوں سے، پوچھا کہ کھانے پینے کا کیا نظم ہے؟ فرمایا: ﴿هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَ يَسْقِيْنِ﴾ (الشعراء:٧٩) کھانا پیش کیا تو عرض کیا: ﴿أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى الَّيْلِ﴾ (البقرة:١٨٧) سمجھ گئے کہ روزہ دار ہے، عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ان کی سواری کی مہار پکڑ لی اور بیت المقدس کی طرف چلنا شروع کر دیا، درمیان میں میں نے ان سے ان کی نجی زندگی کے بارے میں معلوم کرنا چاہا تو کہنے لگیں: ﴿لاَ تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلاً﴾ (بنی إسرائيل:٣٦) میں سمجھ گیا کہ یہ اپنی نجی زندگی کے متعلق بات کرنا نہیں چاہتیں، لہٰذا میں نے دورانِ سفر عربی اشعار پڑھنے شروع کر دیے، کہنے لگیں: ﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ﴾ (المزمل:٢٠) تو میں نے قرآن پڑھنا شروع کیا، حتیٰ کہ ہم قافلہ تک پہنچ گئے، میں نے پوچھا کہ یہاں تمہارا کون ہے؟ عرض کیا کہ ﴿اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ (الكهف:٤٦) میں سمجھ گیا کہ ان کا مال وسامان وغیرہ یہاں ہے، میں نے ان کے بیٹوں کے نام پوچھے، کہنے لگیں: ﴿إِبْرٰهِيْمَ﴾ (النساء:١٢٥) ﴿مُوْسٰى﴾ (النساء:١١٤) ﴿يَا يَحْيٰى﴾ (مريم:١٢) میں سمجھ گیا کہ ان کے تین بیٹے ہیں اور یہ ان کے نام ہیں، جب خیمہ کے دروازہ میں جا کر دستک دی تو اَندر سے تین خوب صورت نوجوان نکلے اور اپنی والدہ کو دیکھ کر نہایت خوش ہوگئے، خیمہ میں داخل ہو کر ماں نے کہا: ﴿فَابْعَثُوْٓا أَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ

هٰذِهٖٓ إِلَى الْمَدِيْنَةِ﴾ (الكهف:١٩) بیٹوں نے فوراً انتظام کیا اور دسترخوان بچھا کر کھانا لگا دیا، کہنے لگیں: ﴿كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا هَنِيْٓئًا﴾ (الحاقة:٢٤) خوش گواری کے ساتھ کھاؤ پیو اُس عمل کے بدلے جو پچھلے دِنوں تم نے کیے۔ میں نے کھانا کھایا، جب فارغ ہو کر جانے لگا تو عرض کیا: ﴿إِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّ كَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا﴾ (الدهر:٢٢) میں نے رُخصت ہوتے وقت بیٹوں سے ان کی والدہ کے احوال دریافت کیے تو اُنہوں نے بتایا کہ الحمدللہ پچھلے چالیس سال سے قرآن کی زبانی بات کرنے کا معمول رہا ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ قیامت میں جب میرا نامۂ اعمال پیش کیا جائے تو قرآن کے علاوہ کوئی بات نہ نکلے، حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے فرمایا: ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾ (الجمعة:٤)

(المستطرف فی کل فن مستظرف: ١/٧٤-٧٦)

مخلص سخی قابلِ رشک ہے:

دوسرا طبقہ وہ مخلص مال دار ہے جو دل دار بھی ہو، جو مصارفِ خیر کے ہر موقع پر حسبِ استطاعت خرچ کرتا رہتا ہو۔ فرمایا:

”وَ رَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ مَالاً، فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ اٰنَاءَ اللَّيْلِ وَ اٰنَاءَ النَّهَارِ“.

جسے اللہ تعالیٰ نے مالِ حلال عطا کیا اور وہ اخلاص کے ساتھ دن رات کے اکثر اوقات کبھی پوشیدہ طور پر اور کبھی علانیہ طور پر حسبِ استطاعت خرچ کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَ النَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلاَنِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ لاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لاَ هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (البقرة:٢٧٤)

”جو لوگ اپنے اموال رات دِن پوشیدہ وعلانیہ طور پر خرچ کرتے رہتے ہیں ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر وثواب ہے، نہ اُنہیں خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔“

اگر یہ کہہ دیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ مذکورہ آیت کریمہ حضرات صحابہؓ کی زندگی کی عملی تصویر ہے، مصارفِ خیر میں خرچ کرنا اُن میں سے ہر اَمیر وغریب کا محبوب مشغلہ اور پسندیدہ عمل تھا۔

چنانچہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ سیدنا صدیق اکبرؓ نے چالیس ہزار دینار مصارفِ خیر میں اس طرح خرچ کیے کہ دس ہزار رات میں، دس ہزار دِن میں، دس ہزار پوشیدہ طور پر اور دس ہزار علانیہ طور پر، اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

اسی طرح کا واقعہ حضرت علیؓ سے متعلق یوں منقول ہے کہ غربت کے زمانہ میں ایک مرتبہ آپ کے پاس صرف چار درہم تھے، جنہیں آپ نے ضرورت مندوں پر اس طرح خرچ فرما دیا کہ ایک درہم رات میں، ایک درہم دن میں، ایک درہم پوشیدہ طور پر اور ایک درہم علانیہ طور پر، اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (تفسیر خزائن العرفان)

یاد رکھو! مانگنے والوں کو دنیا دیتی ہے تو دینے والوں کو خود دنیا کا خالق و مالک عطا کرتا ہے، اس لیے مخلص صاحب قرآن کے علاوہ مخلص سخی بھی قابل رَشک ہے۔

امت کے علماء وقراء کے چار قابل رَشک اوصاف:

یہاں ایک نکتہ قابل غور ہے کہ دونوں کو ایک ساتھ کیوں بیان کیا؟ تو عاجز کے خیالِ ناقص میں یہاں اشارہ اس طرف ہے کہ مخلص صاحب قرآن اور خادم قرآن کو حق تعالیٰ دنیا میں بھی محروم نہیں رکھتے، قرآن کی برکت سے اللہ تعالیٰ اسے مال و دولت بھی عطا فرماتے ہیں۔ حق تعالیٰ قرآنِ کریم کے خادموں کو یا تو اموال عطا فرماتے ہیں یا پھر استغنا، بہر حال قرآن کے خادم مال دار ہوں تب بھی اور مستغنی ہوں تب بھی وہ سخی ضرور ہوتے ہیں، اس لیے ایک مقام پر قرآن نے امت کے علماء، صلحاء اور قراء کے جو چار اوصاف بیان فرمائے ان میں ایک اللہ تعالیٰ کی خشیت: ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ (الفاطر: ۲۸) دوسری خصلت قرآن کریم کی تلاوت: ﴿يَتْلُونَ كِتٰبَ اللّٰهِ﴾ تیسری صفت نماز کی

اقامت: ﴿وَ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ﴾ اور چوتھا وصف سخاوت ہے: ﴿وَ أَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً﴾ (الفاطر: ۲۹) آگے ان کے لیے اجر عظیم کا تذکرہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ امت کے علماء وقراء کے یہ چار بنیادی اوصاف ہیں، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ امت کے وہی علماء وقراء قابل رَشک ہیں جن میں یہ چار اوصاف پائے جائیں۔

مخلص صاحب قرآن اور مخلص سخی پر رَشک کرنے والے بھی محروم نہیں:

حقیقت یہ ہے کہ مخلص صاحب قرآن جو دن رات کے اکثر اوقات تلاوتِ قرآن اور خدمت قرآن میں مشغول ومصروف رہتا ہو اور مخلص سخی جو دِن رات کے اکثر اوقات حسب موقع مصارفِ خیر میں خرچ کرنے کا عادی ہو، یہ حضرات تو قابل رَشک اور عنداللہ مقبول ہیں ہی، لیکن اُن پر رَشک کرنے اور ان جیسے بننے کی طلب اور تمنا کرنے والے بھی اَجر وثواب سے محروم نہیں، کیوں کہ حدیث پاک میں ہے:

"عَبْدٌ رَزَقَهُ اللّٰهُ مَالًا وَ عِلْمًا، فَهُوَ يَتَّقِي فِيهِ رَبَّهُ، وَ يَصِلُ رَحِمَهُ، وَ يَعْمَلُ لِلّٰهِ فِيهِ بِحَقِّهِ، فَهٰذَا بِأَفْضَلِ الْمَنَازِلِ".

ایک شخص تو وہ ہے جسے حق تعالیٰ نے علم اور مال دونوں عطا فرمائے ہوں، یعنی وہ خوش نصیب بندہ صاحب علم ہونے کے سبب قرآن وحدیث کے علوم واحکام سے واقف بھی ہے اور صاحب مال بھی ہے، جس کی وجہ سے یہ صاحب علم وفضل بندہ اپنے مال کو مصارفِ خیر میں خرچ کرنے کا طریقہ جانتا ہے، اور خرچ کرنے کا عادی بھی ہے، نیز وہ مال کے اثراتِ بد سے بھی باخبر ہے اس لیے مال وزر کے متعلق اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، صلہ رحمی کا اہتمام کرتا ہے، اور تمام مالی حقوق کی ادائیگی کا بھی رضاءِ الٰہی کی خاطر اہتمام کرتا ہے تو یہ بندہ بہت

افضل مرتبہ اور مقام کا مالک ہے، لیکن دوسرا شخص یہ ہے:

" عَبْدٌ رَزَقَهُ عِلْمًا، وَ لَمْ يَرْزُقْهُ مَالًا، فَهُوَ صَادِقُ النِّيَّةِ، يَقُوْلُ: لَوْ أَنَّ لِيْ مَالًا لَعَمِلْتُ بِعَمَلِ فُلَانٍ، فَأَجْرُهُمَا سَوَاءٌ". (رواه الترمذی، مشکوٰة : ۴۵۱)

جو بندہ صاحب علم و صاحب قرآن تو ہے، مگر صاحب مال نہیں ہے، یہ صاحب علم و خادم قرآن غریب ہے، جس کی وجہ سے مال کے مصارفِ خیر کو جاننے کے باوجود خرچ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، مگر سچی نیت، تمنا اور طلب ضرور رکھتا ہے، یہ بندہ صاحب علم اور صاحب مال پر رَشک کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میرے پاس بھی اگر مال ہوتا تو میں بھی اس صاحب علم مخلص سخی کی مانند مال کو مصارفِ خیر میں خرچ کرتا، چنانچہ یہ دونوں اجر وثواب کے اعتبار سے برابر ہیں، مطلب یہ ہے کہ اس صاحب علم، خادم قرآن مخلص سخی کو جو اَجر وثواب ملے گا ان پر رَشک کرنے والوں کو بھی اللہ تعالیٰ وہی اَجر وثواب عطا فرمائیں گے۔

معلوم ہوا کہ صاحب قرآن اور مخلص سخی پر رَشک کرنے والے ان شاء اللہ محروم نہیں رہیں گے۔

حق تعالیٰ ہمیں بھی اپنے فضل و کرم سے قابل رَشک لوگوں میں شامل فرمالیں، آمین یارب العالمین۔

۲۸/ رمضان المبارک/ ۱۴۴۰ھ

مطابق: ۳/ جون/ ۲۰۱۹ء

نزیل: مسجد شیخ زکریا، جامعہ سراج العلوم، خانقاہ اُجین

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيْرًا　　فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيْرًا كَثِيْرًا

(۲۵)

بہترین زندگی اور بہترین موت کا قرآنی نسخہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " يُبْعَثُ كُلُّ عَبْدٍ عَلٰى مَا مَاتَ عَلَيْهِ".

(رواه مسلم، مشکوٰة : ۴۵۷ / باب البکاء و الخوف)

ترجمہ : حضرت جابرؓ سے مروی ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر بندے کو اسی حالت میں اُٹھایا جائے گا جس پر اُس کی موت آئی ہے۔ (یعنی ایمان پر موت ہوئی ہو تو ایمان پر اور کفر پر ہوئی ہو تو کفر پر اُٹھایا جائے گا)۔

اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حق:

اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کے ذریعہ بہت سے احکام و پیغام بندوں کو عطا فرمائے ہیں، یوں تو قرآن کی ہر ہر آیت اور ہر ہر حکم و پیغام میں پوری انسانیت کے لیے بہترین رہنمائی موجود ہے، لیکن قرآنِ کریم کی بعض آیات و احکام ایسے بھی ہیں کہ اگر ان کے مطابق انسان زندگی میں اپنا عملی سفر طے کرے تو زندگی اور موت کو بہترین بنا سکتا ہے، منجملہ ان کے ایک مختصر آیت کریمہ وہ ہے جس میں حق تعالیٰ نے اپنے وفادار بندوں کو دو ایسے جامع احکام عطا فرمائے ہیں کہ ان پر عمل کرنے سے انسان دارین میں صلاح و فلاح کا حق دار بن سکتا

ہے، گویا آیت کریمہ میں حق تعالیٰ نے بہترین زندگی اور بہترین موت کا نسخہ بیان فرما دیا، پہلا حکم اور پیغام ہے اللہ تعالیٰ ہی سے ڈرنا، اور دوسرا ہے اسلام ہی پر مرنا، ارشاد ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۝﴾ (آل عمران : ۱۰۲)

’’اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے (ایسا) ڈرا کرو (جیسا) کہ ڈرنے کا حق ہے، اور ہرگز مت مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو‘‘۔

اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حق یہ ہے کہ ہر حال میں، ہر جگہ اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کی نافرمانی، اس کی ناراضی اور اس کی ناشکری سے حتی الامکان بچا جائے، لیکن یہ اس وقت آسان ہوگا جب ہر وقت یہ خیال ہو کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارے تمام احوال و کیفیات کا مکمل علم ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ ہی اس کا حق دار ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔

﴿ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ ﴾ (الأحزاب : ۳۷)

اللہ تعالیٰ کا ڈر بندے کو گناہ سے روکتا ہے:

جب بندہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ ہی سے ڈرے گا تو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کے تین بڑے فائدے ہوں گے، پہلا فائدہ تو یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا جھوٹ، غیبت، سود، رشوت، بغض، عداوت، اتباعِ شہوت اور ظاہری و باطنی گناہوں سے دور اور محفوظ رہے گا، کیوں کہ انسان کو گناہوں سے ہر وقت، ہر حال میں اور ہر جگہ کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس کی پکڑ کا ڈر ہے، اس لیے یہ حقیقت ہے کہ جو جتنا اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا وہ اسی قدر گناہوں سے دور اور محفوظ رہے گا، اور جو بندہ جس قدر گناہوں سے دور اور محفوظ ہوگا وہ اسی قدر خالق و مخلوق کے یہاں محبوب ہوگا، حدیث پاک میں ہے کہ ایک مرتبہ سرکارِ دو عالم ﷺ منبر پر تشریف فرما تھے کہ ایک صحابیؓ نے کھڑے ہو کر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! لوگوں میں سب سے محبوب ترین اور بہترین انسان کون ہے؟ جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا

کہ جس شخص میں پانچ باتیں پائی جائیں وہ لوگوں میں محبوب ترین اور بہترین ہے۔

عَنْ دُرَّةَ بِنْتِ أَبِیْ لَهَبٍ قَالَتْ: ’’ قَامَ رَجُلٌ إِلَی النَّبِيِّ ﷺ، وَ هُوَ عَلَی الْمِنْبَرِ، فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَيُّ النَّاسِ خَيْرٌ؟ فَقَالَ:’’ خَيْرُ النَّاسِ أَقْرَؤُهُمْ وَ أَتْقَاهُمْ لِلّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ، وَ اٰمَرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ أَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ، وَ أَوْصَلُهُمْ لِلرَّحِمِ‘‘.

(مسند أحمد : ۴۳۲/۶، المعجم الكبير للطبراني: ۲۵۸/۲۴، مصنف ابن أبي شيبة : ۷۲/۱۳، درمنثور: ۱۱۰/۶، شعب الإيمان : ۲۲۰/۶)

(۱) جو لوگوں میں سب سے اچھا قرآن پڑھتا ہو، قرآنِ کریم کی عمدہ تلاوت کے لیے محنت شرط ہے، اور محنت قرآنِ پاک سے محبت کے بغیر مشکل ہے، اور قرآن سے محبت اللہ تعالیٰ سے محبت کی علامت ہے، اچھا قرآن پڑھنے والا بندہ لوگوں میں محبوب ترین اور بہترین ہے۔

(۲) لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا خوف رکھنے والا، جو جتنا زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا وہ اسی قدر گناہوں سے دور رہے گا، اور جو بندہ جتنا گناہوں سے دور رہے گا وہ اسی قدر اللہ تعالیٰ سے قریب ہو جائے گا، ارشادِ باری ہے:

﴿ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقٰكُمْ ﴾ (الحجرات : ۱۳)

اور جسے اللہ تعالیٰ کا قرب اور محبت مل جائے تو وہ بندہ لوگوں میں بھی محبوب ترین اور بہترین بن جاتا ہے۔

(۳) لوگوں میں جو بھلائی کی فکر کرتا ہو، بھلائی کی فکر کرنے والے کو حق تعالیٰ عموماً بھلائی کی توفیق عطا فرما ہی دیتے ہیں، اور بھلے آدمی سے ہر کوئی محبت کرتا ہی ہے۔

(۴) جو بندہ لوگوں کو برائی سے روکتا ہو، برائیوں سے روکنا لوگوں کے ساتھ حقیقی اور سچی ہمدردی کے بغیر مشکل ہے، اس لیے لوگوں کو برائی سے روکنے والا شخص بھی لوگوں میں بالآخر محبوب اور بہترین بن جاتا ہے۔

(۵) جو بندہ لوگوں کے ساتھ صلہ رحمی کا معاملہ کرتا ہو، صلہ رحمی کا مطلب یہ ہے کہ

حق تعالیٰ نے پیدائشی طور پر جن خونی رِشتوں سے انسان کو منسلک کیا ہے ان رِشتہ داروں کے ساتھ تعلق جوڑا جائے، صلہ رحمی سے محبت میں، رِزق میں، عمر میں اور تعلق مع اللہ میں اضافہ ہوتا ہے، اس لیے یہ عمل بھی انسان کو لوگوں میں محبوب ترین اور بہترین بنا دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا لوگوں سے بے خوف ہو جاتا ہے:

الغرض آیت کریمہ کے پہلے نسخے پر عمل کرنے کا بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ انسان گناہوں سے دور اور محفوظ رہے گا، جس کے نتیجہ میں وہ خالق ومخلوق کی نظر میں محبوب بن جائے گا، اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہی سے ڈرنے والا مخلوق سے بے خوف اور بے فکر ہو جاتا ہے، نہ کسی سے نفع ونقصان کا اُسے خوف ہوتا ہے اور نہ ہی کسی کا بے جا ڈر، کیوں کہ اللہ رب العزت اس سے ڈرنے والے بندوں کے دلوں سے مخلوق کا ڈر نکال دیتے ہیں، حدیث پاک میں ہے:

عَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الْأَسْقَعِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنِ اتَّقَى اللّٰهَ أَهَابَ اللّٰهُ مِنْهُ كُلَّ شَيْءٍ، وَ مَنْ لَمْ يَتَّقِ اللّٰهَ أَهَابَهُ اللّٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ".

(در منثور: ٦/١١٠، كنز العمال: ٣/٦٠)

''جو بندہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اس سے ہر چیز ڈرتی ہے، اور جو بندہ اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتا اسے ہر چیز ڈراتی ہے۔'' اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کو کسی دشمن، کسی ذمہ دار، کسی منیجر اور کسی افسر وغیرہ سے ڈرنا نہیں پڑتا، بلکہ ان لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ اپنے مقربین وخائفین کا رُعب ڈال دیتا ہے، اور ایسے مقربین بے خوف ہو کر زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

ظلم کے شور سے نہیں ڈرتے — موت کے زور سے نہیں ڈرتے
صرف اللہ سے جو ڈرتے ہیں — وہ کسی اور سے نہیں ڈرتے

اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اس سے قریب ہو جاتا ہے:

تیسرا بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے ڈر کی وجہ سے گناہ سے دور اور محفوظ رہنے والا اللہ تعالیٰ سے، اس کی رحمت سے، اس کی جنت سے قریب اور اس کے عذاب اور جہنم سے محفوظ رہے گا۔ ارشاد ہے:

﴿ وَ أَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى ۝﴾ (النّٰزعٰت : ٤٠-٤١)

اس آیت کریمہ میں گناہ سے حفاظت اور جنت کی بشارت کے لیے خوفِ الٰہی کی قید ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کے ڈر کی وجہ سے گناہ سے دور اور محفوظ رہے گا وہی اللہ تعالیٰ، اس کی رحمت اور جنت سے قریب اور دوزخ سے محفوظ اور دور رہے گا، جب بندہ کے دل میں اللہ تعالیٰ کا ڈر پیدا ہو جاتا ہے تو اس کے لیے بہر حال گناہ سے بچنا آسان ہو جاتا ہے، اسے ہر وقت اللہ تعالیٰ کا دھیان اور یہ خیال رہتا ہے کہ

جو تو کرتا ہے چھپ کر اہل جہاں سے — کوئی دیکھتا ہے تجھے آسماں سے

اللہ تعالیٰ ڈرنے والوں کے لیے دارین میں بہترین زندگی کی خوش خبری:

نیز حق تعالیٰ نے اپنے ڈرنے والوں کے لیے دارین میں بہترین زندگی کی خوشخبری دی ہے:

﴿ وَ لَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْأَرْضِ﴾ (الأعراف : ٩٦)

اس آیت کریمہ میں تقویٰ اختیار کرنے والوں یعنی اللہ تعالیٰ کا دھیان رکھنے اور اسی سے ڈرنے والوں کے لیے دنیا میں خیر وبرکت کی بشارت دی گئی ہے، نیز قرآنِ کریم نے

کامیاب لوگوں کی جو صفات بیان فرمائی ہیں ان میں بنیادی صفت اللہ تعالیٰ کی ناراضی، اس کی نافرمانی اور اس کی پکڑ سے ڈرنا ہے، ارشادِ باری ہے:

﴿ وَ مَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ وَ يَخۡشَ اللّٰهَ وَ يَتَّقۡهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ ﴾ (النور : ۵۲)

چار صفات کامیابی کی علامات:

جو بندہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے، مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے بندوں پر جو احکام فرض اور لازم کیے ہیں ان کی پابندی کرے، جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ، اور اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کی اطاعت کرے، ان کی سنتوں کا اتباع کرے، اور اللہ تعالیٰ ہی سے ڈرے، یعنی ہر وقت ہر حال میں ہر جگہ اللہ تعالیٰ کا خوف اس کے دل میں غالب رہے، خصوصاً جو گناہ پچھلی زندگی میں سرزد ہو چکے ہیں ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے ڈرتا رہے، توبہ کرے اور تقویٰ اختیار کرے۔ تقویٰ عربی زبان میں اجتناب کرنے، بچنے اور ڈرنے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، اس کا ترجمہ ''ڈرنا'' بھی اس مناسبت سے کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے جن چیزوں سے بچنے کا حکم دیا ہے وہ ڈرنے ہی کی ہیں، جیسے کفر و شرک، محرمات و منکرات اور مشتبہات و مکروہات وغیرہ، لہٰذا تقویٰ کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ ساری زندگی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور ناراضی والی تمام چیزوں سے ڈرے اور بچے، اب جو بھی ان چار صفات سے متصف ہو جائے وہ بندہ آخرت میں کامیاب ہوگا۔

﴿فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ﴾ مطلب یہ ہے کہ آخرت میں انہیں دوزخ سے بچا کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا، جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿ فَمَنۡ زُحۡزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدۡخِلَ الۡجَنَّةَ فَقَدۡ فَازَ﴾ (آل عمران : ۱۸۵)

واقعہ یہ ہے کہ اس آیت کریمہ نے تمام کتب قدیمہ کے علوم کو اپنے اندر سمو لیا ہے، جس میں بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے بعد اللہ تعالیٰ سے

ڈرنے اور تقویٰ یعنی اس کی نافرمانی سے بچنے پر کامیابی کی خوشخبری دی گئی ہے۔

اس لیے مولانا جلال الدین رومیؒ نے تقویٰ یعنی اللہ تعالیٰ ہی سے ڈرنے اور گناہوں سے بچنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا

تو چنیں خواہی، خدا خواہد چنیں　　　　می دہد یزداں مرادِ متقیں

اللہ تعالیٰ متقی لوگوں کو اور اپنے سے ڈرنے والوں کو نامراد نہیں فرماتا۔

جیسے جیو گے ویسے مرو گے:

ان حقائق سے ثابت ہوا کہ بہترین زندگی کا پہلا نسخۂ قرآنی ﴿اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ پر عمل کرنا اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حق ادا کرنے کی کوشش کرنا ہے، پھر جو بندہ پہلے نسخے پر عمل کرتے ہوئے زندگی گزارے گا تو اس کے لیے دوسرے نسخے پر عمل کرنا بھی آسان ہو جائے گا، یعنی جو بندہ اللہ تعالیٰ ہی سے ڈرتے ہوئے زندگی گزارے گا وہ اسلام ہی پر مرے گا کیوں کہ ﴿اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ کے ساتھ ہی یہ حکم بھی ہے کہ ﴿وَ لَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ﴾ جس میں یہ اشارہ ہے کہ جو بندہ صرف اللہ تعالیٰ ہی سے ڈرتا ہے وہ اسلام ہی پر مرتا ہے، اسلام ہی پر مرنا اگرچہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اسلام پر چلنا تو ہمارے اختیار میں ہے، عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ جب بندہ وہ کام کرتا ہے جو اس کے اختیار میں ہے تو حق تعالیٰ اسے وہ توفیق دیتا ہے جو بندہ کے اختیار میں نہیں ہے، لہٰذا جب ہم اپنے اختیار سے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اور اسلام پر عمل کرتے ہوئے زندگی گزاریں گے تو حق تعالیٰ اپنے کرم سے ہمیں موت بھی اسلام ہی پر عطا فرمائیں گے، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے، جس میں فرمایا گیا: " كَمَا تَعِيۡشُوۡنَ تَمُوۡتُوۡنَ، وَ كَمَا تَمُوۡتُوۡنَ تُحۡشَرُوۡنَ". (مرقاة : باب إثبات عذاب القبر) یعنی جس حالت پر تم اپنی زندگی گزارو گے اُسی حالت پر تمہاری موت آئے گی، اور جس حالت میں تمہاری موت آئے گی (ایمان یا العیاذ باللہ کفر) اسی حالت میں قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔ اسی کو مذکورہ حدیث میں اس طرح فرمایا کہ "يُبۡعَثُ كُلُّ عَبۡدٍ عَلٰى مَا مَاتَ

عَلَيْهِ." ہر بندے کو اسی حالت پر اُٹھایا جائے گا جس حالت پر اس کی موت آئی ہے، اس میں ایمان اور اعمالِ صالحہ والی زندگی گزارنے والوں کے لیے تو خاتمہ بالایمان یا خاتمہ بالخیر کی بشارت ہے، لیکن بے ایمانی اور گناہوں والی زندگی گزارنے والوں کے لیے خاتمہ بالسوء اور بری موت کی وعید ہے، نیز حدیث میں ہے: "إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيْمِ". (متفق علیہ، مشکوٰۃ: ۲۰) اصل اعتبار انجام اور خاتمہ کا ہے، جیسا خاتمہ ویسا فیصلہ۔

جہاں تک تعلق ہے اُن روایات کا جن میں اس بات کا ذکر ہے کہ بعض بندے ایسے بھی ہوں گے کہ ساری عمر اعمالِ صالحہ میں گزار دی اور آخر میں کوئی ایسا کام کر بیٹھے جس سے سارے اعمال حبط اور برباد ہو گئے، تو یہ ایسے ہی لوگوں کو پیش آ سکتا ہے جن کے عمل میں اخلاص اور استقامت نہ ہو۔ (مستفاد از معارف القرآن: ۱۲۸/۲)

ورنہ اللہ تعالیٰ کی سنت وعادت تو یہی ہے کہ انسان جن حالات میں زندگی گزارتا ہے ان ہی حالات میں اس کی موت بھی آتی ہے۔

حضرت امام ابو یوسفؒ کا واقعہ:

اس سلسلہ میں بطورِ مثال دونوں طرح کا ایک ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے، مشہور ہے کہ حضرت امامنا العلام امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ کے مایۂ ناز شاگرد حضرت امام ابو یوسفؒ جب مرض الوفات میں مبتلا ہوئے تو حضرت ابراہیم بن الجراحؒ عیادت کے لیے آئے، دیکھا تو آپؒ پر غشی اور نیم بے ہوشی طاری تھی، تھوڑی دیر کے بعد جب کچھ طبیعت سنبھلی اور اِفاقہ ہوا تو آنکھیں کھولیں، ابراہیمؒ کو اپنے قریب بیٹھا ہوا دیکھ کر فرمایا: بتایئے! حاجی کے لیے رمی کا افضل طریقہ کونسا ہے؟ پیدل یا سوار ہو کر؟ حضرت ابراہیمؒ نے عرض کیا: پیدل، فرمایا: نہیں، عرض کیا: سوار ہو کر، فرمایا نہیں، پھر خود ہی فرمایا کہ جس رَمی کے بعد کوئی رَمی ہو اسے پیدل کرنا افضل ہے، اور جس رَمی کے بعد کوئی رَمی نہ ہو اسے سوار ہو کر کرنا افضل ہے، اس کے بعد حضرت ابراہیمؒ رُخصت ہو کر دروازہ تک ہی پہنچے تھے کہ حالت نزع میں بھی علمی مسئلہ پر گفتگو کرنے والے یہ عظیم فقیہ وہاں چلے گئے جہاں سب کو جانا ہے، چوں کہ ساری زندگی دینی وعلمی مشغلہ میں گزاری تھی اس لیے موت بھی اسی حالت میں آئی۔ (معارف السنن

:۶/۴۷۴، بحوالہ البحر الرائق، از: تراشے: ۱۰۸)

وَلَدَتْكَ أُمُّكَ يَا ابْنَ آدَمَ بَاكِيًا ... وَ النَّاسُ حَوْلَكَ يَضْحَكُوْنَ سُرُوْرًا
فَاعْمَلْ لِنَفْسِكَ أَنْ تَكُوْنَ إِذَا بَكَوْا ... فِيْ يَوْمِ مَوْتِكَ ضَاحِكًا مَسْرُوْرًا

کہتے ہیں کہ اس وقت کو یاد کرو جب تم پیدا ہوئے تھے تو تم خود رو رہے تھے؛ لیکن تمہارے اقرباء ہنس رہے تھے، اب زندگی ایسی گزار کر جاؤ کہ موت کے وقت تم ہنس رہے ہو اور لوگ رو رہے ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ اسی وقت ہوگا جب کہ بندہ اللہ تعالیٰ ڈرتے ہوئے اس کی رضا والی زندگی جیے گا۔

ایک عبرت ناک واقعہ:

اس کے برخلاف جن بندوں کی زندگی معاصی، فضولیات اور لہویات میں گزرتی ہے عموماً ان کی موت بھی اسی حالت میں آتی ہے، العیاذ باللہ، چنانچہ ابھی پچھلے دِنوں دو نوجوانوں کے متعلق اَخبار میں ایک خبر شائع ہوئی کہ مہاراشٹر کے پربھنی میں دونو جوان ریل کی پٹری پر بیٹھ کر موبائل کی ایک منحوس گیم پب جی کھیلنے میں اس قدر مشغول تھے کہ انہیں ٹرین کے آنے کا بھی احساس نہ ہوا، دونوں اُس گیم کے کھیلنے میں مصروف رہے اور ٹرین انہیں کچل کر چلی گئی۔

سچ ہی ہے کہ "جیسے جیوگے ویسے مروگے"، اور یہ بھی حق ہے کہ "جیسے مروگے ویسے اُٹھائے جاؤگے"، اگر ہم خاتمہ بالخیر والا ایمان چاہتے ہیں تو ایمان اور اعمالِ صالحہ والی زندگی ہمیں گزارنی چاہیے۔

حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں یہ نعمت محض اپنے فضل سے عطا فرما دیں، آمین۔

۱۸/ رمضان المبارک/ ۱۴۴۰ھ
مطابق: ۲۴/ مئی/ ۲۰۱۹ء
(مسجد ہاجرا، سورت، قبل الجمعہ)

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيْرًا ... فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيْرًا كَثِيْرًا

(۲۶)

شرم وحیا کی اہمیت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ عِمۡرَانَ بۡنِ حُصَیۡنٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: " اَلۡحَیَاءُ لَا یَأۡتِیۡ إِلَّا بِخَیۡرٍ". وَ فِیۡ رِوَایَةٍ: " اَلۡحَیَاءُ خَیۡرٌ کُلُّهٗ".

(متفق علیه، مشکوٰة: ٤٣١/ باب الرفق و الحیاء و حسن الخلق)

ترجمہ: حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ شرم وحیا خیر ہی لاتی ہے (شرم وحیا خیر ہی کا باعث بنتی ہے) اور ایک روایت میں ہے کہ شرم وحیا کی تمام صورتیں خیر ہی خیر ہیں۔

شرم وحیا کا مطلب:

اللہ رب العزت نے انسانی فطرت میں جو اوصاف رکھے ہیں ان میں شرم وحیا ایک اہم اور بنیادی وصف ہے، لغوی اعتبار سے شرم وحیا کا مطلب ہے دل میں گناہ سے ہچکچاہٹ کا پیدا ہونا، اور اصطلاح میں شرم وحیا دل کی ایک ایسی کیفیت کو کہتے ہیں کہ جس کی وجہ سے انسان ناپسندیدہ باتوں اور کاموں کو چھوڑ دے، اور کسی بھی نامناسب بات اور کام پر

انسان کو فطری اور قلبی طور پر اَذیت اور تکلیف ہو، یہ وہ وصف ہے جو انسان کو بہت سی بری باتوں اور کاموں سے روکتا ہے اور اچھی باتوں اور کاموں پر آمادہ کرتا ہے، گویا شرم وحیا کو انسان کے کردار وسیرت سازی میں اور انسان میں انسانیت پیدا کرنے میں بڑا دخل ہے، جس میں یہ وصف نہیں وہ صورۃً تو انسان ہے، لیکن حقیقۃً حیوان وشیطان ہے۔

شرم وحیا انسانی خصوصیت ہے:

کیوں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ شرم وحیا انسان کی خاصیت ہے، اللہ تعالیٰ نے شرم و حیا کا جو خاصہ و مادّہ انسان کی فطرت میں ودیعت رکھا ہے وہ دیگر حیوانات میں نہیں رکھا، اسی لیے دیگر حیوانات اپنے جسم کے کسی حصے، کسی فعل یا اپنے جنسی عمل کو چھپانے کا اہتمام نہیں کرتے، جیسا اہتمام وکوشش ایک انسان کرتا ہے، چنانچہ حضرت آدم وحوا علیہا السلام نے جب شجرۂ ممنوعہ کا پھل کھالیا اور اس کے نتیجہ میں دونوں کا ستر عیاں ہوگیا تو فوراً انہوں نے جنت کے پتوں سے اپنے ستر کو ڈھانکنے کی کوشش کی، قرآن پاک میں فرمایا گیا:

﴿ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتۡ لَهُمَا سَوۡاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا یَخۡصِفٰنِ عَلَیۡهِمَا مِنۡ وَّرَقِ الۡجَنَّةِ﴾ (الأعراف: ٢٢)

"جب ان دونوں نے درخت کو چکھا تو ان دونوں کا ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گیا جس کی وجہ سے وہ دونوں مارے شرم وحیا کے جنتی درخت (انجیر، یا زیتون یا کیلے) کے پتوں سے اپنے ستر کو چھپانے لگے"۔

اس سے ثابت ہوا کہ حضرت آدم وحوا علیہا السلام کا اپنے ستر کو چھپانے کا یہ اضطراری عمل دراصل اُسی فطری وطبعی شرم وحیا کا نتیجہ ہے، جسے اللہ رب العزت نے اَزل ہی سے انسان کے خمیر میں رکھ دیا، آج بھی جس انسان کی فطرت مسخ اور ختم نہیں ہوگئی اس میں کسی نہ کسی درجہ میں شرم وحیا کا خاصہ و مادّہ ضرور پایا جاتا ہے، اور موقع بموقع اس کا اِظہار بھی چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے ہوتا رہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ انسان عام طور سے بے شرمی و

بے حیائی کا کھلے عام مظاہرہ نہیں کرتا، نیز بہت سے لوگ شرم وحیا کے خیال سے گناہوں سے دور رہتے ہیں، یا شرما شرمی میں نیکی اور بھلائی کے کام کر لیتے ہیں، اس کے برخلاف بے حیائی و بے شرمی انسان کو مجرم اور گناہوں کا شوقین بنا دیتی ہے۔ غالبًا اسی لیے حدیث مذکورہ میں حضور پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''الحَیَاءُ لَا یَأْتِیْ إِلَّا بِخَیْرٍ'' شرم وحیا خیر و بھلائی کا باعث ہے۔

حیا سے متعلق ایک اشکال اور اس کا جواب:

اس موقع پر سرسری نظر میں یہ شبہ واشکال ہوتا ہے کہ شرم وحیا کی وجہ سے بعض اوقات ایک شخص کو دنیوی اعتبار سے نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے، یا شرم وحیا کی وجہ سے حصولِ علم اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر جیسے دینی کاموں میں وہ ڈھیلا اور کمزور پڑ جاتا ہے، جواب یہ ہے کہ یہ شبہ واشکال دراصل ایک مغالطہ وغلط فہمی پر مبنی ہے، انسان کی طبیعت کی جو کیفیت اس قسم کے کاموں کے انجام دینے میں رُکاوٹ بنتی ہے تو اصل میں وہ حیا ہے ہی نہیں، بلکہ وہ اس آدمی کی ایک فطری وطبعی کمزوری ہے، اگر اسے حیا کہا جاتا ہے تو یہ مجازاً ہے، شرعاً نہیں، کیوں کہ جو چیز سچ اور حق کی راہ میں رُکاوٹ ہو وہ شرعاً حیا نہیں؛ بلکہ بزدلی و کمزوری ہے، رہی بات دنیوی نقصان کی، تو حقیقت یہ ہے کہ شرم وحیا کے نتیجہ میں کبھی کوئی نقصان نہیں ہوتا؛ بلکہ ہمیشہ نفع ہی ہوتا ہے، حتیٰ کہ جن مواقع پر ایک عام آدمی کو عامیانہ نقطۂ نظر سے نقصان کا شبہ ہوتا ہے وہاں بھی اگر ایمانی واسلامی وسیع نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بجائے نقصان کے نفع ہی نظر آئے گا، اور اگر بالفرض دنیوی اعتبار سے کچھ نقصان ہوا بھی تو یہ نقصان اُخروی اعتبار سے نفع کا سبب بنے گا۔

ایک واقعہ:

اس کی تائید حدیث پاک میں مذکور ایک واقعہ سے بھی ہوتی ہے:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ مَرَّ عَلٰى رَجُلٍ مِنَ الْأَنْصَارِ، وَ هُوَ يَعِظُ أَخَاهُ فِي الْحَيَاءِ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "دَعْهُ، فَإِنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الْإِيْمَانِ".

(متفق علیه، مشکوٰۃ : ۴۳۱)

حدیث پاک کا مطلب یہ ہے کہ انصار میں سے ایک صحابیؓ تھے، جن کو اللہ تعالیٰ نے شرم وحیا کا وصف خاص طور پر عطا فرمایا تھا، جس کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ وہ اپنے معاملات میں بہت زیادہ نرم تھے، اور بعض اوقات شرم وحیا کی وجہ سے لوگوں کے ساتھ کھل کر اور گھل مل کر بات نہ کر پاتے، ان کے بھائی ان کی اس عادت وروِش کو پسند نہ کرتے تھے، جس کی وجہ سے ان کے بھائی اس شرم وحیا کے پیکر صحابیؓ کو نصیحت کرتے ہوئے کہنے لگے کہ اس قدر شرم وحیا بھی مناسب نہیں، عین اسی وقت وہاں سے حضور پاک ﷺ کا گزر ہوا، تو آپ ﷺ نے نصیحت کرنے والے بھائی کی بات سن کر فرمایا کہ اپنے شرم وحیا کے پیکر بھائی کو اس کے حال پر چھوڑ دو اور اسے شرم وحیا سے منع نہ کرو، اس کا یہ حال اور وصف بڑا مبارک ہے، کیوں کہ شرم وحیا تو ایمان کی ایک شاخ یا شجرۂ ایمان کا پھل ہے، یہ وصف اہل ایمان میں ہوتا ہے، جو انہیں بہرحال نقصان سے بچاتا ہے۔

شرم وحیا اسلام کا امتیازی وصف ہے:

غرض شرم وحیا انسان کا بنیادی وصف اور شجرۂ ایمان کا پھل ہے، ایک حدیث میں شرم وحیا کو دین اسلام کا امتیازی وصف قرار دیا گیا ہے:

عَنْ زَيْدِ بْنِ طَلْحَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِنَّ لِكُلِّ دِيْنٍ خُلُقًا، وَ خُلُقُ الْإِسْلَامِ الْحَيَاءُ". (ابن ماجه : ۱/۴۱۸، مشکوٰۃ : ۴۳۲)

مطلب یہ ہے کہ ہر (آسمانی) دین ومذہب اور شریعت میں اخلاقِ انسانی کے کسی خاص پہلو پر نسبتہً زیادہ زور دیا جاتا ہے، اور انسانی زندگی میں اسی کو نمایاں اور غالب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم وشریعت میں رحم دلی اور عفو و

درگذر پر بہت زور دیا گیا ہے، یہاں تک کہ مسیحی تعلیمات کا مطالعہ کرنے والے کو صاف محسوس ہوتا ہے کہ رحم دلی اور عفو ودرگذر ہی گویا ان کی شریعت کا مرکزی نقطہ اوران کی تعلیم کی روح ہے، اسی طرح دین اسلام اور شریعت محمدی میں شرم وحیا پر خاص زور دیا گیا ہے۔
(معارف الحدیث:۲/۲۸۶)

ایک حدیث میں تو یہاں تک ارشاد ہے:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: "إِنَّ الْحَيَاءَ وَ الْإِيْمَانَ قُرَنَاءُ جَمِيْعًا، فَإِذَا رُفِعَ أَحَدُهُمَا رُفِعَ الْآخَرُ". (رواه البيهقى فى شعب الإيمان، مشكوٰة : ٤٣٢)

"شرم وحیا اور ایمان باہمی ساتھی ہیں، دونوں ہمیشہ ساتھ اور اکٹھے ہی رہتے ہیں، ان دونوں میں ایسا گہرا تعلق ہے کہ اگر کسی آدمی یا کسی قوم میں سے ان دونوں میں سے ایک اُٹھالیا جائے تو لازمی طور پر دوسرا وصف بھی ختم ہوجاتا ہے۔" یعنی کسی بھی شخص یا جماعت میں شرم وحیا اور ایمان دونوں ہوں گے، یا دونوں میں سے ایک بھی وصف نہ ہوگا، جہاں ایمان ہے وہاں شرم وحیا ہے، اور جہاں شرم وحیا نہیں وہاں ایمان بھی نہیں، بالفاظِ دیگر "جو کامل مسلمان ہوگا وہ بےحیا نہ ہوگا، اور جو بےحیا ہوگا وہ کامل مسلمان نہ ہوگا"۔

شرم وحیا اللہ تعالیٰ اور اس کے پسندیدہ بندوں کا خصوصی وصف:

شرم وحیا کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ شرم وحیا اللہ تعالیٰ اور اس کے پسندیدہ بندوں کا خصوصی وصف ہے، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَبِيْ أَيُّوْبَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "أَرْبَعٌ مِنْ سُنَنِ الْمُرْسَلِيْنَ، الْحَيَاءُ وَ التَّعَطُّرُ، وَ السِّوَاكُ وَ النِّكَاحُ". (رواه الترمذى، مشكوٰة : ٤٤)

حضرت انبیاءِ کرام علیہم السلام کی سنتوں میں سے چار سنتیں بہت زیادہ اہمیت و خصوصیت کی حامل ہیں:

(۱) پہلی سنت شرم وحیا ہے۔ عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ باحیا حضرات انبیاءِ کرام علیہم السلام ہی تھے، ان کے بعد جو شخص جس قدر ان کا مطیع و متبع ہوگا وہ اسی قدر باحیا ہوگا، متقی بندوں کے گناہوں سے دور اور محفوظ رہنے کا ایک بڑا اور ظاہری سبب ان کی شرم وحیا ہے، جو شخص جس قدر اس وصف سے متصف ہوگا وہ اسی قدر گناہوں سے محفوظ ہوگا۔

(۲) دوسری سنت اور خصوصیت خوشبو لگانا ہے، خوشبو ملائکۂ رحمت کے قرب کا سبب ہے، حدیث پاک میں وارد ہے کہ جب کوئی بندہ جھوٹ بولتا ہے تو اس سے ایک باطنی بدبو پھیلتی ہے جس کی وجہ سے محافظ فرشتے دور ہوجاتے ہیں۔ (ترمذی، مشکوٰۃ:۴۱۳) بدبو سے فرشتوں کو نفرت ہے، خود انسان کی فطرت وطبیعت بھی خوشبو کو پسند کرتی ہے، اس سے طہارت میں بھی کمال پیدا ہوتا ہے۔

(۳) تیسری سنت اور خصوصیت مسواک کرنا ہے، یہ منہ کی صفائی اور رب کی خوشنودی کا ذریعہ ہے، اور یہ حقیقت مسلم ہے کہ حضرات انبیاءِ کرام علیہم السلام کی کوئی بھی سنت وعادت نفع سے خالی نہیں ہوتی، چنانچہ مسواک ہی کو دیکھ لیں، ظاہری فائدہ منہ کی صفائی ہے، تو ایمانی واُخروی فائدہ رب کی رضا وخوشنودی ہے، اس کے علاوہ بھی مسواک کے ظاہری وباطنی، دینی ودنیوی فوائد ہیں۔

(۴) چوتھی سنت وخصوصیت نکاح کرنا ہے، نکاح انسانی سماج کی ضرورت ہونے کے ساتھ حضرات انبیاءِ علیہم السلام کی سنت بھی ہے، اس سے زندگی پرسکون گزرتی ہے، بشرطیکہ نکاح کے بعد زوجین آپس میں اداءِ حقوق اور حسن سلوک کا اہتمام کریں۔

بہرحال اس حدیث پاک میں شرم وحیا کو حضرات انبیاءِ کرام علیہم السلام کا خصوصی وصف قرار دیا گیا، نیز قرآنِ کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک واقعہ بیان فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مدین کے کنویں پر دو لڑکیوں کی بکریوں کو پانی پلایا، جس کی وجہ

سے وہ دونوں اپنے گھر معمول سے پہلے پہنچ گئیں، ان کے والد حضرت شعیب علیہ السلام نے جب ان سے خلافِ معمول جلد آنے کا سبب دریافت کیا تو دونوں نے اطلاع دی، حضرت شعیب علیہ السلام نے غائبانہ تعارف سے متاثر ہوکر ان میں سے ایک کو حکم دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کو بلاکر لے آؤ، قرآنِ کریم نے اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ فَجَآءَتۡهُ إِحۡدَىٰهُمَا تَمۡشِي عَلَى ٱسۡتِحۡيَآءٖ قَالَتۡ إِنَّ أَبِي يَدۡعُوكَ لِيَجۡزِيَكَ أَجۡرَ مَا سَقَيۡتَ لَنَا﴾ (قصص: ۲۵)

"اِتنے میں ان دونوں عورتوں میں سے ایک ان کی طرف شرم وحیاء سے چلتی ہوئی آئی، کہنے لگی کہ میرے والد آپ کو بلا رہے ہیں، تاکہ آپ نے ہمارے جانوروں کو جو پانی پلایا ہے اس کی اُجرت اور بدلہ دیں"۔

یہاں قرآنِ کریم میں اس عورت کی شکل وصورت، قد وقامت یا دیگر محاسن کا ذکر نہیں ہے، بلکہ جس صفت کو نمایاں کرکے پیش کیا ہے وہ شرم وحیا ہے، سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اسی وصف کو دیکھ کر دس سال کی طویل خدمت گزاری کے عوض سیدنا شعیب علیہ السلام کی بیٹی کے ساتھ نکاح فرمالیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ شرم وحیا نبیوں کے علاوہ نیک مردوں اور عورتوں کا خصوصی وصف اور طریقہ ہے۔ عاجز کے خیالِ ناقص کے مطابق یہ وصف اگر مردوں کے لیے بہتر ہے تو عورتوں کے لیے بہترین اور بہت قیمتی سرمایہ ہے، نیز شرم وحیا انسانی خصوصیت ہونے کے علاوہ انسانیت کے لیے زینت بھی ہے، باحیا عورت حقیقۃً خوبصورت ہوتی ہے، جب کہ بے حیا عورت ظاہراً خوبصورت کیوں نہ ہو؛ مگر وہ حقیقۃً بدصورت وبدسیرت ہوتی ہے۔

نیز گھر سے نکلنے والی عورتیں دوطرح کی ہوتی ہیں: (۱) باحیا (۲) بے حیا۔ دونوں میں بڑا فرق ہے، باحیا عورت مجبوری میں نکلتی ہے اور شرعی پردے کے ساتھ نکلتی ہے، جب کہ بے حیا عورت بلا مجبوری اور بنا پردے کے بھی نکل پڑتی ہے۔ امت کے مردوں کو شریعت کی

یہ ہدایت ہے کہ جب باحیا عورتیں گھر سے باہر کسی مجبوری کی وجہ سے شرعی پردے کی پابندی کے ساتھ نکلیں تو آپ ان کے ساتھ وہ معاملہ کریں جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا، یعنی نیک نیتی اور حدودِ شرعی میں رہتے ہوئے ان کی مدد کریں، ان کے کام میں آسانی پیدا کریں اور اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿فَسَقَىٰ لَهُمَا ثُمَّ تَوَلَّىٰٓ إِلَى ٱلظِّلِّ﴾ (القصص: ۲۴) یاد رکھیں۔

اور جب بے حیا عورتوں سے واسطہ پڑے تو ان کے ساتھ وہ معاملہ کریں جو سیدنا یوسف علیہ السلام نے کیا، یعنی اپنی نگاہ اور شرم گاہ کی حفاظت کی فکر کریں، کیوں کہ سیدنا یوسف علیہ السلام اسی عفت وعصمت کی بنا پر بلند مقام پر فائز ہوئے، اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو حسن تعامل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے عزت وعظمت عطا فرمائی۔ ہماری خواتین بھی سوچ لیں کہ گھر سے نکلتے وقت وہ بے حیا عورتوں کا کردار ادا کررہی ہیں، یا پھر باحیا اور اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ بندیوں کا۔

حیا عورت کو نیک سیرت بناتی ہے:

اس سلسلے میں ایک واقعہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ سبق پڑھا رہے تھے، اسی درمیان برقعہ میں ایک عورت آئی، اس نے ایک سیب اور چھری امام صاحبؒ کو دے دی، ممکن ہے کہ طلبہ خوش ہوئے ہوں کہ بہت ہی نیک عورت ہے، کہ سیب تو لائی، ساتھ میں چھری بھی لے آئی، تاکہ ہمیں تلاش نہ کرنی پڑے۔

امام اعظمؒ نے سیب کاٹا، اس کے اندر کے حصہ کو باہر نکال کر چھری اور سیب عورت کو واپس کردیا، اب شاگرد امام صاحبؒ کو حدیثیں سنارہے ہیں کہ حضرت! حدیث میں تو آتا ہے کہ ہدیہ قبول کرلینا چاہیے، اور آپ نے تو حدیث کے خلاف عمل کیا، اگر آپ کو ضرورت نہیں تھی تو ہمیں دے دیتے، کہ ہدیہ میں سب شریک ہوتے ہیں۔

امام صاحبؒ نے فرمایا کہ وہ بے چاری مسئلہ پوچھنے آئی تھیں، طلبہ حیران رہ گئے کہ کونسا مسئلہ پوچھ کر گئیں؟ نہ اس نے زبان سے کچھ پوچھا اور نہ ہی آپ نے کچھ بتایا، امام صاحبؒ نے فرمایا کہ سیب کے باہر کئی رنگ ہوتے ہیں، کہیں مٹیالہ ہے، کہیں مہندی کا رنگ

ہے، کہیں سبز ہے، کہیں سرخ ہے، عورت جب ناپاک ہوتی ہے تو خون کئی رنگ بدلتا ہے، وہ یہ مسئلہ پوچھنے آئی تھیں کہ کونسا رنگ ناپاکی کا ہے اور کونسا پاکی کا؟ جس سے پتہ چلے کہ کب نماز شروع کی جائے، تو سیب کے باہر اگرچہ بہت سے رنگ ہوتے ہیں؛ لیکن جب اسے کاٹا جائے تو اندر ایک سفید رنگ ہی ہوتا ہے، اور کوئی رنگ نہیں، تو میں نے کاٹ کر وہ سفید حصہ باہر کر کے اس عورت کو دے دیا، کہ سوائے خالص سفیدی کے سارے رنگ ناپاکی کے ہیں۔

وہ خیر القرون کا زمانہ تھا، اندازہ کرو کہ اس عورت کو بھی اللہ تعالیٰ نے کیسا دماغ دیا تھا کہ اس نے اس انداز سے مسئلہ پوچھا، اور امام اعظمؒ نے بھی کس انداز سے یہ مسئلہ سمجھا دیا۔

(حدیث اور سنت میں فرق، بحوالہ ''منتخب واقعات'')

الغرض! شرم وحیا اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ بندوں کا خصوصی وصف ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ خود حق تعالیٰ نے شرم وحیا کو اپنا وصف قرار دیا ہے، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ سَلْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِنَّ رَبَّكُمْ حَيٌّ كَرِيْمٌ، يَسْتَحْيِيْ مِنْ عَبْدِهٖ إِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ أَنْ يَرُدَّهُمَا صِفْرًا". (رواه الترمذي، مشكوٰة: ۱۹۵)

''بے شک تمہارا رب بہت ہی زیادہ کریم ہے، اسے بندوں سے حیا آتی ہے، خصوصاً جب بندہ اس کے سامنے ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگتا ہے تو اسے خالی ہاتھ لوٹاتے ہوئے اسے حیا آتی ہے۔''

اللہ تعالیٰ اس بات کا سب سے زیادہ حق دار ہے کہ اس سے حیا کی جائے:

صاحبو! جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے شرماتے ہیں تو بندوں پر بھی لازم ہے کہ وہ گناہ کرتے ہوئے اپنے رب سے شرمائیں، گناہ کرتے وقت بندہ سب سے تو شرماتا ہے؛ لیکن اگر رب سے شرمائے تو بالیقین گناہ سے بچنا اس کے لیے آسان ہو جائے، اسی لیے

حدیث پاک میں اس کی ترغیب دی گئی ہے، حضرت سعید بن زید انصاریؓ فرماتے ہیں کہ ایک صحابیؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے نصیحت فرمائیے! تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ سے ایسے حیا کرو جیسے تم اپنی قوم کے کسی نیک بندے سے کرتے ہو۔ (المعجم الكبير للطبراني)

ایک باحیا انسان گناہ کے وقت اپنے ماں باپ اور بڑوں سے شرماتا ہے، ان کی نظروں کے سامنے کوئی نامناسب کام شرم کی وجہ سے نہیں کرتا، جب یہی بات ہے تو تمام بڑوں سے بڑا تو اللہ تعالیٰ ہے، جس کی شان یہ ہے:

جو کرتا ہے تو چھپ کر جہاں سے — کوئی دیکھتا ہے تجھے آسماں سے

﴿أَلَمْ يَعْلَمْ بِأَنَّ اللّٰهَ يَرٰى﴾ (العلق: ۱۴)

اللہ تعالیٰ کی نگاہ سے ہمارا کوئی عمل اور حال پوشیدہ نہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ ہی سب سے زیادہ اس بات کا حق دار ہے کہ اس سے شرم وحیا کی جائے۔

﴿اَللّٰهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشٰهُ﴾ (الأحزاب: ۳۷)

تفسیر قرطبی میں آیت کریمہ ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِيْ﴾ (البقرة: ۲۶) کے تحت امام طبریؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ آیت کریمہ: ﴿اَللّٰهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشٰهُ﴾ میں "تَخْشٰى"، بمعنی "تَسْتَحْيِيْ" ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی سب سے زیادہ حق دار ہے کہ اس سے شرم و حیا کی جائے، اس سے حیا کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اُن کاموں کو چھوڑ دے جو اللہ تعالیٰ کی نظر میں برے ہوں، اور قولاً وعملاً کوئی ایسا کام نہ کرے جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو، جسم کے تمام اعضاء کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کا پابند بنائے، یہی اللہ تعالیٰ سے شرم وحیا کا تقاضا ہے۔

حق حیا اور اس کی فضیلت:

ایک حدیث پاک میں نبی پاک ﷺ نے فرمایا:

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ ذَاتَ يَوْمٍ لِأَصْحَابِهٖ: "اِسْتَحْيُوْا مِنَ اللّٰهِ حَقَّ الْحَيَاءِ، قَالُوْا: إِنَّا نَسْتَحْيِيْ مِنَ اللّٰهِ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ! وَ

الحَمْدُ لِلّٰہِ، قَالَ: لَیْسَ ذٰلِکَ، وَ لٰکِنْ مَنِ اسْتَحْیَا مِنَ اللّٰہِ حَقَّ الحَیَاءِ فَلْیَحْفَظِ الرَّأْسَ وَ مَا وَعیٰ، وَ البَطْنَ وَ مَا حَویٰ، وَ لْتَذْکُرِ المَوْتَ وَ البِلیٰ، وَ مَنْ أَرَادَ الآخِرَۃَ تَرَکَ زِیْنَۃَ الدُّنْیَا، فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِکَ فَقَدِ اسْتَحْیَا مِنَ اللّٰہِ حَقَّ الحَیَاءِ".

(رواہ الترمذی، مشکوٰۃ : ۱۴۰)

''اللہ تعالیٰ سے ایسی حیا کرو جیسی حیا اس سے کرنی چاہیے، مخاطبین صحابہؓ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ ﷺ! الحمدللہ، ہم اللہ تعالیٰ سے شرم وحیا کرتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ نہیں، مطلب یہ ہے کہ شرم وحیا کا مفہوم اِتنا محدود نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ سے حیا کا حق ادا کرو، اب جو بندہ حق حیا ادا کرنا چاہتا ہو تو اسے تین کام کرنے ہوں گے:

(۱) سر اور سر کے اِردگرد جو کچھ ہے جیسے آنکھ، کان اور زبان وغیرہ کی حفاظت کرے، غلط اور باطل خیالات سے اپنے دماغ اور ذہن کو محفوظ رکھے، اپنے آپ کو مثبت سوچ کا عادی بنائے اور منفی سوچ سے بچے، کیوں کہ جن کی سوچ اچھی ہوتی ہے انہیں تو کانٹوں میں بھی پھول اور کنکروں میں بھی ہیرے نظر آجاتے ہیں، لیکن جن کی سوچ ہی غلط ہوتی ہے انہیں پھولوں میں بھی کانٹے اور ہیروں میں کنکر نظر آتے ہیں، اسی طرح غلط چیز دیکھنے سے آنکھوں کی، غلط چیز سننے سے کانوں کی اور غلط بات بولنے سے زبان کی حفاظت کا اہتمام کیا جائے۔

(۲) پیٹ اور جو کچھ اس کے اِردگرد ہے اس کی حفاظت کرے، پیٹ کی حرام غذا اور حرام کاری سے حفاظت کی جائے، پیٹ کے اِردگرد شرمگاہ ہے، اس کی حفاظت کی جائے۔

(۳) موت کو اور موت کے بعد کے احوال یعنی قبر، حشر اور آخرت کو یاد کرے، اور جو بندہ آخرت اور اس کی کامیابی کو اپنا مطمحِ نظر اور مقصد بنائے اسے چاہیے کہ وہ دنیا کے عیش و عشرت کو چھوڑ دے۔ مطلب یہ ہے کہ سارا زور دنیا ہی کی بہتری و بھلائی پر نہ لگائے؛ بلکہ دنیا سے زیادہ آخرت کی بہتری و بھلائی کی فکر کرے، یقین جانو! جو ایسا کرے گا وہی اللہ تعالیٰ سے شرم وحیا کرنے کا حق ادا کرے گا، اس کا یہ عمل اسے جنت میں لے جائے گا۔''

ایک حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: "الحَیَاءُ مِنَ الإِیْمَانِ، وَ الإِیْمَانُ فِی الجَنَّۃِ، وَ البَذَاءُ مِنَ الجَفَاءِ، وَ الجَفَاءُ فِی النَّارِ".

(رواہ أحمد، مشکوٰۃ : ۴۳۱)

''حیا شجرۂ ایمانی کی ایک شاخ اور پھل ہے، اور ایمان کا مقام ومنزل جنت ہے، جب کہ بے حیائی و بے شرمی بدکاری میں سے ہے، اور بدکاری دوزخ میں لے جانے والی چیز ہے۔''

افسوس صد افسوس! آج بعض لوگ اوپن مائنڈ بننے کے چکر میں بے حیا بنتے جا رہے ہیں، جس کے نتیجے میں بے شمار برائیاں وجود میں آرہی ہیں، اس کا انجام بہت خطرناک ہے۔ العیاذ باللہ۔

حق تعالیٰ ہمیں اس ماہِ مبارک اور درمیانی عشرہ میں اعتکاف کی برکت سے حیا کی نعمت سے مالامال فرمائیں۔ آمین۔

۱۴/ رمضان المبارک/ ۱۴۴۰ھ

مطابق: ۲۰/ مئی/ ۲۰۱۹ء/ بروز پیر

واردحال: مسجد ہاجرا، کڑیا کنواں، رامپورا، سورت، گجرات

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِیْرًا فَصَلُّوْا عَلَیْہِ کَثِیْرًا کَثِیْرًا
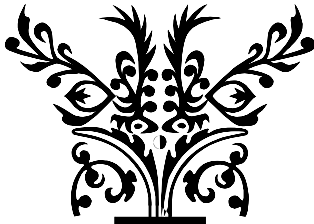
(۲۷)

اعترافِ ذنوب واعترافِ قصور کی اہمیت

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهَا قَالَتۡ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِنَّ الۡعَبۡدَ إِذَا اعۡتَرَفَ، ثُمَّ تَابَ، تَابَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٢٠٣/ باب الاستغفار و التوبة)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ جب بندہ اعترافِ ذنوب (اپنے گناہوں کا اللہ رب العزت کے سامنے اقرار) کرتا ہے، پھر توبہ واستغفار کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالیتا ہے۔

کیوں کہ اللہ پاک کو ایسے بندے بہت پسند ہیں جو اپنے گناہوں کا اقرار کر کے توبہ کرتے ہیں، ارشادِ ربانی ہے:

﴿أَلَمۡ يَعۡلَمُوۡآ أَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقۡبَلُ التَّوۡبَةَ عَنۡ عِبَادِهٖ﴾ (التوبة : ١٠٤)

''کیا ان یہ معلوم نہیں کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے''۔

دو اہم کردار:

اللہ رب العزت نے قرآنِ کریم میں دو نہایت ہی اہم کردار پیش کیے ہیں، ایک کردار حضرت آدم علیہ السلام کا اور دوسرا ابلیس کا، ابلیس کا پرانا نام ''عزازیل'' تھا، جب وہ

حکم الٰہی کے خلاف اَنانیت وبغاوت کر کے ملعون ہوگیا تو اس کا نام ''اِبلیس'' رکھا گیا اور اسی کو ''شیطان'' بھی کہا جانے لگا، ''شیطان'' کے معنیٰ ہیں بہت زیادہ شریر۔ (مستفاد از: انوار البیان)

حضرت آدم علیہ السلام کے کردار میں تو اعترافِ حقیقت، اپنی غلطی کا اقرار، اور عاجزی وانکسار کا اِظہار ہے، جب کہ اِبلیس کے کردار میں انکارِ حقیقت اور اظہارِ بڑائی وخود پسندی ہے، جس کی وجہ سے خسران ونقصان کے اسباب کو اپنے بجائے دوسروں میں تلاش کرنے کی کوشش ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ غلطی اِبلیس سے بھی ہوئی، اور (اجتہادی وفکری غلطی) حضرت آدم علیہ السلام سے بھی ہوئی، حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرما کر حقائق وخواص کا علم عطا فرمایا، پھر ملائکہ کے اس گروہ کو جس میں اِبلیس شامل تھا حکم فرمایا کہ آدم کو میرے حکم کی وجہ سے سجدۂ تعظیمی کرو، تو قرآن کہتا ہے کہ حکم الٰہی کی تعمیل میں تمام فرشتوں نے تو سجدہ کیا؛ مگر اِبلیس انکار کر کے کافر ہوگیا۔

﴿فَسَجَدُوۡآ إِلَّآ إِبۡلِيۡسَ أَبٰى وَ اسۡتَكۡبَرَ وَ كَانَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ﴾ (البقرة : ٣٤)

یہ اس کی غلطی تھی، باری تعالیٰ نے جب اس سے غلطی وحکم عدولی کے بارے میں سوال کیا تو اس ملعون نے اعترافِ حقیقت سے پہلو تہی کرتے ہوئے اُلٹا خود حق تعالیٰ کو قصوروار قرار دینے کی جسارت کردی، قرآن کہتا ہے:

﴿قَالَ مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسۡجُدَ إِذۡ أَمَرۡتُكَ ۖ قَالَ أَنَا خَيۡرٌ مِّنۡهُ ۚ خَلَقۡتَنِيۡ مِنۡ نَّارٍ وَّ خَلَقۡتَهٗ مِنۡ طِيۡنٍ﴾ (الأعراف : ١٢٧)

اس نے کہا کہ میں آدم سے بہتر ہوں، کیوں کہ مجھے آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور اسے خاک سے، اس لیے آدم کو سجدہ کرنا میری تحقیر وتوہین ہے اور گویا میرے ساتھ نااِنصافی ہے، حالانکہ اسے یہ یقین رکھنا چاہیے تھا کہ تمام مخلوقات کا خالق ومالک اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جس کے لیے جو مرتبہ ودرجہ متعین کر دیا وہی اس کا صحیح اور اصل مقام ہے، نیز

فضیلت کا معیار یہ نہیں ہے کہ کون کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے، یا کون کس نسل سے تعلق رکھتا ہے، بلکہ فضیلت کا اصل معیار تقویٰ اور حکم الٰہی کی پیروی ہے۔

یہ کردار ابلیس کا ہے، جس میں اَنانیت، حکم الٰہی کے خلاف بغاوت، انکارِ حقیقت، اظہارِ بڑائی، خود بینی وخود پسندی ہے، ایسا شخص عموماً اپنی ناکامی ومحرومی کے اسباب دوسروں میں تلاش کرتا ہے، چنانچہ شیطان نے بھی یہی کیا، اس نے اپنی محرومی کا ذمہ دار دوسروں کو قرار دیا، اس کے برخلاف حضرت آدم علیہ السلام کا حال یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے انہیں خاص اعزاز واکرام سے نواز کر جنت میں جگہ عطا فرمائی تو وہاں ہر چیز کی آزادی تھی، سوائے شجرۂ ممنوعہ کے، قرآن نے کہا:

﴿وَ قُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَاص وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ○﴾ (البقرة : ۳۵)

لیکن شیطان حضرت آدم وحوا علیہما السلام کو وسوسہ کے ذریعہ بہکانے اور پھسلانے میں کامیاب ہوگیا اور بہ تقاضائے حکمت الٰہی حضرت آدم علیہ السلام سے بھی اجتہادی خطا ہو گئی تو آپ نے فوراً اللہ رب العزت کی بارگاہ میں سربہ سجود ہو کر اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور مغفرت طلب کرتے ہوئے عرض کیا:

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا سکتہ وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ (الأعراف : ۲۳)

”اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر آپ نے ہماری مغفرت نہ فرمائی اور رحم نہ فرمایا تو ہم ضرور بالضرور خسارہ اُٹھانے والوں میں سے ہوجائیں گے۔“

یہ کردار حضرت آدم علیہ السلام کا ہے، جس میں اعترافِ حقیقت، اپنی غلطی کا اقرار، عاجزی اور انکسار کا اظہار ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کی غلطی میں پانچ فرق:

غلطی دونوں سے ہوئی، لیکن عاجز کے خیالِ ناقص کے مطابق دونوں کی غلطیوں میں پانچ فرق پائے جاتے ہیں:

(۱) حضرت آدم علیہ السلام نے غلطی کے بعد فوراً اعتراف اور اقرار کیا، جب کہ شیطان نے اپنی غلطی کا انکار کر دیا۔ اور حق تعالیٰ کو اپنے غلطی اور گناہ کا اقرار کرنے والے بندے پسند ہیں۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ﴾ (البقرة : ۲۲۲)

نیز حدیث مذکورہ میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ اپنی غلطی اور گناہ کا انکار کرنے والے اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہیں۔

(۲) حضرت آدم علیہ السلام اپنی غلطی پر پچھتائے، جب کہ شیطان اپنی غلطی پر اِترایا۔ اللہ رب العزت کو غلطی اور گناہ کر کے شرمانے اور پچھتانے والا گنہگار بندہ پسند ہے، لیکن اِترانے والا عبادت گزار پسند نہیں۔ گناہ اور غلطی کا صدور کسی بھی انسان سے ممکن ہے، اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، البتہ کسی بھی انسان کا اعترافِ ذنوب واعترافِ قصور نہ کرنا تعجب کی بات ہے، کہ اس سے انسان شیطان کے زمرہ میں داخل ہوجاتا ہے۔

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

خطا جس سے نہیں ہوتی اسے رحمٰن کہتے ہیں
خطا کر کے جو پچھتائے اسے انسان کہتے ہیں
خطا پر جو خطا کرے اُسے حیوان کہتے ہیں
خطا کر کے جو اِترائے اُسے شیطان کہتے ہیں

(۳) حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی غلطی کا ذمہ دار وقصوروار اپنے آپ کو ٹھہرایا، چنانچہ اللہ تعالیٰ سے عرض کیا:

﴿ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ أَنْفُسَنَا وَ إِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۝﴾ (الأعراف : ۳۲)

جب کہ شیطان نے اپنی غلطی کا ذمہ دار اور قصوروار دوسرے کو ٹھہرایا۔ اللہ پاک اصلاح و توبہ کی توفیق ان ہی لوگوں کو عطا فرماتے ہیں جنہیں اپنی غلطی اور گناہ کا احساس ہوتا ہے، اور جنہیں اپنی غلطی اور گناہ کا احساس ہی نہیں ہوتا عموماً وہ لوگ اپنی اصلاح اور توبہ سے محروم رہ جاتے ہیں۔

(۴) حضرت آدم علیہ السلام سے غلطی نفس کے ورغلانے سے ہوئی، جب کہ شیطان سے غلطی اس کے کبر اور بڑائی کی وجہ سے ہوئی۔ شیطان نے کہا:

﴿ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ۝﴾ (الأعراف : ۱۲)

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ جو گناہ ہوائے نفس کی وجہ سے ہو اس کی بخشش کی توقع ہے، لیکن جو گناہ تکبر کے سبب ہو اس کی بخشش کی توقع بہت کم ہے، اس لیے کہ اس میں عموماً توبہ کی توفیق ہی سلب ہو جاتی ہے۔

(۵) حضرت آدم علیہ السلام غلطی صادر ہو جانے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس اور نااُمید نہیں ہوئے، جب کہ شیطان نااُمید ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مردِ مؤمن نااُمید نہیں ہوتا، بے ایمان شخص ہی نااُمید ہو سکتا ہے، ارشادِ باری ہے:

﴿ إِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ۝﴾ (یوسف : ۸۷)

دُنیا کا ہر انسان دو میں سے ایک کردار ادا کرتا ہے:

یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآنِ کریم میں حق تعالیٰ نے جو دو کردار پیش کیے وہ صرف حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں، بلکہ دُنیا کا ہر انسان ان دو میں سے کوئی ایک کردار ادا کرتا ہے، جس شخص میں جس قدر اللہ تعالیٰ کی محبت اور واقعی انسانیت ہوگی وہ حقیقتوں کے اعتراف میں اسی قدر وسیع الظرف ہوگا، اظہارِ عاجزی وانکسار اس کے

ایک ایک عمل و ادا سے نمایاں ہوگا، وہ دوسروں کے بجائے اپنے آپ میں غلطی تلاش کرنے کا عادی ہوگا، پھر اپنی غلطیوں کی تاویل و توجیہ کے بجائے سیدھے سادے طریقہ پر ان کا اعتراف و اقرار کر کے معافی و اصلاح کا طلب گار ہوگا، اور اس کے نتیجہ میں وہ بندہ خالق و مخلوق تمام کی نظر میں محبوب بن جائے گا، اس کے برخلاف جس شخص میں جس قدر انسانیت کا عنصر کم ہوگا وہ شیطانی مزاج و عادت سے اسی قدر قریب ہوگا، اس میں انکارِ حقیقت اور اَنانیت کا جذبہ بھی اِتنا ہی زیادہ ہوگا، جس کی وجہ سے وہ بندہ اپنی غلطیوں کے اعتراف اور زیادتیوں کے اقرار و اصلاح سے محروم رہے گا، وہ ہمیشہ اپنی ناکامی اور محرومی کا ذمہ دار و قصوروار دوسروں کو ہی قرار دے گا، اظہارِ بڑائی اور خود بینی اس کے ہر قول و عمل سے ظاہر ہوگی، نتیجۃً ایسا بندہ خالق و مخلوق کی نظر میں مبغوض بن جائے گا۔ العیاذ باللہ العظیم۔

اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کا کردار:

یاد رکھو کہ ان دو کردار میں سے جو کردار حضرت آدم علیہ السلام کا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اعترافِ ذنوب اور بندوں کے سامنے اعترافِ قصور اور اس کے ساتھ اظہارِ عاجزی وانکسار ہے یہ دراصل اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کا کردار ہے، چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کے علاوہ حضرت یونس علیہ السلام سے بھی جب اجتہادی غلطی ہوئی تو آپ نے بھی اعتراف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کی، قرآنِ کریم ان کا قول نقل کرتا ہے:

﴿ لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ إِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۝﴾ (الأنبياء : ۸۷)

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہِ طور سے واپسی پر اپنی قوم کو بچھڑے کی عبادت میں مبتلا پا کر اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو حمیتِ ایمانی کے جوش میں تنبیہ فرمائی اور بعد میں حضرت ہارون علیہ السلام کی مجبوری و عذر سن کر انہیں اپنی اجتہادی غلطی کا احساس ہوا، تو اعتراف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا:

﴿ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَ لِأَخِيْ وَ أَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ۖ وَ أَنْتَ أَرْحَمُ

الرَّحِمِيۡنَ۝﴾ (الأعراف : ۱۵۱)

نیز رحمت عالم ﷺ نے نماز کے اخیر میں جو دعا پڑھی جاتی ہے: ”اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ......الخ“ (مشکوٰۃ : ۸۷) اس میں صراحت سے اپنے قصور کا اقرار و اعتراف فرمایا ہے، حالاں کہ آپ کو مغفرت کا سرٹیفکیٹ آسمان سے ملا تھا۔

مرشدی حضرت شیخ الزماں مولانا محمد قمر الزماں صاحب الہ آبادی مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور اکرم ﷺ تک تمام انبیاء علیہم السلام نے باوجود گناہوں سے معصوم ہونے کے جب کبھی ان سے منصب نبوت کے بلند مقام کے اعتبار سے کوئی غیر افضل کام صادر ہوگیا یا کوئی اجتہادی خطا ولغزش ہوگئی (جو قانونِ شرع میں گناہ نہیں ہے) تو انہوں نے اس کو ذنب و گناہ تصور کرتے ہوئے رو رو کر گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار فرمایا ہے۔ (اعترافِ ذنوب:۳۲)

اس سے ثابت ہوا کہ اعترافِ ذنوب مع اعترافِ قصور اللہ تعالیٰ کے محبوب اور مقبول بندوں کا کردار ہے، اسی لیے حضور ﷺ نے اپنے قول وعمل اور مسنون دعاؤں کے ذریعہ امت کو اس بات کی ترغیب دی کہ حقوق اللہ میں ہونے والی کمی وکوتاہی پر اعترافِ ذنوب اور حقوق العباد میں ہونے والی کمی وکوتاہی پر اعترافِ قصور کے بعد توبہ، تلافی اور اظہارِ عاجزی وبندگی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی خوشنودی حاصل کی جائے۔

حضراتِ صحابہؓ کا اعترافِ ذنوب مع اعترافِ قصور:

یہی وجہ ہے کہ حضراتِ صحابہؓ میں سے جب کسی سے کوئی کوتاہی، غلطی یا گناہ ہوگیا تو فوراً اعتراف کر کے مغفرت ومعافی کے طلب گار ہوئے، چنانچہ اعترافِ ذنوب اور اعترافِ قصور دونوں کی مثالیں پیش کی جارہی ہیں:

(۱) مشہور واقعہ ہے کہ غزوۂ تبوک کے لیے جب رحمت عالم ﷺ کی طرف سے

اعلان ہوا اور مسلمانوں کو جہاد کے لیے چلنے کا حکم ہوا تو زمانہ سخت گرمی کا تھا، مسافت دور دراز کی تھی اور ایک باقاعدہ حکومت کی تربیت یافتہ فوج سے مقابلہ تھا، جو اسلام کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا، یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے اس حکم کے متعلق لوگوں کے حالات مختلف ہوگئے اور منافقین کے علاوہ حضرات صحابہؓ کی چار قسمیں ہوگئیں۔

ایک قسم تو ان حضرات کی تھی جو اوّل حکم سنتے ہی بلا تردّد جہاد کے لیے تیار ہوگئے۔

دوسری قسم ان لوگوں کی تھی جو ابتداءً کچھ تردّد میں رہے، پھر ساتھ ہوگئے، اِس آیت قرآنی میں ان ہی کا ذکر ہے:

﴿اَلَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡهُ فِىۡ سَاعَةِ الۡعُسۡرَةِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا كَادَ يَزِيۡغُ قُلُوۡبُ فَرِيۡقٍ مِّنۡهُمۡ﴾ (التوبة : ۱۱۷)

تیسری قسم ان حضرات کی تھی جو واقعی معذور تھے، اس لیے نہ جاسکے، ان کا ذکر اس آیت کریمہ میں ہے:

﴿لَيۡسَ عَلَى الۡاَعۡمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الۡاَعۡرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الۡمَرِيۡضِ حَرَجٌ﴾ (النور : ۶۱)

چوتھی قسم ان مؤمنین مخلصین کی تھی جو عذر نہ ہونے کے باوجود محض سستی وکوتاہی کے سبب جہاد میں شریک نہیں ہوئے، حضرت ابن عباسؓ کے قول کے مطابق ایسے دس صحابہؓ تھے جو بلا کسی صحیح عذر کے محض سستی اور کوتاہی کی وجہ سے غزوۂ تبوک میں شریک نہیں ہوئے تھے، پھر ان حضرات کو اپنی اس کوتاہی، غلطی اور گناہ پر بے حد افسوس ہوا، انہوں نے اپنے گناہ کا اعتراف کرتے ہوئے توبہ کا عجیب وغریب طریقہ اختیار کیا کہ ان میں سے سات صحابہؓ نے اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستونوں سے باندھ لیا اور یہ عہد کرلیا کہ جب تک ہماری توبہ قبول ہونے کے بعد خود رسول اللہ ﷺ ہمیں نہیں کھولیں گے ہم اسی طرح بندھے ہوئے قیدی رہیں گے، ان حضرات میں حضرت ابولبابہؓ کے نام پر سب روایتیں متفق ہیں، دوسرے

حضرات کے اسماء میں مختلف روایتیں ہیں، رحمت عالم ﷺ نے جب انہیں بندھا ہوا دیکھا اور معلوم ہوا کہ انہوں نے یہ عہد بھی کیا ہے کہ جب تک حضور ﷺ ان کو نہیں کھولیں گے اس وقت تک بندھے رہیں گے تو آپ ﷺ نے بھی قسم کھائی کہ میں اس وقت تک انہیں نہیں کھولوں گا جب تک کہ اللہ تعالیٰ مجھے حکم نہیں دے گا، چوں کہ ان حضرات نے صدق دل سے اعترافِ ذنوب کیا تھا اس لیے حق تعالیٰ نے بھی اُن کی توبہ قبول فرما کر یہ آیت کریمہ نازل فرمائی:

﴿ وَ اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۝﴾ (التوبة : ۱۰۲)

’’اور کچھ لوگ ہیں (جنھوں نے اعترافِ ذنوب کیا) جو اپنی خطا کے اقراری ہیں، جنھوں نے ملے جلے عمل کیے تھے، کچھ بھلے اور کچھ برے، عنقریب اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائے گا (چنانچہ ان کی توبہ قبول بھی ہوگئی) بلاشبہ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔‘‘

آیت کریمہ کے نازل ہونے کے بعد حضور ﷺ نے ان کے کھولنے کا حکم فرمایا اور وہ کھول دیے گئے۔ (قرطبی)

حضرت سعید بن مسیّبؒ کی روایت میں ہے کہ جب حضرت ابولبابہؓ کے کھولنے کا ارادہ کیا گیا تو انہوں نے انکار کیا اور کہا کہ جب تک خود حضور ﷺ راضی ہو کر مجھے اپنے ہاتھ سے نہ کھولیں گے میں بندھا رہوں گا، چنانچہ صبح کی نماز میں جب آپ ﷺ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے ان کو کھولا۔ (مستفاد از: معارف القرآن: ۴/۴۵۳)

(۲) نیز کتب احادیث میں حضرت ماعز بن مالک اسلمیؓ کا واقعہ ہے کہ ازراہِ بشریت ان سے برائی کا صدور ہو گیا، حالانکہ ان کی برائی اور غلطی کو کسی آنکھ نے نہیں دیکھا اور نہ ہی اس پر کسی زبان نے انہیں ٹوکا، نہ کسی مدعی نے ان کے خلاف بارگاہِ نبوی میں دعویٰ کیا،

لیکن احساسِ گناہ نے زندہ ایمان والے ضمیر کو ایسا تڑپایا کہ از خود دربارِ نبوی میں آ کر یہ جانتے ہوئے کہ اس جرم کی سزا نہایت ہی سخت اور عبرت انگیز ہے، اعترافِ ذنب کیا تو حدیث پاک میں وارد ہے کہ آپ ﷺ نے بار بار اپنا چہرہ پھیر لیا اور ایسا انداز اور عنوان اختیار فرمایا کہ ان کو اپنے اعتراف کی تعبیر و توجیہ اور انکار کا موقع میسر آ جائے، لیکن وہ بار بار اپنے جرم کا اعتراف کر کے شرعی حد نافذ کرنے کا تقاضا کرتے رہے، تب آپ ﷺ نے ان پر شرعی حد نافذ فرمائی، اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا:

’’لَقَدْ تَابَ تَوْبَةً لَوْ قُسِمَتْ بَيْنَ أُمَّةٍ لَوَسِعَتْهُمْ‘‘. (رواه مسلم، مشكوٰة: ۳۱۰، كتاب الحدود)

حضرت ماعزؓ نے اعترافِ جرم کے بعد ایسی توبہ کی کہ اگر ساری امت پر اسے تقسیم کر دیا جائے تو وہ سب کے لیے کافی ہو جائے۔

(۳) حضرت عمرؓ کے متعلق منقول ہے کہ ایک مرتبہ آپ حضرت ابن مسعودؓ کے ساتھ رات کے وقت گشت کر رہے تھے، اس دوران آپ نے ایک دروازہ کے سوراخ سے جھانکا تو ایک بوڑھے کو دیکھا جس کے سامنے شراب اور گانے والی لڑکیاں تھیں، آپ نے جب بوڑھے کو شراب و کباب میں مشغول پایا تو دینی حمیت کے جوش میں دیوار پھلانگ کر بوڑھے کے پاس گئے اور اسے ملامت کی، وہ گھبرا کر کہنے لگا: حضرت! میرے متعلق فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کریں، ذرا بات سن لیں، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ کہو! کیا کہتے ہو؟ تو بوڑھے نے کہا کہ حضرت! اگر میں نے دو باتوں میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ہے تو آپ نے تین باتوں میں کی، حضرت عمرؓ نے تعجب سے فرمایا: وہ تین باتیں کون کونسی ہیں؟ اس نے کہا کہ پہلی بات یہ کہ آپ نے تجسس سے کام لیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے: ﴿وَلَا تَجَسَّسُوْا﴾ (الحجرات: ۱۲) دوسری بات یہ کہ آپ گھر میں بغیر اجازت کے تشریف لائے، حالانکہ باری تعالیٰ نے اس سے بھی منع فرمایا ہے:

﴿ لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا ﴾ (النور : ۲۷)

تیسری بات یہ کہ اِجازت کے بعد گھر کے دروازے سے داخل ہونے کا حکم ہے:

﴿ وَ اْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ أَبْوَابِهَا ﴾ (البقرة : ١٨٩)

آپ نے اس حکم کے بھی خلاف کیا۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم نے سچ کہا ہے، پھر آپ نے اعترافِ قصور کے ساتھ اس بوڑھے سے معافی طلب کی اور فرمایا کہ میں ان تین باتوں کی وجہ سے تمہاری دو باتیں معاف کرتا ہوں۔ (مستفاد از: اعترافِ قصور)

اس شخص پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ اس نے اپنی خراب عادتوں سے توبہ کر لی۔ (راہِ عمل: ۲۹۲)

اعترافِ ذنوب پر مغفرت کی بشارت:

ان حقائق سے معلوم ہوا کہ اعترافِ ذنوب مع اعترافِ قصور حضرات صحابہؓ وصلحاء جو اللہ تعالیٰ کے مقرب اور محبوب بندے ہیں ان کا کردار اور طریقہ رہا ہے، حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھیؒ کے بقول ان کا حال یہ تھا کہ

کبھی طاعتوں کا سرور ہے، کبھی اعترافِ قصور ہے
ہے ملک کو جس کی نہیں خبر، وہ حضور میرا حضور ہے

قرآنِ پاک میں حق تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے مغفرت کی بشارت دی ہے جو اعترافِ ذنوب مع اعترافِ قصور اور توبہ وتلافی کی فکر کرتے ہیں، چنانچہ آیت کریمہ: ﴿ وَ اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ ﴾ (التوبة: ١٠٢) کے تحت حضرات علماءِ مفسرین نے فرمایا کہ اگرچہ یہ آیت ایک خاص جماعت کے بارے میں نازل ہوئی ہے، مگر حکم عام ہے، قیامت تک کے ان مسلمانوں کے لیے جن کے نیک و بد اعمال ملے جلے ہوں اگر وہ اعترافِ ذنوب اور توبہ وتلافی کی فکر کریں، اپنے گناہوں سے تائب ہو جائیں تو ان کے لیے معافی کی اُمید ہے۔ اس کی تائید بخاری میں حضرت سمرہ بن جندبؓ کی معراجِ نبوی والی تفصیلی روایت سے بھی ہوتی ہے کہ ساتویں آسمان پر جب رحمت عالم ﷺ کی ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی تو ان کے پاس آپ ﷺ نے کچھ لوگوں کو دیکھا جن میں سے بعض کے

چہرے تو سفید تھے اور بعض کے چہروں میں کچھ داغ تھے، یہ دوسری قسم کے لوگ ایک نہر میں داخل ہوئے اور غسل کیا تو ان کے چہرے بالکل صاف ہو گئے، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو بتایا کہ یہ سفید چہرے والے لوگ وہ ہیں جو ایمان لے آئے اور گناہوں سے پاک وصاف رہے، گویا یہ لوگ آیت کریمہ: ﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ﴾ (الأنعام:٨٢) کے مصداق ہیں، اور دوسرے وہ لوگ ہیں جنہوں نے ملے جلے یعنی اچھے اور برے عمل کیے، پھر اعترافِ ذنوب مع اعترافِ قصور کے بعد توبہ وتلافی کر لی، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمالی اور ان کے گناہ معاف ہو گئے۔ (قرطبی، معارف القرآن: ۴/۴۵۵)

خلاصہ:

خلاصہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں حق تعالیٰ نے دو کردار بیان فرمائے ہیں، ایک کردار ابلیس کا، جس میں انکارِ حقیقت اور اظہارِ بڑائی وخود بینی ہے، جب کہ دوسرا کردار حضرت آدم علیہ السلام کا ہے، جس میں اعترافِ حقیقت یعنی اعترافِ ذنوب مع اعترافِ قصور اور عاجزی وانکسار کا اظہار ہے، اور دنیا کا ہر انسان ان دونوں میں سے ایک کردار ضرور ادا کرتا ہے، البتہ اللہ تعالیٰ کے محبوب اور مقرب بندوں کا کردار اعترافِ ذنوب مع اعترافِ قصور ہے، اور دونوں کردار ادا کرنے والوں کے طریقے اور منزلیں الگ الگ ہیں، جو لوگ ابلیس کا کردار ادا کرتے ہیں ان کی منزل جہنم ہے (العیاذ باللہ العظیم) اور جو لوگ حضرت آدم علیہ السلام کا کردار ادا کرتے ہیں ان کی منزل جنت ہے، کیوں کہ حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ ظالم و جابر اور متکبر لوگوں کی منزل جہنم ہے، جب کہ مسکین اور متواضع لوگوں کی منزل جنت ہے، حدیث قدسی ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "تَحَاجَّتِ الْجَنَّةُ وَ النَّارُ، فَقَالَتِ النَّارُ: "أُوْثِرْتُ بِالْمُتَكَبِّرِيْنَ وَ الْمُتَجَبِّرِيْنَ، وَ قَالَتِ الْجَنَّةُ: "فَمَا لِيْ، لَا يَدْخُلُنِيْ إِلَّا ضُعَفَاءُ النَّاسِ وَ سَقَطُهُمْ"، قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى لِلْجَنَّةِ: "أَنْتِ

رَحْمَتِیْ، أَرْحَمُ بِكِ مَنْ أَشَاءُ مِنْ عِبَادِیْ"، وَ قَالَ لِلنَّارِ: "إِنَّمَا أَنْتِ عَذَابِیْ، أُعَذِّبُ بِكِ مَنْ أَشَاءُ مِنْ عِبَادِیْ"، وَ لِكُلِّ وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا مِلْؤُهَا، فَأَمَّا النَّارُ فَلَا تَمْتَلِئُ حَتّٰى يَضَعَ رِجْلَهٗ فَتَقُوْلُ قَطْ قَطْ، فَهُنَالِكَ تَمْتَلِئُ وَ يُزْوٰى بَعْضُهَا إِلَى بَعْضٍ، وَ لَا يَظْلِمُ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ مِنْ خَلْقِهٖ أَحَدًا، وَ أَمَّا الْجَنَّةُ فَإِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَ جَلَّ يُنْشِئُ لَهَا خَلْقًا".

(متفق علیه، مشکوٰۃ : ۵۰۵) (حدیث قدسی نمبر:۲۰)

''جنت وجہنم کا آپس میں مناظرہ ہوا، جہنم نے کہا کہ مجھے جابر ومتکبر لوگوں کے لیے چھانٹا گیا ہے، جنت نے کہا کہ مجھے ضعیف اور مسکین لوگوں کے لیے بنایا گیا ہے، (یہ سن کر) حق تعالیٰ نے جنت سے فرمایا کہ تو میری رحمت کا مظہر ہے، جب کہ جہنم میرے غضب کا مظہر ہے، اور میں تم دونوں کو لوگوں سے بھر دوں گا، البتہ جہنم کے ساتھ تو یہ معاملہ ہوگا کہ وہ اس وقت تک نہیں بھرے گی جب تک اللہ تعالیٰ اس پر اپنا پاؤں نہ رکھ دے گا، جب ایسا ہوگا تو جہنم کہے گی: بس بس، اس وقت وہ بھر جائے گی اور اس کے بعض حصے لپٹ کر ایک دوسرے سے جا ملیں گے، حق تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے کسی پر ظلم نہیں کرتا، اور جنت کو بھرنے کے لیے ایک نئی مخلوق پیدا کی جائے گی۔''

معلوم ہوا کہ جو لوگ اعترافِ ذنوب مع اعترافِ قصور اور عاجزی وانکسار کا اظہار کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے ہیں، جن کا ٹھکانہ اور منزل جنت ہے، اس کے برخلاف جو لوگ ابلیسی کردار ادا کرتے ہوئے اپنے گناہوں کا اقرار نہیں کرتے اور کبر و بڑائی سے پیش آتے ہیں ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم تمام کو اعترافِ ذنوب اور توبہ واستغفار کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

۸/ رمضان المبارک/ ۱۴۴۰ھ

مطابق: ۱۴/ مئی/ ۲۰۱۹ء/ بروز منگل

بزمِ صدیقی، بڑودا

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيْرًا   فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيْرًا كَثِيْرًا

(۲۸)

قیامت کی علاماتِ بعیدہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَامَ فِيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَقَامًا، مَا تَرَكَ شَيْئًا يَكُوْنُ فِيْ مَقَامِهٖ ذٰلِكَ إِلٰى قِيَامِ السَّاعَةِ إِلَّا حَدَّثَ بِهٖ، حَفِظَهٗ مَنْ حَفِظَهٗ، وَ نَسِيَهٗ مَنْ نَسِيَهٗ، قَدْ عَلِمَهٗ أَصْحَابِيْ هٰؤُلَاءِ، وَ إِنَّهٗ لَيَكُوْنُ مِنْهُ الشَّيْءُ قَدْ نَسِيْتُهٗ، فَأَرَاهُ، فَأَذْكُرُهٗ، كَمَا يَذْكُرُ الرَّجُلُ وَجْهَ الرَّجُلِ إِذَا غَابَ عَنْهُ، ثُمَّ إِذَا رَاٰهُ عَرَفَهٗ".

(متفق علیه، مشکوٰۃ : ۴۶۱ / کتاب الفتن)

ترجمہ: حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے کہ (ایک مرتبہ) رحمت عالم ﷺ ہمارے درمیان (خطبہ دینے کے لیے) کھڑے ہوئے، جس میں آپ ﷺ نے قیامت تک پیش آنے والے واقعات (حالات اور علامات) کو بیان کر دیا (جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر منکشف فرمائے تھے، اور ان سے امت کو باخبر کر دینا آپ ﷺ نے امت کے حق میں دارین کی صلاح وفلاح کے لیے ضروری سمجھا) جس نے یاد رکھا اس نے تو یاد رکھا اور جو بھول گیا سو بھول گیا، میرے یہ احباب بھی اسے جانتے ہیں (آپ ﷺ نے اس موقع پر جن) واقعات کی نشان دہی فرمائی تھی ان میں سے جو میں بھول گیا ہوں جب وہ رونما ہوتے ہیں

تو وہ مجھے یاد آجاتے ہیں، جیسے جب کوئی آدمی غائب ہو جاتا ہے تو انسان اس کا چہرہ بھول جاتا ہے، پھر جب وہ نظر آتا ہے تو دیکھتے ہی پہچان لیتا ہے۔

قیامت کا یقینی علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے:

اللہ تعالیٰ نے جس طرح انسان کی موت کا علم خاص حکمت کے تحت مخفی رکھا ہے، اسی طرح قیامت جو کہ کائنات کی موت ہے اس کا یقینی علم بھی خاص حکمت کے تحت مخفی رکھا ہے، حضور پاک ﷺ نے جب توحید ورسالت کی دعوت دیتے ہوئے احوالِ قیامت پر مطلع فرمایا تو مشرکین مکہ نے آپ ﷺ سے وقوعِ قیامت کے متعلق سوال کیا، جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے وقت کا یقینی اور صحیح علم تو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو نہیں، ارشادِ باری ہے:

﴿ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسٰهَاط قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ﴾ (الأعراف:۱۸۷)

’’محبوبم! یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ کب آئے گی؟ آپ فرمادیجئے کہ اس کا (یقینی) علم صرف میرے رب کے پاس ہے۔‘‘

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ يَسْئَلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِط قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ (الأحزاب: ۶۳)

’’یہ لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ فرمادیجئے کہ اس کا علم تو بس اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔‘‘

یہ ایک ایسا راز ہے جو خالق کائنات نے کسی بھی مقرب فرشتے اور نبی تک کو نہیں بتایا، حدیث جبرئیل میں ہے کہ جب حضور پاک ﷺ سے حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اس کے متعلق سوال کیا تو ان کو بھی یہی جواب ملا کہ ”مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ“ کہ جس سے سوال کیا جارہا ہے اس کو خود اس بارے میں سائل سے زیادہ علم نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ قیامت کے وقت کا یقینی علم جس طرح سائل کو نہیں مجھے بھی نہیں، اسی مضمون کی ایک

روایت جو صحیح بخاری ومسلم میں ہے اس میں آپ ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی:

’’ فِيْ خَمْسٍ لَا يَعْلَمُهُنَّ إِلَّا اللّٰهُ، ثُمَّ قَرَأَ: ﴿ إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ج وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ج وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ط وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ط وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوْتُ ط إِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴾ (لقمان: ۳۴)

(متفق عليه، مشكوٰة: ۱۱)

یعنی وقوعِ قیامت کا حتمی، یقینی اور صحیح علم ان پانچ باتوں میں سے ہے جن کے متعلق قرآن کا اعلان ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا: (۱) قیامت کب آئے گی؟ (۲) بارش کب ہوگی؟ (۳) ماں کے پیٹ میں کیا ہے؟ (۴) بندہ کل کیا کرے گا؟ (۵) کون کس جگہ مرے گا؟ یہ وہ چیزیں ہیں جن کا حتمی اور قطعی علم اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کے پاس نہیں۔

علاماتِ قیامت کا تذکرہ قرآن وحدیث میں:

البتہ اللہ رب العالمین نے رحمۃ للعالمین ﷺ کو قیامت سے پہلے پیش آنے والے حالات وحوادث اور واقعات وعلامات پر مطلع فرما کر بندوں کو باخبر کیا ہے، تاکہ وہ فکر آخرت کرسکیں اور اپنے اعمال کی اصلاح کر کے گناہوں سے اجتناب کر کے دارین کی صلاح وفلاح پاسکیں، اُن علاماتِ قیامت کا تذکرہ قرآنِ پاک میں اجمالی طور پر اور حدیث میں تفصیلی طور پر موجود ہے، چنانچہ قرآنِ پاک کا ارشاد ہے:

﴿ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ إِلَّا السَّاعَةَ أَنْ تَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً فَقَدْ جَآءَ أَشْرَاطُهَا ﴾ (محمد:۱۸)

’’تو کیا (یہ کفار ومعترضین) قیامت کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ ان کے پاس اچانک آجائے (اگر انہیں قیامت کے واقع ہونے کا انتظار ہے تو وہ جان لیں کہ) اس کی علامات تو آچکی ہیں۔‘‘

ان علاماتِ قیامت کا تذکرہ آپ ﷺ نے حضراتِ صحابہؓ کے سامنے کبھی انفرادی

طور پر تو کبھی اجتماعی طور پر اور کبھی اجمالی طور پر تو کبھی تفصیلی طور پر فرمایا، چنانچہ حدیث پاک میں مذکور ہے، حضرت حذیفہؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ رحمت عالم ﷺ نے حضرات صحابہؓ کے مابین ایک مفصل اور طویل خطبہ میں قیامت تک پیش آنے والے حوادث وحالات اور واقعات وعلامات کا ذکر بطورِ پیشین گوئی فرمایا۔

ایک دوسری روایت میں ہے:

عَنْ عَمْرِو بْنِ أَخْطَبَ الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: "صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَوْمًا الفَجْرَ، وَ صَعِدَ عَلَى المِنْبَرِ، فَخَطَبَنَا حَتّٰى حَضَرَتِ الظُّهْرُ، فَنَزَلَ، فَصَلّٰى، ثُمَّ صَعِدَ المِنْبَرَ، فَخَطَبَنَا، حَتّٰى حَضَرَتِ العَصْرُ، ثُمَّ نَزَلَ، فَصَلّٰى، ثُمَّ صَعِدَ المِنْبَرَ، حَتّٰى غَرَبَتِ الشَّمْسُ، فَأَخْبَرَنَا بِمَا هُوَ كَائِنٌ إِلٰى يَوْمِ القِيَامَةِ، قَالَ: فَأَعْلَمُنَا أَحْفَظُنَا". (رواه مسلم : ۲/ ۳۹۰، مشکوٰۃ : ۵۴۳ / باب فی المعجزات / الفصل الثالث)

حضرت عمرو بن اخطب انصاریؓ سے (جن کی کنیت ابوزید ہے، آپ تیرہ غزوات میں شریک ہوئے، اکثر غزوات میں حضور ﷺ کی ہم رکابی کا شرف حاصل رہا، ایک مرتبہ حضور ﷺ نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور انہیں خوبصورتی کی دعا دی، اس کی برکت یہ ہوئی کہ آپ نے سو سال سے زائد عمر پائی؛ مگر چہرہ گلاب کی طرح تر وتازہ رہا اور آپ کی ڈاڑھی مبارک کے چند ہی بال سفید ہوئے۔ مستفاد از: مظاہر حق جدید: ۵/ ۴۶۸) روایت ہے کہ ایک دن حضور ﷺ نے ہمیں نمازِ فجر پڑھائی اور منبر پر چڑھ کر خطبہ دیا یہاں تک کہ ظہر کا وقت ہوگیا، تو آپ ﷺ نے اُتر کر نماز پڑھی، پھر منبر پر تشریف لے گئے اور ہمیں خطبہ دیا، یہاں تک کہ عصر کا وقت ہوگیا، تو آپ ﷺ اُتر کر نماز پڑھی، پھر آپ ﷺ خطبہ دینے کے لیے منبر پر تشریف لے گئے، یہاں تک کہ سورج غروب ہوگیا، اس دن آپ ﷺ نے ہمیں قیامت تک ہونے والے واقعات وحوادث کی خبر دی، ہم میں سے جس کا حافظہ زیادہ قوی تھا وہی ان واقعات کو زیادہ جاننے والا ہے۔

علاماتِ قیامت سے متعلق ایک ضروری وضاحت:

جن احادیث طیبہ میں آپ ﷺ نے قیامت سے قبل کے حوادث وحالات اور واقعات وعلامات کا ذکر بطورِ پیشین گوئی فرمایا ہے، علماء نے اُنہیں بھی آپ ﷺ کے معجزات میں شمار کیا ہے، اس لیے جس طرح وقوعِ قیامت یقینی ہے اسی طرح علاماتِ قیامت کا وقوع بھی یقینی ہے اور ان پر ایمان لانا بھی ضروری ہے، یہاں یہ واضح رہے کہ قیامت سے قبل پیش آنے والے حوادث وحالات اور واقعات وعلامات سے متعلق حضور ﷺ نے جو پیشین گوئیاں فرمائیں ان کا تعلق خواہ شخصیات سے ہو جیسے دجال، امام مہدی وغیرہ، یا علاقوں سے ہو جیسے مکہ اور مدینہ وغیرہ یا غیر مرئیات سے ہو جیسے فتنوں کا ظہور وغیرہ، بہر حال ان تمام پیشین گوئیوں میں اپنی طرف سے من مانی تاویل کرنا درست نہیں، بلکہ انہیں من وعن قبول کرنا اور ظاہری معنیٰ پر محمول کرنا زیادہ قرین قیاس ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر احادیث میں دجال یا امام مہدی کے ظہور کا ذکر ملتا ہے تو ان سے حقیقی طور پر یہ شخصیات ہی مراد ہیں، کوئی قوم، کوئی طاقت یا کوئی بھی مجدد یا امام عادل ومنصف حکمران مراد نہیں، جیسا کہ بعض حضرات نے دجال کی تاویل کرتے ہوئے اس سے امریکہ اور اسرائیل مراد لیا ہے، اسی طرح دجال کے ماتھے پر لکھے ہوئے ’’ک، ف، ر،‘‘ سے اسرائیل کا K.F.R. جنگی طیارہ مراد لیا ہے، جب کہ بعض نے دجال سے ہر وہ طاقت مراد لی ہے جو دَجل وفریب میں حد درجہ بڑھی ہوئی اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو، حالانکہ احادیث صحیحہ سے ان تاویلات کی نفی ہوتی ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ دجال کوئی طاقت، بدی اور قوم نہیں؛ بلکہ ایک متعین شخص ہے جو اولادِ آدم میں سے ہوگا، نیز امام مہدی کے متعلق بھی یہ ثابت ہے کہ وہ ایک خاص شخصیت ہیں جن کی چند علامات ہیں، جن کا تذکرہ احادیث صحیحہ میں موجود ہے، علاوہ ازیں احادیث طیبہ میں ہے کہ قیامت سے قبل زمین سے ایک جانور ’’دابۃ الارض‘‘ نکلے گا، جو لوگوں سے کلام کرے گا، اس سے بھی بلا تاویل وہ خاص جانور ہی مراد لیا جائے گا، اسی طرح علاقہ جات

سے متعلق جو پیشین گوئیاں ہیں مثلاً آپ ﷺ نے فرمایا کہ قسطنطنیہ کی طرف پیش قدمی کرنے والا پہلا اسلامی لشکر جنتی ہے، اور مکہ و مدینہ سے متعلق ارشاد ہے کہ وہاں دجال داخل نہیں ہو سکے گا وغیرہ، تو اس طرح کی پیشین گوئیوں میں بھی وہی مخصوص علاقہ جات مراد ہوں گے۔

البتہ کچھ پیشین گوئیوں میں مبہم انداز بھی اختیار کیا گیا ہے، جیسا کہ مشرق کی طرف سے ایک لشکر آئے گا، تو اس سے علاقوں کی تعیین ازخود نہیں کی جائے گی، بلکہ دیگر روایات میں اس کی وضاحت تلاش کی جائے گی اور آثار و علامات کے ذریعہ ان کی تعیین کی جائے گی، یا پھر کسی مبہم علاقہ کی تعیین کسی صحابی سے منقول ہو تو اسی کو ترجیح دی جائے گی۔

رہی بات غیر مرئیات (یعنی ایسی چیزیں جنہیں دیکھا نہیں جا سکتا) سے متعلق پیشین گوئیوں کی تو انہیں بھی من و عن تسلیم کیا جائے گا، خواہ عقل اُنہیں تسلیم کرے یا نہ کرے۔

علاماتِ قیامت کی تین قسمیں:

جن علاماتِ قیامت کا تذکرہ قرآن وحدیث میں موجود ہے وہ تمام علامات برحق ہیں اور لازماً وہ واقع ہو کر رہیں گی، ان کے وقوع پر ایمان بھی ضروری ہے، مجموعی طور پر ان کی تین قسمیں ہیں: (فتح الباری: ۱۳/۸۳)

(۱) علاماتِ صغریٰ: اس سے مراد اکثر وہ علامتیں ہیں جو قیامت سے بہت پہلے ظاہر ہو کر ختم بھی ہو چکی ہیں، ان کو علاماتِ بعیدہ بھی کہتے ہیں، کیوں کہ ان کے اور قیامت کے درمیان نسبۃً زیادہ فاصلہ ہے، جن کی تعداد تقریباً آٹھ یا نو ہے، من جملہ ان کے حضور ﷺ کی بعثت، واقعۂ شق القمر، حضور ﷺ کی وفات اور جنگ صفین وغیرہ ہیں، یہ سب واقعات از روئے قرآن وحدیث علاماتِ قیامت میں سے ہیں اور ظاہر ہو چکے ہیں۔

(۲) علاماتِ متوسطہ: وہ ہیں جو ظاہر تو ہو گئی ہیں، مگر اب تک انتہاء کو نہیں پہنچیں،

ان میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اور آئے دن ہوتا جائے گا، یہاں تک کہ تیسری قسم کی علامات ظاہر ہونے لگیں گی، علاماتِ متوسطہ کی فہرست طویل ہے، مثلاً ظہورِ فتن، نیز آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ جس میں دین پر چلنا اور اس پر عمل کرنا اَنگارے کو اپنی مٹھی میں پکڑنے کے مانند مشکل ہوگا، اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا کہ (ایک وقت آئے گا کہ) دنیوی اعتبار سے سب سے زیادہ نصیبہ ور وہ شخص ہوگا جو خود بھی کمینہ ہوگا اور اس کا باپ بھی کمینہ ہوگا، قیامت سے قبل گناہوں کی کثرت ہوگی، وغیرہ۔

اس موقع پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ کسی امر کا علاماتِ قیامت میں ہونا اس کی مدح یا مذمت پر دلالت نہیں کرتا، بلکہ اس کا مقصد صرف قربِ قیامت کو ظاہر کرنا ہے، اس لیے یہ علامات ممدوح (لائق تعریف) بھی ہو سکتی ہیں، جیسے حضور پاک ﷺ کی بعثت وغیرہ، اور مذموم بھی ہو سکتی ہیں، جیسے جہالت کا پھیل جانا وغیرہ۔

(۳) علاماتِ کبریٰ: جو بالکل قربِ قیامت میں یکے بعد دیگرے ظاہر ہوں گی اور ان کے بعد فوراً قیامت قائم ہو جائے گی، اسی لیے اُنہیں علاماتِ قریبہ بھی کہتے ہیں، مثلاً ظہورِ امام مہدی، خروجِ دجال، نزولِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، خروجِ یاجوج و ماجوج، آفتاب کا مغرب سے طلوع ہونا، خروجِ دابۃ الارض اور یمن سے آگ کا نکلنا وغیرہ، اس قسم کی علامات کے ظاہر ہونے کے بعد کسی بھی وقت اچانک قیامت آجائے گی، ذیل میں بالترتیب علاماتِ قیامت کا تذکرہ قدرے تفصیل سے کرنے کی ایک طالب علمانہ کوشش کی گئی ہے، اپنی اصلاح کے جذبہ سے ملاحظہ فرمائیں۔

علاماتِ بعیدہ:

(۱) حضور پاک ﷺ کی بعثت:

قیامت کی وہ علامات جو ظاہر ہو کر ختم بھی ہو چکی ہیں اور جنہیں علاماتِ صغریٰ یا علاماتِ بعیدہ کہا جاتا ہے ان میں سے ایک تو حضور ﷺ کی بعثت ہے، حضرت انسؓ کی

روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" بُعِثْتُ أَنَا وَ السَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ". (متفق عليه، مشكوٰة : ۴۸۰ باب قرب الساعة و من مات فقد قامت قيامته)

میری بعثت اور قیامت دونوں اس طرح قریب ہیں جیسے یہ دو انگلیاں، گویا آپ ﷺ کی بعثت قیامت کی پہلی علامت ہے، اور جس طرح انگشت شہادت اور درمیانی انگلی قریب قریب ہیں اسی طرح حضور ﷺ کی بعثت اور قیامت بھی قریب قریب ہیں۔ اور عاجز کے خیالِ ناقص میں یہاں آپ ﷺ کی ختم نبوت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ میرے بعد اب قیامت ہی ہے، نبوت نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

(۲) چاند کے دو ٹکڑے ہونا:

قیامت کی علاماتِ بعیدہ میں سے چاند کے دو ٹکڑے ہونا بھی ہے، ارشادِ باری ہے:

﴿ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَ انْشَقَّ الْقَمَرُ ﴾ (القمر : ۱)

یعنی قیامت قریب آ گئی ہے اور چاند پھٹ گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ علاماتِ قیامت میں سے ایک علامت چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا وہ معجزہ بھی ہے جو رحمت عالم ﷺ کے ہاتھوں ظاہر ہوا، جس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک مرتبہ چاندنی (قمری مہینے کی چودھویں) رات میں مکہ کے کچھ کفار نے حضور ﷺ سے کوئی معجزہ دکھانے کا مطالبہ کیا، (اس وقت حضور ﷺ منیٰ میں تشریف فرما تھے، آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی) اس پر حق تعالیٰ نے یہ کھلا معجزہ دکھایا کہ چاند کے دو ٹکڑے ہوئے، جن میں سے ایک پہاڑ کی مشرقی جانب چلا گیا اور دوسرا مغربی جانب، اس کے درمیان لوگوں کو جبل حراء صاف نظر آیا، حدیث میں ہے:

عَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: إِنَّ أَهْلَ مَكَّةَ سَأَلُوا رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ أَنْ يُرِيَهُمْ آيَةً، فَأَرَاهُمُ الْقَمَرَ شِقَّتَيْنِ، حَتّٰى رَأَوْا حِرَاءَ بَيْنَهُمَا". (رواه البخاري : ۲/۲۲، مشكوٰة : ۵۲۴/ باب علاماتِ النبوة)

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت میں ہے کہ اس موقع پر حاضرین سے حضور ﷺ نے فرمایا: "اِشْهَدُوْا" (متفق عليه، مشكوٰة: ۵۲۴) لو دیکھ لو! اور اس پر گواہ رہو، جب سارے لوگوں نے جو وہاں موجود تھے یہ حیرت انگیز نظارہ دیکھ لیا تو پھر چاند کے دونوں ٹکڑے آپس میں مل گئے، مشرکین مکہ نے جب اس کا مشاہدہ کیا تو انکار تو کر نہیں سکتے تھے، لہٰذا عناد اور ضد میں کہنے لگے کہ ﴿ سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ﴾ (القمر:۲) یہ تو ایک چلا آ رہا جادو ہے۔ حالانکہ بعد میں مکہ مکرمہ کے باہر سے آنے والے مسافروں نے بھی اس واقعہ کی تصدیق کی، نیز ہندوستان میں گوالیار کے راجہ نے بھی یہ واقعہ دیکھا تھا، جیسا کہ تاریخ فرشتہ میں مذکور ہے۔

(مستفاد از: آسان ترجمۂ قرآن: ۱۶۳۹، مرتبہ مفتی محمد تقی عثمانی)

الغرض یہ واقعہ بھی قیامت کی اُن علاماتِ بعیدہ میں سے ہے جو ظاہر ہو کر ختم چکیں۔

(۳) حضور پاک ﷺ کی وفات:

قیامت کی علاماتِ بعیدہ میں سے حضور ﷺ کی وفات بھی ہے:

عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ فِيْ غَزْوَةِ تَبُوْكَ، وَ هُوَ فِيْ قُبَّةٍ مِنْ أَدَمٍ، فَقَالَ: أُعْدُدْ سِتًّا بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ، مَوْتِيْ، ثُمَّ فَتْحُ بَيْتِ الْمَقْدِسِ، ثُمَّ مُوْتَانٌ يَأْخُذُ فِيْكُمْ كَقُعَاصِ الْغَنَمِ، ثُمَّ اسْتِفَاضَةُ الْمَالِ، حَتّٰى يُعْطَى الرَّجُلُ مِائَةَ دِيْنَارٍ فَيَظَلُّ سَاخِطًا، ثُمَّ فِتْنَةٌ لَا يَبْقٰى بَيْتٌ مِنَ الْعَرَبِ إِلَّا دَخَلَتْهُ، ثُمَّ هُدْنَةٌ يَكُوْنُ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ بَنِي الْأَصْفَرِ، فَيَغْدِرُوْنَ، فَيَأْتُوْنَكُمْ تَحْتَ ثَمَانِيْنَ غَايَةً، تَحْتَ كُلِّ غَايَةٍ اِثْنَا عَشَرَ أَلْفًا". (رواه البخاري، مشكوٰة : ۴۶۶/ باب الملاحم)

حضرت عوف بن مالکؓ سے روایت ہے، آپ فرماتے ہیں کہ میں حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں غزوۂ تبوک کے موقع پر حاضر ہوا، اس وقت آپ ﷺ چمڑے کے ایک خیمہ میں تشریف فرما تھے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت سے قبل چھ چیزوں کو شمار کر لو، مطلب یہ ہے کہ قیامت سے پہلے چھ علامات (بعیدہ) یاد رکھنا: (۱) ایک میری وفات ہے۔ (۲) پھر فتح بیت المقدس۔ (۳) پھر ایک قسم کی عام وبائی بیماری جو تم میں اس طرح پھیلے گی

جیسے بکریوں میں طاعون کی بیماری پھیلتی ہے۔(۴) پھر مال کا اس طرح بہنا (مال و دولت کی اس قدر کثرت ہونا) کہ اگر کسی کو سو دینار بھی دیے جائیں گے تو وہ راضی نہیں ہوگا۔(۵) پھر ایک ایسا فتنہ ہوگا جو عرب کے ہر گھر میں داخل ہوگا۔(۶) پھر ایک صلح جو تمہارے اور رومیوں (عیسائیوں) کے درمیان ہوگی اور وہ عہد کو توڑ کر (غداری کر کے) تم پر حملہ آور ہوں گے، اس وقت ان کا لشکر اَسّی جھنڈوں کے سایہ میں ہوگا اور ہر جھنڈے کے تحت بارہ ہزار آدمی ہوں گے (یعنی نو لاکھ ساٹھ ہزار کی فوج ہوگی) اصل مقصود یہاں کثرت کو بیان کرنا ہے۔

اس حدیث پاک میں حضور ﷺ نے قیامت کی چھ علاماتِ بعیدہ بیان فرمائی ہیں، جن میں سے حضور ﷺ کی وفات کو علامت قیامت قرار دیا گیا ہے، مطلب یہ ہے کہ حضور کی بعثت جو کہ قیامت کی پہلی علامت ہے تو اس کی وضاحت یہ ہے کہ جب تک آپ ﷺ دنیا میں موجود ہیں قیامت نہیں آسکتی، قیامت آپ ﷺ کی وفات کے بعد ہی آئے گی۔ جب حضور ﷺ نہیں رہیں گے تو آپ کی وفات کے بعد یہ کائنات بھی نہیں رہے گی، اس لیے آپ ﷺ کی وفات بھی علامت قیامت میں سے ہے جو کہ ظاہر ہو چکی ہے۔

(۴) فتح بیت المقدس:

قیامت کی علاماتِ بعیدہ میں سے بیت المقدس کی فتح بھی ہے، جیسا کہ حدیث بالا میں اس کا ذکر ہے، نیز قرآنِ پاک میں بھی اس کی طرف اشارہ موجود ہے:

﴿ وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴾ (الأنبياء: ١٠٥)

”ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے، یہاں زمین سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک تو جنت ہے، لیکن حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت میں اس سے دنیا کی زمین مراد ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ وعدہ مؤمنین کاملین کے ساتھ ہے، چنانچہ یہ وعدہ پہلے پورا ہو چکا اور امام مہدی کے زمانہ میں پھر پورا

ہوگا۔(مستفاد از معارف القرآن: ۶/۲۳۲)

اور بعض مفسرین نے اس سے ارضِ مقدس (ملک شام کی زمین) مراد لی ہے۔ (تفسیر ماجدی)۔حدیث بالا سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

بیت المقدس فلسطین کا شہر اور دار الحکومت ہے، یہ دنیا کی تین بڑی قومیں یہود، نصاریٰ اور مسلمانوں کے نزدیک ایک مقدس اور پاکیزہ مقام ہے، یہاں مسلمانوں کا قبلۂ اوّل مسجد اقصیٰ بھی واقع ہے، مسلمان مدینہ منورہ میں تحویل قبلہ سے پہلے اسی کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے تھے، مکہ مکرمہ سے بیت المقدس کا فاصلہ تیرہ سو کلومیٹر ہے، حضور ﷺ کی یہ پیشین گوئی حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں پوری ہوگئی، ۱۶ھ میں بیت المقدس حضرت عمرؓ کے ہاتھوں بذریعۂ صلح فتح ہوا، عیسائیوں نے یہ شرط رکھی کہ امیر المؤمنین حضرت عمرؓ خود آکر صلح کا معاہدہ لکھیں، حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع دی گئی تو آپ نے منظور فرمایا اور حضرت علیؓ کو مدینہ منورہ میں اپنا قائم مقام بنا کر تشریف لائے اور بیت المقدس کو صلحاً فتح فرمایا۔

(مستفاد از: تاریخ اسلام: ۱/۱۸۸، شاہ معین الدین ندوی)

اس کے بعد بیت المقدس تقریباً پانچ سو سال تک مسلمانوں کے قبضہ میں رہا، اس طویل مدت کے بعد جب رَفتہ رَفتہ مسلمان مجموعی طور پر غفلت کا شکار ہوئے تو رومی عیسائیوں نے دوبارہ بیت المقدس پر حملہ کر کے خلیفہ مستظہر باللہ کے دورِ خلافت میں قبضہ کر لیا، ایک عرصہ کے بعد پھر چھٹی صدی ہجری میں حق تعالیٰ نے سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے ذریعہ بیت المقدس کو دوبارہ فتح کیا، اس کے بعد جیسے جیسے مسلمانوں میں دین اسلام سے دوری اور آپسی خانہ جنگی اور اختلافِ باہمی بڑھتا گیا تو مملکت اسلامیہ اور ارضِ مقدس پر ان کی گرفت کمزور ہوتی گئی، یہاں تک کہ بدقسمتی سے آج پھر بیت المقدس پر یہود قابض ہیں، کسی نے کہا ہے کہ ”فَتَحَهَا عُمَرُ، وَ حَرَّرَهَا صَلَاحُ الدِّيْنِ، فَمَنْ لَهَا الْيَوْمَ؟“ کہ بیت المقدس کو سیدنا فاروقِ اعظمؓ نے فتح کیا تھا، پھر سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے اُسے آزاد کرایا، لیکن

اب دشمنوں کے قبضہ سے آزاد کرانے کے لیے کون ہے؟

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی نے اپنے ایک مضمون بہ عنوان ''سقوطِ بیت المقدس کے اسباب'' میں تحریر فرمایا ہے کہ بیت المقدس کی شکست کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مسلمانوں نے عرصۂ دراز سے اسلام کی واضح تعلیمات کو بالکل پس پشت ڈال رکھا ہے، سالہا سال سے دعویٰ تو یہ ہے کہ ہمیں مغربی سامراج اور اس کے حاشیہ نشینوں سے نفرت ہے، لیکن مسلمانوں کی زندگی کی ہر نقل وحرکت اس دعوے کو جھٹلاتی ہے، ہماری فکریں، ہماری تہذیب و تمدن، معاشرت، رہن سہن، غرض سر سے لے کر پاؤں تک اور لیل ونہار کے تمام اعمال و افعال پکار پکار کر یہ کہتے ہیں کہ ہم مغربی سامراج (یہود ونصاریٰ کی تہذیب) کو زبان سے خواہ کتنا ہی برا بھلا کہتے رہیں؛ لیکن ہمارے قلوب ان ہی کی محبت وعظمت سے آباد ہیں، ہمیں تہذیب ان ہی کی پسند آتی ہے، اَفکار اُن ہی کے اچھے لگتے ہیں، اور معاشرت اُن ہی کی محبوب ہے، علامہ اقبالؒ نے اسی کو یوں تعبیر فرمایا:

غضب ہے نام لیتے ہیں نصاریٰ کی عداوت کا — مگر نصرانیت اور مغربیت دل سے ہے پیاری
لباس ان کا، معاش ان کا، زبان ان کی، تراش ان کی — وہی طرزِ معیشت ہے وہی طرزِ سخن جاری
سرِ تسلیم خم ہے ہر نئے فیشن پر کیوں تیرا؟ — کہاں جاتی رہی مسلم! وہ تیری وضع خودداری؟
زمانہ نقل کرتا تھا تیری ہر وضع و ہیئت کی — مسلم تھی جہاں میں تیری دانائی و ہشیاری
تیری ہمت کے آگے کوہ ودریا سب برابر تھے — تیرا عزم واستقلال اِک عالم پہ تھا بھاری
تیرے قانونِ فطرت میں گدا وشاہ یکساں تھے — نرالا تھا جہاں سے تیرا آئین جہاں داری

ضرورت ہے کہ ہم احساس کمتری دور کریں، نیز ایمان میں قوت، آپس میں اُخوت، اسلامی سیاست کے لیے اجتماعی طور پر فکرمند اور بیدار ہو جائیں، ہم اپنے اندر اگر صالح انقلاب پیدا کرلیں گے تو رب العالمین عالم میں صالح انقلاب پیدا فرمائے گا، پھر ان شاءاللہ وہ دن بھی دور نہیں جب مسلمان دوبارہ بیت المقدس کو فتح کرلیں گے، قیامت سے

قبل یہ پیشین گوئی پھر ایک بار پوری ہو کر رہے گی۔

(۵) ایک عام وبائی بیماری:

قیامت کی علاماتِ بعیدہ میں حضور پاک ﷺ کی مذکورہ حدیث میں پیشین گوئی کے مطابق ایک عام وبائی بیماری پھیلے گی، حدیث میں ہے: ''ثُمَّ مُوْتَانٌ يَأْخُذُ فِيْكُمْ كَقُعَاصِ الْغَنَمِ'' پھر تم میں ایک عمومی وبائی بیماری پھیل جائے گی جیسے بکریوں میں طاعون پھیلتا ہے، یہ وبائی مرض دراصل بکریوں میں پھیلتا ہے اور ساری بکریوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اس خاص وبائی بیماری کی طرح تم میں بھی ایک وبائی بیماری پھیلے گی۔

علماءِ محدثین کے بیان کے مطابق اس سے مراد وہ طاعون ہے جو فتح بیت المقدس کے بعد حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں ۱۸ھ میں پھیلا تھا، اس وقت مسلمانوں کی لشکر گاہ اور فوجی چھاؤنی بیت المقدس کے قریب عمواس نامی مقام پر تھی، جہاں یہ مرض پھیلا تھا، اس لیے اسے ''طاعونِ عمواس'' بھی کہتے ہیں، اس مرض سے تین دن میں ستر ہزار مسلمان فوت ہو گئے، جن میں صحابہؓ بھی تھے، حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ بھی ان میں تھے، اس لیے قیامت کی یہ علامت بعیدہ بھی ظاہر ہو چکی ہے۔

(۶) مال ودولت کی کثرت:

اس کے بعد حدیث مذکورہ میں دی گئی پیشین گوئی کے مطابق مال ودولت کی کثرت ہوگی، حدیث میں ہے: ''ثُمَّ اِسْتِفَاضَةُ الْمَالِ......الخ'' پھر مال ودولت کی اس قدر فراوانی ہوگی کہ اگر ایک آدمی کو سو دینار دیے جائیں گے تو وہ ان دینار کو حقیر اور کم سمجھے گا، جس پر وہ ناراض ہوگا، حضور پاک ﷺ کا دور عموماً تنگیوں میں گزرا تھا، بالخصوص ابتداءِ اسلام کا دور حالت فقر میں گزرا تھا، بعد میں اللہ تعالیٰ نے فتوح کا دروازہ کھول دیا، جس کی پیشین گوئی حضور پاک ﷺ نے پہلے ہی فرما دی تھی، حدیث بالا میں اسی کا تذکرہ ہے، حتیٰ کہ ایک

حدیث میں فرمایا:

" يَأْتِيْ عَلَيْكُمْ زَمَانٌ يَمْشِيْ الرَّجُلُ بِصَدَقَتِهٖ، فَلَا يَجِدُ مَنْ يَقْبَلُهَا".

(متفق علیه، مشکوٰة : ١٦٤)

''ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ایک شخص زکوٰۃ کا مال لے کر کسی مستحق کو دینے کے لیے نکلے گا؛ لیکن اسے کوئی قبول کرنے والا نہیں مل پائے گا۔'' کیوں کہ سبھی لوگ خوشحال ہوں گے، حضور ﷺ کی یہ پیشین گوئی بھی حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں پوری ہوگئی، آپؓ کا دور فتوحات کا تھا، بڑی بڑی سلطنتیں مثلاً روم وفارس جو اُس زمانہ کی سپر پاور تھیں وہ مسلمانوں کے قبضے میں آ گئیں، نیز خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد مبارک میں مال ودولت کی کثرت کا یہ حال تھا کہ کوئی زکوٰۃ لینے والا آسانی سے نہیں ملتا تھا۔ لہٰذا قیامت کی یہ علامت بھی ظاہر ہوچکی ہے۔ (مستفاد از: الاشاعۃ لاشراط الساعۃ: ۸۷)

(۷) ایک خاص فتنہ:

اس کے بعد حدیث پاک میں قیامت کی علاماتِ بعیدہ میں ایک خاص فتنہ کا تذکرہ فرمایا کہ "ثُمَّ فِتْنَةٌ لَا يَبْقىٰ بَيْتٌ مِنَ الْعَرَبِ إِلَّا دَخَلَتْهُ" پھر ایک ایسا فتنہ ظاہر ہوگا کہ عرب کا کوئی بھی گھر اس سے محفوظ نہ ہوگا، ہر گھر میں اس فتنہ کے اثرات ظاہر ہوں گے، اس سے مراد یا تو حضرت عثمانؓ کی شہادت ہے، یا پھر جنگ جمل وصفین کی جانب اشارہ ہے، یا مطلقاً ہر ایسا فتنہ مراد ہے جو آپ ﷺ کے بعد واقع ہو، یہ حقیقت ہے کہ فتوحات کا دور پرفتن ہوتا ہے، کسی نے کیا خوب کہا ہے:

وہ اندھیرا ہی بھلا تھا کہ قدم راہ پہ تھے
روشنی لائی ہے منزل سے بہت دور ہمیں

چنانچہ حضرت عثمانؓ کا دور فتوحات کا تھا، جس میں ابتدائی چھ سال تو نہایت خیر وخوبی کے ساتھ گزر گئے، بعد میں فتنے ظاہر ہوئے، جن کی ظاہری اور بنیادی وجہ یہ تھی کہ حضرت عثمانؓ بہت ہی زیادہ نرم مزاج اور اقرباء کے ساتھ ہمدردی کا معاملہ فرماتے تھے، اپنے

بعض رشتہ داروں کو ان کی عمدہ صلاحیت کی وجہ سے کچھ حکومتی عہدوں اور مناصب پر آپ نے فائز کیا، اس پر بعض لوگوں نے اعتراض اور انتشار کیا، پھر یہ سلسلہ بڑھتا گیا، اسی دوران صنعاءِ یمن کا ایک کٹر یہودی بغرضِ فساد ونفاق اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر کے مدینہ آ گیا اور حضرت عثمانؓ اور آپ کے گورنروں کے متعلق بکواس پھیلانے لگا، مگر مدینہ میں تو اس کی پذیرائی ہوئی نہیں، پھر وہ بصرہ، کوفہ اور دمشق وغیرہ سے بھی اپنے مذموم مقصد میں ناکام ہوکر مصر گیا، وہاں کچھ لوگ اس کی حمایت میں جمع ہوگئے جن کے ساتھ مل کر اس نے حضرت عثمانؓ اور آپ کی خلافت کے خلاف سازشیں شروع کیں، حضرت عثمانؓ کے گورنروں کے خلاف فرضی شکایتیں کر کے عوام الناس میں بدگمانیاں پھیلائیں، کچھ وقت کے بعد ایک دستہ قتل عثمانؓ کے لیے تیار ہوکر مدینہ کی طرف روانہ ہوگیا، مدینہ آ کر انہوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف بغاوت کردی، یہاں ان کا مطالبہ یہ تھا کہ مصر کے گورنر کو ہٹا کر محمد بن ابی بکر کو گورنر بنایا جائے، حضرت عثمانؓ نے اس کے لیے پروانہ لکھ دیا، جسے لے کر یہ لوگ چلے گئے اور معاملہ رفع دفع ہوگیا، مگر مروان بن حکم نے فوراً مصر کے گورنر کے نام ایک خط لکھا کہ جوں ہی محمد بن ابی بکر پہنچ جائے اسے قتل کردو، خط پر حضرت عثمانؓ کی مہر تھی، گھوڑا بھی حضرت عثمانؓ کا تھا، غلام بھی حضرت عثمانؓ کا تھا، یہ شخص مصر کی طرف دوڑا جارہا تھا، اس دوران محمد بن ابی بکر کو اس غلام پر شک ہوگیا، غلام کو پکڑ کر جب تلاشی لی گئی تو خط برآمد ہوا، محمد بن ابی بکر نے کہا کہ ایک طرف تو عثمان ہمیں مصر کا گورنر بنا رہے ہیں اور دوسری طرف ہمارے قتل کا حکم دے رہے ہیں، اس غلام اور خط کو لے کر محمد بن ابی بکر اور عبداللہ بن سبا کے ہمنوا بلوائی مدینہ آئے اور حضرت عثمانؓ سے دریافت کیا کہ یہ غلام کس کا ہے؟ فرمایا: میرا، کہا: گھوڑا کس کا ہے؟ فرمایا: میرا، کہا: مہر کس کی ہے؟ فرمایا: میری، کہا: خط کس کا ہے؟ فرمایا: خدا کی قسم خط میرا نہیں ہے، خط کے نمونے دیکھے گئے تو معلوم ہوا کہ یہ خط مروان بن حکم نے لکھا ہے، اب بلوائیوں نے کہا کہ مراون کو ہمارے حوالے کردو، آپ نے فرمایا کہ میں ایسا نہیں کرسکتا، اس کے بعد باغیوں اور بلوائیوں نے آپ سے مطالبہ شروع کردیا کہ آپ خلافت سے دست بردار ہوکر خود ہی

اپنے آپ کو معزول کر دیں، حضرت عثمانؓ حضور پاک ﷺ کی ایک تاکیدی ہدایت کی وجہ سے اس بات کے لیے تیار نہ ہوئے، آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

"یَا عُثْمَانُ ! إِنَّهُ لَعَلَّ اللّٰهَ يُقَمِّصُكَ قَمِيْصًا، فَإِنْ أَرَادُوْكَ عَلٰى خَلْعِهٖ، فَلَا تَخْلَعْهُ لَهُمْ". (رواه الترمذی، مشکوٰۃ: ۵۶۲، باب مناقب عثمان بن عفانؓ)

"اے عثمان! اللہ تعالیٰ تمہیں ایک قمیص پہنائے گا (یعنی خلعت خلافت عطا فرمائے گا) پھر اگر لوگ تم سے اس قمیص کے اُتار دینے کا مطالبہ کریں تو قمیص نہ اُتارنا۔" یعنی خلافت ترک نہ کرنا (کیوں کہ تم حق پر ہوں گے اور مطالبہ کرنے والے باطل پر) جب آپ نے بلوائیوں کا یہ مطالبہ پورا نہ کیا تو مصری بلوائیوں نے حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کرلیا، اس وقت لشکر اسلام سرحدوں پر تھا، عام لوگ حج کے لیے گئے ہوئے تھے، اس لیے مدینہ بلوائیوں کے قبضہ میں تھا، اس موقع پر آپ کے رفیقوں اور وفاداروں نے باغیوں کے خلاف طاقت استعمال کرنے کی اجازت طلب کی تو آپ نے منع فرمایا، مصری بلوائیوں نے حضرت عثمانؓ کے گھر کا چالیس دن تک محاصرہ کیا پھر آپ کو شہید کر دیا، یہ واقعہ ۳۵ھ میں پیش آیا، حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد ان کے قاتلین سے قصاص کے مسئلہ پر صحابہؓ میں اجتہادی اختلاف ہوا، حتیٰ کہ جنگ جمل اور صفین کی نوبت آئی، جس کا فریقین کو زندگی بھر رنج و افسوس رہا۔ ایک قول کے مطابق حدیث میں اسی فتنہ کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ (واللہ اعلم)۔

بہر حال یہ مشاجراتِ صحابہؓ ہیں، ان میں خاموش رہنا ہمارے جمہور علماء کے موقف کے مطابق بہتر ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے مشاجراتِ صحابہؓ کے اس مسئلہ کو بہت خوبصورت مثال کے ذریعہ سمجھایا ہے، آپؒ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کسی بادشاہ کے محل میں شہزادوں کے درمیان کسی مسئلہ میں چپقلش یا لڑائی ہو جائے تو محل کے بھنگی، چمار اور خاکروب کو یہ کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ شہزادوں کی اس لڑائی کے بیچ میں پڑیں اور آپس میں تبصرے کریں اور ان کے درمیان فیصلہ کریں، محل کا بادشاہ جانے اور اس کے شہزادے جانیں، یہ بھنگی اگر بیچ میں

پڑیں گے تو اُن کی گردن ماردی جائے گی، بالکل یہی مثال حضراتِ صحابۂ کرامؓ کی ہے، وہ آں حضرت ﷺ کے شہزادے ہیں، ان کے درمیان جو مشاجرات ہوئے اُمت کے کسی فرد کو محل کے خاکروب یا چمار کی طرح کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ ان مقدس ہستیوں کے بارے میں اپنی زبانِ طعن دراز کرے اور ان کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے وہ قضا اور عدالت کی کرسی کو سنبھالے۔ جی ہاں! اگر ایسی جرأت اور بے باکی کی تو پکڑے جائیں گے اور مارے جائیں گے، میاں! اللہ تبارک وتعالیٰ جانے اور اس کے شہزادے جانیں!

الغرض حدیث پاک میں قیامت کی علاماتِ بعیدہ کے طور پر جس خاص فتنہ کا ذکر ہوا وہ فتنہ بھی ظاہر ہو چکا۔

نیز حدیث کے اخیر میں رومیوں اور عیسائیوں کے ساتھ جس صلح اور معاہدہ کا ذکر ہے وہ ظہورِ امام مہدی کے بعد ہوگا۔ (توضیحات: ۷/ ۴۹۵)

(۸) تاتاری فتنہ:

علاوہ ازیں علماءِ محدثین نے فرمایا کہ قیامت کی علاماتِ بعیدہ میں سے تاتاری فتنہ بھی ہے، جس کی پیشگی خبر حضور ﷺ نے دی تھی، احادیث صحیحہ میں وارد ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تُقَاتِلُوْا قَوْمًا نِعَالُهُمُ الشَّعْرُ، وَ حَتّٰى تُقَاتِلُوا التُّرْكَ صِغَارَ الْأَعْيُنِ حُمْرَ الْوُجُوْهِ ذُلْفَ الْأُنُوْفِ، كَأَنَّ وُجُوْهَهُمُ الْمَجَانُّ الْمُطْرَقَةُ".

(متفق علیه، مشکوٰۃ: ۴۶۵ / باب الملاحم)

"قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ تم اس قوم کے ساتھ جنگ نہ کرو جن کے جوتے بالوں سے بنے ہوئے ہوں گے، اور اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی جب تک تم ترکوں سے جنگ نہ کرو گے، جن کی آنکھیں چھوٹی، چہرے سرخ اور ناک چپٹی ہوگی، ان کے چہرے تہہ بہ تہہ چمڑے سے لپٹی ہوئی ڈھال کی طرح ہوں گے (یعنی ان کے چہرے موٹے اور پر گوشت ہوں گے)۔"

حضرت فقیہ الاسلام مفتی مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ "ان

احادیث میں جس قوم سے مسلمانوں کی جنگ کی خبر دی گئی ہے یہ تاتاری قوم ہے۔“

(فتح الباری: ٦/ ٧٧٤)

یہ قوم ترکستان سے قہرِ الٰہی بن کر عالمِ اسلام پر ٹوٹ پڑے تھے، اس قوم کی جو تفصیلات رسول اللہ ﷺ نے بتائی تھیں وہ سب کی سب فتنۂ تاتار میں رونما ہوچکیں۔ یہ فتنہ ٦٥٦ھ میں اپنے عروج پر پہنچا جب کہ تاتاریوں کے ہاتھوں سقوطِ بغداد کا عبرت ناک حادثہ پیش آیا، انہوں نے بنوعباس کے آخری خلیفہ مستعصم باللہ کو قتل کر دیا اور عالمِ اسلام کے بیشتر ممالک ان کی زد میں آکر زیر وزبر ہوگئے۔ شارحِ مسلم علامہ نوویؒ نے وہ دور اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، جس کا تذکرہ آپؒ نے شرحِ مسلم میں (٢/ ٣٩٥) میں فرمایا ہے۔

(مستفاد از: علاماتِ قیامت اور نزولِ مسیح: ١٢٩ تا ١٣١)

تاتاری قوم خلفاء کے زمانے تک تو کافر تھی، بعد میں یہ لوگ مشرف باسلام ہوگئے اور علامہ اقبالؒ کو کہنا پڑا:

ہے عیاں یورشِ تاتار کے اَفسانے سے ۔۔۔ پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانہ سے

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قیامت کی یہ علامت بعیدہ بھی ظاہر ہوچکی ہے۔

(٩) سرزمین حجاز سے آگ کا ظہور:

قیامت کی ان ہی علاماتِ بعیدہ میں سے ایک سرزمین حجاز کی وہ آگ ہے جس کی پیشین گوئی حضور ﷺ نے فرمائی تھی، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَخْرُجَ نَارٌ مِنْ أَرْضِ الْحِجَازِ تُضِيْءُ أَعْنَاقَ الْإِبِلِ بِبُصْرٰى".

(متفق علیه، مشکوٰة : ٤٦٩)

”قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک سرزمین حجاز سے ایک آگ نہ نکلے جو بصریٰ کے اونٹوں کی گردنیں روشن کردے گی۔“

علماءِ محققین کے بیان کے مطابق یہ عظیم آگ بھی تاتاری فتنہ سے ایک سال قبل

مدینہ طیبہ کے نواح واطراف میں اپنی ان صفات کے ساتھ ظاہر ہوچکی ہے جو احادیث میں بیان کی گئی ہیں۔

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی ابتداء زبردست زلزلہ سے ہوئی جو ٣/ جمادیٰ الثانیہ/ ٦٥٤ھ بروز بدھ رات کو عشاء کے بعد آیا اور جمعہ کے دن چاشت کے وقت تک جاری رہ کر ختم ہوگیا، یہ آگ مدینہ طیبہ سے مشرقی سمت میں قریظہ کے مقام پر حرّہ کے پاس نمودار ہوئی، اس آگ کا پھیلاؤ کسی بڑے شہر کی طرح تھا، بجلی کی طرح گرج اور سمندر کی طرح اس کا جوش تھا، اس آگ نے پہاڑوں کو شیشہ کی طرح پگھلا دیا (اس کی عجیب خاصیت یہ تھی کہ وہ پتھروں کو جلا دیتی تھی مگر درختوں پر اس کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا) اس کی روشنی مکہ مکرمہ، ینبوع، تیماء حتیٰ کہ حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق بصریٰ جیسے دور ودراز علاقہ تک دیکھی گئی، یہ آگ اتوار ٢٧/ رجب/ (٥٢ دن) تک مسلسل بھڑکتی رہی، عجیب بات یہ ہے کہ یہ آگ مدینہ کے قریب تک پہنچی؛ مگر حرمِ مدینہ میں داخل نہیں ہوسکی، حتیٰ کہ ایک ہی پتھر کا جو حصہ حرمِ مدینہ کے باہر تھا اسے تو آگ نے جلا دیا اور جو حصہ اندرونِ مدینہ تھا وہاں پہنچ کر آگے ٹھنڈی ہوگئی۔ (مستفاد از: علاماتِ قیامت اور نزولِ مسیح: ١٣١ تا ١٣٦، مظاہر حق جدید: ٥/ ٢٩)

بہرحال قیامت کی یہ علامت بعیدہ بھی ظاہر ہوچکی ہے، البتہ یہاں یہ یاد رہے کہ قیامت کے بالکل قریب ایک دوسری آگ بھی مغرب سے ظاہر ہوگی، جو لوگوں کو محشر کی طرف ہانکے گی۔ (بخاری، مشکوٰۃ: ٤٧٠) یہ آگ اور ہے جو قیامت کی علاماتِ قریبہ میں سے ہے۔

یہ چند قیامت کی علاماتِ بعیدہ ہیں جو ظاہر ہوچکی ہیں، اس لیے قیامت سے غفلت ہرگز مناسب نہیں؛ بلکہ ہر وقت اس کی فکر اور تیاری ضروری ہے، حق تعالیٰ ہمیں یومِ آخرت کا استحضار نصیب فرمائیں۔ آمین۔

مؤرخہ: ٢٢/ ذوالقعدہ/ ١٤٤٠ھ

مطابق: ٢٦/ جولائی/ ٢٠١٩ء (بروز جمعہ، قبل المغرب، بزمِ صدیقی بڑودا)

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيْرًا ۔۔۔ فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيْرًا كَثِيْرًا

(۲۹)

قیامت کی علاماتِ متوسطہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "سَتَكُوْنُ فِتَنٌ الْقَاعِدُ فِيْهَا خَيْرٌ مِنَ الْقَائِمِ، وَالْقَائِمُ فِيْهَا خَيْرٌ مِنَ الْمَاشِيْ، وَالْمَاشِيْ فِيْهَا خَيْرٌ مِنَ السَّاعِيْ، مَنْ تَشَرَّفَ لَهَا تَسْتَشْرِفْهُ، فَمَنْ وَجَدَ مَلْجَأً أَوْ مَعَاذًا فَلْيَعُذْ بِهِ".

(متفق عليه، مشكوٰة : ٤٦٢ / كتاب الفتن)

ترجمہ : حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ عنقریب فتنے ظاہر ہوں گے، اس دورِ فتن میں بیٹھنے والا کھڑے ہونے والے سے بہتر ہوگا، اور کھڑا ہونے والا چلنے والے سے بہتر ہوگا، اور چلنے والا سعی کرنے والے (یعنی سواری کے ذریعہ یا پیادہ پا تیزی سے فتنے کی طرف دوڑنے والے) سے بہتر ہوگا، جو شخص بھی فتنوں کی طرف جھانکے گا فتنہ اسے اپنی طرف کھینچ لے گا (یعنی جو شخص ظہورِ فتن کے وقت ان فتنوں میں معلومات کی حد تک بھی دلچسپی لے گا تو فتنے اسے بھی اپنی لپیٹ میں لے لیں گے) لہٰذا جو شخص بھی دورِ فتن میں کوئی جائے پناہ (فتنوں کے شر سے بچنے کی محفوظ جگہ) پائے اسے چاہیے کہ وہ ضرور پناہ حاصل کرلے (تاکہ فتنوں سے دور اور محفوظ رہ سکے)۔"

قیامت کی علاماتِ متوسطہ سے مراد:

اللہ رب العزت نے قیامت کے متعلق قرآن پاک میں اعلان فرمایا ہے کہ ﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ﴾ (القمر: ١) "قیامت قریب آگئی"۔ لیکن خاص حکمت کے تحت وقوعِ قیامت میں کتنا عرصہ باقی ہے؟ یہ راز کسی مقرب نبی، ولی یا فرشتے کو بھی نہیں بتایا، البتہ اپنے آخری رسول، محبوبِ کل، ہادیٔ سبل جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ بندوں کو اس کی علامات سے باخبر کردیا، جن کے پڑھنے، سننے اور دیکھنے سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ واقعی اب قیامت قریب ہے، آپ ﷺ کی بیان کردہ علاماتِ قیامت بنیادی طور پر تین قسم کی ہیں: (۱) علاماتِ بعیدہ (۲) علاماتِ متوسطہ (۳) علاماتِ قریبہ۔ علاماتِ بعیدہ سے مراد وہ علامتیں ہیں جو ظاہر ہوچکی ہیں، جیسے حضور ﷺ کی بعثت، معجزۂ شق القمر، حضور ﷺ کی وفات، فتح بیت المقدس، فتوحات اور مال واسباب کی کثرت، ایک عام وبائی (طاعون کی) بیماری، ایک خاص قسم کا فتنہ اور سرزمین حجاز سے آگ کا نکلنا، جن کی تفصیلات بیان ہوچکی ہیں۔ اور علاماتِ متوسطہ سے مراد وہ علامات ہیں جو یا تو ظاہر ہوچکی ہیں، یا ہوں گی اور ان میں اضافہ ہوتا جائے گا، یہاں تک کہ قیامت کی علاماتِ قریبہ ظاہر ہوکر قیامت قائم ہوجائے گی، قیامت کی علاماتِ متوسطہ کی فہرست طویل ہے۔

فتنوں کا ظہور ہوگا:

منجملہ ان کے ایک بڑی اور بنیادی علامت ظہورِ فتن ہے، جس کی پیشین گوئی حدیث مذکورہ میں دیتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ "سَتَكُوْنُ فِتَنٌ"، عنقریب فتنے ظاہر ہوں گے، ایک دوسری روایت میں اس بات کو آپ ﷺ نے تین مرتبہ ارشاد فرمایا: "أَلَا سَتَكُوْنُ فِتَنٌ، أَلَا سَتَكُوْنُ فِتَنٌ، أَلَا سَتَكُوْنُ فِتَنٌ". (رواه مسلم، مشكوٰة: ٤٦٢) جس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ زمانے میں مختلف قسم کے فتنے ظاہری و باطنی، دینی و دنیوی، انفرادی و

اجتماعی اور چھوٹے بڑے غرض مختلف قسم کے فتنے یقینی طور پر ظاہر ہوں گے، یعنی آنے والا وقت پرفتن ہوگا، جس میں کفر وشرک، ضلالت ومعصیت اور دینی ودنیوی آفات ومصائب کا غلبہ ہوگا۔

قرآن وحدیث میں ''فتنہ'' کا لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے، مثلاً کفر وشرک، جیسے: ﴿وَ الْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ﴾ (البقرة:۲۱۷) ضلالت ومعصیت، جیسے: ﴿وَ مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ﴾ (المائدة:۴۱) ﴿أَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا﴾ (التوبة: ۴۹) آزمائش اور آفات ومصائب، جیسے: ﴿وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَيْرِ فِتْنَةً﴾ (الأنبياء:۳۵)

اور جب لفظ ''فتنہ'' میں ان تمام معانی کی گنجائش ہے تو اب ظہورِ فتن کا مطلب یہ ہوا کہ آئندہ زمانے میں کفر وشرک، ضلالت ومعصیت اور شدائد ومصائب کا غلبہ ہوگا، بلکہ عہد نبوی کے آخری دور سے اس کی ابتداء بھی ہوگئی، اس کے بعد اب جتنا زمانہ گزرتا جائے گا ان میں اضافہ ہوتا جائے گا، جیسا کہ دیگر روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

چنانچہ کفر وشرک کے متعلق منقول ہے کہ ان کا اس قدر غلبہ ہوگا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "يُصْبِحُ الرَّجُلُ مُؤْمِنًا، وَ يُمْسِي كَافِرًا، وَ يُمْسِي مُؤْمِنًا، وَ يُصْبِحُ كَافِرًا". (رواه مسلم، مشكوٰة : ۴۶۲) ''آدمی صبح کو مؤمن ہوگا اور شام کو کافر بن جائے گا، اسی طرح شام کو مؤمن ہوگا لیکن صبح کافر بن جائے گا۔'' کفرانِ نعمت میں مبتلا ہو جائے گا، یا کفار کے مشابہ ہو جائے گا، ایمانی تہذیب وتمدن اور طور وطریق چھوڑ کر غیروں کی تہذیب وتمدن اور طور وطریق اختیار کرلے گا۔

ضلالت ومعصیت کے متعلق منقول ہے کہ ان کا اس قدر غلبہ ہوگا کہ نیکی، بھلائی اور دین داری پر قائم رہنا ہاتھ میں انگارا پکڑنے کے مانند مشکل کام ہوگا۔ "الصَّابِرُ فِيْهِمْ عَلىٰ دِيْنِهٖ كَالْقَابِضِ عَلَى الْجَمْرِ". (رواه الترمذي، مشكوٰة: ۴۵۹)

آفات ومصائب کا اس قدر غلبہ ہوگا کہ ایک شخص جب دورِ فتن میں کسی قبر کے

قریب سے گزرے گا تو شدتِ فتن اور آفات ومصائب سے تنگ آکر یہ تمنا کرے گا کہ "يَا لَيْتَنِيْ كُنْتُ مَكَانَ صَاحِبِ هٰذَا الْقَبْرِ". (رواه مسلم، مشكوٰة:۴۶۹) کاش کہ اس قبر میں اس قبر والے کی جگہ میں ہوتا۔''

نیز ہر آنے والا زمانہ گزرے ہوئے زمانے سے زیادہ برا ہوگا۔ "لَا يَأْتِيْ عَلَيْكُمْ زَمَانٌ إِلَّا الَّذِيْ بَعْدَهٗ شَرٌّ مِنْهُ". (رواه البخاري، مشكوٰة:۴۶۲)

ظہورِ فتن کے اسباب:

یہ حضور پاک ﷺ کا معجزہ ہی ہے کہ علاماتِ قیامت کے طور پر ظہورِ فتن کی جو پیشین گوئی آپ ﷺ نے اپنے زمانے میں دی تھی نہ صرف یہ کہ اس کی ابتدا ہو چکی ہے بلکہ آئے دن اس میں اضافہ ہو رہا ہے، ہمارے علماء نے اسبابِ فتن پر کلام کرتے ہوئے فرمایا کہ ظہورِ فتن کے تین بنیادی اور بڑے اسباب ہیں: (۱) دین اور علماءِ دین سے دوری (۲) اختلافِ باہمی اور آپسی خانہ جنگی (۳) حکمرانوں اور دینی ودنیوی اداروں کے چھوٹے بڑے ذمہ داروں کی جانب سے اپنے ماتحتوں پر ظلم وزیادتی۔

اور عجیب بات یہ ہے کہ فتنوں کے ان تینوں اسباب کی پیشین گوئیاں بھی مختلف مواقع پر آپ ﷺ نے کی ہیں، مثلاً ارشاد ہوا کہ دین اسلام کا صرف نام اور قرآنِ کریم کے صرف الفاظ رہ جائیں گے، لوگ اسلامی تعلیمات اور قرآنی ہدایات سے دور ہو جائیں گے۔

" لَا يَبْقىٰ مِنَ الْإِسْلَامِ إِلَّا اسْمُهٗ، وَ لَا يَبْقىٰ مِنَ الْقُرْآنِ إِلَّا رَسْمُهٗ". (رواه البيهقي في شعب الإيمان، مشكوٰة : ۳۸)

نیز آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيْبًا، وَ سَيَعُوْدُ كَمَا بَدَأَ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ۲۹/ باب الاعتصام بالكتاب والسنة)

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ آج بعض یورپی ممالک میں اسلام (کی تعلیمات پر عمل)

تو ہے؛ لیکن وہ مسلمان نہیں ہیں، جب کہ مسلم ممالک میں مسلمان ہیں؛ لیکن اسلام اپنی حقیقت کے ساتھ نہیں۔

اسی طرح ایک موقع پر کثرتِ اختلاف کے متعلق پیشین گوئی کرتے ہوئے فرمایا:

" إِنَّهُ مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرٰى اخْتِلَافًا كَثِيْرًا". (رواه أحمد و أبوداود و الترمذی و ابن ماجه، مشكوٰة : ۳۰)

حکمرانوں اور ذمہ داروں کی طرف سے ان کے ماتحتوں پر ظلم وزیادتی کے متعلق پیشین گوئی کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا:

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" إِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ بَعْدِيْ أَثَرَةً وَ أُمُوْرًا تُنْكِرُوْنَهَا، قَالُوْا: فَمَا تَأْمُرُنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: أَدُّوْا إِلَيْهِمْ حَقَّهُمْ، وَ سَلُوْا اللّٰهَ حَقَّكُمْ". (متفق عليه، مشكوٰة : ۳۱۹/ كتاب الإمارة)

''میرے بعد تم (اپنے حکام اور ذمہ داران کی جانب سے) اپنے ساتھ ترجیحی سلوک اور بہت سی ناپسندیدہ چیزیں دیکھوگے (تمہیں مناصب وعہدوں وغیرہ سے نظرانداز کیا جائے گا اور اس کے علاوہ بہت سی ناپسندیدہ باتیں ان کی طرف سے پیش آئیں گی) صحابہؓ نے عرض کیا کہ حضور! ہمیں آپ اس وقت کے لیے کیا ہدایت اور حکم فرماتے ہیں؟ ارشاد ہوا کہ ان کا جو حق تمہارے ذمہ ہے اسے تم ادا کرنے کی فکر کرو، اور اپنے حق کی اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو۔''

نیز ایک موقع پر آپ ﷺ نے اپنی امت کے متعلق تین باتوں کا خوف ظاہر فرمایا: (۱) (جاہلیت کے عقیدہ کے مطابق) چاند کی منازل کے حساب سے بارش طلب کرنا (۲) حکمرانوں کا ظلم (۳) تقدیر کا انکار۔ (مشکوٰۃ:۳۲۲/کتاب الامارۃ/الفصل الثالث)

الغرض بنیادی طور پر ظہورِ فتن کے یہ وہ تین اسباب ہیں جن کی پیشین گوئیاں حدیث پاک میں بیان کی گئی ہیں۔

ظہورِ فتن کے اثرات:

اور جب فتنے ظاہر ہوں گے تو ان کے اثرات سے انسانی قلوب متاثر ہوں گے، وہ اس طرح کہ انسانی قلوب خواہشات کے غلام بن جائیں گے، جس کی پہلی نحوست یہ ہوگی کہ عام آدمی حق و باطل میں، صحیح وغلط میں، حلال وحرام میں، نیز ترجیحات میں (یعنی کیا فرض ہے؟ کیا واجب ہے؟ کیا سنت ومستحب ہے؟ اور کیا مباح ہے؟ تاکہ الاہم فالاہم کی ترتیب پر عمل ہو سکے) فرق کرنا مشکل ہو جائے گا، یہی وجہ ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فتنوں کو شب تاریک کے ساتھ تشبیہ دی اور فرمایا:"كَقِطَعِ اللَّيْلِ الْمُظْلِمِ" (رواه مسلم، مشكوٰة: ٤٦٢) مطلب یہ ہے کہ جس طرح رات اگر تاریک ہو تو انسان کو کچھ دکھائی نہیں دیتا، اسی طرح ظہورِ فتن کے وقت بھی عام انسان کو کچھ سمجھ میں نہ آئے گا کہ کیا کروں اور کہاں جاؤں؟ اور جب ظہورِ فتن کے اثرات سے انسانوں کے دل خواہشاتِ نفسانی کے عادی بن جائیں گے تو اس کی دوسری نحوست یہ ہوگی کہ عام آدمی معمولی دنیوی نفع کی خاطر اپنے دین وایمان کا سودا کرلے گا، چنانچہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ذرا کسی نے دھمکا دیا یا للچا دیا تو دروغ گوئی، جھوٹی گواہی اور ارتکابِ معاصی کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، اس طرح حدیث پاک "يَبِيْعُ دِيْنَهُ بِعَرَضٍ مِنَ الدُّنْيَا". (رواه مسلم، مشكوٰة:٤٦٢) بھی صادق آگئی۔

دورِ فتن کے احکام:

حضور پاک ﷺ کی کمالِ شفقت دیکھئے کہ آپ نے ایک طرف ظہورِ فتن کی پیشین گوئی فرمائی تو دوسری طرف اس کے شر سے بچنے کی تدابیر، تعلیمات اور احکام بھی بتائے، جو عاجز کے خیالِ ناقص کے مطابق بنیادی طور پر تین ہیں:

(۱) رجوع الی اللہ (۲) تعلق مع اللہ (۳) تقرب الی اللہ۔ رجوع الی اللہ کا حکم دیتے ہوئے خود حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ﴾ (الذريٰت: ٥٠)

رجوع الی اللہ کا مطلب بے دینی سے دین داری کی طرف، ضلالت سے ہدایت کی طرف، ظلم سے عدل کی طرف، معصیت سے طاعت کی طرف، گناہ سے توبہ کی طرف، اختلاف سے اتفاق کی طرف اور فتن سے امن کی طرف لوٹنا، پھر جس قدر ہو سکے فتنوں سے، فتنوں کی جگہوں سے اور فتنے میں مبتلا لوگوں سے دور رہنا، حدیث پاک میں ہے فتنوں کی طرف جھانکنا بھی نہیں چاہیے، یعنی بندہ معلومات کی حد تک بھی بندہ فتنوں میں دل چسپی نہ لے، ورنہ فتنوں میں مبتلا ہو جانے کی قوی اندیشہ ہے۔

اسی کے ساتھ دورِ فتن میں مسلمانوں کو اہل حق کی جماعت کے ساتھ وابستگی اختیار کرنے کی ترغیب بھی دی گئی:

"تَلْزَمُ جَمَاعَةَ الْمُسْلِمِيْنَ وَ إِمَامَهُمْ". (متفق عليه، مشكوٰة: ٤٦١)

پھر اگر اہل حق کی کوئی جماعت اور ان کا اِمام و رہبر نہ ملے، چاروں طرف فتنوں، گناہوں اور گمراہیوں والا ماحول ہو تو اس وقت حکم یہ ہے کہ تمام فرقوں سے الگ ہو کر اپنے اور اپنے اہل خانہ کے ایمان واعمال کی حفاظت کے لیے گوشہ نشینی اختیار کر لیں اور اپنی دینی و دنیوی ذمہ داریوں کو نبھائیں، لوگوں کے معاملات میں اور غیر ضروری امور میں دخل نہ دیں۔ چنانچہ فرمایا:"فَاعْتَزِلْ تِلْكَ الْفِرَقَ كُلَّهَا". (رواه مسلم، مشكوٰة: ٤٦١)

جہاں تک بات ہے تعلق مع اللہ کی، تو اس کا آسان ترین اور بہترین ذریعہ دعا ہے، جس سے بندہ بہ راہِ راست اپنے رب سے تعلق قائم کر سکتا ہے، حکم الٰہی ہے:

﴿ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً﴾ (الأعراف: ٥٥)

''اپنے رب سے دعا کرو گڑگڑا کے اور چپکے چپکے۔''

صاحبو! جب عام حالات میں اس حکم پر عمل ضروری ہے تو دورِ فتن میں بہ درجۂ اولیٰ ضروری ہے۔ لہٰذا دورِ فتن میں دعاؤں کا خوب اہتمام کیا جائے، خصوصاً قرآن وحدیث کی وہ

دعائیں جن میں فتنوں سے پناہ طلب کی گئی ہے، حدیث پاک میں اس کی بھی ترغیب وارد ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا:

"تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ". (رواه مسلم، مشكوٰة: ٤٦٢)

یعنی اللہ پاک سے تمام ظاہری اور باطنی فتنوں سے پناہ مانگو، اس کے لیے حدیث پاک کی وہ جامع دعا بھی مفید ہے، جس میں فرمایا:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ". (كنز العمال: ٢/٢٦٤)

''اے اللہ! میں آپ کی پناہ میں آتا ہوں تمام فتنوں سے، خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔''

رہی بات تقرب الی اللہ کی، تو اس کے لیے فرائض کا اہتمام، نواہی سے اجتناب، قرآنِ پاک کی تلاوت اور شریعت پر استقامت ضروری ہے، قرآن کی تلاوت تقرب الی اللہ کا بہترین ذریعہ ہے، چنانچہ سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتوں کے متعلق حدیث میں ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت، اس کی قربت اور حصولِ فلاحِ دارین کی دعا ہے۔

"فَإِنَّهَا صَلوٰةٌ، وَ قُرْبَانٌ، وَ دُعَاءٌ". (دارمی، مشكوٰة: ١٨٩)

جہاں تک تعلق ہے شریعت پر استقامت کا، تو حکم ہے:

﴿ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَ مَنْ تَابَ مَعَكَ﴾ (هود: ١١٢)

اس میں حق تعالیٰ نے حضور ﷺ اور اہل ایمان کو (شریعت پر) استقامت کا حکم دیا ہے۔ اس کا مطلب (یہاں) یہ ہے کہ رجوع الی اللہ، تعلق مع اللہ اور توبہ واہتمامِ دعا کے باوجود فتنوں میں مبتلا ہو جائے تو اس وقت دین وشریعت پر آدمی جما رہے اور صبر وضبط سے کام لے، یعنی اس راہ میں آنے والی تکالیف ومصائب پر صبر کرے، یقیناً یہ چیز تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے۔ حدیث پاک میں آپ ﷺ نے اس شخص کو تین مرتبہ خوش نصیب فرمایا جو فتنوں سے بچا لیا گیا، پھر اس شخص کو بھی خوش نصیب فرمایا جو فتنوں میں صبر وضبط سے کام لے، ہاں وہ بندہ بد نصیب ہے جو فتنوں سے محفوظ نہ رہے اور نہ ہی دورِ فتن میں صبر وضبط سے کام لے۔

عَنِ الْمِقْدَادِ بْنِ أَسْوَدَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: "إِنَّ السَّعِيْدَ لَمَنْ جُنِّبَ الْفِتَنَ، إِنَّ السَّعِيْدَ لَمَنْ جُنِّبَ الْفِتَنَ، إِنَّ السَّعِيْدَ لَمَنْ جُنِّبَ الْفِتَنَ، وَ لَمَنِ ابْتُلِيَ، فَصَبَرَ، فَوَاهًا". (رواه أبو داود، مشكوٰة: ٤٦٢)

دورِ فتن میں عمل بالشریعۃ کی فضیلت:

دورِ فتن میں عمل بالشریعۃ کی وجہ سے پیش آنے والی تکالیف ومصائب میں صبر کرنا گناہوں سے معافی، تلافی اور عذابِ آخرت سے خلاصی کا ذریعہ بن جائے گا، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَبِيْ مُوْسٰى ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "أُمَّتِيْ هٰذِهٖ أُمَّةٌ مَرْحُوْمَةٌ، لَيْسَ عَلَيْهَا عَذَابٌ فِي الْاٰخِرَةِ، عَذَابُهَا فِي الدُّنْيَا الْفِتَنُ وَ الزَّلَازِلُ وَ الْقَتْلُ". (رواه أبو داود، مشكوٰة: ٤٦٠)

میری امت مسلمہ امت مرحومہ ہے (کوئی حاکم ان پر رحم کرے نہ کرے، لیکن احکم الحاکمین ضرور رحم کرتا ہے اور کرتا رہے گا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی) میری اس امت کو آخرت میں (دائمی) عذاب نہ ہوگا (یا عذابِ شدید نہ ہوگا، یا امت کے اکثر طبقہ کو عذاب نہیں ہوگا، یا امت کے نیک لوگوں کو عذاب نہیں ہوگا) کیوں کہ میری امت کا عذاب دنیا کے فتنے، قتل، جھگڑے اور زلزلے ہیں۔

معلوم ہوا کہ امت مسلمہ کے صابرین کے لیے فتنوں کا وجود بھی اس اعتبار سے باعث رحمت ہے کہ یہ عذابِ آخرت سے حفاظت کا ذریعہ ہے، بشرطیکہ دورِ فتن میں عمل بالشریعۃ کا اہتمام کیا جائے اور اس راہ میں آنے والی تکالیف وشدائد پر صبر وضبط سے کام لیا جائے۔

ایک حدیث میں وارد ہے کہ دورِ فتن میں عمل بالشریعۃ اور عبادات واعمال کا اہتمام کرنے کا اَجر وثواب میری طرف ہجرت کے برابر ہے:

عَنْ مَعْقِلِ بْنِ يَسَارٍ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "الْعِبَادَةُ فِي الْهَرْجِ كَالْهِجْرَةِ إِلَيَّ". (رواه مسلم، مشكوٰة: ٤٦٢)

یعنی حضرات صحابہؓ کو ہجرت الی المدینہ پر جو انعام ملا تھا دورِ فتن میں عبادت پر ثابت قدم رہنے والے مسلمانوں کو وہی ثواب ملے گا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ کب تک انجام دیں؟

ایک حدیث میں تو دورِ فتن میں دین وشریعت پر جمنے اور عمل کرنے والوں کے لیے دورِ امن میں عمل کرنے والے پچاس صحابہؓ کے مانند اَجر وثواب کی فضیلت وارد ہوئی ہے، حدیث پاک میں ہے کہ حضرت ابوثعلبہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور پاک ﷺ سے ارشادِ باری کے متعلق دریافت کیا: ﴿يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾. (المائدة:١٠٥) (جس کا مطلب یہ ہے کہ اے ایمان والو! تم اپنی فکر کرو، جب تم راہ راست پر چل رہے ہو تو گمراہ شخص تمہارا کچھ بھی نقصان نہیں کر سکے گا) اس کے متعلق میں نے دریافت کیا کہ کیا اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک کر کے بس اپنی اصلاح اور اعمال میں لگ جائیں؟ فرمایا کہ نہیں، بلکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو اس وقت تک انجام دیتے رہو جب تک (وہ) پانچ برائیاں (جو قیامت کی علاماتِ متوسطہ ہیں) ظاہر نہ ہو جائیں: (۱) "إِذَا رَأَيْتَ شُحًّا مُطَاعًا" جب تم دیکھو کہ لوگ بخل کرنے میں لگے ہوئے ہیں، بخل کا غلبہ ہو جائے۔ (۲) "وَ هَوًى مُتَّبَعًا" جب تم دیکھو کہ لوگ ہوائے نفس کا اتباع کر رہے ہیں، یعنی ہر شخص نفس کا غلام بن جائے۔ (۳) "وَ دُنْيَا مُؤْثَرَةً" جب تم دیکھو کہ لوگ دنیا کو دین پر یا آخرت پر ترجیح دینے لگے ہیں، مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی ہر کوشش کا مطمحِ نظر صرف دنیا اور اس کا عارضی نفع بن جائے۔ (۴) "وَ إِعْجَابَ كُلِّ ذِيْ رَأْيٍ بِرَأْيِهٖ" اور جب تم دیکھو کہ ہر صاحب رائے (دینی ودنیوی

چھوٹا بڑا راہبر ولیڈر) اپنی رائے کو سب سے اچھا اور پسندیدہ سمجھنے لگے۔(۵)" وَ رَأَيْتَ أَمْرًا لَا بُدَّ لَكَ مِنْهُ، فَعَلَيْكَ نَفْسَكَ" اور جب تم دیکھو کہ گناہوں اور برے لوگوں کا ہر جگہ غلبہ ہے جس کی وجہ سے خود بھی کسی فتنہ اور گناہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ اور اندیشہ ہو، یا کسی اور ضروری معاملہ کی وجہ سے تمہیں امر بالمعروف کی قدرت نہ ہو تو اس وقت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو چھوڑ کر اپنی اصلاح کی فکر کرو اور لوگوں کے معاملات سے بے تعلق ہو جاؤ، کیوں کہ تمہارے آگے یعنی آنے والے زمانے میں ظہورِ فتن کے سبب ایامِ صبر آنے والے ہیں، ان میں طرح طرح کی آفات و بلیات اور تکالیف و مصائب نازل ہوں گی، "فَمَنْ صَبَرَ فِيهِنَّ قَبَضَ عَلَى الْجَمْرِ" ان دنوں دین پر چلنا آگ پر چلنے کے مانند ہوگا، لیکن ان تمام حقائق کے باوجود جو بندہ دین وشریعت پر استقامت اختیار کرے گا اور اس راہ میں آنے والی تکالیف و مصائب پر صبر وضبط سے کام لے گا اس کو دورِ امن کے پچاس بندوں کے عمل کے برابر اَجر وثواب سے نوازا جائے گا، حضراتِ صحابہؓ نے عرض کیا کہ حضور! کون سے پچاس بندوں کے مانند اَجر وثواب ملے گا؟ خود ان ہی کے یا ہمارے؟" قَالَ: أَجْرُ خَمْسِينَ مِنْكُمْ" (رواه الترمذي، مشكوٰة: ٤٣٧/ باب الأمر بالمعروف) فرمایا کہ تم (صحابہؓ) کے پچاس افراد کے برابر ثواب اُس بندے کو ملے گا۔ سبحان اللہ۔

صاحبو! ہم حضراتِ صحابہؓ سے شرفِ صحابیت میں تو کسی بھی طرح برابری نہیں کر سکتے، لیکن دورِ فتن میں شریعت پر ثابت قدم رہ کر بفضلہٖ تعالیٰ ان کے اَجر کی برابری کر سکتے ہیں، جب بندہ دین وشریعت سے اور اپنے رب سے وفا میں کمی نہیں کرتا تو رب العالمین بھی بندہ نوازی اور اپنی عطا میں کمی نہیں فرماتے، بلاشبہ یہ بھی فتنوں ہی کا دور ہے، لیکن حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق اس کے بعد اچھے دن آنے والے نہیں ہیں؛ بلکہ اور بھی سخت دن آسکتے ہیں، آج تو پھر بھی دین وشریعت پر چلنے اور عمل کرنے کی الحمد للہ آزادی ہے، اس سے فائدہ اُٹھایا جائے، ورنہ وہ وقت آسکتا ہے جس میں یہ آزادی بھی ختم ہو جائے۔ نیز اس میں بھی جس قدر ہو سکے فتنوں کے اسباب سے، فتنوں کی جگہوں سے اور فتنے میں مبتلا لوگوں سے دور

رہنا چاہیے، اس کے باوجود - العیاذ باللہ - اگر کوئی فتنوں میں مبتلا ہو جائے تو شریعت کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے اور اس کے لیے ان فضائل کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

جھوٹے نبیوں کا ظہور ہوگا:

حضور پاک ﷺ نے من جانب اللہ قیامت کی جو علامات بیان فرمائی ہیں ان میں ظہورِ فتن ایک ایسی جامع اور بنیادی علامت ہے کہ اس کے ضمن میں دوسری بہت سی علامتیں آجاتی ہیں، گویا دیگر جزئی علامات "ظہورِ فتن" کی تشریح وتفصیل ہیں، آپ ﷺ نے قیامت کی علاماتِ متوسطہ کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جھوٹے نبیوں، دھوکہ بازوں اور فتنہ پرداز لیڈروں کا ظہور ہوگا:

" سَيَكُونُ فِي أُمَّتِي كَذَّابُونَ ثَلَاثُونَ، كُلُّهُمْ يَزْعُمُ أَنَّهُ نَبِيُّ اللّٰهِ، وَ أَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ، لَا نَبِيَّ بَعْدِي". (رواه أبوداود و الترمذي، مشكوٰة : ٤٦٥)

"عنقریب میری امت میں تیس جھوٹے پیدا ہوں گے، ان میں سے ہر ایک دعویٰ کرے گا کہ میں اللہ کا نبی ہوں، حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں، میرے بعد کوئی نبی (بحیثیت نبی) نہیں۔"

حضور پاک ﷺ کی اس پیشین گوئی کے مطابق قیامت کی یہ علامت بھی ظاہر ہو گئی اور اس میں اضافہ ہو رہا ہے، کیوں کہ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والوں کا بدترین سلسلہ تو عہدِ رسالت ہی سے شروع ہو گیا تھا، تب سے اب تک کئی بدنصیبوں اور ملعونوں نے نبوت کا دعویٰ کیا، ان میں سے چند مشہور جھوٹوں کے نام یہ ہیں:

(۱)......صاف صیاد ۔ ۲ر ہجری ۔ مدینہ منورہ

(۲)......اسود بن کعب عوف عنسی ۔ ۶ر ہجری ۔ یمن

(۳)......طلیحہ بن خویلد اسعدی ۔ ۸ر ہجری ۔ خیبر

(۴)......مسیلمہ کذاب بن کبیر بن حبیب ۔ ۱۰ر ہجری ۔ یمامہ

(۵)......سباح بن حارث بن سوید	۱۴؍ہجری	الجزائر
(۶)......مختار بن ابوعبیدہ ثقفی	۲۴؍ہجری	کوفہ
(۷)......بیان بن سمعان تمیمی	۹۶؍ہجری	کوفہ
(۸)......ابومنصور عجلی	۱۲۰؍ہجری	کوفہ
(۹)......مغیرہ بن سعید عجلی	۱۲۹؍ہجری	کوفہ
(۱۰)......صالح بن طریف برغواطی	۱۳۰؍ہجری	اُندلس
(۱۱)......محمد بن فضلاس الخطاب	۱۳۴؍ہجری	کوفہ
(۱۲)......اسحاق اخرس مغربی	۱۳۵؍ہجری	شمالی افریقہ
(۱۳)......حکیم مقنع خراسانی	۱۴۸؍ہجری	ایران
(۱۴)......استاد سیس خراسانی	۱۵۴؍ہجری	ایران
(۱۵)......ابوعیسیٰ اسحاق بن یعقوب	۲۱۸؍ہجری	اصفہان
(۱۶)......علی بن محمد بن عبدالرحیم	۲۴۹؍ہجری	بحرین
(۱۷)......یہود بن ریان	۲۶۰؍ہجری	بحرین
(۱۸)......علی بن فضل یمنی	۲۹۳؍ہجری	یمن
(۱۹)......ابوطیب احمد بن حسین متنبّی	پیدائش:۳۰۳؍ہجری کوفہ	
(۲۰)......حامیم بن من اللہ محکسی	۳۱۳؍ہجری	افریقہ
(۲۱)......عبدالعزیز باسندی	۳۲۲؍ہجری	باسند
(۲۲)......حمزہ زورقی	۴۱۱؍ہجری	مصر
(۲۳)......اصفر بن ابوالحسین تغلبی	۴۳۹؍ہجری	نصیبین
(۲۴)......بہافرید بن ماہ فروزین	۴۴۲؍ہجری	نیشاپور
(۲۵)......ابوالقاسم احمد بن قسی	م:۵۵۰؍ہجری	مراکش
(۲۶)......حسین بن حمدان خصیبی	م:۶۵۶؍ہجری	عراق

(۲۷)......قطب الدین احمد بن ہلال	۴۸۰؍ہجری	دمشق
(۲۸)......بایزید بن عبداللہ انصاری	پیدائش:۹۳۱؍ہجری جالندھر، پنجاب، انڈیا	
(۲۹)......مرزا غلام احمد قادیانی	۱۹۰۲؍عیسوی	گرداس پور، پنجاب، انڈیا
(۳۰)......چراغ دین	۱۹۰۳؍عیسوی	جموں، کشمیر، انڈیا
(۳۱)......عبداللہ تیماپوری	۱۹۰۴؍عیسوی	حیدرآباد، دکن، انڈیا
(۳۲)......عبداللہ پٹواری	۱۹۰۷؍عیسوی	چیچہ وطنی
(۳۳)......نبی بخش مرزائی	۱۹۱۱؍عیسوی	سیال کوٹ
(۳۴)......احمد سعید قادیانی	۱۹۱۸؍عیسوی	سمجھر یابی
(۳۵)......احمد مخرر کابلی سرمہ فروش	۱۹۱۸؍عیسوی	پنجاب
(۳۶)......یحییٰ عین اللہ بہاری	۱۹۲۰؍عیسوی	گیا، بہار، انڈیا
(۳۷)......خواجہ اسماعیل لندنی	۱۹۳۰؍عیسوی	لندن
(۳۸)......ٹمو ہی عرف کارڈ بوعلی	۱۹۲۶؍عیسوی	لاطینی امریکہ
(۳۹)......محمد علی غازی پوری	۱۹۸۲؍عیسوی	شیخوپورہ، پاکستان
(۴۰)......غلام فرید	۱۹۸۳؍عیسوی	کشکشہ، ہزارہ، پاکستان

ان کے علاوہ قیامت تک جو بھی نبوت کا دعویٰ کرے گا اس کا جھوٹ ظاہر ہو کر رہے گا، کیوں کہ حضور پاک ﷺ نے ان کے متعلق پیشین گوئی کرتے ہوئے صاف فرمادیا کہ میں خاتم النبیین ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہیں، قرآن نے بھی اس کا اعلان کردیا:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَآ أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ (الأحزاب : ٤٠)

دھوکہ باز رہبروں اور فتنہ پرداز لیڈروں کا ظہور ہوگا:

احادیث مبارکہ کی پیشین گوئی کے مطابق قیامت کی علاماتِ متوسطہ میں یہ بھی ہے

کہ ایسے دھوکہ باز لوگ ظاہر ہوں گے جو دین کے نام پر لوگوں کو ایسی غلط حدیثیں اور باتیں بتا کر گمراہ کریں گے جو پہلے کبھی سنی نہیں ہوں گی، حدیث میں ان سے بچنے اور چوکنا رہنے کی تاکید فرمائی گئی ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "یَکُوْنُ فِیْ اٰخِرِ الزَّمَانِ دَجَّالُوْنَ کَذَّابُوْنَ، یَأْتُوْنَکُمْ مِنَ الْأَحَادِیْثِ بِمَا لَمْ تَسْمَعُوْا أَنْتُمْ وَ لَا اٰبَاؤُکُمْ، فَإِیَّاکُمْ وَ إِیَّاهُمْ، لَا یُضِلُّوْنَکُمْ وَ لَا یَفْتِنُوْنَکُمْ".

(رواه مسلم، مشکوٰة: ٢٨ / باب الاعتصام بالکتاب والسنة)

اسی طرح آپ ﷺ نے فتنہ پرداز لیڈروں کے ظاہر ہونے کی بھی پیشین گوئی دی ہے، حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ اللہ کی قسم! حضور ﷺ نے کسی بھی ایسے فتنہ پرداز کو ذکر کرنے سے نہیں چھوڑا تھا جو دنیا کے ختم ہونے تک پیدا ہونے والا ہے اور جس کے متبعین کی تعداد تین سو تک یا اس سے زائد ہوگی، آپ ﷺ نے ہر فتنہ پرداز کا ذکر کرتے وقت ہمیں اس کا اور اس کے باپ اور قبیلہ کا نام تک بتا دیا۔

"وَ اللّٰهِ مَا تَرَکَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مِنْ قَائِدِ فِتْنَةٍ إِلٰی أَنْ تَنْقَضِيَ الدُّنْیَا یَبْلُغُ مَنْ مَعَهٗ ثَلَاثَ مِائَةٍ فَصَاعِدًا، إِلَّا قَدْ سَمَّاهُ لَنَا بِاسْمِهٖ وَ اسْمِ أَبِیْهِ وَ اسْمِ قَبِیْلَتِهٖ".

(رواه أبو داود، مشکوٰة: ٤٦٣)

یہ فتنہ پرداز لیڈر علماءِ سوء اور عوام الناس دونوں میں سے ہو سکتے ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ قیامت کی علاماتِ متوسطہ میں جھوٹے نبیوں، دھوکہ باز رہبروں اور فتنہ پرداز لیڈروں کا ظہور بھی ہے، تو قیامت کی یہ علامت بھی نہ صرف یہ کہ ظاہر ہوگئی بلکہ اس میں آئے دن اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

علم کا خاتمہ ہو جائے گا:

قیامت کی علاماتِ متوسطہ میں یہ بھی ہے کہ علم رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گا اور جہالت و

بدعت پھیل جائے گی، پھر اس کے نتیجہ میں بہت سی برائیاں وجود میں آئیں گی، حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَنَسٍؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ: "إِنَّ مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ أَنْ یُرْفَعَ الْعِلْمُ، وَ یَکْثُرَ الْجَهْلُ، وَ یَکْثُرَ الزِّنَا، وَ یَکْثُرَ شُرْبُ الْخَمْرِ، وَ یَقِلَّ الرِّجَالُ، وَ یَکْثُرَ النِّسَاءُ، حَتّٰی یَکُوْنَ لِخَمْسِیْنَ امْرَأَةً الْقَیِّمُ الْوَاحِدُ".

(متفق علیه، مشکوٰة: ٤٦٩ / باب أشراط الساعة)

"بلا شبہ قیامت کی علاماتِ (متوسطہ) میں سے یہ ہے کہ علم اُٹھا لیا جائے گا، جہالت کی کثرت ہوگی، زنا کی زیادتی ہوگی اور شراب بکثرت پی جانے لگے گی، (قتل وقتال کے سبب) مردوں کی تعداد میں کمی اور عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہو جائے گا، یہاں تک کہ پچاس عورتوں کی کفالت کرنے والا ایک مرد ہوگا۔"

علم کے خاتمہ کا ایک مطلب یہ ہے کہ علماءِ حق کا خاتمہ ہو جائے گا، وہ یکے بعد دیگرے دنیا سے رُخصت ہو جائیں گے، پھر رسمی طور پر سرکاری و درباری علماء رہیں گے، جو خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کر دیں گے۔ حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِنَّ اللّٰهَ لَا یَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعًا یَنْتَزِعُهٗ مِنَ الْعِبَادِ، وَ لٰکِنْ یَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ، حَتّٰی إِذَا لَمْ یُبْقِ عَالِمًا اتَّخَذَ النَّاسُ رُؤُوْسًا جُهَّالًا، فَسُئِلُوْا، فَأَفْتَوْا بِغَیْرِ عِلْمٍ، فَضَلُّوْا وَ أَضَلُّوْا". (متفق علیه، مشکوٰة: ٣٣ / کتاب العلم)

"اللہ تعالیٰ علم کو (آخری زمانہ میں) اس طرح نہیں اُٹھائیں گے کہ علماء کو علم عطا فرمانے کے بعد ان کے سینوں سے اور دل و دماغ سے اسے نکال دیں، بلکہ علم اس طرح اٹھائیں گے کہ علماء کو دنیا سے اٹھا لیا جائے گا، یہاں تک کہ جب کوئی بڑا عالم ربانی باقی نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو اپنا صدر اور پیشوا بنا لیں گے اور ان سے شرعی مسائل میں رہبری حاصل کریں گے، پھر وہ بغیر علم کے فتویٰ دیں گے، جس کی وجہ سے خود بھی گمراہ ہوں گے اور

لوگوں کو بھی گمراہ کردیں گے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ علم پر عمل کرنے والوں کا خاتمہ ہوجائے گا، اگر علم ہوگا بھی تو اس پر عمل نہیں ہوگا۔

جہالت و بدعت پھیل جائے گی:

حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "يَتَقَارَبُ الزَّمَانُ، وَ يَنْقُصُ العَمَلُ، وَ يُلْقَى الشُّحُّ". (رواه البخاری / کتاب الفتن)

"زمانہ قریب قریب ہوجائے گا (اوقات میں سے برکت ختم ہوجائے گی) عمل کم ہوجائے گا اور بخل بڑھ جائے گا۔" اور جب علم و عمل رفتہ رفتہ ختم ہوجائے گا تو اس کے نتیجہ میں جہالت پھیلے گی، اور یہ حقیقت ہے کہ جہالت ضلالت کا سبب ہے، جہالت سے دینی اور دنیوی دونوں طرح کے نقصانات ہوتے ہیں، چنانچہ جہالت کا دنیوی نقصان تو ذلت ہے اور دینی نقصان بدعت ہے، اس لیے کہ بدعت کا سبب یا تو جہالت ہے، یا نفس کی خباثت و شرارت ہے، یہی وجہ ہے کہ جب جہالت بڑھتی ہے تو بدعت کی کثرت ہوتی ہے، اور بدعت کی کثرت بھی قیامت کی علامات میں سے ہے، جس کی طرف اس حدیث پاک سے اشارہ ملتا ہے جس میں حضور پاک ﷺ نے یوم قیامت میں حوضِ کوثر کے پانی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "لَيَرِدَنَّ عَلَيَّ أَقْوَامٌ أَعْرِفُهُمْ وَ يَعْرِفُوْنَنِیْ" وہاں میرے پاس کچھ ایسے لوگ آئیں گے جنہیں میں اور وہ مجھے پہچان لیں گے، "ثُمَّ يُحَالُ بَيْنِیْ وَ بَيْنَهُمْ" پھر میرے اور ان کے درمیان کوئی چیز حائل کردی جائے گی، "فَأَقُوْلُ: إِنَّهُمْ مِنِّیْ" تو میں کہوں گا کہ یہ تو میرے اپنے ہیں، جوابًا مجھے بتایا جائے گا: "فَيُقَالُ: "إِنَّكَ لَا تَدْرِیْ مَا أَحْدَثُوْا بَعْدَكَ". آپ کو نہیں معلوم کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا، نئی باتیں اور مختلف قسم کی بدعتیں (جو کفر و شرک کی حدود سے ملتی تھیں) پیدا کی تھیں، تب میں کہوں گا کہ "سُحْقًا لِمَنْ غَيَّرَ بَعْدِیْ"

(متفق علیہ، مشکوٰۃ: ۴۸۷) وہ لوگ دور ہوں مجھ سے اور اللہ کی رحمت سے جنہوں نے میرے بعد دین و شریعت میں تبدیلی کردی۔

الغرض علماءِ حقانی و ربانی کی کمی یا علم و عمل کی کمی نیز جہالت و بدعت کی کثرت قیامت کی علاماتِ متوسطہ میں سے ہے، جس میں اب بکثرت اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

نیک لوگ رَفتہ رَفتہ اُٹھ جائیں گے:

اس کے علاوہ قیامت کی علاماتِ متوسطہ میں بنیادی علامت ارتکابِ معاصی یعنی گناہوں کی کثرت ہے، مختلف احادیث مبارکہ میں اس کا اجمالی تذکرہ ملتا ہے، عاجز کے خیالِ ناقص میں ارتکابِ معاصی کی ایک بڑی وجہ نیک لوگوں کی کمی ہے، جو قیامت ہی کی ایک نشانی ہے، حدیث میں ہے کہ قیامت سے قبل نیک لوگ رَفتہ رَفتہ اُٹھ جائیں گے، پھر بے حیثیت (اور بدکار) قسم کے لوگ رہ جائیں گے (جس کے نتیجہ یہ ہوگا کہ بے حیائی اور بدکاری عام ہوجائے گی)۔

"يَذْهَبُ الصَّالِحُوْنَ الْأَوَّلُ فَالْأَوَّلُ، وَ يَبْقَىٰ حُفَالَةٌ كَحُفَالَةِ الشَّعِيْرِ أَوِ التَّمْرِ، لَا يُبَالِيْهِمُ اللّٰهُ بَالَةً". (رواه البخاری / کتاب الرقاق / باب ذهاب الصالحين، مشکوٰۃ: ۴۵۸، باب تغیر الناس)

بے حیائی اور بخیلی کی کثرت ہوگی:

حدیث پاک میں مذکور ہے کہ قیامت سے قبل بے حیائی کی کثرت ہوگی:

عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: "وَ الَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ، لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَظْهَرَ الفَحْشُ وَ البُخْلُ". (المستدرك للحاكم: ۸۶۴۴)

"اُس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے، قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک بے حیائی اور بخیلی عام نہ ہوجائے، بلاشبہ قیامت کی یہ علامت بھی

ایک عرصہ سے ظاہر ہو چکی ہے، آج بخیلی و بے حیائی کا ہر جگہ غلبہ ہے؛ بلکہ بے حیائی کا ایک سیلاب ہے جس نے شرم وحیا کی ساری حدوں کو پار کر دیا، عورت جسے شرم وحیا کا مجسمہ ہونا چاہیے آج وہی سب سے زیادہ بے حیائی وعریانی کو پھیلا رہی ہے، روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت سے قبل بے حیائی کا یہ عالم ہوگا کہ عورتیں لباس پہننے کے باوجود (لباس کی باریکی، تنگی، چستی اور کمی وغیرہ کے باعث) برہنہ ہوں گی اور (دوسروں کو اپنی اداؤں، ناز نخروں اور اشاروں سے اپنی طرف) مائل کرنے والی اور (خود بھی دوسروں کی طرف) مائل ہونے والی ہوں گی، ان کے سروں پر جو بال ہوں گے وہ عمدہ ترین بختی اونٹوں کے کوہان کے مانند حرکت کرتے ہوئے نظر آئیں گے، ایسی بے حیا عورتیں نہ تو جنت میں (ابتدائی مرحلہ میں) داخل ہوں گی اور نہ جنت کی خوشبو ہی محسوس کر سکیں گی، حالانکہ جنت کی خوشبو بہت دور کی مسافت سے محسوس کی جائے گی۔

”وَ نِسَاءٌ كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ مُمِيلَاتٌ مَائِلَاتٌ، رُؤُوسُهُنَّ كَأَسْنِمَةِ الْبُخْتِ الْمَائِلَةِ، لَا يَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ، وَ لَا يَجِدْنَ رِيحَهَا، وَ إِنَّ رِيحَهَا لَيُوجَدُ مِنْ مَسِيرَةِ كَذَا وَ كَذَا“. (رواہ مسلم، مشکوٰۃ: ۳۰۶)

کیا قیامت کی یہ نشانی آج ہر جگہ پوری ہوتی ہوئی دکھائی نہیں دیتی؟

اس لیے صحیح کہا ہے جس نے بھی کہا:

جسم پر لباس کی کمی عجیب لگتی ہے — مجھے امیر باپ کی بیٹی غریب لگتی ہے

ہم جنس پرستی کی کثرت ہو جائے گی:

پھر بے حیائی اگر عورتوں میں ہے تو مردوں میں بھی کچھ کم نہیں، اسی بے حیائی ہی کے نتیجے میں بدکاری، ہم جنس پرستی اور زنا کاری عام ہوگی، احادیث مبارکہ میں قیامت کی جو علامات متوسطہ بیان فرمائی گئیں ان میں ہم جنس پرستی بھی ہے، یعنی مردوں کا مردوں سے اور عورتوں کا عورتوں سے شہوت پوری کرنا، حدیث میں ہے کہ جب میری اُمت ان چھ

۲۳۵

گناہوں میں مبتلا ہوگی (جو علاماتِ قیامت میں سے ہیں) تو ان پر ہلاکت وتباہی آئے گی (العیاذ باللہ العظیم) (۱) جب امت میں لعن طعن کی کثرت ہوگی (۲) شراب کی کثرت ہوگی (۳) مرد بھی ریشمی لباس پہننے لگیں گے (۴) لوگ گانے والیاں (یا ان کے گانے اپنے پاس) رکھنے لگیں (۵) مرد مردوں کے ساتھ (۶) عورتیں عورتوں کے ساتھ اپنی شہوت اور جنسی ہوس کو پورا کرنے لگیں۔ (تو امت پر ہلاکت وتباہی آئے گی)۔

عَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ: ”إِذَا اسْتَحَلَّتْ أُمَّتِي سِتًّا، فَعَلَيْهِمُ الدَّمَارُ، إِذَا ظَهَرَ فِيهِمُ التَّلَاعُنُ، وَ شَرِبُوا الْخُمُورَ، وَ لَبِسُوا الْحَرِيرَ، وَ اتَّخَذُوا الْقِيَانَ، وَ التَقَى الرِّجَالُ بِالرِّجَالِ وَ النِّسَاءُ بِالنِّسَاءِ“. (المعجم الأوسط: ۱/۳۰۵)

امت کی ہلاکت میں جن برائیوں کو خاص دخل ہے ان میں ہم جنس پرستی بھی ہے، حیرت یہ ہے کہ اب اسے گناہ بھی نہیں سمجھا جاتا، بلکہ بہت سے بے حیا لوگ اسے قانونی درجہ اور حق دینے کی کوشش کرتے ہیں، حاصل یہ کہ ہم جنس پرستی کی کثرت بھی قیامت کی وہ علامت ہے جو ساری دنیا میں عام ہو چکی ہے۔

زنا کاری کی کثرت ہوگی:

بے حیائی کے نتیجہ میں زنا کاری بھی بہت عام ہوگی، اور زنا کی کثرت کو بھی حدیث میں علاماتِ قیامت میں شمار فرمایا گیا ہے، چنانچہ متفق علیہ روایت میں ہے کہ ”وَ يَكْثُرُ الزِّنَا“. آج زنا کی کثرت کا یہ حال ہے کہ بے حیا مرد وعورت (اجنبی ہونے کے باوجود) ایک ساتھ میاں بیوی کی طرح بغیر شادی کے رہ رہے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کا بغیر نکاح وشادی کے اس طرح ساتھ رہنا زنا ہی ہے، جس کا اب بکثرت رواج ہو رہا ہے، اس سے بھی آگے کی بات یہ ہے کہ ایک مرد کئی کئی عورتوں سے ناجائز تعلق رکھتا ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ قیامت سے قبل عورتوں کی کثرت ہوگی، پچاس عورتوں کے لیے ایک مرد ہوگا۔

”وَ يَكْثُرُ النِّسَاءُ، حَتّٰى يَكُونَ لِخَمْسِينَ امْرَأَةً الْقَيِّمُ الْوَاحِدُ“. (متفق علیہ،

مشکوٰۃ : ٤٦٩)

اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ ایک مرد پچاس عورتوں سے ناجائز تعلق رکھے گا۔
(مستفاد از فتح الباری:۱/۱۷۹)

علاوہ ازیں روایات سے پتہ چلتا ہے کہ قیامت سے قبل زنا اس قدر عام ہوگا کہ لوگ کھلے عام راستوں پر زنا کریں گے، یعنی اس معاملہ میں انسانوں اور جانوروں میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس زمانہ میں بہترین شخص وہ ہوگا جو یہ کہے کہ کم از کم پس پردہ چھپ کر ہی کرلو۔

"وَ الَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَا تَفْنیٰ هٰذِهِ الْأُمَّةُ حَتّٰى يَقُوْمَ الرَّجُلُ إِلَى الْمَرْأَةِ، فَيَفْتَرِشُهَا فِي الطَّرِيْقِ، فَيَكُوْنُ خِيَارُهُمْ يَوْمَئِذٍ مَنْ يَقُوْلُ:" لَوْ وَارَيْتَهَا وَرَاءَ هٰذَا الْحَائِطِ". (مسند أبي يعلى الموصلي:٦١٨٣)

کیا آج کھلے عام پارکوں، پارٹیوں، میدانوں اور سمندروں کے کناروں پر بدکاری اور زناکاری کے مناظر عام نہیں ہیں؟ اس کی برائی کا احساس بھی نہیں رہا، نیز زناکاری کی کثرت کی ایک غیر محسوس صورت یہ بھی ہے کہ بعض میاں بیوی طلاق کے بعد بھی ساتھ رہتے ہیں، ظاہر ہے کہ طلاق کے بعد ان کا ساتھ رہنا اور جنسی تعلق قائم کرنا زنا ہی ہے، اور یہ بھی قیامت کی علامت ہے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا:

"يَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ يُطَلِّقُ الرَّجُلُ الْمَرْأَةَ، ثُمَّ يَجْحَدُهَا طَلَاقَهَا، فَيُقِيْمُ عَلٰى فَرْجِهَا، فَهُمَا زَانِيَانِ مَا أَقَامَا". (المعجم الأوسط للطبراني:٤٨٦١)

"ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا کہ مرد اپنی بیوی کو طلاق دینے کے بعد طلاق کا انکار کر دے گا، پھر اسی (مطلقہ) کے ساتھ بدستور ہم بستری کرے گا، لہٰذا جب تک یہ دونوں ساتھ رہیں گے اور جنسی تعلق قائم رکھیں گے زنا میں مبتلا رہیں گے۔" یہ برائی بھی آج کل نئی نہیں رہ گئی، بہت سے لوگ اس میں مبتلا ہیں اور انہیں کوئی پرواہ بھی نہیں۔

ناجائز اولاد کی کثرت ہوگی:

ظاہر ہے کہ جب زنا کی کثرت ہوگی تو ولد الزنا یعنی زنا سے پیدا ہونے والی (حرامی) اولاد کی بھی کثرت ہوگی، یہی وجہ ہے کہ علماء نے اسے بھی علاماتِ قیامت میں شمار فرمایا ہے:

"يَا ابْنَ مَسْعُوْدٍ! إِنَّ مِنْ أَعْلَامِ السَّاعَةِ وَ أَشْرَاطِهَا أَنْ يَكْثُرَ أَوْلَادُ الزِّنَا".
(رواه الطبراني في المعجم الأوسط : ٤٨٦١)

بہرحال قیامت کی علاماتِ متوسطہ میں بے حیائی، ہم جنس پرستی، زناکاری اور زنا کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی حرامی اولاد کی کثرت بھی ہے، یہ ساری علامات آج ظاہر ہو کر بڑھتی ہی جارہی ہیں۔

مال و دولت کی کثرت علامت قیامت ہے:

اسی کے ساتھ قیامت کی علاماتِ متوسطہ میں مال و دولت کی کثرت بھی ہے، جس کا ذکر مختلف احادیث میں موجود ہے،

حدیث جبرئیل میں آپ ﷺ نے قیامت کی علامتوں میں سے اس بات کو بیان فرمایا:

"وَ أَنْ تَرَى الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُوْنَ فِي الْبُنْيَانِ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ١١)

تم دیکھو گے کہ جن کے پاؤں میں جوتا نہیں، تن پر ٹھیک سے کپڑا نہیں، ایسے تنگ دست غریب بکریاں چرانے والے بھی اس قدر امیر بن جائیں گے اور اونچی اونچی عمارتیں بنانے لگیں گے اور اس میں ایک دوسرے کے ساتھ مسابقت کریں گے۔ اس وقت دنیا میں بلند و بالا عمارتیں تعمیر ہو چکی ہیں، ایسی عمارتوں کی تعمیر ضرورت کی وجہ سے ہو تو وہ مذموم نہیں، البتہ فخر و مباہات اور نام و نمود کے لیے ہو تو مذموم ہے۔

نیز ایک حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی یَکْثُرَ الْمَالُ وَ یَفِیْضَ، حَتّٰی یَخْرُجَ الرَّجُلُ بِزَکوٰةِ مَالِهٖ، فَلَا یَجِدُ أَحَدًا یَقْبَلُهَا مِنْهُ، وَ حَتّٰی تَعُوْدَ أَرْضُ الْعَرَبِ مُرُوْجًا وَ أَنْهَارًا". (رواه مسلم، مشکوٰة: ٤٦٩/ باب أشراط الساعة)

اس میں قیامت کی علاماتِ متوسطہ کے طور پر ایک بات تو یہ بیان فرمائی کہ قربِ قیامت میں مال و دولت کی فراوانی اس قدر ہوگی کہ ایک مخلص مؤمن اپنے مال کی زکوٰۃ نکالے گا (اس کے لیے کسی مستحق زکوٰۃ کو تلاش کرے گا) تو اسے زکوٰۃ لینے والا کوئی مستحق نہیں ملے گا، کیوں کہ کوئی غریب ہوگا ہی نہیں، قیامت سے قبل غریب لوگ بھی امیر بن جائیں گے۔

سرزمین عرب کی ہریالی اور مال کی فراوانی قیامت کی نشانی:

دوسری بات یہ بیان فرمائی کہ سرزمین عرب میں ہریالی یعنی باغات، نہریں اور بلند وبہترین عمارتوں کا سلسلہ پھیل جائے گا، اگرچہ یہاں جس خوشحالی اور مال و دولت کی فراوانی کا تذکرہ ہے اس کا اصل عروج تو حضرت امام مہدی کے ظہور کے وقت ہوگا، لیکن اس کا ایک حصہ ظاہر ہو کر مکمل ہو چکا، کیوں کہ عہد صحابہؓ میں جب فتوحات ہوئیں تو قیصر و کسریٰ کے خزانے مسلمانوں کے ہاتھ لگے، اس وقت یہی صورتِ حال تھی، اس کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور میں بھی بڑی خوشحالی اور مال و دولت کی فراوانی تھی، قیامت سے قبل پھر یہی صورتِ حال پیدا ہوگی، بلکہ کچھ حد تک اس کی ابتدا ہو چکی ہے، آج عرب کی زمین میں باغات اور بلندترین عمارتوں کا ایک سلسلہ ہے، اس طرح قیامت کی یہ علامت یعنی سرزمین عرب کی ہریالی اور مال کی فراوانی بھی ظاہر ہو چکی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک راویت ہے جس میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ جب تم

دیکھو کہ مکہ مکرّمہ کا پیٹ چیر کر نہروں جیسی چیزیں بنادی گئی ہیں اور مکہ مکرمہ کی عمارتیں پہاڑوں کی چوٹیوں کے برابر اونچی ہوگئی ہیں تو سمجھ لو کہ معاملہ تمہارے سر پر آچکا ہے۔ (یعنی قیامت قریب ہے)۔

"فَإِذَا رَأَیْتَ مَکَّةَ قَدْ بُعِجَتْ کَظَائِمَ، وَ رَأَیْتَ الْبِنَاءَ یَعْلُوْ رُؤُوْسَ الْجِبَالِ، فَاعْلَمْ أَنَّ الْأَمْرَ قَدْ أَظَلَّكَ". (رواه ابن أبي شيبة في مصنفه: ٣٧٢٣٢)

حضرت شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ "یہ حدیث صدیوں سے حدیث کی کتابوں میں نقل ہوتی آرہی ہے؛ لیکن اس کو پڑھنے والے یہ بات پوری طرح نہیں سمجھ سکتے تھے کہ مکہ مکرمہ کا پیٹ چیرنے کا کیا مطلب ہے؟ اور اس کا پیٹ چیر کر نہروں جیسی چیزیں کیسے بنادی جائیں گی؟ لیکن آج جس شخص کو بھی مکہ مکرمہ کی زیارت کا موقع ملا ہے وہ دیکھ سکتا ہے کہ مکہ مکرمہ میں واقع کتنے پہاڑوں اور چٹانوں کے پیٹ چیر کر زمین دوز راستے اور سرنگیں بنادی گئی ہیں، آج مکہ مکرمہ میں ان سرنگوں کا جال بچھا ہوا نظر آتا ہے، اور ان میں نہروں کی طرح شفاف سڑکوں پر کس طرح ٹریفک رواں دواں ہے، اس کے علاوہ مکہ مکرمہ کی عمارتیں نہ صرف پہاڑ کی چوٹیوں کے برابر ہوگئی ہیں بلکہ بعض جگہ اُن سے بھی اونچی چلی گئی ہیں۔ (اصلاحی خطبات: ۷/۲۳۳ تا ۲۳۵ ملخصًا)

تجارت اور اس کے اَسباب ووسائل کا بڑھ جانا:

الغرض قیامت کی نشانی مال و دولت کی فراوانی بھی ہے، جو آج جگہ جگہ نظر آرہی ہے، اور جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا اس میں اضافہ ہوتا جائے گا، عاجز کے خیالِ ناقص میں اس کی دو وجہیں ہیں: (۱) تجارت اور اس کے اَسباب و وسائل کا بڑھ جانا (۲) حلال وحرام کی تمیز کا ختم ہو جانا۔ کیوں کہ حدیث میں ہے کہ قیامت سے قبل تجارتیں بڑھ جائیں گی، یا تجارت کرنے والے اور کمانے والے بڑھ جائیں گے، نہ صرف یہ کہ مرد کمائیں گے، بلکہ عورتیں بھی کمائی میں مرد کے شانہ بہ شانہ رہیں گی، یا کمائی کے اَسباب و وسائل بڑھ

جائیں گے، حدیث میں ہے:

" إِنَّ بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ تَسْلِيمَ الخَاصَّةِ، وَ فُشُوَّ التِّجَارَةِ، حَتّٰى تُعِينَ المَرْأَةُ زَوْجَهَا عَلَى التِّجَارَةِ". (المستدرك للحاكم)

''قیامت کے قریب سلام صرف مخصوص لوگوں (جان پہچان والوں) کو کیا جائے گا اور تجارت پھیل جائے گی، حتیٰ کہ عورت تجارت میں اپنے شوہر کا تعاون کرے گی۔''

یہ بات واضح رہے کہ اگرچہ بوقت ضرورت و مجبوری عورت کے لیے شرعی حدود میں رہتے ہوئے معاشی اور کاروباری جدوجہد کی اجازت ہے؛ لیکن ان کے لیے بھی اپنا گھر ہی بہتر ہے، لہٰذا یہ کوشش بھی گھر میں رہتے ہوئے کی جائے تو بہتر ہے، اور آج تو اس کے بہت سے اَسباب و وسائل بھی پائے جاتے ہیں، اور کاروباری و معاشی اسباب و وسائل کی زیادتی بھی قیامت کی ایک نشانی ہے، حدیث میں ہے:

" لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَظْهَرَ الفِتَنُ، وَ يَكْثُرَ الكِذْبُ، وَ يَتَقَارَبُ الأَسْوَاقُ". (غاية المقصد فی زوائد المسند:٨٣٧)

قیامت کی علاماتِ متوسطہ میں فتنوں کا ظاہر ہونا، جھوٹ کی کثرت اور بازاروں کا قریب قریب ہو جانا ہے۔ بازار کے قریب ہو جانے کا ایک مطلب یہ ہے کہ بازار ایک دوسرے سے قریب ہوں گے، ہر گلی اور محلّہ میں اِتنی کثرت سے بازار ہوں گے کہ انسان ایک بازار سے نکلے گا تو دوسرے میں داخل ہو جائے گا، ایک شوپنگ مول سے نکلے گا تو دوسرے میں داخل ہوگا۔ یا پھر مطلب یہ ہے کہ تجارت کے اسباب و وسائل میں اس قدر ترقی ہوگی کہ لوگ گھر بیٹھے کاروبار اور تجارت کریں گے، آج دنیا کے گلوبل ویلیج بن جانے سے ایسا واقعی ہو چکا ہے۔ حاصل یہ کہ مال و دولت کی فراوانی کی پہلی وجہ تجارت اور اس کے اسباب وسائل کا بڑھ جانا ہے۔

حلال وحرام کی تمیز کا ختم ہو جانا:

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ تجارت میں احکامِ شریعت سے غفلت اور کمائی کے طریقوں میں حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز ختم ہو جائے گی، حدیث میں اسے بھی قیامت کی علامت قرار دیا گیا ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ:" يَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يُبَالِي المَرْأُ مَا أَخَذَ مِنْهُ، أَ مِنَ الحَلَالِ ؟ أَمْ مِنَ الحَرَامِ؟".

(رواه البخاری، مشكوٰة : ٢٤١)

''قیامت سے قبل ایسا وقت آئے گا کہ لوگ کچھ پرواہ نہیں کریں گے کہ جو کچھ وہ کما رہے ہیں اس کے اسباب و ذرائع حلال ہیں یا حرام؟''

ایک حدیث میں ہے کہ حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ عنقریب کچھ لوگ ایسے ہوں گے (قیامت سے قبل) جو اپنی زبانوں سے گائے کی طرح کھائیں گے۔

" سَيَكُونُ قَوْمٌ يَأْكُلُونَ بِأَلْسِنَتِهِمْ كَمَا تَأْكُلُ البَقَرُ مِنَ الأَرْضِ".

(رواه أحمد فی مسنده : ١٥١٧)

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ ایسی بیماریاں یا پھر ایسے سخت حالات پیدا ہوں گے کہ لوگ گائے، بیل (اور جانوروں) کی طرح اپنی زبانوں سے کھائیں گے، یعنی اپنے ہاتھ سے کھانے پر قادر نہ ہوں گے۔ (العیاذ باللہ)

دوسرا مطلب یہ ہے کہ لوگ جانور کی طرح ہر رَطب و یابس یعنی حلال و حرام کی پرواہ کیے بغیر سب کچھ کھا جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

آج اکثر لوگوں کا حال یہی ہے کہ مال و دولت جمع کرنے کی فکر ہے، حلال و حرام کی فکر نہیں، تجارت، ملازمت اور دولت میں ترقی ہونی چاہیے، خواہ سودی قرض لینا پڑے یا چاپلوسی کرنی پڑے یا ناپ تول میں کمی کرنی پڑے۔ العیاذ باللہ۔

پہلے دولت کما لیتے تھے عزت کے لیے
اب تو عزت بھی گنوادیتے ہیں دولت کے لیے
اس قدر مصروف ہو گئے تجارت کے لیے
کہ وقت ہی نہیں بچتا عبادت کے لیے

صاحبو! برکت حلال میں ہے، حرام میں کثرت تو ہوسکتی ہے؛ لیکن برکت کبھی نہیں ہوسکتی، اور حلال کے تھوڑے سے خواہ پیٹ نہ بھرے لیکن دل ضرور مطمئن ہو جاتا ہے، جب کہ حرام سے پیٹ تو بھر جاتا ہے، دل مطمئن نہیں ہوتا، نیز جب حرام سے پیٹ بھر جاتا ہے تو دل کے خیالات وجذبات فاسد ہو جاتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ مختلف برائیاں وجود میں آتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی پکڑ اور عذاب کا سبب ہیں۔

عذابِ الٰہی کا بنیادی سبب ارتکابِ معاصی ہے:

الغرض! قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کی علاماتِ متوسطہ میں بنیادی نشانی ظہورِ فتن اور ارتکابِ معاصی ہے۔ اور عذابِ الٰہی کا اصل اور بنیادی سبب بھی ارتکابِ معاصی ہے، قرآن پاک میں مذکور ہے کہ اب تک جن قوموں پر عذابِ الٰہی نازل ہوا اس کا بنیادی سبب ارتکابِ معاصی اور گناہوں کی کثرت ہے: ﴿فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنْبِهِ﴾ (العنکبوت: ٤٠) آئندہ بھی جب کبھی گناہوں کی کثرت ہوگی تو مختلف قسم کے عذاب نازل ہوں گے۔ چنانچہ ترمذی کی ایک جامع روایت میں (قیامت سے قبل جن گناہوں کی کثرت ہوگی ان میں سے) پندرہ قسم کے گناہوں پر مختلف قسم کے عذاب کی وعید شدید وارد ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: (١) "إِذَا اتُّخِذَ الْفَيْءُ دُوَلًا".

جب مالِ غنیمت کو (ذاتی دولت) قرار دیا جانے لگے، یہاں مالِ غنیمت سے مراد ہر وہ مال ہے جس میں مسلمانوں کے غریبوں اور ضرورت مندوں کا حق ہو، اس میں اسلامی

حکومت کا خزانہ (بیت المال) اور کفار سے بطورِ جزیہ وصلح کے حاصل ہونے والا مال بھی داخل ہے اور اپنی ذاتی زکوٰۃ یا اپنے اداروں اور اوقاف کے لیے قوم سے حاصل کیا ہوا چندہ بھی داخل ہے، مطلب یہ ہے کہ جس مال میں مسلمانوں کے غریبوں کا حق ہو اسے کوئی مال دار یا منتظم ومہتمم اپنا حق اور ذاتی مال سمجھ کر استعمال کرنے لگے (تو یہ حرام خوری عذابِ الٰہی کا سبب ہے)۔

(۲) "وَالْأَمَانَةُ مَغْنَمًا" اور جب امانت کو بھی مالِ غنیمت کی طرح سمجھ کر استعمال کیا جانے لگے (تو یہ بھی حرام ہے جو عذابِ الٰہی کا سبب ہے)۔

(۳) "وَالزَّكٰوةُ مَغْرَمًا" اور زکوٰۃ کو تاوان، ٹیکس اور جرمانہ سمجھ لیا جائے، یعنی جس طرح ٹیکس میں آدمی چوری کرتا ہے یا مجبوری میں ادا کرتا ہے اسی طرح زکوٰۃ کو بھی کما حقہ ادا نہ کرے یا بوجھ سمجھ کر ادا کرے (تو ادائے زکوٰۃ میں کوتاہی بھی عذابِ الٰہی کا سبب ہے)

(۴) "وَتُعُلِّمَ لِغَيْرِ الدِّيْنِ" اور جب علم دین جو دین وآخرت کی درستی کے لیے حاصل کیا جانا چاہیے اسے بھی دنیوی اغراض ومقاصد کے لیے حاصل کیا جانے لگے (العیاذ باللہ العظیم، تو یہ بھی رب العالمین کی ناراضی اور عذابِ الٰہی کا سبب ہے)۔

(۵) "وَأَطَاعَ الرَّجُلُ امْرَأَتَهُ" مرد ہر جائز اور ناجائز امر میں بیوی کی فرماں برداری کرے (یعنی بیوی کا امام بننے کے بجائے خود اس کا غلام بن جائے، یا بیوی کی محبت شریعت پر غالب آجائے تو یہ بھی تباہی اور عذابِ الٰہی کا ذریعہ ہے) "وَعَقَّ أُمَّهُ" لیکن ماں کی نافرمانی کرے۔ اور ترمذی میں حضرت علیؓ کی روایت میں "وَجَفَا أَبَاهُ" (مشکوٰۃ: ٤٧٠) کا ذکر ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ باپ کے ساتھ جور وجفا کرنے لگے۔ اور دونوں روایتوں کا خلاصہ یہی ہے کہ ماں باپ کی تو عزت، عظمت اور خدمت کرنی چاہیے، لیکن اس کے بجائے ان کے ساتھ نافرمانی وایذارسانی کا معاملہ ہونے لگے (تو ظاہر ہے کہ ماں باپ کے ساتھ بدسلوکی بھی عذابِ الٰہی کا سبب ہے)۔

(۶) "وَأَدْنٰى صَدِيْقَهُ" اور جب دوستوں کو قریب کیا جانے لگے، یعنی دوستوں سے ہر وقت قریب مگر اپنوں اور گھر والوں سے دور رہے۔ یا پھر دوستوں کے ساتھ تو اچھا

سلوک کیا جائے؛ لیکن گھر والوں اور والدین کے ساتھ بدسلوکی کی جائے، جیسا کہ اگلے جملے میں فرمایا کہ

(۷) ”وَ أَقْصَى أَبَاهُ“ اور جب باپ کو دور کیا جانے لگے، مطلب یہی ہے کہ غیروں کے ساتھ بڑائیاں اور اپنوں کے ساتھ لڑائیاں، دوستوں کی دلجوئی کے خاطر والدین اور اہل خانہ کی دل شکنی کی جائے، تو اس بداخلاقی پر بھی عذابِ الٰہی نازل ہوگا۔

(۸) ”وَ ظَهَرَتِ الْأَصْوَاتُ فِي الْمَسَاجِدِ“ اور جب مساجد میں آوازیں بلند ہونے لگیں، اس کے دو مطلب ہیں، ایک تو یہ کہ دنیوی باتیں کی جائیں گی، حالانکہ علماء نے مسجد میں مباح کلام کو بھی مکروہ قرار دیا ہے۔ (شامی: ۱/۶۶۲)

دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ دینی باتیں بھی بلا وجہ زور زور سے کی جائیں گی، آج نماز اور بیان وغیرہ کے لیے بلاضرورت مائک کا استعمال نیز اجتماعی دعا وذکر میں زور زور سے چیخنا یہ سب ممنوع ہے، جو آج کل عام ہے، نیز مساجد میں بازاروں کی طرح شور وشغب یہ بھی مساجد کی بے اَدبی اور بے حرمتی ہے، جو عذابِ الٰہی کا ذریعہ ہے، عموماً آج کل مساجد کے ساتھ ہمارا یہی برتاؤ ہے۔

(۹) ”وَ سَادَ الْقَبِيلَةَ فَاسِقُهُمْ“ جب قبیلوں کی سیادت وقیادت فاسقوں اور فاجروں کے ہاتھوں میں آجائے گی۔

(۱۰) ”وَ كَانَ زَعِيمُ الْقَوْمِ أَرْذَلَهُمْ“ قوم کا لیڈر وہ ہوگا جو ان میں سب سے زیادہ (عند اللہ) ذلیل اور کمینہ ہو، پہلے جملے میں قبیلہ جو قوم کی نسبت چھوٹا اور محدود ہوتا ہے اس کی سرداری کے لیے فاسق وفاجر کے آگے بڑھنے بڑھانے کی برائی کو ذکر کیا گیا، جب کہ دوسرے جملے میں قوم کی ذمہ داری کے لیے ذلیل ترین اور بدترین انسان کو آگے کرنے کا ذکر ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر چھوٹی بڑی ذمہ داری، سرداری اور لیڈرشپ کے لیے نااہلوں کو آگے کیا جائے گا، اور ہر دینی یا دنیوی عہدے پر نااہلوں کا تسلط ہوگا، جس سے فساد اور عذاب ہی آئے گا۔

(۱۱) ”وَ أُكْرِمَ الرَّجُلُ مَخَافَةَ شَرِّهِ“ اور جب شریر آدمی کی شرارت اور شیطنت کے خوف سے اس کا اکرام کیا جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی کا اکرام واعزاز اس کی دین داری، شرافت نسبی، بلند اخلاقی اور تقویٰ وپرہیزگاری کی وجہ سے نہیں؛ بلکہ اس شرپسند شخص کی ایذا رَسانی وغنڈہ گردی سے بچنے کے لیے کیا جائے گا، کیوں کہ ہر جگہ تقریباً ایسے ہی شرپسندوں کا غلبہ ہوگا، اور جب ایسا ہوگا تو اللہ تعالیٰ عذاب نازل ہوگا۔

(۱۲-۱۳) ”وَ ظَهَرَتِ الْقَيْنَاتُ وَ الْمَعَازِفُ“ جب گانے والیوں اور مزامیر یعنی گانے بجانے اور لہو ولعب کے آلات کی کثرت ہوگی، اس میں موبائل فون کا غلط استعمال، انٹرنیٹ کا غلط استعمال، گانے، میوزک، فحش پروگرام، سینما ہال، جوا خانہ، کلب وغیرہ سب داخل ہیں۔ آج کل جابہ جا ان چیزوں کی کثرت ہے، نفاق کے غلبہ کی ایک وجہ ناچ گانے کی کثرت بھی ہے، کیوں کہ حدیث میں ہے کہ اس سے دلوں میں نفاق پیدا ہوتا ہے۔ (مشکوٰۃ) ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال خود ہی ایک عذاب ہے۔

(۱۴) ”وَ شُرِبَتِ الْخُمُوْرُ“ اور شرابیں پی جانے لگیں گی۔ یہاں ”خَمْرٌ“ کی جمع ”خُمُوْر“ لاکر اشارہ اس بات کی طرف کر دیا کہ اس زمانہ میں مختلف قسم کی شرابیں مختلف ناموں سے رائج ہوں گی، جو ہر گلی کوچہ میں عام ہوں گی، کیا بچہ، کیا بڑا، کیا جوان، کیا بوڑھا، کیا مرد، کیا عورتیں، کیا سفر، کیا حضر، ہر جگہ شراب کا عام رواج ہوگا، جس سے تباہی آئے گی اور عذابِ الٰہی نازل ہوگا۔

(۱۵) ”وَ لَعَنَ آخِرُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ أَوَّلَهَا“ امت کے بعد والے برے لوگ اگلے نیک لوگوں پر لعنت وملامت کریں گے، آج جو دین سے دوری ہے اس کی ایک بڑی وجہ حضرات صحابہؓ وصلحاء اور اسلاف وعلماء سے بدگمانی بھی ہے، اور اسی بدگمانی کے سبب اُنہیں سب وشتم کا نشانہ بنایا جارہا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی ناراضی وعذابِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔

مذکورہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان گناہوں کی کثرت بھی قیامت کی علاماتِ متوسطہ میں سے ہے، قیامت سے قبل ان گناہوں کی کثرت ہوگی۔

قیامت سے قبل پانچ قسم کے عذاب آئیں گے:

اس حدیث کے اخیر میں حضور پاک ﷺ نے ان گناہوں کے سبب پانچ قسم کے عذاب کی اطلاع دی ہے:

(۱) "رِيْحًا حَمْرَاءَ" سرخ یعنی تیز وتند ہوا کا عذاب نازل ہوگا، جس سے بلند وبالا عمارتیں اور مستحکم درخت بھی ہل جائیں گے اور بڑی تباہی آئے گی، قرآنِ کریم کے بیان کے مطابق پچھلی اُمتوں میں یہ عذاب قومِ عاد پر نازل ہوا تھا۔

(۲) "وَ زَلْزَلَةً" زلزلوں کے چھوٹے بڑے جھٹکے آئیں گے۔ کون نہیں جانتا کہ زلزلے کے معمولی جھٹکے بھی کتنے خطرناک ہوتے ہیں، اس کے معمولی جھٹکے بھی بڑی بڑی بستیوں کو یکدم صفحۂ ہستی سے مٹا دیتے ہیں۔

(۳) "وَ خَسْفًا" زمین میں دھنسا دیا جائے گا۔ قرآن کے بیان کے مطابق یہ عذاب قارون اور اس کے ہمنواؤں پر آیا تھا، جو رب گناہوں کے سبب پچھلے لوگوں پر عذاب نازل کرسکتا ہے وہ آج بھی کرسکتا ہے، لہٰذا بہت ڈرنے کی ضرورت ہے۔

(۴) "مَسْخًا" گنہگار لوگوں کی صورتیں مسخ کردی جائیں گی۔ (یا ان کے دلوں کو مسخ کردیا جائے گا) یہ عذاب بھی بنی اسرائیل میں نازل ہو چکا ہے، قرآن کے بیان کے مطابق بنی اسرائیل کو بندر کی شکل میں مسخ کردیا گیا تھا: ﴿كُونُوا قِرَدَةً خٰسِئِينَ﴾ (البقرة:٦٥) اس امت کے بعض خطرناک قسم کے مجرموں پر بھی یہ عذاب نازل ہوا ہے اور آئندہ بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ حدیث پاک میں اس کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔

(۵) "وَ قَذْفًا" (ترمذی، مشکوٰۃ:۴۷۰) پتھروں کی بارش ہوگی۔ قومِ لوط پر پتھروں کی بارش ہوئی تھی، اسی طرح ابرہہ اور اس کے لشکر پر آسمان سے کنکر کا برسنا قرآن سے ثابت ہے۔

بارش کے سلسلہ میں ایک پیشین گوئی اور قیامت کی نشانی یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ

بارش کی کثرت ہوگی، مگر پیداوار میں قلت ہوگی، حدیث پاک میں وارد ہے:

" لَيْسَتِ السَّنَةُ بِأَنْ لَا تُمْطَرُوا، وَ لٰكِنِ السَّنَةُ أَنْ تُمْطَرُوا وَ تُمْطَرُوا، وَ لَا تُنْبِتُ الْأَرْضُ شَيْئًا". (رواه مسلم / باب في سكنى المدينة و عمارتها قبل الساعة)

"قحط سالی یہ نہیں ہے کہ بارش نہ ہو؛ بلکہ قحط سالی یہ ہے کہ بارش تو خوب ہو؛ لیکن زمین کچھ نہ اُگائے۔" جب بارش اس قدر کثرت سے ہوگی تو وہ کھیتیوں کی تباہی کا سبب بن جائے گی۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ بداعمالیوں اور گناہوں کی وجہ سے جب اس قسم کے عذاب پچھلی اُمتوں پر نازل ہوئے تو اس اُمت پر بھی نازل ہوں گے، اس سے حفاظت کا طریقہ یہی ہے کہ رجوع الی اللہ (اہتمامِ استغفار وتوبہ) تعلق مع اللہ (اہتمامِ دعا) اور تقرب الی اللہ (فرائض کا اہتمام اور معاصی سے اجتناب) اختیار کیا جائے۔

حق تعالیٰ دارین میں محض اپنے فضل وکرم سے اپنی پکڑ، عذاب اور ناراضی سے ہمیں بچا کر اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

یومِ عرفہ/ ۱۴۴۰ھ

مطابق: ۱۱/ اگست/ ۲۰۱۹ء

قبل المغرب (بزمِ صدیقی، بڑودا)

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيرًا فَصَلُّوا عَلَيْهِ كَثِيرًا كَثِيرًا

(۳۰)

قیامت کی علاماتِ قریبہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ حُذَیۡفَۃَ بۡنِ أُسَیۡدٍ الۡغِفَارِيِّ رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡہُ قَالَ: " اِطَّلَعَ النَّبِيُّ ﷺ عَلَیۡنَا، وَ نَحۡنُ نَتَذَاکَرُ، فَقَالَ: مَا تَذۡکُرُوۡنَ؟ قَالُوۡا : نَذۡکُرُ السَّاعَۃَ، فَقَالَ: إِنَّھَا لَنۡ تَقُوۡمَ حَتّٰی تَرَوۡا قَبۡلَھَا عَشۡرَ اٰیَاتٍ، فَذَکَرَ الدُّخَانَ، وَ الدَّجَّالَ، وَ الدَّآبَّۃَ، وَ طُلُوۡعَ الشَّمۡسِ مِنۡ مَغۡرِبِھَا، وَ نُزُوۡلَ عِیۡسَی بۡنِ مَرۡیَمَ، وَ یَأۡجُوۡجَ وَ مَأۡجُوۡجَ، وَ ثَلاَثَۃَ خُسُوۡفٍ، خَسۡفٌ بِالۡمَشۡرِقِ، وَ خَسۡفٌ بِالۡمَغۡرِبِ، وَ خَسۡفٌ بِجَزِیۡرَۃِ الۡعَرَبِ، وَ اٰخِرُ ذٰلِكَ نَارٌ تَخۡرُجُ مِنَ الۡیَمَنِ، تَطۡرُدُ النَّاسَ إِلٰی مَحۡشَرِھِمۡ، وَ فِيۡ رِوَایَۃٍ : نَارٌ تَخۡرُجُ مِنۡ قَعۡرِ عَدَنَ، تَسُوۡقُ النَّاسَ إِلَی الۡمَحۡشَرِ، وَ فِيۡ رِوَایَۃٍ فِي الۡعَاشِرِ : وَ رِیۡحٌ تُلۡقِي النَّاسَ فِي الۡبَحۡرِ".

(رواہ مسلم، مشکوٰۃ : ۴۷۲ / باب العلامات بین یدي الساعۃ و ذکر الدجال)

ترجمہ : حضرت حذیفہ بن اُسید غفاریؓ سے مروی ہے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے ہمیں جھانک کر دیکھا، ہم اس وقت آپس میں قیامت کا تذکرہ کررہے تھے، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''تم کس چیز کا تذکرہ کررہے ہو؟'' ہم نے عرض کیا کہ ''ہم قیامت کا تذکرہ کررہے ہیں، ارشاد فرمایا کہ ''قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک کہ تم دس (بڑی اور خاص) نشانیاں نہ دیکھ لو''، پھر آپ ﷺ نے اُن کو اس طرح بیان فرمایا کہ

(۱) دُھواں (۲) دجال (۳) دابۃ الارض (۴) سورج کا مغرب سے نکلنا (۵) نزولِ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام (۶) یاجوج و ماجوج کا نکلنا (۷) خسوفِ ثلاثہ، جن میں سے ایک مشرق میں (۸) دوسرا مغرب میں (۹) تیسرا جزیرۃ العرب میں (۱۰) سب سے اخیر میں آگ ہوگی جو یمن سے نکل کر لوگوں کو سرزمین محشر کی طرف دھکیل دے گی، اور ایک روایت میں قعرعدن (یمن کے ایک شہر عدن کے دور و دراز علاقہ) سے نکلنے والی آگ کا تذکرہ ہے، جو لوگوں کو محشر (سرزمین شام کا وہ مقام جہاں قیامت کے دن لوگوں کو حساب و کتاب کے لیے جمع کیا جائے گا) کی طرف ہانکے گی، اور ایک روایت میں دسویں نشانی کے طور پر ایک خاص قسم کی ہوا کا ذکر ہے جو لوگوں کو سمندر میں ڈال دے گی۔''

(اس روایت میں حضور پاک ﷺ نے قیامت کی علاماتِ قریبہ کو مطلقاً بیان فرمایا ہے، بالترتیب نہیں؛ کیوں کہ ہمارے علماء کے قول کے مطابق یہاں ''واؤ'' ترتیب کے لیے نہیں؛ بلکہ مطلقاً جمع کے لیے ہے۔ فافہم۔)

حالات کا حل:

اللہ رب العالمین نے اپنے آخری رسول جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ دنیائے انسانیت کو قیامت کی علامات بتادیں، اب یہ لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ از خود یا حضرات علماءِ حقانی و ربانی کے توسط سے کتاب و سنت میں موجود علاماتِ قیامت کو معلوم کرکے دنیا کے مکر و فریب سے بچ جائیں اور سخت سے سخت مایوس کن حالات میں بھی احکامِ شریعت پر جم کر فکر آخرت میں لگ جائیں۔ عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ

تمام حالات و مصائب کا ایک ہی ہے حل
اِخلاص و اِستقامت کے ساتھ شریعت پہ چل

سرکارِ دو عالم ﷺ نے اسے قرآن کی زبانی اس طرح بیان فرمایا کہ

﴿ فَفِرُّوۡٓا اِلَی اللّٰہِ ؕ اِنِّیۡ لَکُمۡ مِّنۡہُ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ۝﴾ (الذّٰریٰت: ۵۰)

لوگو! جلدی کرو، اللہ کی طرف آجاؤ، شیطان کی اطاعت سے رحمان کی اطاعت کی طرف آجاؤ، خواہشاتِ نفسانی سے مرضیاتِ ربانی اور شریعت اسلامی کی طرف آجاؤ۔ موت اور قیامت سے پہلے پہلے ہر کسی کے لیے یہ زندگی اور اس کے شب و روز ایک بہترین موقع ہیں، شریعت اسلامیہ کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس سے فائدہ اُٹھاؤ۔

﴿ إِنِّیْ لَكُمْ مِنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴾ (الذٰریت : ٥٠)

یقیناً میں تمہیں من جانب اللہ صاف صاف تنبیہ کرنے والا ہوں، آپ ﷺ نے قیامِ قیامت تک کے حالات اور ان کا حل بھی بتا دیا کہ شریعت پر استقامت یہ ہر زمانہ میں تمام حالات و مصائب کا حقیقی و یقینی حل ہے، چنانچہ فرمایا:

"بَادِرُوْا بِالْأَعْمَالِ سِتًّا: الدُّخَانَ، وَ الدَّجَّالَ، وَ دَابَّةَ الْأَرْضِ، وَ طُلُوْعَ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا، وَ أَمْرَ الْعَامَّةِ، وَ خُوَيْصَّةَ أَحَدِكُمْ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٤٧٢)

صاحبو! شریعت پر اخلاص کے ساتھ استقامت اِس آخری دور میں کرامت سے کم نہیں؛ کیوں کہ حضور ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق قیامت سے قبل دنیا میں بے دینی و بے حیائی، عیاری و عیاشی اور گمراہی کا غلبہ ہوگا، اس وقت دین پر چلنا آگ پر چلنے سے زیادہ مشکل ہوگا، یہی وجہ ہے کہ دورِ آخر میں شریعت پر استقامت اختیار کرنے والوں کو دورِ اوّل کے مسلمانوں یعنی حضراتِ صحابہؓ کے پچاس افراد کے برابر اجر و ثواب دیا جائے گا، جیسا کہ حدیث پاک میں اس کا وعدہ ہے: "أَجْرُ خَمْسِيْنَ مِنْكُمْ" (ترمذی، مشکوٰۃ: ٤٣٧/باب الأمر بالمعروف)

دنیا کے حالات عارضی ہیں، اَحکامِ شریعت پر عمل کا اَجر دائمی ہے، لہٰذا سخت حالات میں بھی عزم و ہمت سے کام لیتے ہوئے شریعت پر استقامت کے ساتھ چلنا چاہیے، اس سے تمام حالات و مصائب یا تو دنیا ہی میں حل ہوجائیں گے یا پھر آخرت میں تو یقیناً ہوں گے۔

علاماتِ قریبہ اور ان کے ظہور کا وقت:

حضور ﷺ نے من جانب اللہ قیامت تک کی جن علامات و حالات کا بالتفصیل تذکرہ فرمایا ہے علماء نے ان کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں: (١) علاماتِ بعیدہ (٢) علاماتِ متوسطہ (٣) علاماتِ قریبہ۔ پہلی دو قسموں کی تفصیلات پچھلے مضامین میں بحمد اللہ آچکیں۔

جہاں تک علاماتِ قریبہ کا تعلق ہے تو اس سے مراد قیامت کی وہ بنیادی اور بڑی خاص علامات و واقعات ہیں جن کا ظہور قیامت کے بالکل قریب پے در پے ہوگا، جیسے: ظہورِ مہدیؒ، خروجِ دجال، نزولِ عیسیٰ علیہ السلام، خروجِ یاجوج و ماجوج، خسوفِ ثلاثہ، دُھویں کا نکلنا، سورج کا مغرب سے نکلنا، دابۃ الارض، پھر ہوا اور آگ کا نکلنا وغیرہ، ان کے بعد کسی بھی وقت صور پھونک دیا جائے گا اور قیامت قائم ہوجائے گی، جس طرح صبح صادق کے بعد دِن شروع ہوجاتا ہے اِن علاماتِ قریبہ کے بعد قیامت قائم ہوجائے گی۔

اب سوال یہ ہے کہ قیامت کی علاماتِ قریبہ کب ظاہر ہوں گی؟ تو ایک حدیث سے اس طرف اشارہ ملتا ہے کہ علاماتِ قریبہ کا ظہور تقریباً دوسری صدی کے بعد ہوگا:

عَنْ أَبِيْ قَتَادَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "الْآيَاتُ بَعْدَ الْمِائَتَيْنِ". (رواه ابن ماجه، مشكوٰة : ٤٧١ / باب أشراط الساعة)

یعنی قیامت کے بڑی بڑی اور خاص خاص علامتوں کا ظہور دو سو سال کے بعد ہوگا، یہ دو سو سال کب سے شمار ہوں گے؟ تو محدثین نے فرمایا کہ یا تو حضور ﷺ کی ہجرت کے بعد یا وفات کے بعد۔

اگر لفظ "الْمِائَتَيْنِ" میں الف لام کو عہدِ خارجی کے لیے مانا جائے تو پھر اس سے مراد وہ دو سو سال ہیں جو ایک ہزار سال کے بعد ہوں گے، گویا اس میں اشارہ ہے کہ بارہ سو سال تک قیامت کی علاماتِ بعیدہ و متوسطہ جن کو علاماتِ صغریٰ اور چھوٹی علامات کہتے ہیں مکمل ہوجائیں گی، اس کے بعد علاماتِ کبریٰ یعنی بڑی علامتیں ظاہر ہوں گی۔ واللہ اعلم۔

(مستفاد از: توضیحات شرحِ مشکوٰۃ: ۷/۵۲۶، ومظاہر حق جدید: ۵/۴۱)

مطلب یہ ہے کہ حضرت مہدی رضی اللہ عنہ کے ظہور تک جتنی علاماتِ قیامت ہیں وہ سب علاماتِ صغریٰ ہیں، حضرت مہدیؒ کے ظہور کے بعد سے نفخ صور تک قیامت کی علاماتِ قریبہ کبریٰ ہیں، پھر وقوعِ قیامت ہے۔

علاماتِ قریبہ سے قبل کے حالات:

قیامت کی علاماتِ قریبہ کبریٰ سے قبل دنیا کے کیا حالات ہوں گے؟ احادیث مبارکہ میں ان کا بھی تذکرہ موجود ہے، مثلاً (۱) دین وشریعت پر عمل کرنے والوں کے لیے پابندی، جس کی وجہ سے اس وقت دین پر چلنا آگ پر چلنے اور ہاتھ میں انگارہ پکڑنے کے مانند مشکل ہوجائے گا۔ "الصَّابِرُ فِيهِمْ عَلَى دِيْنِهٖ كَالْقَابِضِ عَلَى الْجَمْرِ" (ترمذی، مشکوٰۃ: ٤٥٩) (۲) وقت میں بے برکتی، علماءِ حق کی کمی، فتن، بخل اور قتل وقتال کی کثرت، حدیث میں ہے کہ اس دور میں وقت سے برکت اُٹھ جائے گی، سال مہینوں کی طرح، مہینہ ہفتوں کی طرح، دِن گھنٹوں کی طرح اور گھنٹہ لمحوں کی طرح گزر جائے گا، علم نبوت اور اس پر عمل کرنے والے حضراتِ علماء یکے بعد دیگرے اُٹھ جائیں گے اور جہل کا غلبہ ہوگا، ہر جگہ جاہلوں کا غلبہ اور قبضہ ہوگا، کیا مسجد، کیا مدرسہ، کیا دینی یا دنیوی ادارہ، پھر اس کے نتیجہ میں قسم ہا قسم کے فتنے وجود میں آئیں گے، آئے دن حالات میں شدت اور قتل وقتال کی کثرت ہوگی، معمولی سبب سے بھی لوگ ایک دوسرے کو قتل کر دیں گے، یعنی ہر چیز کی قیمت بڑھ جائے گی، انسان اور اس کے خون کی قیمت گھٹ جائے گی، حتیٰ کہ بعض اوقات تو خود قاتل کو یہ معلوم نہ ہوگا کہ وہ کیوں قتل کر رہا ہے؟ اور مقتول کو یہ معلوم نہ ہوگا کہ اسے کیوں قتل کیا جا رہا ہے؟

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "يَتَقَارَبُ الزَّمَانُ، وَ يُقْبَضُ الْعِلْمُ، وَ تَظْهَرُ الفِتَنُ، وَ يُلْقَى الشُّحُّ، وَ يَكْثُرُ الْهَرَجُ، قَالُوْا: وَ مَا الْهَرَجُ؟ قَالَ: القَتْلُ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٤٦٢ / كتاب الفتن)

(۳) دنیائے کفر کا اہل ایمان کے خلاف اتفاقِ باہمی۔ حدیث میں ہے کہ اس زمانے میں ساری دنیا کے کفار مسلمانوں کے خلاف اپنے آپسی انتشار واختلاف کے باوجود متحد ومتفق ہو جائیں گے، مسلمان بالکل بے حیثیت ہو جائیں گے، جن کے دلوں میں مسلمانوں کا قدرتی رُعب اور خوف تھا، اب وہ مسلمانوں کو خوف زدہ کر دیں گے؛ کیوں کہ مسلمانوں کی اکثریت دنیا کی محبت، موت کے خوف، فکرِ آخرت اور قیامت سے غفلت میں مبتلا ہوجائے گی۔

عَنْ ثَوْبَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "يُوْشِكُ الْأُمَمُ أَنْ تَدَاعَىٰ عَلَيْكُمْ، كَمَا تَدَاعَى الْأَكَلَةُ إِلَى قَصْعَتِهَا، فَقَالَ قَائِلٌ: وَ مِنْ قِلَّةٍ نَحْنُ يَوْمَئِذٍ؟ قَالَ: بَلْ أَنْتُمْ كَثِيْرٌ، وَ لٰكِنَّكُمْ غُثَاءٌ كَغُثَاءِ السَّيْلِ، وَ لَيَنْزِعَنَّ اللّٰهُ مِنْ صُدُوْرِ عَدُوِّكُمُ المَهَابَةَ مِنْكُمْ، وَ لَيَقْذِفَنَّ فِيْ قُلُوْبِكُمُ الوَهْنَ، قَالَ قَائِلٌ: وَ مَا الوَهْنُ؟ قَالَ: حُبُّ الدُّنْيَا، وَ كَرَاهِيَةُ المَوْتِ". (رواه أبوداود، مشكوٰة : ٤٥٩ / باب تغير الناس)

(۴) حکمرانوں کی جانب سے ظلم وزیادتی، حدیث پاک کے مطابق اس وقت دنیا کے تمام چھوٹے بڑے حکمران ظلم وستم سے زمین کو بھر دیں گے، نہ کسی کو مکمل انصاف ملے گا اور نہ جائے پناہ۔

عَنْ أَبِيْ سَعِيْدِنِ الخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: ذَكَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بَلَاءً، يُصِيْبُ هٰذِهِ الْأُمَّةَ، حَتّٰى لَا يَجِدَ الرَّجُلُ مَلْجَأً يَلْجَأُ إِلَيْهِ مِنَ الظُّلْمِ، فَيَبْعَثُ اللّٰهُ رَجُلًا مِنْ عِتْرَتِيْ أَوْ مِنْ أَهْلِ بَيْتِيْ......الخ". (رواه أحمد و الحاكم، مشكوٰة : ٤٧١ / باب أشراط الساعة)

(۵) علاماتِ قریبہ کبریٰ کے ظہور سے قبل دنیا میں عیسائیت کی کثرت ہوگی۔ "تَقُوْمُ السَّاعَةُ وَ الرُّوْمُ أَكْثَرُ النَّاسِ". (رواه مسلم / باب تقوم الساعة و الروم أكثر الناس)

(٦) مسلمان حکمرانوں اور عیسائیوں کے ایک خاص فریق کے درمیان پرامن صلح ہوگی، اور یہ دونوں مل کر عیسائیوں کے ایک دوسرے فریق سے جنگ کریں گے، جس میں

انہیں فتح نصیب ہوگی، فتح کے بعد عیسائی نعرہ لگائیں گے کہ صلیب کی برکت سے فتح حاصل ہوئی ہے، جس کو سن کر مسلمان بھی نعرہ لگائیں گے کہ صلیب کی برکت سے نہیں؛ بلکہ اسلام کی برکت اور اللہ تعالیٰ کی نصرت سے فتح حاصل ہوئی ہے، اس پر ان کے درمیان جنگ شروع ہو جائے گی، اس وقت عیسائیوں کے دونوں فریق ایک ہوکر مسلمانوں کے مقابلہ میں آئیں گے اور بڑی گھمسان کی لڑائی ہوگی، جس میں مسلمانوں کا حکمران شہید ہو جائے گا، مسلمانوں کا قتل عام ہوگا اور انہیں شہادت کا مقام نصیب ہوگا۔

(۷) پھر جو مسلمان بچ جائیں گے وہ مدینہ طیبہ جا کر پناہ لیں گے، اور عیسائیوں کی حکومت خیبر تک پھیل جائے گی (اس وقت مسلمان اپنے امیر کے تقرر کے لیے حضرت مہدیؒ کو مدینہ طیبہ میں تلاش کریں گے)۔

عَنْ ذِیْ مِخْبَرٍ رَضِيَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ: ”سَتُصَالِحُوْنَ الرُّوْمَ صُلْحًا اٰمِنًا، فَتَغْزُوْنَ أَنْتُمْ وَ ھُمْ عَدُوًّا مِنْ وَرَائِكُمْ، فَتُنْصَرُوْنَ، وَ تَغْنَمُوْنَ، وَ تَسْلَمُوْنَ، ثُمَّ تَرْجِعُوْنَ حَتّٰی تَنْزِلُوْا بِمَرْجٍ ذِیْ تُلُوْلٍ، فَيَرْفَعُ رَجُلٌ مِنْ أَھْلِ النَّصْرَانِيَّةِ الصَّلِیْبَ، فَیَقُوْلُ: غَلَبَ الصَّلِیْبُ، فَيَغْضَبُ رَجُلٌ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ، فَيَدُقُّہٗ، فَعِنْدَ ذٰلِكَ تَغْدِرُ الرُّوْمُ وَ تَجْمَعُ لِلْمَلْحَمَةِ، وَ زَادَ بَعْضُھُمْ: فَيَثُوْرُ الْمُسْلِمُوْنَ إِلٰی أَسْلِحَتِھِمْ، فَيَقْتَتِلُوْنَ، فَيُكْرِمُ اللّٰہُ تِلْكَ الْعِصَابَةَ بِالشَّھَادَةِ“. (رواہ أبوداود، مشکوٰۃ: ٤٦٧ / باب الملاحم)

دوسری روایت میں عیسائیوں کی حکومت کا خیبر تک پھیل جانے اور مسلمانوں کا مدینہ منورہ میں محاصرہ کا ذکر ہے:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰہُ عَنْھُمَا قَالَ: ”یُوْشِكُ الْمُسْلِمُوْنَ أَنْ یُحَاصَرُوْا إِلَی الْمَدِیْنَةِ، حَتّٰی یَكُوْنَ أَبْعَدَ مَسَالِحِھِمْ سَلَاحُ، وَ سَلَاحُ قَرِیْبٌ مِنْ خَیْبَرَ“. (رواہ أبوداود، مشکوٰۃ: ٤٦٧ / باب الملاحم)

(۱) حضرت مہدیؒ کا ظہور اور اس کی تفصیلات:

قیامت کی علاماتِ قریبہ کبریٰ میں سے پہلی علامت حضرت مہدیؒ کا ظہور ہے، احادیث مبارکہ میں ان کے تفصیلی حالات کا تذکرہ ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قیامت سے قبل آخری زمانہ میں جب امت مسلمہ پر اس دور کے اربابِ حکومت کی طرف سے شدید اور سنگین مظالم ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کی زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو جائے گی، ہر طرف ظلم وستم کا دور دورہ ہوگا اور ایک طرح سے مایوسی کی کیفیت طاری ہوگی، تو جس طرح رات میں مکمل سیاہی وتاریکی چھا جانے کے بعد اللہ پاک اپنی قدرت سے صبح کی روشنی نمودار فرماتے ہیں، اس دور میں بھی ظلم کی ظلمات چھا جانے کے بعد عدل وانصاف کی روشنی پیدا کرنے کے لیے آلِ رسول ﷺ سے ایک شخصیت کو پیدا فرمائیں گے، جن کی جدوجہد کے نتیجہ میں دنیا میں ایک صالح انقلاب آئے گا، دنیا سے ظلم کی ظلمات ختم ہوکر عدل وانصاف کی روشنی ہر طرف پھیل جائے گی اور زمین وآسمان والے خوش اور مطمئن ہو جائیں گے؛ کیوں کہ اس وقت حق تعالیٰ کی طرف سے غیر معمولی برکتوں کا ظہور ہوگا، آسمان سے وقت پر ضرورت کے مطابق بارش ہوگی اور زمین بھی اپنے اندر سے تمام پھل، پھول، غلہ اور ترکاریاں خوب اُگائے گی، اس خیر وبرکت کے دور میں زندہ لوگ اپنے مردوں کے زندہ ہونے کی تمنا کریں گے کہ کاش! ہمارے اعزہ واقارب بھی زندہ ہوتے تو اس خیر وبرکت اور عیش وفرحت کے زمانہ کو دیکھ لیتے اور اس سے لطف اندوز ہوتے، یہ خیر وبرکت اور عیش وفرحت والا دور تقریباً نو سال تک رہے گا۔ یہ تفصیلات حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت میں ہے:

عَنْ أَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: ذَكَرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ بَلَاءً یُصِیْبُ ھٰذِهِ الْأُمَّةَ، حَتّٰی لَا یَجِدَ الرَّجُلُ مَلْجَأً یَلْجَأُ إِلَیْهِ مِنَ الظُّلْمِ، فَیَبْعَثُ اللّٰہُ رَجُلًا مِنْ عِتْرَتِیْ وَ أَھْلِ بَیْتِیْ، فَیَمْلَأُ بِهِ الْأَرْضَ قِسْطًا وَ عَدْلًا، كَمَا مُلِئَتْ ظُلْمًا وَ جَوْرًا، یَرْضٰی عَنْہُ سَاكِنُ السَّمَاءِ وَ سَاكِنُ الْأَرْضِ، لَا تَدَعُ السَّمَاءُ مِنْ قَطْرِھَا

شَيْئًا إِلَّا صَبَّتْهُ مِدْرَارًا، وَ لَا تَدَعُ الْأَرْضُ مِنْ نَبَاتِهَا شَيْئًا إِلَّا أَخْرَجَتْهُ، حَتّٰى تَتَمَنَّى الْأَحْيَاءُ الْأَمْوَاتَ، يَعِيْشُ فِيْ ذٰلِكَ سَبْعَ سِنِيْنَ، أَوْ ثَمَانَ سِنِيْنَ، أَوْ تِسْعَ سِنِيْنَ".
(رواه أحمد و الحاكم، مشكوٰة : ٤٥٩)

"حضور ﷺ نے اس بلا کا ذکر فرمایا جو اس امت کو پہنچے گی، حتیٰ کہ آدمی جائے پناہ نہ پائے گا جہاں وہ ظلم سے پناہ لے سکے، تب اللہ تعالیٰ میری اولاد اور میرے اہل بیت سے ایک شخص کو بھیجے گا جو زمین کو عدل وانصاف سے بھر دے گا، جیسے وہ ظلم وستم سے بھری ہوئی تھی، آسمان وزمین کے رہنے والے خوش ہوں گے، آسمان اپنا کوئی قطرہ نہیں چھوڑے گا مگر وہ برسا دے گا، اور زمین بھی اپنی کوئی نباتات نہیں چھوڑے گی حتیٰ کہ اسے اُگا دے گی، یہاں تک کہ زندہ لوگ مردوں کی تمنا کرنے لگیں گے، وہ اس حالت میں سات، آٹھ یا نو سال تک زندہ رہیں گے۔"

حضرت مہدیؒ کا نام اور مدتِ خلافت:

اس روایت میں آل رسول سے مراد حضرت مہدیؒ ہیں، ان کا نام محمد ہوگا، والد کا نام عبداللہ ہوگا، خاندانی تعلق اہل بیت یعنی بنو ہاشم سے ہوگا، ان کا لقب "مہدی" ہوگا، وہ نجیب الطرفین سید ہوں گے، آپؒ والد کی طرف سے حسنی ہوں گے تو والدہ کی طرف سے حسینی ہوں گے، جس طرح سیرت وصورت میں بیٹا باپ کے مشابہ ہوتا ہے اسی طرح وہ شکل وشباہت اور اخلاق وشمائل میں حضور ﷺ کے مشابہ ہوں گے، وہ نبی نہیں ہوں گے، نہ ان پر وحی نازل ہوگی اور نہ وہ نبوت کا دعویٰ کریں گے؛ البتہ وہ اس اُمت کے مجدد ہوں گے۔

(مجدد اسے کہتے ہیں جو اس وقت احکامِ شریعت کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے جب کہ ہوا وہوس اور نفس وشیطان کی شرارت کی وجہ سے لوگ یا تو شریعت کو چھوڑ چکے ہوں یا بے توجہی کا شکار ہو چکے ہوں)۔

حدیث پاک میں حضرت مہدیؒ کے متعلق ارشاد ہے:

٢٤٦

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَا تَذْهَبُ الدُّنْيَا حَتّٰى يَمْلِكَ الْعَرَبَ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ بَيْتِيْ، يُوَاطِئُ اسْمُهُ اسْمِيْ".
(رواه الترمذی، مشكوٰة : ٤٧٠)

"دنیا اس وقت تک ختم نہ ہوگی جب تک کہ عرب کا بادشاہ ایک ایسا شخص نہ ہو جو میرے اہل بیت میں سے میرا ہم نام ہوگا" ابوداود کی روایت میں ہے:

"يُوَاطِئُ اسْمُهُ اسْمِيْ، وَ اسْمُ أَبِيْهِ اسْمَ أَبِيْ". (رواه أبوداود، مشكوٰة : ٤٧٠)

یعنی اس کا نام میرے نام کے موافق اور اس کے والد کا نام میرے والد کے نام جیسا ہوگا۔ نیز ابوداود کی روایت میں ہے کہ

"اَلْمَهْدِيُّ مِنْ عِتْرَتِيْ، مِنْ أَوْلَادِ فَاطِمَةَ". (أبوداود، مشكوٰة : ٤٧٠)

"مہدی میرے خاندان میں سے یعنی حضرت فاطمہؓ کی اولاد میں سے ہوں گے۔"

حضرت مہدیؒ کے اوصاف:

ایک روایت میں ہے کہ

"اَلْمَهْدِيُّ مِنِّيْ، أَجْلَى الْجَبْهَةِ، أَقْنَى الْأَنْفِ". (أبوداود، مشكوٰة : ٤٧٠)

"مہدی میری اولاد میں سے ہوں گے، روشن وکشادہ پیشانی اور اونچی ناک والے ہوں گے۔" یعنی خوب صورت ہوں گے، کیوں کہ یہ خوب صورتی کی علامات سے ہے، ان کا سب سے بڑا وصف یہ ہوگا کہ "يَمْلَأُ الْأَرْضَ قِسْطًا وَ عَدْلًا" (أيضا) "وہ زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔"

ان کی سخاوت کا ذکر اس طرح ہے کہ "يَقْسِمُ الْمَالَ، وَ لَا يَعُدُّهُ". (مسلم، مشكوٰة: ٤٦٩) "مال تقسیم کریں گے اور اسے شمار بھی نہیں کریں گے"۔

خضر وقت از خلوت دشت حجاز آید بروں — کارواں زیں وادیِ دور ودراز آید بروں

حضرت مہدیؒ کا ظہور:

حضرت مہدیؒ کے متعلق مزید تفصیلات جو احادیث میں ملتی ہیں ان کے مطابق آپؒ کی پیدائش وتربیت مدینہ طیبہ میں ہوگی، آپؒ کی بیعت وخلافت مکہ مکرمہ میں ہوگی اور آپؒ کی جائے ہجرت بیت المقدس ہوگی، حضرت مہدیؒ کو ظہور کے وقت تک لوگوں سے پوشیدہ اور مخفی رکھا جائے گا، ظہور کے وقت آپؒ کی عمر چالیس سال ہوگی، آپؒ کے ظہور اور خلافت کے ساتویں سال دجال نکلے گا، جسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام قتل فرمائیں گے، اس کے بعد حضرت مہدیؒ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معیت میں رہیں گے اور ۴۹ سال کی عمر میں وفات پائیں گے، حضرت مہدیؒ کے ظہور کے وقت جب مسلمان ہر طرف سے گھر کر مدینہ میں محصور ہوجائیں گے اور اپنے امیر کو منتخب کرنے کے لیے فکر مند ہوں گے عین اس وقت حضرت مہدیؒ منصب امامت سے بچنے کے لیے مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ چلے جائیں گے؛ مگر وہاں کچھ اللہ والے طواف کے دوران انہیں پہچان لیں گے اور حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان ان سے بیعت ہوں گے، حدیث میں ہے:

عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: يَكُوْنُ اخْتِلَافٌ عِنْدَ مَوْتِ خَلِيْفَةٍ، فَيَخْرُجُ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْمَدِيْنَةِ هَارِبًا إِلىٰ مَكَّةَ، فَيُخْرِجُوْنَهٗ، وَ هُوَ كَارِهٌ، فَيُبَايِعُوْنَهٗ بَيْنَ الرُّكْنِ وَ الْمَقَامِ". (أبوداود، مشكوٰة : ٤٧١)

(آخری زمانہ میں) جب امیر المؤمنین، خلیفۃ المسلمین کا انتقال ہوجائے گا تو مسلمانوں میں انتخابِ امیر کو لے کر انتشار ہوگا، اس موقع پر اہل مدینہ سے ایک باکمال شخص (حضرت مہدیؒ جو ابھی لوگوں میں متعارف اور مشہور نہیں ہوں گے) مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوجائیں گے، جنہیں اپنے متعلق یہ اندیشہ ہوگا کہ کہیں لوگ انہیں خلافت کا منصب سپرد نہ کردیں، لیکن جب وہ مکہ مکرمہ جائیں گے تو مکہ کے کچھ خاص لوگ ان کی وجیہ اور باکمال شخصیت کو پہچان لیں گے، پھر ان (حضرت مہدیؒ) کے نہ چاہنے کے باوجود حجر اسود اور مقام ابراہیم

کے درمیان ان سے بیعت کرنا شروع کردیں گے۔''

علماء نے فرمایا کہ بالکل شروع میں جو لوگ حضرت مہدیؒ کے دست بابرکت پر بیعت کی سعادت حاصل کریں گے ان کی تعداد اصحاب بدر اور اصحابِ طالوت (حضرت طالوت کے ساتھ ان کی ہدایت کے مطابق عمل کرکے جالوت کی طرف مقابلہ کے لیے بڑھنے والوں) کی طرح تین سو تیرہ ہوگی، یہ لوگ بہت ہی اونچے درجہ کے ایمان والے ہوں گے، خیر القرون کے بعد اگلے پچھلے تمام لوگوں میں وہ سب سے افضل ہوں گے۔ پھر جیسے جیسے خبر پھیلتی جائے گی مخلصین مختلف جماعتوں میں (دنیا بھر سے) پہنچ کر آپؒ کے ارد گرد جمع ہوتے رہیں گے۔ (ظہورِ مہدی: ۱۲۸)

حضرت مہدیؒ کی حمایت اور مخالفت:

جب حضرت مہدیؒ کے ظہور وخلافت کی خبر مشہور ہوگی تو آپؒ کی حمایت، تقویت اور نصرت کے لیے خراسان (جس پر ایران اور افغانستان کا بھی اطلاق ہوتا ہے) سے حارث حراث نامی شخص ایک لشکر لے کر آئے گا جس کے مقدمۃ الجیش کے کمانڈر کا نام منصور ہوگا، ان کے جھنڈے سیاہ ہوں گے، راستے میں عیسائی لشکر کا مقابلہ بلکہ صفایا کرتا ہوا حضرت مہدیؒ کی تقویت ونصرت کے لیے مکہ پہنچے گا۔ حدیث میں ہے:

عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِذَا رَأَيْتُمُ الرَّايَاتِ السُّوْدَ قَدْ جَاءَ تْ مِنْ قِبَلِ خُرَاسَانَ، فَأْتُوْهَا، فَإِنَّ فِيْهَا خَلِيْفَةَ اللّٰهِ الْمَهْدِيَّ". (مسند أحمد، مشكوٰة : ٤٧١)

''جب تم خراسان سے سیاہ جھنڈے (والے حارث حراث اور منصور- یہ دونوں یا تو نام ہیں یا وصف ہیں- کے لشکر کو) آتے ہوئے دیکھو تو تم ان کی طرف متوجہ ہوجانا؛ کیوں کہ ان میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ مہدیؒ ہوں گے۔''

اس لیے کہ جب یہ خراسانی لشکر مکہ مکرمہ کے قریب پہنچے گا تو حضرت مہدیؒ ان کے استقبال کے لیے مکہ سے باہر نکل کر ان میں شامل ہوجائیں گے۔ واللہ اعلم۔

دوسری روایت میں ہے کہ

"وَجَبَ عَلَىٰ كُلِّ مُؤْمِنٍ نَصْرُهٗ، أَوْ قَالَ: إِجَابَتُهٗ". (أبوداود، مشكوٰة: ٤٧١)

''ہر مسلمان پر ان کی نصرت یا ان کی بات ماننا ضروری ہوگا۔'' کیوں کہ یہی حضرت مہدیؒ کا لشکر ہوگا۔

حضرت مہدیؒ کے اصحاب کے اوصاف میں یہ ہے کہ ان کے دل باہم جوڑ دیے گئے ہوں گے، نہ وہ کسی سے متوحش ہوں گے، نہ کسی کو دیکھ کر خوش ہوں گے، ان کا مقصد اور مطمحِ نظر اعلاءِ کلمۃ اللہ ہوگا، الغرض اللہ پاک اس لشکر سے حضرت مہدیؒ کو تقویت دیں گے، یہی وجہ ہے کہ دوسری روایت میں ہے کہ ملک شام کے بادشاہ کی جانب سے ان سے جنگ کرنے کے لیے ایک لشکر بھیجا جائے گا، اس سے مراد سفیانی کا لشکر ہے، یہ خروجِ مہدیؒ کی ایک بڑی علامت ہے، اس سلسلہ میں ایک صحیح روایت حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ یہ سفیانی اولاد خالد بن یزید بن ابی سفیان اُموی کی نسل سے ہوگا، وہ ایک بھاری بھرکم آدمی ہوگا، جس کے پاؤں چیچک زدہ اور آنکھوں میں سفید نقطے ہوں گے، جو ان دنوں دمشق کے علاقہ میں ظاہر ہوں گے، اس کے پیروکاروں کی اکثریت قبیلہ کلب سے ہوگی، وہ لوگوں کو بہت زیادہ قتل کرنے والا ہوگا، اس کے ظلم وستم کا یہ حال ہوگا کہ عورتوں کے پیٹ پھاڑ کر بچوں کو قتل کردے گا، خروجِ مہدیؒ کی اطلاع پاکر یہ ان کی مخالفت ومقابلہ کے لیے ایک لشکر بھیجے گا، جو شکست کھا جائے گا، پھر دوبارہ حضرت مہدیؒ کے لشکر پر حملہ کرنے کے لیے ایک لشکر جرّار آئے گا؛ لیکن حضرت مہدیؒ کے لشکر تک پہنچنے سے پہلے ہی جب یہ لشکر مقام بیداء میں پہنچے گا جو مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک چٹیل میدان ہے، تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے زمین میں دھنسا دیا جائے گا، حدیث پاک میں ہے:

"فَيُخْسَفُ بِهِمْ بِالْبَيْدَاءِ بَيْنَ مَكَّةَ وَ الْمَدِيْنَةِ". (رواه أبوداود، مشكوٰة: ٤٧١، مستفاد از: مظاہر حق جدید: ۵/ ۳۸)

حضرت مہدیؒ کے پاس اَبدال کی آمد:

اس واقعہ کی خبر سن کر شام کے اَبدال اور عراق کے پرہیزگار لوگوں کے وفود حضرت مہدیؒ کی خدمت میں پہنچ کر بیعت کرلیں گے، حدیث میں ہے:

"فَإِذَا رَأَى النَّاسُ ذٰلِكَ، أَتَاهُ أَبْدَالُ الشَّامِ، وَ عَصَائِبُ أَهْلِ الْعِرَاقِ، فَيُبَايِعُوْنَهٗ". (رواه أبوداود، مشكوٰة: ٤٧١)

"أَبْدَال" "بَدَل" کی جمع ہے، یہ اولیاء اللہ کی ایک خاص جماعت ہے، جنہیں عراق میں "عَصَائِب" اور مصر میں "نُجَبَاء" کہتے ہیں، یہ دنیا میں ہر زمانہ میں ہر جگہ ہوتے ہیں، جن کا مرکزی مقام شام ہے۔

عاجز کے خیالِ ناقص میں "أَبْدَال: الياقوت بين الحجر" کنکر میں ہیرے کے مانند ہوتے ہیں۔ حضرت معاذؓ کی روایت میں ہے کہ "أبـــدال" وہ ہیں جن میں تین صفات پائی جائیں: (۱) رضا بالقضا (۲) ممنوعات سے باز رہنا (۳) اللہ کے دین کی خاطر غصہ کرنا۔

حضرت امام غزالیؒ نے ''احیاء'' میں فرمایا ہے کہ جو شخص روزانہ تین مرتبہ اس دعا کو پڑھے گا وہ اَبدال کا درجہ پالے گا:

"اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِأُمَّةِ مُحَمَّدٍ ﷺ، اَللّٰهُمَّ ارْحَمْ أُمَّةَ مُحَمَّدٍ ﷺ، اَللّٰهُمَّ تَجَاوَزْ عَنْ أُمَّةِ مُحَمَّدٍ ﷺ". (مستفاد از: توضیحات: ۷/ ۵۲۳، مظاہر حق جدید: ۵/ ۳۸)

حضرت مہدیؒ کے زمانہ کی جنگِ عظیم:

حضرت مہدیؒ کے ساتھ عرب وعجم کے مخلص مسلمان جمع ہوجائیں گے، تب روم اور شام کے عیسائی ایک لشکرِ جرّار تیار کرکے حضرت مہدیؒ کے لشکر سے مقابلہ کرنے کے لیے شام میں اِکٹھے ہوجائیں گے، رومی افواج میں اس وقت اسّی جھنڈے ہوں گے، اور ہر جھنڈے کے نیچے بارہ ہزار کا لشکر ہوگا، اس کی مجموعی تعداد نو لاکھ ساٹھ ہزار ہوگی، تب حضرت

مہدیؒ مکہ مکرمہ سے اپنے لشکر کو لے کر اولاً مدینہ طیبہ میں روضۂ اقدس پر حاضری دیں گے، اس کے بعد دمشق پہنچ جائیں گے اور شام میں عیسائیوں کے ساتھ فیصلہ کن جنگ کریں گے، لشکر اسلام تین حصوں میں منقسم ہو جائے گا، ایک حصہ میدان چھوڑ کر بھاگ جائے گا، جس کی توبہ قبول نہیں ہوگی، دوسرا حصہ شہید ہو جائے گا اور تیسرا حصہ مسلسل لڑتا ہوا چار دن کے بعد عیسائیوں پر غالب آجائے گا۔ حدیث پاک میں اس کا تذکرہ اس طرح ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَنْزِلَ الرُّوْمُ بِالْأَعْمَاقِ، أَوْ بِدَابِقٍ".

"قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ رومی اعماق و دابق میں اُتریں۔" مطلب یہ ہے کہ قیامت کی علامات میں یہ بھی ہے کہ رومی عیسائی (مراد سارے یورپ کے عیسائی یا حکومتیں ہیں؛ کیوں کہ سارے عیسائی ممالک خواہی نخواہی رومی کلیسہ کے ماننے والے ہیں) تمہارے مقابلہ میں اعماق یا دابق میں آدھمکیں گے، جمع ہو جائیں گے۔

"فَيَخْرُجُ إِلَيْهِمْ جَيْشٌ مِنَ الْمَدِيْنَةِ مِنْ خِيَارِ أَهْلِ الْأَرْضِ يَوْمَئِذٍ".

"پھر مدینہ (مراد حلب جو شام کا ایک شہر ہے) سے ایک لشکر مقابلہ کے لیے نکلے گا، جس میں اس وقت روئے زمین کے سب سے بہترین لوگ شامل ہوں گے۔"

"فَإِذَا تَصَافُّوْا، قَالَتِ الرُّوْمُ :" خَلُّوْا بَيْنَنَا وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ سَبَوْا مِنَّا، نُقَاتِلُهُمْ"، فَيَقُوْلُ الْمُسْلِمُوْنَ :" لَا، وَ اللّٰهِ لَا نُخَلِّيْ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ إِخْوَانِنَا".

"جب جنگ کے لیے صف بندی ہوگی تو رومی کہیں گے کہ ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان سے تم ہٹ جاؤ جنہوں نے جہاد کر کے ہمارے لوگوں کو قیدی بنایا ہے، ہم تو ان سے مقابلہ کر کے بدلہ لینا چاہتے ہیں، تم سے نہیں، ان کا مقصد مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنا ہوگا، مسلمان اس تفرقہ بازی سے باز رہیں گے اور سب مل کر مقابلہ شروع کر دیں گے۔"

"فَيُقَاتِلُوْنَهُمْ، فَيُهْزَمُ ثُلُثٌ لَا يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ أَبَدًا، وَ يُقْتَلُ ثُلُثُهُمْ أَفْضَلُ الشُّهَدَاءِ عِنْدَ اللّٰهِ، وَ يَفْتَتِحُ الثُّلُثُ، لَا يُفْتَنُوْنَ أَبَدًا"......الخ (مسلم، مشکوٰۃ : ٤٦٦)

"جب جنگ شروع ہوگی تو یہ بڑی گھمسان کی جنگ ہوگی، جس کی وجہ سے مسلمانوں کے لشکر میں سے ایک تہائی پیٹھ دِکھا کر شکست کھا کر بھاگ جائیں گے، جن کی توبہ کبھی قبول نہیں ہوگی، دوسرا تہائی حصہ کا لشکر جام شہادت نوش کرے گا، جو یقیناً عنداللہ بہترین شہداء شمار ہوں گے، اور بقیہ ایک تہائی لشکر فتح پا جائے گا، ان مجاہدین مسلمانوں کو حق تعالیٰ کبھی فتنہ میں مبتلا نہیں کریں گے۔"

مسلم شریف ہی کی دوسری روایت میں اس جنگ کی کیفیت وشدت کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

"فَإِذَا كَانَ يَوْمُ الرَّابِعِ نَهَدَ إِلَيْهِمْ بَقِيَّةُ أَهْلِ الإِسْلَامِ، فَيَجْعَلُ اللّٰهُ الدَّبْرَةَ عَلَيْهِمْ، فَيَقْتُلُوْنَ مَقْتَلَةً لَمْ يُرَ مِثْلُهَا، حَتّٰى إِنَّ الطَّائِرَ لَيَمُرُّ بِجَنَبَاتِهِمْ، فَلَا يُخَلِّفُهُمْ حَتّٰى يَخِرَّ مَيْتًا، فَيَتَعَادُّ بَنُوْ الْأَبِ كَانُوْا مِائَةً، فَلَا يَجِدُوْنَهُ بَقِيَ مِنْهُمْ إِلَّا الرَّجُلُ الْوَاحِدُ، فَبِأَيِّ غَنِيْمَةٍ يُفْرَحُ؟ أَوْ أَيِّ مِيْرَاثٍ يُقَسَّمُ؟". (مسلم، مشکوٰۃ : ٤٦٧)

مسلسل تین دِن گھمسان کی لڑائی اور جنگ عظیم کے بعد جب چوتھا دن ہوگا تو مسلمانوں کی باقی ماندہ تمام فوج کفار سے جنگ کرنے کے لیے نکل کھڑی ہوگی، اس عزم و ارادہ کے ساتھ کہ یا تو غالب آکر فتح پائیں گے یا پھر موت کو گلے لگا کر جامِ شہادت پی لیں گے، بقول شاعر:

سوچا ہے کفیل اب کچھ بھی ہو، ہر حال میں اپنا حق لیں گے
عزت سے جیے تو جی لیں گے، یا جامِ شہادت پی لیں گے

حق تعالیٰ ان کے ہاتھوں لشکر کفار کو شکست دیں گے، بہر حال یہ لڑائی بڑی گھمسان کی ہوگی، جس میں بے شمار لوگ مارے جائیں گے، ایسی جنگ عظیم کبھی دیکھی گئی نہ ہوگی، حتیٰ کہ اگر پرندے اس جنگ میں مرنے والوں کی لاشوں کے اوپر سے اُڑتے ہوئے گزرنا چاہیں گے تو لاشیں دور و دراز تک پھیلی ہوئی ہوں گی اور وہ اتنی سڑی ہوئی بدبودار ہوں گی کہ

پرندے اُڑتے اُڑتے ان کی بدبو کی وجہ سے گر کر مر جائیں گے، اور وہ لاشوں کے میدان کو پار نہیں کرسکیں گے، نیز اس جنگِ عظیم میں قتلِ عام کا یہ حال ہوگا کہ ایک باپ دادا کی اولاد بلکہ پورے خاندان کے لوگوں کو جب گنا جائے گا تو سو افراد میں سے ایک بچ گیا ہوگا، ایسی صورت میں کسے مالِ غنیمت پر خوشی ہوگی؟ اور مالِ میراث کس پر تقسیم کیا جائے گا؟

حضرت مہدیؒ کے ہاتھوں قسطنطنیہ کی فتح اور ان کی وفات:

اس کے بعد حضرت مہدیؒ لشکرِ اسلام کے ساتھ قسطنطنیہ کی طرف متوجہ ہوں گے، تو بحیرۂ روم کے پاس بنو اسحاق کے ستر ہزار آدمی اہلِ کتاب سے مسلمان ہو کر ساحلِ سمندر کے پاس حضرت مہدیؒ کے لشکر میں شامل ہو جائیں گے، پھر کشتیوں میں سوار ہو کر قسطنطنیہ کی طرف چلیں گے، اس وقت قسطنطنیہ کے اِرد گرد فصیل ہوگی، اسلامی لشکر کو شہر میں داخل ہونے کے لیے جب راستہ نہیں ملے گا تو مجاہدینِ اسلام جذبۂ ایمانی سے زور دار نعرۂ تکبیر بلند کریں گے، جس سے شہر کی فصیل ٹوٹ جائے گی، اس کے بعد جب مجاہدین شہر میں داخل ہوں گے تو یہاں بھی گھمسان کی لڑائی کے بعد مجاہدین کو فتح حاصل ہوگی، اور اس طرح قیامت کی ایک اور علامت فتح قسطنطنیہ پوری ہوگی۔ جنگ کے بعد اموالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت خروجِ دجّال کی افواہ پھیلے گی، تو حضرت مہدیؒ اسلامی لشکر کے ساتھ شام آکر نو افراد کو اس کی تحقیق کے لیے روانہ کریں گے، یہ لوگ بہترین لوگ ہوں گے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں ان کے قبیلوں کے نام اور ان کے گھوڑوں کے رنگ کیا ہیں؟ یہ بھی جانتا ہوں، تحقیق کے بعد یہ معلوم ہوگا کہ خروجِ دجال کی یہ خبر غلط تھی، مگر اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد جب حضرت مہدیؒ کی خلافت کو سات سال مکمل ہو جائیں گے تو دجال کا واقعی خروج ہوگا، حدیث پاک میں اس کا تذکرہ یوں ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: هَلْ سَمِعْتُمْ بِمَدِیْنَةٍ جَانِبٌ مِنْهَا فِی الْبَرِّ، وَ جَانِبٌ مِنْهَا فِی الْبَحْرِ، قَالُوْا: نَعَمْ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ: لَا تَقُوْمُ

السَّاعَةُ حَتّٰی یَغْزُوَهَا سَبْعُوْنَ أَلْفًا مِنْ بَنِیْ إِسْحٰقَ، فَإِذَا جَاءُوْهَا، نَزَلُوْا، فَلَمْ یُقَاتِلُوْا بِسِلَاحٍ، وَ لَمْ یَرْمُوْا بِسَهْمٍ، قَالُوْا: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ اللّٰهُ أَكْبَرُ، فَیَسْقُطُ أَحَدُ جَانِبَیْهَا"...... الخ (رواه مسلم، مشکوٰة: ٤٦٧)

"کیا تم ایسے شہر کو جانتے ہو جس کی ایک جانب خشکی میں ہے، تو دوسری جانب سمندر میں ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا: جی ہاں، جانتے ہیں، ارشاد فرمایا کہ قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک بنو اسحاق کے ستر ہزار افراد اس شہر (قسطنطنیہ) پر حملہ کر کے جنگ نہ کرلیں، جب یہ لوگ شہر کے قریب آکر پڑاؤ ڈالیں گے (اور داخلہ کی کوئی سبیل نظر نہیں آئے گی) تو ابھی ہتھیاروں اور تیروں سے جنگ کی نوبت بھی نہ آئے گی کہ مسلمان جذبۂ ایمانی سے سرشار ہو کر نعرۂ تکبیر بلند کریں گے تو (کرامتی طور پر) شہر کے دو طرف کی دیواروں میں سے ایک طرف کی دیوار گر جائے گی (راوی کے بیان کے مطابق یہ غالبًا سمندری جانب کی دیوار ہوگی) پھر جب دوسری مرتبہ نعرۂ تکبیر بلند کریں گے تو شہر کی دوسری جانب کی دیوار بھی گر جائے گی، اور جب تیسری مرتبہ نعرۂ تکبیر بلند کریں گے تو شہر میں داخلہ کا راستہ کشادہ ہو جائے گا، پھر شہر میں داخل ہو کر (جنگ کے بعد) فتح نصیب ہوگی، ابھی وہ مالِ غنیمت آپس میں تقسیم کر رہے ہوں گے کہ (شیطان کی ایک چیخ اور) آواز سنیں گے کہ دجال نکل آیا، سنتے ہی سب چھوڑ چھاڑ کر دجال سے مقابلہ کرنے کے لیے (شام کی طرف) لوٹ آئیں گے۔

دوسری روایت میں ہے کہ یہاں آکر حضرت مہدیؒ خروجِ دجال کی تحقیق کے لیے نو افراد کو بھیجیں گے، حدیث میں ہے:

"إِنِّیْ لَأَعْرِفُ أَسْمَاءَهُمْ، وَ أَسْمَاءَ اٰبَائِهِمْ، وَ أَلْوَانَ خُیُوْلِهِمْ، هُمْ خَیْرُ فَوَارِسَ، أَوْ مِنْ خَیْرِ فَوَارِسَ عَلٰی ظَهْرِ الْأَرْضِ یَوْمَئِذٍ". (رواه مسلم، مشکوٰة: ٤٦٧)

فرمایا کہ میں (بطورِ معجزہ) ان شہسواروں کے نام اور ان کے باپ کے نام بھی جانتا ہوں، حتیٰ کہ ان کے گھوڑوں کی رنگت بھی جانتا ہوں، نیز وہ بہترین سوار ہوں گے، یا فرمایا

کہ روئے زمین پر بسنے والے شہسواروں میں بہترین افراد ہوں گے۔

ان کی تحقیق کے مطابق خروجِ دجال کی خبر غلط ہوگی؛ مگر اس واقعہ کے کچھ ہی عرصہ کے بعد واقعی دجال نکلے گا، اسی زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول بھی ہوگا، پھر اسلامی لشکر دجالی لشکر سے مقابلہ کرے گا اور دجالی لشکر کو شکست ہوگی، نیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں دجال کا قتل ہوگا، اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مل کر عالمی نظام کی اصلاح میں لگ جائیں گے، ۴۹ سال کی عمر میں آپؓ کی وفات ہوگی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آپؓ کی نمازِ جنازہ پڑھائیں گے۔ (مستفاد از: توضیحات: ۴۸۵، علاماتِ قیامت: ۹۵)

(۲) دجال کے خروج کا تذکرہ:

قیامت کی علاماتِ قریبہ کبریٰ اور خاصہ میں دوسری بڑی قطعی اور یقینی علامت خروجِ مسیح دجال ہے، لفظ ''دجال''، ''دجل'' سے بنا ہے، جس کے معنیٰ ہیں حق و باطل کو خلط ملط کر دینا، بہت زیادہ جھوٹ بولنا، مکر و فریب اور دھوکہ دینا، اور ''مسیح'' کا مطلب یہاں بہت زیادہ سیاحت اور سفر کرنے والا، چونکہ دجال اپنے مکر و فریب کو پھیلانے کے لیے مکہ، مدینہ اور بیت المقدس کے علاوہ ساری دنیا کا چکر لگائے گا، اس لیے اُسے مسیح دجال کہتے ہیں، اس سے مراد یہود کا وہ شخص ہے جو قیامت سے قبل اس امت میں سب سے بڑے فتنہ کے طور پر ظاہر ہوگا۔

ارشادِ باری ہے:

﴿ یَوْمَ یَأْتِیْ بَعْضُ اٰیٰتِ رَبِّکَ لَا یَنْفَعُ نَفْسًا إِیْمَانُهَا﴾ (الأنعام: ۱۵۸)

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس دن تیرے رب کی بعض نشانیاں ظاہر ہوں گی اس دن کسی نفس کو اس کا ایمان نفع نہیں دے گا، اس میں جن نشانیوں اور قیامت کی علامتوں کا ذکر ہے ان میں خروجِ مسیح دجال بھی شامل ہے، جس کی تائید مسلم شریف کی روایت سے ہوتی ہے۔ (مسلم، مشکوٰۃ: ۴۷۲)

اسی طرح ابتداءً جو حدیث ذکر کی گئی اس میں قیامت کی دس یقینی علامتوں میں خروجِ مسیح دجال کو بھی بیان فرمایا ہے۔

جس طرح حق تعالیٰ نے اپنی خاص حکمت کے تحت بندوں کی آزمائش کے لیے شیطان کو پیدا فرمایا اسی طرح قیامت سے قبل دجال کو بھی پیدا فرمائے گا، جو کائنات کا سب سے بڑا فتنہ ہوگا، حدیث میں ہے:

عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَیْنٍؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ: "مَا بَیْنَ خَلْقِ اٰدَمَ إِلَی قِیَامِ السَّاعَةِ أَمْرٌ أَکْبَرُ مِنَ الدَّجَّالِ". (مسلم، مشکوٰۃ: ۴۷۲)

تخلیقِ آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک اور اب سے لے کر قیامت تک جو بے شمار فتنے پیدا ہوئے اور ہوں گے ان میں سب سے بڑا اور خطرناک فتنہ دجال کا ہوگا، یہی وجہ ہے کہ از آدم علیہ السلام تا رحمت عالم ﷺ تمام انبیاء اور رُسل علیہم السلام نے اپنی اُمتوں کو دجال کے فتنے سے ڈرایا ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَا مِنْ نَبِيٍّ إِلَّا قَدْ أَنْذَرَ أُمَّتَهُ الْأَعْوَرَ الْکَذَّابَ، أَلَا إِنَّهُ أَعْوَرُ، وَ إِنَّ رَبَّکُمْ لَیْسَ بِأَعْوَرَ، وَ مَکْتُوْبٌ بَیْنَ عَیْنَیْهِ: "ك، ف، ر". (متفق علیه، مشکوٰۃ: ۴۷۲)

''ہر پیغمبر نے اپنی امت کو کانے دجال سے ڈرایا ہے، خبردار! بے شک وہ کانا ہے اور تمہارا رب کانا نہیں، اس کی آنکھوں کے درمیان ''ک، ف، ر'' (یعنی کافر) لکھا ہوگا۔''

دجّال کا حُلیہ:

یوں تو تمام انبیاء و رُسل علیہم السلام نے دجال کا تذکرہ اپنی امت کے سامنے کیا؛ لیکن اس کی جتنی تفصیلات رحمت عالم ﷺ نے بیان فرمائیں کسی اور نبی اور رسول نے نہیں بتائیں؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے حضور پاک ﷺ کو دجال ایک مرتبہ خواب میں دِکھایا۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ: ۴۷۶) تاکہ آپ ﷺ اس کے متعلق امت کی صحیح اور مکمل رہنمائی فرما سکیں۔

آپ ﷺ نے اس کا حلیہ، خروج کا مقام، دجال کے ہاتھوں ظاہر ہونے والے خوارق اور شعبدہ بازیاں، اس کے قیام کی مدت اور جائے قتل وغیرہ کی تمام تفصیلات بیان فرما دیں، تاکہ امت اس کی حقیقت سے باخبر رہ کر اس کے مکر وفریب سے بچنے کی فکر کرے، چنانچہ آپ ﷺ کے بیان کے مطابق دجال کی شکل وصورت اور حلیہ اس طرح ہوگا کہ اس کی دونوں آنکھیں خراب ہوں گی، جن میں سے دائیں آنکھ کانی ہوگی۔

﴿ وَ إِنَّ الْمَسِيْحَ الدَّجَّالَ أَعْوَرُ عَيْنِ الْيُمْنىٰ، كَأَنَّ عَيْنَهٗ عِنَبٌ طَافِيَةٌ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٤٧٢ / باب العلامات بين يدي الساعة و ذكر الدجال)

"مسیح دجال دائیں آنکھ سے کانا ہوگا، اس کی وہ آنکھ ایسی ہوگی جیسے وہ انگور کا پھولا ہوا دانہ ہو، جب کہ بائیں آنکھ بالکل صاف اور سپاٹ ہوگی، نہ آنکھ ہوگی اور نہ آنکھ کا گڑھا ہوگا۔ اس کی آنکھ کے متعلق فرمایا:

" مَطْمُوْسُ الْعَيْنِ، لَيْسَتْ بِنَاتِئَةٍ، وَ لَا حَجْرَاءَ". (أبوداود، مشكوٰة : ٤٧٦)

"اس کی ایک آنکھ بالکل سپاٹ ہے، نہ اُبھری ہوئی نہ دھنسی ہوئی، اس وجہ سے وہ انتہائی بدشکل معلوم ہوگا، نیز اس کی دو آنکھوں کے درمیان بالکل واضح طور پر "کافر" لکھا ہوگا، جس کو وہ مٹا نہیں سکے گا، کیوں کہ اس کے لیے مٹانا ممکن ہوتا تو وہ ایسا ضرور کرتا، تاکہ لوگوں کو مزید گمراہ کرسکے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ نہیں مٹا سکے گا، اور ہر سچا مسلمان جس کو اللہ تعالیٰ دجالی فتنہ سے محفوظ رکھیں گے خواہ وہ پڑھا لکھا ہو یا اَن پڑھ ہو، اپنی فراست ایمانی کے سبب دجال کی پیشانی پر لکھے ہوئے لفظ "کافر" کو بآسانی پڑھ لے گا۔

" مَكْتُوْبٌ بَيْنَ عَيْنَيْهِ "كَافِرٌ"، يَقْرَأُهٗ كُلُّ مُؤْمِنٍ كَاتِبٍ وَ غَيْرِ كَاتِبٍ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٤٧٣)

"اس کی آنکھوں کے درمیان "کافر" لکھا ہوگا، جس کو ہر مؤمن پڑھ سکے گا، خواہ وہ لکھنا (پڑھنا) جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔

دجال کے جسم پر اتنی کثرت سے بال ہوں گے جیسے کوئی جنگلی جانور ہو، حدیث میں ہے کہ "حُفَالُ الشَّعْرِ" (مسلم، مشكوٰة:٤٧٣) "اس کے (جسم پر) بکثرت بال ہوں گے۔" وہ جوان ہوگا، اور سر کے بال گھونگریالے ہوں گے۔

نیز وہ اپنی شکل وصورت میں عبدالعزیٰ بن قطن (جو بنوخزاعہ کا ایک مشرک تھا اور زمانۂ جاہلیت میں مرگیا) کے مشابہ ہوگا، حدیث میں ہے:

" إِنَّهٗ شَابٌّ قَطَطٌ، عَيْنُهٗ طَافِيَةٌ، كَأَنِّيْ أُشَبِّهُهٗ بِعَبْدِ الْعُزّٰى بْنِ قَطَنٍ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٤٧٣)

"دجال جوان ہوگا، اس کے سر پر گھونگریالے بال ہوں گے، اس کی آنکھ پھولی ہوئی ہوگی، گویا میں اس کو قطن کے بیٹے عبدالعزیٰ سے تشبیہ دے سکتا ہوں۔"

دجال کا جسم بھاری بھرکم اور رنگ سرخ ہوگا، حدیث میں ہے:

وَ فِيْ رِوَايَةٍ قَالَ فِي الدَّجَّالِ: رَجُلٌ أَحْمَرُ، جَسِيْمٌ".

"وہ بھاری جسم والا اور سرخ رنگ کا آدمی ہوگا۔"

دجال پستہ قد اور پھڈا ہوگا، حدیث میں ہے:

" إِنَّ الْمَسِيْحَ الدَّجَّالَ قَصِيْرٌ أَفْحَجُ". (رواه أبوداود، مشكوٰة : ٤٧٦)

"دجال پستہ قد اور ٹیڑھے پاؤں والا ہوگا۔"

دجال یہودیوں میں سے ہوگا اور عوام میں اس کا لقب "مسیح" ہوگا۔ (بخاری:۲۵۲)

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دجال بے اولاد ہوگا:

"إِنَّهٗ لَا يُوْلَدُ لَهٗ." (رواه مسلم، مشكوٰة : ٤٧٨ / باب قصة ابن الصياد)

الغرض دجال بدصورت اور بدبخت ہوگا، جس کے چہرے پر آثارِ نحوست نمایاں ہوں گے۔

خروجِ دجال کی جگہ:

مسلم کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دجال اس وقت بھی دنیا میں موجود ہے، جسے حق تعالیٰ نے کسی ویران جزیرے میں بیڑیوں کے ساتھ جکڑ کر چھپا رکھا ہے، حدیث پاک میں ہے:

"إِنَّهُ فِيُ بَحُرِ الشَّامِ، أَوُ بَحُرِ الْيَمَنِ، لَا بَلُ مِنُ قِبَلِ الْمَشُرِقِ، مَا هُوَ، وَ أَوُمَأَ بِيَدِهٖ إِلَى الْمَشُرِقِ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٤٧٦)

''دجال شام کے سمندر میں ہے، یا یمن کے سمندر میں، نہیں؛ بلکہ وہ مشرق کی جانب سے نکلے گا، یہ فرما کر آپ ﷺ نے مشرق کی جانب اشارہ کیا۔'' آپ ﷺ نے یہ کلام شک اور تردّد کے انداز میں اس لیے فرمایا کہ دجال قیامت کی بڑی علامات میں سے ہے، تو جس طرح قیامت کو پوشیدہ رکھا گیا ہے اسی طرح اس کی علامت کو بھی ایک حد تک پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ یا پہلے آپ ﷺ کو دجال کے قید ہونے کی یقینی جگہ کا علم نہ تھا، بعد میں وحی کے ذریعہ بتایا گیا کہ وہ جانب مشرق میں ہے۔

(مستفاد از: توضیحات: ۷/ ۵۴۹، مظاہر حق جدید: ۵/ ۶۹)

ایک مصری عالم شیخ کمال ہشام عبدالحمید نے "اقترب خروج المسیح الدجال" کے نام سے ایک مفصل کتاب لکھی ہے، اس میں انہوں نے دجال کے خروج کا مرکزی مقام جزیرۂ برمودا قرار دیا ہے، برمودا کا تکون امریکہ کے قریب واقع ہے، ایک جانب شمالی امریکہ ہے، دوسری جانب جنوبی امریکہ ہے، اس کے درمیان برمودا اٹلانٹک واقع ہے، اسی مقام میں مثلث برمودا ہے، جو ایک تکون کی شکل میں ہے، یہ ایک پراسرار مقام ہے، کہتے ہیں کہ اسی مقام پر جنات کا عالمی مرکز، ابلیسی تخت اور دجال کا قید خانہ ہے، گویا دجال، ابلیس اور جنات کے آپس میں قریبی رابطے ہیں، جو بحری جہاز اس سمندر میں گیا وہ آج تک ایسا غائب ہوا کہ اس کی کوئی خبر نہیں آئی، اگر ہوائی جہاز بھی اس کے اوپر سے اُڑا ہے تو غائب ہو گیا، اس

علاقہ میں رات کو روشنیاں آتی جاتی دِکھائی دیتی ہیں، یہ سب ابلیسی پہرہ ہے، جو دجال کے اِردگرد لگا ہوا ہے۔ (از توضیحات: ۷/ ۵۵۸)

واقعہ یہ ہے کہ سیٹیلائٹ کی سسٹم کے ذریعہ دنیا کے ہر حصہ کی خبر اور معلومات رکھنے کے دعویٰ دار بھی آج تک دجال کو تلاش نہ کر سکے، یقیناً یہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کھلا چیلنج ہے۔

قیامت سے قبل جب دجال کے خروج کا وقت آئے گا تو وہ اس وقت انتہائی غصہ کی حالت میں ہوگا، حدیث میں ہے:

" إِنَّمَا يَخُرُجُ مِنُ غَضُبَةٍ يَغُضَبُهَا". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٤٧٨)

''اس کا خروج کسی غصہ کی وجہ سے ہوگا، جو اس کو غضب ناک کرے گا۔'' ابتداءً اس کا خروج شام وعراق کے درمیان ریگستانی علاقہ سے ہوگا، جہاں وہ نبی ہونے کا دعویٰ کرے گا۔ حدیث میں ہے:

" إِنَّهُ خَارِجٌ خَلَّةً بَيُنَ الشَّامِ وَ الْعِرَاقِ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٤٧٣)

''دجال اس راستے سے نکلے گا جو شام اور عراق کے درمیان ہے۔'' مگر اس وقت اس کی شہرت نہ ہوگی؛ کیوں کہ اس کے اعوان وانصار (مددگار) یہودیہ گاؤں میں اس کے منتظر ہوں گے، پھر دجال اصفہان کے علاقہ یہودیہ آئے گا، یہاں سے ستر ہزار یہودی اس کے ساتھ ہو جائیں گے، اس کے بعد مسلمانوں کے خلاف اس کا خروج خراسان سے ہوگا۔
(تحفۃ الالمعی: ۵/ ۶۰۶)

حدیث میں ہے:

عَنُ أَنَسٍؓ عَنُ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: يَتُبَعُ الدَّجَّالَ مِنُ يَهُودِ إِصُفَهَانَ سَبُعُونَ أَلُفًا، عَلَيُهِمُ الطَّيَالِسَةُ" (مسلم، مشكوٰة : ٤٧٥)

(ایران کے بڑے شہر) اصفہان کے ستر ہزار یہودی دجال کی اطاعت اور پیروی

کریں گے جن کے (سروں پر) طیالیس (سبز چادریں) ہوں گی۔ یہاں پہنچ کر دجال اُلوہیت کا دعویٰ کرے گا اور اپنے مشن کو پھیلانے کے لیے آگے بڑھے گا، جہاں جائے گا وہاں اور دائیں بائیں فساد برپا کرے گا۔

"فَعَاثَ يَمِينًا، وَ عَاثَ شِمَالاً". (رواہ مسلم، مشکوٰۃ: ۴۷۳)

دجال کے ہاتھوں ظاہر ہونے والے خوارق اور شعبدہ بازیاں:

خروجِ دجال سے پہلے تین سال سخت قحط سالی اور تنگ دستی کے ہوں گے، لوگ مجبور ومحتاج ہو چکے ہوں گے، پھر من جانب اللہ دجال کو استدراج (کافر وفاسق سے عجائبات کا ظہور) کا اختیار دیا جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کی آزمائش کے لیے دجال کو بڑے بڑے غیر معمولی، محیر العقول، ناممکن اور نادر الوقوع کاموں کی قوت دیں گے؛ اس لیے وہ لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے اِس استدراج کا بھرپور فائدہ اٹھائے گا، مثلاً دجال ایک گدھے پر سوار ہو کر پوری دنیا کا چکر لگائے گا، ہوسکتا ہے کہ یہ حقیقی گدھا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ دورِ جدید کا کوئی جہاز ہو۔ زمین کے سارے خزانے اس کے ساتھ ساتھ چلتے رہیں گے، اس کے ساتھ جنت کی طرح ایک نقلی جنت اور دوزخ کی طرح ایک نقلی دوزخ ہوگی، حالانکہ جس کو وہ جنت بتائے گا وہ درحقیقت دوزخ (کا ذریعہ) ہوگی اور جس کو دوزخ بتائے وہ جنت (کا ذریعہ) ہوگی، وہ بادلوں کو حکم دے گا تو اسی وقت بارش ہوگی اور زمین کو حکم دے گا تو فوراً کھیتی اُگتی نظر آئے گی، لوگوں کے مُردوں کو شیطانی شکل میں پیش کر کے ان کو زندہ کرنے کا دھوکہ دے گا، یہ دجالی فتنہ چالیس دن تک رہے گا، ان میں سے پہلا دن ایک سال کے برابر، دوسرا دن ایک مہینہ کے برابر، تیسرا دن ہفتہ کے برابر اور بقیہ ایام معمول کے مطابق ہوں گے۔

اب جو لوگ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور ایمانی دولت سے مرحوم ہوں گے، یا جن کا ایمان بہت ضعیف اور کمزور ہوگا وہ اس کے ہاتھوں ظاہر ہونے والے خوارق، شعبدہ بازیوں اور استدراجی کرشموں سے متاثر ہو کر اس کی خدائی کو مان لیں گے، تو ان کے دنیوی حالات بظاہر بہت اچھے ہو جائیں گے، وہ خوب پھلتے پھولتے نظر آئیں گے، اس کے برخلاف جو مؤمنین کاملین اور مخلصین صادقین ہوں گے وہ اس کے خدائی دعویٰ کی تردید کریں گے، اس کے کرشموں سے ذرّہ برابر متاثر نہیں ہوں گے؛ بلکہ یہ چیزیں ان کے ایمان ویقین میں ترقی کا ذریعہ ہوں گی، اس وقت ان کے دنیوی حالات بہت سخت ناسازگار ہوں گے، فقر وفاقہ اور طرح طرح کی دشواریوں اور تکلیفوں میں مبتلا ہوں گے؛ مگر صبر واستقامت اور دجال کا مقابلہ کرنے کے بعد وہ اس آخری امتحان میں کامیاب ہو کر قربِ الٰہی کا بہت بڑا مقام حاصل کر لیں گے۔

مختلف احادیث میں ان تمام تفصیلات کا تذکرہ ملتا ہے، مثلاً حدیث میں ہے:

عَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيدَ قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ فِي بَيْتِي، فَذَكَرَ الدَّجَّالَ، فَقَالَ: إِنَّ بَيْنَ يَدَيْهِ ثَلَاثَ سِنِينَ، سَنَةٌ تُمْسِكُ السَّمَاءُ فِيهَا ثُلُثَ قَطْرِهَا، وَ الْأَرْضُ ثُلُثَ نَبَاتِهَا، وَ الثَّانِيَةُ تُمْسِكُ السَّمَاءُ ثُلُثَيْ قَطْرِهَا، وَالْأَرْضُ ثُلُثَيْ نَبَاتِهَا، وَالثَّالِثَةُ تُمْسِكُ السَّمَاءُ قَطْرَهَا كُلَّهُ، وَالْأَرْضُ نَبَاتَهَا كُلَّهُ، فَلَا يَبْقَى ذَاتُ ضِرْسٍ وَلَا ذَاتُ ظِلْفٍ مِنَ الْبَهَائِمِ إِلَّا هَلَكَتْ". (رواہ ابن ماجہ و أحمد، مشکوٰۃ: ۴۷۷)

''حضرت اسماء بنت یزیدؓ فرماتی ہیں کہ رحمت عالم ﷺ ایک مرتبہ ہمارے گھر تشریف فرما تھے کہ آپ ﷺ نے دجال کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ خروجِ دجال سے پہلے تین سال قحط کے ہوں گے، ان میں پہلے سال تو آسمان اپنی تہائی بارش اور زمین اپنی تہائی پیداوار روک دے گی، پھر دوسرے سال آسمان دو تہائی بارش اور زمین دو تہائی پیداوار روک لے گی، پھر تیسرے سال آسمان تمام بارش اور زمین تمام پیداوار روک لے گی، اس وقت صورتِ حال یہ ہوگی کہ کوئی کھر والا جانور (اہلی) باقی رہے گا نہ ڈاڑھ والا (نہ وحشی)

یعنی اس قحط سالی سے تمام انسان اور جانور متاثر ہوں گے۔''

اس وقت دجال کا خروج ہوگا اور زمین کے تمام خزائن اور دفائن اس کے تصرف اور قبضہ میں ہوں گے۔

دوسری حدیث میں ہے:

"إِنَّهُ يَجِيءُ مَعَهُ مِثْلُ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ، فَالَّتِي يَقُولُ إِنَّهَا الْجَنَّةُ هِيَ النَّارُ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٤٧٣)

''وہ اپنے ساتھ جنت اور دوزخ کے مانند دو چیزیں لیے پھرے گا، وہ جس کو جنت کہے گا حقیقت میں وہ دوزخ ہوگی۔'' بعض شارحین نے اس کا مطلب یہ بیان فرمایا کہ اس پر ایمان لے آنا دوزخ کا سبب اور انکار جنت کا سبب ہے۔

دجال کی سواری کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضي الله عنه عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: يَخْرُجُ الدَّجَّالُ عَلَىٰ حِمَارٍ أَقْمَرَ، مَا بَيْنَ أُذُنَيْهِ سَبْعُونَ بَاعًا". (سنن بيهقى، مشكوٰة : ٤٧٧)

(دجال خود تو بڑا بدصورت ہوگا؛ لیکن اس کا گدھا بہت خوب صورت ہوگا) وہ ایک سفید گدھے پر سوار ہو کر نکلے گا، جس کے دو کانوں کے درمیان ستر باع (جب دونوں ہاتھ اور بازو مکمل پھیلائے جائیں تو وہ ایک باع کی مقدار ہو جاتے ہیں) چوڑا فاصلہ ہوگا، اس کی تیز رفتاری کا تذکرہ حضرت ابن مسعودؓ کی روایت میں ہے کہ اس کا ایک قدم تین دن کی مسافت کے برابر ہوگا، جو تقریباً بیاسی کلومیٹر فی سیکنڈ ہوگا، یہ رفتار ٢٩٥٢٠٠ کلومیٹر فی گھنٹہ کے حساب سے ہوگی، گویا ہوا اور ہوائی جہاز سے بھی تیز رفتار ہوگا۔ بعض روایات میں گدھے کا اُترنا یعنی نزول کا تذکرہ بھی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اُڑنے والا کوئی گدھا ہے، یا اس سے مراد سفید ہوائی جہاز ہے۔ (توضیحات: ٧/ ٥٥٧)

حدیث میں دجال کی سواری کی تیز رفتاری کے متعلق جب حضرات صحابہؓ نے

دریافت کیا کہ "يَا رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ! وَ مَا إِسْرَاعُهُ فِي الْأَرْضِ؟" حضور! زمین میں اس کی تیز رفتاری کا کیا حال ہوگا؟ تو فرمایا: "كَالْغَيْثِ اسْتَدْبَرَتْهُ الرِّيحُ". (رواه الترمذي، مشكوٰة : ٤٧٣) "بادل کی طرح جس کو ہوا پیچھے سے دھکیل رہی ہو۔"

آگے اس کے استدراجی کرشموں کا ذکر ہے کہ

" فَيَأْتِي عَلَى الْقَوْمِ، فَيَدْعُوهُمْ، فَيُؤْمِنُونَ بِهِ، فَيَأْمُرُ السَّمَاءَ، فَتُمْطِرُ، وَ الْأَرْضَ، فَتُنْبِتُ، فَتَرُوحُ عَلَيْهِم سَارِحَتُهُمْ أَطْوَلَ مَا كَانَتْ ذُرًى، وَ أَسْبَغَهُ ضُرُوعًا، وَ أَمَدَّهُ خَوَاصِرَ، ثُمَّ يَأْتِي الْقَوْمَ فَيَدْعُوهُم، فَيَرُدُّونَ عَلَيْهِ قَوْلَهُ، فَيَنْصَرِفُ عَنْهُم، فَيُصْبِحُونَ مُمْلِحِينَ، لَيْسَ بِأَيْدِيهِمْ شَيْءٌ مِنْ أَمْوَالِهِم، وَيَمُرُّ بِالْخَرِبَةِ، فَيَقُولُ لَهَا: أَخْرِجِي كُنُوزَكِ، فَتَتْبَعُهُ كُنُوزُهَا كَيَعَاسِيبِ النَّحْلِ". (ترمذى، مشكوٰة : ٤٧٣)

''پھر وہ ایک قوم کے پاس پہنچے گا اور اس کو اپنی (اُلوہیت کی) دعوت دے گا، لوگ اس پر ایمان لے آئیں گے، یعنی اس کے مکر وفریب میں آکر اس کا اتباع کرنے لگیں گے، تو وہ آسمان کو بارش برسانے کا حکم دے گا، تو وہ ان پر بارش برسائے گا، اور زمین کو سبزہ اُگانے کا حکم دے گا تو وہ فوراً اُگا دے گی، اتنا ہی نہیں؛ بلکہ جب شام کو اس قوم کے مویشی ان کی چراگاہوں سے واپس آئیں گے تو لمبی کوہانوں کے ساتھ اور ان کے تھن دودھ سے بھرے ہوئے ہوں گے، اس کے بعد دجال ایک اور قوم کے پاس پہنچے گا اور اسے بھی اپنی دعوت دے گا، لیکن وہ مؤمنین کاملین اس کی دعوت کو رَد کر دیں گے، وہ ان کے پاس سے چلا جائے گا تو یہ مؤمنین مخلصین سخت آزمائش وقحط سالی میں مبتلا ہو جائیں گے، حتیٰ کہ ان کے مال و اسباب بھی تباہ ہو جائیں گے، پھر اس کا گزر ایک ویرانے سے ہوگا، وہ اس کو اپنا خزانہ نکالنے کا حکم دے گا، چنانچہ وہ ویرانہ دجال کے حکم پر اپنے خزانوں کو اُگل دے گا، اور وہ خزانے اس طرح اس کے پیچھے پیچھے ہولیں گے جس طرح شہد کی مکھیاں اپنے سردار کے پیچھے چلتی ہیں۔

ایک دوسری روایت میں ہے:

" إِنَّهُ يَأْتِي الْأَعْرَابِيَّ، فَيَقُولُ: "إِنْ أَحْيَيْتُ لَكَ إِبِلَكَ، أَلَسْتَ تَعْلَمُ أَنِّي

رَبُّكَ؟ فَيَقُوْلُ:" بَلىٰ، فَيُمَثَّلُ لَهُ الشَّيْطَانُ نَحْوَ إِبِلِهِ كَأَحْسَنِ مَا يَكُوْنُ ضُرُوْعًا، وَ أَعْظَمِهِ أَسْنِمَةً".

"دجال ایک دیہاتی کے پاس آئے گا اور اس سے کہے گا کہ اگر میں تیرا اونٹ زندہ کردوں تو کیا تو یقین کرے گا کہ میں تیرا رب ہوں؟ وہ کہے گا: جی، بالکل، تو شیطان اس کے سامنے اونٹ کی شکل میں آجائے گا، جس کے بہترین تھن اور شاندار کوہان ہوں گے۔"

"قَالَ: وَ يَأْتِي الرَّجُلَ قَدْ مَاتَ أَخُوْهُ، وَ مَاتَ أَبُوْهُ، فَيَقُوْلُ:" أَ رَأَيْتَ إِنْ أَحْيَيْتُ لَكَ أَبَاكَ وَ أَخَاكَ، أَلَسْتَ تَعْلَمُ أَنِّيْ رَبُّكَ؟ فَيَقُوْلُ:" بَلىٰ، فَيُمَثِّلُ لَهُ الشَّيَاطِيْنَ نَحْوَ أَبِيْهِ وَ أَخِيْهِ". (رواه ابن ماجه، مشكوٰة : ٤٧٧)

"حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ پھر وہ ایک شخص کے پاس آئے گا جس کے بھائی اور باپ کا انتقال ہوگیا ہوگا، اس سے کہے گا کہ بتا! اگر میں تیرے باپ اور بھائی کو زندہ کردوں تو کیا تو تسلیم کرلے گا کہ میں تیرا رب ہوں؟ وہ شخص جواب دے گا کہ ہاں، تب دجال شیاطین کو اس شخص کے باپ اور بھائی کی شکل میں پیش کردے گا۔"

اس سے ثابت ہوا کہ دجال جو شعبدہ بازیاں اور کرشمے دکھائے گا اس کے پیچھے پورا ہاتھ ابلیس کا ہوگا۔ ابلیس جانوروں اور رِشتہ داروں کی خیالی و مثالی شکل و صورت اختیار کرکے آجائے گا، جو ابتلا کے بعد غائب ہوجائے گا۔ الغرض خروجِ دجال کے وقت بے ایمانوں کے لیے بظاہر تو بڑی خوشحالی ہوگی اور ایمان والوں کے لیے بڑی بدحالی ہوگی۔

حضرت اسماء بنت یزیدؓ نے حضور ﷺ سے دریافت کیا:

"يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَ اللّٰهِ إِنَّا لَنَعْجِنُ عَجِيْنَنَا، فَمَا نَخْبِزُهُ حَتّٰى نَجُوْعَ، فَكَيْفَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَئِذٍ؟ قَالَ: يُجْزِئُهُمْ مَا يُجْزِئُ أَهْلَ السَّمَاءِ مِنَ التَّسْبِيْحِ وَ التَّقْدِيْسِ". (رواه ابن ماجه، مشكوٰة : ٤٧٧)

"یارسول اللہ! اللہ کی قسم! بھوک کے وقت انسان کی بے صبری کا یہ عالم ہوتا ہے کہ

ہم آٹا گوندھتے ہیں اور اس کی روٹیاں پکا کر ابھی فارغ بھی نہیں ہوتے کہ ہم بھوک سے بے چین ہوجاتے ہیں، تو آخر اس وقت اہل ایمان بھوک پر کیسے صبر کریں گے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ان کے لیے وہی چیز کافی ہوجائے گی جو آسمان والوں (فرشتوں) کے لیے کافی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس۔"

مطلب یہ ہے کہ ذکر اللہ جو کہ روح کی غذا ہے حق تعالیٰ اس وقت مؤمنین مخلصین کے لیے اسے جسم کی غذا بنا دیں گے، مؤمن ذکر اللہ سے قوت حاصل کریں گے، کسی نے کہا:

خدا کی یاد ہے طاقت ہماری مصلّٰی ہے ہمارا تختِ شاہی
ہماری فوج ہے اخلاقِ حسنہ ہمارا حصن ہے ترکِ مناہی

دجال کا یہ عظیم اور شدید فتنہ چالیس دنوں تک رہے گا، حدیث پاک میں ہے:

"أَرْبَعُوْنَ يَوْمًا، يَوْمٌ كَسَنَةٍ، وَ يَوْمٌ كَشَهْرٍ، وَ يَوْمٌ كَجُمُعَةٍ، وَ سَائِرُ أَيَّامِهِ كَأَيَّامِكُمْ". (رواه الترمذي، مشكوٰة : ٤٧٣)

"دجالی فتنے کے چالیس دن ہوں گے، جن میں سے ایک دن ایک سال کے برابر ہوگا، دوسرا دن ایک مہینے کی طرح ہوگا، تیسرا دن ایک ہفتہ کے برابر ہوگا، اور بقیہ دن تمہارے عام دنوں کے برابر ہوں گے۔"

حضراتِ صحابہؓ کا نماز سے کس قدر تعلق تھا اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ جب حضور ﷺ نے یہ پیشین گوئی فرمائی تو صحابہؓ نے عرض کیا: حضور! "أَيَكْفِيْنَا فِيْهِ صَلوٰةُ يَوْمٍ؟" ان دنوں میں جب ایک دن ایک سال کے برابر ہوگا تو کیا ہمیں اس میں ایک دن کی نماز کافی ہوجائے گی؟ ارشاد ہوا: "لَا، اقْدِرُوْا لَهُ قَدْرَهُ". (ترمذی، مشکوٰۃ: ۴۷۳) نہیں؛ بلکہ نماز پڑھنے کے لیے ایک دن کا حساب لگانا ہوگا، وقت کا اندازہ لگا کر نماز پڑھنی ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ عموماً طلوعِ فجر کے بعد ظہر کا وقت ہونے میں جتنی دیر لگتی ہے اس اندازہ سے ظہر کی نماز ادا کی جائے گی، اور اسی ترتیب سے تمام نمازیں ادا کی جائیں گی، اسی اندازہ کے

مطابق نمازیں ان ایام میں بھی پڑھی جائیں گی جو مہینہ اور ہفتہ کا ہوگا۔

دجال سے ایک مؤمن کامل کا مناظرہ:

اس وقت جن ایمان والوں نے کتاب وسنت کی تعلیم پر استقامت کے ساتھ عمل کر کے اپنا ایمان مضبوط کیا ہوگا دجال کے بڑے بڑے کارنامے اور اس کی شعبدہ بازیاں انہیں ذرّہ برابر متاثر نہ کرسکیں گی؛ بلکہ وہ ان تمام خلافِ عادت اور ناممکن کاموں کو شعبدہ بازی اور شیطانی کارنامہ اور جادوگری کا نام دے کر اور دیگر نشانیوں سے تعیین کر کے کہیں گے کہ یقیناً یہ دجال ہی ہے، جس کے فتنہ کی خبر حضور ﷺ نے دی تھی۔

اہل ایمان میں کاملین ومخلصین کے علاوہ دنیا بھر کے لوگوں کو گمراہ کرتا ہوا دجال مکہ مدینہ آنا چاہے گا؛ لیکن وہاں فرشتوں کا پہرہ ہوگا، جس کی وجہ وہ ان دونوں مقدس مقامات میں داخل نہ ہوسکے گا، حدیث میں ہے:

غَيْرَ مَكَّةَ وَ طَيْبَةَ، هُمَا مُحَرَّمَتَانِ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٤٧٦)

حرمین شریفین کے تمام راستوں پر فرشتے پہرہ دیں گے اور دجال کو داخل ہونے سے روکیں گے۔

ایک حدیث میں ہے کہ مدینہ منوّرہ کے اس وقت سات دروازے ہوں گے:

"لَهَا يَوْمَئِذٍ سَبْعَةُ أَبْوَابٍ، عَلَىٰ كُلِّ بَابٍ مَلَكَانِ." (بخاری، مشکوٰۃ : ٤٧٥)

"مدینہ منورہ کے سات دروازے ہوں گے اور ہر دروازے پر دو فرشتے ہوں گے۔"

نیز یہ بھی منقول ہے کہ ان دنوں مدینہ طیبہ میں زلزلہ آئے گا، جس کی وجہ سے منافق قسم کے لوگ خوف زدہ ہوکر مدینہ منورہ سے نکل جائیں گے اور باہر آکر دجال کے جال میں پھنس جائیں گے؛ کیوں کہ یہ لوگ مدینہ طیبہ میں حضور پاک ﷺ کی محبت اور ایمان کی حفاظت کے لیے نہیں؛ بلکہ دنیوی اغراض ومنافع کی وجہ سے رہ رہے ہوں گے؛ اس لیے

انہیں زلزلہ کے ذریعہ (من جانب اللہ) نکال دیا جائے گا۔ والعیاذ باللہ العظیم۔ (توضیحات: ٧/ ٥٤٥)

جس وقت دجال مدینہ طیبہ کے باہر پڑاؤ ڈالے گا تو وہاں ایک مؤمن کامل اپنے خداداد علم سے دجال کو پہچان کر اس سے مناظرہ ومقابلہ کرے گا، جس میں بالآخر اسے کامیابی حاصل ہوگی اور اس کے بعد دجال کی شعبدہ بازیاں ختم ہوجائیں گی۔ حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ نِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "يَأْتِي الدَّجَّالُ، وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْهِ أَنْ يَدْخُلَ نِقَابَ الْمَدِيْنَةِ......الخ".

"ساری دنیا میں فتنہ وفساد پھیلاتا ہوا جب دجال مدینہ منورہ کی طرف آئے گا تو اس پر مدینہ کے تمام راستوں میں داخلہ ممنوع اور حرام ہوگا، آخر وہ مدینہ کے قریب ایک کھاری زمین میں ٹھہر جائے گا۔ مدینہ منورہ میں حدودِ حرم کے باہر پہاڑ کے پیچھے ایک شورہ کھاری زمین کا نام "سباخ" ہے، دجال یہیں آکر ٹھہر جائے گا، اور زلزلہ کے بعد منافقین مدینہ سے نکل کر یہیں دجال سے جاملیں گے، اور اسی مقام پر مؤمن کامل کا دجال سے مناظرہ ومقابلہ ہوگا۔ حدیث میں آگے ارشاد ہے:

"فَيَخْرُجُ إِلَيْهِ رَجُلٌ، وَ هُوَ خَيْرُ النَّاسِ، أَوْ مِنْ خِيَارِ النَّاسِ، فَيَقُوْلُ: أَشْهَدُ أَنَّكَ الدَّجَّالُ، الَّذِيْ حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حَدِيْثَهُ".

"اس کے پاس ایک شخص آئے گا جو بہترین (مؤمنین کاملین ومخلصین) لوگوں میں سے ہوگا، وہ شخص کہے گا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو وہی دجال ہے جس کی خبر ہمیں رحمت عالم ﷺ نے اس کے احوال وعلامات بیان کر کے دی ہے۔"

یہ مؤمن کامل کون ہے؟ اس کے متعلق علماء کی ایک جماعت کا خیال یہ ہے کہ یہ حضرت خضر علیہ السلام ہوں گے۔ واللہ اعلم۔ (توضیحات: ٧/ ٥٤٥)

"فَيَقُوْلُ الدَّجَّالُ: "أَ رَأَيْتُمْ إِنْ قَتَلْتُ هٰذَا، ثُمَّ أَحْيَيْتُهُ، هَلْ تَشُكُّوْنَ فِي الْأَمْرِ؟" فَيَقُوْلُوْنَ: "لا"، فَيَقْتُلُهُ، ثُمَّ يُحْيِيْهِ، فَيَقُوْلُ: "وَ اللّٰهِ مَا كُنْتُ فِيْكَ أَشَدَّ بَصِيْرَةً مِنِّي الْيَوْمَ"، فَيُرِيْدُ الدَّجَّالُ أَنْ يَقْتُلَهُ، فَلَا يُسَلَّطُ عَلَيْهِ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٤٧٥)

"دجال اپنے حواریوں سے کہے گا کہ اگر میں اس شخص کو قتل کر کے دوبارہ زندہ کر دوں تب بھی تم میرے (خدا ہونے کے) بارے میں شک کروگے؟ لوگ کہیں گے: بالکل نہیں، تب دجال اس مردِ مؤمن کو مار کر دوبارہ زندہ کر دے گا، اس وقت یہ مردِ مؤمن کہے گا کہ اللہ کی قسم! تیرے بارے میں میری فراست وبصیرت اور یقین اب پہلے سے بھی زیادہ پختہ ہوگیا کہ تو ہی دجال ہے، اس کے بعد دجال دوبارہ اس مردِ مؤمن کو مارنا چاہے گا؛ لیکن وہ اس پر قادر نہیں ہو سکے گا، پھر اس سے استدراج کی قوت بھی ختم کر دی جائے گی۔

حدیث پاک میں وارد ہے:

"ثُمَّ تَصْرِفُ المَلَائِكَةُ وَجْهَهُ قِبَلَ الشَّامِ، وَ هُنَالِكَ يَهْلِكُ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٤٧٥)

"اس کے بعد فرشتے اس کا رُخ شام کی طرف پھیر دیں گے، تاکہ جہاں سے آیا تھا وہیں چلا جائے، جہاں دجال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں ہلاک ہوگا۔"

دجال کے خلاف اہلِ حق کا آخری معرکہ اور اس کا قتل:

اس کی مزید تفصیل اس طرح ہے کہ حضرت مہدیؒ جب قسطنطنیہ کی فتح کے بعد شام پہنچ کر اسلامی لشکر کو دجالی لشکر سے مقابلہ کے لیے ترتیب دے رہے ہوں گے کہ دجال بھی اپنے لاؤ لشکر سمیت شام پہنچ جائے گا۔ حدیث میں ہے:

"فَإِذَا جَاءُوا الشَّامَ، خَرَجَ، فَبَيْنَمَا هُمْ يَعُدُّونَ لِلْقِتَالِ يُسَوُّونَ الصُّفُوفَ......الخ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٤٦٦ / باب الملاحم)

"جب وہ شام پہنچیں گے تو دجال نکل چکا ہوگا، یعنی وہاں پہنچ چکا ہوگا، اسلامی لشکر اس سے لڑنے کی تیاری کر کے صف بندی میں مشغول ہو جائے گا۔"

دجال کے خلاف اہلِ حق کا یہ آخری مقابلہ ہوگا اور نہایت سخت ہوگا، دیگر روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اسلامی لشکر بیت المقدس کے قریب ایک پہاڑ "جبل الدخان" کے قریب ہوگا تب دجال اس پہاڑ کے دامن میں پڑاؤ ڈال کر اسلامی لشکر کا سخت محاصرہ کر لے گا، ابتداءً اس محاصرہ کی وجہ سے مسلمان سخت مشقت اور فقر و فاقہ میں مبتلا ہو جائیں گے، حتیٰ کہ بعض لوگ اپنی کمان کی تانت جلا کر کھا جائیں گے۔ (مسند احمد) جب محاصرہ طول پکڑ لے گا تب اسلامی لشکر کے امیر حضرت مہدیؒ مجاہدین کو فتح یابی یا شہادت کی ترغیب دیتے ہوئے فیصلہ کن مقابلہ کرنے پر آمادہ کریں گے، تو مجاہدین بھی اس کا پختہ ارادہ اور تیاری کر لیں گے کہ صبح ہوتے ہی دجالی لشکر سے فیصلہ کن جنگ کریں گے، وہ رات بڑی سخت تاریک ہوگی، لوگ جنگ کی تیاری میں مشغول ہوں گے کہ صبح سے قبل اچانک کسی کی آواز آئے گی کہ "تمہارا فریادرَس اور مسیحا آپہنچا"۔ حضرت کعب احبارؓ فرماتے ہیں کہ اس آواز کے بعد جب لوگ اِدھر اُدھر نظر دوڑائیں گے تو ان کی نظر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر پڑے گی، نمازِ فجر کے وقت آپ علیہ السلام نزول فرمانے کے بعد دجالی لشکر سے مقابلہ کے لیے اسلامی لشکر کو لے کر آگے بڑھیں گے، اس وقت دجالی لشکر میں ستر ہزار مسلح یہودی ہوں گے۔

(مستفاد از: علاماتِ قیامت: ۱۵۳تا۱۵۹، مفتی محمد رفیع عثمانی)

آپ علیہ السلام کو دیکھ کر دجال اس طرح گھلنے لگے گا جس طرح پانی میں نمک گھلتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کو اس حال میں اگر چھوڑ دیں اور قتل نہ بھی کریں تب بھی وہ ملعون سارا گھل کر ختم ہو جائے اور از خود مر جائے؛ لیکن حق تعالیٰ نے اس کا قتل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں مقدر فرمایا ہے؛ اس لیے آپ علیہ السلام اس کو بابِ لُدّ (جو فلسطین کا ایک مقام ہے، جس پر آج کل یہودیوں کا ناجائز قبضہ ہے اور نام نہاد اسرائیلی حکومت نے وہاں ایک ایرپورٹ بھی بنوایا ہے) کے پاس اپنے نیزے سے قتل کر دیں گے، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کا خون اسلامی لشکر کو اپنے نیزے پر لگا ہوا دِکھا کر اطمینان دلائیں گے۔

حدیث پاک میں وارد ہے:

"فَإِذَا رَآهُ عَدُوُّ اللّٰهِ، ذَابَ كَمَا يَذُوبُ الْمِلْحُ فِي الْمَاءِ، فَلَوْ تَرَكَهُ لَانْذَابَ، حَتَّى يَهْلِكَ، وَلَكِنْ يَقْتُلُهُ اللّٰهُ بِيَدِهِ فَيُرِيهِمْ دَمَهُ فِي حَرْبَتِهِ".

(رواه مسلم، مشكوٰة : ٤٦٦)

روایتوں میں ہے کہ جو شخص جمعہ کے دن سورۂ کہف کی تلاوت کرے وہ آٹھ دن تک ہر قسم کے فتنوں سے محفوظ رہے گا، یہاں تک کہ اگر دجال بھی اس عرصے میں نکلے تو وہ اس سے بھی بچالیا جائے گا۔ (ابن کثیر)

(۳) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول:

قیامت کی علاماتِ کبریٰ قریبہ اور خاصہ میں سے تیسری علامت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول بھی ہے، جیسا کہ دجال کے تذکرہ میں اجمالی طور پر اس کا ذکر آچکا، قرآنِ کریم نے تو اجمالی طور پر اپنے معجزانہ انداز میں اس کا ذکر کیا؛ لیکن رحمت عالم ﷺ نے اپنے فرامین میں پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ قربِ قیامت میں نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کی خبر دی ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے اپنے رسالہ "التصريح بما تواتر في نزول المسيح" میں اس سلسلہ کی ستر احادیث مختلف کتب سے جمع فرمائی ہیں۔ (مستفاد از: معارف الحدیث: ۱۷۹/۸)

ہم یہاں کتاب وسنت کی روشنی میں کچھ تصریحات پیش کرنا چاہتے ہیں۔ وباللہ التوفیق۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وِلادت اور آسمان پر اُٹھائے جانے کا واقعہ:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے رسول اور اس کے برگزیدہ پیغمبر ہیں، آپ علیہ السلام کی ولادت بطریق خرقِ عادت اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی خصوصی قدرت سے ہوئی، اسی لیے قرآنِ کریم میں آپ کو "کلمۃ اللہ" بھی کہا گیا، ارشادِ ربانی ہے:

﴿إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ﴾ (النساء : ١٧١)

"بلاشبہ مسیح جو عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) ہیں وہ تو صرف اللہ کے رسول اور اس کے کلمہ ("کُن" سے پیدا شدہ) ہیں، جسے اللہ تعالیٰ نے مریم (علیہا السلام) تک پہنچایا، اور اللہ کی طرف سے ایک روح ہیں۔"

"کلمۃ اللّٰہ" سے مراد اللہ پاک کا لفظ "کُن" ہے، اور "روح" سے مراد ایک قول کے مطابق رحمت ہے۔ (انوار البیان: ۴۴/۲)

یعنی مفسرین کے اقوال کے مطابق "روح" سے مراد وہ پھونک ہے جسے حضرت جبرئیل علیہ السلام نے بحکم الٰہی حضرت مریم علیہا السلام کے گریبان میں پھونکا اور جسے اللہ تعالیٰ نے باپ کے نطفہ کے قائم مقام کر دیا۔ (تفسیر ابن کثیر)

اور اس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت آپ کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام کے بطن سے معجزانہ طور پر ہوئی، بغیر اس کے کہ ان کو کسی مرد نے چھوا بھی ہو۔ لیکن اس زمانہ کے یہود کو یہ بات ہضم نہ ہوئی، وہ آپ کو نعوذ باللہ ولد الزنا تصور کرتے تھے اور اسی بات پر اڑے رہے کہ آپ کی والدہ سیدہ مریم علیہا السلام سے برائی کا صدور ہوا ہے، پھر جب آپ علیہ السلام کو من جانب اللہ نبوت سے سرفراز کیا گیا تو یہود نے نہ صرف یہ کہ آپ علیہ السلام کی تردید کی؛ بلکہ دشمنی مول لی، حتیٰ کہ آپ کو سولی پر چڑھا کر سزائے موت دینے کا فیصلہ کر لیا، کیوں کہ ان کی کتاب تورات کے قانون اور اسرائیلی شریعت میں نبوت کے جھوٹے مدعی کی یہی سزا تھی، جس طرح اسلامی حکومت میں جھوٹے مدعیٔ نبوت کی سزا قتل ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کی والدہ کو پہلے ایک جگہ قید کر دیا، آپ علیہ السلام نے بددعا کر دی، جس سے قید کرنے والے بندر اور خنزیر بنا دیے گئے، جب یہ بات یہودیوں کے سردار یہودا کو

معلوم ہوئی تو اس نے ایک میٹنگ بلا کر فوری طور پر آپ کو سولی دے کر قتل کرنے کا فیصلہ کر دیا، جب یہودی لوگ آپ کو قتل کرنے کے لیے آئے تو حق تعالیٰ نے اپنی قدرت سے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھیج کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان کی طرف اُٹھالیا، اوران ہی یہودیوں میں سے جو شخص آپ علیہ السلام کو قتل کرنے کے لیے اندر داخل ہوا، جس کا نام ''طیطانوس'' تھا، وہاں ان کو موجود نہ پایا، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی شکل وصورت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ بنا دی، جب وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو موجود نہ پا کر باہر نکلا تو یہودیوں نے اسے حضرت عیسیٰ سمجھ کر سولی پر چڑھا دیا۔ (انوار البیان: ۳۲/۲)

قتل کے بعد جب غور سے دیکھا تو اس کا چہرہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ تھا اور بدن ان کے ساتھی کے مشابہ، اب حیران ہوگئے کہ اگر یہ حضرت عیسیٰ ہیں تو ہمارا ساتھی کہاں ہے؟ اور اگر یہ ہمارا ساتھی ہے تو عیسیٰ کہاں ہے؟ آج تک وہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق شکوک وشبہات کے شکار ہیں۔ قرآنِ پاک نے اسے اس طرح بیان فرمایا:

﴿ وَ قَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ﴾ (النساء : ۱۵۷)

''اور ان کے اس قول (دعویٰ) کے باعث کہ ہم نے اللہ کے رسول عیسیٰ بن مریم کو قتل کر دیا، حالانکہ نہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کیا، نہ سولی پر چڑھایا؛ بلکہ ان کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مشابہ بنا دیا گیا۔''

﴿ وَ إِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ﴾ (النساء : ۱۵۷)

''یقین جانو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اختلاف کرنے والے ان کے بارے میں شک میں ہیں، انہیں اس کا کوئی یقین نہیں، بجز تخمینی باتوں پر عمل کرنے کے، ہاں، اتنا یقینی ہے کہ انہوں نے ان کو قتل نہیں کیا۔''

﴿ بَلْ رَفَعَهُ اللّٰهُ إِلَيْهِ ﴾ (النساء : ۱۵۷)

''بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی طرف اُٹھالیا۔''

اس سے بالکل واضح ہوگیا کہ آپ علیہ السلام کو من جانب اللہ آسمان پر اٹھالیا گیا، نہ آپ علیہ السلام مقتول ہوئے اور نہ ہی آپ علیہ السلام کو طبعی موت آئی، آپ علیہ السلام دوسرے آسمان پر فرشتوں کے ساتھ ہیں، وہاں آپ علیہ السلام پر فرشتوں کی صفات ڈال دی گئیں، اس لیے آپ علیہ السلام آسمان میں بشری اور انسانی لوازمات سے پاک ہیں، نہ کھانے پینے کی ضرورت، نہ پیشاب و پاخانہ کی حاجت، پھر قیامت کے قریب آپ علیہ السلام آسمان سے نزول فرمائیں گے اور یہ قیامت کی بڑی علامت ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَ إِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا ﴾ (زخرف : ۶۱)

''اور یقیناً حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی ایک نشانی ہیں، لہٰذا تم قیامت کے بارے میں شک نہ کرو۔''

مطلب یہ ہے کہ قیامت کے قریب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نازل ہونا قیامت کی بڑی نشانی ہے۔ بعض قراء نے اسے عین اور لام کے فتحہ کے ساتھ ''عَـلَـمٌ'' پڑھا ہے، جس کے معنیٰ نشانی اور علامت کے ہیں۔

احادیث مبارکہ میں اس کا تذکرہ اس طرح ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ''كَيْفَ أَنْتُمْ إِذَا نَزَلَ ابْنُ مَرْيَمَ فِيْكُمْ، وَ إِمَامُكُمْ مِنْكُمْ''. (رواه البخاری، و مسلم، مشکوٰة : ۴۸۰)

''اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا (جب کہ حالات بہت غیر معمولی ہوں گے اور) جب تم میں حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نازل ہوں گے اور تمہارا امام تم میں سے ہوگا۔''

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ''فَـأَمَّـكُـمْ مِنْكُمْ'' ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمہاری امامت اور دینی قیادت فرمائیں گے۔ (معارف الحدیث: ۱۸۸/۸)

دوسری روایت میں ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "وَ الَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ، لَیُوْشِكَنَّ أَنْ یَنْزِلَ فِیْكُمُ ابْنُ مَرْیَمَ حَكَمًا عَدْلًا......الخ". (متفق علیه، مشکوٰة : ۴۷۹ / باب نزول عیسی علیه السلام)

’’اس پاک کی ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، قریب ہے وہ وقت جب تم میں حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام عادل حاکم کی حیثیت سے نازل ہوں گے۔‘‘

آپ علیہ السلام مشہور صحابی حضرت عُروہ بن مسعودؓ کے مشابہ ہوں گے، قد وقامت درمیانہ اور رنگ سرخ وسفید ہوگا، بال شانوں تک بڑھے ہوئے اور کسی قدر گھنگریالے ہوں گے، جس جماعت پر آپ کا نزول ہوگا وہ اس زمانہ کے صالح ترین آٹھ سو مرد اور چار سو عورتوں پر مشتمل ہوگی۔

حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کہاں نازل ہوں گے؟

اب رہی بات یہ کہ آپ علیہ السلام آسمان سے کس جگہ نازل ہوں گے؟ تو حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے مروی طویل روایت میں ہے:

إِذْ بَعَثَ اللّٰهُ الْمَسِیحَ ابْنَ مَرْیَمَ فَیَنْزِلُ عِنْدَ الْمَنَارَةِ الْبَیْضَاءِ شَرْقِيَّ دِمَشْقَ بَیْنَ مَهْرُوْدَتَیْنِ، وَاضِعًا كَفَّیْهِ عَلَی أَجْنِحَةِ مَلَكَیْنِ، إِذَا طَأْطَأَ رَأْسَهٗ قَطَرَ، وَ إِذَا رَفَعَهٗ تَحَدَّرَ مِنْهُ مِثْلُ جُمَانٍ كَاللُّؤْلُؤِ، فَلَا یَحِلُّ لِكَافِرٍ یَجِدُ رِیحَ نَفَسِهٖ إِلَّا مَاتَ، وَنَفَسُهٗ یَنْتَهِي حَیْثُ یَنْتَهِي طَرْفُهٗ، فَیَطْلُبُهٗ، حَتّٰی یُدْرِكَهٗ بِبَابِ لُدٍّ، فَیَقْتُلُهٗ". (رواه مسلم، مشکوٰة : ۴۷۳)

’’جب اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو بھیجیں گے تو آپ علیہ السلام دمشق کے مشرقی حصہ میں سفید منارے کے پاس اُتریں گے، اس وقت آپ علیہ السلام دو زرد رنگ کے لباس میں ملبوس ہوں گے اور دو فرشتوں کے بازؤں پر ہاتھ رکھ کر اُتریں گے، جب

آپ سر جھکائیں گے تو ایسا محسوس ہوگا کہ قطرے ٹپک رہے ہیں، اور جب سر اُٹھائیں گے تو موتی کی طرح قطرے ڈھلکتے نظر آئیں گے، ان کے سانس کی ہوا جس کافر تک پہنچے گی وہ زندہ نہیں بچے گا، جب کہ ان کی سانس ان کی حدنگاہ تک پہنچے گی، پھر ابن مریم علیہ السلام دجال کا پیچھا کریں گے اور مقام لُد کے دروازے پر اسے پکڑ لیں گے اور قتل کر ڈالیں گے۔‘‘

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دمشق کی جامع مسجد اُموی کے مشرقی منارے پر جلوہ افروز ہوں گے اور سیڑھی منگوا کر نیچے اُتریں گے، جب کہ ابن ماجہ کی روایت میں ہے کہ آپ علیہ السلام بیت المقدس میں اُتریں گے۔

بعض علماء نے اس طرح تطبیق دی ہے کہ ہوسکتا ہے کہ آسمان سے نزول تو دمشق کی مشرقی سمت میں سفید منارے کے پاس ہو، مگر اخیری شب میں آپ علیہ السلام بیت المقدس کے محصور مسلمانوں کے پاس پہنچ جائیں، جہاں امام مہدیؒ بھی ہوں گے، دیگر روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

اس وقت حضرت مہدیؒ نمازِ فجر پڑھانے کے لیے آگے بڑھ چکے ہوں گے اور نماز کی اقامت ہوچکی ہوگی، حضرت مہدیؒ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو امامت کے لیے بلائیں گے تو آپ علیہ السلام انکار فرمادیں گے، کہ یہ اس امت کا اعزاز ہے کہ اس کے بعض لوگ بعض کے امیر ہیں۔

حدیث میں ہے:

عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي یُقَاتِلُوْنَ عَلَی الْحَقِّ، ظَاهِرِینَ إِلَی یَوْمِ الْقِیَامَةِ، قَالَ: فَیَنْزِلُ عِیسَی ابْنُ مَرْیَمَ عَلَیْهِ السَّلَامُ، فَیَقُوْلُ أَمِیرُهُمْ: "تَعَالَ! صَلِّ لَنَا" فَیَقُوْلُ: "لَا، إِنَّ بَعْضَكُمْ عَلَی بَعْضٍ أُمَرَاءُ تَكْرِمَةَ اللّٰهِ هٰذِهِ الْأُمَّةَ". (رواه مسلم، مشکوٰة : ۴۸۰)

’’میری امت کی ایک جماعت حق کے غلبہ کے لیے قیامت تک لڑتی رہے گی، پھر

فرمایا کہ جب حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نازل ہوں گے تو ان کا امیر کہے گا کہ آئیے! اور ہمیں نماز پڑھائیے! وہ انکار کرتے ہوئے کہیں گے کہ تم میں سے بعض بعض پر امیر ہیں، اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس امت کے اکرام کے طور پر ہے۔''

ایک روایت میں ہے کہ آپ علیہ السلام کو دیکھ کر حضرت مہدیؒ جب مصلیٰ سے پیچھے ہٹنے لگیں گے تو آپ علیہ السلام ان کی پشت پر ہاتھ رکھ کر فرمائیں گے کہ تم ہی نماز پڑھاؤ، کیوں کہ اقامت تمہارے لیے کہی گئی ہے، چنانچہ اس وقت حضرت مہدیؒ ہی نماز پڑھائیں گے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ان کے پیچھے نماز ادا فرمائیں گے، اس کے بعد کی نمازوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام امامت فرمائیں گے، جن میں رکوع سے اٹھ کر ''سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ'' کے بعد یہ جملہ فرمائیں گے: ''قَتَلَ اللّٰہُ الدَّجَّالَ وَ أَظْهَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ''. (اللہ تعالیٰ دجال کو قتل کرے اور مسلمانوں کو غالب فرمائے)۔ (صحیح ابن حبان و مجمع الزوائد)

نمازِ فجر سے فراغت پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام دروازہ کھلوائیں گے جس کے پیچھے دجال اپنے ستر ہزار مسلح یہودی لشکر کے ساتھ ہوگا، آپ ہاتھ کے اشارے سے فرمائیں گے کہ میرے اور دجال کے درمیان سے ہٹ جاؤ، دجال آپ کو دیکھتے ہی ایسا گھلنے لگے گا جیسے پانی میں نمک گھلتا ہے، یا جیسے رانگ اور چربی پگھلتی ہے، اس وقت جس کافر پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سانس کی ہوا پہنچے گی وہ مر جائے گا، اور جہاں تک آپ کی نظر پہنچے گی وہاں تک آپ کی سانس بھی پہنچے گی، اسلامی لشکر بھی پہاڑ سے اُتر کر دجالی لشکر پر ٹوٹ پڑے گا، یہود پر ایسا قدرتی رُعب چھایا ہوگا کہ ڈیل ڈول والا یہودی بھی تلوار تک نہ اُٹھا سکے گا۔

(مستفاد از: علاماتِ قیامت: ١٥٧ تا ١٥٩، مفتی محمد رفیع عثمانی)

غزوۂ ہند اور آخری غزوہ میں شرکت کی فضیلت:

الغرض سخت جنگ ہوگی، یہی وہ جنگ ہے جس میں شریک ہونے والوں کے لیے

حدیث میں جہنم سے حفاظت کی بشارت ہے:

عَنْ ثَوْبَانَ مَوْلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "عِصَابَتَانِ مِنْ أُمَّتِي أَحْرَزَهُمَا اللَّهُ مِنَ النَّارِ، عِصَابَةٌ تَغْزُو الْهِنْدَ، وَعِصَابَةٌ تَكُونُ مَعَ عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ عَلَيْهِمَا السَّلَام". (رواه النسائي : ٥٢/ كتاب الجهاد / باب غزوة الهند، مسند أحمد : ٥/ ٢٧٨)

''میری امت کی دو جماعتوں کو اللہ تعالیٰ نے جہنم کی آگ سے محفوظ کر لیا ہے، ایک وہ جماعت جو ہندوستان کے ساتھ غزوہ کرے گی، اور دوسری وہ جماعت جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معیت میں (دجال کے خلاف آخری معرکہ میں) جنگ کرے گی۔''

اس حدیث شریف میں مجاہدین کی دو جماعتوں کے لیے جہنم سے آزادی کی خوش خبری دی گئی ہے، ایک وہ جماعت جو غزوۂ ہند میں شریک ہوگی، دوسری وہ جماعت جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معیت میں آخری جنگ میں دجال کے خلاف شریک ہوگی۔ جہاں تک غزوۂ ہند کا تعلق ہے تو اس کی فضیلت میں مذکورہ روایت کے علاوہ کم از کم چار احادیث منقول ہیں، جن میں دو کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ ہیں، تیسری روایت کے راوی حضرت ابی بن کعبؓ ہیں، اور چوتھی کے راوی حضرت صفوان بن عمروؒ تابعی ہیں، حضرت ابو ہریرہؓ کی پہلی روایت یہ ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا:

"يَكُونُ فِي هٰذِهِ الْأُمَّةِ بَعْثٌ إِلَى السِّنْدِ وَ الْهِنْدِ، فَإِنْ أَنَا أَدْرَكْتُهُ فَاسْتُشْهِدْتُ فَذٰلِكَ، وَ إِنْ أَنَا رَجَعْتُ، وَ أَنَا أَبُو هُرَيْرَةَ الْمُحَرَّرُ، قَدْ أَعْتَقَنِي مِنَ النَّارِ". (مسند أحمد : ٢/٣٦٩)

''اس امت میں سندھ و ہند کی طرف (اسلامی) لشکر کی روانگی ہوگی، اگر مجھے کسی ایسی مہم میں شرکت کا موقع ملا اور میں شہید ہو گیا تو ٹھیک، اگر غازی بن کر واپس آیا تو میں ایک آزاد ابو ہریرہ ہوں گا، جسے اللہ تعالیٰ نے جہنم سے آزاد کر دیا ہوگا۔''

امام نسائی نے حضرت ابو ہریرہؓ کی اس روایت کو اپنی کتاب ''السنن المجتبیٰ'' اور

’’السنن الکبریٰ‘‘ میں ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے:

”وَعَدَنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ غَزْوَةَ الْهِنْدِ، فَإِنْ أَدْرَكْتُهَا أُنْفِقُ فِيهَا نَفْسِيْ وَ مَالِيْ، فَإِنْ أُقْتَلْ كُنْتُ مِنْ أَفْضَلِ الشُّهَدَاءِ، وَ إِنْ أَرْجِعْ فَأَنَا أَبُوْ هُرَيْرَةَ الْمُحَرَّرُ“.

(السنن المجتبیٰ:٦/٤٢ / كتاب الجهاد / باب غزوة الهند، السنن الكبرىٰ للنسائی : ٣/٢٨ / باب غزوة الهند)

’’حضور ﷺ نے ہم سے غزوۂ ہند کا وعدہ فرمایا (آگے حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ) اگر مجھے اس میں شرکت کا موقع مل گیا تو میں اپنی جان و مال اس میں خرچ کروں گا، اگر میں قتل ہو گیا تو افضل ترین شہداء میں شمار ہوں گا، اور اگر غازی بن کر واپس لوٹا تو جہنم سے آزاد ہوں گا۔‘‘

حضرت ابو ہریرہؓ کی دوسری روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے ہندوستان کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ’’ضرور تمہارا ایک لشکر ہندوستان سے جنگ کرے گا، اللہ پاک ان مجاہدین کو فتح عطا فرمائے گا، حتیٰ کہ وہ مجاہدین ہند کے بادشاہ و حاکم کو بیڑیوں میں جکڑ کر لائیں گے اور اللہ تعالیٰ اس جہادِ ہند کی برکت سے ان مجاہدین کی مغفرت فرما دے گا، پھر جب وہ مجاہدین غزوۂ ہند سے واپس لوٹیں گے تو حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو شام میں پائیں گے، حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ اگر میں نے وہ غزوہ پایا تو اپنا نیا اور پرانا سب مال بیچ دوں گا اور اس میں شرکت کروں گا، جب اللہ تعالیٰ ہمیں فتح عطا فرمائیں اور ہم واپس لوٹیں تو میں ایک آزاد ابو ہریرہؓ ہوں گا، جو ملک شام میں اس شان سے آئے گا کہ وہاں حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو پائے گا، یارسول اللہ! اس وقت میری شدید خواہش ہوگی کہ میں ان کے پاس پہنچ کر انہیں بتاؤں کہ میں آپ ﷺ کا صحابی ہوں۔ راوی کا بیان ہے کہ حضور ﷺ نے مسکرا کر فرمایا کہ بہت مشکل، بہت مشکل۔‘‘

اس حدیث کو حضرت نعیم بن حمادؒ نے اپنی (کتاب الفتن: ١/۴٠٩/ غزوۃ الہند) میں روایت کیا ہے۔

۲۶۳

حضرت اُبی بن کعبؓ کی روایت میں ہے کہ ’’بیت المقدس کا ایک بادشاہ ہند کی جانب ایک لشکر روانہ کرے گا، یہ مجاہدین ہند کو فتح کریں گے اور اس کے حاکم کو بیڑیوں میں جکڑ کر بادشاہ کے روبرو پیش کریں گے، دجال کے خروج تک ہند میں قیام کریں گے۔‘‘

(الفتن: ١/۴٠٩)

حضرت صفوان بن عمروؓ کی روایت میں حضور پاک ﷺ کا ارشاد ہے کہ ’’میری امت کے کچھ لوگ ہندوستان سے جنگ کریں گے، جنہیں اللہ تعالیٰ فتح عطا فرمائے گا، حتیٰ کہ وہ ہند کے حاکم کو بیڑیوں میں جکڑ لیں گے، اللہ تعالیٰ ان مجاہدین کی مغفرت فرمائیں گے، جب وہ شام کی طرف رُخ کریں گے تو حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو پائیں گے۔‘‘

(الفتن: ١/٣٩٩، مستفاد از: ’’غزوۂ ہند ایک مبارک الہامی پیشین گوئی‘‘)

علماءِ محققین کے قول کے مطابق اس میں ’’ہند‘‘ سے مراد متحدہ ہندوستان یا ہند کی طرف کے علاقے مراد ہیں، نیز اس سے مراد کونسا غزوہ ہے؟ تو اس سلسلہ میں ایک رائے یہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی اور درمیانی دور میں جو غزوات ہوئے ان کی بنا پر ہندوستان ایک عرصہ تک دار الاسلام بنا رہا اور وہاں اسلامی حکومت قائم رہی، وہ تمام غزوات غزوۃ الہند کے مصداق ہیں۔

دوسری رائے یہ ہے کہ خلافت راشدہ سے لے کر قیامت تک ہندوستان میں اعلاءِ کلمۃ اللہ اور دین حق کی سربلندی کے لیے جتنے بھی غزوات ہوں گے وہ سب غزوۃ الہند کے مصداق ہیں۔

تیسری رائے یہ ہے کہ ابھی غزوۂ ہند پیش نہیں آیا؛ بلکہ حضرت مہدیؒ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں غزوۂ ہند کا تحقق ہوگا، جیسا کہ نعیم بن حمادؒ کی روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

یہودیوں کا خاتمہ اور ایمان کا غلبہ :

بہر کیف اسلامی لشکر کو دجالی لشکر پر کامیابی نصیب ہوگی، جنگ کے بعد دجال شکست کھا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوجائے گا؛ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کا تعاقب فرمائیں گے اور بابِ لدّ کے پاس اسے نیزہ مار کر قتل کردیں گے۔

" فَيَطْلُبُهُ، حَتّٰى يُدْرِكَهُ بِبَابِ لُدٍّ، فَيَقْتُلُهُ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٤٧٣)

اس کے بعد یہودیوں کا قتل عام ہوگا، کوئی شجر، حجر یا درخت یہود کو پناہ نہیں دے گا، بلکہ شکایت کرے گا کہ اے مسلم! اے فوجِ ربانی کے مجاہد سپاہی! آجا! یہ یہودی میرے پیچھے چھپ کر بیٹھا ہے، اس کو آکر ختم کردے، ماردے، صرف ''غرقد'' نامی درخت شکایت نہیں کرے گا؛ کیوں کہ یہ درخت یہود کا وفادار ہے، یہی وجہ ہے کہ آج کل یہودیوں نے اسرائیل کو اس درخت سے بھر دیا ہے؛ لیکن مسلمان بھی اندھے نہیں ہوں گے، بصارت کے ساتھ بصیرت سے بھی معمور ہوں گے؛ اس لیے اگر غرقد کا درخت نہ بھی بتائے تو مسلمان یہود کو ڈھونڈ لیں گے اور پکڑ پکڑ کر قتل کردیں گے، یہاں تک کہ صفحۂ ہستی سے یہود کا خاتمہ ہو جائے گا، حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يُقَاتِلَ الْمُسْلِمُوْنَ الْيَهُوْدَ، فَيَقْتُلُهُمُ الْمُسْلِمُوْنَ، حَتّٰى يَخْتَبِئَ الْيَهُوْدِيُّ مِنْ وَرَاءِ الْحَجَرِ وَالشَّجَرِ، فَيَقُوْلُ الْحَجَرُ وَالشَّجَرُ: يَا مُسْلِمُ! يَا عَبْدَ اللّٰهِ! هٰذَا يَهُوْدِيٌّ خَلْفِيْ، فَتَعَالَ! فَاقْتُلْهُ، إِلَّا الْغَرْقَدَ، فَإِنَّهُ مِنْ شَجَرِ الْيَهُوْدِ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٤٦٦ / باب الملاحم)

''قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک مسلمان یہودیوں سے جنگ نہ کریں گے (اس جنگ میں) مسلمان یہود کا قتل عام کریں گے، حتیٰ کہ جو یہودی (اس قتل عام میں) کسی پتھر اور درخت کے پیچھے چھپا ہوا ہوگا تو وہ مسلمان کو آواز دے کر کہے گا کہ اے

مسلمان! اے اللہ کے بندے! اِدھر آ، میرے پیچھے یہودی ہے، اسے قتل کردے، سوائے غرقد (ایک کانٹے دار درخت) کے؛ کیوں کہ وہ یہود کا درخت ہے۔''

دنیا سے یہود کا مکمل صفایا اور خاتمہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ہوگا، حق تعالیٰ کو جانوروں میں خنزیر بہت مبغوض ہے، تو انسانوں میں یہودِ نا بہبود بہت مبغوض ہیں، انھوں نے ایک ایک دن میں کئی کئی انبیاءِ بنی اسرائیل کو شہید کر ڈالا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی حملہ کر کے ان کے اپنے گمان کے مطابق ان کو بھی مار ڈالا تھا؛ مگر قربِ قیامت میں اللہ تعالیٰ نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ان ہی یہود کا دنیا سے مکمل صفایا اور خاتمہ فرما دیں گے، اور اہل ایمان کو غلبہ نصیب ہوگا، اس طرح کہ دنیا بھر کے اہل کتاب عیسائی ایمان لے آئیں گے۔

حدیث میں ہے:

" يَنْزِلُ فِيْكُمُ ابْنُ مَرْيَمَ حَكَمًا عَدْلًا، فَيَكْسِرُ الصَّلِيْبَ، وَ يَقْتُلُ الْخِنْزِيْرَ، وَ يَضَعُ الْجِزْيَةَ، وَ يُفِيْضُ الْمَالَ، ......الخ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٤٧٩)

''حضرت عیسیٰ علیہ السلام حاکم عادل کی حیثیت سے نازل ہو کر صلیب کو توڑ دیں گے اور خنزیر کو قتل کردیں گے، نیز جزیہ بھی ختم کردیں گے (کیوں کہ اس کی ضرورت ہی باقی نہ ہوگی) بے شمار مال تقسیم کریں گے، حتیٰ کہ کوئی اسے قبول کرنے والا نہیں ہوگا، اس وقت ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے بہتر سمجھا جائے گا (ایمان کا غلبہ ہوگا) پھر آپ ﷺ نے آیت کریمہ ﴿وَ إِنْ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ﴾ (النساء : ١٥٩) **تلاوت فرمائی۔''**

خروجِ یاجوج وماجوج کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور کی تنگ حالی:

اس آخری دجالی جنگ میں کامیابی کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت

مہدیؒ دونوں مل کر ان شہروں اور علاقوں کا دورہ کریں گے جہاں دجال نے فساد برپا کیا تھا، لیکن مخلص ایمان والے اپنے ایمان واعمال پر جمے اور ڈٹے رہے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں دجالی فتنہ سے محفوظ رکھا (یا تو وہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے یا پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے پاس پہنچیں گے) اور انہیں تسلی وخوش خبری دیں گے۔ حدیث پاک میں وارد ہے:

"ثُمَّ يَأْتِي عِيسٰى قَوْمٌ قَدْ عَصَمَهُمُ اللّٰهُ مِنْهُ، فَيَمْسَحُ عَنْ وُجُوهِهِمْ، وَيُحَدِّثُهُمْ بِدَرَجَاتِهِمْ فِي الْجَنَّةِ". (رواہ مسلم، مشکوٰۃ: ۴۷۳)

"پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس ایسے لوگ آئیں گے جنہیں اللہ تعالیٰ نے فتنۂ دجال سے محفوظ رکھا تھا، آپ علیہ السلام ان کے چہروں کو پوچھیں گے، یعنی ان کے دلوں سے دجال کا خوف دور کریں گے، انہیں تسلی دیں گے اور جنت کے درجات کی خوش خبری سنائیں گے۔"

اس کے بعد لوگ اپنے اپنے وطن واپس ہو جائیں گے، مسلمانوں کی ایک جماعت آپ کی خدمت اور صحبت میں رہے گی، لوگ امن وچین کی زندگی بسر کر رہے ہوں گے، کہ حق تعالیٰ کی طرف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوگا کہ وہ مسلمانوں کو کوہِ طور کی طرف جمع کر لیں؛ کیوں کہ اب یاجوج وماجوج کو نکالا جائے گا، جن کا مقابلہ کسی کے بس کا نہیں ہوگا، اس حکم کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں کے ساتھ وہاں جا کر قلعہ بند ہو جائیں گے۔ حدیث میں ہے:

"فَبَيْنَمَا هُوَ كَذٰلِكَ، إِذْ أَوْحَى اللّٰهُ إِلٰى عِيسٰى أَنِّي قَدْ أَخْرَجْتُ عِبَادًا لِي، لَا يَدَ لِأَحَدٍ بِقِتَالِهِمْ، فَحَرِّزْ عِبَادِي إِلَى الطُّورِ". (رواہ مسلم، مشکوٰۃ: ۴۷۳)

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی حال میں ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر وحی آئے گی کہ میں اپنے ایسے بندوں کو نکالنے والا ہوں جن سے لڑنے کی طاقت کسی میں نہیں، لہٰذا آپ میرے بندوں کو لے کر کوہِ طور کی طرف چلے جائیں اور ان کی حفاظت کریں،

اس کے بعد یاجوج وماجوج زمین پر نکل آئیں گے اور ساری دنیا میں فساد پھیلائیں گے، اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مسلمانوں پر زندگی اس قدر تنگ ہو جائے گی کہ لوگوں کو بیل کا سر سو دینار سے بہتر معلوم ہوگا۔" حدیث میں ہے:

"وَيُحْصَرُ نَبِيُّ اللّٰهِ وَأَصْحَابُهُ حَتّٰى يَكُونَ رَأْسُ الثَّوْرِ لِأَحَدِهِمْ خَيْرًا مِنْ مِأَةِ دِينَارٍ لِأَحَدِكُمُ الْيَوْمَ". (رواہ مسلم، مشکوٰۃ: ۴۷۳)

"(جب یاجوج وماجوج نکل کر زمین میں فساد پھیلا رہے ہوں گے تو اس عرصہ میں) اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اس وقت کے مؤمنین مخلصین کوہِ طور پر محصور ہو جائیں گے (روک لیے جائیں گے، تنگیٔ معاش اور غذائی قلت کے سبب) ان لوگوں کے لیے بیل کا سر تمہارے آج کے سو دینار سے بہتر ہوگا۔"

مطلب یہ ہے کہ فقر وفاقہ اور غذائی تنگی کا یہ حال ہوگا کہ بیل کا سر جو دیگر اعضاء کے بالمقابل نہایت سستا ہوتا ہے وہ بھی سو دینار میں ملے گا، تو اس کے دیگر اعضاء کا کیا حال ہوگا؟ پھر مرغوب چیزوں کی قیمت کیا ہوگی؟ ایک عرصہ تک یہ سلسلہ رہے گا، پھر حق تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے رُفقاء کی بد دعا کے نتیجہ میں یاجوج وماجوج کو ہلاک کر دیں گے۔ اس سے دعا کی طاقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کی کوئی ظاہری طاقت اور حکومت یاجوج وماجوج کے مقابلہ کی طاقت نہ رکھ سکے گی؛ لیکن دعا کی برکت سے حق تعالیٰ اس قوم کو ہلاک فرمائیں گے۔ حدیث پاک میں ہے:

"فَيُرْسِلُ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ النَّغَفَ فِي رِقَابِهِمْ، فَيُصْبِحُونَ فَرْسٰى، كَمَوْتِ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ، ثُمَّ يَهْبِطُ نَبِيُّ اللّٰهِ عِيسٰى وَأَصْحَابُهُ إِلَى الْأَرْضِ، فَلَا يَجِدُونَ فِي الْأَرْضِ مَوْضِعَ شِبْرٍ إِلَّا مَلَأَهُ زَهَمُهُمْ وَنَتْنُهُمْ، فَيَرْغَبُ نَبِيُّ اللّٰهِ عِيسٰى وَأَصْحَابُهُ إِلَى اللّٰهِ، فَيُرْسِلُ اللّٰهُ طَيْرًا كَأَعْنَاقِ الْبُخْتِ، فَتَحْمِلُهُمْ فَتَطْرَحُهُمْ حَيْثُ شَاءَ اللّٰهُ، وَفِي رِوَايَةٍ: تَطْرَحُهُمْ بِالنَّهْبَلِ". (رواہ مسلم، مشکوٰۃ: ۴۷۳)

"اللہ کے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی یاجوج وماجوج کی ہلاکت

کے لیے بددعا کریں گے، جس کے بعد حق تعالیٰ یاجوج وماجوج کی گردنوں میں "نـــغف" نامی بیماری پیدا کردیں گے (یہ ایک قسم کا دانہ پھنسی کی شکل کا ہوگا، جو بھیڑ، بکری وغیرہ کی ناک اور گردن میں نکلتا ہے اور طاعون کی طرح تھوڑی دیر میں انسان کو ہلاک کردے گا) ساری ساری قوم ایک ہی دن میں ہلاک ہو جائے گی (جیسے دوائی سے کیڑے یکبارگی مرجاتے ہیں) یاجوج وماجوج کی ہلاکت کے بعد جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے رُفقاء محفوظ قلعہ سے نکل کر آئیں گے تو انہیں زمین میں ایک بالشت کے برابر بھی ایسی جگہ نہیں ملے گی جو یاجوج وماجوج کی چربی کی چکناہٹ اور ان کی سڑی ہوئی لاشوں کی بدبو سے خالی ہو، جس کی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے رُفقاء پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے تب حق تعالیٰ ایسے پرندے بھیجیں گے جو بختی اونٹ کی گردن جیسی لمبی لمبی گردنوں والے ہوں گے، جو ان کی لاشوں کو اُٹھا کر جہاں اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوگی وہاں (سمندروں میں) پھینک دیں گے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ "نَهْبَل" (سورج نکلنے کی جگہ، یا بہت ہی گہرا کھڈا یا مطلقاً کسی جگہ کا نام ہے) میں پھینک دیں گے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور کی خوشحالی:

اس کے بعد بڑی بابرکت بارش ہوگی، جو مسلسل چالیس دن تک برسے گی، جس سے روئے زمین کا کوئی کچا یا پکا مکان اور خیمہ وچھپر وغیرہ ٹپکے بغیر نہ رہ سکے گا، اس بارش کی وجہ سے زمین میں نہ صرف ہریالی آئے گی؛ بلکہ پیداوار میں بھی نہایت بڑھوتری اور خوشحالی ہوگی، ہر قسم کی دینی ودنیوی برکات نازل ہوں گی، پوری دنیا امن وامان، ہریالی اور خوشحالی سے بھر جائے گی، بغض وعداوت کسی بھی جاندار میں باقی نہ رہے گی، مال ودولت کی اس قدر فراوانی اور زیادتی ہوگی کہ زکوٰۃ وصدقات لینے والا ڈھونڈنے سے بھی کوئی نہیں ملے گا۔ حدیث پاک میں وارد ہے:

"ثُمَّ يُرْسِلُ اللّٰهُ مَطَرًا لَا يَكُنُّ مِنْهُ بَيْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ، فَيَغْسِلُ الْأَرْضَ، حَتّٰى

يَتْرُكَهَا كَالزَّلَفَةِ، ثُمَّ يُقَالُ لِلْأَرْضِ: "أَنْبِتِي ثَمَرَتَكِ وَرُدِّي بَرَكَتَكِ"، فَيَوْمَئِذٍ تَأْكُلُ الْعِصَابَةُ مِنَ الرُّمَّانَةِ، وَيَسْتَظِلُّونَ بِقِحْفِهَا، وَيُبَارَكُ فِي الرِّسْلِ، حَتّٰى أَنَّ اللِّقْحَةَ مِنَ الْإِبِلِ لَتَكْفِي الْفِئَامَ مِنَ النَّاسِ، وَاللِّقْحَةَ مِنَ الْبَقَرِ لَتَكْفِي الْقَبِيلَةَ مِنَ النَّاسِ، وَ اللِّقْحَةَ مِنَ الْغَنَمِ لَتَكْفِي الْفَخِذَ مِنَ النَّاسِ". (رواه مسلم، مشكوٰة: ٤٧٣)

"پھر اللہ تعالیٰ ایک زوردار بارش بھیجیں گے، جس سے کوئی مکان خواہ وہ مٹی کا ہو یا پتھر کا یا صوف کا نہیں بچے گا، وہ بارش زمین کو دھو کر آئینہ کی طرح صاف کردے گی، پھر زمین کو حکم دیا جائے گا کہ اپنی پیداوار کو نکال اور اپنی برکتوں کو واپس لا (چنانچہ اس وقت زمین کی پیداوار اس قدر بابرکت ہوگی کہ) دس سے لے کر چالیس آدمیوں کی ایک پوری جماعت ایک ہی اَنار کے پھل سے سیراب ہو جائے گی اور اس اَنار کے چھلکے سے لوگ سایہ حاصل کریں گے، نیز دودھ میں برکت کا یہ حال ہوگا کہ دودھ دینے والی ایک اونٹنی لوگوں کی ایک بڑی جماعت کے لیے کافی ہوگی اور دودھ دینے والی ایک گائے لوگوں کے ایک قبیلہ کے لیے کافی ہوگی اور دودھ دینے والی ایک بکری ایک چھوٹی سی جماعت کے لیے کافی ہوگی۔"

اس زمانہ میں مسلمان یاجوج وماجوج کا جو مالِ غنیمت حاصل کریں گے حق تعالیٰ اس میں بھی برکت پیدا فرمادیں گے۔ حدیث میں ہے:

"وَ يَسْتَوْقِدُ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ قِسِيِّهِمْ وَ نُشَّابِهِمْ وَ جِعَابِهِمْ سَبْعَ سِنِيْنَ".

(رواه مسلم، مشكوٰة: ٤٧٣)

"مسلمان یاجوج وماجوج کی کمانوں، تیروں اور ترکشوں کو سات سال تک آگ میں جلانے کے کام میں لیں گے۔"

بعض علماء نے اس سے یہ ثابت کیا ہے کہ آئندہ قیامت سے قبل وہ زمانہ آئے گا جس میں جدید ٹیکنالوجی ختم ہو جائے گی، اور اہل زمانہ پھر اسباب وسائل میں جدید سے قدیم کی طرف لوٹیں گے۔ واللہ اعلم۔

ایک روایت میں ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "وَاللّٰهِ لَيَنْزِلَنَّ ابْنُ مَرْيَمَ حَكَمًا عَادِلًا، فَلَيَكْسِرَنَّ الصَّلِيْبَ، وَلَيَقْتُلَنَّ الْخِنْزِيْرَ، وَلَيَضَعَنَّ الْجِزْيَةَ، وَلَتُتْرَكَنَّ الْقِلَاصُ، فَلَا يُسْعَىٰ عَلَيْهَا، وَلَتَذْهَبَنَّ الشَّحْنَاءُ وَالتَّبَاغُضُ وَالتَّحَاسُدُ، وَلَيَدْعُوَنَّ إِلَى الْمَالِ فَلَا يَقْبَلُهُ أَحَدٌ". (رواہ مسلم، مشکوٰۃ : ۴۸۰)

''حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ کی قسم! حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام حاکم عادل کی حیثیت سے اُتریں گے، وہ صلیب کو توڑ دیں گے (''صلیب'' اصل میں دولکڑیوں کا نام ہے، جو مثلث کی شکل میں ہوتی ہیں، جو عیسائیوں کے یہاں نہایت مقدس ہے، اس کے ساتھ ان کی محبت کا یہ حال ہے کہ اپنی اکثر مصنوعات پر اس کی شکل بناتے ہیں، ان کا یہ عقیدہ ہے کہ یہود نے اسی پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دی تھی اور یہود کا بھی یہی دعویٰ اور عقیدہ ہے، حالانکہ دونوں کا اعتقاد باطل ہے، اسی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسے توڑ دیں گے، اس کو توڑنے کا مطلب عیسائیت کو باطل کرنا اور شریعت محمدی کو واجب الاطاعت قرار دینا ہے) اور خنزیر (جو عیسائیوں کا محبوب جانور ہے) اسے قتل کر دیں گے (اس سے مقصد بھی اس کی حرمت کو واضح کرنا ہے) اور جزیہ کو اُٹھا دیں گے (کیوں کہ اس وقت ساری دنیا کا مذہب اسلام ہی ہوگا، لہٰذا اب جزیہ کس سے لیا جائے؟ جیسا کہ ارشادِ باری ﴿ وَ إِنْ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ﴾ (النساء : ۱۵۹) کے تحت حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اس وقت دنیا میں جو یہود و نصاریٰ ہوں گے وہ بھی دین اسلام قبول کر لیں گے، حضرت ابو ہریرہؓ نے بھی اس کو بیان فرمایا ہے۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ : ۴۷۹) جوان اونٹوں کو (جو عربوں کے یہاں بہت محبوب مال ہے) کھلا چھوڑ دیا جائے گا، ان سے سواری اور بار برداری کا کام نہیں لیا جائے گا، یعنی لوگ قیمتی سے قیمتی اموال سے بھی مستغنی ہو جائیں گے، اور بلاشبہ لوگوں کے دلوں سے کینہ، بغض اور عداوت وحسد نکل جائے گا (یعنی دنیا کی محبت ہی جب ختم ہو جائے گی تو اس سے پیدا شدہ بیماریاں مثلاً کینہ، بغض، عداوت اور حسد وغیرہ بھی

ختم ہو جائیں گے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام لوگوں کو مال و دولت سے نوازنے کے لیے بلائیں گے، مگر کوئی بھی قبول کرنے والا نہیں ہوگا۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات اور آپ کے خلیفہ:

الغرض نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد یہ دور نہایت خوشحال ہوگا، کہا گیا ہے کہ اسلام کے دورِ اوّل کے بعد امت کا یہ بہترین دور ہوگا، اسی دوران حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نکاح حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم یعنی قبیلۂ جذام میں ہوگا اور آپ کی اولاد بھی ہوگی۔ حدیث پاک میں وارد ہے:

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "يَنْزِلُ عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ إِلَى الْأَرْضِ، فَيَتَزَوَّجُ، وَ يُوْلَدُ لَهٗ". (مشکوٰۃ : ۴۸۰)

''حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام زمین پر نازل ہوں گے، پھر وہ نکاح کریں گے اور ان کی اولاد ہوگی۔''

نیز روایتوں میں ہے کہ آپ حج اور عمرہ کے لیے بھی تشریف لے جائیں گے، چنانچہ مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

"وَ الَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَيُهِلَّنَّ ابْنُ مَرْيَمَ بِفَجِّ الرَّوْحَاءِ حَاجًّا أَوْ مُعْتَمِرًا، أَوْ لَيَثْنِيَنَّهُمَا". (رواہ مسلم : ۱/۴۰۸)

''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے ابن مریم علیہ السلام ضرور فج الروحاء کے مقام پر حج یا عمرہ یا دونوں کی نیت کر کے احرام باندھیں گے۔''

فج الروحاء مدینہ طیبہ سے تقریباً چھ میل دور ایک مقام ہے جسے ''ذوالحلیفہ'' اور آج کل ''بیر علی'' کہتے ہیں، نیز روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر سلام پیش کریں گے تو آپ ﷺ ان کے سلام کا جواب دیں گے۔ (مجمع الزوائد)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں کل پینتالیس (۴۵) سال قیام فرمائیں گے، اس کے بعد جب آپ کی وفات ہوگی تو مسلمان نمازِ جنازہ پڑھ کر آپ کو مدینہ طیبہ میں حضور ﷺ کے ساتھ دفن کریں گے۔ (کما رواہ البخاری فی تاریخہ والطبرانی، کما فی الدر المنثور)

حدیث میں ہے:

"وَ يَمْكُثُ خَمْسًا وَ أَرْبَعِيْنَ سَنَةً، ثُمَّ يَمُوْتُ، فَيُدْفَنُ مَعِيَ فِيْ قَبْرِيْ، فَأَقُوْمُ أَنَا وَ عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ فِيْ قَبْرٍ وَاحِدٍ بَيْنَ أَبِيْ بَكْرٍ وَ عُمَرَ". (رواہ ابن الجوزیؒ فی کتاب الوفاء، و رواہ ابن ماجہ فی کتاب الوفاء، مشکوٰۃ: ٤٨٠ / باب نزول عیسیٰ علیہ السلام)

"عیسیٰ علیہ السلام پینتالیس (۴۵) سال قیام کرنے کے بعد جب وفات پائیں گے تو میرے ساتھ قبر میں دفن ہوں گے، چنانچہ قیامت کے دن میں اور حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام ایک مقبرہ سے ابوبکر وعمر کے درمیان اُٹھیں گے۔"

معتمد خبروں سے یہ بات ثابت ہے کہ روضۂ اقدس میں ایک قبر کی جگہ خالی ہے، جسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پُر کریں گے، آپ کی وفات کے بعد ملک یمن کے ایک نیک اور انصاف پسند شخص جہجاہ نامی خلیفہ ہوں گے، قبیلۂ قحطان سے ان کا تعلق ہوگا، وہ بھی نہایت عدل وانصاف سے امورِ خلافت کو انجام دیں گے۔ حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " لَا تَذْهَبُ الْأَيَّامُ وَ اللَّيَالِيْ حَتّٰى يَمْلِكَ رَجُلٌ يُقَالَ لَهٗ "الْجَهْجَاهُ". (مسلم، مشکوٰۃ: ٤٦٦ / باب الملاحم)

"رات دِن اس وقت تک تمام نہیں ہوں گے جب تک "جہجاہ" نامی بادشاہ نہ آجائے۔"

البتہ ان کی وفات کے بعد رفتہ رفتہ فساق کی حکومت آجائے گی؛ لیکن حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اس کی تردید فرمائی ہے۔ جب کہ بعض روایتوں کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد قبیلہ بنی تمیم کا ایک شخص آپ کا خلیفہ مقرر ہوگا، جس کا نام "مُقعد"

ہوگا۔ واللہ اعلم۔ (الاشاعۃ للبرزنجی: ۲۳۹، از: علاماتِ قیامت اور نزولِ مسیح: ۱۱۱، مفتی محمد رفیع عثمانی)

(۴) یاجوج وماجوج کا خروج:

قیامت کی علاماتِ کبریٰ قریبہ اور خاصہ میں سے چوتھی علامت یاجوج وماجوج کا خروج بھی ہے، جیسا کہ شروع میں جو حدیث بیان ہوئی اس میں بھی ذکر ہے۔ جمہور علماء، محدثین اور مؤرخین کے قول کے مطابق یاجوج وماجوج بھی عام انسانوں کی طرح حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے یافث بن نوح کی اولاد میں سے دو نہایت طاقت ور اور کثیر المقدار قبیلوں کے نام ہیں، جو بڑے ظالم، خونخوار، غیر متمدن اور وحشی درندوں کی طرح فسادی ہیں، جن کی تعداد دیگر انسانی نسلوں سے بہت زیادہ ہے۔

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ زمین کی کل وسعت پانچ سو سال کی مسافت کے برابر ہے، تین سو سال کی مسافت کے علاقہ پر سمندر محیط ہے، ایک سو نوے سال کی مسافت کے علاقہ پر یاجوج وماجوج آباد ہیں، اور صرف دس سال کی مسافت کے رقبہ پر انسان آباد ہیں۔ (از: توضیحات شرح مشکوٰۃ: ۷/ ۴۱۸)

اس وقت یاجوج وماجوج کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟

ان کا ملک قطب شمال کی سمت ایک ایسے مقام پر ہے جہاں دو بہت اونچے پہاڑ ہیں، دیگر پہاڑوں کی طرح ان پر چڑھنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، اور دونوں پہاڑ سمندر کے کنارے پر ہیں، جس کا پانی انتہائی ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے گاڑھا اور جما ہوا ہے، جس میں جہاز چلانا بھی ممکن نہیں، البتہ صرف جنوب کی طرف ایک گھاٹی ہے جس طرف سے یاجوج وماجوج فساد مچاتے تھے اور قتل وغارت گری کرتے تھے، وہاں حضرت ذوالقرنین نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے لوہے کی ایک بہت ہی مضبوط اور بڑی دیوار بنادی، یہ دیوار ساٹھ (٦٠) گز

چوڑی اور پہاڑوں کے برابر بلند ہے، اس وقت یاجوج و ماجوج ان پہاڑوں اور آہنی دیوار کے پیچھے محصور ہیں۔ قرآنِ پاک کا بیان ہے:

﴿ فَمَا اسۡطَاعُوۡآ أَنۡ يَّظۡهَرُوۡهُ وَ مَا اسۡتَطَاعُوۡا لَهٗ نَقۡبًا﴾ (الکھف : ۹۷)

''وہ دیوار اس قدر مضبوط اور بلند ہے کہ یاجوج و ماجوج نہ اس پر چڑھنے کی طاقت رکھتے ہیں اور نہ ہی اس میں کوئی سوراخ بنا سکتے ہیں۔''

حضرت ذوالقرنین (جو ایک نیک دل بادشاہ تھے انہوں نے) کہا:

﴿ قَالَ هٰذَا رَحۡمَةٌ مِّنۡ رَّبِّيۡ﴾ (الکھف : ۹۸)

''یہ میرے رب کی رحمت ہے کہ اس نے ایسی دیوار بنانے کی توفیق دی۔''

یاجوج و ماجوج اس دیوار کو توڑنے اور عبور کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہتے ہیں۔ حدیث پاک میں وارد ہے:

"إِنَّ يَـأْجُوجَ وَ مَـأْجُوجَ لَيَحْفِرُوْنَ السَّدَّ كُلَّ يَوْمٍ، حَتّٰى إِذَا كَادُوْا يَرَوْنَ شُعَاعَ الشَّمْسِ، قَالَ الَّذِيْ عَلَيْهِمْ :" اِرْجِعُوْا......الخ".

''بلا شبہ یاجوج و ماجوج ہر روز دیوار کو کھودتے ہیں، حتیٰ کہ جب وہ سورج کی شعاع دیکھنے کے قریب ہوتے ہیں تو ان کا امیر کہتا ہے کہ واپس چلو، باقی کل کھودیں گے، تو (اگلے روز) وہ دیوار پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہو چکی ہوتی ہے، اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے، حتیٰ کہ جب ان کے خروج کا وقت آئے گا تب من جانب اللہ ان کا امیر کہے گا کہ ''ان شاء اللہ باقی کل کھودیں گے'' پھر وہ دیوار اسی حالت پر برقرار رہے گی، جس کو وہ دوسرے دن توڑ کر زمین میں پھیل جائیں گے۔'' (ترمذی)

قرآن نے اسے اجمالی طور پر فرمایا کہ قیامت کے قریب جب اللہ تعالیٰ چاہیں گے تو یاجوج و ماجوج اس دیوار کو توڑ کر نکل پڑیں گے، اور ساری دنیا میں تباہی و فساد مچا دیں گے۔ قرآنِ پاک میں فرمایا گیا:

﴿ فَإِذَا جَآءَ وَعۡدُ رَبِّيۡ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ وَ كَانَ وَعۡدُ رَبِّيۡ حَقًّا﴾ (الکھف:۹۸)

''پھر جب میرے رب نے جس کا وعدہ کیا ہے (قیامت یا خروجِ یاجوج و ماجوج، جب اس کا) وقت آئے گا تو وہ اس (دیوار) کو ڈھا کر زمین کے برابر کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ بالکل سچا ہے۔''

یاجوج و ماجوج کا فساد:

خروجِ یاجوج و ماجوج کے متعلق کتاب و سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت سے پہلے نازل ہو کر دجال کا خاتمہ فرما دیں گے، اس کے بعد یاجوج و ماجوج کا خروج ہوگا، جیسے قرآنِ کریم نے اس طرح بیان کیا ہے:

﴿ حَتّٰٓى إِذَا فُتِحَتۡ يَأۡجُوۡجُ وَ مَأۡجُوۡجُ وَ هُمۡ مِّنۡ كُلِّ حَدَبٍ يَّنۡسِلُوۡنَ ۝ وَ اقۡتَرَبَ الۡوَعۡدُ الۡحَقُّ﴾ (الأنبياء : ۹۶-۹۷)

(حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موجودگی میں قیامت سے قریب) جب یاجوج و ماجوج کھول دیے جائیں گے اور وہ ہر بلندی سے دوڑتے ہوئے آئیں گے اور قیامت کا سچا وعدہ قریب ہو جائے گا۔''

قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یاجوج و ماجوج کے کھلنے کے وقت سد ذوالقرنین منہدم ہو کر زمین کے برابر ہو جائے گی، اس وقت یاجوج و ماجوج کی بے پناہ تعداد بیک وقت پہاڑوں کی بلندی سے اُترتی ہوئی تیز رفتاری کے سبب ایسی معلوم ہوگی گویا یہ پھسل پھسل کر گر رہے ہیں، اور لاتعداد وحشی انسان عام انسانی آبادی بلکہ تمام روئے زمین پر ٹوٹ پڑیں گے اور فساد پھیلا دیں گے، کسی میں ان کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہوگی، تب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے کوہِ طور پر پناہ لیں گے، کچھ عرصہ نہایت تنگی سے گزرے گا کیوں کہ یاجوج و ماجوج جہاں جائیں گے خوب فساد پھیلائیں گے، فصلیں برباد کر دیں گے، ندی، نالوں حتیٰ کہ سمندروں کا پانی بھی پی جائیں گے، بالآخر حضرت عیسیٰ علیہ

السلام کے بددعا سے یاجوج وماجوج کو ہلاک کردیا جائے گا۔حدیث میں ہے:

"فَيَبْعَثُ اللّٰهُ يَأْجُوجَ وَ مَأْجُوجَ، وَ هُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُوْنَ، فَيَمُرُّ أَوَائِلُهُمْ عَلىٰ بُحَيْرَةِ طَبْرِيَّةِ، فَيَشْرَبُوْنَ مَا فِيْهَا، وَ يَمُرُّ اٰخِرُهُمْ، فَيَقُوْلُوْنَ:" لَقَدْ كَانَ بِهٰذِهٖ مَرَّةً مَاءٌ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٤٧٤)

"اللہ تعالیٰ یاجوج وماجوج کو نکالیں گے اور وہ ہر گھاٹی سے بھاگتے ہوئے آئیں گے، ان کی جماعت کا پہلا دستہ جب بحیرۂ طبریہ پر پہنچے گا تو اس کا تمام پانی پی کر خشک کر دے گا، اور جب پچھلی جماعت وہاں پہنچے گی تو کہے گی کہ اس میں کبھی پانی ہوا کرتا تھا۔"

(بحیرۂ طبریہ طبرستان میں ایک دریا ہے، جس کی شکل مربع ہے، اس کا پاٹ سات یا دس میل ہے، اور نہایت گہرا ہے) ساری دنیا میں آندھی کی طرح تباہی مچا کر یاجوج وماجوج جب ملک شام آئیں گے (جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں کے ساتھ ایک قلعہ میں محصور ہوں گے) تو کہیں گے کہ ہم نے زمین والوں کو تو ختم کر دیا، اب ہم آسمان والوں کا بھی خاتمہ کر دیں گے۔حدیث میں ہے:

"ثُمَّ يَسِيْرُوْنَ، حَتّٰى يَنْتَهُوا إِلَى جَبَلِ الْخَمَرِ، وَهُوَ جَبَلُ بَيْتِ الْمَقْدِسِ، فَيَقُوْلُوْنَ: "لَقَدْ قَتَلْنَا مَنْ فِي الْأَرْضِ، هَلُمَّ، فَلْنَقْتُلْ مَنْ فِي السَّمَاءِ، فَيَرْمُوْنَ بِنُشَّابِهِمْ إِلَى السَّمَاءِ، فَيَرُدُّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ نُشَّابَهُمْ مَخْضُوْبَةً دَمًا ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٤٧٤)

"وہ چلتے چلتے جب جبل خمر (بیت المقدس کے ایک پہاڑ) تک پہنچیں گے تو کہیں گے کہ ہم نے زمین کے تمام لوگوں کو قتل کر دیا، آؤ، اب آسمان والوں کو بھی قتل کر دیں، چنانچہ وہ اپنے تیر آسمان کی طرف پھینکیں گے، تو اللہ تعالیٰ (بطورِ استدراج) ان کے تیروں کو خون سے رنگا ہوا واپس کریں گے۔" (جس کی وجہ سے وہ بزعم خود یہ گمان کریں گے کہ ہم نے زمین وآسمان والوں کو ختم کر دیا اور ان پر غلبہ حاصل کر لیا)۔

یاجوج وماجوج کی ہلاکت وبربادی:

واقعہ یہ ہے کہ یاجوج وماجوج کا خروج بھی من جانب اللہ ایک بہت بڑی آزمائش ہی ہے، روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان فسادیوں میں سے کوئی بھی اسلام قبول نہ کرے گا، یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اس زمانہ کے مخلصین کاملین مسلمانوں کی بددعا کی وجہ سے یاجوج وماجوج دارین میں ہلاک اور برباد ہوجائیں گے۔حدیث میں ہے:

"فَيَرْغَبُ نَبِيُّ اللّٰهِ عِيْسٰى وَ أَصْحَابُهٗ، فَيُرْسِلُ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ النَّغَفَ فِي رِقَابِهِمْ، فَيُصْبِحُوْنَ فَرْسٰى، كَمَوْتِ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٤٧٤)

"پھر (یاجوج وماجوج کے فساد سے تنگ اور عاجز آکر) حضرت عیسیٰ اور ان کے رُفقاء حق تعالیٰ سے دعا کریں گے، جس کی وجہ سے من جانب اللہ یاجوج وماجوج پر اس طرح عذاب نازل ہوگا کہ ان کی گردنوں میں کیڑے پیدا ہوجائیں گے، جس سے وہ سب کے سب ایک ہی رات میں صبح تک ہلاک وبرباد ہوجائیں گے۔"

یہ تو دنیوی ہلاکت وبربادی تھی، آخرت میں دائمی جہنم ان کا مقدر بن جائے گی۔ حدیث قدسی میں ہے:

عَنْ أَبِي سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى:" يَا آدَمُ ! فَيَقُوْلُ: لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ كُلُّهٗ فِيْ يَدَيْكَ، قَالَ: أَخْرِجْ بَعْثَ النَّارِ، قَالَ: وَمَا بَعْثُ النَّارِ؟ قَالَ: مِنْ كُلِّ أَلْفٍ تِسْعَ مِائَةٍ وَتِسْعَةً وَتِسْعِيْنَ، فَعِنْدَهٗ يَشِيْبُ الصَّغِيْرُ، وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا، وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى، وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى، وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ، قَالُوا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَأَيُّنَا ذٰلِكَ الْوَاحِدُ؟ قَالَ: أَبْشِرُوْا! فَإِنَّ مِنْكُمْ رَجُلًا وَمِنْ يَأْجُوْجَ وَمَأْجُوْجَ أَلْفًا، ثُمَّ قَالَ: وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ إِنِّيْ أَرْجُوْ أَنْ تَكُوْنُوْا رُبُعَ أَهْلِ الْجَنَّةِ، فَكَبَّرْنَا، فَقَالَ: أَرْجُوْ أَنْ تَكُوْنُوْا ثُلُثَ أَهْلِ الْجَنَّةِ، فَكَبَّرْنَا، فَقَالَ: أَرْجُوْ أَنْ تَكُوْنُوْا نِصْفَ أَهْلِ الْجَنَّةِ، فَكَبَّرْنَا، فَقَالَ: مَا أَنْتُمْ فِي

النَّاسِ إِلَّا كَالشَّعْرَةِ السَّوْدَاءِ فِي جِلْدِ ثَوْرٍ أَبْيَضَ، أَوْ كَشَعْرَةٍ بَيْضَاءَ فِي جِلْدِ ثَوْرٍ أَسْوَدَ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٤٨٣ / باب الحشر) (حدیث قدسی نمبر:۲۱)

(قیامت کے دن) حق تعالیٰ فرمائیں گے: اے آدم! تو حضرت آدم علیہ السلام عرض کریں گے: اے اللہ! میں حاضر ہوں، تیری اطاعت کے لیے تیار ہوں اور تمام بھلائیاں تیرے ہی قبضۂ قدرت میں ہیں، حق تعالیٰ فرمائیں گے: آگ کا حصہ (دوزخ کا لشکر) نکالو! حضرت آدم علیہ السلام عرض کریں گے کہ آگ کا وہ حصہ اور ان کی تعداد کیا ہے؟ تو حق تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ ہر ہزار میں سے نوسو ننانوے (دوزخ کے لیے اور ایک جنت کے لیے) یہ حکم خداوندی سن کر بچے بوڑھے ہو جائیں گے اور ہر حاملہ عورت اپنا حمل (خوف کی وجہ سے) ضائع کر دے گی (اگر وہ بچے اور حاملہ عورتیں ہوں گی تو وہ، یا پھر وہ بچے جو بچپن میں فوت ہوئے تھے یا جو عورتیں حالت حمل میں وفات پا چکی تھیں ان کے متعلق یہ فرمایا) اور اس وقت تم دیکھو گے کہ لوگ گویا نشہ میں مست ہیں، حالانکہ وہ مست نہیں ہوں گے؛ بلکہ عذابِ الٰہی بہت سخت ہے، حضرات صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! وہ ایک ہم میں سے کون ہوگا؟ ارشاد ہوا: تمہیں خوشخبری ہو کہ (تم اہل ایمان) میں سے ایک اور یاجوج و ماجوج میں سے ایک ہزار ہوں گے، پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، مجھے اُمید ہے کہ تم اہل جنت کی مجموعی تعداد کا چوتھا حصہ ہوں گے، حضرت ابوسعیدؓ کا بیان ہے کہ یہ سن کر ہم نے مارے خوشی کے نعرۂ تکبیر بلند کیا (معلوم ہوا کہ خوشی کے موقع پر نعرۂ تکبیر بلند کرنا چاہیے، نہ کہ تالیاں بجانا) پھر آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے اُمید ہے کہ تم اہل جنت کی مجموعی تعداد کا تہائی حصہ ہوں گے، ہم نے پھر مارے خوشی کے نعرۂ تکبیر بلند کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ تم اہل جنت کی مجموعی تعداد کا نصف حصہ ہوں گے، ہم نے پھر فرطِ خوشی میں نعرۂ تکبیر بلند کیا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ (از آدم علیہ السلام تا رحمت عالم ﷺ تمام امتوں کے مقابلہ میں) تمہاری تعداد اتنی کم ہے جیسا کہ سفید بیل کے جسم پر ایک سیاہ بال یا ایک کالے بیل کے جسم پر ایک سفید بال ہو۔"

اس سے معلوم ہوا کہ آخرت میں بھی تمام یاجوج ماجوج جہنم کا ایندھن بنا دیے جائیں گے۔ والعیاذ باللہ العظیم۔

(۵، ٦، ۷) خسوفِ ثلاثہ:

یاجوج ماجوج کی ہلاکت و تباہی کے بعد روئے زمین پر ایک عرصہ تک صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مسلمان ہی باقی رہ جائیں گے، وہ زمانہ خیر القرون کے بعد خیر و صلاح کے اعتبار سے بہتر ہوگا، حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد بھی ایک عرصہ تک صلاح و فلاح کا دور جاری رہے گا، جس طرح آفتاب غروب ہونے کے بعد فوراً تاریکی نہیں چھا جاتی؛ بلکہ کچھ روشنی باقی رہتی ہے، پھر آہستہ آہستہ لوگوں میں غفلت پیدا ہوگی، جس کے نتیجہ میں پھر معصیت و ضلالت کا ایک دور شروع ہو جائے گا، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے منقول ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد قیامت سے پہلے ایک سو بیس سال تک عرب لوگ شرک و بت پرستی میں مبتلا رہیں گے۔ (الاشاعۃ للبرزنجی)

اور فتح الباری میں تو حضرت عمرو بن العاصؓ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ آفتاب کے مغرب سے طلوع ہونے کے بعد جب دنیا پھر ایک بار کفر و شرک اور ظلم و ستم سے بھر جائے گی تو ان ہی دنوں میں خسوفِ ثلاثہ یعنی زمین میں دھنس جانے کے تین واقعات پیش آئیں گے، ایک مشرق میں، دوسرا مغرب میں اور تیسرا جزیرۃ العرب میں، اور یہ بھی قیامت کی علامت کبریٰ، قریبہ اور خاصہ ہے، حدیث پاک میں قیامت کی جن دس بڑی علامات قریبہ و خاصہ کو بیان فرمایا گیا ہے ان میں پانچویں، چھٹی اور ساتویں علامت یہی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"وَ ثَلَاثَةُ خُسُوفٍ، خَسْفٌ بِالْمَشْرِقِ، وَ خَسْفٌ بِالْمَغْرِبِ، وَ خَسْفٌ بِجَزِيرَةِ الْعَرَبِ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٤٧٢ / باب العلامات بين يدي الساعة و ذكر الدجال)

"تین مقامات پر زمین کے دھنس جانے کے واقعات رونما ہوں گے، ایک تو مشرق کے علاقہ میں، دوسرا مغرب کے علاقہ میں اور تیسرا جزیرۃ العرب میں۔"

ہمارے علماء کے بقول عذابِ الٰہی کے طور پر زمین کا دھنس جانا مختلف زمانوں اور مختلف علاقوں میں امم سابقہ کی طرح اس امت میں بھی کہیں کہیں واقع ہو چکا ہے، لیکن حدیث پاک میں جن تین خسوف کا ذکر ہے وہ پہلے واقع ہونے والے خسوف کے علاوہ ہیں، جو ان سے بھی زیادہ سخت ہوں گے۔

حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ ''یہ عذاب تقدیرِ الٰہی کے جھٹلانے والوں پر (خصوصیت کے ساتھ) نازل ہوگا۔'' (آثارِ قیامت اور فتنۂ دجال: ۳۹)

کیوں کہ خود حدیث پاک میں اس کی صراحت موجود ہے:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: "يَكُوْنُ فِيْ أُمَّتِيْ خَسْفٌ وَ مَسْخٌ، وَ ذٰلِكَ فِي الْمُكَذِّبِيْنَ بِالْقَدَرِ". (رواه أبوداود و الترمذی، مشکوٰة : ۲۲ / باب الإيمان بالقدر)

''میری امت میں (بطورِ عذابِ الٰہی) زمین میں دھنس جانا (ایک مخصوص طبقہ کے لیے) اور صورتوں کا مسخ (یا تو حقیقۃً یا حکماً، یا پھر چہروں یا دلوں کا سیاہ) ہو جانا بھی ہوگا، اور یہ عذاب ان لوگوں پر ہوگا جو تقدیر کے منکر ہیں۔''

حدیث کے مطابق قیامت سے قبل یہ واقعات بطورِ خاص مشرق و مغرب اور جزیرۃ العرب میں ہوں گے، جو قیامت کی علامت کبریٰ، قریبہ اور خاصہ میں سے ہے۔

(۸) دُخان یعنی دُھواں:

اس کے بعد ان ہی دنوں میں قیامت کی علاماتِ کبریٰ قریبہ اور خاصہ میں سے آٹھویں بڑی علامت کے طور پر ایک خاص عالمگیر دُھواں نمودار ہوگا، جس کا تذکرہ حدیث میں ہے: "الدُّخَانُ". (مسلم، مشکوٰة: ۴۷۲) یعنی دُھواں چھا جائے گا۔

قرآنِ کریم میں اس دُھویں کا ذکر اس طرح ہے کہ

﴿ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۝ يَغْشَى النَّاسَ هٰذَا عَذَابٌ أَلِيْمٌ ۝﴾
(الدخان : ۱۰-۱۱)

''اب آپ (اے نبی! ان بے ایمانوں کے لیے) اس دن کا انتظار فرمائیں جب آسمان (وزمین) کے درمیان ایک دُھواں پیدا ہوگا، جس کی کیفیت یہ ہوگی کہ لوگوں کو گھیر لے گا، یہ دردناک عذاب ہے۔''

اس سے کونسا دُھواں مراد ہے؟ تو حضرت حذیفہ بن اُسیدؓ کی روایت اور تفسیر کے مطابق اس سے مراد وہ دُھواں ہے جو قیامت کی علاماتِ کبریٰ، خاصہ اور قریبہ کے طور پر ظاہر ہو کر مشرق و مغرب میں پھیل جائے گا، چالیس دن تک مسلسل رہے گا، اس دُھویں کی وجہ سے مسلمان تو صرف ضعف دماغ اور کدورتِ حواس اور نزلہ و زُکام وغیرہ میں مبتلا ہوں گے؛ مگر منافقین و کفار بدحواس اور بے ہوش ہو جائیں گے۔ (تفسیر طبری: ۲۲/۱۸)

لیکن حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد دُھویں کی وہ شکل ہے جو قریش مکہ کو قحط سالی میں بھوک کے سبب آسمان میں نظر آتی تھی۔

جب کہ روح المعانی میں علامہ سفارینی کی کتاب ''البحور الذاخرۃ'' کے حوالہ سے حضرت ابن مسعودؓ کی ایک دوسری روایت یہ نقل کی گئی ہے کہ دخان دو ہیں، ایک قحطِ مکہ کے وقت گزر چکا اور دوسرا باقی ہے، وہ آسمان و زمین کی درمیانی فضا کو بھر دے گا اور مؤمن (مخلص) کو اس کی وجہ سے صرف زُکام کی کیفیت پیدا ہوگی، جب کہ کافر کے تمام منافذ کو پھاڑ دے گا۔ (معارف القرآن: ۷/۷۶۴)

زیادہ قوی موقف یہی ہے کہ قیامت کے قریب ایک خاص قسم کا دُھواں ہوگا جس کی تائید دیگر روایات سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "بَادِرُوْا بِالْأَعْمَالِ سِتًّا : الدُّخَانَ، وَ الدَّجَّالَ، وَ دَابَّةَ الْأَرْضِ، وَ طُلُوْعَ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا، وَ أَمْرَ

الْعَامَّةِ، وَ خُوَيْصَّةَ أَحَدِكُمْ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٤٧٢)

"چھ چیزوں کے ظہور سے پہلے تم اعمالِ صالحہ میں جلدی اور پیش قدمی کرو، وہ یہ ہیں: (۱) دُھواں (۲) دجال (۳) دابۃ الارض (۴) مغرب سے آفتاب کا طلوع ہونا (۵) عمومی فتنہ (جو لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا، مراد دین سے بے زاری کا ہمہ گیر اور عالم گیر فتنہ (۶) یا خصوصی فتنہ جو ہر شخص کو ذاتی طور پر اہل وعیال اور مال میں پیش آئے گا، یا عمومی فتنہ سے قیامت مراد ہے اور خصوصی فتنہ سے مراد اپنی موت، مطلب یہ ہے کہ اپنی موت یا قیامت کی اِن چھ علامات کے ظہور سے قبل اعمال کا اہتمام کرو، ورنہ بعد میں موقع ہی نہ ہوگا، یا قبول نہیں ہوں گے۔

اس حدیث شریف میں بھی جن چھ چیزوں کو قیامت کی علاماتِ کبریٰ وخاصہ کے طور پر بیان فرمایا ان میں دُھویں کا تذکرہ بھی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ قیامت کی یہ خاص علامت باقی ہے، جو قربِ قیامت میں پیش آئے گی، البتہ آیت کریمہ کی تفسیر میں حضرت ابن مسعودؓ کا اہل مکہ پر آیا ہوا قحط مراد لینا بھی بعید نہیں ہے، بلکہ عین ممکن ہے، لیکن حدیث شریف میں جس دُھویں کا ذکر ہے وہ علاماتِ قیامت میں سے ہے، یہ دُھواں مسلسل چالیس دن تک رہنے کے بعد مطلع صاف ہوجائے گا۔

(۹) سورج کا مغرب سے طلوع ہونا:

اس کے بعد قیامت کی علاماتِ کبریٰ، قریبہ وخاصہ میں سے نویں بڑی علامت اس طرح ظاہر ہوگی کہ سورج بجائے مشرق سے طلوع ہونے کے مغرب سے طلوع ہوگا، چنانچہ حضرت حذیفہ بن اُسید غفاریؓ کی روایت میں حضور ﷺ نے جن بڑی دس علامتوں کا ذکر کیا ان میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ "وَ طُلُوْعُ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا". (مسلم، مشكوٰة : ٤٧٢)

حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ کے بقول اس وقت "ذی الحجہ میں یوم النحر کے بعد جو رات آئے گی وہ تین چار راتوں کے بقدر لمبی ہوگی، اس میں مسافر چلتے چلتے گھبرا

جائیں گے، بچے سوتے سوتے اُکتا جائیں گے، جانور جنگل اور چراگاہ میں جانے کے لیے بے قرار ہو جائیں گے، لوگ سخت خوف زدہ اور پریشان ہو کر گریہ وتوبہ کرنا شروع کر دیں گے، اس وقت سورج تھوڑی سی روشنی لے کر مغرب سے نکلے گا، اس کی روشنی ایسی ہوگی جیسے گہن کے وقت چاند کی ہوتی ہے۔"

صاحب بیان القرآن درِمنثور کے حوالہ سے ایک روایت نقل فرماتے ہیں کہ "مغرب سے سورج نکل کر جب بیچ آسمان میں پہنچ جائے گا تو واپس لوٹ جائے گا اور مغرب ہی میں غروب ہوکر بدستور مشرق سے نکلنے لگے گا۔"

(مستفاد از: علاماتِ قیامت: ۱۰۶، مولانا عاشق الٰہیؒ)

احادیث صحیحہ میں اس کا تذکرہ اس طرح ہے:

"عَنْ أَبِي ذَرٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "حِينَ غَرَبَتِ الشَّمْسُ أَتَدْرِي أَيْنَ تَذْهَبُ، قُلْتُ: اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ، قَالَ: فَإِنَّهَا تَذْهَبُ حَتَّى تَسْجُدَ تَحْتَ الْعَرْشِ، فَتَسْتَأْذِنَ، فَيُؤْذَنُ لَهَا، وَيُوشِكُ أَنْ تَسْجُدَ، فَلَا يُقْبَلَ مِنْهَا، وَتَسْتَأْذِنَ، فَلَا يُؤْذَنَ لَهَا، يُقَالُ لَهَا: ارْجِعِي مِنْ حَيْثُ جِئْتِ، فَتَطْلُعُ مِنْ مَغْرِبِهَا، فَذٰلِكَ قَوْلُهُ تَعَالَى: ﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝﴾ (يٰس:٣٨) قَالَ: مُسْتَقَرُّهَا تَحْتَ الْعَرْشِ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٤٧٢)

"حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ جب سورج غروب ہورہا تھا تب رحمت عالم ﷺ فرمانے لگے کہ کیا تم جانتے ہو کہ سورج غروب ہوکر کہاں جاتا ہے؟ میں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں، فرمایا: یہ عرشِ الٰہی کے نیچے پہنچ کر (اپنے حال کے مطابق) سجدہ کرکے دوبارہ حق تعالیٰ سے طلوع ہونے کی اجازت طلب کرتا ہے، تو اس کو اجازت مل جاتی ہے، اور عنقریب وہ وقت آئے گا کہ سورج اپنے معمول کے مطابق سجدہ کرے گا تو اس کا سجدہ قبول نہ ہوگا اور دوبارہ طلوع کی اجازت طلب کرے گا تو اسے اجازت نہیں دی جائے گی، بلکہ حکم ہوگا کہ جہاں سے آیا ہے وہیں لوٹ جا، چنانچہ وہ

مغرب سے طلوع ہوگا۔ اور یہی مطلب ہے فرمانِ الٰہی کا ﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا﴾ یعنی سورج اپنے مستقر کی طرف جاری وساری ہے، اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ سورج کا مستقر یعنی اس کے ٹھہرنے کی جگہ عرشِ الٰہی کے نیچے ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ قیامت سے قبل سورج مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہوگا، اور یہ نہ صرف قربِ قیامت کی علامت ہے؛ بلکہ وقوعِ قیامت کی بھی علامت ہے، جسے حدیث پاک میں اس طرح بیان فرمایا کہ

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: إِنَّ أَوَّلَ الْآيَاتِ خُرُوجًا طُلُوعُ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا، وَخُرُوجُ الدَّابَّةِ عَلَى النَّاسِ ضُحًى، وَأَيُّهُمَا كَانَتْ قَبْلَ صَاحِبَتِهَا، فَالْأُخْرَى عَلَى إِثْرِهَا قَرِيبَةٌ".

(رواه مسلم، مشكوٰة : ٤٧٢)

''فرمایا (قربِ قیامت کے علاوہ) وقوعِ قیامت یا ابتداءِ وقوعِ قیامت کی پہلی علامت سورج کا مغرب سے طلوع ہونا ہے، اور دوسری علامت چاشت کے وقت لوگوں کے سامنے دابۃ الارض (زمین کے چوپایہ) کا نکلنا ہے، ان دونوں میں سے جو نشانی وعلامت پہلے ظاہر ہوگی اس کے فوراً بعد دوسری بھی ظاہر ہو جائے گی۔''

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ ''بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کے بعد دابۃ الارض بھی اسی دن نکلے گا۔'' (فتح الباری: ۱۱/۳۵۳)

اور چوں کہ اس کے بعد قیامت کا وقوع متعین ہو جائے گا، نیز لوگوں کو احوالِ آخرت کا مشاہدہ ہو جائے گا اس لیے اس کے بعد کسی کا ایمان لانا یا توبہ کرنا قبول نہ ہوگا، جس طرح غرغرۂ موت کے وقت ایمان وتوبہ معتبر نہیں، کیوں کہ اس وقت بھی آخرت کے احوال مشاہدہ میں آجاتے ہیں۔ اسی کو قرآنِ کریم نے اس طرح بیان فرمایا:

﴿يَوْمَ يَأْتِىْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ

أَوْ كَسَبَتْ فِىْٓ إِيْمَانِهَا خَيْرًا﴾ (الأنعام : ١٥٨)

''جس دِن آپ کے رب کی کچھ (بڑی) نشانیاں ظاہر ہوں گی اس وقت کسی ایسے شخص کا ایمان اس کے کام نہیں آئے گا جو پہلے سے ایمان نہیں رکھتا تھا، یا اس نے اپنی زندگی میں ایمان کی وجہ سے کوئی نیک عمل نہ کیا ہو۔''

تو ایسے شخص کا ایمان اور عمل قبول نہیں ہوگا؛ کیوں کہ اس وقت ایمان اور توبہ کا وقت ختم ہو جائے گا۔

اب وہ نشانیاں کونسی ہیں؟ اس کی وضاحت حدیث پاک میں کردی گئی، ارشاد ہے:

عَنْ أَبِىْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: " ثَلَاثٌ إِذَا خَرَجْنَ، لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ، أَوْ كَسَبَتْ فِىْ إِيْمَانِهَا خَيْرًا: طُلُوعُ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا، وَ الدَّجَّالُ، وَ دَابَّةُ الْأَرْضِ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٤٧٢)

(قیامت کی تین نشانیاں ایسی ہیں کہ) جب وہ ظاہر ہو جائیں گی تو پھر کسی ایسے شخص کا ایمان لانا جس نے پہلے ایمان قبول نہیں کیا ہوگا اسے نفع نہیں دے گا، اور نہ ہی اس شخص کا کوئی نیک عمل کرنا فائدہ مند ہوگا، جس نے پہلے کبھی کوئی نیکی نہیں کی تھی، اور وہ تین نشانیاں ہیں: (۱) سورج کا مغرب سے طلوع ہونا (۲) خروجِ دجال (۳) دابۃ الارض۔

اس حدیث میں تین چیزیں ذکر کی گئی ہیں، جن کے بعد ایمان اور توبہ قبول نہیں ہوگی، ان میں ایک دجال بھی ہے، لیکن راجح یہ ہے کہ خروجِ دجال کے بعد بھی ایمان قبول ہوگا، جیسا کہ دیگر صحیح اور متعدد روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے، اس لیے حدیث میں مذکور تین چیزوں میں سے دجال کے علاوہ بقیہ دو چیزیں مراد ہیں، یعنی سورج کا مغرب سے نکلنا اور دابۃ الارض کا نکلنا۔ واللہ اعلم۔ (فتح الباری: ۱۱/۳۵۳)

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ یہ حکم ایک عرصہ تک باقی رہے گا، بعد میں بدل جائے گا، چنانچہ روح المعانی میں ہے کہ علامہ بلقینیؒ وغیرہ نے فرمایا کہ یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں کہ

ایمان وتوبہ قبول نہ ہونے کا حکم جو آفتاب کے مغرب کی جانب سے طلوع ہونے کے وقت ہوگا آخر زمانہ تک باقی نہ رہے؛ بلکہ کچھ عرصہ کے بعد یہ حکم بدل جائے اور ایمان وتوبہ قبول ہونے لگے۔ (معارف القرآن: ۳/ ۴۹۹)

امام قرطبیؒ نے تذکرہ میں اور حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے ایک روایت حضور ﷺ کی اس طرح نقل فرمائی کہ سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کے بعد بھی ایک سو بیس سال تک دنیا قائم رہے گی (پھر قیامت آئے گی)۔
(روح المعانی، معارف القرآن: ۳/ ۴۹۹)

(۱۰) دابۃ الارض کا نکلنا:

الغرض جن دنوں ایک طویل رات کے بعد سورج بجائے مشرق کے مغرب سے طلوع ہوگا ان ہی دنوں میں قیامت کی علامت کبریٰ، قریبہ وخاصہ میں سے دسویں اور آخری بڑی علامت کے طور پر دابۃ الارض کا ظہور ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ زمین سے ایک عجیب و غریب قسم کا جانور نکلے گا اور لوگوں سے بہت صاف زبان میں گفتگو کرے گا۔

یاد رکھو! قیامت سے قبل بہت سی عجیب وغریب چیزوں کا ظہور ہوگا، جنہیں اس وقت سمجھنا بھی مشکل ہے، جیسے ٹرین، پلین اور موبائل وانٹرنیٹ وغیرہ ساری چیزیں ایسی ہیں جو پہلے سمجھ میں نہیں آسکتی تھیں، لیکن جب وجود میں آگئیں تو سمجھ میں بھی آگئیں، یہی حال قیامت کی علاماتِ قریبہ وخاصہ کا بھی ہے، من جملہ ان کے دابۃ الارض بھی ہے۔

حضرت حذیفہؓ کی روایت میں جن دس علامتوں کا تذکرہ ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے، فرمایا کہ "وَ دَابَّةُ الْأَرْضِ". (مسلم، مشکوٰۃ: ٤٧٢)

اور جیسا کہ مسلم کے حوالہ سے مذکور حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی روایت سے معلوم ہوا کہ یہ بھی قربِ قیامت کے علاوہ وقوعِ قیامت کی علامت ہے، اور بھی کئی روایتوں میں اس کا تذکرہ ہے، جس کو ہم نے سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کی علامت میں بیان کر دیا،

قرآنِ کریم میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد ہے:
﴿وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا لَا يُوقِنُونَ﴾ (النمل: ٨٢)

''اور جب ہماری بات (اور وعدہ) ختم ہونے کا وقت ان لوگوں پر آپہنچے گا تو ہم ان کے لیے زمین سے ایک جانور نکالیں گے جو ان سے بات کرے گا کہ لوگ ہماری آیتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے۔''

ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ قیامت کے بالکل قریب جب لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بالکل ہی چھوڑ دیں گے تب یہ عجیب وغریب خلقت کا جانور مکہ مکرمہ میں کوہِ صفا سے (یعنی کسی توالد وتناسل کے بغیر) نکلے گا اور اپنے سر سے مٹی جھاڑتا ہوا مسجد حرام میں حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان پہنچ جائے گا، لوگ اس کو دیکھ کر بھاگنے لگیں گے، ایک جماعت رہ جائے گی، یہ دابہ ان کے چہروں کو ستاروں کی طرح روشن کر دے گا۔ (معارف القرآن)

حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ شکل کے لحاظ سے یہ جانور مندرجۂ ذیل سات جانوروں کے مشابہ ہوگا: (۱) چہرہ انسانوں جیسا ہوگا (۲) پاؤں اونٹ جیسے ہوں گے (۳) گردن گھوڑے کے مشابہ ہوگی (۴) دم بیل کی طرح ہوگی (۵) سرین ہرن کی طرح ہوگی (۶) سینگ میں بارہ سنگھا جیسا ہوگا (۷) ہاتھوں میں بندر کے مشابہ ہوگا۔

یہ جانور نہایت فصیح اللسان ہوگا، لوگوں سے گفتگو کرے گا، بعض علماء نے فرمایا کہ وہ ہر فسادی اور بے ایمان سے کلام کرتے ہوئے کہے گا کہ "أَنَّ النَّاسَ كَانُوا" ...... الخ، تم قیامت کی نشانیوں کا انکار کرتے تھے نا! اب خود ہی دیکھ لو، وہ ظاہر ہو رہی ہیں۔

ترمذی اور ابن ماجہ کی روایت میں ہے کہ اس کے ایک ہاتھ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا ہوگا، تو دوسرے ہاتھ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی ہوگی، تمام شہروں (اور پوری دنیا) میں ایسی سرعت اور تیزی سے دورہ کرے گا کہ کوئی فردِ بشر اس کا پیچھا نہیں کر

سکے گا اور کوئی بھی بھاگنے والا اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے گا، ہر صاحب ایمان کی پیشانی پر عصائے موسیٰ سے ایک لکیر اور نشان لگا دے گا، جس سے اس کا سارا چہرہ روشن ہو جائے گا، جب کہ بے ایمان کی ناک اور گردن پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگشتری سے سیاہ مہر لگا دے گا، جس سے اس کا چہرہ بے رونق اور سیاہ ہو جائے گا، حتیٰ کہ ایک دسترخوان پر کئی آدمی جمع ہوں گے تو ہر مؤمن و کافر بخوبی پہچانے جائیں گے۔ یہ جانور اس کام سے فارغ ہو کر غائب ہو جائے گا۔ (آثارِ قیامت اور فتنۂ دجال: ۴۰ تا ۴۱)

مؤمنین کی موت اور وقوعِ قیامت:

قیامت کی دسویں بڑی اور خصوصی علامت دابۃ الارض کے غائب ہو جانے کے بعد جنوب یا شام کی طرف سے ایک نہایت فرحت افزا اور خوش گوار ہوا آئے گی جس سے ہر صاحب ایمان کی بغل میں ایک درد اٹھے گا اور یکے بعد دیگرے ہر ایک مؤمن افضل مفضول سے، مفضول ناقص سے اور ناقص فاسق سے پہلے بالترتیب مرنا شروع ہو جائیں گے، حتیٰ کہ اگر کوئی صاحب ایمان پہاڑ کے غار میں ہوگا تو وہ ہوا اس میں بھی داخل ہو کر اس کی موت کا سبب بن جائے گی، مؤمنین کی موت کے بعد بدترین کفار باقی رہ جائیں گے، پھر ان ہی پر قیامت واقع ہوگی۔ حدیث میں ہے:

"كَذَلِكَ إِذَا بَعَثَ اللّٰهُ رِيحًا طَيِّبَةً، فَتَأْخُذُهُمْ تَحْتَ آبَاطِهِمْ، فَتَقْبِضُ رُوحَ كُلِّ مُؤْمِنٍ وَكُلِّ مُسْلِمٍ، وَيَبْقَى شِرَارُ النَّاسِ، يَتَهَارَجُونَ فِيهَا تَهَارُجَ الْحُمُرِ، فَعَلَيْهِمْ تَقُومُ السَّاعَةُ". (رواه مسلم، مشكوٰة: ٤٧٤)

"لوگ اسی حالت میں ہوں گے کہ حق تعالیٰ ایک پاکیزہ اور خوشبو دار ہوا بھیجیں گے جو ان کی بغلوں کے نیچے کے حصہ کو متاثر کرے گی اور ہر مؤمن و مسلم کی روح کو قبض کر لے گی، اس کے بعد صرف بدکار لوگ باقی رہ جائیں گے، جو گدھوں کی طرح برسر عام زنا کاری و بدکاری میں مبتلا ہوں گے، بالآخر ان ہی بدترین لوگوں پر قیامت قائم ہوگی۔"

ایک دوسری حدیث میں ہے:

"ثُمَّ يُرْسِلُ اللّٰهُ رِيحًا بَارِدَةً مِنْ قِبَلِ الشَّامِ، فَلَا يَبْقَى عَلَى وَجْهِ الْأَرْضِ أَحَدٌ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ خَيْرٍ أَوْ إِيمَانٍ إِلَّا قَبَضَتْهُ، حَتَّى لَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ دَخَلَ فِي كَبِدِ جَبَلٍ لَدَخَلَتْهُ عَلَيْهِ، حَتَّى تَقْبِضَهُ، قَالَ: فَيَبْقَى شِرَارُ النَّاسِ فِي خِفَّةِ الطَّيْرِ وَأَحْلَامِ السِّبَاعِ، لَا يَعْرِفُونَ مَعْرُوفًا وَلَا يُنْكِرُونَ مُنْكَرًا، فَيَتَمَثَّلُ لَهُمُ الشَّيْطَانُ، فَيَقُولُ: أَلَا تَسْتَجِيبُونَ؟ فَيَقُولُونَ: فَمَا تَأْمُرُنَا؟ فَيَأْمُرُهُمْ بِعِبَادَةِ الْأَوْثَانِ، وَهُمْ فِي ذَلِكَ دَارٌّ رِزْقُهُمْ، حَسَنٌ عَيْشُهُمْ، ثُمَّ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ، فَلَا يَسْمَعُهُ أَحَدٌ إِلَّا أَصْغَى لِيتًا، وَرَفَعَ لِيتًا، قَالَ: وَأَوَّلُ مَنْ يَسْمَعُهُ رَجُلٌ يَلُوطُ حَوْضَ إِبِلِهِ، قَالَ: فَيَصْعَقُ وَيَصْعَقُ النَّاسُ، ثُمَّ يُرْسِلُ اللّٰهُ، أَوْ قَالَ: يُنْزِلُ اللّٰهُ مَطَرًا، كَأَنَّهُ الطَّلُّ، أَوِ الظِّلُّ، نُعْمَانُ الشَّاكُّ، فَتَنْبُتُ مِنْهُ أَجْسَادُ النَّاسِ، ثُمَّ يُنْفَخُ فِيهِ أُخْرَى، فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنْظُرُونَ، ثُمَّ يُقَالُ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ هَلُمَّ إِلَى رَبِّكُمْ ﴿وَقِفُوهُمْ إِنَّهُمْ مَسْئُولُونَ﴾ قَالَ: ثُمَّ يُقَالُ: أَخْرِجُوا بَعْثَ النَّارِ، فَيُقَالُ: مِنْ كَمْ؟ فَيُقَالُ: مِنْ كُلِّ أَلْفٍ تِسْعَ مِائَةٍ وَتِسْعَةً وَتِسْعِينَ، قَالَ: فَذَاكَ ﴿يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا﴾ وَذَلِكَ ﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ﴾

(رواه مسلم، مشكوٰة: ٤٨١ / باب لا تقوم الساعة إلا على شرار الناس)

"پھر اللہ تعالیٰ ایک ٹھنڈی ہوا شام کی طرف سے بھیجیں گے تو روئے زمین پر کوئی ایسا شخص نہیں رہے گا جس کے دل میں ذرّہ برابر ایمان یا خیر و بھلائی ہو؛ مگر یہ کہ وہ فوت ہو جائے گا، یہاں تک کہ تم میں سے کوئی شخص پہاڑ کے دامن میں داخل ہو جائے تو وہ ہوا اس میں بھی گھس کر اس پر موت طاری کر دے گی، پھر روئے زمین پر بدترین لوگ ہی باقی رہ جائیں گے، وہ پرندوں کی طرح سبک رو اور تیز رفتار اور درندوں کی مانند بے عقل اور سخت دل ہوں گے، نہ نیکی و بھلائی سے واقف ہوں گے، نہ برائی اور بدکاری سے پرہیز کریں گے، شیطان انہیں مزید گمراہ کرے گا، بت پرستی کا حکم دے گا، تو لوگ بت پرستی، گمراہی اور بدکاری میں مبتلا ہو جائیں گے، اس کے باوجود ان کے رزق میں فراوانی اور خوب عیاشی والی زندگی

ہوگی۔ (اس کے ایک عرصے بعد) قیامت کا صور پھونک دیا جائے گا۔ اس طرح بالآخران ہی گمراہ اور بدترین قسم کے لوگوں پر قیامت قائم ہوگی۔

مؤمنین کی موت کے بعد سے قیامت قائم ہونے تک کے زمانہ میں روئے زمین پر حبشہ والوں کا غلبہ ہوجائے گا، اس دوران صحیح بخاری و مسلم کی روایت کے مطابق حبشہ والے خانۂ کعبہ کو گرادیں گے (اور اس کے نیچے سے خزانہ نکال لیں گے) اس وقت حج اور عمرہ بھی موقوف ہوجائے گا اور قرآنِ کریم لوگوں کے دلوں اور کاغذوں میں سے اُٹھالیا جائے گا۔

(آثارِ قیامت اور فتنۂ دجال: ۴۱)

ایک حدیث میں ہے:

"عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: "اُتْرُكُوا الْحَبَشَةَ مَا تَرَكُوكُمْ، فَإِنَّهُ لَا يَسْتَخْرِجُ كَنْزَ الْكَعْبَةِ إِلَّا ذُو السُّوَيْقَتَيْنِ مِنَ الْحَبَشَةِ".

(رواه أبوداود، مشكوٰة: ٤٦٨ / باب الملاحم)

"فرمایا: حبشیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو اور ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کرو، تاوقتیکہ وہ تم سے کچھ نہ کہیں، اور اس بات میں شک نہیں کہ کعبہ کا خزانہ ایک حبشی ہی نکالے گا، جس کی دونوں پنڈلیاں چھوٹی ہوں گی۔"

یہ اسی زمانہ میں ہوگا جب کہ کوئی "اللہ، اللہ" کہنے والا باقی نہیں ہوگا، ان دنوں روئے زمین کے دیگر علاقوں کی نسبت ملک شام میں امن ہوگا، جس کے سبب بہت سے لوگ وہیں آکر پناہ لیں گے، کچھ ہی عرصہ کے بعد ایک بڑی آگ یمن کی جانب سے بڑی تیزی کے ساتھ نمودار ہوگی، جو لوگوں کو میدانِ محشر (جو ملک شام میں قائم ہوگا) کی طرف ہانک کر لے جائے گی۔ حدیث پاک میں ہے:

"وَ اٰخِرُ ذٰلِكَ نَارٌ تَخْرُجُ مِنَ الْيَمَنِ، تَطْرُدُ النَّاسَ إِلٰى مَحْشَرِهِمْ".

(رواه مسلم، مشكوٰة: ٤٧٢)

"قیامت کی سب سے آخری نشانی ایک آگ ہوگی جو یمن سے نکل کر لوگوں کو سر زمین محشر کی طرف دھکیل دے گی۔"

بعض علماء نے فرمایا کہ اس کے بعد بھی تین چار سال تک کا عرصہ قیامت سے قبل اس طرح گزرے گا کہ لوگ نہایت غفلت میں ہوں گے، لوگ اپنے کاموں اور مشاغل میں مشغول ہوں گے کہ اچانک سائرن کی آواز شروع ہوجائے گی، یہ آواز بڑھتی چلی جائے گی، ہر طرف لوگوں کو یکساں سنائی دے گی، لوگ اس آواز سے حیران و پریشان ہوجائیں گے، آہستہ آہستہ یہ آواز بجلی کی کڑک کی طرح سخت اور اونچی ہوجائے گی، یہاں تک کہ لوگوں کے کانوں کے پردے اور دل پھٹ جائیں گے، جس سے سارے لوگ مرجائیں گے، پھر زمین میں زلزلہ شروع ہوکر سب کچھ تباہ و برباد ہوجائے گا، آسمان بھی ٹوٹ جائیں گے، پہاڑ ریزہ ریزہ ہوجائیں گے، سمندر اُبل کر جوش ماریں گے اور موجودہ کائنات بالکل فنا ہوکر قیامت قائم ہوجائے گی۔

وقوعِ قیامت کے متعلق یہ تو منقول ہے کہ جمعہ کے دن قیامت قائم ہوگی؛ لیکن دس محرم کو قیامت کا واقع ہونا کسی صحیح حدیث میں موجود نہیں۔

(معارف السنن: ٤/٣٠٤، ابواب الجمعة / باب في الساعة التي ترجى في يوم الجمعة)

یا اللہ! اپنے کرم سے موت اور قیامت سے قبل ہمیں اور ہماری آل و اولاد، اہل خانہ اور نسلوں کو اپنا قربِ خاص عطا فرما کر دارین کی رضاءِ کامل نصیب فرمائیے۔ آمین یارب العالمین۔

۲۵/صفر المظفر/۱۴۴۱ھ

مطابق: ۲۵/اکتوبر/۲۰۱۹ء

بروز جمعہ، قبل المغرب (بزمِ صدیقی، بڑودا)

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيرًا　　فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيرًا كَثِيرًا

(۳۱)

اسلامی تاریخ کے پانچ اَدوار اورموجودہ حالات میں پانچ اَحکام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنِ النُّعۡمَانِ بۡنِ بَشِیۡرٍ عَنۡ حُذَیۡفَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "تَكُوۡنُ النُّبُوَّةُ فِيۡكُمۡ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنۡ تَكُوۡنَ، ثُمَّ يَرۡفَعُهَا اللّٰهُ تَعَالٰى، ثُمَّ تَكُوۡنُ خِلَافَةً عَلٰى مِنۡهَاجِ النُّبُوَّةِ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنۡ تَكُوۡنَ، ثُمَّ يَرۡفَعُهَا اللّٰهُ تَعَالٰى، ثُمَّ تَكُوۡنُ مُلۡكًا عَاضًّا فَيَكُوۡنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنۡ يَكُوۡنَ، ثُمَّ يَرۡفَعُهَا اللّٰهُ تَعَالٰى، ثُمَّ يَكُوۡنُ مُلۡكًا جَبۡرِيًّا، فَيَكُوۡنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنۡ يَكُوۡنَ، ثُمَّ يَرۡفَعُهَا اللّٰهُ تَعَالٰى، ثُمَّ تَكُوۡنُ خِلَافَةً عَلٰى مِنۡهَاجِ النُّبُوَّةِ، ثُمَّ سَكَتَ."

(رواه أحمد، و البيهقى فى دلائل النبوة، مشكوٰة: ٤٦١، باب الإنذار والتحذير)

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیرؓ حضرت حذیفہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے درمیان نبوت (ذاتِ نبوت اور نورِ نبوت) اس وقت تک موجود ہے

جب تک اللہ تعالیٰ چاہیں گے، پھر حق تعالیٰ نبوت کو اٹھالیں گے، تو خلافت نبوت کے طریقے پر قائم ہوگی جب تک اللہ تعالیٰ چاہیں گے، پھر حق تعالیٰ خلافت کو بھی اٹھالیں گے، تب کاٹ کھانے والی بادشاہت قائم ہوگی جب تک اللہ تعالیٰ چاہیں گے، پھر جب بادشاہت بھی اُٹھا لیں گے تو جابرانہ حکومت قائم ہوگی جب تک اللہ تعالیٰ چاہیں گے، اس کے بعد جب جابرانہ حکومت کو بھی اٹھالیں گے تو (ایک طویل عرصے کے بعد دوبارہ) حق تعالیٰ نبوت کے طریقے والی خلافت قائم فرمائیں گے۔ یہ فرما کر آپ ﷺ خاموش ہوگئے۔ (کیوں کہ اس پانچویں دور کے بعد قیامت قائم ہوگی)۔

تمہید:

اللہ رب العالمین اس کائنات کے خالق و مالک ہیں، اس لیے مخلوقات بھی اسی کی ہیں، ملک بھی اس کا اور حکم بھی اس کا چلتا ہے۔ قرآن کا فرمان ہے:

﴿أَلَا لَهُ الۡخَلۡقُ وَ الۡأَمۡرُ﴾ (الأعراف: ٥٤)

ہمارا ایمان و یقین ہے کہ آج تک اس کائنات میں جو کچھ بھی ہوا اور آئندہ بھی تا اَبد جو کچھ ہوگا اس کا اصل سبب تو اللہ پاک کا حکم ہی ہے۔ اور اللہ پاک کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں ہے، ہمیں حکم الٰہی کی کوئی حکمت سمجھ میں آئے یا نہ آئے، ہم فرماں برداری کے مکلّف ہیں، کیوں کہ ہم اللہ پاک کے بندے ہیں۔ اور بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے آخری رسول جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے ہمیں جو حکم دیا اس کے سامنے ہم سر تسلیم خم کردیں، یہی اصل بندگی اور اپنے خالق و مالک سے اظہارِ وفاداری ہے اور اسی میں دارین کی کامیابی ہے۔

حالات اللہ پاک کے حکم اور حکمت کا نتیجہ ہیں:

اس تمہید کے بعد جب ہم موجودہ زمینی حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو صاف نظر آتا

ہے کہ اس وقت ہمارے ملک ہندوستان سمیت دنیا بھر کے حالات مجموعی طور پر سبھی کے لیے اور خصوصی طور پر مسلمانوں کے لیے پریشان کن ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ حالات بھی اللہ تعالیٰ کے حکم اور حکمت ہی کا ثمرہ ونتیجہ ہیں۔ قرآنِ کریم نے ایک مقام پر فرمایا:

﴿مَآ أَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ فِي الۡأَرۡضِ وَ لَا فِيۡٓ أَنۡفُسِكُمۡ إِلَّا فِيۡ كِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ أَنۡ نَّبۡرَأَهَا إِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرٌ﴾ (الحدید: ۲۲)

”جو بھی اجتماعی وانفرادی مصیبت تم پر آتی ہے اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے طے شدہ اور لوحِ محفوظ میں لکھی ہوئی ہے، آج تک جو کچھ ہوا اور آئندہ بھی جو کچھ ہوگا وہ سب اسی کے مطابق ہوا ہے اور ہوگا۔ اور یہ کام اللہ پاک کے لیے بالکل آسان ہے۔“

﴿لِكَيۡلَا تَأۡسَوۡا عَلٰى مَا فَاتَكُمۡ وَ لَا تَفۡرَحُوۡا بِمَآ اٰتٰكُمۡ﴾ (الحدید: ۲۳)

”حق تعالیٰ نے جو کچھ مصیبت وراحت تمہارے مقدر میں لکھ دی ہے وہ تو مل کر رہے گی۔“ لہٰذا مصیبتوں میں گھبراؤ نہیں اور نعمتوں میں اِتراؤ نہیں۔“ ہر حال میں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کرو۔

ان حقائق وہدایات پر ہم یقین کرلیں تو ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا اور شریعت پر عمل کرنا آسان ہوجائے۔ اور یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں، کیوں کہ ایسا بھی نہیں کہ دنیا کے تمام اچھے برے احوال حق تعالیٰ نے پہلے سے طے فرما کر ان کی کوئی خبر اور اطلاع بھی نہیں دی؛ بلکہ بندوں کو کہیں اجمالی طور پر تو کہیں قدرے تفصیلی طور پر ان کی اطلاع بھی فرمادی۔ چنانچہ حضور ﷺ نے من جانب اللہ آئندہ پیش آنے والے اچھے برے احوال کی بھی اطلاع دی، جنہیں پیشین گوئیاں کہا جاتا ہے۔ کتب احادیث میں ہمارے علماءِ محدثین کتاب الفتن کے تحت اس قسم کی بہت سی صحیح روایات لائے ہیں، من جملہ ان کے حدیث مذکورہ بھی ہے، جس میں آپ ﷺ نے اسلامی تاریخ کے پانچ اَدوار اور زمانوں

کا ذکر فرمایا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ حضور ﷺ کی من جانب اللہ اب تک کی دی ہوئی پیشین گوئیاں بلا کم وکاست پوری ہوئی ہیں اور آئندہ بھی ہوں گی۔ ان شاءاللہ تعالیٰ۔

اسلامی تاریخ کا پہلا دور ”نبوت والا“:

اس کی بہترین مثال یہ حدیث ہے جس میں آپ ﷺ نے اسلامی تاریخ کے پانچ اَدوار اور زمانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

”تَكُوۡنُ النُّبُوَّةُ فِيۡكُمۡ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنۡ تَكُوۡنَ، ثُمَّ يَرۡفَعُهَا اللّٰهُ تَعَالٰى.“

مسلمانو! تمہارے درمیان ذاتِ نبوت اور نورِ نبوت کو حق تعالیٰ جب تک چاہیں گے باقی رکھیں گے۔“ جب تک تمارے درمیان نبوت کا وجود اور نور موجود رہے گا گویا وہ اسلامی تاریخ کا پہلا دور ہے، جسے دورِ نبوت کہا جاتا ہے، اس سے بہتر دور دنیا کی تاریخ میں نہیں آیا، نہ آئے گا۔ حق تعالیٰ نے اس کی عظمت کی قسم کھائی ہے: ﴿وَ الۡعَصۡرِ﴾ (العصر: ۱) قسم ہے زمانے کی۔

علامہ فخرالدین رازیؒ اور امام قرطبیؒ کے بقول یہاں ”العصر“ سے مراد دورِ نبوت ہے۔ عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ حضور ﷺ سید البشر ہیں، تو آپ ﷺ کا دور اور زمانہ بھی سید العصر ہے، آپ ﷺ نبیوں اور رسولوں کے سردار ہیں، تو آپ ﷺ کا زمانہ زمانوں کا سردار ہے۔ دورِ نبوت سراپا رحمت تھا، اس میں اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت عام تھی، یہ اسی کا اثر تھا کہ کفار وفجار بھی عام عذابِ الٰہی سے محفوظ رہے۔ قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمۡ وَ أَنۡتَ فِيۡهِمۡ﴾ (الأنفال: ۳۳)

”محبوبم! آپ کے موجود ہوتے ہوئے ان کفار وفجار پر بھی ہمارا عمومی عذاب نہیں آنے والا۔“ قرآنِ پاک کی اس آیت سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے عمومی عذاب سے حفاظت جس طرح حضور ﷺ کے وجودِ باجود سے ہوتی ہے اسی طرح استغفار کی کثرت سے بھی ہوتی ہے، لہٰذا حضور ﷺ کے وصال کے بعد استغفار کی کثرت عمومی عذابِ الٰہی سے

حفاظت کا سبب ہے۔

اسلامی تاریخ کا یہ رحمت اور برکت والا دور نزولِ وحی الٰہی اور نزولِ کلامِ الٰہی سے شروع ہوکر حضور ﷺ کی وفات تک تقریباً ۲۳ ر سال تک باقی رہا۔

اسلامی تاریخ کا دوسرا دور ''خلافت والا'':

حضور ﷺ کی وفات کے بعد اسلامی تاریخ کا پہلا دور ختم ہوکر دوسرا دور شروع ہوا، جسے دورِ خلافت کہا جاتا ہے، حضور ﷺ نے اس کی پیشین گوئی کرتے ہوئے فرمایا:

" ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةٌ عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ، مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ تَكُوْنَ."

''اس کے بعد نبوت کے طریقے پر خلافت والا دور آئے گا۔'' اس سے مراد خلافت راشدہ کا دور ہے، جس کی ابتدا سیدنا صدیق اکبرؓ سے ہوئی، تو اختتام سیدنا حسنؓ کے دورِ خلافت پر ہوا۔ اس لیے کہ ایک دوسری حدیث میں حضور ﷺ نے دورِ خلافت کی پیشین گوئی کرتے ہوئے اس کی مدت تیس سال ارشاد فرمائی:

" الْخِلَافَةُ ثَلَاثُوْنَ سَنَةً." (ترمذی، مشکوٰۃ: ٤٦٣، کتاب الفتن)

جس میں خلافت صدیقی دو سال (چار ماہ) خلافت فاروقی دس سال (چھ ماہ) خلافت عثمانی بارہ سال (نو ماہ) اور خلافت علوی چار سال (نو ماہ، اخیر کے پانچ ماہ خلافت حسنی کے ہیں) اس طرح تیس سال مکمل ہوئے۔ (جامع الاصول، از: مظاہر حق جدید: ۸۵۸/۴)

واقعہ یہ ہے کہ دورِ نبوت کے بعد اسلامی تاریخ کا دوسرا دور بھی نہایت رحمت و برکت سے لبریز رہا، کیوں کہ وہ دورِ نبوت کے بالکل قریب تھا، پھر اس دور کے حکمران و خلفاء اور عوام کی اکثریت منشائے نبوت کے مطابق زندگی گزارتی تھی، اس زمانے میں اکثر و بیشتر لوگ ایمان و اعمال اور اخلاص و اخلاق میں نہایت مضبوط اور پختہ تھے، جس کے نتیجے میں حق تعالیٰ نے اہل ایمان سے جو وعدہ فرمایا تھا وہ پورا ہوا، اسلام اور مسلمانوں کو تقریباً ہر جگہ عروج و عزت ملی اور دنیا امن و سلامتی کا گہوارہ بن گئی۔

قرآنِ پاک نے اس وعدۂ ربانی کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا﴾ (النور: ٥٥)

اللہ رب العزت نے ایمان و اعمالِ صالحہ پر اہل ایمان سے تین وعدے فرمائے:

(۱) تمہیں زمین کی خلافت و حکومت دی جائے گی۔ (۲) تمہارے پسندیدہ دین اسلام کو غلبہ ہوگا۔ (۳) تمہارے خوف کو امن سے بدل دیا جائے گا۔ دورِ خلافت میں ایسا ہی ہوا؛ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا یہ وعدۂ ربانی ایمان و اعمال کی پختگی کے ساتھ مشروط ہے، اس لیے جب اور جہاں یہ شرط پائی گئی تب وہاں یہ وعدہ پورا ہوا، الٰہی ضابطہ آج بھی یہی ہے، اس لیے آج بھی اور آئندہ بھی جہاں یہ شرط پائی جائے گی وہاں یہ ربانی وعدہ پورا ہوگا، اس کے برخلاف جب اور جہاں اہل ایمان مجموعی طور پر اپنے ایمان میں کمزور اور عمل میں کوتاہ ہوتے جاتے ہیں تو پھر ان کا عروج زوال سے، عزت ذلت سے، اقتدار اور غلبہ غلامی سے اور امن و سلامتی کو خوف و دہشت سے بدل دیا جاتا ہے، کیوں کہ "إِذَا فَاتَ الشَّرْطُ فَاتَ الْمَشْرُوْطُ". اصولی بات ہے، دورِ خلافت کے بعد یہی ہوا، دورِ خلافت ختم ہوگیا اور دورِ ملوکیت شروع ہوا۔

اسلامی تاریخ کا تیسرا دور ''ملوکیت اور بادشاہت والا'':

اس کی پیشین گوئی کرتے ہوئے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا عَاضًّا، فَتَكُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ تَكُوْنَ."

''اس کے بعد کاٹ کھانے والی ملوکیت اور بادشاہت کا دور آئے گا اور جب تک اللہ تعالیٰ چاہیں گے باقی رہے گا۔''

ظاہر ہے کہ دورِ نبوت کے بعد دورِ خلافت بھی اس لیے بابرکت تھا کہ وہ دورِ نبوت کے بالکل قریب تھا، دوسرے اس دور کے حکمران و خلفاء اور عوام کی زندگی عموماً منشائے نبوت

اورشریعت کے عین مطابق تھی، اس کے بعد جیسے جیسے لوگ دورِ نبوت اور شریعت سے دور ہوتے گئے خرافات کے قریب ہوتے گئے، نیز نیک صالح حکمران اور برکت وامن والے دور سے محروم و دور ہو گئے؛ کیوں کہ یہ بھی الٰہی ضابطہ ہے کہ جیسے اعمال ہوں گے ویسے عمال ہوں گے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسبابِ غیبی کے تحت دنیا کے اچھے برے حالات کا تعلق عمال وحکام سے کم، اعمال واحکام سے زیادہ ہے۔

”کَمَا تَکُوْنُوْنَ کَذٰلِکَ یُؤَمَّرُ عَلَیْکُمْ.“ (مشکوۃ: ۳۳۳، کتاب الإمارۃ والقضاء)

ایسا اس وقت ہوا جب کہ حضرت امیر معاویہؓ کے دورِ حکومت کے بعد زمامِ حکومت اکثر ان لوگوں کے ہاتھوں میں آ گئی جن میں یا تو حکومت کی سرے سے صلاحیت نہ تھی، یا پھر ان میں صالحیت نہ تھی، جب کہ شریعت نے انتخابِ حکمرانی کے لیے صلاحیت کے ساتھ صالحیت کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔

یاد رکھو کہ سیاست شریعت ہی کا حصہ ہے، حکومت وسیاست دین وشریعت سے ہرگز علاحدہ چیز نہیں؛ بلکہ شریعت ہی کا ایک اہم حصہ ہے۔ شریعت کے بہت سے احکام ایسے ہیں جن کا براہِ راست حکومت وسیاست سے تعلق ہے، مثلاً قانونِ الٰہی وشرعی کو عملی طور پر نافذ کرنا، حفاظت سرحد، رفع خصومات، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، قیامِ عیدین وجمعات، قیامِ بیت المال وتحصیل صدقات، تعلیم وتعلم، علاج وانصاف وغیرہ کے شعبہ جات کے علاوہ خلق خدا کی ضروری خدمات وغیرہ احکام وامور ایسے ہیں جن کا براہِ راست حکومت سے تعلق ہے، اسی لیے کہا گیا ہے: ”الدین والأمارۃ توأمان“. یعنی دین وشریعت اور حکومت وسیاست دو جڑواں بھائی ہیں، اگر حکومت وسیاست کو دین وشریعت سے جدا کر دیا تو اس سے بہت بڑا فساد پیدا ہوتا ہے، بقولِ علامہ اقبالؒ:

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو　　جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

انتخابِ حکمرانی کے پانچ طریقے:

شریعت کا منشا یہ ہے کہ اسلامی حکومت وسیاست کے لیے کسی ایسے حکمران کو منتخب کیا جائے جس میں حکومت کی صلاحیت کے ساتھ صالحیت بھی ہو، تب ہی وہ شریعت کے مطابق حکومت وسیاست کر سکے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسے حکمران کو کیسے منتخب کیا جائے؟ تو انتخابِ حکمرانی کے پانچ طریقوں میں سے ہمارے علماء نے کتاب وسنت کی روشنی میں چار ایسے ضابطے اور طریقے بیان فرمائے ہیں جنہیں شرعی طریقے کہہ سکتے ہیں:

(۱) پہلا طریقہ یہ ہے کہ عام مسلمان اور بالخصوص مقتدا حضرات وذمہ داران کسی ایسے شخص کو نامزد اور متعین کریں جو اسلام کا سب سے زیادہ مخلص، وفادار اور اسلامی شریعت خصوصاً سیاست وحکومت کے شرعی احکام اور قواعد وضوابط کا ماہر ہونے کے علاوہ لوگوں کا خیر خواہ ہو، یعنی جس میں حکومت سنبھالنے کی صلاحیت بھی ہو اور دین داری وصالحیت بھی ہو۔ اس کے بعد بیعت عامہ (جسے سیاسی بیعت بھی کہہ سکتے ہیں) کر کے اسے منصب خلافت و حکومت پر فائز کریں، جیسا کہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے وقت اس طریقے کو اختیار کیا گیا۔

(۲) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ موجود خلیفہ وحکمران اپنے بعد کے لیے کسی ایسے شخص کو جس میں واقعی اسلامی حکومت سنبھالنے کی صلاحیت وصالحیت ہو ولی عہد نامزد کرے، سیدنا صدیق اکبرؓ نے اپنے بعد سیدنا عمرؓ کے لیے اسی طریقے کو اختیار فرمایا۔

(۳) تیسرا طریقہ یہ ہے کہ خلیفہ وقت اور حاکم وقت اپنے بعد کے لیے پانچ، سات اصحابِ رائے اکابر کی ایک شوریٰ بنائے، پھر وہ شوریٰ کسی کو اس کی واقعی اہلیت، صلاحیت اور صالحیت کی بنیاد پر خلیفہ نامزد کرے اور عوام الناس سے اس کے لیے بیعت

کرائیں، چنانچہ سیدنا فاروقِ اعظمؓ نے اپنے بعد کے لیے اسی طریقۂ انتخاب کو اختیار فرمایا۔

(۴) چوتھا طریقہ یہ ہے کہ مذکورہ تین طریقوں کے علاوہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جو شرعاً ناجائز نہ ہو اور اکثر عوام اسے قبول کرلیں، تو اگرچہ یہ طریقہ منصوص اور خلفاءِ راشدین کے طریقے کے مطابق نہیں ہے؛ لیکن اس کی بھی گنجائش ہے، دورِ خلافت کے بعد عموماً اسی طرح حکومتیں قائم ہوئیں، اس کی بنیاد اکثر وراثت پر ہوتی ہے، اس لیے ایسی حکومت کو ملوکیت و بادشاہت کہا جاسکتا ہے۔

(۵) رہی بات انتخابِ حکمرانی کا موجودہ جمہوری طریقہ، تو یہ پانچواں طریقہ شریعت کی رو سے کوئی پسندیدہ نہیں، درحقیقت یہ انگریزی طریقہ ہے، جس میں علامہ اقبالؒ کے بقول:

جمہوریت اِک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں　　بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے

نالائق کو ذمہ دار بنانے کا نقصان:

الغرض! حضور ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق دورِ خلافت کے بعد ملوکیت اور بادشاہت کا دور آیا، کیوں کہ اس میں اکثر حکومتیں وراثت کی بنیاد پر قائم ہوئیں، حکمرانوں میں یا تو حکومت سنبھالنے کی سرے سے صلاحیت ہی نہ تھی، یا صالحیت نہ تھی، جس کی وجہ سے دورِ بادشاہت میں مختلف شکلوں میں فتنہ وفساد اور اختلاف و انتشار پھیل گیا۔ مثلاً واقعۂ کربلا کی شکل میں، اسی طرح مدینہ طیبہ میں بصورتِ واقعہ حرّہ پیش آیا، تو مکہ مکرمہ میں جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو شہید کردیا گیا، اس کے علاوہ بھی حجاج بن یوسف ثقفی جیسے ظالم و جابر کے ہاتھوں ہزاروں بےقصور قتل کیے گئے۔

ان حقائق کے پیشِ نظر یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ایک ہزار حکماء، علماء وعقلاء کے فوت ہوجانے سے اس قدر نقصان نہیں ہوتا جتنا نقصان کسی نااہل ونالائق کو ملک وملت (یا کسی بھی

چھوٹے بڑے دینی یا دنیوی مدرسہ و ادارہ) کا ذمہ دار بنانے سے ہوسکتا ہے، کیوں کہ ایسے لوگ عموماً اپنے مفاد کو قوم کے مفاد پر ترجیح دیتے ہیں، اس کے لیے وہ اپنی غیرت، حمیت اور ایمان تک کا سودا کر بیٹھتے ہیں، ان کے پیشِ نظر تو بس اپنی حکومت ومنفعت ہوتی ہے، جس کے حصول وحفاظت کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار ہوجاتے ہیں، خواہ لوگوں کا بیڑہ غرق ہو جائے۔ دورِ ملوکیت و بادشاہت میں دنیا اس کا خوب اچھی طرح مشاہدہ کرچکی ہے، جس کی بڑی اور بنیادی وجہ یہ تھی کہ جب لوگوں کے ایمان میں کمزوری اور اعمال واخلاق میں کوتاہی آئی تو ان کے حکام وعمال میں بھی بگاڑ وفساد پیدا ہوگیا۔

اسلامی تاریخ کا چوتھا دور ”جابرانہ حکومت والا“:

پھر جب یہ سلسلہ بڑھا تو حضور ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق دورِ ملوکیت و بادشاہت کے بعد اسلامی تاریخ کا چوتھا دور آیا، جس کا تذکرہ حدیث میں اس طرح ہے:

”ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا جَبْرِيًّا، فَتَكُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ تَكُوْنَ.“

”پھر دورِ ملوکیت کے بعد جابرانہ دورِ حکومت شروع ہوگا، یعنی بادشاہت کے بعد زوروزبردستی اور ظلم وزیادتی والی حکومت قائم ہوگی، جب تک اللہ تعالیٰ چاہیں گے۔“

علماءِ محدثین کے بقول ”جابرانہ حکومت“ کی ایک مراد غیروں کی غلامی کا دور ہے، کیوں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ دورِ ملوکیت و بادشاہت میں بنواُمیہ اور بنوعباس کے اکثر خلفاء وحکمران (عبدالملک بن مروان اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ) کے علاوہ اگرچہ نالائق بلکہ فاسق تھے، لیکن تھے تو وہ مسلمان، جب کہ دورِ بادشاہت کے بعد جن لوگوں کے ہاتھوں میں حکومت آئی وہ تو عموماً بے ایمان وکافر تھے، اس طرح مسلمان غیروں کی حکومت اور غلامی میں آگئے؛ بلکہ واقعی مسلمانوں کو ایک زمانے تک غیروں نے غلام بنالیا، کسی علاقے کے مسلمان انگریزوں کی غلامی میں رہے تو کسی جگہ فرانسیسیوں کی غلامی میں۔ آج اگرچہ جسمانی طور پر تو دورِ غلامی ختم ہوگیا؛ لیکن تہذیبی طور پر آج بھی بدقسمتی سے مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ

غیروں کا غلام بنا ہوا ہے۔ اسی کو علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

اس لیے ہمارے علماء کے کہنے کے مطابق اسلامی تاریخ کا یہ چوتھا دور غیروں کی غلامی کا ہے۔

لیکن اگر دورِ ''جابرانہ حکومت'' کا دوسرا ظاہری مفہوم مراد لیں کہ زور وزبردستی اور ظلم وزیادتی والی حکومت، تو یہ بھی صحیح ہے۔

چوتھے دورِ حکومت میں زمین ظلم سے بھر جائے گی:

کیوں کہ اِس وقت دنیا کی اکثر حکومتیں اہلیت، صلاحیت اور صالحیت کی بنیاد پر نہیں؛ بلکہ تسلط، طاقت اور اکثریت کی بنیاد پر قائم ہیں، حکومت واقتدار عموماً ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو صالحیت کے علاوہ قائدانہ صلاحیت سے محروم اور حکومت وسیاست کی اَبجد سے بھی ناواقف ہیں، اور یہی حال ہے تقریباً ان کے اَعوان و اَنصار کا بھی، ہمارے شیخ حضرت مولانا محمد قمرالزمان صاحب مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ آج کل کی سلطنتوں اور حکومتوں میں جتنی خرابیاں مشاہدے میں آتی ہیں اگر غور کیا جائے تو ان کا اصل سبب امیر ریاست کے اَعوان واَنصار اور وزراء وامراء کی خرابی، بے عملی، بدعملی یا عدمِ صلاحیت ہے، اسی لیے حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ جب کسی شخص کو کوئی حکومت یا امارت سپرد کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ وہ اچھے کام کرے، حکومت کو اچھی طرح چلائے تو اس کو نیک وزیر دیتے ہیں، جو اس کی مدد کرتا ہے، اگر یہ کسی ضروری کام کو بھول جائے تو وزیر اسے یاد دلاتا ہے، اور جس کام کا وہ ارادہ کرتا ہے وزیر اس میں اس کی مدد کرتا ہے، اس کے برعکس جب کسی امیر سے ناراض ہوتے ہیں تو اسے اَعوان واَنصار اور وزیر بھی بدخواہ دیتے ہیں، آج کے حکمرانوں کے ساتھ یہی صورتِ حال ہے۔ یہ اسی کا ثمرہ ونتیجہ ہے کہ ہر طرف ظلم وزیادتی، بدامنی اور بے برکتی عام ہے (کیوں کہ بدامنی اور بے برکتی لازم ملزوم ہیں، جس طرح عدل اور برکت میں چولی

دامن کا تعلق ہے)۔

حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق اس میں آئے دن اضافہ ہو کر نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی کہ ساری زمین ظلم وزیادتی اور بدامنی وبے حیائی سے بھر جائے گی اور کسی جگہ کسی کو مکمل طور پر انصاف اور جائے پناہ نہیں ملے گی۔

''ذَکَرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ بَلَاءً یُّصِیْبُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃَ حَتّٰی لَا یَجِدَ الرَّجُلُ مَلْجَأً یَلْجَأُ إِلَیْہِ مِنَ الظُّلْمِ.'' (مسند أحمد، مشکوٰۃ: ٤٧١، باب أشراط الساعة)

کیا آج اکثر عوام ان ہی حالات سے دوچار نہیں؟ اس صورتِ حال کی بظاہر ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اکثر حکمرانوں کو اپنی عوام سے نہ ہمدردی ہے، نہ ان کی دینی، دنیوی واخروی بھلائی سے کوئی دل چسپی۔ (الا ماشاء اللہ) انہیں دل چسپی ہے تو اپنی حکومت وعیاشی سے، جسے حاصل کرنے کے لیے اور قائم رکھنے کے لیے وہ آئے دن جائز وناجائز تدبیریں اور تباہ کن سازشیں کرتے ہیں۔ ان ہی جابر وظالم حکمرانوں کے متعلق حضور ﷺ نے ایک دوسری حدیث میں پیشین گوئی کرتے ہوئے فرمایا:

''ثُمَّ کَائِنٌ حَرْبَۃً وَ عُتُوًّا وَ فَسَادًا فِی الْأَرْضِ، یَسْتَحِلُّوْنَ الْحَرِیْرَ وَ الْفُرُوْجَ وَ الْخُمُوْرَ، یُرْزَقُوْنَ عَلٰی ذٰلِکَ وَ یُنْصَرُوْنَ، حَتّٰی یَلْقَوُا اللّٰہَ''. (رواہ البیہقی فی شعب الإیمان، مشکوٰۃ: ٤٦٠، باب الإنذار و التحذیر)

یعنی اسلامی تاریخ کے دورِ نبوت، دورِ خلافت اور دورِ بادشاہت کے بعد زبردستی، سرکشی اور ظلم وزیادتی والی حکومت آئے گی (جس کی وجہ سے زمین ظلم وفساد سے بھر جائے گی) اور اس دور کے ظالم وجابر حکمران مرد ہونے کے باوجود ریشمی (قیمتی) لباس پہنیں گے، نیز (اپنی عیاشی کے لیے) عورتوں کی شرمگاہوں اور شرابوں کو حلال قرار دیں گے (انہیں حلال وحرام سے کوئی مطلب نہیں ہوگا، وہ شراب وشباب کے شوقین اور فحاشی وعیاشی کے دل دادہ ہوں گے) اس کے باوجود رب العالمین اپنی خاص حکمت کے تحت انہیں مہلت دیں گے، انہیں رزق دیں گے، ان کے من کی مرادیں پوری فرمائیں گے، خاص خاص مقاصد میں

انہیں کامیابی دیں گے، اور یہ مہلت انہیں ایک خاص وقت تک یا پھر موت تک ملے گی۔

واقعی دنیا کے ظالم حکمران اللہ تعالیٰ کی مہلت سے غفلت میں مبتلا ہو گئے، یقیناً یہ بڑی ہلاکت کا سبب ہے، جان لیں کہ حق تعالیٰ ان کی ہر خفیہ وعلانیہ نقل وحرکت سے باخبر ہیں، غافل نہیں۔

﴿ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ۝﴾ (البقرة : ۱۴۴)

اللہ تعالیٰ کی مہلت سے غفلت ہلاکت کا سبب ہے:

صاحبو! اگر کسی کو اس کے فسق وفجور کے باوجود فتوحات ملیں تو اس کے لیے وہ اللہ تعالیٰ کا انعام نہیں؛ بلکہ استدراج، ڈھیل اور مہلت ہے، جس سے غفلت بڑی ہلاکت کا سبب ہے۔ قرآن نے اس مضمون کو یوں بیان فرمایا:

﴿ وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ۝﴾ (الأعراف: ۱۳۲)

”اور جو لوگ ہماری آیات واحکام کو جھٹلاتے ہیں ہم انہیں بتدریج (آہستہ آہستہ) اپنی گرفت میں لیے جاتے ہیں اور انہیں تو اس کا شعور بھی نہیں ہوتا۔“

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ بَنِيْنَ ۝ نُسَارِعُ لَهُمْ فِى الْخَيْرٰتِ ؕ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ۝﴾ (المؤمنون : ۵۵-۵۶)

”کیا یہ ظالم وجابر اور کفار وفجار اس خیال میں ہیں کہ ہم انہیں جو دولت (حکومت، عہدے، اموال) اور اولاد دیے جا رہے ہیں تو ان کو بھلائیاں پہنچانے میں جلدی دکھا رہے ہیں؟ نہیں؛ بلکہ (ان بے حسوں کو اس کا) شعور واحساس بھی نہیں۔“ (کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مہلت ہے، جس سے غفلت ہلاکت کا سبب ہے)۔

نیز فرمایا:

﴿ فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوٰلُهُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ۝﴾ (التوبة : ۵۵)

”پیارے! آپ کو ان (فجار لوگوں) کے اموال واولاد (کی کثرت) تعجب میں نہ ڈال دے، اللہ کی چاہت یہی ہے کہ ان سے انہیں دنیا میں سزا دے۔“ (مال بڑھانے کی حرص اور اس کی حفاظت کی فکر کیا عذاب نہیں؟)

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ۝﴾ (الأنعام : ۴۴)

”پھر جب وہ (ان تمام شرعی احکام اور کلامِ الٰہی کی نصائح کو) بھولے رہے جس کی ان کو نصیحت کی جاتی تھی تو ہم نے (بھی بطورِ مہلت) ان پر تمام چیزوں کے دروازے کھول دیے، یہاں تک کہ وہ (فتوحات کی کثرت) پر اترانے لگے، تو ہم نے ان کو دفعۃً پکڑ لیا، پھر وہ بالکل مایوس ہو گئے۔“

ظالموں کے لیے الٰہی ضابطہ ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ انہیں حکومت اور فتوحات کی کثرت کے ساتھ موقع اور مہلت بھی دی جاتی ہے، اس میں اگر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں کرتے اور ظلم وزیادتی سے باز نہیں آتے تو پھر کبھی انہیں موت سے پہلے ہی ورنہ موت کے بعد سخت گرفت اور عذاب میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے:

عَنْ اَبِيْ مُوْسٰىؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ”اِنَّ اللّٰهَ لَيُمْلِيْ الظَّالِمَ، حَتّٰى اِذَا اَخَذَهٗ لَمْ يُفْلِتْهُ، ثُمَّ قَرَأَ: ﴿ وَ كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى وَ هِيَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ﴾ (متفق عليه، مشكوٰة : ۴۳۴، باب الظلم)

”بلا شبہ اللہ پاک ظالم کو (ایک حد اور وقت تک) مہلت دیتے ہیں، اس کے بعد جب پکڑ فرماتے ہیں تو اللہ کی پکڑ تو بڑی سخت ہے، پھر حضور ﷺ نے سورۂ ہود کی آیت (۱۰۲) تلاوت فرمائی۔“ جس میں اسی مضمون کو بیان فرمایا گیا ہے۔

قرآن کے ان حقائق پر ہمارا تو بحمد اللہ ایمان وایقان ہے اور دنیا کی تاریخ بھی اس پر گواہ ہے کہ ظلم وستم سے صرف ظالموں ہی کے نہیں؛ بلکہ بڑی بڑی سلطنتوں کے چراغ گل ہو گئے، جیسے خون جب گرتا ہے تو جم جاتا ہے، ایسے ہی ظلم جب بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔

اسلامی تاریخ کا پانچواں دور ''خلافت والا'':

آج تاریخ اسلام کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اس میں دنیا کی اکثر حکومتیں یا تو ظالم ہیں یا پھر ظالم کی حامی ومددگار ہیں، جس کی وجہ سے تقریباً ساری زمین ظلم وزیادتی، بد امنی اور بے برکتی سے بھر گئی، اس کے باوجود ہمیں پست ہمت ہونے کی بالکل ضرورت نہیں، بس رجوع الی اللہ کے ساتھ اپنے ایمان واعمال پر ثابت قدمی کی ضرورت ہے، کیوں کہ حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق یہ دور دنیا کے خاتمے کا نہیں؛ بلکہ تبدیلی کا ہے، دنیا اس وقت تک ختم نہیں ہوگی جب تک قیامت سے پہلے دورِ خلافت نہ آجائے، چنانچہ فرمایا:

"ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةٌ عَلىٰ مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ."

یعنی اس دورِ جابرانہ کے بعد دورِ خلافت آئے گا، گویا اسلامی تاریخ کا وہ پانچواں دور ہوگا، جس میں حکومت منشائے نبوت اور عین شریعت کے مطابق قائم ہوگی، پھر یہ کسی ایک خطہ اور حصہ میں نہیں؛ بلکہ حضرت مہدیؒ کے ظہور اور سیدنا عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے نزول کے وقت ساری دنیا میں پھر ایک بار خلافت قائم ہوگی، پھر جس طرح آج زمین ظلم وزیادتی، بدامنی اور بے برکتی سے بھری ہوئی ہے، اس وقت زمین عدل، امن اور برکت سے بھر جائے گی۔
حدیث میں ہے:

فَيَمْلَأُ الْأَرْضَ قِسْطًا وَّ عَدْلًا كَمَا مُلِئَتْ ظُلْمًا وَّ جَوْرًا." (رواه الحاكم فی مستدركه، مشكوٰة المصابيح: ۴۷۱)

اہل ایمان کو اللہ تعالیٰ کی تسلی پر یقین رکھنا چاہیے، فرمایا:

﴿ وَ لَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝﴾ (آل عمران: ۱۳۹)

ہم نہیں تو ہماری نسلیں دورِ خلافت کو ضرور دیکھیں گی، اس وقت تو ہم یہی کہیں گے:

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

موجودہ حالات میں پہلا حکم ''اِنابت'' ہے:

رہی بات یہ کہ موجودہ جابرانہ دور میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ تو قرآن پاک نے ہماری ایسی رہبری فرمائی ہے جو ہر دور میں ہمارے کام آسکتی ہے، مثلاً اس وقت قرآنِ کریم کی دو آیتیں پیشِ نظر رہیں، جن میں سے ایک آیت میں دو ہدایتیں اور دوسری آیت میں تین ہدایتیں دی گئی ہیں۔ جس آیت کریمہ میں دو ہدایتیں ہیں وہ یہ ہے:

﴿ وَ اَنِيْبُوْٓا اِلىٰ رَبِّكُمْ وَ اَسْلِمُوْا لَهٗ﴾ (الزمر: ۵۴)

اور جس آیت میں تین ہدایتیں ہیں وہ یہ ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا قف وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝﴾ (آل عمران: ۲۰۰)

عاجز کے خیالِ ناقص میں موجودہ حالات کے لیے یہ وہ پانچ احکام ہیں جن پر عمل کر کے ہم فلاحِ دارین کے حق دار بن سکتے ہیں، منجملہ ان کے پہلا حکم ہے: انابت الی اللہ، مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی نافرمانی سے فرماں برداری کی طرف رجوع کرنا، لوٹ آنا، پلٹ آنا، جس کی تین شکلیں ہیں: (۱) توبہ (۲) اہتمام دعا (۳) اعمال واخلاق کی اصلاح۔

قرآن کریم نے اس کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَ اَنِيْبُوْٓا اِلىٰ رَبِّكُمْ وَ اَسْلِمُوْا لَهٗ﴾ (الزمر: ۵۴)

''اللہ تعالیٰ کی طرف انابت اختیار کرو۔'' رجوع کرو۔ اللہ پاک کی طرف رجوع ہونے اور متوجہ کرنے کے لیے قرآن کریم نے دو الفاظ استعمال فرمائے ہیں: (۱) تو یہی "اَنِيْبُوْا" اور دوسرا ہے: "تُوْبُوْا" (النور: ۳۱)

صاحب روح المعانی نے ''انابت'' اور ''توبہ'' میں ایک باریک فرق بیان فرمایا ہے کہ توبہ کرنے والا تو اللہ پاک کے عذاب سے گھبرا کر اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے، جب کہ ''انابت'' میں بندہ اللہ تعالیٰ کے انعامات واحسانات سے شرما کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ بہر کیف مقصود اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا ہے، خواہ حالاتِ زمانہ سے گھبرا کر ہو یا پھر انعاماتِ الٰہیہ سے شرما کر۔ قرآن نے ایسے لوگوں کو فلاحِ دارین اور رب العالمین کی رضا و رحمت کی خوش خبری سنائی ہے:

﴿وَ الَّذِیْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ یَّعْبُدُوْهَا وَ اَنَابُوْٓا اِلَی اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰی﴾ (الزمر: ۱۷)

اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے والے (حقیقی اور دائمی) خوش خبری کے مستحق ہیں۔
اس کا موقع موت سے پہلے ہر ایک کے لیے ہے، اور موت کا کوئی بھروسہ نہیں، اس لیے ابھی اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاؤ، پلٹ کر آؤ، اللہ تعالیٰ کی رحمت کی قسم! اس دنیا میں جتنا ہمارے رب کو اپنی طرف لوٹ آنے کا انتظار ہے اتنا کسی ماں یا بیوی وغیرہ کو نہیں، اس کا کریمانہ ضابطہ یہ ہے کہ بندہ تھوڑا ابھی متوجہ ہوتا ہے تو رب العالمین ہمہ تن متوجہ ہو جاتے ہیں، بندہ اپنے رب کی طرف چل کر آتا ہے تو رب کی رحمت دوڑ کر اس کا استقبال کرتی ہے۔

بقولِ شاعر:

ظلم وستم ہو، دردو غم ہو یا کوئی ہو رنج والم　　سارے تعلق رب سے جوڑ، کر دے گا وہ نظر کرم

موجودہ حالات میں دوسرا حکم ''اطاعت'' ہے:

یاد رکھو! انابت یعنی اللہ پاک کی طرف متوجہ ہونا ایک قلبی عمل ہے، جس کی علامت اللہ پاک کی اطاعت اور فرماں برداری ہے، یہی وجہ ہے کہ آیت کریمہ میں انابت کے بعد ہی اطاعت کا حکم دیا، چنانچہ فرمایا: ﴿وَ اَسْلِمُوْا لَهٗ﴾ یہاں علامہ آلوسی بغدادیؒ صاحب روح المعانی کے بقول ''اَسْلِمُوْا'' سے مراد وہ اطاعت ہے جس میں اخلاص ہو۔ گویا موجودہ حالات میں دوسرا حکم یہ ہے کہ اللہ پاک کی طرف متوجہ ہو کر زندگی کے ہر شعبے میں اخلاص کے

ساتھ احکامِ شریعت کی اطاعت ہو، احکامِ الٰہی و احکامِ شرعی کی اطاعت عین عبادت ہے، نیز احکامِ شریعت کی اطاعت یہی صراطِ مستقیم ہے، جس کے بغیر ہم منزلِ مقصود تک پہنچ ہی نہیں سکتے، جن لوگوں نے اطاعت والا راستہ اختیار کیا قرآن نے انہیں منزلِ مقصود کی بشارت دیتے ہوئے فرمایا:

﴿وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِیْقًا۝﴾ (النساء: ۶۹)

''اللہ تعالیٰ کے مطیع اور فرماں بردار جنت میں حضرات انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ ہوں گے۔''

دوسرے مقام پر انابت اور اطاعت اختیار کرنے والوں کا انعام اور مقام بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِیْنَ غَیْرَ بَعِیْدٍ۝ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِیْظٍ۝﴾ (ق: ۳۱-۳۲)

''قیامت کے دن متقیوں کے لیے جنت قریب کر دی جائے گی، ذرہ برابر بھی دور نہ ہوگی۔'' دخولِ جنت کی اجازت ملتے ہی جنت ان کے قریب کر دی جائے گی، تاکہ انہیں چل کر جنت تک جانے کی زحمت بھی نہ اٹھانی پڑے۔ پھر جب جنت میں داخل ہو جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ یہ جنت نعمتوں اور لذتوں کی جگہ ہے، جس کا وعدہ ہر اس شخص کے لیے تھا جو ''اَوّاب'' یعنی بہت زیادہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا اور ''حفیظ'' یعنی احکامِ شریعت کی حفاظت کرنے والا تھا، یعنی ہر حال میں احکامِ شریعت پر جمنے اور چلنے والا تھا۔

موجودہ حالات میں تیسرا حکم صبر ہے:

ظاہر ہے کہ شریعت پر استقامت کے ساتھ چلنا توفیق الٰہی کے بعد صبر کے بغیر

مشکل ہے، لہٰذا موجودہ حالات کا تیسرا حکم صبر ہے، جس کا حکم قرآنِ کریم کی دوسری آیت میں دیتے ہوئے فرمایا:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا ۫ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۠﴾ (آل عمران : ۲۰۰)

"اللہ کے فرماں بردار بندو! عمومی وخصوصی حالات میں، انفرادی واجتماعی حالات میں احکامِ شریعت کی اطاعت واستقامت میں جو دشواریاں پیش آئیں ان میں خود بھی صبر کرو اور دوسروں کو بھی صبر کی تلقین کرو، سرحد کی حفاظت کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، تاکہ تم کامیاب ہوجاؤ۔"

تو موجودہ حالات میں تیسرا حکم صبر کرنا ہے، کیوں کہ اس وقت یہ تو ممکن ہے کہ انفرادی طور پر کسی کے لیے شکر کے حالات ہوں؛ لیکن اجتماعی طور پر جو حالات ہیں وہ صبر کا تقاضا کرتے ہیں، ایک تو اس لیے بھی کہ معصیت بہت ہی زیادہ عام ہے، جس کی وجہ سے احکامِ شریعت پر عمل واستقامت میں طرح طرح کی دشواریاں پیش آتی ہیں، مزید برآں مجموعی حالات سبھی کے لیے پریشان کن ہیں، اس کا شرعی حل صبر کرنا ہے، فرمایا: ﴿اِصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا﴾ خود بھی صبر کرو اور اپنے اہل خانہ واحباب کو بھی صبر کی تلقین کرو، خواہ تم یا تمہارے اہل خانہ واحباب نیک ہوں یا بد، صبر سب کے لیے لازم ہے، اس کے لیے اتنا سوچ لیں کہ مؤمن کے لیے دنیا کی مصیبتیں یا تو گناہوں کی معافی کا ذریعہ ہیں، یا درجات کی بلندی کا، حدیث پاک میں ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَا یَزَالُ الْبَلَاءُ بِالْمُؤْمِنِ أَوِ الْمُؤْمِنَةِ فِيْ نَفْسِهٖ وَ مَالِهٖ وَ وَلَدِهٖ حَتّٰی یَلْقَی اللّٰهَ، وَ مَا عَلَیْهِ مِنْ خَطِیْئَةٍ." (رواه الترمذی، مشکوٰة المصابیح : ۱۳۶، باب عیادة المریض)

"مؤمن مرد وعورت کو جان، مال اور اولاد کے سلسلے میں ہمیشہ بلا ومصیبت پہنچتی رہتی ہے یہاں تک کہ (جب) (مرنے کے بعد) اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرتا ہے تو اس پر

(اس کے نامۂ اعمال میں) کوئی گناہ نہیں ہوتا۔"

کیوں کہ دنیا کے حالات ومصائب میں صبر کرنے سے اللہ پاک نے اس کے تمام گناہوں کو معاف کردیا۔

دوسری روایت میں ہے:

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ خَالِدٍ السُّلَمِيِّ عَنْ أَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا سَبَقَتْ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ مَنْزِلَةٌ لَمْ یَبْلُغْهَا بِعَمَلِهٖ ابْتَلَاهُ اللّٰهُ فِيْ جَسَدِهٖ، أَوْ فِيْ مَالِهٖ، أَوْ فِيْ وَلَدِهٖ، ثُمَّ صَبَّرَهٗ عَلٰی ذٰلِكَ، حَتّٰی یُبْلِغَهُ الْمَنْزِلَةَ الَّتِيْ سَبَقَتْ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ." (رواه أحمد و أبوداود، مشکوٰة : ۱۳۷، کتاب الجنائز، باب عیادة المریض)

"جب حق تعالیٰ کسی (نیک مؤمن) کے لیے جنت میں کوئی بلند درجہ طے فرمادیتے ہیں اور وہ بندہ اپنے عمل سے اس مرتبے کو نہیں پہنچ سکتا تو حق تعالیٰ اسے جسمانی، مالی یا اولاد کے سلسلے میں مصیبت میں ڈالتے ہیں، پھر وہ اس پر صبر کر کے اُس مقامِ عالی کا حق دار بن جاتا ہے۔"

معلوم ہوا کہ مؤمن کے لیے دنیوی مصائب میں صبر یا تو گناہوں کی معافی یا درجات کی بلندی کا سبب ہے۔

ان حقائق پر یقین کے بعد صبر کی تینوں قسمیں (اہتمامِ طاعت، اجتناب عن المعصیۃ اور مصیبت) میں صبر کرنا آسان ہوجاتا ہے۔

موجودہ حالات میں چوتھا حکم سرحد کی حفاظت (اور چوکنا رہنے کا) ہے:

اسی کے ساتھ موجودہ حالات میں چوتھا حکم سرحد کی حفاظت ہے، قرآنِ پاک نے اس کے متعلق ارشاد فرمایا کہ ﴿وَ رَابِطُوْا﴾ یعنی اے اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار بندو! اپنی

سرحد کی حفاظت کرو۔ چاہے وہ سرحد جغرافی ہو یا نظریاتی، تاکہ جسمانی یا ایمانی دشمن تمہیں نقصان نہ پہنچا سکیں۔ یعنی یہ وقت غفلت کا نہیں؛ بیدار اور چوکنا رہنے کا ہے۔

حضرات مفسرین کے بقول جیسے لفظ ”صَابِرُوْا“ میں بہت وسعت ہے، ایسے ہی لفظ ”رَابِطُوْا“ میں بھی بہت وسعت ہے۔ عموماً کتاب وسنت میں یہ لفظ دو معنوں میں استعمال ہوا ہے:

(۱) اسلامی سرحدوں کی حفاظت کے لیے، اس معنی کے اعتبار سے مطلب یہ ہے کہ تم اپنی اسلامی سرحدوں کی خوب اچھی طرح حفاظت کرو، دشمنوں سے جنگ کے مواقع تو کبھی کبھی پیش آتے ہیں، لیکن ان کی طرف سے حملے کا خطرہ ہمیشہ رہتا ہے، جس کے لیے سرحد کی حفاظت ہر وقت ضروری ہے۔ یہ کوئی معمولی عمل نہیں، اگر اخلاص کے ساتھ کیا جائے تو اجر عظیم کا ذریعہ ہے، حدیث میں ہے:

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ”رِبَاطُ يَوْمٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَ مَا عَلَيْهَا.“ (متفق عليه، مشكوٰة: ۳۲۹، كتاب الجهاد)

”اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک دن سرحد کی حفاظت میں گزارنا دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے ان سب سے بہتر ہے۔“

ایک حدیث میں ہے:

عَنْ سَلْمَانَ الْفَارِسِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: ”رِبَاطُ يَوْمٍ وَ لَيْلَةٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِنْ صِيَامِ شَهْرٍ وَ قِيَامِهِ، وَ إِنْ مَاتَ جَرَى عَلَيْهِ عَمَلُهُ الَّذِيْ كَانَ يَعْمَلُهُ، وَ أُجْرِيَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ، وَ أَمِنَ الْفَتَّانَ.“ (رواه مسلم، مشكوٰة: ۳۲۹)

”اسلامی سرحد کی حفاظت میں ایک دن اور رات گزارنا ایک ماہ کے (نفل) روزوں اور ایک ماہ کی راتوں کی عبادت سے بہتر ہے، اور اگر اسی عمل میں موت آئے گی تو اس کا وہ عمل جاری رہے گا جو وہ کرتا تھا (یہ عمل اس کے لیے صدقۂ جاریہ بنا دیا جائے گا) اور

اس کو اس کا رزق ملتا رہے گا اور وہ عذابِ قبر سے محفوظ اور بے خوف رہے گا۔“

ان روایات کے تحت ہمارے علماء نے فرمایا کہ اسلامی سرحد کی حفاظت میں جو فضائل وارد ہوئے ہیں وہ تمام فضائل دشمنوں سے خطرات کے وقت مسلمانوں کے شہر، آبادی، سوسائٹی، محلّہ وغیرہ کی اندر یا باہر سے حفاظت کرنے والوں کو بھی حاصل ہوتے ہیں۔
(مستفاد از: انوار البیان: ۱/ ۵۴۵)

(۲) اس کے علاوہ یہ لفظ ”رَابِطُوْا“ دیگر بعض اعمالِ صالحہ کی اخلاص کے ساتھ پابندی کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ حدیث میں تین اعمال کا ذکر ہے: (۱) مکارہ یعنی ناگواریوں کے باوجود سنت کے مطابق وضو کرنا۔ (۲) دور ہونے کے باوجود مسجد کی طرف جانا، یا مسجد میں بار بار جانا۔ (۳) ایک نماز کے بعد دوسری کا انتظار کرنا۔ حدیث میں ان اعمال کے لیے بھی ”رِباط“ کا لفظ استعمال ہوا ہے، چنانچہ فرمایا:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ”أَلَا أَدُلُّكُمْ عَلٰى مَا يَمْحُو اللّٰهُ بِهِ الْخَطَايَا، وَ يَرْفَعُ بِهِ الدَّرَجَاتِ؟ قَالُوْا: بَلٰى، يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ: إِسْبَاغُ الْوُضُوْءِ عَلَى الْمَكَارِهِ، وَ كَثْرَةُ الْخُطٰى إِلَى الْمَسَاجِدِ، وَ انْتِظَارُ الصَّلٰوةِ بَعْدَ الصَّلٰوةِ، فَذٰلِكُمُ الرِّبَاطُ.“ (رواه مسلم، مشكوٰة: ۳۸، كتاب الطهارة)

الغرض! قرآنِ کریم نے ہمیں جہاں رجوع الی اللہ، اعمالِ صالحہ اور صبر و استقامت کا حکم دیا وہاں ظاہری و باطنی، جغرافی و نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کا بھی حکم دیا، تاکہ ہم ظاہری و باطنی، جسمانی و ایمانی دشمنوں کے خطرات سے چوکنا اور محفوظ رہیں۔

موجودہ حالات میں پانچواں حکم تقویٰ ہے:

علاوہ ازیں موجودہ حالات میں پانچواں حکم یہ ہے: ﴿وَ اتَّقُوا اللّٰهَ﴾ تقویٰ اختیار کرو۔ اللہ تعالیٰ کا استحضار، دھیان اور ڈر پیدا کرو۔ یہ عمل تمام اعمالِ صالحہ کی روح ہے، اس کے بعد رجوع الی اللہ، اعمالِ صالحہ، صبر اور سرحدوں کی حفاظت اور چوکنا رہنا سب آسان

ہوں گے، اور اتنا ہی نہیں؛ بلکہ قرآن کے بیان کے مطابق اگر تم اس صفت سے متصف ہو جاؤ گے تو پھر دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں اور حکومتیں مل کر تمہارے خلاف مکر کریں تب بھی تمہیں مٹا نہیں سکیں گی، فرمایا:

﴿ وَ إِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا﴾ (آل عمران : ١٢٠)

یہاں رب العالمین نے صبر اور تقویٰ پر دشمنوں کے مکر و فریب اور نقصان سے حفاظت کا وعدہ فرمایا، آگے چند آیتوں کے بعد ان ہی دو اعمال پر اپنی مدد اور نصرت کا بھی وعدہ فرمایا:

﴿ بَلٰىٓ إِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا وَ يَأْتُوْكُمْ مِنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلَافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ○﴾ (ال عمران : ١٢٥)

یہ وعدہ دنیا میں بھی پورا ہوتا ہے اور آخرت میں تو ہے ہی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر جب فرعون کی جانب سے سخت حالات پیش آئے تو آپ نے بنی اسرائیل کو صبر و تقویٰ کی تلقین کرنے کے بعد فرمایا تھا کہ اس کا نتیجہ اور انجام بہت بہتر ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَ اصْبِرُوْا ۚ إِنَّ الْأَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۗ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ○﴾ (الأعراف : ١٢٨)

(حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا: اللہ ہی سے مدد مانگو، صبر سے کام لو، یہ زمین (اور اس کی دولتیں اور حکومتیں سب) اللہ ہی کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے (عارضی طور پر بطورِ امتحان مالک بنا دیتا ہے) لیکن یاد رکھو! کامیابی تو تقویٰ ہی پر ملتی ہے۔

واقعۃً موجودہ حالات میں ان احکام پر عمل کر لیا جائے تو آج نہیں تو کل کامیابی ہمارے قدم چومے گی۔

حق تعالیٰ توفیق عطا فرما کر فلاحِ دارین کو ہمارے لیے، ہمارے والدین، اولاد و

ازواج، اہل خانہ، اعزاء و اقرباء اور محسنین کے لیے مقدر فرما دیں، اپنے لطف و کرم سے حضرت والد صاحب زید مجدہم کو شفاءِ کاملہ، عاجلہ، دائمہ، مستمرہ نصیب فرمائیں، جنہیں مؤرخہ ١٦/ربیع الآخر ١٤٤١ھ مطابق: ١١/فروری/٢٠٢٠ء بروز منگل برین ہیمبریج ہوا، جس کے بعد مقامی ہسپتال میں دماغ کا آپریشن ہوا، اور تب سے اب تک حضرت والد صاحب صاحب فراش ہیں۔

یا اللہ! کرم فرما، ساری امت پر رحم فرما، مولیٰ! مدد فرما، ہمیں اپنی مدد کا مستحق بنا، امت سے سارے عالم میں کورونا کی سازشیں اور وبائی مرض کے عذاب کو جلد از جلد عافیت کے ساتھ ختم فرما، جو بیمار ہیں تمام کو اپنے کرم سے شفاءِ کاملہ، عاجلہ، دائمہ، مستمرہ عطا فرما، خصوصاً حضرت والد صاحب کا سایہ بہ عافیت و سلامتی تا دیر قائم رکھ۔ آمین یا رب العالمین۔

مؤرخہ: یکم شعبان المعظم/١٤٤١ھ

مطابق: ٢٧/مارچ/٢٠٢٠ء (شب جمعہ، قبل الفجر)

بزمِ صدیقی، بڑودا

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيْرًا فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيْرًا كَثِيْرًا
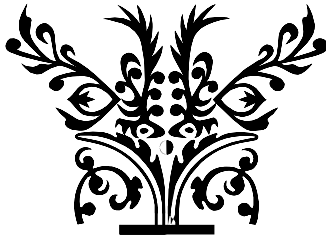
(۳۲)

کورونا کا قہر: کبائر کا اثر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ عَـائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهَا قَالَتۡ: سَأَلۡتُ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الطَّاعُوۡنِ، فَأَخۡبَرَنِیۡ أَنَّهٗ عَذَابٌ یَبۡعَثُهُ اللّٰهُ عَلٰی مَنۡ یَشَاءُ، وَ أَنَّ اللّٰهَ جَعَلَهٗ رَحۡمَةً لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ، لَیۡسَ مِنۡ أَحَـدٍ یَـقَعُ الطَّاعُوۡنُ، فَیَمۡكُثُ فِیۡ بَلَدِهٖ صَابِرًا مُحۡتَسِبًا یَعۡلَمُ أَنَّهٗ لَا یُصِیۡبُهٗ إِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ، إِلَّا كَانَ لَهٗ مِثۡلُ أَجۡرِ شَهِیۡدٍ.'' (رواه البخاری، مشکوٰۃ: ۱۳۵، باب عیادۃ المریض)

ترجمہ: ''حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رحمت عالم ﷺ سے طاعون کی حقیقت دریافت کی، تو آپ ﷺ نے مجھے بتلایا کہ (ویسے تو) یہ طاعون عذابِ الٰہی ہے، حق تعالیٰ اپنی مرضی سے جس پر چاہیں بھیجتے ہیں، البتہ ان مؤمنین کے لیے یہ طاعون باعث رحمت ہے جو اس میں مبتلا ہونے پر صبر سے کام لیتے ہیں اور جس جگہ طاعون کا وبائی مرض پھیلے وہاں ایک مؤمن نکلنے پر قدرت کے باوجود رضاءِ الٰہی کا طالب بن کر صبر کے ساتھ ٹھہرا رہے، اس یقین کے ساتھ کہ مقدر کا لکھا ہوا بہر حال پہنچ کر رہے گا (کیوں کہ تقدیر سے کوئی بھاگ نہیں سکتا، اس کے بعد خواہ وہ بچ جائے یا طاعون کے وبائی مرض میں مرجائے) اُسے ایک شہید کے برابر ثواب ملے گا۔''

عذابِ الٰہی کا سبب:

اللہ رب العزت اپنے بندوں کو ان کے گناہوں اور زیادتیوں کے باوجود ایک مقررہ وقت تک مہلت اور توبہ کا موقع عطا فرماتے ہیں اور عذابِ عام سے محفوظ رکھتے ہیں، لیکن جب بندے اللہ تعالیٰ کی مہلت سے غفلت میں مبتلا ہو کر کثرتِ معاصی کے عادی بن جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی زمین کو اجتماعی گناہوں اور زیادتیوں سے بھر دیتے ہیں تب انہیں مختلف عمومی عذابِ الٰہی میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے بطورِ عبرت مختلف مقامات پر اس کا تذکرہ کیا، ایک جگہ ارشاد فرمایا: ﴿فَكُلًّا أَخَذۡنَا بِذَنۡبِهٖ﴾ پھر تو ہر ایک کو ہم نے گناہ کے وبال میں گرفتار کر لیا۔ ﴿فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ أَرۡسَلۡنَا عَلَیۡهِ حَاصِبًا﴾ ان میں سے بعض پر ہم نے پتھروں کی بارش برسائی، جیسے قومِ عاد اور قومِ لوط۔ ﴿وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ أَخَذَتۡهُ الصَّیۡحَةُ﴾ اور ان میں سے بعض کو سخت چنگھاڑ اور آواز نے آ پکڑا، جیسے اہلِ مدین اور قومِ ثمود کو۔ ﴿وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ خَسَفۡنَا بِهِ الۡأَرۡضَ﴾ ان میں سے بعض کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا، جیسے قارون اور اس کے خزانہ کو۔ ﴿وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ أَغۡرَقۡنَا﴾ ان میں سے بعض کو غرق کر دیا، جیسے قومِ نوح اور قومِ فرعون کو۔ (العنکبوت: ۴۰)

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿كَدَأۡبِ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ وَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ كَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا فَأَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوۡبِهِمۡ﴾ (ال عمران: ۱۱)

''الِ فرعون اور ان سے پہلی قوموں کے ساتھ بھی ہمارا معاملہ یہی رہا کہ جب انہوں نے ہماری آیتوں (نشانیوں اور نبیوں) کو جھٹلایا تو ان کے اس گناہ اور جرم کے سبب ہم نے انہیں عذابِ عام میں مبتلا کیا۔''

اسی طرح قومِ فرعون کو غفلت سے بیدار کرنے کے لیے حق تعالیٰ نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے ان پر پانچ مختلف عمومی عذاب نازل فرمائے، اس کے باوجود جب ان کی

غفلت کا نشہ نہ اُترا تو بالآخر انہیں ہلاک کر دیا گیا۔ قرآن نے ان کے عبرت ناک انجام کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَ الْجَرَادَ وَ الْقُمَّلَ وَ الضَّفَادِعَ وَ الدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ٥﴾ (الأعراف : ۱۳۳)

’’پھر ہم نے ان پر طوفان بھیجا اور ٹڈیوں کا عذاب نازل کیا جس نے ان کی فصلوں اور کھیتوں کو برباد کر دیا اور جوئیں یا چھوٹے چھوٹے کیڑے جس نے ان کی زندگی کو تنگ کر دیا اور مینڈک کی فوج بھیجی، جہاں دیکھو وہاں مینڈک ہی مینڈک، اور خون کے عذاب میں مبتلا کیا، ان کا ہر پانی خون بن گیا، یا ان کا ہر فرد نکسیر کی بیماری میں مبتلا ہو گیا۔ یہ سب عذابِ الٰہی کی کھلی نشانیاں تھیں؛ لیکن اس کے باوجود وہ لوگ غفلت وضلالت سے باز نہیں آئے، تکبر اور جرم میں بڑھتے گئے، بالآخر ہمیشہ کے لیے ہلاک کر دیے گئے۔‘‘

اس سے واضح ہو گیا کہ عذابِ الٰہی کا سبب گناہوں کی کثرت ہے، اس سے حفاظت کے لیے توبہ، اعمالِ صالحہ اور دعوت الی اللہ ضروری ہے، کیوں کہ حدیث میں ہے کہ تم ضرور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (دعوت دین) کا اہتمام کرو، ورنہ اللہ تعالیٰ تم پر عذاب نازل کرے گا، پھر تم دعائیں مانگو گے تو قبول نہ ہوں گی۔ (ترمذی، مشکوٰۃ: ۴۳۶)

عذابِ الٰہی کی ایک صورت، وبائی بیماری:

معلوم ہوا کہ اجتماعی گناہوں اور ظلم وزیادتیوں کے سبب اللہ تعالیٰ کا عمومی عذاب مختلف صورتوں میں آتا ہے، من جملہ ان کے ایک صورت وبائی بیماری بھی ہے، اس کی تائید ایک تو اسی آیت کریمہ سے ہوتی ہے جس میں فرمایا:

﴿فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ﴾ (الأعراف : ۱۳۳)

یہاں ایک قول کے مطابق ’’طوفان‘‘ سے مراد ’’طاعون‘‘ پلیگ (PLAGE) ہے۔ (انوار البیان: ۲/۳۶۸)

کہتے ہیں کہ طاعون ایک عام مرض اور وبا ہے جس کی وجہ سے ہوا، مزاج اور بدن کے اندر خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ طاعون مہلک قسم کی بیماری ہے، جس کی وجہ سے بدن کے نرم حصوں میں زخم ہو جاتے ہیں، جیسے بغلیں وغیرہ، اور گردن سیاہ، سرخ یا سبزی مائل ہو جاتی ہے۔ (توضیحات شرح مشکوٰۃ: ۲/۴۷)

نیز مذکورہ حدیث میں بھی طاعون کو اللہ تعالیٰ کا عذاب قرار دیا گیا ہے، ایک اور حدیث میں ہے:

عَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ’’الطَّاعُوْنُ رِجْزٌ أُرْسِلَ عَلٰى طَائِفَةٍ مِنْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ.‘‘ (متفق عليه، مشكوٰة : ۱۳۵، باب عيادة المريض)

طاعون ایک عذاب ہے، جو بنی اسرائیل پر اس وقت نازل کیا گیا تھا جب ان کو حکم ہوا کہ ﴿وَ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا﴾ (البقرة: ۵۸) تو انہوں نے حکمِ الٰہی کی مخالفت کی، اس وقت انہیں عمومی عذاب میں طاعون کی وبائی بیماری کے ذریعہ مبتلا کیا گیا، جسے قرآن نے بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ٥﴾ (البقرة : ۵۹)

’’ہم نے بھی ان ظالموں پر ان کے فسق اور نافرمانی کی وجہ سے آسمانی عذاب نازل کیا۔‘‘ یہ آسمانی عذاب حدیث کے مطابق طاعون ہی تھا۔ معالم التنزیل میں ہے کہ اس طاعون کی وجہ سے بنی اسرائیل کے ستر ہزار افراد ایک ہی وقت میں ہلاک ہو گئے۔
(انوار البیان: ۱/۹۶)

بیماری کی دو قسمیں:

الغرض گناہوں کے سبب جو عمومی عذاب نازل ہوتا ہے اس کی ایک صورت وبائی بیماری بھی ہے۔ بنیادی طور پر بیماری کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ ہے جو متعدی اور وبائی نہیں

ہے، یعنی جن میں پھیلاؤ نہیں ہوتا، یہ بیماری ایک سے دوسرے میں سرایت نہیں کرتی۔ دوسری قسم وہ ہے جو متعدی اور وبائی ہے، یعنی حق تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے حکمت خاصہ کے تحت اس میں پھیلاؤ رکھا ہے، جس کی وجہ سے تحت الاسباب ایک کی بیماری منشائے الٰہی کے مطابق دوسرے میں سرایت کر جاتی ہے۔

جہاں تک تعلق ہے اس حدیث کا جس میں فرمایا: ”لَا عَدْوٰی“. (بخاری، مشکوٰۃ: ۲۹۱) تو اس کا مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور مرضی کے بغیر ایک کی بیماری از خود دوسرے کو ہرگز نہیں لگ سکتی، اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں تو بیماری متعدی اور وبائی بن جاتی ہے، یہ بات مشاہدہ میں بھی آتی ہے کہ بعض اوقات ایک وبائی مرض میں مبتلا ہونے والے شخص سے چند لمحوں کی ملاقات سے دوسرا شخص اس بیماری کا شکار ہو جاتا ہے اور جو شخص مستقل اس مریض کی خدمت میں لگا ہوا ہے یا جو ڈاکٹر اس کا علاج کر رہا ہے وہ اس بیماری میں مبتلا نہیں ہوتا، جس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ مرض کا پھیلنا اللہ تعالیٰ کی مرضی اور مشیت کے بغیر ممکن نہیں، اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں تو بیماریوں میں پھیلاؤ پیدا فرما دیتے ہیں۔ اس طرح ظاہری اسباب کے تحت وہ بیماریاں متعدی اور وبائی بنتی ہیں۔

ماہرین طب کے بقول سات بیماریاں ایسی ہیں جو بہ حکم الٰہی اسبابِ ظاہری کے تحت دوسروں میں سرایت کرتی ہیں، ان میں حق تعالیٰ نے کسی خاص حکمت سے پھیلاؤ رکھا ہے، وہ یہ ہیں: (۱) جذام یعنی کوڑھ (Leprsy) (۲) چیچک (Chicken / Small Pox) (۳) خارش (Itchimg) (۴) آبلے اور بدن کے پھوڑے (Mums / Meagels) (۵) گندہ ذہنی یعنی منہ کی بدبو (Oral smell) (۶) رمد یعنی آنکھوں سے سفید پانی کا بہنا (Conjuctivtis) (۷) متعدی امراض یعنی وبائی عام بیماریاں (Cntageous diseses) جیسے طاعون یعنی پلیگ (Plage) ہیضہ (Cholera) ٹی. بی. ٹائی فس بخار (Typhes fever) اور اس وقت کا نظر نہ آنے والا عالم گیر وبائی مرض کورونا (Corona Virus)

کورونا کی حقیقت اور اثرات:

واقعہ یہ ہے کہ کورونا اگر وبائی بیماری ہے تب بھی اور دھوکہ و دَجل ہے تب بھی بہر حال کورونا کا یہ قہر کبائر کا اثر ہے، اس وقت عالمی میڈیا کی سرخیوں میں کورونا کا قہر چھایا ہوا ہے، ہر کوئی کورونا کا رونا رو رہا ہے، چین سے پھیلنے والے (یا پھیلائے جانے والے) اس وائیرس نے ساری دنیا کو بے چین کر دیا ہے، میڈیکل سائنس اور ساری دُنیا کی طاقتیں اس کورونا کے سامنے عاجز اور بے بس نظر آ رہی ہیں، ساری دنیا میں لاک ڈاؤن ہے، دُنیا کی تقریباً ساری سرگرمیاں تھم چکی ہیں، حالانکہ اس سے پہلے بھی دنیا کو مختلف وائیرس سے پالا پڑا ہے، جیسے ڈینگیو وائیرس، سوائن فلو وائیرس، برڈ فلو وائیرس اور سارس جیسے وائیرس خوب تباہی پھیلا چکے ہیں؛ مگر ان کی تباہ کاریاں کورونا جیسی نہیں تھیں، اس نے تو پوری دنیا میں کہرام مچا دیا اور دنیا کو ہلا کر رکھ دیا ہے، یہ وائیرس اس لیے بھی بہت خطرناک ہے کہ ظاہری اسباب کے درجے میں یہ کورونا انسان سے انسان کے درمیان میں پھیلنے کی صلاحیت رکھتا ہے، یہ مانا جاتا ہے کہ کورونا عام طور پر بالغ افراد کو نزلے کی وجہ سے سب سے زیادہ لاحق ہوتا ہے، اس وائیرس میں مبتلا لوگوں میں بالعموم زُکام، گلے کی خرابی، سر درد اور بخار وغیرہ کی علامتیں ظاہر ہوتی ہیں، ناک مسلسل بہنے لگتی ہے، جسم تھکا تھکا سا محسوس ہوتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ ایک طرح کا بگڑا ہوا زُکام ہے، جب یہ وائیرس بڑھتا ہے تو انفیکشن زیادہ ہو جاتا ہے، پھر اس کی وجہ سے پھیپھڑے بھی متاثر ہوتے ہیں، سب سے زیادہ خطرے کی بات تب ہوتی ہے جب انفیکشن کی زیادتی سے نیومونیا ہو جاتا ہے، اس وقت میں سانس لینے میں سخت دشواری ہو جاتی ہے، بسا اوقات سانس رُک جاتی ہے تو مصنوعی نظام تنفس کا سہارا لینا پڑتا ہے، مزید انفیکشن پھیلنے کی صورت میں چند ہی گھنٹوں میں موت واقع ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔ اس وائیرس کا تشویش ناک پہلو یہ ہے کہ متاثر شخص سے پانچ دن میں یہ وائیرس دوسروں میں منتقل ہو جاتا ہے، اس لیے تشخیص ہونے پر مریض کو قریب ایک ہفتے تک علاحدہ رکھا جاتا

ہے، اس مرض کی تشخیص کے لیے بلڈ ٹیسٹ کرایا جاتا ہے، تا حال اس کا کوئی کامیاب علاج دریافت نہیں ہو پایا ہے، احتیاطی تدابیر ہی اس وقت اس کا واحد علاج ہیں، بشرطیکہ شرعی حدود میں رہ کر وہ اختیار کی جائیں۔

کورونا کا حقیقی ویقینی سبب:

صاحبو! یہ حقیقت کتاب وسنت سے ثابت ہے کہ وبائی امراض اور قدرتی آفات کے کچھ اسباب تو وہ ہیں جن کا ہماری ظاہری آنکھیں مشاہدہ کر لیتی ہیں اور میڈیکل سائنس اس کا سبب دریافت کر لیتا ہے؛ لیکن بہ حیثیت مسلمان ہمارا ایمان یہ ہے کہ وبائی امراض اور قدرتی آفات کے ظاہری اسباب کے علاوہ کچھ حقیقی اور یقینی اسباب ہوتے ہیں، جن کا علم وحیِ الٰہی کے بغیر مشکل ہے، اس پس منظر میں جب ہم کتاب وسنت میں غور وفکر سے کام لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وبائی امراض اور قدرتی آفات کا انسانی اعمال سے بڑا گہرا تعلق ہے، قرآنِ پاک میں ہے:

﴿ وَ مَآ اَصَابَکُمۡ مِّنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ﴾ (الشوریٰ: ٣٠)

"تمہیں جو کچھ مصیبتیں پہنچتی ہیں وہ سب تمہارے اعمالِ بد کی نحوست ہے۔" اور جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا کہ بندوں کے برے اعمال کے سبب جو عذاب نازل ہوتے ہیں ان میں سے ایک عذاب وبائی بیماری بھی ہے۔

ابن ماجہ کی ایک روایت ہے جس میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ رحمت عالم ﷺ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ

"لَمۡ تَظۡهَرِ الۡفَاحِشَةُ فِيۡ قَوۡمٍ قَطُّ حَتّٰى يُعۡلِنُوۡا بِهَا إِلَّا فَشَا فِيۡهِمُ الطَّاعُوۡنُ وَ الۡأَوۡجَاعُ الَّتِيۡ لَمۡ تَكُنۡ مَضَتۡ فِيۡ أَسۡلَافِهِمُ الَّذِيۡنَ مَضَوۡا." (ابن ماجه، باب العقوبات)

"جس قوم میں علانیہ فحاشی، زنا کاری اور بے حیائی کے کام ہوتے ہیں تو اس قوم میں من جانب اللہ طاعون اور ایسی بیماریاں پھیلا دی جاتی ہیں جو اُن سے پہلے لوگوں میں نہیں تھیں۔"

علماءِ محدثین کے بقول اس حدیث میں جس طاعون کا ذکر ہے اس میں تمام وبائی امراض داخل ہیں۔ اس بنا پر عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ اس وقت کورونا کا یہ مرض یا دھوکہ و دَجل جو بہت تیزی سے پھیل کر عالم گیر شکل اختیار کر گیا اس کا حقیقی ویقینی سبب اجتماعی فحاشی و بدکاری کے سبب اللہ تعالیٰ کی ناراضی ہے، یعنی کورونا کا قہر کبائر کا اثر ہے، لہٰذا اس سے بچنے کے لیے پہلے حقیقی تدابیر پھر ظاہری تدابیر شرعی حدود میں رہتے ہوئے اختیار کی جائیں۔

کورونا سے حفاظت کی حقیقی تدابیر:

(١) کورونا سے حفاظت کے لیے حقیقی تدابیر میں سب سے پہلے رجوع الی اللہ اور اہتمام توبہ ہے، اس لیے کہ قرآن کے بیان کے مطابق دنیا میں نازل ہونے والی ہر مصیبت اللہ تعالیٰ کے حکم سے آتی ہے:

﴿ مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَۃٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ﴾ (التغابن: ١١)

اس لیے اس وبائی مصیبت کا اصل حقیقی اور یقینی حل یہی ہے کہ ہم سچے دل سے توبہ کریں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے فرماں برادری کی طرف پلٹ آئیں، سچی توبہ کا اہتمام کریں، کورونا کو ہرانے کے بجائے رجوع الی اللہ اور اہتمامِ توبہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو منانے کی فکر کریں، قرآنِ پاک نے توبہ واستغفار کی کثرت پر عذابِ الٰہی سے حفاظت کی بشارت دی ہے، فرمایا:

﴿ وَ مَا کَانَ اللّٰہُ مُعَذِّبَہُمۡ وَ ہُمۡ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ﴾ (الأنفال: ٣٣)

ایک دوسرے مقام پر بھی قرآن پاک میں اسی کا حکم دیا گیا ہے:

﴿ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّکُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَیۡہِ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ رَحِیۡمٌ وَّدُوۡدٌ﴾ (ہود: ٩٠)

"لوگو! اپنے رب سے توبہ واستغفار کرو، اس کو منانے کی فکر کرو، اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ، یقین جانو! میرا رب بڑی مہربانی والا اور بہت محبت کرنے والا ہے۔"

ہمارے شاہ صاحب علامہ سید عبدالمجید ندیمؒ کے بقول: "وہ اپنی طرف رجوع

کرنے والوں کو طعنہ بھی نہیں دیتا اور معاف کر دیتا ہے۔'' یقیناً رجوع الی اللہ وہ عمل ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کا آیا ہوا عذاب پلٹ جاتا ہے، جیسا کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے ساتھ یہ معاملہ پہلے ہو چکا ہے، قرآن نے کہا:

﴿ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ۭ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ۝﴾ (یونس: ۹۸)

اگر حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کی سچی توبہ سے اللہ تعالیٰ کا غذاب ٹل سکتا ہے تو ہم تو محبوبِ ربانی ﷺ کے اُمتی ہیں، ہم بھی اگر سچی توبہ کر لیں تو بلا شبہ کورونا کا یہ عذاب اور قہر ہم سے بھی ٹل سکتا ہے۔

ابن کثیرؒ کے بہ قول عباسی خلیفہ المقتدی باللہ کے زمانے میں جب شام، عراق اور حجاز میں سخت طاعون کی وبا پھیلی اور ساتھ ہی گرم ہوا کا تیز طوفان بھی آیا تو بے شمار انسان اور جانور مرنے لگے، درخت جڑوں سے اُکھڑ گئے، ایسا محسوس ہوا کہ قیامت آ گئی، اس وقت لوگوں نے سچی توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے یہ عذاب ختم فرما دیا۔

اس وقت کا اہم تقاضا یہی ہے کہ ہم بھی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے سچی توبہ کا اہتمام کریں، کورونا کے خلاف جنگ جیتنے کی رَٹ لگانا چھوڑ دیں، اس کے بجائے سیدھے سیدھے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر اپنی ہار اور عاجزی کا اقرار کرتے ہوئے کہیں کہ یا اللہ! ہم کمزور بندے ہار گئے، ہم پر رحم فرما دیجیے، یقین ہے کہ وہ ہمیں مایوس و محروم نہیں کرے گا۔

(۲) کورونا سے حفاظت کی دوسری حقیقی تدبیر اہتمامِ اعمالِ صالحہ اور بالخصوص صدقہ ہے، جیسا کہ عرض کیا گیا کہ کورونا کا قہر یہ کبائر کا اثر ہے، جس کے لیے اہتمامِ رجوع الی اللہ اور سچی توبہ کی ضرورت ہے۔ ایک طرف ہماری بد عملی کے سبب اللہ تعالیٰ ناراض ہیں، کورونا کی شکل میں یہ وبائی بیماری اس کا نتیجہ ہے، تو دوسری طرف تقریباً ساری دنیا میں لاک ڈاؤن نافذ کر دیا گیا ہے، جس سے بے شمار لوگ بے کار بن کر رہ گئے، بالخصوص غریب اور

مزدور طبقہ بہت سخت حالات سے دوچار ہے، ایسی صورت میں اخلاص کے ساتھ اپنی حیثیت کے مطابق اعمالِ صالحہ کے علاوہ صدقہ کا اہتمام کرنا اس کا بہترین حل ہے، کیوں کہ صدقہ سے جہاں غریبوں کا بھلا ہوتا ہے وہاں اس سے اللہ پاک کا غضب بھی دور ہو جاتا ہے۔ نیز صدقہ کرنے والا بری موت سے محفوظ رہتا ہے۔

عَنْ أَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ وَ تَدْفَعُ مِيْتَةَ السُّوْءِ." (رواه الترمذی، مشکوٰۃ: ۱۶۸، باب فضل الصدقة)

اہل خیر حضرات اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے آگے بڑھیں، خصوصاً وہ حضرات جو ہر سال رمضان حرمین شریفین میں گزارتے ہیں، اگر امسال وہ اتنے پیسے اپنے رشتہ داروں اور ضرورت مندوں پر خرچ کر دیں تو بلا شبہ اخلاص کے ساتھ خرچ کرنے پر حق تعالیٰ حرمین شریفین میں رمضان گزارنے سے زیادہ اجر و ثواب سے نوازیں گے۔

ایک واقعہ:

حضرت شیخ رحمہ اللہ نے ایک واقعہ نقل فرمایا ہے کہ حضرت ربیع بن سلیمانؒ اپنے بھائی اور ایک قافلے کے ہمراہ حج کے لیے روانہ ہوئے، جب کوفہ پہنچے تو ربیع بن سلیمانؒ ضروریات کا سامان خریدنے کے لیے بازار گئے، قریب میں ایک ویران سی جگہ میں کسی پردہ نشین خاتون کو دیکھا کہ اس نے ایک مردہ خچر سے گوشت کے چند ٹکڑے کاٹے اور زنبیل میں رکھ کر لے جانے لگی، ربیع بن سلیمانؒ تفتیش کے لیے اس کے پیچھے ہو لیے، وہ عورت ایک پرانے سے مکان میں داخل ہوئی اور دروازہ بند کر لیا۔

ربیع بن سلیمانؒ فرماتے ہیں کہ میں نے چھپ کر دیکھا تو اس عورت نے اپنی بچیوں کے سامنے مرے ہوئے خچر کے گوشت کو روتے ہوئے پیش کیا اور کہا کہ ابھی اسی سے کام چلا کر اپنی بھوک مٹا لو، اسی وقت حضرت ربیع بن سلیمانؒ نے آواز دے کر مردار گوشت پکانے سے منع کیا، تو اس خاتون نے پس پردہ اپنا دکھڑا سنایا کہ میں خاندانِ نبوت کی ایک بیوہ ہوں

اور میری چار یتیم بچیاں ہیں، غربت اور فقر و فاقہ نے ہمیں اس حالت پر مجبور کر دیا۔ سن کر حضرت ربیع بن سلیمانؒ رونے لگے اور انہیں تھوڑی دیر انتظار کرنے کو کہہ کر اپنے قافلے کے پاس آئے اور اپنے بھائی اور اہل قافلہ سے فرمایا کہ تم لوگ جا سکتے ہو، اِس وقت میرا حج کا ارادہ نہیں، قافلے والے حیران ہوگئے، بھائی نے بہت سمجھایا، فضائل حج سنائے، لیکن وہ اپنے ارادے پر قائم رہے، اپنا سامان لے کر علاحدہ ہوگئے۔ آپ کے پاس سفرِ حج کے لیے چھ سو درہم تھے، ان میں سے سو درہم کا آٹا اور غلہ اور سو درہم کا کپڑا وغیرہ خریدا، بقیہ چار سو درہم سامان میں چھپا کر اس بیوہ کے گھر گئے اور اس کی خدمت میں پیش کر دیا، اس نے دعا دیتے ہوئے کہا: اللہ پاک تمہارے اگلے پچھلے سارے گناہ معاف فرما دیں، تمہیں حج کا ثواب عطا فرمائیں، اپنی جنت میں جگہ عطا فرمائیں اور اس کا نعم البدل عطا فرمائیں۔

اس کے بعد حضرت ربیع بن سلیمانؒ قافلے کی حج سے واپسی تک کوفہ میں مقیم رہے، حج کے بعد جب قافلہ آیا تو آپؒ نے اہل قافلہ کا استقبال کرتے ہوئے مبارک باد پیش کی، لوگوں نے تعجب سے کہا کہ عجیب آدمی ہو، ہمیں مبارک باد پیش کرتے ہو، حالاں کہ آپ خود تو ہمارے ساتھ حج میں شامل تھے، حج کے تمام ارکان ہم نے ساتھ مل کر ادا کیے اور آپ ہمیں حج کی اس طرح مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ گویا آپ نے حج کیا ہی نہیں۔

اسی دوران قافلے میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور ایک تھیلی پیش کرتے ہوئے کہا کہ روضۂ اَقدس کی زیارت کے بعد آپ نے میرے پاس یہ تھیلی بہ طورِ امانت رکھوائی تھی، جو حاضرِ خدمت ہے، اس کی مہر پر لکھا ہوا تھا: ”مَنْ عَامَلَنَا رَبِحَ“. (جو ہمارے ساتھ معاملہ کرتا ہے وہ نفع کماتا ہے) ربیع بن سلیمانؒ کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا، آپؒ نے خاموشی کے ساتھ تھیلی رکھ لی اور بعد نمازِ عشا اپنے معمولات سے فارغ ہو کر سو گئے۔

خواب میں حضور ﷺ کی زیارت ہوئی، سلام کر کے ہاتھ چومے تو حضور ﷺ نے مسکرا کر فرمایا کہ ربیع! آخر ہم کتنے گواہ پیش کریں کہ تم نے حج کیا ہے، بات دراصل یہ ہے

۲۹۵

کہ تم نے خاندانِ نبوت کی بیوہ پر حج کا سارا مال اور روپیہ خرچ کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے اس صدقے کو قبول فرما کر تمہاری صورت کے ایک فرشتے سے حج کروا دیا، تمہیں حج کے ثواب سے بھی نوازا گیا اور چھ سو درہم کے عوض اس مہر بند تھیلی میں چھ سو دینار بھی عطا فرمائے۔

حضرت ربیع بن سلیمانؒ جب بیدار ہوئے تو واقعی اس تھیلی میں چھ سو دینار موجود تھے۔ (مستفاد از: فضائل حج: ۲۲۱ تا ۲۲۳)

واقعی یہ وقت ہے خلوصِ نیت کے ساتھ ضرورت مندوں پر خرچ کرنے کا، کیوں کہ لوک ڈاؤن کے حالات نے کتنے جلتے چولہوں کو بجھا دیا ہے، اس صورت میں اگر اخلاص کے ساتھ صدقے کا اہتمام کیا جائے تو یہ وقت کا تقاضا بھی ہے اور اجرِ عظیم کا ذریعہ بھی۔

(۳) علاوہ ازیں کورونا سے حفاظت کی تیسری حقیقی تدبیر اہتمامِ دعا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اضطرابی کیفیت اور قبولیت کے یقین کے ساتھ دعا کی جائے تو اس سے حق تعالیٰ اپنی تقدیر کے فیصلے تک بدل دیتے ہیں۔ بہ قولِ شاعر:

مایوس نہ ہوں اہل زمیں اپنی خطا سے   تقدیر بھی بدل جاتی ہے مضطر کی دعا سے

حدیث پاک میں ہے:

عَنْ سَلْمَانَ الْفَارِسِيِّؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" لَا يَرُدُّ الْقَضَاءَ إِلَّا الدُّعَاءُ، وَ لَا يَزِيْدُ فِيْ الْعُمُرِ إِلَّا الْبِرُّ." (رواه الترمذي، مشكوٰة : ١٩٥، كتاب الدعوات)

”دعا کے علاوہ کوئی چیز اللہ تعالیٰ کی تقدیر (معلق) کو نہیں ٹال سکتی اور نیکی کے علاوہ کوئی چیز زندگی کو بڑھا نہیں سکتی۔“ (عمر میں برکت ہوگی اور ضائع ہونے سے محفوظ رہے گی)

لہٰذا اس وقت عذابِ الٰہی کے فیصلے کو بدلنے کے لیے مسنون دعاؤں کا اہتمام کرنا چاہیے، منامی وظائف سے مسنون دعائیں بہتر ہیں۔ اور حضور ﷺ کی مسنون دعاؤں میں وبائی امراض سے حفاظت کے لیے مختلف دعائیں منقول ہیں، جن میں سے ایک بہترین دعا یہ ہے، جس کا اہتمام اس وقت بہت مفید ہے:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْبَرَصِ وَ الْجُذَامِ وَ الْجُنُوْنِ وَ مِنْ سَيِّءِ الْأَسْقَامِ." (رواه أبوداود والنسائی، مشکوٰۃ : ۲۱۷)

''اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں کوڑھ، جذام، جنون اور بری بیماریوں سے۔''

اس کے علاوہ ایک اور دعا کا اہتمام اچانک آنے والے عذابِ الٰہی سے حفاظت کا سبب ہے، وہ یہ ہے:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ زَوَالِ نِعْمَتِكَ وَ تَحَوُّلِ عَافِيَتِكَ وَ فُجَاءَةِ نِقْمَتِكَ وَ جَمِيْعِ سَخَطِكَ." (رواه مسلم، مشکوٰۃ : ۲۱۶)

''اے اللہ! میں تیری رحمت کے ختم ہونے سے اور تیری عافیت کے بدل جانے سے (یعنی صحت کے بدلے بیماری اور غنا کے بدلے محتاجی وغیرہ) اور تیرے اچانک کے عذاب اور تمام غضب اور غصے والے کاموں سے پناہ چاہتا ہوں۔''

ہر قسم کے امراض سے عافیت طلب کرنے کے لیے صبح وشام تین مرتبہ اس دعا کا اہتمام کرنا چاہیے:

"اَللّٰهُمَّ عَافِنِیْ فِیْ بَدَنِیْ، اَللّٰهُمَّ عَافِنِیْ فِیْ سَمْعِیْ، اَللّٰهُمَّ عَافِنِیْ فِیْ بَصَرِیْ، لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ." (رواه أبوداود، مشکوٰۃ : ۲۱۲)

''اے اللہ! میرے بدن میں، میری شنوائی میں اور میری بینائی میں عافیت عطا فرمایئے۔ آپ کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔''

نیز آسمانی اور زمینی آفات و امراض اور کسی بھی قسم کے وائرس سے حفاظت کے لیے صبح وشام یہ دعا تین مرتبہ پڑھے:

"بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَا يَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ شَيْءٌ فِی الْأَرْضِ وَ لَا فِی السَّمَاءِ، وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ." (رواه الترمذی، مشکوٰۃ : ۲۰۹)

''میں نے اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ صبح اور شام کی، اس کے نام کی برکت سے

کوئی چیز زمین وآسمان میں نقصان نہیں پہنچا سکتی، اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔''

اسی کے ساتھ ان دنوں چلتے پھرتے بہ کثرت وہ دعا پڑھے جو حضور ﷺ پریشان کن اوقات میں پڑھا کرتے تھے، وہ دعا یہ ہے:

"يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ أَسْتَغِيْثُ." (رواه الترمذی، مشکوٰۃ : ۲۱۶)

''اے حی، اے قیوم! میں تیری رحمت ہی سے مدد طلب کرتا ہوں۔''

علاوہ ازیں اگر کسی کو وبائی بیماری یا پریشانی میں مبتلا دیکھے تو آہستہ سے یہ دعا پڑھے:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ عَافَانِیْ مِمَّا ابْتَلَاكَ، وَ فَضَّلَنِیْ عَلٰی كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِيْلًا." (رواه الترمذی، مشکوٰۃ : ۲۱۴)

''تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں، جس نے مجھے اس مصیبت سے بچایا جس میں تجھے مبتلا کیا اور مجھے اپنی بہت سے مخلوقات پر فضیلت دی۔''

اس دعا کی برکت سے اللہ پاک وبائی بیماری اور پریشانی سے بچائیں گے۔

یہ سب کورونا سے حفاظت کی حقیقی تدابیر ہیں، یعنی رجوع الی اللہ، اہتمامِ توبہ، اہتمامِ اعمالِ صالحہ وصدقہ اور اہتمامِ دعا۔

یا الٰہی! یا الٰہی! یا الٰہی! مٹا دے ہمارے گناہوں کی سیاہی
روک لے کورونا کی تباہی، مان گئی دنیا تیری بادشاہی

کورونا سے حفاظت کی احتیاطی تدابیر:

اس کے علاوہ احتیاطی اور حفاظتی تدابیر کا بھی اہتمام کرنا شرعی دائرے میں رہتے ہوئے ضروری ہے۔

(۱) ان میں سب سے پہلی چیز علاج و احتیاط ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے ہی وائرس کے آثار ظاہر ہوں تو فوراً کسی معتبر اور ہمدرد ڈاکٹر سے رجوع کیا جائے اور اپنے مکمل

علاج کی فکر کی جائے۔ حدیث پاک میں ہے کہ کوئی بیماری ایسی نہیں جس کی دوا اللہ تعالیٰ نے پیدا نہیں کی ہو۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: "مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ دَاءً إِلَّا أَنْزَلَ لَهُ شِفَاءً." (رواه البخاری، مشكوٰة : ٣٨٧، كتاب الطب و الرقي)

یہ اور بات ہے کہ بعض بیماریوں کے علاج کی جو دوائیں خلاقِ عالم نے کارخانۂ عالم میں پیدا فرمائیں انسانی تحقیق کی ابھی وہاں تک رسائی نہیں ہوئی، اس اعتبار سے بعض بیماریوں کو لاعلاج کہا جاتا ہے، جیسے یہی کورونا؛ لیکن چوں کہ علاج ہی کا ایک حصہ احتیاط بھی ہے، اس لیے بہ طورِ علاج ماہرین نے جو احتیاطی تدابیر بتائی ہیں انہیں شرعی حدود میں رہتے ہوئے اختیار کرنا اپنی اور دوسروں کی صحت کی حفاظت کے لیے ضروری ہے، اسی احتیاط کے پیشِ نظر حدیث پاک میں حکم ہے کہ جس جگہ طاعون اور وبائی مرض پھیل جائے وہاں مت جاؤ۔

"فَإِذَا سَمِعْتُمْ بِهِ بِأَرْضٍ فَلَا تَقْدَمُوا عَلَيْهِ."

کیوں کہ وہاں جانے کا مطلب اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے، اور قرآن نے اس سے منع فرمایا ہے:

﴿وَ لَا تَقْتُلُوٓا أَنْفُسَكُمْ﴾ (النساء : ٢٩)

"وَ إِذَا وَقَعَ بِأَرْضٍ وَ أَنْتُمْ بِهَا، فَلَا تَخْرُجُوا فِرَارًا مِّنْهُ." (متفق عليه، مشكوٰة : ١٣٥)

لیکن تم جس علاقے میں ہو وہاں اگر یہ بیماری پھیل جائے تو اب وہاں سے بھاگنا گناہِ کبیرہ ہے، کیوں کہ مقدر میں جو لکھ دیا گیا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔

﴿قُلْ لَّنْ يُّصِيبَنَآ إِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا﴾ (التوبة : ٥١)

اور منع اس لیے بھی ہے کہ تم جہاں جاؤ گے ظاہری اسباب کے درجے میں وہاں بھی یہ مرض پھیل سکتا ہے، نیز اگر تم نے اس مرض میں مبتلا ہونے کے خوف سے علاقہ چھوڑ دیا تو وہاں موجود مریض کو کس کے بھروسے چھوڑ کر جاؤ گے؟ حاصل یہ کہ انسان کو ایسے وقت میں

احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

احتیاطی اور حفاظتی تدابیر میں علاج کے علاوہ دو باتیں اور بھی بتائی جاتی ہیں:

(۱)(Home Quarantine) یعنی اپنے گھروں میں رہنا، تو دورِ فتن کا ایک حکم یہی ہے کہ

"فَمَنْ وَجَدَ مَلْجَأً أَوْ مَعَاذًا، فَلْيَعُذْ بِهِ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٤٦٢)

کوئی جائے پناہ اور محفوظ جگہ ہو تو وہاں رہنے کی کوشش کریں، ظاہر ہے کہ گھر سے بہتر اور کونسی جگہ ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں حدیث پاک میں ایک موقع پر رحمت عالم ﷺ نے دینی، دنیوی، ظاہری اور باطنی فتنوں سے نجات کے تین نسخے بیان فرمائے۔ ان میں پہلا نسخہ :"أَمْلِكْ عَلَيْكَ لِسَانَكَ" (اپنی زبان کو کنٹرول میں رکھو)۔

دوسرا نسخہ :"وَلْيَسَعْكَ بَيْتُكَ" (جہاں تک ہو سکے اپنے گھر ہی میں رہو) یعنی دینی اور دنیوی ضرورت کے بغیر باہر نہ نکلو۔ یہ حکم اگر عام حالات میں ہے تو ایمرجنسی اور ہنگامی حالات میں بدرجۂ اولیٰ ضروری ہے۔

اور تیسرا نسخہ بتایا:

"وَ ابْكِ عَلٰى خَطِيئَتِكَ" (رواه الترمذی، مشكوٰة : ٤١٣)

اپنی خطاؤں پر اللہ تعالیٰ کے حضور اظہارِ ندامت کے ساتھ رونا، یہ بھی کورونا کا بہترین علاج ہے۔ صاحبو! کورونا کا رونا ہی کافی نہیں، کبائر پر رونا ضروری ہے، کیوں کہ کبائر کا نقصان کورونا کے نقصان سے زیادہ خطرناک ہے، لہٰذا کورونا سے زیادہ کبائر سے ڈرنا ضروری ہے۔

اس کے علاوہ احتیاطی و حفاظتی تدابیر کے تحت دوسری بات یہ بتائی جاتی ہے کہ (Social Distancing) یعنی رہن سہن میں جسمانی دوری بنائے رکھیں۔ کیوں کہ جس جگہ وبائی بیماری پھیل جاتی ہے وہاں ایک دوسرے سے بے احتیاطی اس بیماری کے

مزید پھیلنے کا سبب بن سکتی ہے، غالباً اسی کے بیانِ جواز کے لیے توکل کے اعلیٰ درجے پر فائز ہونے کے باوجود سید المرسلین جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے جب بنوثقیف کا ایک وفد آیا، جن میں ایک شخص جذام کے مریض تھے، جب انہوں نے بیعت کے لیے ہاتھ بڑھایا تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ میں نے تم سے غائبانہ بیعت کر لی، تم واپس ہو جاؤ۔

"كَانَ فِي وَفْدِ ثَقِيفٍ رَجُلٌ مَجْذُومٌ، فَأَرْسَلَ إِلَيْهِ النَّبِيُّ ﷺ: إِنَّا قَدْ بَايَعْنَاكَ فَارْجِعْ." (رواه مسلم، مشكوٰة : ۳۹۲، باب الفال والطيرة)

نیز آپ ﷺ نے مجذوم سے ایسے بچنے کو فرمایا جس طرح شیر سے بچا جاتا ہے۔

"وَ فِرَّ مِنَ الْمَجْذُومِ كَمَا تَفِرُّ مِنَ الْأَسَدِ." (رواه البخاری، مشكوٰة : ۳۹۱)

ایک روایت میں طاعون (وبائی بیماری) کے متعلق منقول ہے کہ "يَشْتَعِلُ اشْتِعَالَ النَّارِ" (تاریخ طبری) یہ آگ کی طرح پھیلتا ہے، آگ کو پھیلنے کے لیے ایندھن چاہیے، اگر ایندھن نہ ہوگا تو آگ خود بہ خود بجھ جائے گی۔ یہی حال اس وبائی بیماری کا بھی ہے، کورونا نے یہ بات ثابت کر دی، چنانچہ وہ جنگل کی آگ کی طرح ساری دنیا میں پھیل گیا اور اس بیماری کا ایندھن انسان ہے، لہٰذا وبائی علاقے میں ایک شخص دوسرے سے قریب ہوگا تو یہ بیماری مزید پھیل سکتی ہے، قریب نہیں ہوگا تو تحت الاسباب نہیں پھیلے گی، یہ کومن سینس کی بات ہے، اس لیے ان دنوں جہاں یہ کورونا ہے وہاں جسمانی دوری بنائے رکھنا ضروری ہے اور بلاضرورت کسی جگہ جمع ہونے سے بچنا لازم ہے۔

علاوہ ازیں ہاتھ منھ کو صاف ستھرا رکھنے کی ماہرین کی جانب سے تاکید کی جاتی ہے، تو اس کے لیے وضو سے بہتر کون سا عمل ہو سکتا ہے؟ دُنیا کا سب سے سستا اور بہترین سینیٹائزر تو وضو ہے، لہٰذا صرف ہاتھ دھونے کے بجائے سنت کے مطابق مکمل وضو کر لیا کریں، جراثیم کے ساتھ ساتھ گناہ بھی دُھل جائیں گے، زیادہ سے زیادہ باوضو رہنے اور بار بار اچھی طرح سنت کے مطابق ثواب کی نیت سے وضو کا اہتمام کرنا ان شاء اللہ اس وبائی

بیماری سے حفاظت کا سبب ہوگا۔

وبائی مرض میں مبتلا ہونے والا مسلمان شہادت کا مقام حاصل کرتا ہے:

ان حقیقی واحتیاطی تدابیر کے باوجود اگر کوئی مسلمان کورونا کے وبائی مرض میں مبتلا ہو گیا تو اسے مایوس ہونے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں، وہ صبر سے کام لے اور ثواب کی اُمید رکھے، کیوں کہ اس بیماری کے بعد مؤمن کا صحیح سالم ہونا مغفرت ہے، تو موت واقع ہونا شہادت ہے، کفار کی موت ہلاکت ہو سکتی ہے؛ لیکن مؤمن کے لیے کورونا کی موت شہادت ہے۔ حدیث میں ایسے مسلمان کے لیے شہادت کی فضیلت وارد ہوئی ہے، ایسا بندہ شہید حکمی کا مرتبہ اور مقام حاصل کر لیتا ہے۔

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ فِي الطَّاعُونِ: "الْفَارُّ مِنْهُ كَالْفَارِّ يَوْمَ الزَّحْفِ، وَ مَنْ صَبَرَ فِيهِ كَانَ لَهُ أَجْرُ شَهِيدٍ." (رواه الإمام أحمد في مسنده)

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری اور ساری امت کی تمام امراض وآفات اور بلیات سے حفاظت فرمائیں۔ آمین۔

مؤرخہ: ۱۵/شعبان/۱۴۴۱ھ/جمعہ

مطابق: ۱۰/اپریل/۲۰۲۰ء

(بزمِ صدیقی، بڑودا)

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيرًا فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيرًا كَثِيرًا

(۳۳)

قیامت کے ہولناک مناظر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنِ ابۡنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنۡ سَرَّهٗ أَنۡ يَنۡظُرَ إِلٰى يَوۡمِ الۡقِيَامَةِ كَأَنَّهٗ رَأۡيُ عَيۡنٍ فَلۡيَقۡرَأۡ: إِذَا الشَّمۡسُ كُوِّرَتۡ وَ إِذَا السَّمَآءُ انۡفَطَرَتۡ وَ إِذَا السَّمَآءُ انۡشَقَّتۡ." (رواه الترمذی و أحمد، مشكوٰة : ٤٨٤، باب الحشر)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو بھی (صاحب ایمان) قیامت کے (ہولناک) مناظر کو اس طرح دیکھنا پسند کرتا ہو جیسے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو (جس کی چاہت اور مرضی یہ ہو کہ اسے قیامت کے ہولناک مناظر سے ایمان و یقین میں قوت ملے جو بالآخر اس کے لیے خوشی کا سبب بنے گا) اس کو چاہیے کہ (حضورِ دل کے ساتھ غور وفکر کر کے) سورۂ تکویر، انفطار اور انشقاق پڑھے (کیوں کہ یہ سورتیں قیامت کے ہولناک مناظر کو بیان کرتی ہیں، انہیں حضورِ دل اور غور وفکر کے ساتھ پڑھنے سے قیامت کے ہولناک مناظر کا اس طرح مشاہدہ ہوتا ہے گویا اپنی آنکھوں سے وہ سارے مناظر دیکھ رہے ہوں)۔

قیامت برحق ہے:

اللہ رب العزت اس کائنات میں موجود تمام مخلوقات کو جس دن موت کی آغوش میں سلا دیں گے اس دن کو قیامت کہتے ہیں، قیامت درحقیقت عالم موجودات اور کائنات کی موت کا نام ہے، اور جس طرح موت برحق ہے، لیکن اس کا صحیح وقت اللہ پاک کے علاوہ کسی کو نہیں معلوم، اسی طرح قیامت بھی برحق ہے، جس کا منکر کافر ہے۔ اور اس کا صحیح، حقیقی اور یقینی وقت بھی اللہ پاک کے علاوہ کسی کو نہیں معلوم۔

قرآن پاک میں ہے کہ جب کفار ومشرکین نے وقوعِ قیامت کے متعلق شک ظاہر کیا اور حضور ﷺ سے سوال کیا کہ کیا واقعی قیامت قائم ہوگی؟ ﴿وَ يَسۡتَنۡبِـئُوۡنَكَ أَحَقٌّ هُوَ﴾ تو اس وقت حق تعالیٰ نے فرمایا کہ پیارے! آپ قسم کھا کر وقوعِ قیامت کا اعلان کیجیے:

﴿قُلۡ إِيۡ وَ رَبِّيۡۤ إِنَّهٗ لَحَقٌّ﴾ (یونس:۵۳)

دوسرے ایک مقام پر ارشاد ہوا:

﴿قُلۡ بَلٰى وَ رَبِّيۡ لَتَأۡتِيَنَّكُمۡ ۙ عٰلِمِ الۡغَيۡبِ﴾ (سبا: ۳۱)

"محبوبم! آپ کہہ دیجیے مجھے میرے رب کی قسم! جو عالم الغیب ہے، قیامت آکر رہے گی۔"

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿قُلۡ بَلٰى وَ رَبِّيۡ لَتُبۡعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلۡتُمۡ ؕ وَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرٌ۝﴾ (التغابن:۷)

"میرے محبوب! آپ فرما دیجیے! مجھے میرے رب کی قسم! تم (قیامت کے دن) ضرور دوبارہ (مرنے کے بعد) اٹھائے جاؤ گے، پھر جو تم نے کیا اس کی خبر دیے جاؤ گے۔ اور اللہ پر یہ بالکل آسان ہے۔

ابن کثیرؒ کے بقول قرآنِ کریم میں یہ تین مقامات ایسے ہیں جہاں رب العالمین نے رحمۃ للعالمین ﷺ کو وقوعِ قیامت کے برحق ہونے کے متعلق قسم کھا کر اعلان کرنے کا حکم فرمایا۔ البتہ وقوعِ قیامت کا صحیح، حقیقی اور یقینی علم اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو نہیں، قرآنِ کریم میں فرمایا:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ السَّاعَةِ﴾ (لقمان : ٣٤)

''وقوعِ قیامت کا صحیح اور یقینی علم اللہ ہی کو ہے۔''

قیامت کے مختلف نام ہیں:

حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کو وقوعِ قیامت کا مزید یقین دلانے اور اس کی حقیقت اور ہولناک مناظر واحوال سے باخبر کرنے کے لیے قرآنِ کریم میں مختلف ناموں کے ساتھ انداز وعنوان بدل بدل کر بار بار اس کا تذکرہ فرمایا۔ بعض علماء نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں قیامت کے تقریباً سوا لگ الگ ناموں کا ذکر فرمایا ہے، جن میں سے ہر نام سے قیامت کی اصلیت وحقیقت کا پتہ چلتا ہے۔ (مستفاد از: قیامت کے ہولناک مناظر: ۱۲۲، آخرت کے عجیب وغریب حالات: ۱۳۷، اردو ترجمہ البدور السافرۃ فی امور الاخرۃ، مؤلفہ علامہ جلال الدین عبدالرحمٰن سیوطیؒ)

من جملہ ان کے صرف دس نام یہاں قدرے تشریح کے ساتھ ذکر کیے جارہے ہیں۔

(۱) ایک نام تو یہی ہے لفظ قیامت، جس کا مطلب ہے قیام کرنا اور کھڑا ہونا، چوں کہ اس دن تمام مخلوقات اپنی اپنی قبروں سے نکل کر رب العالمین کے سامنے کھڑی ہوں گی اور روحیں اور فرشتے بھی اللہ پاک کے سامنے جتنی دیر اللہ تعالیٰ چاہیں گے صف بستہ کھڑے ہوں گے، اس لیے اس دن کو قرآن نے ''قیامت'' کہا ہے۔ قرآنِ کریم میں اس نام کی مستقل ایک سورت ہے، جس کی پہلی آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿ لَآ اُقۡسِمُ بِيَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ ﴾ (القيامة : ١)

(۲) قیامت کا ایک نام ''الساعۃ'' ہے، فرمایا:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ السَّاعَةِ﴾ (لقمان : ٣٤)

جس کا مطلب ہے ایک گھڑی، ایک لمحہ، اس دن کو ''الساعۃ'' اس لیے کہتے ہیں کہ جب اللہ پاک قیامت قائم کرنا چاہیں گے تو یہ بالکل اچانک ایک ہی گھڑی اور لمحہ میں آجائے گی، اسے قرآن نے اس طرح بیان کیا کہ

﴿ وَ مَآ اَمۡرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمۡحِ الۡبَصَرِ اَوۡ هُوَ اَقۡرَبُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ○﴾ (النحل : ٧٧)

''قیامت کا معاملہ تو ایسا ہی ہے جیسے آنکھ کا جھپکنا؛ بلکہ اس سے بھی قریب، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔''

یعنی قیامت کا معاملہ اتنا تیزی کے ساتھ ہوگا جیسے آنکھ کا جھپکنا؛ بلکہ اس سے بھی جلدی۔

علامہ سیوطیؒ نے قیامت کو ''الساعۃ'' کہنے کی اور بھی وجوہ بیان فرمائی ہیں کہ جب حق تعالیٰ قیامت قائم فرمائیں گے تو تمام مردے اپنی قبروں سے ایک لمحے سے بھی کم عرصے میں نکل کر رب العالمین کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے۔ یا پھر اس لیے کہ اس دن اعمال کے فیصلے ایک گھڑی میں ہوجائیں گے، جیسا کہ حضرت علیؓ سے بھی اس طرح منقول ہے۔

(۳) ایک نام ہے ''نَبَأٌ عَظِیۡمٌ'' ۔ ارشاد ہے:

﴿ عَمَّ يَتَسَآءَلُوۡنَ ○ عَنِ النَّبَاِ الۡعَظِیۡمِ ○﴾ (النبأ : ١-٢)

جس کا مطلب ہے: بہت بڑی خبر۔ واقعہ یہ ہے کہ کائنات کی ابتدا سے انتہا تک روزانہ، ماہانہ وسالانہ پیش آنے والی جتنی خبریں ہیں مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق، سجودِ ملائکہ، دخولِ جنت اور نزول بہ سوئے زمین کی خبریں، ابلیس کے مغرور اور مردود ہونے کی خبریں، قابیل کی درندگی وخون ریزی کی خبریں، حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت، پھر قوم

کے انکار پر عذاب کی خبریں، قومِ عاد پر ریح صرصر کا عذاب، قومِ ثمود پر موت کی وادی میں سلا دینے والی چنگھاڑ، قومِ لوط پر نشان زدہ پتھروں کی بارش، قومِ شعیب پر سائے بان چھانے کے بعد آتش باری، قومِ فرعون وقارون کے عبرت ناک انجام، حضرت ابراہیم واسماعیل، حضرت یعقوب و یوسف اور حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہم السلام کے ابتلاء وآزمائشوں کی خبریں، پھر سید الانبیاء جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت، نبوت اور حیات کے مختلف لمحات کی خبریں، نیز آپ کے بعد قیامت تک کی مختلف بڑی خبروں کو اگر جمع کیا جائے تو ان میں بہت بڑی بلکہ سب سے بڑی خبر وقوعِ قیامت کی ہے، اس لیے قرآن میں اسے ”نَبَأٌ عَظِيْمٌ“ فرمایا ہے۔

(۴) ”الغاشية“۔ قرآن نے کہا:

﴿ هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ﴾ (الغاشية : ۱)

اس کے معنیٰ ہیں چھپانے اور ڈھانکنے والی۔ صاحب روح المعانیؒ فرماتے ہیں کہ قیامت کو ”الغاشية“ اس لیے فرمایا کہ وہ لوگوں پر اپنی سختیوں کے ساتھ چھا جائے گی اور اس کے دل دہلا دینے والے احوال واہوال (یعنی خوف زدہ کر دینے والے حالات) ہر طرف سے گھیر لیں گے۔ (انوار البیان: ۷/۶۰۳)

اور یہ حقیقت ہے کہ جب حالات گھیر لیتے ہیں تو اکثر لوگ اپنی نظریں پھیر لیتے ہیں، یہی ہوگا قیامت کے دن۔

بعض علماء نے قیامت کو ”الغَاشِيَة“ کہنے کی ایک وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ ”الغَاشِيَة“ کے معنیٰ ہیں چھا جانے والی، تو حقیقت بھی یہی ہے کہ قیامت ہر چیز پر چھا جائے گی، کوئی بھی چیز اس کے حصار سے باہر نہیں رہے گی، قیامت زمین وزمان پر چھا جائیگی، کون ومکان پر چھا جائے گی، فضا اور آسمان پر چھا جائے گی، جن وانسان پر چھا جائے گی، ہر ذی نفس حیوان پر چھا جائے گی، ہر خشک وتر اور بے جان پر چھا جائے گی۔

(مستفاد از: ندائے منبر ومحراب: ۴/۳۲۶)

(۵) ”الآزِفَة“۔ یعنی قریب آنے والی، اس سے مراد قیامت ہے۔ ارشاد ہے:

﴿ أَزِفَتِ الْآزِفَةُ﴾ (النجم: ۵۷)

ہم آخری نبی کی آخری امت ہیں، ہمارے بعد قیامت بالکل قریب ہے، قرآنِ کریم نے ایک مقام پر اس حقیقت کو سمجھانے کے لیے قیامت کو لفظ ”غد“ سے تعبیر فرمایا ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ﴾ (الحشر: ۱۸)

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں قیامت کو لفظ ”غد“ سے تعبیر کیا، جس کے معنیٰ ہیں آنے والی کل، اس میں تین چیزوں کی طرف اشارہ ہے، اوّل پوری دنیا کا بمقابلہ آخرت نہایت قلیل ومختصر ہونا ہے، کہ ساری دنیا آخرت کے مقابلے میں ایک دن کی مثال ہے اور حساب کے اعتبار سے تو یہ نسبت ہونا بھی مشکل ہے۔ (کیوں کہ دنیا کی زندگی وعمر تو محدود ہے، جب کہ آخرت کی زندگی وعمر لامحدود ہے)۔

بعض روایات میں وارد ہے: ”الدُّنْيَا يَوْمٌ، وَلَنَا فِيهِ صَوْمٌ“. یعنی ساری دنیا ایک دن کی ہے اور اس دن ہمارا روزہ ہے۔ عاجز کے خیالِ ناقص میں اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح روزے میں روزہ دار مخصوص شرعی پابندیوں کا پابند ہوتا ہے اسی طرح دنیا میں ہم بھی احکامِ شریعت کے پابند ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کی یہ پوری زندگی ”آج“ ہے، اور ”کل“ کا دِن قیامت کا ہے۔

ان حقائق کے پیش نظر بعض عارفین نے فرمایا کہ ”الدُّنْيَا سَاعَةٌ، فَاجْعَلْهَا طَاعَةً“ دنیا کی زندگی ایک ساعت ہے، اسے طاعت والی بنالو، یعنی زندگی کو سراپا بندگی بنالو، تو کامیابی تمہارا مقدر بن جائے گی۔

دوسرا اشارہ یہ ہے کہ جس طرح آج کے بعد کل کا آنا یقینی اور ضروری ہے، اسی طرح دنیا کے بعد قیامت کا آنا بھی یقینی اور ضروری ہے۔

تیسرا اشارہ اس طرف ہے کہ جیسے آج کے بعد کل دور نہیں اسی طرح حضور ﷺ

کی بعثت کے بعد قیامت بھی دور نہیں۔ (مستفاد از: معارف القرآن: ۸/۳۹۰-۳۹۱)

(٦) ”یوم الدین“۔ بدلے (یعنی جزاو سزا) کا دن۔ ارشاد ہے:

﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۝﴾ (الفاتحة : ٤)

اس سے مراد قیامت کا دن ہے۔ دنیا میں بھی ایک حد تک من جانب اللہ جزاو سزا کا سلسلہ جاری رہتا ہے، لیکن اس کا مکمل ظہور قیامت کے دن ہوگا، قرآن نے کہا:

﴿ وَ اتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ إِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۝﴾ (البقرة : ٢٨١)

”اور اس دن سے ڈرو جس میں تم سب اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، اور ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ۝ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ۝﴾ (الزلزال : ٧-٨)

”جس نے ذرّہ برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور ذرّہ برابر بھی برائی کی ہوگی وہ اسے (بھی) دیکھ لے گا۔“

یہاں یہ بتلانا مقصود ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی اپنا ایک وزن رکھتی ہے۔ اور یہی حال بدی کا بھی ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی برائی بھی حساب میں آنے والی چیز ہے، ہمارے شیخ حضرت شیخ الزمان مولانا محمد قمر الزمان مدظلہٗ فرمایا کرتے ہیں کہ کسی چھوٹی نیکی کو معمولی سمجھ کر مت چھوڑو۔ اور چھوٹی سی برائی کو بھی معمولی سمجھ کر مت کرو۔ کیا معلوم کل چھوٹی سی نیکی نجات کا سبب بن جائے اور معمولی برائی ہلاکت کا ذریعہ بن جائے۔ اس لیے آج ہمیں کوئی اچھا کہے نہ کہے، ہم ہمیشہ اچھا کرتے رہیں۔

(۷) ”یوم الحسرة“۔ یعنی حسرت کا دن۔ ارشاد فرمایا:

﴿ وَ اَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ﴾ (مريم : ٣٩)

قیامت کو قرآن نے ”یوم الحسرة“ اس لیے فرمایا کہ اس دن سب ہی لوگ حسرت کریں گے، کیا اچھے اور کیا برے، کیا مؤمن اور کیا کافر، کیا مخلص اور کیا منافق، کیا مرد اور کیا عورتیں۔ اب کفار، فجار اور بدکار لوگوں کی قیامت کے دن حسرت تو سمجھ میں آتی ہے کہ جب انہیں بداعمالیوں کی سزا ملے گی اور وہ اپنے انجامِ بد کو دیکھیں گے تو حسرت کریں گے کہ کاش! انہوں نے برائیاں نہ کی ہوتیں، اور نیکیوں کا اہتمام کیا ہوتا۔ قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ﴾ (الفجر : ٢٤)

”کاش! میں اپنی اِس دائمی زندگی کے لیے کچھ اچھے اعمال آگے بھیج دیتا۔“ جو یہاں نفع دیتے، خود اہل ایمان کا حال یہ ہوگا کہ وہ لوگ جب عمل قلیل پر اجر عظیم کو پائیں گے تو زندگی بھر کی عبادات واعمال کو حقیر وقلیل تصور کریں گے۔

حدیث میں ہے:

”إِنَّ عَبْدًا لَوْ خَرَّ عَلٰى وَجْهِهٖ مِنْ يَوْمِ وُلِدَ إِلٰى أَنْ يَمُوْتَ هَرَمًا فِيْ طَاعَةِ اللّٰهِ، لَحَقَّرَهٗ فِيْ ذٰلِكَ الْيَوْمِ، وَ لَوَدَّ أَنَّهٗ يُرَدُّ إِلَى الدُّنْيَا، كَيْمَا يَزْدَادَ مِنَ الْأَجْرِ وَ الثَّوَابِ.“ (مسند أحمد، مشكوٰة: ٤٥٢)

”اگر کوئی بندہ اپنی ولادت سے وفات تک بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت میں مشغول رہے تو وہ بھی قیامت کے دِن حسرت اور تمنا کرے گا کہ کاش! اس کو دنیا میں پھر بھیج دیا جاتا، تاکہ وہ مزید اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرے اور اجر وثواب کا حق دار بنے، کیوں کہ وہ اپنی زندگی بھر کی بندگی کو بھی حقیر اور معمولی سمجھے گا۔“

(۸) ”یوم التغابن“ یعنی خسارے کا دِن۔ فرمایا:

﴿ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ﴾ (التغابن : ٩)

مفسرین کے بقول یہ لفظ ”غبن“ سے لیا گیا ہے۔ اور غبن نقصان وخسران کو کہتے ہیں۔ قیامت کو یوم التغابن یعنی نقصان اور خسارے کا دن اس لیے کہتے ہیں کہ اس دن سبھی کا

اصلی خسارہ ظاہر ہوجائے گا، کیا مؤمن اور کیا کافر، یہاں بھی کفار کا خسارہ تو ظاہر ہے کہ جب ان کے کفر کی بنیاد پر دائمی دوزخ کا فیصلہ ہوگا تو کہیں گے:

﴿ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ۝﴾ (الحجر : ٢)

کہ کاش وہ بھی مسلمان ہوتے۔ لیکن خود مؤمنین کا بھی یہ حال ہوگا کہ جب ان کے حق میں جنت اور ان کی نعمتوں کا فیصلہ ہوگا تو حسرت کرتے ہوئے کہیں گے کہ کاش! اور زیادہ اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرتے، تاکہ مزید انعام و اکرام سے نوازے جاتے، اسی لیے حدیث میں ہے:

" عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " مَا مِنْ أَحَدٍ يَّمُوْتُ إِلَّا نَدِمَ، قَالُوْا: وَ مَا نَدَامَتُهُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ: إِنْ كَانَ مُحْسِنًا نَدِمَ أَنْ لَا يَكُوْنَ ازْدَادَ، وَ إِنْ كَانَ مُسِيْئًا نَدِمَ أَنْ لَا يَكُوْنَ نَزَعَ."

(رواہ الترمذی، مشکوٰۃ : ٤٨٤ ، باب الحشر)

''ایسا کوئی نہیں جو مرے اور پشیمان نہ ہو، صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! ندامت اور پشیمانی کا سبب کیا ہوتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر وہ نیکوکار رہتا ہے تو اس بات پر پشیمان ہوتا ہے کہ اس نے زیادہ نیکیاں کیوں نہ کیں (یہ چیز اس کے لیے نقصان اور خسران کا سبب ہوگی) اور اگر وہ بدکار رہے تو اپنی بدکاری پر اسے خوب پشیمانی ہوگی۔'' العیاذ باللہ۔

قیامت کے دن انسان کو جن باتوں پر افسوس اور حسرت ہوگی ان باتوں کا تذکرہ قرآنِ پاک میں مختلف جگہوں پر کیا گیا ہے، مثلاً:

(١) ﴿يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا۝﴾ (النبأ : ٤٠)

''اے کاش! میں مٹی ہوتا۔''

کافراں گویند در وقت عذاب ہر یکے یالیتنی کنت تراب

(٢) ﴿يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ﴾ (الفجر : ٢٤)

٣٠٣

''اے کاش! میں نے اپنی (اُخروی) زندگی کے لیے کچھ کیا ہوتا۔''

(٣) ﴿ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ أُوْتَ كِتٰبِيَهْ۝﴾ (الحاقة : ٢٥)

''اے کاش! مجھے میرا نامۂ اعمال نہ دیا جاتا۔''

(٤) ﴿ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا۝﴾ (الفرقان : ٢٨)

''اے کاش! میں فلاں کو دوست نہ بناتا۔''

(٥) ﴿ يٰلَيْتَنَآ أَطَعْنَا اللّٰهَ وَ أَطَعْنَا الرَّسُوْلَا۝﴾ (الأحزاب : ٦٦)

''اے کاش! ہم نے اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کی ہوتی۔''

(٦) ﴿ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا۝﴾ (الفرقان : ٢٧)

''اے کاش! میں رسول کا راستہ اپنالیتا۔''

(٧) ﴿ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَأَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا۝﴾ (النساء : ٧٣)

''اے کاش! میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بہت بڑی کامیابی حاصل کرلیتا۔''

(٨) ﴿ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ أُشْرِكْ بِرَبِّيْ أَحَدًا۝﴾ (الكهف : ٤٢)

''اے کاش! میں نے اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہوتا۔''

(٩) ﴿ يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَ لَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَ نَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۝﴾ (الأنعام : ٢٧)

''اے کاش! کوئی صورت ایسی ہو کہ ہم دنیا میں واپس بھیجے جائیں اور اپنے رب کی نشانیوں کو نہ جھٹلائیں اور ایمان لانے والوں میں شامل ہوں۔''

(٩) "یوم الجمع" یعنی جمع ہونے کا دِن۔ فرمایا:

﴿ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ﴾ (التغابن : ٩)

قیامت کو جمع ہونے کا دِن اس لیے فرمایا کہ اس میں اوّلین و آخرین تمام لوگوں کو میدانِ محشر میں حساب و کتاب اور جزا و سزا کے لیے جمع کیا جائے گا۔ اسی کو فرمایا:

﴿ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ وَ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ۝﴾ (هود : ۱۰۳)

’’وہ وہ دن ہے جس میں سب لوگ جمع کیے جائیں گے اور وہ وہ دن ہے جس میں سب حاضر کیے جائیں گے۔‘‘

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿قُلْ إِنَّ الْأَوَّلِيْنَ وَ الْاٰخِرِيْنَ لَمَجْمُوْعُوْنَ إِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝﴾ (الواقعة : ۴۹)

’’پیارے نبی! آپ فرما دیجیے کہ قیامت کا دن اپنے مقررہ وقت پر ضرور آئے گا جس میں تمام اگلوں اور پچھلوں کو حساب و کتاب کے لیے جمع کیا جائے گا۔‘‘

(۱۰) ’’يَوْمٌ عَسِيْرٌ‘‘ یعنی بڑا سخت (اور ہولناک) دِن۔ فرمایا:

﴿فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ۝﴾ (المدثر : ۹)

واقعۃً قیامت کا دن کافروں، ظالموں اور بدکاروں کے لیے نہایت سخت ہوگا، پھر وہ ایسی سختی نہ ہوگی جس کے بعد نرمی اور آسانی ہو۔ فرمایا:

﴿ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ۝﴾ (المدثر : ۱۰)

حق تعالیٰ نے مثبت و منفی دونوں انداز اختیار فرمائے، ’’یوم عسیر‘‘ اور ’’غیر یسیر‘‘، تاکہ اس کے شدائد و مصائب اور ہولناکی کا احساس ہو، تب ہی تو اس کی اتنی زبردست تیاری کرائی کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء و رُسل علیہم السلام بھیجے، تمام نے آکر اپنی قوموں اور امتوں کو اس کی طرف متوجہ کیا، آسمانی کتابوں اور بالخصوص قرآنِ کریم میں قسمیں کھا کر اس کا برحق ہونا بیان کیا، انداز و عنوان بدل بدل کر اس کی حقیقت اور ہولناک مناظر و احوال کو بیان فرمایا، تاکہ بندے اس دن سے پہلے اس کی تیاری کرلیں۔

قیامت کیسے قائم ہوگی؟

حق تعالیٰ جب قیامت قائم کرنے کا ارادہ فرمائیں گے تب حضرت اسرافیل علیہ السلام کو صور پھونکنے کا حکم فرمائیں گے۔ حضرت اسرافیل علیہ السلام تو جب سے زمین و آسمان کی تخلیق کے بعد حق تعالیٰ نے صور (قدرتی سینگ) بنایا اور ان کے سپرد فرمایا تب ہی سے حکم الٰہی کے منتظر ہیں۔ حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں:

’’ كَيْفَ أَنْعَمُ ؟ وَ صَاحِبُ الصُّوْرِ قَدِ الْتَقَمَهٗ، وَ أَصْغٰى سَمْعَهٗ، وَ حَنٰى جَبْهَتَهٗ، يَنْتَظِرُ مَتٰى يُؤْمَرُ بِالنَّفْخِ، فَقَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَ مَا تَأْمُرُنَا؟ قَالَ: قُوْلُوْا: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ.‘‘ . (رواه الترمذی، مشکوٰۃ : ۴۸۲، باب النفخ فی الصور)

’’میں کیسے آرام اور سکون سے رہوں؟ جب کہ صور پھونکنے والا فرشتہ صور کو منہ میں دبائے ہوئے ہے، اپنا کان لگائے ہوئے ہے اور پیشانی جھکائے ہوئے حکم الٰہی کا منتظر ہے، صحابہؓ نے عرض کیا: پھر آپ ہمیں کیا حکم فرماتے ہیں؟ فرمایا: یہ پڑھا کرو: ’’حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ‘‘، یعنی ہم کو اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔‘‘

اس لیے حکم الٰہی پاتے ہی حضرت اسرافیل علیہ السلام فوراً صور پھونک دیں گے۔ ارشادِ باری ہے:

﴿ فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ﴾ (المدثر : ۸)

پس جب کہ صور میں پھونک ماری جائے گی، ’’ناقور‘‘ کے معنیٰ صور کے ہیں اور ’’نقر‘‘ سے مراد صور میں پھونک مار کر آواز نکالنا ہے۔ حدیث میں ہے:

’’الصُّوْرُ قَرْنٌ يُّنْفَخُ فِيْهِ.‘‘ (ترمذی، مشکوٰۃ : ۴۸۲)

’’صور ایک (قدرتی) سینگ ہے، جس میں (بحکم الٰہی) پھونکا جائے گا۔

دوسری حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جب حضرت اسرافیل علیہ السلام صور پھونکیں گے تو

”عَنۡ يَمِيۡنِهٖ جِبۡرَئِيۡلُ وَ عَنۡ يَسَارِهٖ مِيۡكَائِيۡلُ.“ (أبوداود، مسندأحمد، مشكوٰة : ٤٨٢)

ان کی دائیں جانب حضرت جبرئیل علیہ السلام اور بائیں جانب حضرت میکائیل علیہ السلام ہوں گے۔“

روایتوں میں آتا ہے کہ یہ صور اس وقت پھونکا جائے گا جب دنیا میں سوائے اشرار و بدکار کے کوئی نیکوکار اور اللہ اللہ کہنے والا باقی نہ ہوگا، لوگ غافل ہو کر اپنے گھروں، بازاروں، کھیتوں اور محفلوں میں مست اور مشغول ہوں گے کہ اچانک صور پھونک دیا جائے گا۔

حدیث میں ہے کہ یہ صور جمعہ کے دِن پھونکا جائے گا۔

”وَ فِيۡهَا الصَّعۡقَةُ“ (مسند أحمد، مشكوٰة : ١٢١، باب الجمعة)

اس صور کی آواز کو سب سے پہلے وہ شخص سنے گا جو اپنے اونٹ کے لیے حوض لیپ رہا ہوگا۔

”فَأَوَّلُ مَنۡ يَسۡمَعُهٗ رَجُلٌ يَلُوۡطُ حَوۡضَ إِبِلِهٖ، فَيَصۡعَقُ وَ يَصۡعَقُ النَّاسُ.“ (مسلم، مشكوٰة : ٤٨١)

صورِ اسرافیل علیہ السلام کی آواز اتنی سخت ہوگی کہ زمین ہل جائے گی، زلزلہ آجائے گا، جس سے لوگ گھبرا کر خوف زدہ ہو جائیں گے اور سب لوگ بے ہوش ہونا شروع ہو جائیں گے۔ اسی کو دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ وَ تَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَ مَا هُمۡ بِسُكٰرٰى وَ لٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيۡدٌ ۝﴾ (الحج : ٢)

”اور تجھے لوگ مدہوش دکھائی دیں گے، حالاں کہ درحقیقت وہ مدہوش نہیں ہوں گے؛ لیکن اللہ تعالیٰ کا عذاب بڑا سخت ہے۔“

علاوہ ازیں قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿ وَ يَوۡمَ يُنۡفَخُ فِي الصُّوۡرِ فَفَزِعَ مَنۡ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنۡ فِي الۡأَرۡضِ إِلَّا مَنۡ شَاءَ اللّٰهُ ﴾ (النمل : ٨٧)

”جس دن صور پھونکا جائے گا تو صرف انسان ہی نہیں؛ بلکہ آسمان و زمین کی تمام

مخلوقات گھبرا اُٹھیں گی، مگر جسے اللہ چاہے۔“

اور دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَ نُفِخَ فِي الصُّوۡرِ فَصَعِقَ مَنۡ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنۡ فِي الۡأَرۡضِ إِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰهُ﴾ (الزمر : ٦٨)

”صور میں پھونک ماری جائے گی تو جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں سب بے ہوش ہو جائیں گے، مگر جنہیں اللہ چاہیں۔“

مطلب یہ ہے کہ صور کی سخت آواز سن کر اولاً سب گھبرا جائیں گے، پھر پریشان ہو کر بے ہوش ہو جائیں گے اور بحکمِ الٰہی سب ہی مر جائیں گے، مگر جنہیں اللہ تعالیٰ چاہیں گے وہ نہ گھبرائیں گے، نہ بے ہوش ہوں گے۔ یہ کون لوگ ہوں گے جو حشر کے وقت کی فـــزع (گھبراہٹ) اور ”صـعـق“ (بے ہوشی) سے محفوظ رہیں گے؟ تو بعض علماء نے فرمایا کہ وہ ملائکہ، انبیاء اور شہداء ہیں۔ (صفوۃ التفاسیر)

علماءِ محدثین کے بقول نفخۂ اولیٰ یعنی پہلا صور مسلسل چھ ماہ تک برابر جاری رہے گا، اس سے کائنات کا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور زمین و آسمان کی تمام مخلوق ختم ہو جائے گی، صرف آٹھ چیزیں محفوظ رہ جائیں گی: (۱) عرشِ الٰہی (۲) کرسی (۳) لوحِ محفوظ (۴) قلم (۵) جنت (۶) دوزخ (۷) صور (۸) ارواح۔ (توضیحات: ۷/۵۸۴)

کتاب و سنت کی تشریح کے مطابق بعد میں ان آٹھ چیزوں کو بھی موت آجائے گی اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کوئی باقی نہ رہے گا۔ حق تعالیٰ تین مرتبہ یہ اعلان فرمائیں گے:

﴿ لِمَنِ الۡمُلۡكُ الۡيَوۡمَ ﴾ (المؤمن : ١٦)

”آج کس کی بادشاہی ہے؟“

پھر خود ہی جواب دیں گے:

﴿ لِلّٰهِ الۡوَاحِدِ الۡقَهَّارِ ﴾ (المؤمن : ٦)

”فقط اللہ واحد وقہار کی۔“

قیامت کا پہلا مرحلہ:

طبرانی کی روایت میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کے مطابق زمین کی حالت اس کشتی کی سی ہوگی جو موجوں کے تھپیڑے کھا کر ڈگمگا رہی ہو، یا اس کی حالت لٹکی ہوئی قندیل کی سی ہوگی جس کو ہوا کے جھونکے بری طرح ہلا رہے ہوں، قرآن نے اسی زلزلے کو ''شیئٌ عظیم'' فرمایا:

﴿ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ ۝ ﴾ (الحج : ٢)

اس کے بعد وقوعِ قیامت کا پہلا مرحلہ شروع ہوگا، جس کی مزید تفصیلات مختلف آیات میں مذکور ہیں، مثلاً قرآنِ کریم کی وہ تین سورتیں جن میں قیامت کے ہولناک مناظر کا ذکر ہے، اور جن کے متعلق حدیث میں ہے کہ جو شخص قیامت کے ہولناک مناظر کو اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہو اسے چاہیے کہ وہ سورۂ تکویر، سورۂ انفطار اور سورۂ انشقاق کی غور وفکر کے ساتھ تلاوت کرے۔ ان میں سورۂ تکویر میں قیامت کے ابتدائی چھ مراحل کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ ﴾ (التکویر : ١)

جس طرح سر پر پگڑی کو لپیٹا جاتا ہے اسی طرح صورِ اسرافیل علیہ السلام کے بعد وقوعِ قیامت کے پہلے مرحلے میں سورج کے وجود کو لپیٹ دیا جائے گا، جس سے اس کی روشنی ختم ہوجائے گی اور چمکتا ہوا یہ سورج بے نور ہوجائے گا۔

﴿ وَ إِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ ۝ ﴾ (التکویر : ٢)

''اور جب آسمان کے سارے ستارے ٹوٹ پھوٹ کر منتشر اور بے نور ہو جائیں گے۔''

﴿ وَ إِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝ ﴾ (التکویر : ٣)

''اور جب پہاڑوں کو زمین سے اُکھیڑ کر ہواؤں اور فضاؤں میں (بادلوں کی

طرح) چلا دیا جائے گا۔''

﴿ وَ إِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝ ﴾ (التکویر : ٤)

''اور جب دس ماہ کی حاملہ اونٹنیاں بے کار چھوڑ دی جائیں گی۔''

یہاں قرآنِ کریم نے اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں پہلے کائنات کی عظیم الشان چیزیں جیسے سورج، ستارے اور پہاڑوں کی بے ثباتی بیان کرنے کے بعد محبوب ترین اموال اور چیزوں کی بے وقعتی کو بیان فرمایا کہ صورِ اسرافیل علیہ السلام کے بعد وقوعِ قیامت کے ابتدائی مراحل میں لوگوں پر ایسی نفسی نفسی کی حالت طاری ہوگی جس سے ان کی نظر میں محبوب اور قیمتی اموال کی بھی کوئی وقعت اور حیثیت باقی نہیں رہے گی۔

دوسرے مقام پر اس حقیقت کو ان الفاظ کے ساتھ سمجھایا:

﴿ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ أَرْضَعَتْ ﴾ (الحج : ٢)

اس وقت انسان اپنے قیمتی اموال تو کجا دودھ پلانے والی عورتیں اپنے دودھ پیتے بچے تک کو بھول جائیں گی۔ جب عورتوں کو اپنے حمل اور بچوں تک کی پرواہ نہ ہوگی تو قیمتی اموال کی کہاں پرواہ ہوگی؟ بس ہر ایک پر بہت ہی سخت فکر اور خوف کی کیفیت طاری ہوگی۔

﴿ وَ إِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ ۝ ﴾ التکویر : ٥)

''اور جب وحشی جانور اِکٹھے کیے جائیں گے۔'' مطلب یہ ہے کہ وحشی جانور جو عموماً انسانوں کی بستیوں سے بہت دور جنگلوں میں رہتے ہیں، جہاں ان میں سے بعض بعض کو کھا بھی جاتے ہیں، جیسے شیر ہرن کو کھا لیتا ہے، وغیرہ، مگر جس وقت حضرت اسرافیل علیہ السلام صور پھونکیں گے تو اس کی ہولناک آواز سے صرف انسان ہی نہیں؛ بلکہ جنگل کے تمام جانور بھی اس قدر گھبرا کر اِکٹھے ہو جائیں گے کہ انہیں یہ ہوش بھی نہیں ہوگا کہ ان کے ساتھ دوسرا کون ہے؟

﴿ وَ إِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝ ﴾ (التکویر : ٦)

''اور جب سمندر بھڑکائے جائیں گے۔'' یعنی اس وقت سمندروں میں بھی آگ بھڑک رہی ہوگی، حالانکہ پانی تو آگ بجھانے کا کام کرتا ہے، لیکن جو خدا زمین وآسمان اور پہاڑ جیسی مضبوط چیزوں کو نیست ونابود کرے گا اس کے لیے یہ کوئی مشکل نہیں کہ سمندر کے پانی کو پٹرول اور گیس کی طرح بنا کر اسے آگ لگا دے۔ اور اس دن ایسا ہی ہوگا۔

علماءِ مفسرین کے بقول حق تعالیٰ قیامت کے ابتدائی مراحل میں سورج، چاند اور ستاروں کو بے نور کر کے سمندر میں ڈال دیں گے، پھر اس پر ایک نہایت تیز ہوا (مغرب کی جانب سے) چلائی جائے گی، جس سے سارا سمندر آگ میں تبدیل ہو جائے گا، بعد میں اسی کو جہنم میں شامل کر دیا جائے گا۔ (مستفاد از معارف القرآن: ۶۸۱/۸)

قیامت کا دوسرا مرحلہ:

حدیث میں ہے کہ ان تمام مراحل کے چالیس سال بعد حق تعالیٰ سب سے پہلے حضرت اسرافیل علیہ السلام کو زندہ کریں گے، جو بحکمِ الٰہی دوسری مرتبہ صور پھونکیں گے، جس کے بعد قیامت کا دوسرا مرحلہ شروع ہوگا، قرآن نے کہا:

﴿ ثُمَّ نُفِخَ فِيهِ أُخْرٰى فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ﴾ (الزمر: ٦٨)

پھر اس صور میں دوبارہ پھونک ماری جائے گی تو دفعۃً سب کے سب زندہ ہو کر اپنی اپنی قبروں سے نکل کر میدانِ محشر میں (جو شام میں واقع ہوگا) کھڑے ہو کر چاروں طرف قیامت کے ہولناک مناظر دیکھنے لگیں گے۔ اور وہی دراصل قیامت کا دن ہوگا۔

بعض علماء نے فرمایا کہ نفخۂ ثانیہ کے بعد سب سے پہلے ملائکۂ حاملینِ عرش، پھر حضرت جبرئیل، حضرت میکائیل اور حضرت عزرائیل علیہم السلام اُٹھیں گے، پھر نئے زمین و آسمان اور چاند وسورج کو (از سرِ نو) پیدا کیا جائے گا۔ (عمدۃ الفقہ: ۴۶/۱)

اس کا اشارہ اس آیت کریمہ میں ہے:

﴿ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ

الْقَهَّارِ ﴾ (إبراهيم: ٤٨)

''جس دن زمین وآسمان بدل دیے جائیں گے اور سب لوگ اللہ واحد قہار کے سامنے کھڑے ہوں گے۔''

حدیث میں ہے کہ از سرِ نو انسانوں کی پیدائش کا سلسلہ اس طرح جاری ہوگا:

'' ثُمَّ يُنْزِلُ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً، فَيَنْبُتُوْنَ كَمَا يَنْبُتُ الْبَقْلُ''. (متفق عليه، مشكوٰة: ٤٨١)

''اس کے بعد اللہ پاک آسمان سے بارش برسائیں گے، جس سے لوگ اس طرح اُگیں گے جس طرح سبزہ اُگتا ہے۔'' یعنی تمام لوگ اپنی اپنی قبروں سے زندہ ہو کر اُٹھنا شروع کر دیں گے، جس کو قرآن نے اس طرح بیان کیا:

﴿ وَ إِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ﴾ (التكوير: ٧)

''اور جب جانیں اپنے جسموں سے ملا دی جائیں گی۔''

اس کے کئی مفہوم مفسرین نے بیان فرمائے ہیں: ایک یہ کہ روحوں کو جسموں سے جوڑ کر انہیں دوبارہ اپنی قبروں سے زندہ اُٹھایا جائے گا۔ (قرطبی)

حدیث پاک میں انسانوں کو زندہ کیے جانے کی تفصیل اس طرح منقول ہے کہ پہلے ریڑھ کی ہڈی کو پیدا کیا جائے گا، اس کے بعد اجزاءِ انسانی کو اس ہڈی کے ساتھ جوڑ کر گوشت پوست چڑھا کر انسانی شکل وصورت تیار کی جائے گی۔ حدیث میں ہے:

'' وَ لَيْسَ مِنَ الْإِنْسَانِ شَيْءٌ لَا يَبْلٰى، إِلَّا عَظْمًا وَّاحِدًا، وَ هُوَ عَجْبُ الذَّنَبِ، وَ مِنْهُ يُرَكَّبُ الْخَلْقُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ''. (متفق عليه، مشكوٰة: ٤٨٢)

''جسمِ انسانی میں کوئی چیز ایسی نہیں جو بوسیدہ نہ ہوتی ہو، سوائے ایک ہڈی کے، جس کو دُم (اور جڑ) کہتے ہیں (یہ ہڈی پشت کے آخر میں دونوں سرین کے درمیان ہوتی ہے) قیامت کے دن ہر جاندار کو اسی ہڈی سے جوڑ کر مرکب (اور تیار) کیا جائے گا۔''

گویا جو حیثیت ہوائی جہاز میں ’’بلیک باکس‘‘(Black Box) کی ہے وہ حیثیت جسم انسانی میں عجب الذنب یعنی دُمچی کی ہڈی کی ہے، حق تعالیٰ انسان کے مرنے کے بعد بھی اسے باقی رکھتے ہیں۔

اس کے بعد جب نفخۂ ثانیہ پھونکا جائے گا تو تمام روحیں اپنے جسموں میں چلی جائیں گی، پھر آسمانی بارش کے بعد انہیں دوبارہ اپنی قبروں سے زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔

عمدۃ الفقہ (۱/۴۳) میں ہے کہ سب سے پہلے رحمت دو عالم ﷺ اپنی قبر اطہر سے اس طرح باہر تشریف لائیں گے کہ آپ کے داہنے ہاتھ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہاتھ ہوگا اور بائیں ہاتھ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ہاتھ ہوگا، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دیگر حضرات انبیاء و رُسل علیہم السلام، پھر امت مسلمہ کے صدیقین، شہداء، صالحین اور درجہ بہ درجہ مؤمنین اپنی اپنی قبروں سے یہ کہتے ہوئے اٹھیں گے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ﴾ (فاطر: ٣٤)

’’اللہ کا شکر ہے جس نے ہم سے غم کو دور کر دیا، بے شک ہمارا رب بڑا بخشنے والا اور بڑا قدر دان ہے۔‘‘ (مظہری بہ حوالہ طبرانی عن ابن عمرؓ، مستفاد از معارف القرآن: ۷/۳۵۰)

پھر کفار و فجار یہ کہتے ہوئے اُٹھیں گے:

’’ يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا﴾ (یٰس: ٥٢)

’’ہائے ہماری کم بختی و کم نصیبی، کس نے ہمیں ہماری قبروں سے اُٹھا دیا؟‘‘

جواب میں فرشتے یا اہل ایمان یا پھر جب انہیں اصل معاملے کی حقیقت سمجھ میں آ جائے گی تو وہ خود اپنے آپ سے کہیں گے:

﴿هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَ صَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ﴾ (یٰس: ٥٢)

’’ارے یہ تو وہی دن ہے جس کا رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں نے اس کی سچی خبر دی تھی۔‘‘

اس کے بعد ہر ایک کو اپنی جماعت کے ساتھ جمع کر دیا جائے گا، یعنی نیکوں کو نیکوں کے ساتھ اور بروں کو بروں کے ساتھ۔ چنانچہ آیت کریمہ ﴿وَ اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ﴾ (التکویر: ۷) کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ ہر انسان کو اس کے ہم مذہب یا ہم عمل کے ساتھ جمع کر دیا جائے گا۔ اور اسی کو ﴿وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ﴾ (یٰس: ٥٩) میں فرمایا۔

قیامت کی ہولناکی کا عالم:

اس وقت ہولناکی کا عالم یہ ہوگا کہ ہر شخص اپنی قبر سے بالکل برہنہ غیر مختون اُٹھے گا؛ مگر خوف و دہشت کے سبب کوئی دوسرے کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا، اگر دیکھے گا بھی تو اس کا دل بچے کی طرح شہوت سے خالی لیکن بڑے کی طرح خوف و فکر سے بھرا ہوا ہوگا۔ حدیث میں وارد ہے:

’’ اِنَّكُمْ مَحْشُوْرُوْنَ حُفَاةً عُرَاةً غُرْلًا، ثُمَّ قَرَأَ: ﴿كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ﴾ (الأنبياء: ١٠٤) (متفق عليه، مشكوٰة: ٤٨٣)

’’تم لوگ برہنہ پا، برہنہ جسم اور بغیر ختنہ کے (اس طرح اپنی قبروں سے اٹھا کر میدانِ محشر میں) جمع کیے جاؤ گے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: جس طرح ہم نے پہلی بار پیدا فرمایا تھا اسی طرح ہم دو بارہ پیدا کریں گے، یہ ہمارے ذمہ وعدہ ہے، جسے ہم کر کے رہیں گے۔‘‘ حضور ﷺ نے جب یہ بات ارشاد فرمائی تو سیدہ، عفیفہ، طاہرہ عائشہ صدیقہؓ نے دریافت کیا: حضور! تمام مرد و زن کا یہی حال ہوگا، تو کیا وہ ایک دوسرے کو عریاں اور برہنہ دیکھیں گے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا:

’’ يَا عَائِشَةُ! اَلْأَمْرُ أَشَدُّ مِنْ أَنْ يَنْظُرَ بَعْضُهُمْ إِلٰى بَعْضٍ‘‘. (متفق عليه، مشكوٰة: ٤٨٣)

’’اے عائشہ! اس دن کا معاملہ اس قدر سخت اور ہولناک ہوگا کہ کسی کو دوسرے کی طرف دیکھنے کا ہوش ہی نہ ہوگا۔‘‘ (جیسا کہ دنیا میں بھی سخت حالات میں ہوتا ہے)۔

وہاں کی ہولناکی اور نفسی نفسی کا یہ عالم ہوگا کہ کسی کو یہ معلوم نہ ہوگا کہ کون مرد ہے اور کون عورت، کون برہنہ ہے اور کون باپردہ۔

قیامت کے دن سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سفید جنتی لباس پہنایا جائے گا، نمرود نے آپ کو آگ میں ڈالنے سے قبل برہنہ کیا تھا، جس کے بدلے میں حق تعالیٰ انہیں قیامت کے دن سب سے پہلے لباس پہنائیں گے۔ حدیث میں ہے:

"أَوَّلُ مَنْ يُكْسٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِبْرَاهِيْمُ". (متفق عليه، مشكوٰة : ۴۸۳)

ان کے بعد حضور ﷺ کو، پھر حضراتِ انبیاء و رُسل علیہم السلام، ان کے بعد مؤذنین اور مؤمنین کو۔ (مستفاد از: عمدۃ الفقہ: ۱/۴۴)

اس کے بعد ہر ایک کو من جانب اللہ میدانِ حشر کی طرف لایا جائے گا، جس کی تین شکلیں ہوں گی: (۱) حضراتِ انبیاء و رُسل علیہم السلام اور مؤمنین کاملین کو تو بہترین قسم کی حسب درجہ عمدہ سواریوں پر سوار کر کے لایا جائے گا۔ (۲) گناہ گار مسلمانوں کو پیدل لایا جائے گا۔ (۳) اور کفار و فجار منہ کے بل گھسیٹ کر لائے جائیں گے۔ حدیث میں ہے:

"يُحْشَرُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثَلَاثَةَ أَصْنَافٍ، صِنْفًا مُشَاةً، وَ صِنْفًا رُكْبَانًا، وَ صِنْفًا عَلٰى وُجُوْهِهِمْ، قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَ كَيْفَ يَمْشُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ؟ قَالَ: إِنَّ الَّذِيْ أَمْشَاهُمْ عَلٰى أَقْدَامِهِمْ قَادِرٌ عَلٰى أَنْ يُمْشِيَهُمْ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ، أَمَا إِنَّهُمْ يَتَّقُوْنَ بِوُجُوْهِهِمْ كُلَّ حَدَبٍ وَّ شَوْكٍ". (رواه الترمذي، مشكوٰة : ۴۸۴)

ان مناظر کو قرآن نے بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ

﴿يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ إِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا٥﴾ (مريم : ۸۵)

"جس دن ہم متقین کو اللہ رحمٰن کی طرف بہ طور مہمان (نہایت عزت و احترام کے ساتھ) جمع کریں گے۔"

مفسرین نے فرمایا: جیسے ہی یہ لوگ قبروں سے اُٹھیں گے تو ان کے اعمالِ صالحہ کو

ان کی مرغوب سواریوں میں بدل دیا جائے گا، پھر ان ہی پر ان کو سوار کیا جائے گا۔
(روح المعانی، قرطبی، معارف القرآن: ۶/۵۷)

اس کے برخلاف مجرمین کا حال یہ ہوگا:

﴿وَ نَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ إِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا٥﴾ (مريم: ۸۹)

کہ انہیں جانوروں کی طرح ہانک کر پیاس کی حالت میں جہنم کے گھاٹ پر لے جایا جائے گا۔ العیاذ باللہ العظیم۔

الغرض میدانِ محشر میں جب لوگ اپنے اپنے مقام پر قبروں سے نکل کر جمع ہو جائیں گے تو سورج ان کے بالکل قریب آجائے گا، جس سے لوگوں کی حیرانی، ہولناکی اور پریشانی میں مزید اضافہ ہوگا۔

مگر علامہ سیوطیؒ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے حوالے سے نقل فرمایا ہے کہ اس وقت مؤمنین کاملین اور متقین پر بادل نے سایہ کر رکھا ہوگا۔ (البدور السافرۃ، قیامت کے ہولناک مناظر: ۱۳۵)

لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ ہر شخص اپنے جرائم اور گناہوں کے بقدر پسینے میں ڈوبا ہوگا۔
ارشادِ باری:

﴿يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ٥﴾ (مطففين : ۶)

کے تحت ابن عمرؓ نے حضور ﷺ کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے کہ یہ اس دن ہوگا جب لوگ پسینے میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔ (مستفاد از انوار البیان: ۵/۵۷۵)

حدیث میں وارد ہے:

"تُدْنَى الشَّمْسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنَ الْخَلْقِ حَتّٰى تَكُوْنَ مِنْهُمْ كَمِقْدَارِ مِيْلٍ، فَيَكُوْنُ النَّاسُ عَلٰى قَدْرِ أَعْمَالِهِمْ فِي الْعَرَقِ، فَمِنْهُمْ مَنْ يَكُوْنُ إِلٰى كَعْبِهٖ، وَ مِنْهُمْ مَنْ يَكُوْنُ إِلٰى رُكْبَتَيْهِ، وَ مِنْهُمْ مَنْ يَكُوْنُ إِلٰى حَقْوَيْهِ، وَ مِنْهُمْ مَنْ يُلْجِمُهُ الْعَرَقُ

إِلْجَامًا، وَ أَشَارَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِيَدِهٖ إِلٰى فَمِهٖ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ۴۸۳)

قیامت کے دن سورج کو مخلوق کے قریب کر دیا جائے گا، یہاں تک کہ وہ ان سے ایک میل کے فاصلے پر رہ جائے گا، تو لوگ اپنے اعمال (بد) کے بقدر پسینے میں شرابور ہوں گے (مگر عجیب بات یہ ہوگی کہ ایک کا پسینہ دوسرے کو نہیں لگے گا) چنانچہ ان میں سے بعضوں کا پسینہ ٹخنوں تک، بعضوں کا گھٹنوں تک، بعضوں کا کمر تک اور بعضوں کا منہ تک ہوگا۔ اس وقت اہل ایمان کو پیاس کا احساس ہوگا تو تمام انبیاء اپنی اپنی امتوں کو حوضِ کوثر سے پانی پلائیں گے، حضور ﷺ کا حوض سب سے بڑا ہوگا، جہاں آپ ﷺ اپنی امت کو آثارِ وضو سے پہچان کر آبِ کوثر سے سیراب کریں گے، اس میں سے جو ایک مرتبہ پی لے گا پھر کبھی پیاسا نہ ہوگا۔

"مَنْ يَشْرَبُ مِنْهَا فَلَا يَظْمَأُ أَبَدًا". (متفق عليه، مشكوٰة : ۴۸۷)

رہی بات کفار و فجار کی، تو انہیں نہ صرف محروم رکھا جائے گا؛ بلکہ ان کے چہرے غبار آلود ہوں گے، جس کی طرف آیت قرآنیہ ﴿وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ﴾ (عبس: ۴۰) سے اشارہ ملتا ہے۔

بعض علماء نے فرمایا کہ کفار اس دن لاچار ہو کر مٹی کھانے لگیں گے اور پیاس بجھانے کی غرض سے حوضِ کوثر کی طرف آئیں گے تو محروم کر دیے جائیں گے۔ (آثار قیامت: ۴۷)

یہ دن اپنی سختی اور ہولناکی کے اعتبار سے بعضوں کو ایک ہزار سال کا محسوس ہوگا، جیسے قرآن نے فرمایا:

﴿فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ أَلْفَ سَنَةٍ﴾ (السجدة : ۵)

اور بعضوں کو پچاس ہزار سال کا محسوس ہوگا، جیسے دوسرے ایک مقام پر فرمایا:

﴿فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ أَلْفَ سَنَةٍ﴾ (المعارج : ۴)

البتہ مؤمنین کاملین کے لیے وہ دن اتنا مختصر ہوگا جتنے میں ایک فرض نماز پڑھی جاتی

ہے، جیسا کہ حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت میں ہے کہ حضور ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ قیامت کا پچاس ہزار سال کا دن کس قدر طویل ہوگا؟

"سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ أَلْفَ سَنَةٍ، مَا طُوْلُ هٰذَا الْيَوْمِ؟"

تو آپ ﷺ نے قسم کھا کر فرمایا کہ وہ دن (بہ فضل الٰہی) مؤمن کامل پر اُس فرض نماز سے بھی زیادہ آسان اور مختصر کر دیا جائے گا جس کو وہ ادا کرتا تھا۔

"وَ الَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ إِنَّهٗ لَيُخَفَّفُ عَلَى الْمُؤْمِنِ، حَتّٰى يَكُوْنَ أَهْوَنَ عَلَيْهِ مِنَ الصَّلٰوةِ الْمَكْتُوْبَةِ، يُصَلِّيْهَا فِي الدُّنْيَا". (رواه البيهقي في كتاب البعث و النشور، مشكوٰة : ۴۸۷)

قرآنِ کریم نے اس دن کی سختی اور ہولناکی بیان کرنے کے لیے بہ طورِ مثال فرمایا کہ جس طرح کثرتِ غم و فکر سے انسان بہت جلد بوڑھا ہو جاتا ہے، یہی حال میدانِ محشر میں گنہگاروں اور کفار کا ہوگا، جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا:

﴿يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا﴾ (المزمل : ۱۷)

وہ دن بچوں کو بوڑھا بنا دے گا۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ کنایہ ہے شدت سے، یعنی وہ دن اس قدر سخت ہوگا کہ مصیبت کی وجہ سے بچے بوڑھے ہو جائیں گے۔ اور بعض نے فرمایا کہ چوں کہ وہ دن اس قدر طویل ہوگا کہ واقعۃً بچے بوڑھے ہو جائیں گے جو بچپن میں وفات پا گئے تھے وہ قبروں سے اسی حال میں نکلیں گے، پھر قیامت کے امتداد و اشتداد (طویل اور سخت ہونے) کے سبب بوڑھے ہو جائیں گے۔ (انوار البیان: ۵/۵۰۲)

قیامت کے دن نفسی نفسی کا عالم:

روایتوں میں ہے کہ لوگ قیامت کی سختی اور ہولناکی سے تنگ آ کر نہایت اضطراب اور بے قراری کی حالت میں حضرت آدم علیہ السلام کے پاس جا کر عرض کریں گے کہ آپ اللہ پاک کے حضور سفارش کیجیے کہ باری تعالیٰ ہمیں اس ہولناکی سے نجات عطا فرمائیں،

حضرت آدم علیہ السلام فرمائیں گے: "لَسْتُ هُنَاكُمْ" میں اس مرتبہ ومقام کا اہل نہیں ہوں، انہیں اپنی وہ (اجتہادی) خطا یاد آجائے گی جو شجرۂ ممنوعہ کو کھانے کی وجہ سے سرزد ہوئی تھی، آپ لوگوں کو حضرت نوح علیہ السلام کے پاس جانے کا مشورہ دیں گے، لوگ حضرت نوح علیہ السلام کے پاس آکر سفارش کی درخواست کریں گے، تو آپ بھی وہی بات عرض کریں گے کہ "لَسْتُ هُنَاكُمْ" میں اس کا اہل نہیں ہوں، انہیں اپنی وہ اجتہادی خطا یاد آئے گی جو اپنے مشرک بیٹے کو بچانے کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ سے درخواست کی صورت میں ہوئی تھی، آپ لوگوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جانے کا مشورہ دیں گے، جب لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جا کر درخواست کریں گے تو آپ بھی وہی بات فرمائیں گے کہ "لَسْتُ هُنَاكُمْ" میں حق تعالیٰ کے حضور سفارش نہیں کرسکتا، انہیں اپنے وہ تین جملے یاد آجائیں گے جو آپ نے بہ طورِ توریہ استعمال فرمائے تھے، جن کے ظاہری الفاظ سے ایسا لگتا تھا کہ یہ جھوٹ ہے، اس سے "إِنِّيْ سَقِيْمٌ، بَلْ فَعَلَهُ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا" اور "هٰذِهِ أُخْتِيْ" کی طرف اشارہ ہے۔ آپ لوگوں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جانے کا مشورہ دیں گے۔ جب لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جا کر درخواست کریں گے تو آپ بھی یہی عرض کریں گے کہ "لَسْتُ هُنَاكُمْ" یہ کام میرا نہیں، اس وقت انہیں اپنی وہ خطا یاد آجائے گی جو بلا قصد قبطی کو قتل کرنے کی صورت میں ہوئی تھی۔ آپ مشورہ دیں گے کہ تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ، چنانچہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے اور درخواست کریں گے تو انہیں پھر وہی جواب ملے گا کہ "لَسْتُ هُنَاكُمْ" یہ مقام میرا نہیں، انہیں اس وجہ سے شرم اور ڈر محسوس ہوگا کہ ان کی اُمت نے یا تو انہیں ابن اللہ بنا دیا، یا معبود بنا دیا تھا۔ آپ لوگوں کو سید الاولین والآخرین ﷺ کے پاس جانے کا مشورہ دیں گے:

"اِئْتُوْا مُحَمَّدًا عَبْدًا غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَ مَا تَأَخَّرَ".

تم لوگ حضرت محمد ﷺ کے پاس جاؤ، وہ اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے ہیں جن کے

اگلے پچھلے سارے گناہ اللہ تعالیٰ نے بخش دیے ہیں، اس کے بعد تمام انسانیت نبی رحمت ﷺ کے پاس آئے گی، حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ حق تعالیٰ سے سفارش کی اجازت طلب فرمائیں گے، اجازت ملنے پر آپ ﷺ ایک طویل سجدہ فرمائیں گے۔

"فَأَسْتَأْذِنُ عَلٰى رَبِّيْ فِيْ دَارِهٖ، فَيُؤْذَنُ لِيْ عَلَيْهِ". (متفق عليه، مشكوٰة: ٤٨٨، باب الحوض والشفاعة)

محدثین فرماتے ہیں کہ یہ سجدہ آپ ﷺ مقام محمود میں فرمائیں گے اور اللہ پاک کی عجیب وغریب حمد بیان فرمائیں گے۔ (توضیحات: ۶۱۸/۷)

مسند احمد میں ہے کہ یہ سجدہ دنیا کے دن رات کے حساب سے سات دن اور سات رات کے برابر ہوگا۔ (مظاہر حق جدید: ۱۴۴/۵)

اس کے بعد حکم ہوگا:

"اِرْفَعْ مُحَمَّدُ! وَ قُلْ، تُسْمَعْ، وَ اشْفَعْ، تُشَفَّعْ، وَ سَلْ، تُعْطَهُ". (متفق عليه، مشكوٰة: ٤٨٨، باب الحوض والشفاعة)

"پیارے! سر اُٹھائیے، جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہیے، آپ کی بات سنی جائے گی، آپ شفاعت کیجیے، آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی اور جو چاہتے ہو مانگو، آپ کا سوال پورا کیا جائے گا۔"

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں سر اٹھاؤں گا، پھر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرتے ہوئے شفاعت کی درخواست کروں گا۔ اس طرح شفاعت کبریٰ کا مرحلہ مکمل ہو کر لوگوں کا حساب وکتاب شروع ہوگا، جس کے لیے خود رب العالمین اپنی شان کے مطابق میدانِ محشر میں تشریف لائیں گے، جس کی حقیقت و کیفیت اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ قرآن کہتا ہے:

﴿وَ جَآءَ رَبُّكَ وَ الْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾ (الفجر: ٢٢)

”تیرا رب خود جلوہ افروز ہوگا اور فرشتے قطار در قطار صفیں باندھ کر حاضر ہوں گے۔“

اس وقت کی کیفیت کو دوسری جگہ اس طرح بیان فرمایا گیا:

﴿وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَ وُضِعَ الْكِتٰبُ وَ جِایْٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ قُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ۝﴾ (الزمر: ٦٩)

”اس وقت زمین رب کے نور سے روشن ہو جائے گی اور کتاب رکھ دی جائے گی، یعنی اعمال نامے سامنے آجائیں گے اور نبیوں کو لایا جائے گا، تاکہ وہ اپنی اُمتوں کے بارے میں گواہی دیں اور تاکہ خود ان سے بھی امتوں کے سامنے حق دعوت وتبلیغ کا سوال کیا جائے اور گواہوں کو بھی لایا جائے گا، اس میں تمام فرشتے اعمال نامے لکھنے والے اور انسانوں کے اعضاء وغیرہ سب شامل ہیں۔ اور بندوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا، کسی پر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

اس آیت میں رب العالمین کی عدالت کا منظر دکھایا گیا ہے، جو قیامت کے دن سر محشر سجائی جائے گی، اس میں سب سے پہلے اعمال نامے تقسیم ہوں گے، مؤمنین کو تو سامنے سے دائیں ہاتھ میں دیے جائیں گے، جب کہ کفار کو پیچھے سے بائیں ہاتھ میں دیے جائیں گے، جن کو اعمال نامے دائیں ہاتھ میں ملیں گے ان کا حساب بھی نہایت آسان ہوگا۔ قرآن نے کہا:

﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا۝﴾ (الانشقاق: ٨-٩)

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ جن مؤمنین کے نامۂ اعمال میں استغفار کی کثرت ہوگی انہیں نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیے جائیں گے اور ان کا حساب بھی نہایت آسان ہوگا، کیوں کہ حدیث پاک میں ایسے لوگوں کو خوش خبری دی گئی ہے:

” طُوْبٰى لِمَنْ وَجَدَ فِیْ صَحِیْفَتِهٖ اسْتِغْفَارًا كَثِیْرًا“. (ابن ماجه، مشكوٰة: ٢٠٦)

”مبارک بادی ہے اس بندے کے لیے جس کے نامۂ اعمال میں استغفار بہت

زیادہ موجود ہو۔“ کیوں کہ اسے نامۂ اعمال بھی سیدھے ہاتھ میں دیا جائے گا اور حساب بھی نہایت آسان ہوگا۔

اور ظاہر ہے جن کا نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں ملے گا ان کا حساب بہت سخت ہوگا، وہ ہلاک ہوں گے۔ قرآن نے کہا:

﴿وَ اَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا وَّ یَصْلٰى سَعِیْرًا۝﴾ (الانشقاق: ١٠)

اس کے بعد حساب و کتاب ہوگا، پھر میزانِ عدل قائم کی جائے گی، اس میں صحائف اعمال کو تولا جائے گا، جیسا کہ حدیث بطاقہ سے معلوم ہوتا ہے۔ پھر اسی کے مطابق آگے کے مراحل طے ہوں گے۔ (واللہ اعلم بالصواب)۔

حق تعالیٰ دارین میں ہمارے استحقاق کے بغیر ہمارے ساتھ فضل وکرم کا معاملہ فرمائیں اور دارین کی آفات وبلیات سے ہمیں محفوظ فرمائیں۔ آمین۔

۲۹؍شعبان المعظم؍۱۴۴۱ھ، بروز: جمعہ

مطابق: ۲۴؍اپریل؍۲۰۲۰ء

بزمِ صدیقی، بڑودا

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِیْرًا   فَصَلُّوْا عَلَیْهِ كَثِیْرًا كَثِیْرًا
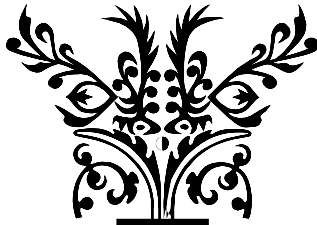
(۳۴)

میزانِ عمل کو وزنی کرنے والے چند مختصر اعمال

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ عَبۡدِاللّٰہِ بۡنِ عَمۡرٍو رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: "اَلتَّسۡبِیۡحُ نِصۡفُ الۡمِیۡزَانِ، وَ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ یَمۡلَؤُہٗ، وَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ لَیۡسَ لَہَا حِجَابٌ دُوۡنَ اللّٰہِ، حَتّٰی تَخۡلُصَ اِلَیۡہِ". (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ: ۲۰۲، باب ثواب التسبیح)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ (ایمان والے کا اخلاص کے ساتھ ایک مرتبہ) ''سبحان اللہ'' کہنا آدھی میزانِ عمل کو بھر دیتا ہے اور ''الحمد للہ'' کہنا پوری میزانِ عمل کو (اجر و ثواب سے) بھر دیتا ہے (یا دونوں کلمے مل کر میزانِ عمل کو اجر و ثواب سے بھر دیتے ہیں) اور ''لا الٰہ الا اللہ'' کے لیے حق تعالیٰ تک (پہنچنے میں) کوئی پردہ حائل نہیں، یہ کلمہ سیدھا حق تعالیٰ تک پہنچ جاتا ہے (بہت جلد قبول ہو جاتا ہے۔ یا پھر یہ مطلب ہے کہ کلمہ ''لا الٰہ الا اللہ'' کہنے کا جو اجر و ثواب ہے اس کا تو

کوئی حساب ہی نہیں)۔ واللہ اعلم۔

اعمالِ صالحہ کی اُخروی جزا عظیم بھی ہے اور بہترین بھی:

اللہ رب العزت نے اپنے وفادار اور مخلص بندوں کو دنیا میں جن اعمالِ صالحہ کا مکلّف بنایا ہے ان کے اصل اجر و ثواب کو آخرت کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے، اگر چہ بندوں کو ان کی نیکی و بدی کی جزا و سزا کسی نہ کسی شکل میں دنیا میں بھی ضرور ملتی ہے، جہاں تک تعلق ہے نیکی پر دنیوی اجر کا، تو حق تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُلۡ یٰعِبَادِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوۡا رَبَّکُمۡ ؕ لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوۡا فِیۡ ہٰذِہِ الدُّنۡیَا حَسَنَۃٌ ؕ﴾ (الزمر: ۱۰)

اسی طرح بدی پر دنیوی سزا کے متعلق ارشاد ہے:

﴿وَ مَاۤ اَصَابَکُمۡ مِّنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ وَ یَعۡفُوۡا عَنۡ کَثِیۡرٍ﴾ (الشوریٰ: ۳۰)

لیکن قرآنِ کریم نے یہ وضاحت فرمادی کہ دنیا میں ملنے والی نیکی کی جزا اور بدی کی سزا نہایت ہی معمولی ہے، خواہ کسی بھی صورت میں ہو، آخرت ہی کی جزا و سزا اصل ہے، فرمایا:

﴿وَ لَعَذَابُ الۡاٰخِرَۃِ اَکۡبَرُ﴾ (الزمر: ۲۶)

''آخرت اور قیامت میں برائیوں پر جو سزا اور عذاب ملنے والا ہے وہ بہت بڑا ہے۔'' اسی طرح:

﴿وَ لَاَجۡرُ الۡاٰخِرَۃِ اَکۡبَرُ﴾ (النحل: ۴۱)

''آخرت میں نیکیوں کا جو بدلہ ملنے والا ہے وہ بھی بہت بڑا ہے۔'' اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے قرآنِ کریم نے دونوں مقام پر فرمایا: ﴿لَوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ﴾ کاش کہ (بے وفا اور غافل) لوگ اس سے باخبر ہو جاتے۔

دوسرے مقام پر حق تعالیٰ نے اموالِ فانیہ کے بجائے اعمالِ صالحہ کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَ الْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ أَمَلًا ﴾ (الكهف : ٤٦)

''اور باقی رہنے والی (مؤمنین مخلصین) کی نیکیاں (جن میں اعمالِ سیئہ سے بچنے کے علاوہ تمام اعمالِ صالحہ کا اہتمام داخل ہے) آپ کے رب کے نزدیک اجر وثواب اور (آئندہ کی) اچھی توقع واُمید کے اعتبار سے بہت ہی بہتر ہے۔''

معلوم ہوا کہ مؤمنین مخلصین کے لیے اعمالِ صالحہ کی اُخروی جزا بہت عظیم بھی ہے اور بہترین بھی۔

اعمالِ صالحہ کا مکمل اجر دنیا میں ممکن ہی نہیں:

کتاب وسنت میں مؤمنین مخلصین کے لیے عمل قلیل پر آخرت میں اجر عظیم کے جو بہترین وعدے فرمائے گئے ہیں ان کی بنیاد پر اس عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس دنیا کو دار العمل اور آخرت کو دار الجزاء اس لیے بنایا ہے کہ مؤمنین مخلصین کے اعمالِ صالحہ کا مکمل اجر وثواب اس دنیا میں ممکن ہی نہیں، اس میں کوئی مبالغہ نہیں، یہ بات مبنی برحقیقت ہے کہ دنیا وہ جگہ ہی نہیں جہاں بظاہر مختصر سے عمل کا اجر بھی سما سکے، اس کے لیے تو آخرت ہی بہتر اور ضروری ہے، کیوں کہ احادیث طیبہ کے بیان کے مطابق مؤمن مخلص کا مختصر سا عمل بھی قیامت میں قائم میزانِ عمل کو بھر دے گا، حالانکہ میزانِ عمل میں ساتوں زمین وآسمان سما سکتے ہیں۔

قیامت میں میزانِ عمل کا قیام:

اس اجمال کی مختصر تشریح یہ ہے کہ قیامت کے دن شفاعت کبریٰ کے بعد بندوں کے سامنے ان کے اعمال نامے پیش کیے جائیں گے، جس سے ہر ایک کو اپنے اچھے برے انجام کا اندازہ ہو جائے گا؛ لیکن اس کے باوجود مزید حساب وکتاب اور عدل وانصاف کے

۳۱۴

لیے حق تعالیٰ میزانِ عدل قائم فرمائیں گے، جیسا کہ قرآن کا فرمان ہے:

﴿ وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ﴾ (الأنبياء : ٤٧)

حالانکہ حق تعالیٰ تو بندوں کے تمام اچھے برے اعمال سے بخوبی واقف ہیں، وہ اگر میزانِ عدل کے بغیر محض اپنے اَزلی، اصلی، حقیقی اور یقینی علم کی بنیاد پر بھی فیصلے صادر فرما دیں تو انہیں حق ہے اور یہ بات کوئی عدل کے خلاف بھی نہیں ہوگی؛ لیکن قیامت میں ایسا اس لیے نہیں کیا جائے گا کہ وہ "یوم الدین" ہے، مکمل انصاف اسی دن ہوگا، اس دن صرف یہی نہیں کہ تمام لوگوں کے ساتھ مکمل انصاف ہوگا؛ بلکہ حق تعالیٰ کی جانب سے اس بات کا بھی اہتمام ہوگا کہ ساری انسانیت ہر ایک کے حساب اور انصاف کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لے، اس کے لیے ایک بہت ہی عظیم الشان انصاف کی ترازو قائم کی جائے گی، جس میں بندوں کے اعمال نامے تولے جائیں گے، پھر اس وزن کے حساب سے ان کے اچھے برے انجام کے فیصلے سنائے جائیں گے، جسے قرآن نے اس طرح بیان فرمایا:

﴿ وَ الْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ ﴾ (الأعراف : ٨)

''اور اس دن وزنِ اعمال کے لیے میزانِ عدل کا قیام برحق ہے۔''

بعض مفسرین نے دوسرا مفہوم یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ اس دن اعمال ناموں کا وزن ہی حق ہوگا، وزن ہی فیصلہ کن ہوگا، یہ اور بات ہے کہ اعمال میں وزن ایمان واخلاص کی بنیاد پر ہی ہوگا، اور بے ایمانوں کے اعمال میں کوئی وزن ہوگا ہی نہیں، اسی طرح ریاکار کے پہاڑ کے مانند اعمال بھی بے حیثیت اور بے وزن ہوں گے۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے، جس میں حضور ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن میزانِ عدل پر ایک فرشتہ مقرر ہوگا۔ (یہ فرشتہ جو میزانِ عمل پر مقرر ہوگا امام قرطبیؒ کے بقول حضرت جبرئیل امین علیہ السلام ہیں۔ معارف القرآن: ۶/۱۹۰) وزنِ اعمال کے لیے اس ترازو کے سامنے انسانوں کو لایا جائے گا، جو آئے گا اسے ترازو کے دونوں پلڑوں کے درمیان کھڑا کر دیا جائے گا۔ اور قرآن کے بیان

کے مطابق حساب وکتاب کے لیے ہر ایک کو اکیلا کسی کے سہارے کے بغیر حاضر کیا جائے گا:

﴿وَ كُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا۝﴾ (مريم : ۹۵)

پھر اگر اس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگا تو فرشتہ اعلان کرے گا، جس کو ساری مخلوق سنے گی:

"سَعِدَ فُلَانٌ سَعَادَةً لَا يَشْقٰى بَعْدَهَا أَبَدًا".

''فلاں شخص کامیاب ہوگیا، اب کبھی وہ ناکام نہ ہوگا۔''

لیکن اگر اس کی نیکیوں کا پلڑا ہلکا ہوگا تب بھی وہ فرشتہ بآوازِ بلند یہ اعلان کرے گا:

" شَقِيَ فُلَانٌ شَقَاوَةً لَا يَسْعَدُ بَعْدَهَا أَبَدًا". (الترغيب و الترهيب: ٤/ ٤٢٥، مسند بزار و البيهقي، انوار البيان)

''فلاں شخص ناکام ہوگیا، اب وہ کبھی کامیاب نہ ہوگا۔''

قرآن نے اس منظر کو اس طرح بیان فرمایا:

﴿فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَأُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا أَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ۝﴾ (الأعراف : ۸-۹)

جس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگا وہ کامیاب ہوگا اور جس کی برائیوں کا پلڑا بھاری ہوگا وہ ناکام ہوگا۔ قرآنِ پاک کی آیات اور احادیث مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمنین مخلصین کی نیکیوں کا پلڑا بلا شبہ نہایت بھاری اور وزنی ہوگا، ان کا عمل قلیل بھی عظیم الشان میزان کو اجر وثواب سے بھر دے گا۔

میزانِ عمل کی وسعت:

جہاں تک تعلق ہے میزانِ عمل کی عظمت و وسعت کا، تو اس کے متعلق آیت کریمہ ﴿و نضع الموازين﴾ کے تحت جمہور مفسرین نے فرمایا کہ یہاں "موازین" جو "میزان" کی

جمع ہے، اس لیے فرمایا کہ وہ بہت بڑی ہے اور بہت سی موازین کا کام دے گی، اس کی عظمت و وسعت کو ظاہر کرنے کے لیے یہاں اس کو جمع کے ساتھ تعبیر فرمایا۔

مزید تفصیلات حدیث پاک میں ہیں:

حضرت سلمانؓ سے روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن میزانِ عمل جو رکھی جائے گی وہ اتنی بڑی ہوگی کہ

" فَلَوْ وُزِنَ فِيْهِ السَّمَاوَاتُ وَ الْأَرْضُ، لَوَسِعَتْ".

اگر اس میں آسمان و زمین کا بھی وزن کیا جائے اور انہیں بھی اس میں رکھ دیا جائے تو سب سما جائیں، فرشتے اس عظیم الشان ترازو کو دیکھ کر کہیں گے کہ یا اللہ! یہ ترازو کس کے اعمال کا وزن کرے گی؟ حق تعالیٰ فرمائیں گے: "لِمَنْ شِئْتُ مِنْ خَلْقِيْ". اپنی مخلوق میں سے جس کے لیے میں چاہوں گا وزن کروں گا، اس پر فرشتے کہیں گے "سُبْحَانَكَ مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ". تیری ذات پاک ہے، ہم نے تیری عبادت کا حق ادا نہیں کیا۔

(الترغيب: ٤/٤٢٥، رواه الحاكم و قال: صحيح على شرط مسلم)
(حدیث قدسی نمبر:۲۲)

مؤمنین مخلصین کا مختصر عمل بھی میزانِ عمل میں وزنی رہے گا:

احادیث مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ جب مؤمنین مخلصین کے اعمالِ صالحہ کو اس عظیم وسیع میزان میں تولا جائے گا تو بظاہر چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی میزانِ عمل کو اجر وثواب سے بھر دے گا۔ یہاں ان میں سے چند اعمال کو بیان کیا جا رہا ہے:

حدیث مذکورہ میں کلمہ ''سبحان اللہ'' کے متعلق فرمایا کہ اس کا اجر "نصف المیزان" یعنی آدھی ترازو کو بھر دے گا۔ اور ''الحمد للہ'' کے متعلق فرمایا کہ یا تو دوسری آدھی کو یا پوری ترازو

کواجر وثواب سے بھر دے گا۔اور کلمہ طیبہ کے متعلق فرمایا کہ اس کا اجر تو بے حساب ہے۔

ایک حدیث قدسی میں چند مختصر کلموں کے فضائل بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ

"سُبْحَانَ اللّٰهِ هِيَ صَلوٰةُ الخَلاَئِقِ، وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ كَلِمَةُ الشُّكْرِ، وَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ كَلِمَةُ الإِخْلاَصِ، وَ اللّٰهُ أَكْبَرُ تَمْلَأُ مَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَ الْأَرْضِ، وَ إِذَا قَالَ الْعَبْدُ : لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ، قَالَ اللّٰهُ تَعَالىٰ: أَسْلَمَ وَ اسْتَسْلَمَ".

(رواه رزين، مشكوٰة : ٢٠٢) (حدیث قدسی نمبر:٢٣)

کلمہ "سبحان اللہ" کائنات کی تمام مخلوقات کی عبادت (اور تسبیح) ہے۔قرآن نے اسی کو بیان فرمایا:

﴿ وَ إِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ﴾ (بنی إسرائيل : ٤٤)

"کائنات کی تمام مخلوقات اپنی زبانِ حال یا زبانِ قال سے اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہیں۔"

شاہ صاحب علامہ سید عبد المجید ندیمؒ فرماتے تھے:

ثنا گو پتہ پتہ ہے خدا یا دم بہ دم تیرا
زمین وآسماں تیرے، ہے موجود وعدم تیرا
زمین میں جو تیرا کھا کر تیرے شکوے کرے یارب!
تعجب ہے کہ اس پر بھی رہے لطف وکرم تیرا

اللہ پاک کی شان ورحمت سے کیا بعید ہے کہ اخلاص کے ساتھ ایک مرتبہ "سبحان اللہ" کہنے پر مؤمن کو تمام مخلوقات کے برابر ثواب عطا فرما دیں۔ نیز حدیث میں ہے کہ "الحمد للہ" شکر کا کلمہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا ہو تو اس کے لیے بہترین اور آسان ترین کلمہ "الحمد للہ" کہنا ہے۔اور "لا الٰہ الا اللہ" کلمہ اخلاص ہے، یعنی اس میں توحید خالص کا بیان ہے۔اور وہ اپنے پڑھنے والے کے لیے جہنم کی آگ سے خلاصی کا سبب ہے۔ اور کلمہ "اللہ اکبر" کا اجر وثواب آسمان وزمین کی درمیانی فضا کو بھر دیتا ہے۔اور جب بندہ

خلوصِ دل کے ساتھ "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" پڑھتا ہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرا بندہ بہت زیادہ فرماں بردار ہو گیا، یعنی اسے من جانب اللہ فرماں برداری کا خطاب اور سرٹیفکٹ مل جاتا ہے۔

دیکھیے! یہ تمام کلمات بظاہر مختصر ہیں؛ لیکن ان کا اجر وثواب نہایت عظیم الشان ہے۔

کلمۂ طیبہ میزانِ عمل کو وزنی کردے گا:

ایک حدیث قدسی میں کلمۂ طیبہ کی عظیم الشان فضیلت کو اس طرح بیان کیا گیا کہ حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے ایک مرتبہ دربارِ الٰہی میں عرض کیا:

"يَا رَبِّ عَلِّمْنِيْ شَيْئًا أَذْكُرُكَ بِهٖ، أَوْ أَدْعُوْكَ بِهٖ".

"میرے رب! مجھے کوئی ایسی چیز (اور کلمہ) سکھا دیجیے جس کے ذریعے میں تجھے یاد کروں، یا تجھ سے دعا مانگوں۔"

اس پر حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"يَا مُوْسٰى! قُلْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ".

"اے موسیٰ! "لا الٰہ الا اللہ" کہا کرو۔" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: "میرے رب! یہ کلمہ تو تیرے تمام موحد بندے کہتے ہیں، پھر میری کیا تخصیص ہوئی؟ میں تو کوئی بہت مخصوص کلمہ (وظیفہ اور ذکر) چاہتا ہوں، تب حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"يَا مُوْسٰى ! لَوْ أَنَّ السَّمَاوَاتِ السَّبْعَ وَ عَامِرَهُنَّ غَيْرِيْ وَ الْأَرْضِيْنَ السَّبْعَ وُضِعْنَ فِيْ كِفَّةٍ، وَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ فِيْ كِفَّةٍ، لَمَالَتْ بِهِنَّ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ". (شرح السنة، مشكوٰة : ٢٠١) (حدیث قدسی نمبر:٢٤)

"اے موسیٰ! اگر ساتوں آسمان اور ان کے تمام مکین (آباد کرنے والے فرشتے) میرے علاوہ اور ساتوں زمین (میزانِ عمل کے) ایک پلڑے میں رکھ دیے جائیں اور "لا الٰہ الا اللہ" کا کلمہ دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے، تو یقیناً "لا الٰہ الا اللہ" والا پلڑا (اجر وثواب

سے بھر کر) جھک جائے گا۔''

یعنی دنیا میں خلوصِ دل کے ساتھ ''لا الٰہ الا اللہ'' کہنا قیامت میں میزانِ عمل کو وزنی بنادے گا اور اجر وثواب سے بھر دے گا۔

کلمۂ شہادت میزانِ عمل کو وزنی کرے گا:

اسی طرح حدیث بطاقہ سے ثابت ہوتا ہے کہ کلمۂ شہادت میزانِ عمل کو وزنی کر دے گا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ قیامت کے دن حضور ﷺ کے ایک اُمتی کو تمام مخلوقات کے سامنے پیش کیا جائے گا، جس کے ننانوے دفتر، رجسٹر اور بنڈل گناہوں سے بھرے ہوئے ہوں گے اور ہر دفتر منتہائے نظر تک پھیلا ہوا ہوگا، حق تعالیٰ اُس بندے سے فرمائیں گے:

''أَتُنْكِرُ مِنْ هٰذَا شَيْئًا؟ أَظَلَمَكَ كَتَبَتِيْ الْحَافِظُوْنَ؟''

''ان رجسٹروں میں جو کچھ لکھا ہوا ہے، کیا تو اس میں سے کسی چیز کا انکار کرتا ہے؟ اور کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ میرے لکھنے والے فرشتوں نے تیرے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے؟ وہ بندہ عرض کرے گا: نہیں، اے میرے رب! حق تعالیٰ فرمائیں گے: ''أَلَكَ عُذْرٌ؟'' کیا تیرے پاس کوئی عذر ہے؟ وہ عرض کرے گا: نہیں، اے میرے رب! تب حق تعالیٰ فرمائیں گے:

''بَلٰى، إِنَّ لَكَ عِنْدَنَا حَسَنَةً، وَ إِنَّهٗ لَا ظُلْمَ عَلَيْكَ الْيَوْمَ، فَتُخْرَجُ بِطَاقَةٌ فِيْهَا: ''أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ''.

''ہاں، ہمارے پاس تیری ایک نیکی ہے اور بلاشبہ آج تجھ پر کوئی ظلم نہیں ہوگا، پھر ایک پرچہ نکالا جائے گا، جس میں کلمۂ شہادت لکھا ہوگا۔'' (جو اس بندے نے پہلی مرتبہ یا کسی اور وقت میں سچی توبہ کے بعد یا پھر آخری وقت میں خلوصِ دل کے ساتھ دنیا میں پڑھا تھا اور وہ قبول ہوگیا تھا) حق تعالیٰ فرمائیں گے: ''أُحْضُرْ وَزْنَكَ''. جاؤ! میزانِ عمل میں اس کا وزن کراؤ، وہ بندہ (احساسِ کم تری کی بنیاد پر) عرض کرے گا: اے میرے رب! اتنے چھوٹے

سے پرچے کو اتنے بڑے اور اتنے زیادہ رجسٹروں کے ساتھ کیا مناسبت ہے؟ حق تعالیٰ فرمائیں گے: تیرے ساتھ ذرّہ برابر بھی ظلم نہ ہوگا (عدل بھی ہوگا اور فضل بھی) حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کے بعد میزانِ عمل میں ان گناہوں کے رجسٹروں کے مقابلے میں کلمۂ شہادت والا پرچہ رکھا جائے گا تو گناہوں کے رجسٹر والا پلڑا ہلکا اور کلمۂ شہادت والا پلڑا وزنی اور بھاری ہوجائے گا کیوں کہ اللہ کا نام سب سے زیادہ وزنی اور بھاری ہے۔

''فَلَا يَثْقُلُ مَعَ اسْمِ اللّٰهِ شَيْءٌ''. (رواه الترمذی و ابن ماجه، مشكوٰة: ٤٨٦، باب الحساب و القصاص والميزان)

دو مختصر کلمے میزانِ عمل کو وزنی کر دیں گے:

اس کے علاوہ بخاری شریف کی آخری اور بڑی مشہور حدیث ہے، جس میں ارشاد ہے:

''كَلِمَتَانِ حَبِيْبَتَانِ إِلَى الرَّحْمٰنِ، خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ، ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ، سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ''. (بخاری: ١١٢٩/٢، مشكوٰة: ٢٠٠)

''دو کلمے رحمٰن کو بہت ہی زیادہ پسند اور زبان سے ادائیگی کے اعتبار سے نہایت آسان لیکن میزانِ عمل میں نہایت وزنی کہ خلوصِ دل کے ساتھ اگر دنیا میں ان کلمات کو پڑھا جائے تو قیامت کے دن میزانِ عمل ان کے اجر سے بھر کر وزنی ہوجائے گی۔ اور وہ کلمے ہیں: سبحان اللہ وبحمدہٖ، سبحان اللہ العظیم۔

اخلاقِ حسنہ سے میزانِ عمل وزنی ہوجائے گی:

اسی طرح حدیث پاک میں ذکر ہے کہ اخلاقِ حسنہ سے بھی میزانِ عمل وزنی ہو جائے گی، اخلاقِ حسنہ سے مراد ان اعمال واوصاف کو اختیار کرنا جن سے خالق بھی راضی ہو جائے اور مخلوق بھی راحت پا جائے، حدیث میں ہے:

''إِنَّ أَثْقَلَ شَيْءٍ يُوْضَعُ فِيْ مِيْزَانِ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ خُلُقٌ حَسَنٌ''.

(رواہ الترمذی و أبوداود، مشکوٰۃ : ۴۳۱)

’’قیامت کے دن مؤمن کے میزانِ عمل میں رکھی جانے والی چیزوں (اور اعمال) میں نہایت وزنی چیز (اور عمل) اخلاقِ حسنہ ہے۔‘‘

واقعہ یہ ہے کہ بہت سے بڑے سے بڑے اعمال کے مقابلے میں بھی حسن اخلاق کا وزن بڑھ جائے گا۔

مسلمان کے جنازے میں شرکت، قربانی اور صدقہ میزانِ عمل کو وزنی کردیں گے:

نیز حدیث پاک میں ہے کہ جب کسی مسلمان کا انتقال ہو جائے تو اس کے جنازے میں شرکت کرنا مؤمن کے میزانِ عمل کو قیامت کے دِن وزنی کردے گا۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

’’مَنِ اتَّبَعَ جَنَازَةَ مُسْلِمٍ إِيْمَانًا وَّ احْتِسَابًا، وَ كَانَ مَعَهٗ حَتّٰى يُصَلّٰى عَلَيْهَا وَ يَفْرُغَ مِنْ دَفْنِهَا، فَإِنَّهٗ يَرْجِعُ مِنَ الْأَجْرِ بِقِيْرَاطَيْنِ، كُلُّ قِيْرَاطٍ مِثْلُ أُحُدٍ، وَ مَنْ صَلّٰى عَلَيْهَا، ثُمَّ رَجَعَ قَبْلَ أَنْ تُدْفَنَ، فَإِنَّهٗ يَرْجِعُ بِقِيْرَاطٍ‘‘. (متفق عليه، مشکوٰۃ : ۱۴۴)

’’جس نے کسی مسلمان کے جنازے میں مؤمن ہونے کی وجہ سے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر شرکت کی، یہاں تک کہ اس کی نمازِ جنازہ بھی پڑھی اور تدفین میں بھی شریک رہا، ایسا شخص دو قیراط اجر وثواب کا مستحق بن جاتا ہے، جن میں سے ہر قیراط کا اجر وثواب (میزانِ عمل میں) اُحد پہاڑ کے برابر (وزنی) ہوگا۔ اور اگر کسی شخص نے صرف نمازِ جنازہ میں شرکت کی تو اسے ایک قیراط کا ثواب ملے گا۔‘‘

اس کے علاوہ قربانی کے جانور کے متعلق روایت میں ہے کہ خلوص کے ساتھ کی گئی قربانی کے جانوروں کا جو کل وزن ہوگا اس کا ستر گنا بڑھا کر میزانِ عمل میں پیش کیا جائے گا۔

’’فَيُوْضَعُ فِيْ مِيْزَانِكَ سَبْعِيْنَ ضِعْفًا‘‘. (الترغيب: حديث : ۳۵۵، بيهقی)

یہ وہ چند مختصر اعمال ہیں جو قیامت کے دن مؤمن کے میزانِ عمل کو وزنی کر دیں گے، بشرطیکہ ان اعمال میں اخلاص ہو، اس لیے کہ اخلاص کے بغیر تو بڑے سے بڑا عمل بھی بے وزن ہوگا۔ اور اخلاص کے ساتھ کیا جانے والا عمل قلیل بھی نہایت وزنی اور اجر عظیم کا سبب ہوگا، چنانچہ حدیث پاک میں ہے کہ جب کوئی بندہ مالِ حلال سے اخلاص کے ساتھ کھجور کے برابر (صورۃً یا قیمۃً) صدقہ کرتا ہے تو اس کا ثواب پہاڑ کے مانند کر دیا جاتا ہے۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ: ۱۶۷) بہر حال کوئی عمل ہو، اخلاص شرط ہے۔

ایک فکر انگیز واقعہ:

اس کے متعلق ”سلسلة القصص من التراث“ میں ایک فکر انگیز واقعہ منقول ہے کہ ابونصر الصیاد نامی ایک شخص اپنی بیوی بچوں کے ساتھ نہایت اِفلاس کی زندگی بسر کر رہا تھا، ایک مرتبہ بھوک سے نڈھال اور غموں سے چور ہو کر گھر سے نکلا تو راستے میں ایک بزرگ احمد مسکین ملے، ان کے سامنے جب اپنا دُکھڑا سنایا تو احمد مسکین نے فرمایا: میرے ساتھ سمندر کے کنارے پر چلو، ہم کچھ کوشش کرتے ہیں۔ سمندر پر پہنچ کر شیخ نے اسے دو رکعات نفل نماز پڑھنے کو کہا، تاکہ اسباب سے پہلے مسبب الاسباب سے رابطہ کیا جائے، نماز سے فارغ ہونے کے بعد اسے ایک جال دیتے ہوئے کہا کہ اللہ کا نام لے کر سمندر میں ڈالو، جب ایسا کیا تو اللہ کی شان! پہلی مرتبہ میں ہی ایک بہت بڑی مچھلی پھنس کر باہر آئی، شیخ نے ابونصر سے کہا کہ اس مچھلی کو بازار جا کر فروخت کرو اور حاصل شدہ آمدنی سے اپنا اور اہل وعیال کا انتظام کرو، ہدایت کے مطابق ابونصر نے مچھلی بیچ کر حاصل ہونے والے پیسوں سے دو پراٹھے خریدے، ایک قیمے والا، دوسرا میٹھا، خوشی خوشی اپنے گھر جا رہا تھا کہ راستے میں بھوک سے نڈھال اور غموں سے چور ایک عورت کو روتے ہوئے دیکھا، جس کے پاس اس کا ایک بے حال بیٹا بھی تھا، ان پر رحم کھا کر دونوں پراٹھے دے دیے، تو عورت کے چہرے پر خوشی اور بیٹے کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی، اس حسن سلوک کے بعد ابونصر ذرا سا آگے بڑھا کہ

ایک منادی کو سنا، جو کہہ رہا تھا کہ کوئی ہے جو مجھے ابونصر سے ملا دے؟ کسی نے ابونصر سے ملوا دیا، تو اس منادی نے کہا کہ تمہارے والد نے آج سے بیس سال پہلے میرے پاس تیس ہزار درہم بہ طورِ امانت رکھوائے تھے، تمہارے والد کی وفات کے بعد میں برابر تمہیں ڈھونڈتا رہا، آج اتفاق سے تم مل گئے، لہٰذا یہ لو،'' آپ کی امانت آپ کے حوالے''۔

ابونصر کہنے لگا: اللہ کی شان! میں تو بیٹھے بٹھائے امیر بن گیا، ان پیسوں سے میں نے اسبابِ ضرورت وسہولت کے علاوہ ذریعہ معاش کا بھی خوب اچھی طرح انتظام کیا، جس سے کچھ دنوں میں میرے مال واسباب میں خوب اضافہ ہوا اور میں امیر کبیر بن گیا؛ لیکن چوں کہ مفلسی وغریبی دیکھ چکا تھا اس لیے غرباء اور مفلسین کی اعانت میں خوب خرچ کرتا اور ذرّہ برابر بخل سے کام نہ لیتا۔

ان ہی دنوں ایک مرتبہ ایک عجیب وغریب خواب دیکھا کہ میدانِ محشر قائم ہے اور میزانِ عمل رکھا ہوا ہے، جس کے پاس مجھے لاکر میری نیکیوں اور برائیوں کو تولا گیا، تو برائیوں کا پلڑا بھاری اور نیکیوں کا پلڑا ہلکا ہوگیا، میں نے نہایت تعجب سے کہا کہ میرے وہ صدقات و خیرات جو میں غرباء کو دیا کرتا تھا کہاں ہیں؟ تو کہا گیا کہ تمہاری خودنمائی وریا کاری نے انہیں بے وزن کردیا، یہ سن کر میں رو پڑا کہ ہائے! اب میری نجات کیسے ہوگی؟ اتنے میں ایک فرشتے نے وہ دو پراٹھے میزانِ عمل میں رکھ دیے جو غریبی میں ایک عورت کو دیے تھے، جس سے نیکیوں کا پلڑا ذرا سا وزنی ہوگیا، میزانِ عمل کے فرشتے نے کہا: اس کے اعمال میں اور کچھ ہے؟ فرشتے نے کہا: ہاں، اس عورت کے آنسو ہیں جنہیں اس کے حسن سلوک نے پوچھا تھا، عورت کے ان آنسوؤں کو میزانِ عمل میں رکھا گیا تو ان کا وزن پہاڑ کے برابر تھا، جس سے نیکیوں کا پلڑا گناہوں کے پلڑے کے برابر ہوگیا، مجھے کچھ اُمید ہونے لگی، اتنے میں پھر فرشتے نے کہا: اور کچھ باقی ہے؟ تو کہا گیا کہ ابھی اس عورت کے بچے کی مسکراہٹ کو پلڑے میں رکھنا باقی ہے، جیسے ہی اس غریب بچے کی مسکراہٹ کو نیکی کے پلڑے میں رکھا تو وہ بھاری ہوگیا اور میری نجات کا اعلان ہوگیا۔

ابونصر نے کہا: اس کے بعد فوراً میری آنکھ کھل گئی، تب مجھے یہ حقیقت سمجھ میں آگئی کہ خلوص کے بغیر میزانِ عمل میں بڑے سے بڑا عمل بھی بے وزن ہوگا۔ جب کہ اخلاص والا مختصر عمل بھی بہت وزن دار ہوگا۔

کون مقبول ہے؟ کون مردود ہے؟   بے خبر! کیا خبر تجھ کو کیا کون ہے؟
جب تلیں گے عمل سب کے میزان میں   تب کھلے گا کہ کھوٹا کھرا کون ہے؟

حق تعالیٰ ہمیں بھی یہ حقیقت سمجھا دیں اور اپنے کرم سے ہمیں مؤمنین مخلصین میں شامل فرما کر دارین کی نجات کو ماہِ مبارک کی برکت اپنے فضل ورحمت سے مقدر فرما دیں۔ آمین یارب العالمین۔

۳؍رمضان المبارک؍۱۴۴۱ھ
مطابق: ۲۷؍اپریل؍۲۰۲۰ء
بروز: پیر (بزمِ صدیقی، بڑودا)

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيرًا   فَصَلُّوا عَلَيْهِ كَثِيرًا كَثِيرًا
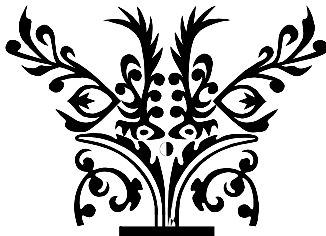
(۳۵)

جہنم کے خوفناک مناظر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ ھُرَیۡرَۃَ رَضِيَ اللّٰہُ عَنۡهُ أَنَّ رَسُوۡلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: " نَارُکُمۡ جُزۡءٌ مِنۡ سَبۡعِیۡنَ جُزۡءًا مِنۡ نَارِ جَھَنَّمَ، قِیۡلَ: یَا رَسُوۡلَ اللّٰہِ ! إِنۡ کَانَتۡ لَکَافِیَۃً، قَالَ: فُضِّلَتۡ عَلَیۡھِنَّ تِسۡعَۃً وَّ سِتِّیۡنَ جُزۡءًا، کُلُّھُنَّ مِثۡلُ حَرِّھَا".

(متفق علیه، مشکوٰۃ : ۵۰۲ / باب صفة النار و أھلھا)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہاری اس دنیا کی آگ جہنم کی آگ کے ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔ (مطلب یہ ہے کہ جہنم کی آگ دنیا کی آگ سے ستر درجہ یعنی بہت ہی زیادہ تیز اور گرم ہے) عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! دنیا کی آگ ہی تو کافی تھی، تب آپ ﷺ نے فرمایا: جہنم کی آگ کو دنیا کی آگ کے مقابلے میں انہتر درجہ بڑھا دیا گیا ہے اور ہر درجے کی حرارت آتش دنیا کی حرارت کے برابر ہے۔''

اَللّٰھُمَّ أَجِرۡنَا مِنَ النَّارِ، بِرَحۡمَتِكَ یَا مُجِیۡبُ یَا غَفَّارُ!

جہنم کیا ہے؟

اللہ رب العزت نے موت کے بعد والی لامحدود زندگی میں باغی اور بے ایمان جن وانس پر کامل قہر وجلال اور غضب وعذاب نازل کرنے کے لیے جو جگہ مخصوص فرمائی ہے اس کا نام جہنم ہے۔ وہاں اللہ پاک کے کامل اور مکمل قہر وجلال اور غضب وعذاب سے جو شدید تکلیف ہوگی اس دنیا میں اس کا صحیح ادراک اور تصور بھی مشکل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دنیا کی بڑی سے بڑی تکلیف جس کا تصور ممکن ہے، وہ جہنم کی چھوٹی سے چھوٹی تکلیف کا ادنیٰ حصہ اور معمولی درجہ ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے دنیا کے بڑے سے بڑے عذاب کو ادنیٰ اور عذابِ آخرت کو اکبر کہا ہے:

﴿وَ لَنُذِیۡقَنَّھُمۡ مِّنَ الۡعَذَابِ الۡأَدۡنٰی دُوۡنَ الۡعَذَابِ الۡأَکۡبَرِ﴾ (السجدۃ : ۲۱)

نیز حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے سب سے زیادہ عیش وآرام میں پلے ہوئے باغی اور بے ایمان کو جہنم میں لمحہ بھر کے لیے داخل کرنے کے بعد دنیا کے عیش وعشرت اور راحت ونعمت کے متعلق سوال کیا جائے گا تو وہ قسم کھا کر انکار کر دے گا:

" لَا وَ اللّٰہِ یَا رَبِّ!". (رواہ مسلم، مشکوٰۃ : ۵۰۲)

یعنی عذابِ جہنم کا ایک لمحہ ساری دنیوی زندگی کی عیش کو بھلا دے گا۔

اَللّٰھُمَّ أَجِرۡنَا مِنَ النَّارِ، بِرَحۡمَتِكَ یَا مُجِیۡرُ یَا غَفَّارُ!

جہنم کہاں واقع ہے؟

حق تعالیٰ نے اپنے تمام بندوں کو جہنم سے بچنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

﴿وَ اتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡ وَقُوۡدُھَا النَّاسُ وَ الۡحِجَارَۃُ أُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ۝﴾ (البقرۃ : ۲٤)

''اس جہنم سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، جو منکروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔''

سوال یہ ہے کہ جہنم سے بچنے کا طریقہ کیا ہے؟ تو اس کے لیے دنیا میں ایمان اور

اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرنا پڑے گا۔ اور یہ کوئی مشکل نہیں، حتیٰ کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمن اخلاص کے ساتھ کھجور کے برابر صدقہ کر کے بھی جہنم سے بچ سکتا ہے۔ ارشاد ہے:

" فَاتَّقُوا النَّارَ، وَ لَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ". (متفق علیه، مشکوٰۃ : ٤٨٥)

قرآنِ کریم کی آیت کریمہ سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ نارِ جہنم کی مرغوب غذا یا تو وہ جسم ہوں گے جن میں کفر وشرک کا مواد بھرا ہوا ہے، یا پھر وہ پتھر ہوں گے جنہیں دنیا میں معبود بنا کر پوجا گیا۔ یہ آگ اپنے اصل رنگ میں ان ہی دو چیزوں سے بھڑکے گی۔

دوسری بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ جہنم کوئی تمثیلی چیز نہیں، جیسا کہ معتزلہ کے علاوہ بعض متجددین اور منکرینِ حدیث سمجھتے ہیں؛ بلکہ وہ ایک زندہ حقیقت ہے، جس طرح جنت متقین کے لیے تیار کی گئی ہے: ﴿أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ (آل عمران: ١٣٣) اسی طرح جہنم: ﴿أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ (البقرۃ: ٢٤) کافرین کے لیے تیار ہے، ان دونوں کا وجود ثابت ہے۔ چنانچہ جہنم کے متعلق منقول ہے کہ وہ اس وقت دنیا کے سمندروں کے تہہ میں واقع ہے، جس کا اشارہ حدیث پاک میں اس طرح ملتا ہے کہ آپ ﷺ نے حج وعمرہ اور جہاد فی سبیل اللہ (یعنی بغیر شدید دینی و دنیوی ضرورت) کے علاوہ سمندر کے سفر سے منع کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ سمندر کے نیچے آگ ہے اور آگ کے نیچے سمندر ہے۔

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" لَا تَرْكَبِ الْبَحْرَ إِلَّا حَاجًّا أَوْ مُعْتَمِرًا أَوْ غَازِيًا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، فَإِنَّ تَحْتَ الْبَحْرِ نَارًا، وَ تَحْتَ النَّارِ بَحْرًا". (رواه أبوداود : ٣٣٧/١، مشکوٰۃ : ٣٣٣، کتاب الجهاد)

تو یہ سمندر کی تہہ میں جو آگ ہے وہ یہی جہنم کی آگ ہے۔ منقول ہے کہ کسی یہودی عالم نے ایک مرتبہ حضرت علیؓ سے سوال کیا کہ جہنم کہاں واقع ہے؟ آپ نے فرمایا: سمندر میں۔ (قرطبی، از: معارف القرآن: ۱۷۹/۸)

علماءِ مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ جس وقت قیامت قائم فرمائیں گے تو

دنیا کے تمام سمندروں کو ایک کر دیا جائے گا، پھر سورج، چاند اور ستاروں کو بے نور کر کے اُنہیں سمندروں میں ڈال دیا جائے گا، جن سے یہ تمام سمندر بھڑک جائیں گے، چنانچہ ارشادِ باری: ﴿وَ الْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ﴾ (الطور: ٦) کا ایک مطلب یہی ہے کہ قسم ہے سمندر کی جو آگ بنا دیا جائے گا۔ اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ (اس وقت سمندروں میں اوپر پانی اور نیچے آگ ہے) قیامت کے روز یہ سارا سمندر ہی آگ بن جائے گا۔ اسی کو دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَ إِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْO﴾ (التکویر : ٦)

یعنی چاروں طرف کے سمندر آگ بن کر میدانِ محشر میں جمع ہونے والے انسانوں کو محیط (اردگرد) ہو جائیں گے۔ حضرت ابن عباسؓ، حضرت علیؓ اور حضرت مجاہد وغیرہ سے یہی تفسیر منقول ہے۔ (معارف القرآن: ۱۷۹/۸)

محشر میں جہنم کا خوفناک منظر:

قیامت کے دن ان ہی ساتوں زمین اور سمندروں کی تہہ میں جہنم کی آگ کو مزید بھڑکا کر نکالا جائے گا اور میدانِ محشر میں بڑی خوفناک کیفیت کے ساتھ لا کر عرشِ الٰہی کی بائیں جانب کھڑا کر دیا جائے گا، جس کے خوفناک منظر کو دیکھ کر ساری انسانیت نفسی نفسی پکار اُٹھے گی۔ (فتح القدیر)

قرآن پاک نے اس منظر کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَ جِايْٓءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ وَ أَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰىO﴾ (الفجر: ٢٣)

اس دن جہنم کو لایا جائے گا۔ کس طرح؟ تو حدیث پاک میں ہے:

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" يُؤْتٰى بِجَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لَهَا سَبْعُوْنَ أَلْفَ زِمَامٍ مَعَ كُلِّ زِمَامٍ سَبْعُوْنَ أَلْفَ مَلَكٍ يَجُرُّوْنَهَا". (رواه مسلم، مشکوٰۃ : ٥٠٢)

اس دن جہنم کو لایا جائے گا تو اس کی ستر ہزار لگامیں ہوں گی اور ہر لگام پر (اسے قابو

میں رکھنے کے لیے) ستر ہزار فرشتے ہوں گے، جو اسے کھینچیں گے، گویا چار ارب نوے کروڑ فرشتے قیامت کے دن جہنم کو قابو میں کیے ہوئے ہوں گے، تاکہ جہنم جوشِ غضب سے کہیں ساری انسانیت کا صفایا نہ کردے۔

حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن جہنم تین قسم کے لوگوں کا سب سے پہلے صفایا کردے گی: (۱) منکرین ومتکبرین (۲) مشرکین (۳) مصورین۔ فرمایا:

عَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "يَخْرُجُ عُنُقٌ مِنَ النَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، لَهَا عَيْنَانِ تُبْصِرَانِ، وَ أُذُنَانِ تَسْمَعَانِ، وَ لِسَانٌ يَنْطِقُ، يَقُوْلُ: إِنِّيْ وُكِّلْتُ بِثَلَاثَةٍ: بِكُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ، وَ كُلِّ مَنْ دَعَا مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا اٰخَرَ، وَ بِالْمُصَوِّرِيْنَ".
(رواه الترمذی، مشکوٰة: ۳۸٦، باب التصاویر)

"قیامت کے دن جہنم سے ایک گردن نکلے گی، یعنی آگ کا ایک شرارہ لمبی گردن کی صورت میں نکلے گا، اس میں دیکھنے والی دو آنکھیں ہوں گی، سننے والے دو کان ہوں گے اور بولنے والی زبان ہوگی، وہ گردن کہے گی کہ میں تین طرح کے لوگوں پر مسلط کر دی گئی ہوں، یعنی اللہ پاک نے مجھے اس بات پر متعین کیا ہے کہ میں تین طرح کے لوگوں کو دوزخ میں کھینچ کر لے جاؤں، ان میں سے ایک تو وہ لوگ ہیں جنھوں نے (محض ضد کی وجہ سے) حق کا انکار کیا، دوسرے وہ لوگ ہیں جنھوں نے اللہ کے ساتھ شرک کیا اور تیسرے وہ لوگ ہیں جو تصویر سازی کیا کرتے تھے۔"

اَللّٰهُمَّ أَجِرْنَا مِنَ النَّارِ، بِرَحْمَتِكَ يَا مُجِيْبُ يَا غَفَّارُ!

جہنم کے سات طبقات کی تفصیلات:

قرآنِ پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن جہنمیوں کے سات الگ الگ گروہ ہوں گے، جنھیں اپنے جرائم کے لحاظ سے جہنم کے مختلف درکات اور طبقات میں داخل کیا جائے گا۔ فرمایا:

﴿لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ﴾ (الحجر: ٤٤)

"جہنم کے سات دروازے (اور طبقے) ہیں، جن میں سے ہر دروازے کے لیے مخصوص مجرمین طے ہوں گے۔ حدیث میں ہے:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: "لِجَهَنَّمَ سَبْعَةُ أَبْوَابٍ، بَابٌ مِنْهَا لِمَنْ سَلَّ السَّيْفَ عَلٰی أُمَّتِيْ". (رواه الترمذی، مشکوٰة: ٣٠٦، باب من لا يضمن من الجنايات)

"جہنم کے سات دروازے ہیں، جن میں سے ایک دروازہ ان لوگوں کے لیے ہے جو میری اُمت (کے مسلمانوں کو ناحق) قتل کرنے کے لیے (نیام سے) تلوار نکالیں گے۔"

حضرت وہب بن منبہؒ فرماتے ہیں کہ جہنم کے ہر دروازے کے درمیان ستر سال کی مسافت کا فاصلہ ہے اور ہر نچلا دروازہ اوپر والے سے شدید ترین گرم ہوگا۔
(التخویف من النار والتعریف بحال دار البوار، ترجمہ جہنم کے خوفناک مناظر: ۱۰۷)

بعض علماء کے بقول آیت کریمہ میں سات دروازوں سے جہنم کے سات طبقات مراد ہیں، چوں کہ ہر طبقے کا دروازہ الگ ہوگا اس لیے اُنھیں "سبعة أبواب" سے تعبیر فرمایا۔

صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ ان میں سے پہلے طبقے میں ان مسلمانوں کو عذاب ہوگا جو کبائر کے مرتکب اور عذاب کے مستحق تھے۔

بعض علماء نے فرمایا کہ انہیں ان کی دنیوی عمر کے بقدر جہنم میں رکھا جائے گا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت یا نبی ﷺ کی شفاعت سے نجات دی جائے گی۔

اس طبقے کا نام "جَهَنَّم" ہے۔ دوسرا طبقہ یہودیوں کے لیے ہے، جس کا نام "لظیٰ" ہے، یعنی شعلے والی آگ۔ قرآن میں ہے:

﴿كَلَّآ إِنَّهَا لَظٰی﴾ (المعارج: ١٥)

تیسرا طبقہ نصاریٰ کے لیے ہے، جس کا نام "حُطَمَة" ہے، یعنی ایسی آگ جو توڑ

پھوڑ کر رکھ دے۔قرآن پاک میں فرمایا:

﴿ كَلَّا لَيُنۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝﴾ (الهمزة : ٤)

چوتھا طبقہ "صَابِئِين" کے لیے ہے (اس سے مراد ستارہ پرست یا باطل پرست یا لا مذہب لوگ ہیں) اس طبقے کا نام "سَعِير" ہے، یعنی بھڑکتی ہوئی آگ۔قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَسُحْقًا لِّأَصْحَابِ السَّعِيرِ ۝﴾ (الملك : ١١)

پانچواں طبقہ مجوس کے لیے ہے، جس کا نام "سَقَر" ہے، یعنی ایسی آگ جو جہنمی کی کھال کو جھلسا کر اسے سیاہ کر دے گی۔فرمایا:

﴿ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝﴾ (مدثر : ٢٦)

چھٹا طبقہ مشرکین کے لیے ہے، جس کا نام "جَحِيم" ہے، یعنی وہ آگ جو انسان کو بھون کر رکھ دے۔فرمایا:

﴿ إِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ۝﴾ (المطففين : ١٦)

اور ساتواں طبقہ منافقین کے لیے ہے، قرآن نے اسے یوں بیان فرمایا:

﴿ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ (النساء : ١٤٥)

''یقیناً منافقین جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں رہیں گے۔'' جس کا نام "هَاوِيَه" ہے، یعنی نہایت گہری کھائی۔فرمایا:

﴿ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ ۝﴾ (القارعة : ٩)

اس کی گہرائی کے متعلق حدیث میں ہے:

" إِنَّ الْحَجَرَ يُلْقٰى مِنْ شَفَةِ جَهَنَّمَ فَيَهْوِي فِيهَا سَبْعِينَ خَرِيفًا لَا يُدْرِكُ لَهَا قَعْرًا". (رواه مسلم، مشكوٰة : ٤٩٧)

''جہنم کے کنارے سے پتھر پھینکا جائے تو وہ ستر سال تک گرتا رہے، پھر بھی اس کی تہہ میں نہ پہنچ سکے۔''

اَللّٰهُمَّ أَجِرْنَا مِنَ النَّارِ بِرَحْمَتِكَ يَا مُجِيبُ يَا غَفَّارُ.

جہنم میں داخلے کا خوفناک منظر:

جن بدبختوں کے متعلق قیامت میں جہنم کا فیصلہ ہوگا ان کی گردنوں میں طوق، ہاتھوں میں زنجیر اور پاؤں میں بیڑیاں پہنا کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔قرآنِ کریم نے اس منظر کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿خُذُوهُ فَغُلُّوهُ﴾ (الحاقة : ٣٠)

(حکم ہوگا) اس باغی اور بے ایمان کو پکڑو، پھر اسے طوق پہنا دو۔بعض روایات میں ہے کہ یہ حکم صادر ہوتے ہی جہنم کے در و دیوار اور ہر چیز مطیع و فرماں بردار نوکروں کی طرح اس کو پکڑنے کے لیے دوڑے گی۔(معارف القرآن)

﴿ ثُمَّ الْجَحِيمَ صَلُّوهُ﴾ (الحاقة : ٣١)

''پھر اسے دوزخ میں ڈال دو۔''

﴿ ثُمَّ فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوهُ﴾ (الحاقة : ٣٢)

''پھر اسے ستر گز زنجیر میں میں جکڑ دو۔'' تاکہ وہ جہنم سے باہر نکلنے کا تصور تک نہ کر سکے۔باغیوں اور بے ایمانوں کو حکم پاتے ہی دوزخ کے فرشتے اس میں پھینک کر جہنم کے دروازوں کو بند کر دیں گے، باغیوں اور بے ایمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد دوزخ میں ڈال دی جائے گی، اس کے بعد حق تعالیٰ چوں کہ جہنم کی پیدائش کے بعد اس سے یہ وعدہ فرما چکے تھے کہ

﴿ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝﴾ (الجسده : ١٣)

''میں ضرور جہنم کو (باغی اور بے ایمان) انسانوں اور جنوں سے بھر دوں گا۔'' اس وعدے کے مطابق حق تعالیٰ جہنم سے پوچھیں گے "هل امتلأتِ؟" "کیا تو بھر چکی؟ تو وہ جواب میں کہے گی: ﴿هل من مزيد﴾ (ق : ٣٠) میں تو اور بھی باغیوں اور بے ایمانوں کو اپنے اندر

لینے کے لیے تیار ہوں۔یعنی ایک بڑی تعداد جہنم میں جانے کے باوجود اس میں اتنی وسعت ہوگی کہ وہ خالی رہ جائے گی اور مزید کا مطالبہ کرے گی۔تو حدیث میں آتا ہے:

"حَتّٰی یَضَعَ رَبُّ الْعِزَّةِ فِیْهَا قَدَمَهٗ". (متفق علیه، مشکوٰة : ۵۰۵)

حق تعالیٰ اس میں (اپنی شان کے مطابق) اپنا قدم رکھ دیں گے تو وہ کہے گی: بس، بس، تیری عزت وکرم کی قسم۔اس کے بعد جہنم زیادتی کا مطالبہ نہیں کرے گی۔

اَللّٰهُمَّ أَجِرْنَا مِنَ النَّارِ بِرَحْمَتِكَ یَا مُجِیْبُ یَا غَفَّارُ.

جہنم کی آگ کا خوفناک منظر:

ان باغیوں اور بے ایمانوں کو یوں تو جہنم میں مختلف قسم کے عذاب دیے جائیں گے؛ لیکن سب سے خطرناک عذاب آگ کا ہوگا۔قرآنِ کریم نے اس کے متعلق فرمایا کہ

﴿قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا﴾ (التوبة : ۸۱)

"میرے محبوب! آپ بتادیجیے کہ جہنم کی آگ بہت ہی سخت گرم ہے۔"

حدیث میں ہے کہ دنیا میں گرمی کی شدت جہنم کی بھاپ کا اثر ہے:" فَإِنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فَیْحِ جَهَنَّمَ". آگے حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے جہنم سال بھر میں دو سانس لیتی ہے، ایک ٹھنڈی میں اور دوسری گرمی میں، "نَفَسٍ فِی الشِّتَاءِ وَ نَفَسٍ فِی الصَّیْفِ". (متفق علیه، مشکوٰة : ۶۰، باب تعجیل الصلوٰة)

ایک سانس باہر کی طرف نکل کر جاتا ہے تو اس کے اندر کی گرمی دنیا میں پھیل جاتی ہے، اور جب سانس اندر کی طرف چلا جاتا ہے تو باہر کی دنیا میں سردی پھیل جاتی ہے، یعنی دنیا کی سردی وگرمی اسبابِ باطنی کے تحت جہنم کے سانس لینے کا اثر ہے۔

جہنم کی گرمی سے متعلق سرکارِ دو عالم ﷺ نے احادیث طیبہ میں اس کی مزید

تفصیل بیان فرمائی، ایک حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ:" أُوْقِدَ عَلَی النَّارِ أَلْفَ سَنَةٍ، حَتّٰی احْمَرَّتْ، ثُمَّ أُوْقِدَ عَلَیْهَا أَلْفَ سَنَةٍ، حَتّٰی ابْیَضَّتْ، ثُمَّ أُوْقِدَ عَلَیْهَا أَلْفَ سَنَةٍ، حَتّٰی اسْوَدَّتْ، فَهِيَ سَوْدَاءُ مُظْلِمَةٌ". (رواه الترمذی، مشکوٰة : ۵۰۳)

"جہنم کی آگ کو (اللہ تعالیٰ کے حکم سے فرشتوں نے) ایک ہزار سال تک جلایا، یہاں تک کہ وہ سرخ ہوگئی، پھر ایک ہزار سال تک جلایا تو وہ سفید ہوگئی، پھر ایک ہزار سال تک جلایا تو وہ سیاہ ہوگئی، اس وقت جہنم کی آگ (شدید ہونے کے ساتھ نہایت) سیاہ بھی ہے۔"

جہاں تک اس کی شدت کا تعلق ہے تو حدیث مذکورہ میں فرمایا کہ جہنم کی آگ دنیا کی آگ سے ستر گنا زیادہ شدید، تیز اور گرم ہے، حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ خود دنیا کی آگ بھی اپنے درجۂ حرارت میں بعض بعض سے بڑھی ہوئی ہوتی ہیں، مثلاً لکڑی کی آگ میں گھاس کی آگ سے زیادہ حرارت اور تیزی ہوتی ہے، اسی طرح پتھر کے کوئلے کی آگ میں لکڑی کی آگ سے زیادہ تیزی اور گرمی ہوتی ہے، نیز مختلف بموں سے جو آگ وجود میں آتی ہے وہ درجۂ حرارت، شدت اور گرمی کے اعتبار سے سب سے زیادہ ہوتی ہے، اس کے باوجود ہے تو وہ دنیا کی آگ، یہ آگ جہنم کی آگ سے ستر درجہ کم ہے، دنیا کی سب سے زیادہ تیز اور شدید گرم آگ بھی جہنم کی آگ سے بہت ہی کم گرم ہے۔اس بنا پر عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ سوئی کے سوراخ کے برابر بھی جہنم کی آگ اگر دنیا میں ڈال دی جائے تو آناً فاناً ساری دنیا خاک ہوجائے۔

اَللّٰهُمَّ أَجِرْنَا مِنَ النَّارِ بِرَحْمَتِكَ یَا مُجِیْبُ یَا غَفَّارُ.

جہنم کی یہ آگ ان باغیوں اور مجرموں کو اوپر نیچے ہر طرف سے گھیر لے گی، قرآن میں پاک میں اسے بیان فرمایا:

﴿لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّ مِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ﴾ (الأعراف : ۴۱)

"آگ ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہوگا، ان کے نیچے بھی آگ ہوگی، اوپر بھی آگ ہوگی۔" کوئی جائے پناہ بھی نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ قرآنِ پاک میں جہنم کی آگ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ سَأُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا﴾ (مدثر: ۱۷)

"عنقریب میں (اس باغی اور بے ایمان کو جہنم کی آگ کی) سخت چڑھائی چڑھاؤں گا۔"

حدیث پاک میں اس کی تفصیل اس طرح منقول ہے:

"عَنْ أَبِیْ سَعِیْدٍؓ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: "الصَّعُوْدُ جَبَلٌ مِنَ النَّارِ، يَتَصَعَّدُ فِيْهِ سَبْعِيْنَ خَرِيْفًا، وَ يُهْوٰى بِهٖ كَذٰلِكَ فِيْهِ". (رواه الترمذی، مشکوٰۃ: ۵۰۳)

"صعود جہنم میں آگ کا وہ پہاڑ ہے (جس پر جہنمیوں کو چڑھنے کے لیے مجبور کیا جائے گا) تو وہ ستر سال تک اوپر چڑھے گا، پھر وہاں سے پھینکا جائے گا تو ستر سال تک گرتا رہے گا اور یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔"

روایتوں میں ہے کہ جہنم میں آگ کو پوری خوراک مل سکے اس لیے جہنمیوں کے جسم کو بہت زیادہ بڑھا دیا جائے گا۔ حدیث میں ہے:

"مَا بَيْنَ مَنْكِبَيِ الْكَافِرِ فِي النَّارِ مَسِيْرَةُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ لِلرَّاكِبِ الْمُسْرِعِ". (رواه مسلم، مشکوٰۃ: ۵۰۲)

"جہنم میں بے ایمان کے جسم کو اس قدر موٹا اور فربہ بنا دیا جائے گا کہ اس کے مونڈھوں کا درمیانی فاصلہ تیز سوار کی تین دن کی مسافت کے برابر ہوگا۔" نیز ایک روایت میں مذکور ہے کہ ان کی ایک ڈاڑھ اُحد پہاڑ کے برابر ہوگی اور جسم کی کھال تین دن کی مسافت کے برابر ہوگی۔

جہنم کے مختلف عذابوں کے خوفناک مناظر:

قرآن وحدیث میں آگ کے علاوہ بھی جہنم کے مختلف عذابوں کے خوفناک مناظر کا ذکر ہے، مثلاً ایک مقام پر قرآنِ کریم نے جہنمیوں کے تین مختلف قسم کے خوفناک عذابوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنَ النَّارِ﴾ (الحج: ۱۹)

"ان باغیوں اور بے ایمانوں کو جہنم میں آگ کے کپڑے پہنائے جائیں گے۔"

یعنی جس طرح لباس اور کپڑے انسان کے جسم کو ڈھانپ لیتے ہیں اسی طرح آگ ان کے جسم کو ڈھانپ لے گی۔

﴿ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ۝ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَ الْجُلُوْدُ ۝﴾ (الحج: ۱۹-۲۰)

"ان کے سروں پر کھولتا ہوا شدید گرم پانی اُنڈیلا جائے گا۔ جس سے نہ صرف ان کی کھالیں بلکہ ان کے پیٹ کے اندر بھی سب کچھ گل سڑ کر باہر نکل جائے گا۔"

﴿ وَ لَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ۝﴾ (الحج: ۲۱)

"فرشتے ان کے سروں پر لوہے کے مضبوط ہتھوڑے ماریں گے۔" اس ہتھوڑے کے متعلق تفسیر ابن کثیر میں مذکور ہے کہ اتنا مضبوط اور وزنی ہوگا کہ دنیا کے تمام انسان اور جنات مل کر بھی اسے اٹھا نہیں سکتے۔ نیز اگر وہ کسی بڑے پہاڑ پر مار دیا جائے تو وہ ریزہ ریزہ ہو جائے، اس سے جہنمی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے، پھر جیسے تھے ویسے کر دیے جائیں گے۔

جہنمیوں کے عذاب میں اضافے کے لیے حق تعالیٰ اونٹ کے برابر سانپ اور خچر کے برابر بچھو پیدا فرمائیں گے۔ حدیث میں ہے:

"إِنَّ فِي النَّارِ حَيَّاتٍ كَأَمْثَالِ أَعْنَاقِ الْبُخْتِ، تَلْسَعُ إِحْدَاهُنَّ اللَّسْعَةَ، فَيَجِدُ حَمْوَتَهَا أَرْبَعِيْنَ خَرِيْفًا، وَ إِنَّ فِي النَّارِ عَقَارِبَ كَأَمْثَالِ الْبِغَالِ الْمُوْكَفَةِ تَلْسَعُ

إِحۡدَاهُنَّ اللَّسۡعَةَ، فَيَجِدُ حَمۡوَتَهَا أَرۡبَعِيۡنَ سَنَةً". (مسند أحمد، مشكوٰة : ٥٠٤)

جوایک مرتبہ ڈنک ماریں گے تو چالیس سال تک اس کی تکلیف کا اثر رہے گا، یہی حال خچروں جیسے بچھوؤں کے ڈنک کا بھی ہوگا۔ (العیاذ باللہ العظیم)۔

اور بھی مختلف قسم کے عذاب کا تذکرہ کتاب وسنت میں موجود ہے، جس کو بیان کرنے کی اس عاجز میں ہمت نہیں۔ اس سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے، وہ ہے رجوع الی اللہ، اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوکر تمام گناہوں سے سچی توبہ کرنا۔ جہنم کی آگ کو سمندر کا پانی نہیں بجھا سکتا، اگر اسے کوئی چیز بجھا سکتی ہے تو گنہگار کی آنکھ سے نکلا ہوا اشک ندامت۔

بہ قولِ شاعر:

ایک پل کا گناہ ایک مرتبہ مزہ دے گا
لیکن ایک پل کا وہ گناہ صدیوں سزا دے گا
گر خوفِ خدا سے ٹپکے گا ایک آنسو
وہ آنسو بھی جہنم کو بجھا دے گا

حدیث پاک میں ہے:

عَنۡ عَبۡدِاللّٰهِ بۡنِ مَسۡعُوۡدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَا مِنۡ عَبۡدٍ مُؤۡمِنٍ يَخۡرُجُ مِنۡ عَيۡنَيۡهِ دُمُوۡعٌ، وَ إِنۡ كَانَتۡ مِثۡلَ رَأۡسِ الذُّبَابِ مِنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ، ثُمَّ يُصِيۡبُ شَيۡئًا مِنۡ حُرِّ وَجۡهِهٖ إِلَّا حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ". (ابن ماجه، مشكوٰة : ٤٥٨)

"خوفِ خدا کی وجہ سے بندۂ مؤمن کی آنکھ سے نکلنے والا ایک آنسو خواہ وہ مکھی کے سر کے برابر ہی کیوں نہ ہو، اس پر جہنم کی آگ کو حرام کردے گا۔"

اسی لیے حدیث میں ہے:

"أَيُّهَا النَّاسُ! اِبۡكُوۡا، فَإِنۡ لَمۡ تَسۡتَطِيۡعُوۡا فَتَبَاكَوۡا، فَإِنَّ أَهۡلَ النَّارِ يَبۡكُوۡنَ فِيۡ النَّارِ". (شرح السنة، مشكوٰة: ٥٠٤)

"اے لوگو! (اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے ہوئے) رویا کرو، اگر رونہ سکو تو بہ تکلف رویا کرو (اللہ تعالیٰ کو یہ بھی پسند ہے، اس سے بھی تمہیں معافی اور جہنم سے نجات مل جائے گی)۔ اس لیے کہ جہنمی جہنم میں روئیں گے۔" (لیکن یہ رونا انہیں کوئی نفع نہیں دے گا)۔

اَللّٰهُمَّ أَجِرۡنَا مِنَ النَّارِ بِرَحۡمَتِكَ يَا مُجِيۡرُ يَا غَفَّارُ.

اے اللہ! اپنے کرم سے اس مقبول گھڑی میں ہمیں، ہمارے والدین، بیوی، بچوں، اعزاء واقرباء اور تمام مؤمنین کو اپنے غضب وغصہ اور عذاب سے دارین میں بچالیں۔ آمین یارب العالمین۔

٦ر رمضان المبارک ١٤٤١ھ
مطابق: یکم مئی ٢٠٢٠ء
بروز جمعہ، قبل المغرب (بزمِ صدیقی، بڑودا)

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيۡرًا فَصَلُّوۡا عَلَيۡهِ كَثِيۡرًا كَثِيۡرًا

(۳۶)

جنت کے حسین مناظر

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَنۡ أَبِیۡ هُرَيۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ:" قَالَ اللّٰهُ تَعَالىٰ: "أَعۡدَدۡتُ لِعِبَادِیَ الصَّالِحِيۡنَ مَا لَا عَيۡنٌ رَأَتۡ، وَ لَا أُذُنٌ سَمِعَتۡ، وَ لَا خَطَرَ عَلىٰ قَلۡبِ بَشَرٍ، وَ اقۡرَؤُوۡا إِنۡ شِئۡتُمۡ : ﴿فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّآ أُخۡفِيَ لَهُمۡ مِنۡ قُرَّةِ أَعۡيُنٍ﴾

(متفق عليه، مشكوٰة : ٤٩٥، باب صفة الجنة و أهلها) (حدیث قدسی نمبر:۲۵)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: حق تعالیٰ کا فرمانِ عظیم الشان ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کیا ہے (جس کے حسین مناظر کو) کسی آنکھ نے دیکھا نہیں (جس کی حسین آواز یا صفات کو) کسی کان نے سنا نہیں (جس کی اصل حقیقت اور دائمی عیش وعشرت کا) حقیقی تصور اور خیال تک کسی کے دل میں نہیں گزرا۔ اگر تم اس بات کی تصدیق چاہو تو یہ آیت پڑھو:

﴿فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّآ أُخۡفِيَ لَهُمۡ مِنۡ قُرَّةِ أَعۡيُنٍ﴾ (السجدة : ١٧)

"اللہ کے علاوہ کسی نفس کو معلوم نہیں (ان نعمتوں اور راحتوں کی تفصیلات جو اس نے نیک بندوں کے لیے) چھپا رکھی ہیں، جن سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔" (اور

۳۲۷

دل مطمئن ہو جائیں)

جنت کی حقیقت:

اللہ رب العزت نے مؤمنین صالحین کے لیے موت کے بعد والی دائمی زندگی میں جو آخری منزل بنائی جہاں رب کریم کا کامل فضل وکرم اور اس کی کامل رضا ورحمت کے علاوہ ہر وہ راحت وچاہت جس کا تصور ممکن ہے اس کی تکمیل کا کامل اور مکمل انتظام فرمایا ہے، اس کا نام جنت ہے، جس میں ایک کوڑے کی جگہ بھی دنیا ومافیہا سے بہتر ہے۔

"مَوۡضِعُ سَوۡطٍ فِیۡ الۡجَنَّةِ خَيۡرٌ مِنَ الدُّنۡيَا وَ مَا فِيۡهَا". (متفق عليه، مشكوٰة : ٤٩٥)

محقق العصر حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ فرماتے ہیں کہ عرب کا یہ رواج تھا کہ جب چند سواروں کا قافلہ چلتا تو جو سوار منزل پر اُترتے وقت جہاں قیام کرنا چاہتا وہاں اپنا کوڑا ڈال دیتا، پھر وہ جگہ اسی کی سمجھی جاتی، کوئی دوسرا اس پر قبضہ نہ کرتا، تو اس حدیث میں کوڑے کی جگہ سے مراد دراصل اتنی مختصر سی جگہ ہے جو کوڑا ڈال دینے سے کوڑے والے سوار کے لیے مخصوص ہو جاتی ہے۔ اب مطلب یہ ہوا کہ جنت کی تھوڑی سی جگہ بھی دنیا ومافیہا سے بہتر اور قیمتی ہے۔ (معارف الحدیث: ۱/۲۶۰)

لغوی اعتبار سے تو "جنت" کے معنی ہیں ڈھانپنا اور چھپانا، جب کہ اصطلاحی اعتبار سے جنت باغ وبہشت کو کہتے ہیں، جنت کو دو وجہوں سے جنت کہا جاتا ہے: (۱) پہلی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اسے نہایت قیمتی باغات اور اس کے عمدہ درختوں کے بیچ میں چھپا رکھا ہے، اس لیے اسے جنت کہتے ہیں۔ (۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ اِس وقت اُسے لوگوں کی آنکھوں سے چھپا رکھا ہے، تاکہ پردۂ غیب میں رہے اور مؤمنین صالحین کا جنت پر ایمان بالغیب قائم ودائم رہے، ورنہ جس طرح جہنم باغیوں اور بے ایمانوں کے لیے تیار ہے اسی طرح جنت بھی مؤمنین صالحین کے لیے تیار اور موجود ہے، جیسا کہ رمضان کے فضائل میں

جو روایت منقول ہے اس میں فرمایا:

" إِذَا دَخَلَ رَمَضَانُ فُتِحَتْ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ، وَ غُلِّقَتْ أَبْوَابُ جَهَنَّمَ". (متفق عليه، مشكوٰة : ١٧٣)

نیز حدیث میں ہے کہ مرنے والے کو اس کی قبر میں صبح وشام اس کا ٹھکانہ جنت یا جہنم دکھایا جاتا ہے:

" إِذَا مَاتَ عُرِضَ عَلَيْهِ مَقْعَدُهُ بِالْغَدَاةِ وَ الْعَشِيِّ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٢٥)

اسی طرح مروی ہے کہ معراج کے موقع پر حضور ﷺ کو آسمان سے جنت وجہنم کے مناظر دکھائے گئے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت اور جہنم دونوں موجود ہیں۔ جہنم سے متعلق بھی اس سے پہلے والے مضمون (جہنم کے خوفناک مناظر) میں عرض کیا گیا کہ وہ سمندروں کی تہہ میں ہے، جہاں سے اسے قیامت کے دن کھینچ کر نکالا جائے گا۔

جنت کہاں ہے؟

جنت کے متعلق کتاب وسنت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آسمانوں کی بلندیوں پر ہے، چنانچہ ارشادِ باری ہے:

﴿ وَ فِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَ مَا تُوْعَدُوْنَ۝﴾ (الذريت: ٢٢)

''اور تمہارا رزق اور جس (جنت) کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ آسمان میں ہے۔''

یہاں "وما توعدون" سے مراد جنت اور اس کی نعمتیں ہیں۔ (معارف القرآن)

اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت آسمانوں کی بلندیوں پر ہے۔ قرآنِ کریم نے فرمایا کہ آسمان کی بلندیوں پر سدرۃ المنتہیٰ (بیری کا ایک بہت بڑا درخت) ہے، یہ فرشتوں کی آخری حد ہے، نیز عالم بالا سے جو احکام اور رزق وغیرہ آتے ہیں وہ پہلے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچتے ہیں، پھر وہاں سے فرشتے زمین پر لاتے ہیں، اسی طرح بندوں کے جو اعمال اوپر جاتے

ہیں وہ بھی سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچتے ہیں، پھر وہاں سے اوپر اٹھائے جاتے ہیں۔ (قرطبی: ٩٤/٩)

دنیا میں اس کی مثال ڈاک خانے جیسی سمجھ لیں، کہ خطوط کی آمد ورفت وہاں سے ہوتی ہے، قرآنِ کریم نے بیان کیا کہ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جنت الماویٰ ہے:

﴿ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوٰى﴾ (النجم : ١٥)

''ماویٰ'' کے معنیٰ ہیں مسکن اور رہنے کی جگہ، جنت چوں کہ مؤمنین صالحین کے رہنے کی جگہ اور اصل ٹھکانہ ہے اس لیے اسے جنت الماویٰ کہتے ہیں۔ یہ دراصل جنت ہی کا ایک صفتی نام ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اہل ایمان کی ارواح یہاں ٹھہرتی ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کا ماویٰ ومسکن یہی تھا۔ (فتح القدیر)

دوسرے مقام پر قرآنِ کریم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی سے ڈرنے والے بندے اس میں ہوں گے، فرمایا:

﴿ وَ أَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى۝ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى۝﴾ (النازعات : ٤٠-٤١)

جنت کے نام:

جنت تو ایک ہی ہے؛ لیکن جس طرح رب العالمین کے، رحمۃ للعالمین ﷺ کے، قرآنِ کریم کے اور قیامت کے ذاتی نام کے علاوہ کئی صفاتی نام ہیں، اسی طرح جنت کے بھی کئی صفاتی نام ہیں، منجملہ ان کے دوسرا نام ہے: "دارالسلام"، یعنی سلامتی والا گھر، قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿ لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ (الأنعام : ١٢٧)

''مؤمنین صالحین کے لیے ان کے رب کے پاس سلامتی کا گھر ہے۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ وَ اللّٰهُ يَدْعُوْۤا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ﴾ (یونس : ۲۵)

’’حق تعالیٰ تمہیں دار السلام کی طرف بلاتا ہے۔‘‘ جنت کو دار السلام اس لیے بھی کہا جاتا ہے کہ وہاں تمام آفات وامراض اور مصائب ومکروہات سے سلامتی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جنتیں سات ہیں: (۱) ذوالجلال (۲) دار السلام (۳) جنت عدن (۴) جنت الماویٰ (۵) جنت الخلد (۶) جنت الفردوس (۷) جنت النعیم۔ (تفسیر قرطبی)

بعض فرماتے ہیں کہ یہ سب جنت کے مختلف نام ہیں یا اس کے اعلیٰ مقام ہیں۔

جنت کا تیسرا نام ہے: ”دار المتقین“ یعنی متقی لوگوں کا گھر، قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿ وَ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَا ذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوْا خَيْرًا ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ؕ وَ لَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ○﴾ (النحل : ۳۰)

’’اور جب متقین سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے (تمہارے نبی پر) کیا نازل کیا؟ تو وہ کہتے ہیں: بہترین چیز نازل فرمائی، ایسے صالحین کے لیے دنیا میں بھی (انجام کے اعتبار سے) بھلائی ہے اور آخرت کا گھر تو ان کے لیے بہت ہی بہتر ہے اور کیا ہی بہترین ہے متقین کا گھر۔‘‘

متقین کا مطلب ہے ڈرنے والے اور بچنے والے، اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے اور کفر وشرک سے مکمل اور تمام معاصی سے حتی الامکان بچنے والے لوگ متقین ہیں، جن کا اصل گھر آخرت میں جنت ہے، جس کا ایک نام ”دار المتقین“ ہے۔

جنت کا چوتھا نام ہے: ’’مقامِ امین‘‘ یعنی امن کی جگہ، قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ○﴾ (دخان : ۵۱)

’’بے شک متقین امن اور چین وسکون والی جگہ میں ہوں گے۔‘‘

یعنی ایسی جنت میں جہاں بدامنی اور بے چینی نہیں ہوگی، وہاں کسی قسم کا خطرہ اور اندیشہ بھی نہ ہوگا، وہاں متقین وصالحین ہر وقت ہر طرح کے شر وخطر سے مامون ومطمئن ہوں گے۔

جنت کا پانچواں نام ہے: ”دار القرار“ یعنی ہمیشہ کا گھر، قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿ يٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ ؗ وَّ اِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ○﴾ (غافر : ۳۹)

’’اے میری قوم! یہ دنیوی زندگی تو متاعِ فانی ہے، یقین مانو! قرار اور ہمیشگی کا گھر تو آخرت ہی (جنت) ہے، نہ وہاں کسی نعمت کو زوال ہے، نہ کسی کا انتقال ہے، وہاں کی نعمتیں بھی ہمیشہ کے لیے، وہاں کی زندگی بھی ہمیشہ کے لیے، وہاں کی جوانی بھی ہمیشہ کے لیے، وہاں کی تندرستی بھی ہمیشہ کے لیے ہے۔

جنت کا چھٹا نام ہے ”جنات النعیم“ یعنی نعمتوں بھری جنتیں، قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿ وَ السّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ○ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ○﴾

(الواقعة : ۱۱-۱۲-۱۳)

’’اور جو آگے والے ہیں وہ تو آگے والے ہیں (جو نیکی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے ہیں) وہ (اللہ تعالیٰ کا قرب اور) نزدیکی حاصل کیے ہوئے ہیں، یہ نعمتوں والے باغوں میں ہوں گے۔‘‘

جنت کا ساتواں نام ہے ”جنات عدن“ یعنی سدابہار جنتیں، ارشادِ باری ہے:

﴿ جَنّٰتِ عَدْنِ ِۨالَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا ○﴾ (مریم:۶۱)

’’ان سدابہار جنتوں میں جن کا رحمٰن نے اپنے بندوں سے غائبانہ وعدہ فرمایا ہے، بلاشبہ اس کا وعدہ پورا ہونے والا ہے۔‘‘

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ﴾ (الصف : ۱۲)

(مؤمنین صالحین) ان صاف ستھرے گھروں میں ہوں گے جو سدابہار جنتوں میں ہیں۔“

جنت کا آٹھواں نام ہے ”فِــــرْدَوْس“ یعنی سرسبز باغ، یا انگوروں کے باغ والی جنت، یا بہت ہی گھنے درخت والی جنت، ارشادِ باری ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَانَتْ لَھُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًاO﴾ (الکھف : ۱۰۷)

حدیث پاک میں مذکور ہے کہ یہ تمام جنتوں میں سب سے اعلیٰ جنت ہے، جس کی چھت اللہ تعالیٰ کا عرش ہے۔ (ترمذی، مشکوٰۃ: ٤٩٦)

جنت کے دروازے:

قرآنِ کریم میں جنت کے دروازوں کا بھی ذکر ہے، جس طرح معزز مہمانوں کے استقبال کے لیے پہلے سے دروازے کھول دیے جاتے ہیں ایسے ہی مؤمنین صالحین کے لیے بھی جنت کے دروازے پہلے ہی سے کھول دیے جائیں گے۔ فرمایا:

﴿ جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّھُمُ الْاَبْوَابُ﴾ (ص: ۵۰)

”سدابہار جنتوں کے دروازے مؤمنین صالحین کے لیے کھلے ہوں گے۔“

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ حَتّٰۤی اِذَا جَآءُوْھَا وَ فُتِحَتْ اَبْوَابُھَا﴾ (الزمر : ۷۳)

”مؤمنین صالحین جس وقت جنت کے پاس پہنچیں گے تو اس کے دروازے پہلے ہی کھولے جاچکے ہوں گے۔“

قرآنِ کریم نے مطلقاً جنت کے دروازوں کا ذکر کیا، یہ وضاحت نہیں فرمائی کہ ان کی تعداد کتنی ہے؟ اسے احادیث مبارکہ میں بتایا گیا کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں:

عَنْ سَھْلِ بْنِ سَعْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ

وَ سَلَّمَ : ”فِی الْجَنَّةِ ثَمَانِیَةُ اَبْوَابٍ، مِنْھَا بَابٌ یُسَمّٰی رَیَّانَ، لَا یَدْخُلُہٗ اِلَّا الصَّائِمُوْنَ“. (متفق علیه، مشکوٰۃ : ۱۷۳، کتاب الصوم)

قرآنِ کریم نے جہنم کے سات دروازوں کا ذکر فرمایا:

﴿ لَھَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ﴾ (الحجر : ٤٤)

اور حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں، وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ اور جنت اللہ تعالیٰ کی جائے رحمت ہے، تو جہنم جائے غضب، اس لیے جنت کے دروازے جہنم کے دروازوں سے زیادہ ہیں، جن میں سے ہر دروازہ مخصوص اعمالِ صالحہ والوں کے لیے خاص ہوگا، مطلب یہ ہے کہ جو مؤمنین صالحین ان اعمالِ صالحہ کا بہ کثرت اہتمام کرنے والے تھے، یا پھر ان اعمال کو نہایت اخلاص واَدب کے ساتھ انجام دیتے ہیں، جیسے کسی کو نماز سے بہت زیادہ دل چسپی تھی، تو کسی کو جہاد فی سبیل اللہ سے بہت زیادہ لگاؤ تھا، کسی کا مخصوص عمل صدقات وخیرات تھا، تو کسی کا محبوب عمل روزے رکھنا تھا، تو جس نے خصوصیت کے ساتھ جو عمل کیا ہوگا اس کو اس دروازے سے داخل کیا جائے گا۔

چنانچہ ایک دروازے کا نام ہے: ”باب الصلوٰۃ“۔ یہ دروازہ نمازیوں کے لیے خاص ہوگا۔ دوسرے دروازے کا نام ہے: ”باب الجھاد“۔ یہ دروازہ مجاہدین کے لیے خاص ہوگا۔ تیسرے دروازے کا نام ہے: ”باب الصدقة“۔ یہ دروازہ صدقات وخیرات کرنے والوں کے لیے خاص ہوگا۔ چوتھے دروازے کا نام ہے: ”باب الریان“۔ یہ دروازہ روزے داروں کے لیے خاص ہوگا۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ: ١٦٧، باب فضل الصدقہ)

جنت کے پانچویں دروازے کا نام ہے: ”باب التوبة“۔ یہ دروازہ سچی پکی توبہ کرنے والوں کے لیے خاص ہوگا۔ چھٹے دروازے کا نام ہے: ”باب الکاظمین الغیظ“۔ یہ دروازہ اللہ تعالیٰ کے لیے غصہ پر قابو کرنے والوں کے لیے خاص ہوگا۔ ساتویں دروازے کا

نام ہے:"بـاب الـراضین" ۔یہ دروازہ اللہ پاک کے فیصلوں پر راضی رہنے والوں کے لیے خاص ہوگا۔آٹھویں دروازے کا نام ہے:"باب الأیمن الذی یدخل منه من لا حساب علیه"۔یہ دروازہ ان خوش نصیب لوگوں کے لیے خاص ہوگا جنہیں بلاحساب وکتاب جنت میں داخل کیا جائے گا۔(مستفاد از: جنت کے حسین مناظر: ۱۲۷)

جنت کے دروازوں کی چابی:

حدیث پاک میں کلمہ توحید کی گواہی اور اس کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزارنے کو جنت کے دروازوں کی چابی فرمایا:

"عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" مَفَاتِيْحُ الْجَنَّةِ شَهَادَةُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ". (رواه أحمد، مشكوٰة: ۱۵، كتاب الإيمان)

ظاہر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کلمہ توحید کے تقاضوں کو پورا کیے بغیر جس نے دنیا میں زندگی گزاری ہوگی قیامت کے دن ان کے لیے جنت کے دروازے بند ہوں گے، جنت کے دروازوں میں وسعت کے باوجود ان باغیوں اور بے ایمانوں کے لیے کوئی گنجائش نہ ہوگی۔حدیث میں ہے:

"إِنَّ مَا بَيْنَ مِصْرَاعَيْنِ مِنْ مَصَارِيْعِ الْجَنَّةِ مَسِيْرَةُ أَرْبَعِيْنَ سَنَةً، وَ لَيَأْتِيَنَّ عَلَيْهَا قَوْمٌ، وَ هُوَ كَظِيْظٌ مِنَ الزِّحَامِ". (رواه مسلم، مشكوٰة: ٤٩٧)

''جنت کے ہر دروازے کی چوڑائی چالیس سال کی مسافت کے برابر ہوگی، اس کے باوجود یہ مؤمنین صالحین کے دخولِ جنت کے موقع پر بھرے ہوئے ہوں گے۔''

کیوں کہ جنت اللہ تعالیٰ کے فضل ورحمت کی جگہ ہے۔اور ہر جنتی اللہ تعالیٰ کے فضل ورحمت سے جنت میں جائے گا، تو اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے، اس لیے جنتیوں کی تعداد بھی زیادہ ہے۔

جنت کی وسعت:

پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ جب جنت کے دروازے اتنے وسیع ہیں کہ ان کی چوڑائی چالیس سال کی مسافت کے برابر ہے تو خود جنت کس قدر وسیع ہوگی؟ واقعہ یہ ہے کہ جنت کی وسعتوں اور نعمتوں کا صحیح تصور بھی اس دنیا میں مشکل ہے، جیسا کہ حدیث مذکورہ میں فرمایا گیا۔قرآنِ کریم نے فرمایا:

﴿ وَ إِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيْمًا وَّ مُلْكًا كَبِيْرًا﴾ (الدهر: ۲۰)

''اور (جنت میں) تم جب بھی جہاں بھی دیکھوگے کثرت سے نعمتیں اور عظیم الشان سلطنت ہی دیکھوگے۔''

اس آیت میں جنت کی نعمتوں اور وسعتوں کا اجمالی ذکر فرمایا گیا ہے، یعنی دنیا میں کوئی مؤمن مخلص فقیر بے نوا ہی کیوں نہ رہا ہو؛ مگر موت کے بعد جب حق تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اسے جنت میں داخل فرمائیں گے تو وہ وہاں عظیم الشان سلطنت کا مالک ہوگا۔

حضرت عکرمہؒ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ ایک مرتبہ حضور ﷺ کے پاس تشریف لائے، تو آپ ﷺ کھجوروں کی شاخوں سے بنی ہوئی چٹائی پر آرام فرما رہے تھے اور آپ ﷺ کے پہلو میں اس کے نشانات پڑ گئے تھے، یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ کو رونا آگیا، حضور ﷺ نے پوچھا: عمر! کیوں رو رہے ہو؟ تو عرض کیا کہ مجھے کسریٰ اور اس کی سلطنت اور شاہِ حبشہ اور اس کی سلطنت یاد آگئی۔(یعنی وہ تو اس قدر عیش سے زندگی گزار رہے ہیں) اور آپ اللہ کے رسول ہیں اور کھجور کی شاخوں کی چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں، تب آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی نہیں کہ ان کے لیے تو دنیا (میں عیش وراحت) ہو اور ہمارے لیے آخرت میں۔

"أَمَا تَرْضٰى أَنْ تَكُوْنَ لَهُمُ الدُّنْيَا وَ لَنَا الْاٰخِرَةُ". (متفق عليه، مشكوٰة: ٤٤٧، باب فضل الفقر و ما كان من عيش النبي ﷺ)

ابن کثیر وغیرہ میں ہے کہ اس موقع پر آپ ﷺ نے یہی آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

﴿ وَ إِذَا رَأَيۡتَ ثَمَّ رَأَيۡتَ نَعِيۡمًا وَّ مُلۡكًا كَبِيۡرًا۝﴾ (سیوطی، ابن کثیر: ٤٥٧/٤)

رب العالمین نے اس جنت کی دعوت دیتے ہوئے اس کی وسعت کے کم از کم درجے کو اس طرح بیان فرمایا کہ

﴿ وَ سَارِعُوۡٓا إِلٰى مَغۡفِرَةٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَ جَنَّةٍ عَرۡضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الۡأَرۡضُ أُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِيۡنَ۝﴾ (آل عمران: ١٢٣)

’’اپنے رب کی مغفرت اور اس کی جنت کی طرف سبقت کرو (ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو) جس کی (کم از کم) وسعت آسمان وزمین کے برابر ہے۔‘‘

انسانوں کی نظر کے سامنے چوں کہ آسمان وزمین ہی طول وعرض کے اعتبار سے سب سے وسیع ہیں اس لیے جنت کی وسعت بتانے کے لیے تقریب الی الفہم کے طور پر یہ ارشاد فرمایا کہ اس کی چوڑائی زمین وآسمان کے برابر ہے، ورنہ تو یہ اس کا کم از کم درجہ ہے، اس کا انتہائی درجہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔

عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ جنت ہمارے اس کرۂ ارضی کے مقابلے میں بلا مبالغہ اَربوں نہیں؛ بلکہ کھربوں گنا زیادہ وسیع وعریض ہوگی، عین ممکن ہے کہ جنت کے کسی بڑے شہر کا سب سے چھوٹا سا محلّہ ہمارے اس کرۂ ارضی کے برابر ہو، کیوں کہ حدیث میں ہے کہ سب سے آخری جنتی کو اس دنیا سے دس گنا بڑی اور وسیع جنت ملے گی:

”فَادۡخُلِ الۡجَنَّةَ، فَإِنَّ لَكَ مِثۡلَ الدُّنۡيَا وَ عَشَرَةَ أَمۡثَالِهَا“. (متفق علیه، مشکوٰة: ٤٩٢، باب الحوض و الشفاعة)

ایک دوسری حدیث میں ادنیٰ درجہ کے جنتی کو کتنی وسیع جنت دی جائے گی اسے بیان کرتے ہوئے فرمایا:

عَنِ ابۡنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: ” إِنَّ أَدۡنٰى أَهۡلِ الۡجَنَّةِ مَنۡزِلَةً لَمَنۡ يَنۡظُرُ إِلٰى جِنَانِهٖ وَ أَزۡوَاجِهٖ وَ نَعِيۡمِهٖ وَ خَدَمِهٖ وَ سُرُرِهٖ مَسِيۡرَةَ أَلۡفِ

سَنَةٍ، وَ أَكۡرَمَهُمۡ عَلَى اللّٰهِ مَنۡ يَنۡظُرُ إِلٰى وَجۡهِهٖ غُدۡوَةً وَ عَشِيَّةً، ثُمَّ قَرَأَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: ﴿ وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ إِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ (رواه أحمد و الترمذی، مشکوٰة: ٥٠١، باب روية اللّٰه تعالیٰ)

’’اہل جنت میں ادنیٰ درجے کا جنتی وہ ہوگا جو دیکھے گا کہ جنت میں اس کا ملک اور عظیم سلطنت ایک ہزار سال کی مسافت تک پھیلی ہوئی ہے، وہ اپنے باغوں، بیویوں، نعمتوں، خادموں اور مسہریوں کو ہزار سال کی مسافت میں دیکھے گا (یعنی ان مذکورہ نعمتوں کو اتنی دور تک پھیلی ہوئی دیکھے گا کہ جنتی دور تک تیز رفتار سواری ہزار سال تک چل کر پہنچ سکے) اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے معزز شخص وہ ہوگا جو اللہ تعالیٰ کا صبح وشام دیدار کرے گا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے وہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی جس میں فرمایا گیا کہ اس روز بہت سے چہرے تروتازہ اور بارونق ہوں گے اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے۔‘‘ اَللّٰهم اجعلنا منهم.

مزید جنت کی وسعت کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ سب سے آخری جنتی کو دنیا سے دس گنا بڑی مملکت والی جنت ملنے کے بعد بھی اس میں جگہ بچ جائے گی تو حق تعالیٰ ایک نئی مخلوق کو پیدا فرما کر جنت کو پُر فرمائیں گے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

” وَ لَا يَزَالُ فِي الۡجَنَّةِ فَضۡلٌ حَتّٰى يُنۡشِئَ اللّٰهُ لَهَا خَلۡقًا، فَيُسۡكِنُهُمۡ فَضۡلَ الۡجَنَّةِ“. (متفق علیه، مشکوٰة: ٥٠٥، باب فضل الجنة و النار)

صاحبو! جنت میں اتنی وسعت کے باوجود کسی کو اپنی بدبختی اور بے ایمانی کے سبب جنت میں جگہ نہ ملے تو اس سے بڑا خسارہ اور کیا ہوسکتا ہے؟ اس کو فرمایا:

﴿ لَا جَرَمَ أَنَّهُمۡ فِي الۡاٰخِرَةِ هُمُ الۡأَخۡسَرُوۡنَ۝﴾ (هود: ٢٢)

’’یہ لازمی بات ہے کہ یہ (باغی اور بے ایمان بد بخت) لوگ آخرت میں سب سے زیادہ خسارہ اور نقصان میں ہوں گے۔‘‘

اور مؤمنین صالحین واقعی فلاح یاب اور کامیاب ہوں گے، کیوں کہ ان کے حق میں جنت کا فیصلہ ہوگا جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

دخولِ جنت کے حسین مناظر:

ایسی عظیم الشان نعمتوں اور وسعت والی جنت میں حق تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے مؤمنین صالحین کو کس شان سے داخل فرمائیں گے؟ تو کتاب وسنت میں اُن حسین مناظر کا ذکر بھی ہے، قرآنِ کریم میں فرمایا کہ قیامت میں مؤمنین صالحین کے لیے جنت کا فیصلہ ہوتے ہی جنت ان کے بالکل قریب کردی جائے گی، فرمایا:

﴿ وَ إِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ ۝﴾ (التکویر: ۱۳)

’’اور جب جنت کو قریب کردیا جائے گا۔‘‘ تاکہ اہل جنت بآسانی جنت میں داخل ہوسکیں، اس کے بعد اہل جنت کو اپنے اپنے درجات کے اعتبار سے مختلف گروہ میں جنت کے دروازوں پر لایا جائے گا، مثلاً سب سے پہلے مقربین، پھر ابرار وصالحین، پھر ان سے کم درجے کے مؤمنین وغیرہ۔ اور ظاہر ہے کہ مقربین میں سب سے پہلے سرکارِ دوعالم ﷺ اور دیگر حضرات انبیاء ورُسل علیہم السلام ہوں گے، ان کے بعد حضرات صحابہؓ وعلماء اور درجہ بہ درجہ اہل ایمان ہوں گے، قرآن پاک نے اس منظر کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَ سِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۭ حَتّٰٓى إِذَا جَاءُوْهَا وَ فُتِحَتْ أَبْوَابُهَا﴾ (الزمر: ۷۳)

متقیوں (اور جنتیوں) کو اپنے اپنے درجاتِ ایمانی کے مطابق مختلف جماعتوں میں تقسیم کرکے جنت کے مختلف دروازوں پر لایا جائے گا، جہاں جنت کے محافظ فرشتے دروازے کھولے ان کے استقبال کے لیے پہلے ہی سے موجود ہوں گے اور وہ اہل جنت کا استقبال کرتے ہوئے کہیں گے

﴿ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ۝﴾ (الزمر: ۷۳)

سلامتی ہو تم پر، یہاں تم مکمل سلامت رہوگے، شیطان کے حملوں سے سلامت، نفس کی شرارتوں سے سلامت، عذابِ الٰہی اور رب کی ناراضی سے سلامت، ہر طرح کی مشقت اور پریشانی سے سلامت، ’’طِبْتُم‘‘ شاباش! بہت اچھا کام کیا تم نے، بڑے اچھے کام کرکے آئے، بڑی ہمت اور صبر سے کام لیا، حصولِ جنت اور رب کی رضا کے لیے تم نے بڑی کوشش اور محنت کی، اب جنت میں ہمیشہ کے لیے داخل ہوجاؤ اور یہاں ہمیشہ کے لیے شاد رہو، آباد رہو، پھلو پھولو۔

اس وقت اہل جنت شکر الٰہی ادا کرتے ہوئے کہیں گے:

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَ أَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ ﴾ (الزمر: ۷۴)

’’اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے ہم سے (نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ) کیا ہوا وعدہ پورا فرمایا اور ہمیں جنت کا وارث بنایا، ہم جنت میں اپنے درجے کے علاوہ بھی جہاں چاہیں جائیں گے۔‘‘

کبھی نبیوں سے، تو کبھی رسولوں سے، تو کبھی حضرات صحابہؓ اور صلحاء سے، غرض ہر ایک کو یہ اختیار دیا جائے گا کہ وہ دوسرے اہل جنت کے پاس ملاقات اور تفریح کے لیے جایا کریں۔ (معارف القرآن: ۷/۵۷۷)

ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ جنت سے متعلق ہمیں کچھ ایسا بتائیے کہ جسے سن کر ہمارے شوقِ جنت میں اضافہ ہو، فرمایا: جنت میں حضراتِ انبیاء ورُسل علیہم السلام اور سید الانبیاء والمرسلین ﷺ ہیں، جن سے ہر جنتی کی بآسانی ملاقات ہوگی۔ ان شاء اللہ العزیز۔

جنت کے درجات اور غرفات:

دخولِ جنت کے بعد تمام جنتی اپنے اپنے درجات کے اعتبار سے اپنے محلات میں چلے جائیں گے، کیوں کہ جنت کے بلند وبالا محلات جنتیوں کے مختلف درجات کے اعتبار

سے اوپر نیچے ہوں گے۔ قرآن میں فرمایا:

﴿ وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا﴾ (الأنعام : ١٣٢)

’’ہر ایک کے لیے اپنے عمل کے اعتبار سے مختلف درجات ہیں۔‘‘

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ مَغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ۞﴾ (الأنفال : ٤)

’’اُن (مؤمنین صالحین) کے لیے ان کے رب کے پاس (مختلف) درجات ہیں اور مغفرت اور عزت والی روزی ہے۔‘‘

حدیث پاک سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے بہت سے درجات ہیں۔ ایک حدیث میں فرمایا:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" إِنَّ فِي الْجَنَّةِ مِائَةَ دَرَجَةٍ، مَا بَيْنَ كُلِّ دَرَجَتَيْنِ مِائَةُ عَامٍ". (رواه الترمذی، مشکوٰة : ٤٩٧)

’’جنت کے سو درجے ہیں، جن میں سے ہر درجے کے درمیان سو سال کی مسافت ہے۔‘‘

یہاں علماءِ محدثین کے بقول "مائة درجة" سے مراد کثرت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جنت کے درجات بہت کثرت سے ہیں۔

امام بیہقی نے ایک مرفوع روایت نقل فرمائی ہے، جس میں ذکر ہے:

" عَدَدُ دَرَجِ الْجَنَّةِ عَدَدُ آيِ الْقُرْآنِ". (رواه البيهقي في شعب الإيمان، فصل في إدمان تلاوة القرآن)

’’جنت کے درجات کی تعداد قرآنِ کریم کی آیات کے مطابق ہے۔‘‘ واللہ اعلم۔

(مستفاد از: مظاہر حق جدید: ۱۸۳/۵)

حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِي سَعِيْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:" إِنَّ فِي الْجَنَّةِ مِائَةَ

دَرَجَةٍ، لَوْ أَنَّ الْعَالَمِيْنَ اجْتَمَعُوْا فِيْ إِحْدَاهُنَّ، لَوَسِعَتْهُمْ". (رواه الترمذی، مشکوٰة : ٤٩٧)

’’جنت کے سو (یعنی بہ کثرت) درجات ہیں، اگر تمام جہان کی مخلوق اس کے کسی ایک درجے میں جمع ہوجائے تو وہ ان تمام کی گنجائش رکھتا ہے۔‘‘

حدیث میں ہے کہ جنت کے سب سے اعلیٰ درجے کا نام ’’فردوس‘‘ ہے:

" وَ الْفِرْدَوْسُ أَعْلَاهَا دَرَجَةً". (رواه الترمذی، مشکوٰة : ٤٩٦)

جن اعمال سے جنت میں درجات بلند ہوتے ہیں:

حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ تین اعمال ایسے ہیں جن سے جنت میں درجات بلند ہوتے ہیں: (۱) مشقت کے باوجود سنت طریقے کے مطابق مکمل وضو کرنا۔ (۲) مسجد کی طرف بہ کثرت جانا۔ (۳) ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا۔

(مسلم، مشکوٰۃ: ۳۸)

بعض جنتیوں کو ان کے اعمالِ صالحہ کی وجہ سے حق تعالیٰ بہت اونچے درجات عطا فرمائیں گے، حدیث پاک میں ہے:

" إِنَّ أَهْلَ الْجَنَّةِ يَتَرَاءَوْنَ أَهْلَ الْغُرَفِ مِنْ فَوْقِهِمْ، كَمَا تَتَرَاءَوْنَ الْكَوْكَبَ الدُّرِّيَّ الْغَابِرَ فِي الْأُفُقِ مِنَ الْمَشْرِقِ أَوِ الْمَغْرِبِ لِتَفَاضُلِ مَا بَيْنَهُمْ، قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! تِلْكَ مَنَازِلُ الْأَنْبِيَاءِ، لَا يَبْلُغُهَا غَيْرُهُمْ، قَالَ: بَلٰى وَ الَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ رِجَالٌ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ صَدَّقُوا الْمُرْسَلِيْنَ". (متفق عليه، مشکوٰة : ٤٩٦)

’’بلاشبہ جنت والے اپنے اوپر بالاخانوں کے رہنے والوں کو اس طرح دیکھیں گے جیسے تم چمکدار ستارے کو دیکھتے ہو، جو مشرق یا مغرب کے اُفق میں دور چلا گیا ہو۔ اور یہ فرقِ مراتب کی وجہ سے ہوگا، صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! (ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ) یہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے منازل ہوں گے، ان کے علاوہ وہاں کوئی نہ پہنچ سکے گا، آپ ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ پر (کامل

اور مکمل) ایمان لائے اور (جنہوں نے اپنے قول و عمل کے ذریعہ) رسولوں کی تصدیق کی (اور اس راہ میں آنے والی ہر تکلیف پر صبر و استقامت سے کام لیا)۔

قرآنِ کریم نے فرمایا:

﴿ أُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا ﴾ (الفرقان : ۷۸)

''یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ان کے صبر کے بدلے جنت کے بالاخانے دیے جائیں گے۔'' (اَللّٰهم اجعلنا منهم)

ایک اور حدیث میں ہے:

" إِنَّ فِي الْجَنَّةِ غُرَفًا يُرىٰ ظَاهِرُهَا مِنْ بَاطِنِهَا، وَ بَاطِنُهَا مِنْ ظَاهِرِهَا، أَعَدَّ اللّٰهُ لِمَنْ أَلَانَ الْكَلَامَ، وَ أَطْعَمَ الطَّعَامَ، وَ تَابَعَ الصِّيَامَ، وَ صَلّٰى بِاللَّيْلِ وَ النَّاسُ نِيَامٌ". (رواه البيهقي في شعب الإيمان، مشكوٰة : ۱۰۹)

''بلاشبہ جنت میں ایسے بالاخانے ہیں جن کا ظاہر ان کے باطن سے اور باطن ان کے ظاہر سے نظر آتا ہے، حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے یہ بالاخانے اس بندے کے لیے تیار فرمائے ہیں جو نرمی سے بات کرے اور کھانا کھلائے اور کثرت سے روزے رکھے اور رات میں جب لوگ سوئے ہوئے ہوں تو یہ نمازِ تہجد میں مشغول ہو۔'' اَللّٰهم اجعلنا منهم.

جنت کے محلات اور باغات:

جنت کے تمام درجات میں ہر جنتی کو نہایت عالی شان محلات اور باغات ملیں گے، یہ وعدہ رب العالمین نے قرآنِ کریم میں کیا ہے:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِينَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَا وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنّٰتِ عَدْنٍ ﴾ (التوبة : ۷۲)

''اور مؤمنین مرد و مؤمنات خواتین سے رب العالمین نے وعدہ فرمایا کہ (دنیا میں اگر وہ من چاہی زندگی پر رب چاہی زندگی کو ترجیح دیں گے تو آخرت کی دائمی زندگی میں) ان

کے لیے ایسی جنتیں اور باغات ہوں گے جن کے نیچے سے نہریں بہہ رہی ہوں گی، جہاں وہ ہمیشہ ہمیش رہنے والے ہیں، اور صاف ستھرے پاکیزہ محلات بھی اور ہمیشہ کے باغوں میں رہیں گے۔''

دوسرے مقام پر مؤمنین صالحین کے لیے رب العالمین نے ارشاد فرمایا:

﴿ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَ يُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ۝ ﴾ (الصف : ۱۲)

''حق تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف فرما دیں گے اور ایسے باغوں میں تمہیں داخل کریں گے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی اور ان باغات میں تمہیں نہایت پاکیزہ محلات عطا کیے جائیں گے یہی تو سب سے بڑی کامیابی ہے۔''

احادیث مبارکہ میں جنت کے محلات اور باغات کی تفصیلات بھی منقول ہیں، مثلاً حق تعالیٰ نے اپنے امر ''کُنْ'' سے جنت کے محلات اور باغات کو جس ترتیب سے تیار کیا اس کا تذکرہ ایک حدیث میں ہے کہ جنت کے محلات سونے اور چاندی کی اینٹوں سے بنے ہوئے ہیں، اس کا گارا اور مسالہ جس سے اینٹوں کو جوڑا جاتا ہے مشک ہے اور اس کے سنگریزے جو بچھے ہوئے ہیں وہ موتی اور یاقوت ہیں، جب کہ وہاں کی خاک گویا زعفران ہے۔

"قَالَ: لَبِنَةٌ مِنْ ذَهَبٍ وَ لَبِنَةٌ مِّنْ فِضَّةٍ، وَ مِلَاطُهَا الْمِسْكُ الْأَذْفَرُ، وَ حَصْبَاءُهَا اللُّؤْلُؤُ وَ الْيَاقُوتُ، وَ تُرْبَتُهَا الزَّعْفَرَانُ". (رواه أحمد و الترمذي و الدارمي، مشكوٰة : ۴۷۹)

ایک اور حدیث میں ہے کہ جنت کے محلات اور باغات کے تمام برتن اور کنگھیاں سونے اور چاندی کے ہوں گے اور جنتیوں کے محلات اور باغات میں ہر وقت فضا کو خوشبو سے معطر بنانے کے لیے عود جلتی رہے گی، حالانکہ خود جنتیوں کے پسینے بھی مشک کی طرح معطر ہوں گے۔ فرمایا:

" اٰنِیَتُهُمُ الذَّهَبُ وَ الفِضَّةُ، وَ أَمْشَاطُهُمُ الذَّهَبُ، وَ وَقُوْدُ مَجَامِرِهِمُ الْأَلُوَّةُ، وَ رَشْحُهُمُ المِسْكُ". (متفق علیه، مشکوٰة : ٤٩٦)

جنت کی نہریں، چشمے اور میوے:

قرآنِ کریم نے جا بہ جا جنت کے محلات اور باغات کے ساتھ اس کی نہروں کا بھی تذکرہ کیا ہے، فرمایا:

﴿ مَثَلُ الجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ط فِیْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَیْرِ اٰسِنٍ ج وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ یَتَغَیَّرْ طَعْمُهٗ ج وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِلشّٰرِبِیْنَ ج وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّی ط وَ لَهُمْ فِیْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَ مَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ط﴾ (محمد : ١٥)

''رب العالمین نے مؤمنین صالحین اور متقین کے لیے جس جنت کا وعدہ فرمایا ہے اس میں ایک تو ایسے پانی کی نہریں ہیں جس کا رنگ، بو اور مزہ کبھی بدلنے والا نہیں اور ایسے دودھ کی نہریں جو نہایت ہی لذیذ ہے اور اس کی لذت میں کبھی کوئی تغیر بھی نہ آئے گا اور ایسی شراب کی نہریں ہیں جن میں پینے والوں کے لیے بڑی لذت ہے اور ایسے شہد کی نہریں ہیں جو نہایت خالص اور صاف ستھرا ہے۔''

جنت کی ان تمام نہروں کے مشروبات نہایت عمدہ، تازہ، خوش ذائقہ، مفرح، صحت افزا اور روح افزا ہیں۔ قرآنِ کریم نے جنت کی جن چار نہروں کا تذکرہ فرمایا ہے حدیث پاک میں مذکور ہے کہ یہ چاروں نہریں جنت الفردوس سے نکلتی ہیں، جو جنت کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔ فرمایا:

" وَ الْفِرْدَوْسُ أَعْلَاهَا دَرَجَةً، مِنْهَا تُفَجَّرُ أَنْهَارُ الجَنَّةِ الْأَرْبَعَةُ". (رواه الترمذی، مشکوٰة : ٤٩٦)

مطلب یہ ہے کہ جنت الفردوس ان چاروں نہروں کا منبع اور مرکز ہے، پھر وہیں سے ان کی شاخیں پھوٹتی ہوئی دوسری جنتوں میں پہنچتی ہیں، جن میں سے اہل جنت عمدہ اور

میٹھا پانی، خوش ذائقہ دودھ، اعلیٰ قسم کی حلال و پاکیزہ شراب اور صاف و شفاف شہد حسب خواہش پییں گے۔

ان کے علاوہ اور بھی چار نہروں (یا چشموں) کا تذکرہ قرآنِ کریم نے کیا ہے، جن میں سے ایک ''کافور'' ہے، فرمایا:

﴿ اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ۝ عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ یُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِیْرًا۝﴾ (الدهر : ٥-٦)

''بلاشبہ نیک لوگوں کو جنت میں ایسا مشروب پیش کیا جائے گا جس میں کافور کے چشمے کا پانی ملا ہوا ہوگا اور اس مشروب سے کافور جیسی مہک آرہی ہوگی، حق تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کے لیے یہ ایسا چشمہ بنایا کہ وہ اپنے محلات اور باغات میں جدھر چاہیں گے موڑیں گے۔''

دوسری نہر اور چشمے کا نام ''زنجبیل'' ہے، فرمایا:

﴿ وَ یُسْقَوْنَ فِیْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِیْلًا۝﴾ (الدهر : ١٧)

''اور انہیں وہاں وہ جام پلائے جائیں گے جن کی آمیزش زنجبیل (سونٹھ، خشک اَدرک) کی ہوگی۔'' اس سے ایک قسم کی خوشبو دار تلخی پیدا ہوگی۔ آج کل عربوں کے قہووں میں زنجبیل شامل ہوتی ہے، یعنی جنت میں ایک شراب وہ ہوگی جس میں کافور کی آمیزش کی وجہ سے ٹھنڈک ہوگی تو دوسری شراب وہ ہوگی جس میں زنجبیل کی ملاوٹ کی وجہ سے گرمی ہوگی۔

تیسری نہر اور چشمے کا نام ہے: ''سلسبیل''۔ فرمایا:

﴿ عَیْنًا تُسَمّٰی فِیْهَا سَلْسَبِیْلًا۝﴾ (الدهر : ١٨)

جنت کی ایک نہر اور چشمے کا نام ''سلسبیل'' ہے، مراد ایسا میٹھا پانی جو ہلکا اور خوش ذائقہ ہونے کی بنا پر حلق سے بہ سہولت اُتر جائے۔

چوتھی نہر اور چشمے کا نام ہے: ''تسنیم''۔ فرمایا:

﴿ وَ مِزَاجُهٗ مِنۡ تَسۡنِيۡمٍ﴾ (المطففين : ۲۷)

یہ جنت کی وہ نہر اور چشمہ ہے جس میں اعلیٰ درجے کی شراب ہے، جس میں سے مقرب بندے بہ طورِ خاص پئیں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان تمام کی حقیقت، کیفیت اور لذت تو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، آج اس کا تصور بھی مشکل ہے۔

جہاں تک تعلق ہے جنت کے میووں کا تو انہیں قرآنِ کریم نے اس طرح بیان کیا:

﴿ وَ لَهُمۡ فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ﴾ (محمد : ۱۵)

''مؤمنین صالحین کے لیے جنت میں ہر طرح کے میوے اور پھل ہوں گے۔''

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ إِنَّ الۡمُتَّقِيۡنَ فِيۡ ظِلٰلٍ وَّ عُيُوۡنٍ○ وَّ فَوَاكِهَ مِمَّا يَشۡتَهُوۡنَ○﴾
(المرسلات : ۴۱-۴۲)

''بلاشبہ متقین جنت کے (درختوں اور محلات کے) سایے میں ہوں گے اور بہتے چشموں (کے مشروبات کا مزہ لے رہے ہوں گے) اور ہر قسم کے (اور ہر موسم کے تازہ اور عمدہ) پھل جب بھی خواہش کریں گے موجود ہوں گے۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ وَ دَانِيَةً عَلَيۡهِمۡ ظِلٰلُهَا وَ ذُلِّلَتۡ قُطُوۡفُهَا تَذۡلِيۡلًا○﴾ (الدهر : ۱۴)

''ان جنتیوں پر ان کے سایے جھکے ہوئے ہوں گے اور ان میووں کے گچھے لٹکے ہوئے ہوں گے۔''

یعنی جنت میں سورج اور اس کی حرارت تو نہ ہوگی؛ لیکن نورِ الٰہی کا بہترین سایہ ہوگا۔ یا مطلب یہ ہے کہ جنت میں دھوپ نہ ہوگی، سایہ ہی سایہ ہوگا۔ یا وہاں درختوں کی شاخیں جھکی ہوئی ہوں گی، جن سے بہترین سایہ بن جائے گا، سایہ بھی بہت قریب اور نہایت گھنا ہوگا، اور جو پھل ہوں گے وہ سب ان کے اختیار میں ہوں گے، جنہیں جنتی کھڑے ہو کر،

بیٹھے ہوئے، لیٹے ہوئے جس طرح چاہیں گے توڑ سکیں گے۔

اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَسۡأَلُكَ الۡجَنَّةَ، وَ نَعُوۡذُ بِكَ مِنَ النَّارِ.

اہل جنت کے اَوصاف:

ظاہر ہے اللہ رب العزت کی اس وسیع وعریض جنت اور اس کے درجات، محلات اور باغات میں رہنے والے لوگ معمولی تو نہیں ہوں گے؛ بلکہ نہایت اعلیٰ اخلاق و اوصاف کے حامل ہوں گے، ان کا ظاہر بھی بہت اچھا ہوگا اور باطن بھی، وہ خوب صورت بھی ہوں گے اور نیک سیرت بھی، کیوں کہ حق تعالیٰ ان کے دل سے تمام کدورتوں کو دور فرما دیں گے۔ ارشادِ باری ہے:

﴿ وَ نَزَعۡنَا مَا فِيۡ صُدُوۡرِهِمۡ مِّنۡ غِلٍّ﴾ (الأعراف : ۴۳)

''جو کچھ بھی ان کے دلوں میں کینہ اور کدورت تھی ہم اس کو دور کر دیں گے۔'' جس کا ثمرہ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ وہاں کسی کی طرف سے دل میں کوئی حسد، عداوت اور بغض و کدورت نہ ہوگی اور تمام جنتی آپس میں پیار، محبت اور دوستی و بھائی چارے کے ماحول میں رہیں گے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ

بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد　　　کسے را با کسے کارے نہ باشد

جنت میں اہل جنت کا تکیۂ کلام "سبحانك اللّٰهم" ہوگا اور باہمی ملاقات کے وقت جیسے دنیا میں سلام کرتے تھے ویسے جنت میں بھی سلام کریں گے۔ اور اپنی ہر بات کے اخیر میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہیں گے: الحمد للہ رب العالمین۔ قرآنِ پاک میں فرمایا گیا:

﴿ دَعۡوٰهُمۡ فِيۡهَا سُبۡحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِيَّتُهُمۡ فِيۡهَا سَلٰمٌ ۚ وَ اٰخِرُ دَعۡوٰهُمۡ أَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ○﴾ (يونس : ۱۰)

فرشتے بھی جنتیوں کے دروازوں پر آئیں گے تو سلام کریں گے، فرمایا:

﴿ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ ﴾
(الرعد : ٣٢-٣٣)

سب سے اہم بات یہ ہے کہ خود حق تعالیٰ بھی اہل جنت کو سلام کریں گے، فرمایا:

﴿ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ۝ ﴾ (یٰس: ٥٨)

حدیث میں اہل جنت کے مزید اوصاف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جنت میں داخل ہونے والے سب سے پہلے گروہ کے چہرے چودہویں رات کے چاند کی طرح چمکدار ہوں گے، دوسرے گروہ کے چہرے آسمان کے ستاروں کی طرح روشن ہوں گے۔

" إِنَّ أَوَّلَ زُمْرَةٍ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ضَوْءُ وُجُوْهِهِمْ عَلىٰ مِثْلِ ضَوْءِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ، وَ الزُّمْرَةُ الثَّانِيَةُ عَلىٰ مِثْلِ أَحْسَنِ كَوْكَبٍ دُرِّيٍّ فِي السَّمَاءِ".
(رواه الترمذی، مشكوٰة : ٤٩٧)

جنتیوں کے چہرے پر ڈاڑھی اور مونچھ کے بال نہیں ہوں گے، نیز سر کے علاوہ باقی جسم پر بھی کہیں بال نہ ہوں گے۔ اور جنتیوں کی آنکھیں قدرتی طور پر سرمگیں ہوں گی، ان کی جوانی لازوال ہوگی، یعنی تمام جنتی ہمیشہ جوان رہیں گے اور ان کے کپڑے پرانے نہیں ہوں گے، حدیث میں ہے:

" أَهْلُ الْجَنَّةِ جُرْدٌ مُرْدٌ، كُحْلٌ، لَا يَفْنىٰ شَبَابُهُمْ وَ لَا تَبْلىٰ ثِيَابُهُمْ".
(رواه الترمذی، مشكوٰة : ٤٩٨)

دوسری روایت میں ہے کہ ہر جنتی کی عمر تیس یا تینتیس (٣٣) سال کی ہوگی:

" أَبْنَاءُ ثَلَاثِيْنَ أَوْ ثَلَاثٍ وَ ثَلَاثِيْنَ سَنَةً". (رواه الترمذی، مشكوٰة : ٤٩٨)

ہر جنتی کا قد حضرت آدم علیہ السلام کی طرح ساٹھ ہاتھ (٩٠ فٹ) بلند ہوگا:

" عَلىٰ صُوْرَةِ أَبِيْهِمْ اٰدَمَ سِتُّوْنَ ذِرَاعًا فِي السَّمَاءِ". (متفق علیه، مشكوٰة : ٤٩٦)

اہل جنت ہمیشہ صحت مند رہیں گے، کبھی بیمار نہ ہوں گے، ہمیشہ جوان رہیں گے، کبھی بوڑھے نہ ہوں گے، ہمیشہ زندہ رہیں گے، کبھی نہیں مریں گے اور ہمیشہ خوش رہیں گے،

٣٣٨

کبھی پریشان نہیں ہوں گے۔ حدیث میں وارد ہے کہ جنت میں اللہ تعالیٰ کا منادی یہ اعلان کرے گا:

" إِنَّ لَكُمْ أَنْ تَصِحُّوْا فَلَا تَسْقَمُوْا أَبَدًا، وَ إِنَّ لَكُمْ أَنْ تَحْيَوْا فَلَا تَمُوْتُوْا أَبَدًا، وَ إِنَّ لَكُمْ أَنْ تَشِبُّوْا فَلَا تَهْرَمُوْا أَبَدًا، وَ إِنَّ لَكُمْ أَنْ تَنْعَمُوْا فَلَا تَبْأَسُوْا أَبَدًا".
(رواه مسلم، مشكوٰة : ٤٩٦)

اہل جنت کے جوڑے:

سب سے مزے کی بات تو یہ ہے کہ اہل جنت کو بن بیاہا اور اکیلا نہیں رکھا جائے گا، ہر جنتی مرد و عورت کا جوڑا بنایا جائے گا، ہر جنتی کو کم از کم دو جنتی حوریں ملیں گی۔ حدیث پاک میں وارد ہے:

" لِكُلِّ امْرِءٍ مِنْهُمْ زَوْجَتَانِ مِنَ الْحُوْرِ الْعِيْنِ". (متفق علیه، مشكوٰة : ٤٩٦)

یہ حوریں جنت کی انتہائی حسین و جمیل عورتیں ہوں گی، قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿ وَ حُوْرٌ عِيْنٌ ۝ كَأَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ۝ ﴾ (الواقعة : ٢٢-٢٣)

''اہل جنت کے لیے خوب صورت آنکھوں والی حوریں ہوں گی، ایسی حوریں جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی۔''

حق تعالیٰ ان حوروں کے ساتھ باقاعدہ جنتی مردوں کا نکاح کرائیں گے، فرمایا:

﴿ وَ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ۝ ﴾ (الطور : ٢٠)

''اور ہم خوب صورت آنکھوں والی حوروں کا ان سے نکاح کر دیں گے۔'' یہ ان کے شوہروں کی ہم عمر ہوں گی۔

﴿ وَ عِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ أَتْرَابٌ ۝ ﴾ (ص : ٥٢)

اس کے علاوہ ہر ادنیٰ درجے کے جنتی کو اَسّی ہزار خادم اور بہتّر دوسری جنتی عورتیں دی جائیں گی۔ حدیث میں ہے:

”أَدنیٰ أَھلِ الجَنَّةِ الذِیْ لَہٗ ثَمَانُوْنَ أَلفَ خَادِمٍ، وَ اثْنَتَانِ وَ سَبْعُوْنَ زَوْجَةً“. (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ : ٤٩٩)

علاوہ ازیں جنتی کو اتنی طاقت اور قوت دی جائے گی کہ وہ ایک ایک دن میں سوسو عورتوں سے مباشرت کر سکے۔

”یُعْطیٰ قُوَّةَ مِائَةٍ“. (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ : ٤٩٧)

رہی بات جنتی خواتین کی، تو پہلی بات تو یہ ہے کہ جنت میں داخل ہونے والی خواتین کو حق تعالیٰ نئے سرے سے پیدا فرمائیں گے اور وہ کنواری ہونے کی حالت میں جنت میں داخل ہوں گی۔فرمایا:

﴿ إِنَّآ أَنشَأْنٰھُنَّ إِنشَآءًO فَجَعَلْنٰھُنَّ أَبْكَارًاO عُرُبًا أَتْرَابًاO﴾ (الواقعة : ۳۵-۳۶-۳۷)

”اہل جنت کی بیویوں کو ہم نئے سرے سے پیدا کریں گے اور انہیں باکرہ بنائیں گے، وہ اپنے شوہروں سے محبت کرنے والی ہوں گی اور ان کی ہم عمر ہوں گی۔“

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ قرآنِ کریم نے ان خواتین کا ذکر بڑے لطیف انداز میں فرمایا ہے کہ بس ضمیر سے ان کی طرف اشارہ فرمادیا ہے، صراحت کے ساتھ نام نہیں لیا، اس میں بڑی بلاغت بھی ہے اور ان خواتین کی پردہ پوشی بھی۔بعض مفسرین نے ان سے حوریں مراد لی ہیں جو جنتیوں کے لیے خاص پیدا کی گئی ہیں، یا پیدا کی جائیں گی۔ اور بعض مفسرین نے کہا کہ ان سے مراد نیک لوگوں کی وہ بیویاں ہیں جو دنیا میں ان کی شریک حیات تھیں، آخرت میں انہیں نئی اُٹھان دینے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں وہ کیسی ہی رہی ہوں، جنت میں انہیں شوہروں کے لیے بہت خوب صورت بنا دیا جائے گا، جیسا کہ ایک حدیث میں اس کی صراحت ہے، اسی طرح وہ خواتین جو دنیا میں بن بیاہی رہ گئی تھیں انہیں بھی نئی اُٹھان دے کر کسی نہ کسی جنتی سے ان کا نکاح کر دیا جائے گا۔حدیث کی متعدد روایتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت دونوں قسم کی عورتوں کو شامل ہے، حوروں کو

بھی اور دنیا کی نیک خواتین کو بھی۔تفصیل کے لیے دیکھئے روح المعانی۔

(آسان ترجمہ قرآن:۱۶۶۳)

دوسرے مقام پر قرآنِ کریم نے فرمایا کہ یہ جنتی خواتین ہر قسم کی ظاہری و باطنی گندگی سے پاک ہوں گی، ظاہری گندگی جیسے حیض، نفاس، پیشاب، پاخانہ وغیرہ، اور باطنی گندگی جیسے حسد، جلن، کینہ، غصہ وغیرہ۔فرمایا:

﴿ وَ لَھُمْ فِیْھَآ أَزْوَاجٌ مُّطَھَّرَةٌ﴾ (البقرة : ۲۵)

”ان کے لیے پاک بیویاں ہوں گی۔“

ایک اور مقام پر قرآنِ کریم نے فرمایا کہ جنتیوں کی یہ بیویاں حسن صورت اور حسن سیرت ہر اعتبار سے بے مثال ہوں گی۔فرمایا:

﴿ فِیْھِنَّ خَیْرَاتٌ حِسَانٌO﴾ (الرحمٰن : ۷۰)

”جنت میں خوب صورت اور نیک سیرت بیویاں ہوں گی۔“

قرآنِ کریم کے بیان کے مطابق جنت کی خوشیوں کی تکمیل دنیا کی عورتوں کی رفاقت کے بغیر نہ ہوگی، اس لیے قرآنِ کریم نے فرمایا کہ اہل ایمان کو ان کی مؤمنہ بیویوں کے ساتھ جنت میں داخل ہونے کا حکم ہوگا۔فرمایا:

﴿ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ أَنْتُمْ وَ أَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَO﴾ (الزخرف : ۷۰)

”تم اور تمہاری بیویاں راضی خوشی جنت میں داخل ہوجاؤ۔“

حدیث میں آتا ہے کہ یہ نیک خواتین یعنی مؤمناتِ صالحات جنت میں حوروں کی سردار اور ہر اعتبار سے ان سے افضل و بہتر ہوں گی، حدیث پاک میں ہے کہ سیدہ اِم سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے حضور ﷺ سے عرض کیا:

”أَخْبِرْنِیْ ! نِسَاءُ الدُّنْیَا أَفْضَلُ أَمِ الْحُوْرُ الْعِیْنُ؟“

دنیا کی مؤمناتِ صالحات افضل ہیں یا حورِ عین؟ فرمایا:

"بَلُ نِسَاءُ الدُّنُيَا أَفُضَلُ مِنَ الُحُوُرِ الُعِيُنِ". (رواه الطبراني)

فرمایا: دنیا کی خواتین جنت کی حورِعین سے افضل ہیں، جس طرح اوپر کا کپڑا نیچے کے کپڑے سے افضل ہے، کیوں کہ مؤمناتِ صالحات نے نماز، روزے اور دیگر عبادات کا اہتمام کیا ہے، جنت کی عورتوں اور حوروں نے وہ نہیں کیا، اس لیے بہرحال دنیا کی مؤمناتِ صالحات ہی افضل ہیں۔ اور جنتی مردوں کے دلوں میں ان کی بیویوں کی جو محبت و رغبت ہوگی حوریں اسے حاصل نہیں کرسکیں گی۔

جنت کی سب سے بڑی نعمت اللہ کی رضا اور دیدار ہے:

ان سب کے علاوہ جنت کی سب سے بڑی نعمت اللہ رب العزت کی زیارت ہے، حق تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں مؤمنین صالحین کو اپنی جنت کی دائمی رضا کی خوش خبری سناتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ يُبَشِّرُهُمُ رَبُّهُمُ بِرَحُمَةٍ مِّنُهُ وَ رِضُوَانٍ وَ جَنّٰتٍ لَّهُمُ فِيُهَا نَعِيُمٌ مُّقِيُمٌ ﴾ (التوبة : ۲۱)

"ان کا رب انہیں اپنی رحمت و رضا اور ایسے باغات کی خوش خبری دیتا ہے جہاں ان کے لیے دائمی نعمتیں ہوں گی۔"

حدیث میں ہے کہ جنتیوں کو جنت میں ہر قسم کی کامل اور مکمل نعمتیں عطا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اے جنتیو! تم راضی اور خوش ہو؟ "هل رضيتم؟" وہ کہیں گے: ہم کیوں راضی نہ ہوں، جب کہ آپ نے اپنے فضل و کرم کی انتہا کر دی، تب حق تعالیٰ فرمائیں گے:

"أُحِلُّ عَلَيُكُمُ رِضُوَانِيُ، فَلاَ أَسُخَطُ عَلَيُكُمُ بَعُدَهٗ أَبَدًا". (متفق عليه، مشكوٰة : ۴۹۶)

"میں بھی تم سے راضی اور خوش ہوں اور تمہیں اپنی دائمی رضامندی و خوش نودی کا تحفہ دیتا ہوں، اب کے بعد میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔"

صاحبو! اللہ تعالیٰ کی رحمت کی قسم! جنت میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور خوش نودی سے بڑی اور کوئی کامیابی نہیں ہوگی، اسی کو فرمایا:

﴿ وَ رِضُوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ أَكُبَرُ ذٰلِكَ الُفَوُزُ الُعَظِيُمُ ﴾ (التوبة : ۷۲)

اس کے بعد جنت میں تکمیل نعمت کا سب سے بڑا، سب سے اہم اور آخری مرحلہ باقی رہ جائے گا۔ اور وہ ہے اللہ رب العزت کی زیارت۔ دنیا میں جسے دیکھے بغیر ہم نے اسی کی توفیق سے اس کو مانا تھا، اس کے غیب پر ایمان لائے تھے، اس کی عبادت کی، اس کے کعبہ کا طواف کیا، اس کا دیدار جنت میں ہو جائے گا، جنت میں تمام جنتی رب کریم کا واضح طور پر اس طرح دیدار کریں گے جس طرح چودھویں کے چاند کو واضح اور مکمل شکل میں ہم دیکھتے ہیں، حدیث میں ہے:

"إِنَّكُمُ سَتَرَوُنَ رَبَّكُمُ كَمَا تَرَوُنَ هٰذَا الُقَمَرَ". (متفق عليه، مشكوٰة: ۵۰۰)

دیدارِ الٰہی کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ جب تمام جنتی جنت میں داخل ہو جائیں گے تو حق تعالیٰ فرمائیں گے:

"تُرِيُدُوُنَ شَيُئًا أَزِيُدُكُمُ؟"

"کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں ایک چیز مزید عطا کروں؟" یعنی تمہیں اب تک جنت میں جتنی نعمتیں اپنے فضل و کرم سے عطا کیں اس پر مزید کسی خاص نعمت سے مالا مال کروں؟ جواباً بندے عرض کریں گے: الٰہی! آپ نے اپنے فضل و کرم سے ہمارے چہرے روشن کیے، یعنی سرخ روئی اور خوب روئی عطا فرمائی، ہمیں جہنم سے بچا کر جنت میں جگہ عطا فرمائی، اب اس کے آگے اور کیا چیز ہو سکتی ہے؟ جس کی ہم خواہش کریں۔ یعنی بندوں کو سمجھ میں نہیں آئے گا کہ کس خواہش کا اب اظہار کیا جائے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ اچانک نور کے ستر ہزار پردے ہٹا دیے جائیں گے اور: "فَيَنُظُرُوُنَ إِلىٰ وَجُهِ اللّٰهِ" جنتی اپنے رب کا دیدار کریں گے، اس وقت ان کا حال یہ ہوگا کہ انہیں یہ محسوس ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی زیارت

سے بڑی کوئی نعمت نہیں، اس کے بعد حضور ﷺ نے آیت کریمہ ﴿ لِلَّذِيْنَ أَحْسَنُوا الحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ﴾ تلاوت فرمائی۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ: ۵۰۰)

جس میں حق تعالیٰ نے مؤمنین صالحین کے لیے زیادۃ کا جو وعدہ فرمایا ہے تو اس سے مراد حق تعالیٰ کی زیارت ہے، جو جنت کی سب سے عظیم نعمت ہے، قرآن نے اسے دوسرے ایک مقام پر یوں فرمایا:

﴿ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ إِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ (القيامة : ۲۲)

''اس روز کچھ چہرے تر و تازہ ہوں گے، اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔'' اور اپنی خوشی، خوب صورتی اور نعمتوں میں مزید اضافہ کر رہے ہوں گے۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْهُمْ، اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَسْأَلُكَ الجَنَّةَ، وَ نَعُوْذُ بِكَ مِنَ النَّارِ، بِرَحْمَتِكَ وَ كَرَمِكَ يَا رَحْمٰنُ وَ يَا كَرِيْمُ وَ يَا غَفَّارُ! آمين، و اٰخِرُ دعوٰنا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

إِلٰهِىْ لَسْتُ لِلْفِرْدَوْسِ أَهْلاً　　وَ لَا أَقْوٰى عَلىٰ نَارِ الجَحِيْمِ
فَهَبْ لِىْ تَوْبَةً وَ اغْفِرْ ذُنُوْبِىْ　　فَإِنَّكَ غَافِرُ الذَّنْبِ الْعَظِيْمِ

۱۴؍ رمضان المبارک؍ ۱۴۴۱ھ
مطابق: ۸؍ مئی؍ ۲۰۲۰ء
بروز جمعہ، قبل المغرب
بزمِ صدیقی، بڑودا

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيْرًا　　فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيْرًا كَثِيْرًا

(۳۷)

بابرکت اور نفع بخش تجارت کے بنیادی اصول

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ عُبَيْدِ بْنِ رِفَاعَةَ عَنْ أَبِيْهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: "التُّجَّارُ يُحْشَرُوْنَ يَوْمَ القِيَامَةِ فُجَّارًا، إِلَّا مَنِ اتَّقٰى وَ بَرَّ وَ صَدَقَ". (رواه الترمذی و ابن ماجه و الدارمی، مشکوٰة : ۲۴۴، باب المساهلة فی المعاملة)

''حضرت عبید بن رِفاعہؒ (تابعی) اپنے والد گرامی (حضرت رِفاعہ بن رافع صحابی انصاریؓ) سے اور وہ رحمت عالم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ قیامت کے دِن تاجر حضرات کا حشر فاجر (یعنی علانیہ بہ کثرت کبائر کا ارتکاب کرنے والے مثلاً کھلم کھلا بہت جھوٹ بولنے اور دھوکہ دینے والے) ہونے کی حالت میں ہوگا (ہاں وہ تاجر اس سے مستثنیٰ ہوں گے) جنھوں نے تقویٰ اور پرہیزگاری (محرمات اور منکرات وشبہات سے بچتے ہوئے تجارت کی ہوگی) اور نیکی (اپنے تجارتی معاملات میں لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور نرمی سے کام لیا ہوگا۔ یا پھر جنھوں نے تجارت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت میں فرق اور کمی نہیں آنے دی) اور سچائی سے کام لیا ہوگا۔''

کسبِ معاش کی ترغیب:

اللہ رب العزت نے اپنے بندوں کو فکرِ معاد (موت کے بعد کی دائمی زندگی کی بہتری کے لیے فکر و کوشش) کے ساتھ کسبِ معاش (یعنی ضروریاتِ زندگی کے حصول اور تکمیل کی فکر کرنے) کا بھی مکلّف بنایا ہے، فرق یہ ہے کہ فکرِ معاد تو ہماری زندگی کا مقصد ہے، جب کہ کسبِ معاش زندگی کی ضرورت ہے، یہی وجہ ہے کہ رب العالمین نے بندوں کی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کے لیے کسبِ معاش کا انتظام فرمایا، ارشاد ہے:

﴿ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ ﴾ (الأعراف : ١٠)

''اور ہم نے روئے زمین پر تمہارے لیے معاش کے اسباب و وسائل مہیا کردیے۔''

حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کو جہاں فکرِ معاد کی ترغیب و تاکید فرمائی وہاں کسبِ معاش کی بھی ترغیب دی، قرآنِ کریم میں حق تعالیٰ نے ان اسباب و وسائل کو تلاش کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

﴿ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ﴾ (الجمعة : ١٠)

''روئے زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل (روزی) تلاش کرو۔''

البتہ اس کا پابند ضرور کیا کہ کسبِ معاش کے اسباب و وسائل حلال و پاکیزہ ہوں، چنانچہ دوسرے مقام پر اپنے تمام ہی بندوں کو خطاب کرتے ہوئے رب العالمین نے فرمایا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ﴾ (البقرة : ١٦٨)

''لوگو! زمین میں جتنی بھی حلال پاکیزہ چیزیں ہیں (وہ تمام چیزیں جو شرعاً حرام نہیں، جن پر کسی غیر کا حق نہ ہو، کماؤ اور) وہ کھاؤ۔''

چند آیتوں کے بعد اسی کی ترغیب اپنے وفادار بندوں کو دیتے ہوئے فرمایا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ﴾ (البقرة : ١٧٢)

مختلف نبیوں نے کسبِ معاش کے مختلف ذرائع اختیار کیے:

یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وفادار بندوں نے ہر زمانے میں اس کا اہتمام کیا اور کسبِ معاش کے مختلف حلال و پاکیزہ ذرائع اختیار کیے، اللہ تعالیٰ کے سب سے برگزیدہ اور وفادار بندے حضرات انبیاء و رُسل علیہم السلام تک نے بھی اس کا اہتمام فرمایا۔ چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی تحقیق اس سلسلے میں یہ ہے کہ

(۱) حضرت آدم علیہ السلام نے کسبِ معاش کے لیے کاشت کاری اور کھیتی کا ذریعہ اختیار فرمایا۔

(۲) حضرت ادریس علیہ السلام نے درزی کا پیشہ اختیار فرمایا۔

(۳) حضرت نوح علیہ السلام نے نجاری (بڑھئی کے کام) کو ذریعۂ معاش بنایا۔

(۴) حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام نے تجارت کو ذریعہ معاش بنایا۔

(۵) حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذریعہ معاش کھیتی باڑی تھا۔

(۶) حضرت لوط علیہ السلام کا معاشی مشغلہ بھی کھیتی باڑی تھا۔

(۷) حضرت شعیب علیہ السلام کا ذریعہ معاش بکریاں پالنا تھا۔

(۸) یہی مشغلہ اور کسبِ معاش کا ذریعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھی تھا۔

(۹) حضرت داود علیہ السلام کا ذریعہ معاش لوہے کی زرہ بنانا تھا۔

(۱۰) حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذریعہ معاش ٹوکریاں بنانا تھا۔

(۱۱) حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا ذریعہ ابتداءً تجارت تھا، ہجرت کے بعد جہاد فی سبیل اللہ تھا۔ (تفسیر عزیزی: ۱/۲۴۵)

صاحبو! اللہ تعالیٰ کے وفادار بندے خوددار ہوتے ہیں، وہ قوم کے نذرانوں،

مریدوں کے ہدیوں اور لوگوں کے سہاروں پر پلنا اور جینا پسند نہیں کرتے، اپنے لیے ذریعہ معاش کا حلال و پاکیزہ انتظام ضرور کرتے ہیں اور کرنا ہی چاہیے۔

کسب معاش کی بابرکت اور نفع بخش صورت تجارت ہے:

یوں تو کسب معاش کی بہت سی حلال و پاکیزہ صورتیں ہیں، من جملہ ان کے ایک صورت زراعت ہے، جیسا کہ حضرت آدم، حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہم السلام نے اسے اختیار فرمایا تھا۔ ایک صورت ہے صنعت، جیسا کہ حضرت ادریس، حضرت نوح، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام نے اسے اختیار فرمایا تھا۔ اسی طرح ایک صورت ہے ملازمت، جیسا کہ حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ علیہما السلام نے اسے بھی اختیار فرمایا تھا۔ ایک صورت ہے تجارت، جیسا کہ حضرت ہود، حضرت صالح علیہما السلام اور جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا ہجرت سے قبل یہی ذریعہ معاش تھا۔ ان میں سے جو صورت مناسب ہو اختیار کی جاسکتی ہے؛ لیکن کسب معاش کی سب سے بابرکت اور نفع بخش صورت تجارت ہے۔

تجارت کے بابرکت ہونے کی چار وجہیں:

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے نبوت سے قبل جہاں بکریاں چرانے کا پیشہ اختیار فرمایا تھا تو بعد میں آپ ﷺ نے تجارت کا پیشہ بھی اختیار فرمایا۔ اور تجارت میں آپ ﷺ کی سچائی و امانت داری ہی ام المؤمنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ شادی کا سبب بنی۔ (جس کا تفصیلی تذکرہ طبقاتِ کبریٰ میں ہے) تجارت کے سلسلے میں آپ ﷺ نے ملک شام کے علاوہ دو مرتبہ یمن کا سفر بھی فرمایا، جیسا کہ حضرت امام حاکمؒ نے اپنی مستدرک میں اسے نقل فرمایا ہے۔ نیز بحرین کے سفر کا بھی اشارہ ملتا ہے، جیسا کہ بحرین سے آنے والے ایک وفد عبدالقیس سے آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ میں تمہارے ملک میں خوب

گھوما ہوں۔ (ملاحظہ فرمائیں: مسند احمد)۔

تجارت کے بہتر و افضل اور بابرکت و نفع بخش ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ کاشت کار، ملازم اور مزدور کے بالمقابل تاجر اپنے اوقات اور تجارتی معاملات میں بڑی حد تک بظاہر مختار اور حاکم ہوتا ہے، وہ جب اور جس طرح چاہے تجارت کرسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ تجار پرہیزگار و ابرار بن جائیں تو شریعت کی ہدایات اور بنیادی اصول کے مطابق تجارت بھی کرسکتے ہیں اور اللہ پاک کی عبادت اور دین کی خدمت بھی انجام دے سکتے ہیں، جس سے بالیقین ان کی تجارت بابرکت اور دارین کے اعتبار سے نفع بخش ثابت ہوسکتی ہے۔

نیز تجارت کے افضل و بہتر اور بابرکت و نفع بخش ہونے کی تیسری وجہ یہ ہے کہ تجارت کسب معاش کے دیگر ذرائع کو بھی شامل ہے، آپ دیکھئے کہ زراعت سے جو چیزیں پیدا ہوتی ہیں مثلاً پھل، سبزیاں، اناج، ترکاریاں وغیرہ، تجارت ان کی بھی ہوتی ہے، اسی طرح صنعت کے ذریعہ جو چیزیں تیار ہوتی ہیں خواہ وہ کارخانوں میں ہوں یا گھروں میں، تجارت ان کی بھی ہوتی ہے، خواہ وہ معمولی ہوں یا غیر معمولی و قیمتی، مثلاً اس وقت اگر ہوائی جہاز کا بزنیس ہوتا ہے تو کچرے کی بھی تجارت ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسب معاش کے جتنے بھی ذرائع ہیں ان تمام کی تجارت کی جاسکتی ہے۔ غالبًا اسی لیے حضور ﷺ نے ایک موقع پر تجارت کی اہمیت اس طرح بیان فرمائی کہ

"تِسْعَةُ أَعْشَارِ الرِّزْقِ فِي التِّجَارَةِ، وَ العُشْرُ فِي الْمَوَاشِيْ". (كنز العمال: ۱۹۲/۲)

"رزق کے نو حصے تجارت میں ہیں اور ایک حصہ چوپایوں کی پرورش میں ہے۔"

یعنی تجارت کسب معاش کا بہت بابرکت اور نفع بخش ذریعہ ہے۔

چوتھی وجہ یہ بھی ہے کہ احادیث مبارکہ میں خود حضور ﷺ نے تجارت کی فضیلت بیان فرمائی۔ ایک حدیث میں ہے:

"إِنَّ أَطْيَبَ الْكَسْبِ كَسْبُ التُّجَّارِ الَّذِيْنَ إِذَا حَدَّثُوْا لَمْ يَكْذِبُوْا، وَ إِذَا

ائْتُمِنُوْا لَمْ يَخُوْنُوْا، وَ إِذَا وَعَدُوْا لَمْ يُخْلِفُوْا، وَ إِذَا اشْتَرَوْا لَمْ يَذُمُّوْا، وَ إِذَا بَاعُوْا لَمْ يَمْدَحُوْا، وَ إِذَا كَانَ عَلَيْهِمْ لَمْ يَمْطُلُوْا، وَ إِذَا كَانَ لَهُمْ لَمْ يُعَسِّرُوْا". (رواه البيهقي في شعب الإيمان، باب في حفظ اللسان)

''بہترین کمائی ان تاجروں کی ہے (جو تقویٰ کے ساتھ شریعت کی ہدایات اور بنیادی اصول کے مطابق تجارت کرتے ہیں، یعنی) جو جھوٹ نہیں بولتے (خواہ نفع ہو یا نقصان، نفع کم ہو یا زیادہ، معاملہ تجارت کا ہو یا اور کوئی) امانت میں خیانت نہیں کرتے (کسی دوسری کمپنی کے مال پر اپنا سکہ لگا کر یا نقلی کو اصلی بتا کر نہیں بیچتے) وعدہ خلافی نہیں کرتے، خریدتے وقت (خریدی جانے والی چیز کی) مذمت اور برائی نہیں کرتے (تا کہ بیچنے والا قیمت کم کردے) اور جب خود بیچتے ہیں تو اپنے مال کی بے جا تعریف نہیں کرتے (تا کہ قیمت زیادہ وصول کی جا سکے) اگر ان کے ذمے کسی کا کچھ مال وغیرہ ہو تو ادائیگی میں ٹال مٹول نہیں کرتے (کل آنا، بعد میں دے دیں گے، وغیرہ) اور اگر خود ان کا کسی کے ذمے کچھ مال وغیرہ ہو تو سختی اور تنگی نہیں کرتے (نرمی اور چشم پوشی سے کام لیتے ہیں)۔''

تجار کی دو قسمیں ہیں:

تجار کی دو قسمیں ہیں: (۱) ابرار (۲) فجار۔ حدیث پاک میں جن علامات و اَوصاف کا ذکر ہے وہ جس تاجر میں پائے جائیں عاجز کے خیالِ ناقص میں وہی تجار دراصل ابرار و پرہیزگار ہیں، جن کے لیے یہ بشارت ہے کہ وہ قیامت کے دن نفسی نفسی کے عالم میں عرشِ الٰہی کے زیرِ سایہ ہوں گے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، جس میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

"التَّاجِرُ الصَّدُوْقُ تَحْتَ ظِلِّ الْعَرْشِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ". (الترغيب، مرقاة)

''سچا تاجر قیامت کے دن عرشِ الٰہی کے سایے میں ہوگا۔''

اس کے علاوہ اس کے لیے یہ بشارت بھی ہے کہ

"التَّاجِرُ الصَّدُوْقُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَاءِ". (رواه الترمذي، مشكوٰة: ۲٤۳، باب المساهلة)

''سچا تاجر جنت میں انبیاء علیہم السلام، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔''

اس کے برخلاف جن تجار میں یہ اوصاف نہ ہوں وہ فجار ہیں، ان کی تجارت میں نہ برکت ہوتی ہے، نہ ان کی تجارت انجام کے اعتبار سے نفع بخش ہوتی ہے، ایسے لوگ دنیا میں جیسے چاہے رہیں؛ لیکن قیامت کے دن بالیقین خسارے اور نقصان میں ہوں گے، جیسا کہ حدیث مذکورہ میں فرمایا۔ اور قرآنِ کریم نے فرمایا:

﴿أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ۝﴾ (ص: ۲۸)

''کیا ہم پرہیزگاروں کو فجار جیسا کر دیں گے؟'' ایسا ہرگز نہ ہوگا، کل قیامت کے دن پرہیزگار تجار تو کامیاب اور بامراد ہوں گے، جب کہ فجار تجار ناکام اور نامراد ہوں گے۔

دنیا کی مارکیٹ میں تجارت فجار بھی کرتے ہیں اور پرہیزگار وابرار بھی؛ لیکن دونوں کی تجارت اور ان کے مقاصد میں بڑا فرق ہے، فجار کی تجارت محض حصولِ مال ومنفعت کے لیے ہوتی ہے، اس لیے انہیں حلال وحرام، صحیح وغلط، جائز وناجائز سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ ''انہیں تو چاہیے پیسہ، چاہے وہ ہو جیسا''۔

جب کہ ابرار کے پیشِ نظر حصولِ مال ومنفعت کے علاوہ آخرت بھی ہوتی ہے، اس لیے وہ شریعت کی ہدایات اور اس کے بتائے ہوئے اصول وضوابط کے مطابق تجارت کرتے ہیں، جس سے ان کی تجارت بابرکت اور دارین کے اعتبار سے نفع بخش ثابت ہوتی ہے، تجارت اگرچہ حصولِ مال ومنفعت کے لیے کی جاتی ہے؛ لیکن اگر یہی تجارت شریعت کی ہدایات کے مطابق کی جائے تو یہ بابرکت اور دارین کے اعتبار سے نفع بخش ثابت ہوتی ہے۔

تجارت حلال وطیب ہو:

اس سلسلے میں کتاب وسنت میں جو ہدایات اور بنیادی اصول وضوابط بیان ہوئے

ہیں ان میں پہلا بنیادی اصول یہ ہے کہ تجارت حلال وطیب ہو۔ حلال وطیب سے مراد ہر وہ تجارت ہے جو شرعاً حرام نہ ہو اور جس میں کسی دوسرے کا کوئی حق نہ ہو۔ تجارت کے اس بنیادی اصول کو قرآنِ کریم نے اس طرح بیان فرمایا کہ

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡكُلُوۡۤا اَمۡوَالَكُمۡ بَیۡنَكُمۡ بِالۡبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡكُمۡ ﴾ (النساء : ۲۹)

”اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل یعنی حرام طریقے سے نہ کھاؤ، البتہ آپسی رضامندی سے تجارت کے ذریعہ جو مال تم نے کمایا ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔“

یعنی حلال تجارت میں آپسی رضامندی کے بعد جو مال تم نے کمایا اور حاصل کیا اس کے کھانے اور استعمال کرنے میں کوئی مضایقہ نہیں، لہٰذا حصولِ مال ومنفعت کے لیے آپسی رضامندی کے ساتھ تجارت کرو۔

حدیث پاک میں صاف اور واضح طور پر فرمایا:

عَنۡ عَبۡدِاللّٰهِ بۡنِ مَسۡعُوۡدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ:” طَلَبُ كَسۡبِ الۡحَلَالِ فَرِيۡضَةٌ بَعۡدَ الۡفَرِيۡضَةِ“. (رواه البيهقى فى شعب الإيمان، مشكوٰة : ۲۴۲)

جس طرح تم پر نماز وغیرہ فرض ہے ان فرائض کے بعد حلال روزی کمانا بھی فرض ہے، جس کا ایک بہترین ذریعہ تجارت ہے، لہٰذا تجارت ایسی کی جائے جو حلال اور طیب ہو، حرام نہ ہو؛ کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ رزق تو اللہ تعالیٰ نے ہر بندے کا اسی وقت لکھ دیا جب وہ ماں کے پیٹ میں تھا، اور حق تعالیٰ نے کسی کے مقدر میں حرام رزق نہیں لکھا، یہ تو بندے کی بے وقوفی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حلال لکھا ہوا رزق حرام طریقے سے حاصل کر رہا ہے، ورنہ اگر بندہ حرام ذرائع سے روزی نہ کمائے تو اسے حلال طریقے سے روزی ضرور مل کر رہے گی۔ اور حرام کی تجارت سے بندہ خواہ کتنا ہی کما لے اس میں نہ برکت ہوتی ہے اور نہ ہی انجام کے

۳۴۵

اعتبار سے وہ نفع بخش ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف حلال میں برکت بھی ہوتی ہے اور نفع بھی، یہی وجہ ہے کہ جن کی آمدنی خالص حلال کی ہے، جیسے حضرات علماء، ابرار واتقیاء، ان کے تھوڑے سے مالِ حلال سے بھی بعض اوقات وہ بڑے بڑے کام بفضلہٖ تعالیٰ ہو جاتے ہیں جو حرام خوروں کے ہزاروں اور لاکھوں خرچ کرنے سے بھی نہیں ہوتے۔

حرام کی تجارت، مزدوری اور نوکری چھوڑنے سے انسان رزق سے محروم نہیں ہو جاتا؛ بلکہ مقدر میں لکھا ہوا رزق اسے حلال طریقے سے مل ہی جاتا ہے، بس آدمی اللہ تعالیٰ پر یقین رکھے، ارشادِ باری ہے:

﴿ وَ مَنۡ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجۡعَلۡ لَّهٗ مَخۡرَجًا ۝ وَّ یَرۡزُقۡهُ مِنۡ حَیۡثُ لَا یَحۡتَسِبُ ﴾ (الطلاق : ۲-۳)

”جو بندہ تقویٰ اختیار کرتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈر کر محرمات سے بچتا ہے (خواہ ان محرمات کا تعلق تجارت سے ہو یا دیگر امور سے) تو حق تعالیٰ اس کے لیے تنگی میں راستہ نکالتے ہیں اور ایسی جگہ سے رزق عطا فرماتے ہیں جس کا اسے گمان بھی نہیں ہوتا۔“

واقعی حرام سے بچنے والوں کو بے گمان رزق دیا جاتا ہے، خواہ تھوڑی تاخیر ہو؛ لیکن ملتا ضرور ہے۔

ایک عبرت آموز واقعہ:

دمشق کے اَدیب حضرت شیخ علی طنطاویؒ نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ ”دمشق میں ایک بہت بڑی مسجد ہے، جسے ”مسجد جامع توبہ“ کہتے ہیں، اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ کسی وقت وہاں فسق وفجور اور فحاشات ومنکرات کا بازار گرم ہوتا تھا، اسی زمانے میں ایک مسلمان بادشاہ نے اس جگہ کو خرید کر وہاں مسجد تعمیر کروائی، وہاں ایک غریب مگر نہایت عفیف طالب علم مسجد کے ایک کمرے میں رہتا تھا، ایک مرتبہ دو روز تک فاقہ کی نوبت آگئی، تیسرے روز بھوک کی شدت سے اس نے محسوس کیا کہ وہ مرنے کے قریب ہے، سوچا کہ اضطراری حالت میں جان بچانے کی مقدار میں مردار اور اتنی مقدار چوری بھی حلال ہو جاتی ہے، لہٰذا کچھ کرنا چاہیے۔

چنانچہ اس نے جان بچانے کی مقدار کہیں سے کھانا چرانے کا ارادہ کیا اور قریب کے ایک مکان میں جہاں سے کھانے کی خوشبو آرہی تھی گھس گیا، کچن میں جا کر جب دیگچی کا ڈھکن اُٹھایا تو اس میں بھرے ہوئے بینگن کا سالن تھا، ایک بینگن کو اٹھایا اور منہ میں رکھ کر دانتوں سے کاٹ لیا، بھوک کی شدت کی وجہ سے سالن کے گرم ہونے کا بھی خیال نہ رہا، جیسے ہی بینگن کو نگلنا چاہا تو بس غیرتِ ایمانی بیدار ہوگئی، اس نے اپنے آپ کو ملامت کرتے ہوئے کہا کہ ہائے! میں ایک طالب علم ہو کر لوگوں کے گھر میں گھس کر کھانا چراؤں؟ فوراً بینگن منہ سے نکال کر واپس دیگچی میں ڈال دیا اور جیسے آیا تھا ویسے ہی واپس ہوگیا، مسجد جا کر توبہ کر کے شیخ کی مجلس درس میں حاضر ہوگیا، اس حال میں کہ بھوک کی شدت کے سبب درس بالکل سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

جب شیخ درس سے فارغ ہوئے اور شرکاءِ درس بھی منتشر ہوگئے تو کچھ دیر میں ایک خاتون مکمل پردے میں وہاں آئی اور شیخ سے گفتگو کرنے لگی، جو اس طالب علم کو سمجھ میں نہ آئی، اس دوران شیخ نے اپنے اطراف میں نظر ڈالی تو اس طالب علم کے علاوہ کسی کو نہ پایا، شیخ نے طالب علم کو مخاطب کر کے فرمایا: تم شادی شدہ ہو؟ طالب علم نے کہا: نہیں، شیخ نے فرمایا: تم شادی کرنا چاہتے ہو؟ نوجوان طالب علم نے کہا: حضرت! میرے پاس اس وقت ایک روٹی کے پیسے نہیں، پھر میں کس طرح شادی کر سکتا ہوں؟ شیخ نے کہا: یہ خاتون آئی ہے، اس نے مجھے بتایا کہ اس کا شوہر وفات پا گیا، اور اس شہر میں وہ بے سہارا ہے، سوائے اس کے ایک ضعیف چچا کے اور کوئی رِشتہ دار بھی نہیں، یہ اپنے چچا کو ساتھ لے کر آئی ہے، جو مسجد کے ایک گوشے میں بیٹھا ہوا ہے، اس عورت کو اپنے فوت شدہ شوہر سے مکان اور مال وراثت میں ملا ہے، اب یہ کسی ایسے مرد سے شادی کرنا چاہتی ہے جو شرعاً اس کا شوہر بن سکتا ہو، تاکہ یہ تنہائی اور بد طینت لوگوں سے محفوظ رہ سکے، اب بتاؤ، کیا تم اس سے شادی کرو گے؟ نوجوان نے حامی بھر لی، پھر شیخ نے اس خاتون سے بھی پوچھ لیا کہ کیا تم اس نوجوان کو اپنا شوہر بنانا پسند کرو گی؟ اس نے بھی ہاں کہہ دیا، تو شیخ نے اس خاتون کے چچا اور دو گواہوں کو بلا کر ان

دونوں کا نکاح کروا دیا اور اس طالب علم کی طرف سے شیخ نے ہی مہر ادا کر دیا، پھر خاتون سے کہا کہ اپنے شوہر کا ہاتھ تھام لو اور چلو اپنے گھر کی طرف، اس نے اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑا اور گھر کی طرف بڑھی۔

گھر میں داخل ہو کر اس عورت نے چہرے سے نقاب اُٹھایا، نوجوان اپنی بیوی کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران ہوگیا، پھر جب گھر کی طرف متوجہ ہوا تو کیا دیکھتا ہے کہ یہ تو وہی گھر ہے جس میں وہ چوری کے ارادے سے داخل ہوا تھا، خیر تھوڑی دیر میں خاتون نے اپنے شوہر سے کہا کہ تمہارے لیے کچھ کھانا لاؤں؟ اس نے کہا: جی ہاں، ضرور! وہ کچن میں گئی اور جا کر دیگچی کا ڈھکن اُٹھا کر بینگن کو دیکھ کر بولی: عجیب بات ہے، ایسا لگتا ہے کہ ہمارے گھر میں کوئی گھس آیا تھا، جس نے بینگن کو اپنے دانتوں سے کاٹا ہے، یہ سن کر نوجوان بے اختیار رونے لگا اور اس نے اپنا سارا قصہ سنا دیا، تو زوجہ نے کہا کہ یہ تمہاری پرہیزگاری کا نتیجہ ہے، جب تم نے حرام طریقے سے بینگن کھانے سے اجتناب کیا تو حق تعالیٰ حلال طریقے سے صرف بینگن ہی کو نہیں؛ بلکہ بیگم اور اس کا سارا گھرانہ حلال طریقے سے تمہیں دے دیا۔''

واقعہ یہی ہے کہ جب بندہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے حرام خوری، حرام روزی اور حرام نوکری چھوڑتا ہے تو حق تعالیٰ بعض اوقات بے گمان حلال روزی عطا فرماتا ہے، اس لیے حرام سے بہر حال بچنا چاہیے اور حلال روزی ہی تلاش کرنا چاہیے۔

تجارت صداقت کے ساتھ ہو:

تجارت کو بابرکت اور نفع بخش بنانے کا دوسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ تجارت صداقت کے ساتھ کی جائے، چنانچہ حدیث پاک میں جن ابرار (نیکوکار) تجار کی تجارت کو بہترین فرمایا ان کی علامت یہ بیان فرمائی کہ "إِذَا حَدَّثُوا لَمْ يَكْذِبُوا". کہ وہ اپنی تجارت کو فروغ دینے یا مال بیچنے میں کبھی جھوٹ کا سہارا نہیں لیتے، حقیقت تو یہ ہے کہ تجارت اگر حلال وطیب مال کی ہو؛ لیکن جھوٹ بول کر کی جائے تو ایسی تجارت کی آمدنی بھی خالص حلال نہیں

رہتی اور جھوٹ کی نحوست سے برکت اور منفعت ختم ہو جاتی ہے، یا کم ہو جاتی ہے، حدیث میں ہے:

"فَإِنْ صَدَّقَا وَ بَيَّنَا بُوْرِكَ لَهُمَا فِيْ بَيْعِهِمَا، وَ إِنْ كَتَمَا وَ كَذَبَا، مُحِقَتْ بَرَكَةُ بَيْعِهِمَا". (رواه البخاری و مسلم، مشكوٰة: ٢٤٤، باب الخيار)

"تجار آپس میں مالِ تجارت خریدتے اور بیچتے وقت اگر سچائی سے کام لیں اور (اپنے تجارتی) معاملے کو بالکل واضح رکھیں (کوئی بات مبہم اور پوشیدہ نہ رکھیں) تو ان کی تجارت اور خرید وفروخت میں برکت دی جاتی ہے۔ اور اگر دونوں کوئی بات چھپا لیں اور جھوٹ بولیں تو ان کے کاروبار سے برکت اُٹھالی جاتی ہے۔"

یہ تو دنیا کے نفع ونقصان کی بات تھی، آخرت کے اعتبار سے جو لوگ جھوٹ کے ساتھ کاروبار کرتے ہیں ان کے متعلق فرمایا:

عَنْ أَبِيْ ذَرٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَ لَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ، وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ، وَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ، قَالَ أَبُوْ ذَرٍّ: خَابُوْا وَ خَسِرُوْا، مَنْ هُمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ: "الْمُسْبِلُ، وَ الْمَنَّانُ، وَ الْمُنْفِقُ سِلْعَتَهٗ بِالْحَلِفِ الْكَاذِبِ". (رواه مسلم، مشكوٰة: ٢٤٣، باب المساهلة فی المعاملة)

"تین قسم کے لوگ ایسے ہیں کہ قیامت کے دن حق تعالیٰ ان کی طرف نظرِ رحمت سے نہ دیکھیں گے، نہ ان سے کوئی بات فرمائیں گے، نہ انہیں گناہوں سے پاک فرمائیں گے، ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا، حضرت ابوذرؓ نے دریافت کیا: یارسول اللہ! خیر و بھلائی سے محروم اور نقصان میں رہنے والے وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا: ایک تو اپنی ازار (وغیرہ) ٹخنوں سے نیچے لٹکانے والا (مرد) دوسرا کسی کو کوئی چیز دے کر احسان جتلانے والا اور تیسرا جھوٹی قسمیں کھا کر اپنی تجارت کو بڑھانے والا۔" (جھوٹ بول کر مالِ تجارت بیچنے والا)۔

جھوٹ کا ایک ظاہری اور بڑا نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے اعتماد اور

بھروسہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور یہ چیز بھی تجارت میں بہت بڑے نقصان کا سبب ہے، اس لیے اس سے بچنا تجارت وغیرہ میں بھی لازم ہے۔

تجارت امانت کے ساتھ ہو:

تجارت کو بابرکت اور نفع بخش بنانے کا تیسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ تجارت امانت و دیانت کے ساتھ ہو، حدیث پاک میں جن ابرار (نیکوکار) تجار کی تجارت کو بہترین فرمایا ان کی ایک علامت یہ بیان فرمائی کہ "وَ إِذَا اؤْتُمِنُوْا لَمْ يَخُوْنُوْا". کہ وہ اپنی تجارت کو بڑھانے اور مال کو زیادہ سے زیادہ بیچنے یا زیادہ نفع حاصل کرنے کے چکر میں خیانت اور دھوکے سے کام نہیں لیتے، کیوں کہ بات یہ ہے کہ تجارت خواہ حلال و پاکیزہ ہی کیوں نہ ہو؛ لیکن اگر خیانت اور دھوکہ دہی کے ساتھ کی جائے تو ایسی حلال تجارت کی آمدنی بھی خالص حلال نہیں رہتی، خیانت کی نحوست سے برکت اور منفعت یا تو ختم ہو جاتی ہے یا پھر کم ہو جاتی ہے، چاہے فوری طور پر اس کا احساس ہو یا نہ ہو۔ اوپر بخاری کی جو روایت پیش کی گئی اس میں یہی فرمایا کہ عقد کے وقت معاملہ بالکل واضح رکھیں، یعنی مال کی جو حقیقت و اصلیت ہو اسے صاف صاف بتلا دیں، معاملے میں کسی قسم کا کوئی ابہام نہ ہو، اگر مال میں کوئی عیب ہو بھی تو اسے چھپایا نہ جائے، تو ایسے کاروبار میں برکت دی جاتی ہے۔

اس کے برخلاف اگر معاملہ مبہم اور پوشیدہ رکھا جائے، مال کے عیب اور اصلیت کو چھپایا جائے، نیز مال دوسروں سے خریدتے وقت اس کی مذمت کرنا، تاکہ کم قیمت میں مال مل جائے اور جب خود بیچنے کی نوبت آئے تو مال کی بے جا تعریف کرنا، تاکہ زیادہ قیمت مل جائے، اس کے علاوہ ناپ تول میں کمی کرنا یہ سب باتیں امانت و دیانت کے خلاف ہیں، ان سے بھی برکت و منفعت اُٹھالی جاتی ہے۔ حضور ﷺ نے ایسے دھوکہ باز لوگوں سے اپنی براءت کا اظہار فرمایا ہے۔

حضور ﷺ تجار کے احوال جاننے کے لیے بازار بھی جایا کرتے تھے، یہی وجہ ہے

کہ مشرکین مکہ نے اس بات کو نبوت کے خلاف سمجھتے ہوئے طنز کیا تھا کہ

﴿ وَ قَالُوْا مَا لِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْأَسْوَاقِ ﴾ (الفرقان: ٧)

”یہ کیسا رسول ہے جو کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں بھی چلتا پھرتا ہے۔“ حق تعالیٰ نے چند آیتوں کے بعد اس کے جواب میں فرمایا:

﴿ وَ مَآ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ إِلَّآ إِنَّهُمْ لَيَأْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ يَمْشُوْنَ فِي الْأَسْوَاقِ ﴾ (الفرقان : ٢٠)

”ہم نے آپ سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے سب کے سب کھانا بھی کھاتے تھے (کیوں کہ بشری ضروریات ان سے بھی وابستہ تھیں) اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے۔“ (کیوں کہ انہیں تجار کی بھی رہبری کرنی تھی)۔

بہر حال حضور ﷺ نے ایک مرتبہ بازار میں غلے کے ایک ڈھیر میں اپنا دست مبارک ڈالا تو انگلیوں میں تری محسوس ہوئی، تو آپ ﷺ نے غلے والے سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ اس نے عرض کیا: حضور! غلے کے اس ڈھیر پر بارش ہوئی تھی (تو میں نے بھیگا ہوا مال نیچے کر دیا اور سوکھا مال اوپر کر دیا) حضور ﷺ نے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: تم نے بھیگے ہوئے غلے کو اوپر کیوں نہ کیا؟ تاکہ لوگ (اس کے عیب کو) دیکھ لیتے، پھر فرمایا:

”مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنِّيْ“. (رواہ مسلم، مشکوٰۃ : ٢٤٨، باب المنهى عنها من البيوع)

”جو دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں۔“ (اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں)۔

ظاہر ہے کہ تجارت میں خیانت اور دھوکہ دہی سے کام لیا جائے تو اس سے آدمی سرکاری قانون کی گرفت میں بھی آ سکتا ہے، مزید برآں اس کی وجہ سے اعتماد بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اور یہ چیز تجارت کے لیے نقصان کا سبب ہے، اس لیے عام معاملات اور تجارت وغیرہ میں بھی اس سے بچنا لازم ہے۔

تجارت رِفق (نرمی) کے ساتھ ہو:

تجارت کو بابرکت اور نفع بخش بنانے کا چوتھا بنیادی اصول یہ ہے کہ تجارت میں رفق یعنی نرمی، خوش اخلاقی اور خیر خواہی کا برتاؤ کیا جائے، اس کا بہت اچھا اثر خریداروں اور گاہکوں پر پڑتا ہے، ان کا اعتماد حاصل ہوتا ہے اور وہ دیگر تاجروں کے مقابلے میں نرم مزاج تجار کو ترجیح دیتے ہیں، حدیث پاک میں جن ابرار (نیکوکار) تجار کی تجارت کو بہترین فرمایا ان کی ایک صفت یہ بیان فرمائی کہ

”وَ إِذَا كَانَ عَلَيْهِمْ لَمْ يَمْطُلُوْا، وَ إِذَا كَانَ لَهُمْ لَمْ يُعَسِّرُوْا“.

”کسی کا کوئی حق اور مال جب ان کے ذمے ہوتا ہے تو اس کی ادائیگی میں ٹال مٹول نہیں کرتے، لیکن جب ان کا کوئی حق اور مال کسی اور کے ذمے ہوتا ہے تو وصولی میں سختی سے کام نہیں لیتے؛ بلکہ چشم پوشی، نرمی اور خوش اخلاقی سے کام لیتے ہیں۔“ حضور ﷺ نے ایسے تجار کو دعا دیتے ہوئے فرمایا:

عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ”رَحِمَ اللّٰهُ رَجُلًا سَمْحًا إِذَا بَاعَ وَ إِذَا اشْتَرٰى وَ إِذَا اقْتَضٰى“. (رواہ البخاری، مشکوٰۃ : ٢٤٣، باب المساهلة فی المعاملة)

”اللہ پاک اس (تاجر) شخص پر رحم فرمائیں جو خرید و فروخت اور تقاضا کرنے میں نرمی اور خوش اخلاقی سے کام لیتا ہے۔“

ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کی دعا کے بعد ایسے تجار کی تجارت کیسے بابرکت اور دارین کے اعتبار سے نفع بخش نہ ہوگی، ضرور ہوگی، اس لیے اس کا اہتمام بھی ضروری ہے۔

تجارت پابندیِ اوقات کے ساتھ ہو:

تجارت کو بابرکت اور نفع بخش بنانے کا پانچواں بنیادی اصول یہ ہے کہ تجارت

مناسب (ومتعین) اوقات کی پابندی کے ساتھ ہو، تجارت اور کاروبار شروع کرنے کے لیے دُکان، آفس اور فیکٹری وغیرہ کو مناسب اور متعین وقت پر کھولا جائے۔ اس میں بھی بہتر تو یہ ہے کہ نمازِ فجر کے بعد صبح صبح جلد کاروبار شروع کر دیا جائے، یا اس کے کسی نہ کسی معاملے کا مثلاً اس کے لیے پلاننگ وغیرہ کا آغاز کیا جائے، ایک تو یہ سنت ہے، حضور ﷺ کا معمول اور طریقہ یہ تھا کہ جب کبھی کوئی چھوٹا دستہ یا بڑا لشکر کسی خاص مہم پر روانہ فرماتے تو دن کے ابتدائی وقت میں روانہ فرماتے، حدیث میں ہے:

"إِذَا بَعَثَ سَرِيَّةً أَوْ جَيْشًا، بَعَثَهُمْ مِنْ أَوَّلِ النَّهَارِ". (رواه الترمذی و أبو داود، مشكوٰة : ۳۳۹، باب آداب السفر)

اس سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کا پاکیزہ طریقہ صبح سویرے کام کاج اور کاروبار شروع کرنے کا تھا، علاوہ ازیں اِس وقت میں حضور ﷺ نے برکت کی دعا بھی فرمائی ہے:

"اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لِأُمَّتِيْ فِيْ بُكُوْرِهَا". (رواه الترمذی و أبو داود، مشكوٰة : ۳۳۹، باب آداب السفر)

حضرات صحابہؓ اس کا اہتمام فرماتے تھے، چنانچہ حضرت صخرؓ کے متعلق منقول ہے کہ آپ ایک تاجر تھے، جو اپنے خادموں اور آدمیوں کو صبح سویرے ہی تجارتی کام پر لگا دیتے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ پاک نے ان کی تجارت میں خوب برکت عطا فرمائی اور آپ صاحب ثروت بن گئے۔

"وَ كَانَ صَخْرٌ تَاجِرًا، فَكَانَ يَبْعَثُ تِجَارَتَهُ أَوَّلَ النَّهَارِ، فَأَثْرٰى وَ كَثُرَ مَالُهٗ". (رواه الترمذی، مشكوٰة : ۳۳۹، باب آداب السفر)

بعض روایتوں میں ہے کہ صبح صادق سے لے کر طلوعِ آفتاب تک مخلوق کے لیے رزق تقسیم کیا جاتا ہے، جو لوگ اس پورے وقت میں غافل (اور سوئے) رہتے ہیں وہ برکت رزق سے محروم رہتے ہیں۔ مسند احمد کی ایک ضعیف روایت میں ہے کہ "اَلصُّبْحَةُ تَمْنَعُ الرِّزْقَ" صبح کے وقت سونا رزق میں بے برکتی کا سبب ہے۔ لیکن علماءِ محدثین کے بقول یہ

ممانعت صبح صادق سے لے کر طلوعِ آفتاب تک ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص نمازِ فجر کے بعد طلوعِ آفتاب تک ذکر و اذکار (اور کاروبار) میں مشغول رہ کر طلوعِ آفتاب کے بعد سوئے تو کوئی حرج نہیں، اجازت ہے؛ بلکہ بعض بزرگوں کا یہ معمول بھی رہا ہے۔

ہمیں بھی چاہیے کہ اپنے کاروبار کو یا کم از کم کسی بھی تجارتی معاملے کو صبح سویرے شروع کرنے کی فکر و کوشش کریں، اس سے حضور ﷺ کی ایک سنت پر بھی عمل ہوگا اور یہ چیز تجارت میں برکت کا سبب بھی ہوگی۔

ہمارے یہاں اگر چہ اس کا رواج نہیں، لیکن قانوناً ممنوع بھی تو نہیں، دوسرے تجار اگر اس طرح نہ کریں تو کم از کم مسلمان اور بالخصوص دین دار مسلمان اپنے کاروبار اور بازار کو صبح سویرے کیوں شروع نہیں کر سکتے؟ ضرور کر سکتے ہیں۔ آج مارکیٹوں سے یہ سنت بھی مفقود ہو چکی ہے، کاروبار سے برکت ختم ہونے کی بظاہر یہ بھی ایک وجہ ہے، لہٰذا اسے معمولی نہ سمجھیں، کچھ کوشش کریں، بہت ممکن ہے کہ ہماری صحیح فکر و کوشش بازار میں بدلاؤ کا سبب بن جائے اور ہم اس کا مصداق بن جائیں کہ

کچھ لوگ بدل جاتے ہیں حالات بدلنے سے ۔۔۔ کچھ لوگ بدلتے ہیں حالات قرینے سے

تجارت عبادت اور فکر آخرت کے ساتھ ہو:

علاوہ ازیں تجارت کو بابرکت اور نفع بخش بنانے کا چھٹا بنیادی اصول یہ ہے کہ تجارت عبادت کے ساتھ ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تجارت کی مشغولی اللہ پاک کی یاد و مناجات اور عبادات سے غفلت کا سبب بن جائے، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اس تجارت سے من جانب اللہ برکت اور منفعت یا تو ختم کر دی جاتی ہے یا کم کر دی جاتی ہے، حضرات صحابہؓ اور علماء کامیاب تجار تھے، وہ ابرار تھے، ان کا حال یہ تھا کہ بڑی سے بڑی تجارت اور اس کی مشغولی نے انہیں اللہ پاک سے غافل نہیں کیا، وہ "دست بہ کار و دل بہ یار" کے حقیقی مصداق تھے، ان کا جسم بازار میں اور دل اللہ تعالیٰ کی یاد میں ہوتا تھا، حضرات صحابہؓ جو حضور ﷺ کے

صحبت وتربیت یافتہ تھے ان کا یہی حال تھا، حضرت قتادہؒ کا بیان ہے:

" كَانَ الْقَوْمُ يَتَبَايَعُوْنَ وَ يَتَّجِرُوْنَ، وَ لٰكِنَّهُمْ إِذَا نَابَهُمْ حَقٌّ مِنْ حُقُوْقِ اللّٰهِ لَمْ تُلْهِهِمْ تِجَارَةٌ وَ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ، حَتّٰى يُؤَدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ". (بخاری، کتاب البیوع، باب التجارۃ فی البز)

"حضرات صحابہؓ خرید وفروخت کرتے، تجارت کرتے؛ لیکن جب انہیں اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سے کوئی حق پیش آتا تو تجارت اور خرید وفروخت انہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے روک نہیں سکتی تھی، تاآنکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حق کو ادا کردیتے۔"

قرآنِ کریم نے ایسے ہی لوگوں کے متعلق ارشاد فرمایا:

﴿ رِجَالٌ لا لَا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ إِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ إِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ﴾ (النور: ۳۷)

"(یہ) ایسے لوگ (تھے) جنہیں (ان کی) تجارت اور خرید وفروخت اللہ کے ذکر اور نماز قائم کرنے سے غافل نہیں کرتی۔"

منقول ہے کہ عہد رسالت میں دو صحابی تھے، ایک تجارت کرتے تھے، دوسرے صنعت وحرفت، یعنی لوہار کا کام کرتے تھے اور تلواریں بنا کر بیچا کرتے تھے، پہلے صحابیؓ کی تجارت کا حال یہ تھا کہ اگر سودا تولتے وقت اذان کی آواز کان میں پڑجاتی تو وہیں ترازو کو پٹک کر نماز کے لیے مسجد چلے جاتے اور نماز ادا کرتے۔

دوسرے صحابیؓ کا حال یہ تھا کہ اگر گرم لوہے پر ہتھوڑے کی ضرب لگاتے وقت کان میں اذان کی آواز آگئی تو بس ہتھوڑے کو مونڈھے کے پیچھے ہی چھوڑ دیتے اور نماز کو چل دیتے، ان کی شان میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿ رِجَالٌ لا لَا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ إِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ إِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ﴾ (النور: ۳۷) (قرطبی، معارف القرآن: ۶/ ۴۳۰)

وہ لوگ کامیاب اور ابرار تجار تھے، ان کی تجارت بابرکت اور دارین کے اعتبار سے نفع بخش تھی، ہم بھی اگر یہ چاہتے ہیں تو کتاب وسنت کے ان بنیادی اصول وضوابط اور اس سلسلے میں حضرات صحابہؓ وعلماء کے طرزِ عمل کو اختیار کرنے کی ہمت کریں۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تجارت تقویٰ کے ساتھ کریں، کیوں کہ تقویٰ ہوگا تو مالِ حلال وطیب کی تجارت صداقت، امانت، پابندیِ وقت اور عبادت وفکر آخرت کے ساتھ ہوگی، اور تب ہی تجارت میں برکت ہوگی اور وہ دارین میں نفع بخش بنے گی۔

حق تعالیٰ ہمیں بھی ایسی بابرکت اور نفع بخش تجارت کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یا رب العالمین۔

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا مِنْ فَضْلِكَ، وَ لَا تَحْرِمْنَا رِزْقَكَ، وَ بَارِكْ لَنَا فِيْمَا رَزَقْتَنَا، وَ اجْعَلْ غِنَانَا فِيْ أَنْفُسِنَا، وَ اجْعَلْ رَغْبَتَنَا فِيْمَا عِنْدَكَ". (حلیۃ: ۵/ ۶۶)

مؤرخہ: ۲۰/ رمضان المبارک/ ۱۴۴۱ھ

مطابق: ۱۴/ مئی/ ۲۰۲۰ء

(بروز: جمعرات، بزمِ صدیقی، بڑودا)

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيْرًا فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيْرًا كَثِيْرًا
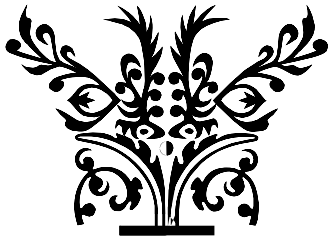
(۳۸)
منافقین کی علامات

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

عَـنۡ عَبۡـدِالـلّٰهِ بۡنِ عَمۡرٍو رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: "أَرۡبَعٌ مَّـنۡ كُـنَّ فِيۡـهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا، وَ مَنۡ كَانَتۡ فِيۡهِ خَصۡلَةٌ مِنۡهُنَّ كَانَتۡ فِيۡهِ خَصۡلَةٌ مِـنَ النِّفَاقِ، حَتّٰى يَدَعَهَا، إِذَا أُؤۡتُمِنَ خَانَ، وَ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَ إِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَ إِذَا خَاصَمَ فَجَرَ". (متفق عليه، مشكوٰة : ۱۷، باب الكبائر و علامات النفاق)

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے فرمایا: جس شخص میں چار باتیں ہوں گی وہ پکا منافق ہے۔اور جس میں ان میں سے کوئی ایک بات پائی جائے گی (تو سمجھ لو کہ) اس میں نفاق کی ایک عادت ہے، جب تک کہ اس کو چھوڑ نہ دے۔ (وہ چار عادات یہ ہیں) (۱) جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ (۲) جب کبھی بات کرے تو جھوٹ بولے۔ (۳) جب کبھی وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے۔ (۴) جب کبھی جھگڑے تو گالیاں بولے۔"

تمہید :

اللہ رب العزت نے اپنے آخری رسول جناب محمد ﷺ کو دین حق کے ساتھ مکہ مکرمہ میں مبعوث فرما کر اس کی عام دعوت وتبلیغ کا حکم فرمایا:

﴿ يٰٓأَيُّهَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَآ أُنۡزِلَ إِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ﴾ (المائدة : ٦٧)

"محبوبم! جو کچھ بھی آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ان تمام احکام کو لوگوں تک پہنچا دیجیے۔"

خواہ کوئی مانے یا نہ مانے، تمہارا کام ہے دین حق کی دعوت دینا۔ چنانچہ جب آپ ﷺ نے دعوت ورسالت کا اعلان کیا اور دین حق کو عام کیا تو خوش نصیب لوگوں نے اسے قبول کیا، آپ ﷺ کی نبوت، رسالت اور دین کا اقرار کیا اور ایمان لے آئے؛ لیکن کچھ لوگوں نے اسے قبول نہ کیا، آپ ﷺ کی نبوت ورسالت اور دین حق کا صاف انکار کر دیا اور ایمان نہیں لائے۔

اسلام کے ابتدائی مکی دور میں جو خوش نصیب لوگ ایمان لائے ان کی غالب اکثریت ان لوگوں پر مشتمل تھی جو اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی حقانیت کو پوری طرح قلبی و ذہنی طور پر تسلیم کرنے کے بعد ایمان لائے تھے، وہ لوگ اپنے ایمان میں کامل اور نہایت مخلص تھے، پھر جیسے جیسے اسلام کا دائرہ بڑھا، بالخصوص ہجرتِ مدینہ کے بعد جب حالات تیزی سے بدلنے لگے اور اسلام و مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہونے لگا، تب کچھ کمزور طبائع نے حالات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے اسلام کو بظاہر قبول کر لیا، یہ لوگ بظاہر زبان سے اسلام کا دعویٰ اور اعلان کرتے تھے؛ لیکن درحقیقت انہیں اسلام اور مسلمانوں سے کوئی دل چسپی نہیں تھی؛ بلکہ شدید دشمنی تھی، ایسے لوگ منافق کہلائے، جن کا سرپرست اور سربراہ عبداللہ بن اُبی بن سلول یہودی تھا، اُحد کے موقع پر اس کا نفاق ظاہر ہوا، پھر وہ منافقت میں بڑھتا گیا۔

نفاق کی حقیقت اور
بنیادی علامت ظاہر وباطن کا تضاد:

’’منافق‘‘ مجاہد کے وزن پر اسم فاعل کا صیغہ ہے، یعنی نفاق رکھنے والا، عربی زبان میں یہ لفظ ’’نفق‘‘ سے بنا ہے، جس کے معنیٰ ہیں سرنگ، (یہ پرانے زمانوں میں قلعوں میں دشمنوں سے بچ نکلنے کے لیے جو خفیہ راستہ بنایا جاتا تھا اسے کہتے ہیں) جس میں ایک طرف سے داخل ہوا جاتا ہے اور دوسری طرف سے نکلا جاتا ہے، منافق کا بھی یہی حال ہوتا ہے، وہ ایک طرف سے اسلام میں داخل ہوتا ہے اور دوسری طرف سے نکلتا ہے۔

شرعی اصطلاح میں منافق اسے کہتے ہیں جس کے دل میں ایمان نہ ہو؛ مگر کسی مجبوری، مصلحت اور عیاری کی وجہ سے وہ ایمان کا مدعی ہو، سرسری مفہوم میں منافق وہ شخص ہے جو دوغلا ہو، یعنی جس کے دو رُخ ہوں، ایک رُخ ایمان کا اور دوسرا رُخ بے ایمانی کا، بغاوت اور کفر کا، وہ بظاہر تو ایمان سے تعلق رکھتا ہے اور بہ باطن کفر سے، ظاہر کچھ، حقیقت میں کچھ، اندر کچھ، باہر کچھ، جیسے کہا جاتا ہے: ’’بغل میں چھری، منھ میں رام رام‘‘، ظاہر میں بڑے میٹھے، بڑے اچھے، بڑے دعوے اور وعدے کرنے والے؛ لیکن دل میں نفرت، عداوت، بغض، حسد اور کینہ کا زہر بھرا ہوا، قرآنِ کریم نے ان کی اس بنیادی علامت یعنی ظاہر وباطن کے تضاد کو اس طرح بیان کیا:

﴿ وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝﴾ (البقرۃ: ۱۴)

’’یہ جب اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی صاحب ایمان اور مسلمان ہیں، جیسے ہم تمہارے ہیں ویسے تم ہمارے ہو۔ اور جب اپنے شیاطین اور سرغنوں سے ملتے ہیں تو ان سے کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ہی ساتھ ہیں، مسلمانوں سے تو ہم استہزا اور مذاق کر

رہے ہیں۔‘‘ ہمارا دعوائے ایمانی مذاق اور دل لگی کے سوا کچھ نہیں۔

ظاہر ہے کہ ایسے لوگ اسلام اور مسلمانوں کے حق میں صرف فساد کی جڑ نہیں؛ بلکہ فساد کا پورا درخت ہوتے ہیں، یہ لوگ کفار سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے حضور ﷺ کو ان کے ساتھ سختی برتنے کا حکم فرمایا:

﴿ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ اغْلُظْ عَلَیْهِمْ ؕ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ﴾ (التوبۃ: ۷۳)

نیز حق تعالیٰ نے منافقین کی جو سزا متعین فرمائی وہ بھی سب سے خطرناک ہے، یعنی جہنم کا سب سے آخری اور خوفناک طبقہ۔

﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ﴾ (النساء: ۱۴۵)

منافقین کی قسمیں:

بنیادی طور پر منافقین کی دو قسمیں ہیں: (۱) اعتقادی اور شعوری منافق (۲) عملی غیر شعوری منافق۔ اعتقادی منافق اس شخص کو کہتے ہیں جو سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اہل ایمان کو دھوکہ دینے کے لیے ایمان کا اقرار واظہار تو کرے لیکن وہ قلبی طور پر توحید ورسالت اور شریعت کا منکر ہو۔ ان کے متعلق قرآنِ کریم کا فیصلہ یہ ہے:

﴿ قَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَ هُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ﴾ (المائدۃ: ۶۱)

’’وہ کفر کے ساتھ اسلام میں داخل ہوئے اور کفر کے ساتھ ہی نکلے۔‘‘

ان اعتقادی منافقین کا تو اسلام سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ ۝﴾ (البقرۃ: ۸)

ایسے ہی منافق قیامت کے دن جہنم کے آخری طبقے میں ہوں گے۔ العیاذ باللہ۔

اس کے برعکس عملی منافق اسے کہتے ہیں جو فکر وعقیدہ کی سطح پر تو اسلام قبول کرتا ہے،

اسلام کا دل سے اقرار تو کرتا ہے؛ لیکن عمل سے اس کا مکمل اظہار بھی نہیں کرتا۔ نفاق کی یہ قسم بندے کو اسلام سے خارج تو نہیں کرتی؛ لیکن منافق (اعتقادی وحقیقی) کے مشابہ کر دیتی ہے۔

مسلمانوں میں پائی جانے والی علاماتِ نفاق کا حکم:

یہ اس وقت ہے جب کسی بھی مسلمان میں نفاق کی کوئی ایک دو نشانی وعلامت پائی جائیں۔ مثلاً جھوٹ بولنا، امانت میں خیانت کرنا، وعدہ خلافی کرنا اور گالی گلوچ کرنا وغیرہ، نفاق کی یہ علامات کسی مسلمان کو اگرچہ اسلام سے خارج تو نہیں کر دیتیں؛ لیکن اس کے باوجود ان کبائر کے مرتکب مسلمان کو بہت زیادہ ڈرتے رہنا چاہیے کہ کہیں یہ برائیاں اسے اعتقادی نفاق تک نہ پہنچا دیں۔

البتہ نفاق کی یہ علامات کسی کی عادت وطبیعت بن جائیں، یا نفاق کی تمام یا اکثر علامات کسی میں جمع ہو جائیں تب ایسا شخص خالص منافق بن جاتا ہے، جیسا کہ حدیث مذکورہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے، آپ ﷺ نے ایسے شخص کے متعلق فرمایا: "کان منافقا خالصا". نیز عہد نبوت میں یہ برائیاں کامل طور پر منافقین ہی میں پائی جاتی تھیں، مؤمنین مخلصین سے کبھی اس قسم کی کوئی برائی سرزد ہو بھی جاتی تو فوراً احساسِ شرمندگی کے ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور معافی مانگ لیتے تھے، سیر الصحابہ میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔

اس بنا پر عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ مؤمنین ومنافقین کے مابین اس سلسلے میں بنیادی فرق یہ ہے کہ مؤمن سے کبھی اس قسم کی برائیاں ضعف ایمانی کے سبب ہو بھی جاتی ہیں تو اس پر وہ شرم سار رہتا ہے، احساسِ گناہ میں مبتلا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حضور اس کا اعتراف کر کے معافی کا طلب گار رہتا ہے، جب کہ منافق ان برائیوں کے ارتکاب کے بعد شرمندہ نہیں ہوتا؛ بلکہ ڈھٹائی سے کام لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حضور اس کا اعتراف کر کے توبہ کا اہتمام نہیں کرتا اور اس طرح وہ "خَسِرَ الدُّنْیَا وَ الاٰخِرَۃَ" کا مصداق بن جاتا ہے۔

دوسری علامت جھوٹ بولنا:

کتاب وسنت میں منافقین کی تقریباً تیس علامات کا مطلقاً تذکرہ ملتا ہے، جن میں سے نفاق کی بڑی اور بنیادی علامت ظاہر و باطن کا تضاد ہے، اس کے بعد دوسری علامت جھوٹ بولنا ہے، حدیث پاک میں فرمایا: "إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ" جب کبھی منہ کھولے تو جھوٹ بولے، جھوٹ بولنا منافقین کی طبیعت و عادت ہوتی ہے، سب سے بڑا جھوٹ یہ ہے کہ وہ زبان سے اسلام وایمان کا اقرار کرتے ہیں؛ لیکن دل سے انکار کرتے ہیں اور اپنے نفاق کو چھپانے کے لیے جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔ ان کے جھوٹے ہونے کا اعلان رب العالمین نے قرآنِ کریم میں فرمایا:

﴿ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ﴾ (المنافقون : ۱)

"اللہ پاک گواہی دیتے ہیں کہ منافقین بالیقین جھوٹے ہیں۔"

اگر مؤمنین کبھی ضعف ایمانی کی وجہ سے جھوٹ بول دیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں نفاقِ عملی کی علامت پائی جاتی ہے، اس سے ڈرنا اور بچنا چاہیے، کہیں نفاقِ عملی کی یہ علامت عادت نہ بن جائے اور نفاق کا کوئی حصہ ہمارے نامۂ اعمال میں شامل نہ ہو جائے، نفاق کی دیگر بہت سی علامات میں بھی جھوٹ کا بڑا دخل ہے۔

تیسری علامت اپنے تحفظ کی خاطر قسمیں کھانا:

قرآنِ کریم نے منافقین کی علامات کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ وہ اپنے تحفظ کی خاطر جھوٹی قسمیں بھی کھا لیتے ہیں:

﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً﴾ (المنافقون : ۲)

"انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے۔"

جس طرح ڈھال کے ذریعہ تحفظ کیا جاتا ہے یہ منافقین جھوٹی قسموں کے ذریعہ اپنا

تحفظ کرتے ہیں، لیکن یاد رکھو کہ جس طرح منافقین جھوٹے ہیں اسی طرح ان کی قسمیں بھی جھوٹی ہیں۔

حدیث پاک میں اس آیت کریمہ کا شانِ نزول اس طرح مروی ہے کہ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی بن سلول کو غزوۂ بنی المصطلق کے موقع پر اپنے ساتھیوں کے درمیان میں نے یہ کہتے ہوئے سنا کہ جو لوگ محمد کے پاس ہیں تم ان پر خرچ نہ کرو، تا کہ وہ ان سے الگ ہو جائیں، نیز اس نے یہ بھی کہا کہ مدینہ جا کر ہم عزت والے لوگ ذلیل لوگوں کو (یعنی نعوذ باللہ محمد ﷺ اور اصحابِ رسول ﷺ کو) مدینہ طیبہ سے ضرور باہر نکال دیں گے، قرآنِ کریم نے اسے نقل کرتے ہوئے فرمایا:

﴿هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِندَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنفَضُّوْا﴾ (المنافقون: ۷)

''جو لوگ رسول اللہ کے پاس ہیں ان پر کچھ خرچ نہ کرو، تا کہ وہ ادھر اُدھر ہو جائیں۔''

اور ان منافقین کی دوسری بات کو قرآنِ کریم نے نقل کرتے ہوئے فرمایا:

﴿لَئِنْ رَّجَعْنَا إِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ﴾ (المنافقون: ۸)

''اگر ہم لوگ مدینہ پہنچ جائیں گے تو ہم میں سے عزت والا ذلت والے کو ضرور نکال دے گا۔''

حضرت زیدؓ کو یہ بات بہت ناگوار گزری، انہوں نے اپنے چچا کے ذریعہ حضور ﷺ تک یہ باتیں پہنچا دیں، حضور ﷺ نے تحقیق کے لیے عبداللہ بن اُبی بن سلول اور اس کے رُفقاء کو طلب کیا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا اور جھوٹی قسم کھا کر کہا کہ ہم نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی، حضور ﷺ نے قسم کی وجہ سے ان کی بات کو تسلیم کر لیا اور اپنے صحابیؓ کی بات کو رد فرما دیا، حضرت زیدؓ فرماتے ہیں کہ مجھے اس بات سے اتنا غم ہوا کہ اس سے پہلے کبھی اتنا غم نہیں ہوا۔ اس کے بعد تھوڑے ہی وقت میں حق تعالیٰ نے سورۂ منافقون کی ابتدائی آیات ﴿إِذَا جَاءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ﴾ سے ﴿وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (المنافقون: ۱ تا ۸)

نازل فرمائیں، تو فوراً حضور ﷺ نے مجھے یہ پیغام بھیجا کہ اللہ پاک نے تمہاری سچائی کی گواہی کلامِ الٰہی میں نازل فرمائی ہے۔ سبحان اللہ۔ (بخاری: ۷۲۸/۲، کتاب التفسیر، باب اتخذوا أيمانهم جنة يجتنبون بها)

معلوم ہوا کہ اپنے تحفظ اور حصولِ مفاد کی خاطر جھوٹی قسم کھانا یہ منافقین کی علامت ہے، مؤمنین میں ضعف ایمانی کی وجہ سے یہ برائی پائی جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں نفاق کی ایک نشانی پائی جاتی ہے، اس سے بہت ڈرنا اور بچنا چاہیے کہ کہیں نفاقِ عملی کی یہ علامت عادت نہ بن جائے۔

چوتھی علامت چرب زبانی:

منافقین کی چوتھی علامت چرب زبانی ہے، قرآنِ کریم نے اسے اس طرح بیان فرمایا کہ

﴿وَ إِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ﴾ (المنافقون: ۴)

''یہ لوگ جب باتیں کرنے لگیں تو آپ ان کی باتوں پر کان لگا کر سنا کریں۔''

یعنی وہ اپنی چرب زبانی سے اسلامی حمیت وحمایت اور اللہ ورسول سے محبت وتعلق اور جوشِ جہاد وغیرہ کی ایسی لچھے دار باتیں کرتے ہیں کہ آدمی سنتا ہی رہ جائے، لوگوں کو میسمرائز کر دیں، حالانکہ یہ سب جھوٹ اور زبانی جمع خرچ ہوتا ہے، حقیقی اور عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، چنانچہ سورۂ محمد میں ان کی اس علامت کی ایک مثال بیان کی گئی کہ مؤمنین کاملین کی طرح یہ بھی جوشِ جہاد کا اظہار کرتے تھے، لیکن جب جہاد کا حکم دے دیا گیا تو ان کے متعلق قرآنِ کریم نے فرمایا:

﴿رَأَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَنْظُرُوْنَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ط فَأَوْلٰى لَهُمْ﴾ (محمد: ۲۰)

ان کے اوسان خطا ہو گئے اور چھپ چھپ کر بچنے لگے، ان منافقین کو یہ خوبی اندازہ تھا

کہ ان کا نفاق حضور ﷺ اور بہت سے مسلمانوں کے سامنے ظاہر ہو چکا ہے، اس وجہ سے جب بھی یہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو کوشش کرتے کہ اپنی چرب زبانی سے حضور ﷺ کو یہ باور کرادیں کہ وہ اسلام کے وفادار اور اس کے تابعدار ہیں، حضور ﷺ اگر چہ زبان کے ان غازیوں سے اچھی طرح واقف تھے لیکن آپ کریم النفس ہونے کے سبب ان کی باتیں سن لیتے جس سے ان کو یہ دھوکہ ہوتا کہ ان کی چرب زبانی اور جادو بیانی کارگر اور مؤثر ہوگئی۔ اخلاصِ عمل کے بغیر زبانی جمع خرچ اور چرب زبانی کی یہ منافقانہ علامت کسی مؤمن میں پائی جائے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ اس میں نفاق کی ایک نشانی پائی جاتی ہے، جس سے فوراً توبہ کرنی چاہیے۔

پانچویں علامت جھوٹی گواہی:

منافقین کی پانچویں علامت جھوٹی گواہی دینا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ سب سے بڑی گواہی توحید ورسالت کی ہے، قرآنِ کریم کے بیان کے مطابق یہ منافقین مجلس نبوی میں آکر کہتے تھے:

﴿ نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ﴾ (المنافقون : ۱)

''ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔''

حق تعالیٰ نے فرمایا: محبوبم! یہ تو سچ ہے کہ آپ واقعی رسول اللہ ہیں؛ لیکن منافقین کی گواہی جھوٹی ہے، نہ ان کا اعتبار ہے اور نہ ہی ان کی گواہی کا، کیوں کہ ان کی گواہی اس لیے جھوٹی ہے کہ وہ محض زبانی دعویٰ ہے، جب کہ دل یقین کامل اور ذوقِ ایمانی سے خالی ہے، یاد رکھو کہ کسی بھی قسم کی جھوٹی گواہی نفاق کی علامت ہونے کے ساتھ کبیرہ گناہ بھی ہے، حدیث پاک میں حضور ﷺ نے کبائر میں جھوٹی گواہی کو بھی شمار فرمایا ہے:

''وَ شَهَادَةُ الزُّوْرِ''. (متفق علیه، مشکوٰۃ : ۱۷، باب الکبائر و علامات النفاق)

کسی مسلمان میں ضعف ایمانی کی وجہ سے اگر یہ برائی پائی جائے تو اسے اپنی

اصلاح کی فکر کرنی چاہیے، ورنہ نفاق کی یہ نشانی -العیاذ باللہ العظیم- نفاقِ حقیقی کا ذریعہ نہ بن جائے۔

چھٹی علامت بہانہ بازی:

منافقین کی چھٹی علامت بہانہ بازی اور جھوٹے عذر پیش کرنا ہے، غزوۂ تبوک کے موقع پر منافقین دربارِ رسالت میں آکر عجیب وغریب بہانے پیش کرنے لگے، کسی نے کہا کہ ہمارے لیے تبوک پہنچنا اس وقت سخت دشوار ہے، اس لیے براہِ کرم آپ ہمیں حکم دے کر نافرمانی کے فتنے میں مبتلا نہ فرمائیں، کسی نے کہا کہ ہماری کھجوروں کی فصل تیار ہے، اگر ہم تبوک چلے گئے تو فصل ضائع ہو جائے گی، لہٰذا آپ ہمیں تبوک کا حکم دے کر مالی نقصان کی آزمائش میں نہ ڈالیں، حتیٰ کہ ایک منافق جس کا نام جَدُ بن قیس تھا وہ کہنے لگا: حضور! میں عورتوں کے بارے میں بڑا کمزور واقع ہوا ہوں، اگر تبوک گیا تو وہاں کی رومی عورتوں کو دیکھ کر میں بہک جاؤں گا، اس لیے درخواست یہ ہے کہ مجھے تبوک میں شرکت سے معذور سمجھیں اور عورتوں کے فتنے میں مبتلا ہونے سے بچالیں۔ حضور ﷺ نے اپنی فطری شرم وحیا کے سبب اس کی طرف سے رُخ پھیرلیا اور عدمِ شرکت کی اجازت دے دی۔ (ابن ابی حاتم، ابن المنذر، ابن مردویہ، طبرانی، روح المعانی وغیرہ)

اس وقت حق تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرما کر منافقین کا راز فاش کردیا کہ

﴿ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَ لَا تَفْتِنِّيْ﴾ (التوبة : ۴۹)

بظاہر تو یہ فتنے سے بچنے کی بات کرتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ باتیں اور بہانے ہی فتنہ ہیں۔

﴿ أَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا﴾

جہاں تک تعلق ہے فتنے کا تو پہلے ہی سے یہ لوگ کفر ونفاق کے فتنے میں مبتلا ہیں۔ معلوم ہوا کہ حکم الٰہی سے روگردانی اور ذمہ داریوں سے بچنے کے لیے جھوٹے بہانے بنانا بھی

منافقین کی علامتوں میں سے ایک ہے۔ اگر کسی مؤمن میں ضعف ایمانی کے سبب یہ برائی پائی جائے تو اس نفاقِ عملی کی اصلاح لازم ہے۔

ساتویں علامت جھوٹی اَفواہیں پھیلانا:

منافقین کی ساتویں علامت یہ ہے کہ مسلمانوں میں پست ہمتی، بزدلی، اضطراب، ماحول میں سنسنی اور بے چینی پیدا کرنے کے لیے غلط اور جھوٹی اَفواہیں پھیلانا اور رائی (کے مانند چھوٹی باتوں) کا پربت (کے مانند بڑا) بنانا، مثلاً یہ کہ مسلمان فلاں علاقے میں مغلوب ہوگئے، یا دشمن کا لشکر جرار حملہ آور ہونے کے لیے آرہا ہے، یا چند مجاہدین کی شہادت پر یہ اَفواہ پھیلانا کہ مجاہدین کی بڑی تعداد شہید ہوگئی (جیسا کہ عصر حاضر میں بڑی حد تک یہ کام میڈیا کر رہا ہے، جس پر اغیار کا قبضہ ہے) اس زمانے میں منافقین اس میں بڑے ماہر تھے اور یہ ان کا محبوب مشغلہ تھا، قرآنِ کریم نے ان کی اس علامت کو واضح کیا کہ اگر منافقین مؤمنین کے ساتھ کسی جنگ یا سفر میں جاتے تو ان کی حرکت کیا ہوتی تھی؟ فرمایا:

﴿ لَوۡ خَرَجُوۡا فِيۡكُمۡ مَّا زَادُوۡكُمۡ إِلَّا خَبَالًا وَّلَاۡأَوۡضَعُوۡا خِلٰلَكُمۡ يَبۡغُوۡنَكُمُ الۡفِتۡنَةَ ۚ وَ فِيۡكُمۡ سَمّٰعُوۡنَ لَهُمۡ﴾ (التوبة : ٤٧)

اگر یہ (منافقین) تم میں مل کر نکل بھی پڑتے (جہاد وغیرہ میں) تو تمہارے لیے سوائے فتنے کے اور کوئی چیز نہ بڑھاتے، رب العالمین نے منافقین کی اس حرکت پر رحمۃ للعالمین ﷺ کو متنبہ فرمایا، پھر وعدہ فرمایا:

﴿ لَئِنۡ لَّمۡ يَنۡتَهِ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَ الَّذِيۡنَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ وَّ الۡمُرۡجِفُوۡنَ فِى الۡمَدِيۡنَةِ لَنُغۡرِيَنَّكَ بِهِمۡ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوۡنَكَ فِيۡهَاۤ إِلَّا قَلِيۡلًا﴾ (الأحزاب : ٦٠)

اگر یہ بد باطن منافقین اپنی ان ناپاک حرکتوں اور جھوٹی اَفواہیں پھیلانے سے باز نہیں آئے تو ہم تمہیں ان پر غلبہ عطا فرمائیں گے، پھر یا تو وہ توبہ کر کے مسلمان ہوجائیں گے،

یا پھر انہیں مدینہ سے نکال دیں گے۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بدعنوانی میں مبتلا لوگوں کا آخری اَنجام مغلوبیت ہے، اگر کسی مسلمان میں ضعف ایمانی کے سبب یہ برائی پائی جائے تو آج توبہ کرنے کا موقع ہے، تاخیر نہ کرے۔

منافقین کی آٹھویں علامت جاسوسی کرنا:

منافقین کی آٹھویں علامت مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی خاطر ان میں رہ کر بظاہر اپنائیت کا اظہار کرتے ہوئے جاسوسی کرنا ہے، قرآنِ کریم نے ان کی اس عادتِ بد کو اس طرح بیان فرمایا:

﴿ وَ فِيۡكُمۡ سَمّٰعُوۡنَ لَهُمۡ﴾ (التوبة : ٤٨)

’’اور تم میں ایسے لوگ ہیں جو ان کے لیے جاسوسی کرتے ہیں۔‘‘

ان منافقین کا مقصد تم میں گھل مل کر تمہاری خفیہ خبریں معلوم کرنا، عیوب تلاش کرنا اور دشمنوں تک وہ خبریں پہنچانا ہے، ان سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے، جاسوسی نفاق کی نشانی ہونے کے ساتھ بہت بری اور خطرناک برائی ہے، اس لیے حق تعالیٰ نے اپنے وفادار بندوں کو اس سے بہ طورِ خاص منع فرمایا: ﴿ وَ لَا تَجَسَّسُوۡا﴾ (الحجرات: ۱۲) گویا جاسوسی مؤمنین کاملین کی شان نہیں، منافقین کی پہچان ہے۔ حدیث پاک میں جاسوسی کرنے والوں کے لیے بڑی سخت وعید آئی ہے کہ ایسے لوگوں کے کانوں میں قیامت کے دن سیسہ پگھلا کر ڈالا جائے گا۔

’’مَنِ اسۡتَمَعَ إِلٰى حَدِيۡثِ قَوۡمٍ، وَ هُمۡ لَهٗ كَارِهُوۡنَ، أَوۡ يَفِرُّوۡنَ مِنۡهُ، صُبَّ فِيۡ أُذُنَيۡهِ الۡآنُكُ يَوۡمَ الۡقِيَامَةِ‘‘. (رواه البخاري: ۲/۲۴۲، کتاب التفسیر، باب من کذب فی حلمه)

مسلمانوں کے لیے منافقین کی ان علامات سے بچنا لازم ہے، ورنہ آخرت میں بڑا خسارہ ہوگا۔

منافقین کی نویں علامت فساد فی الارض:

منافقین کی نویں علامت فساد فی الارض ہے، زمین میں فتنہ وفساد پھیلانا نفاق کی نشانیوں میں سے ہے، چرب زبانی، جھوٹی گواہی، جھوٹی افواہیں اور جاسوسی وغیرہ کا بنیادی مقصد بھی فساد فی الارض ہے، منافقین اس کام میں بڑے ماہر اور گویا پی. ایچ. ڈی. کیے ہوئے ہوتے ہیں، قرآنِ کریم نے ان کے اس عیب سے پردہ اُٹھاتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یُّعۡجِبُکَ قَوۡلُہٗ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا﴾

’’اور لوگوں میں سے بعض (منافقین) ایسے ہیں جن کی باتیں آپ کو خوش کرتی ہیں۔‘‘ (وہ آپ کے سامنے تو بڑی اچھی اور میٹھی باتیں کرتے ہیں)

﴿ وَ یُشۡہِدُ اللّٰہَ عَلٰی مَا فِیۡ قَلۡبِہٖ﴾

’’اور وہ اپنے دل کی باتوں پر اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتے ہیں۔‘‘ (اپنے اسلام واخلاص کو ثابت کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھاتے ہیں اور بڑی اپنائیت کا اظہار کرتے ہیں)

﴿ وَ ہُوَ اَلَدُّ الۡخِصَامِ۝﴾ (البقرۃ: ۲۰۴)

’’حالاں کہ وہ تو زبردست جھگڑالو (اور فسادی) ہے۔‘‘

’’دل بھیڑیوں کے اور کھال انسانوں کی‘‘ کے مصداق ہیں، یہی وجہ ہے کہ

﴿ وَ اِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الۡاَرۡضِ لِیُفۡسِدَ فِیۡہَا وَ یُہۡلِکَ الۡحَرۡثَ وَ النَّسۡلَ وَ اللّٰہُ لَا یُحِبُّ الۡفَسَادَ۝﴾ (البقرۃ: ۲۰۵)

’’جب اسے کچھ اختیار واقتدار ملتا ہے، یا واپس پلٹ کر منافقین کے پاس جاتا ہے تو فساد فی الارض شروع کر دیتا ہے، قتل وغارت گری، کھیتی کی بربادی اور نسل کشی کی کوشش میں لگا رہتا ہے، اور اللہ پاک فسادیوں کو پسند نہیں کرتا۔‘‘

ایک اور مقام پر قرآنِ کریم نے فرمایا کہ منافقین سے جب کہا جاتا ہے کہ فساد فی

الارض مت پھیلاؤ۔

﴿ وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ لَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ﴾

تو کہتے ہیں کہ جی! ہم کہاں اور فساد کہاں؟ ہم مفسد نہیں؛ ہم تو مصلح ہیں۔

﴿ قَالُوۡۤا اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ۝﴾ (البقرۃ: ۱۱)

ہماری کوششوں کا مقصد فساد نہیں؛ بلکہ اصلاح ہے، قرآنِ کریم نے حقیقت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ اَلَاۤ اِنَّہُمۡ ہُمُ الۡمُفۡسِدُوۡنَ وَ لٰکِنۡ لَّا یَشۡعُرُوۡنَ۝﴾ (البقرۃ: ۱۲)

وہ یقیناً دعویٰ تو اصلاح کا کرتے ہیں؛ لیکن درحقیقت وہی فسادی ہیں اور انہیں شعور بھی نہیں۔ ہر زمانے میں منافقین کا یہی کردار رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جن کے دلوں میں نفاق کا مرض ہوتا ہے ان کے دل اور ضمیر مردہ ہو جاتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ فساد کو اصلاح اور اصلاح کو فساد تصور کرتے ہیں۔

قرآنِ کریم کے بیان کے مطابق ہر وہ شخص فسادی ہے جو اصلاح کی آڑ میں فساد اور اتحاد کے نام پر انتشار کی تخم ریزی کرتا ہے، یہ منافق کی پہچان ہے، مؤمن کامل کی شان نہیں۔ ضعف ایمانی کے سبب اگر یہ برائی کسی میں پائی جائے تو اسے فوراً اصلاح کی فکر کرنی چاہیے۔

منافقین کی دسویں علامت
اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے وعدوں کو جھٹلانا:

منافقین کی دسویں علامت اللہ پاک اور اس کے رسول ﷺ کے وعدوں کو جھٹلانا ہے، چنانچہ مستند روایات میں ہے کہ جب غزوۂ احزاب کے موقع پر حضور ﷺ اپنے صحابہؓ کے ساتھ خندق کی کھدائی میں مصروف تھے، اس دوران ایک سخت چٹان بیچ میں آ گئی، جو کسی

طرح ٹوٹ نہیں رہی تھی، حضور ﷺ کو اطلاع دی گئی، تو آپ ﷺ بہ نفس نفیس وہاں تشریف لائے اور آپ ﷺ نے دست مبارک میں کدال لے کر یہ آیت پڑھی:

﴿ وَ تَمَّتُ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدُقًا وَّ عَدُلًاO﴾ (الأنعام : ۱۱۵)

اس سے معلوم ہوا کہ کسی مشکل کو حل کرنے کے لیے اس آیت کریمہ کا وِرد ایک مجرب عمل اور نسخہ ہے۔ (معارف القرآن: ۱۰۶/۷)

پھر آپ ﷺ نے کدال سے چٹان پر ضرب لگائی، جس سے ایک تہائی چٹان ٹوٹ گئی اور اس میں سے ایک روشنی نمودار ہوئی، جس میں بہ طورِ معجزہ آپ ﷺ کو کسریٰ کے محلات دِکھائے گئے، پھر دوسری ضرب لگاتے وقت بھی آپ ﷺ نے اسی آیت کو پڑھا، تو چٹان کا ایک اور حصہ ٹوٹا، جس کی روشنی میں روم کے محلات دِکھائے گئے، اس کے بعد تیسری ضرب پر پوری چٹان ٹوٹ گئی اور اس کی روشنی میں یمن کے محلات دِکھائے گئے، اس موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے یمن، فارس اور روم کے محلات دِکھا کر یہ بشارت دی گئی کہ یہ سارے ممالک میری امت کے ہاتھوں فتح ہوں گے۔ منافقین نے جب یہ سنا تو کہنے لگے کہ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ خود اپنے شہر کا بچاؤ کرنا مشکل ہے اور خواب دیکھے جا رہے ہیں کہ ایران اور روم ہمارے ہاتھوں فتح ہوں گے۔

حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اُس وقت یہ آیت نازل ہوئی، جس میں فرمایا:

﴿ وَ إِذُ يَقُولُ الْمُنٰفِقُونَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوبِهِمُ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُولُهٗ إِلَّا غُرُورًاO﴾ (الأحزاب : ۱۲)

’’اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے محض ایک دھوکے ہی کا وعدہ کیا ہے۔‘‘

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے وعدوں کو جھٹلانا منافق کی پہچان ہے، مؤمن کی شان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے ایمان و اعمال پر جتنے وعدے کیے ہیں ان تمام پر ایمان و یقین رکھتا ہے، مؤمنین نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول

ﷺ کے وعدے کی تکذیب نہیں کی اور جب کبھی ان سے وعدہ کیا گیا تو انہوں نے ہمیشہ ہی تصدیق کی۔ مؤمنین کہتے ہیں:

﴿ هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُولُهٗ وَ صَدَقَ اللّٰهُ وَ رَسُولُهٗ﴾ (الأحزاب : ۲۲)

’’اسی کا وعدہ ہم سے اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول ﷺ نے کیا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا وعدہ سچا ہے۔ (کبھی جھوٹا نہیں ہوتا)۔

منافقین کی گیارہویں علامت وعدہ خلافی کرنا:

منافقین کی گیارہویں علامت وعدہ خلافی کرنا ہے، ظاہر ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے وعدوں کو جھٹلا سکتے ہیں وہ اپنے کیے ہوئے وعدوں کو کیسے نہیں جھٹلا سکتے، وعدہ خلافی نفاق کی بنیادی نشانی ہے، جیسے قرآنِ کریم نے منافقین کی وعدہ خلافی کی مثال پیش کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ وَ لَقَدُ كَانُوا عٰهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّونَ الْأَدْبَارَ ط وَ كَانَ عَهُدُ اللّٰهِ مَسْئُولًاO﴾ (الأحزاب : ۱۵)

بات یہ تھی کہ غزوۂ اُحد میں تین ہزار کفار نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا، اس وقت حضور ﷺ ایک ہزار افراد کے ساتھ مدینہ طیبہ سے مقابلہ کے لیے نکلے، لیکن راستے میں رئیس المنافقین اپنے تین سو افراد کو لے کر واپس ہو گیا۔ ’’برے وقت کا اچھا وصف یہ ہے کہ وہ اچھے برے لوگوں کی پہچان کرا دیتا ہے۔‘‘

غزوۂ اُحد کے بعد منافقین نے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ کسی بھی مشکل گھڑی میں بے وفائی نہیں کریں گے:

﴿ وَ لَقَدُ كَانُوا عٰهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّونَ الْأَدْبَارَ ط وَ كَانَ عَهُدُ اللّٰهِ مَسْئُولًاO﴾ (الأحزاب : ۱۵)

لیکن جب غزوۂ احزاب کا موقع آیا تو پھر وہی وعدہ خلافی کر دی، اس پر انہیں تنبیہ

کی گئی کہ

﴿وَ کَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْئُوْلًا۝﴾

''قیامت کے دن تم سے اس وعدہ خلافی کے متعلق باز پرس ہوگی۔''

قرآنِ کریم نے ان منافقین کی وعدہ خلافی کی ایک اور مثال پیش کی ہے:

﴿وَ مِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ۝﴾ (التوبة : ٧٥)

''ان منافقین میں وہ بھی ہیں جنہوں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے (یعنی مال سے) ہمیں نوازا تو ہم ضرور صدقہ وخیرات کریں گے اور صالحین میں سے بن جائیں گے۔''

﴿فَلَمَّآ اٰتٰهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَ تَوَلَّوْا وَّ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ۝﴾ (التوبة : ٧٦)

''جب اللہ پاک نے انہیں مال سے نوازا تو بخل کرنے لگے (یہ بخل بھی منافقین کی ایک علامت ہے) اور ٹال مٹول کر کے منھ موڑ لیا۔''

﴿فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ۝﴾ (التوبة : ٧٧)

''پھر تو اس کی سزا میں حق تعالیٰ نے اپنی ملاقات (قیامت) کے دن تک ان کے دلوں میں نفاق ڈال دیا، کیوں کہ انہوں نے اللہ پاک سے کیے ہوئے وعدے کے خلاف کیا اور جھوٹ بولے۔''

معلوم ہوا کہ وعدہ خلافی نفاق کی نشانی ہے، اسی لیے حدیث پاک میں منافقین کی جو بڑی اور بنیادی علامتیں بیان کی گئیں ان میں یہ بھی ہے: "و إذا وعد غدر". اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں ہے:

"وَ إِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ١٧)

٣٥٩

جب کہ مؤمنین کی صفات میں وعدہ وفائی ہے:

﴿وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ۝﴾ (المؤمنون : ٨)

مؤمن نہ امانت میں خیانت کرتا ہے، نہ وعدہ خلافی کرتا ہے، یہ منافق کی پہچان ہے، مؤمن کی شان نہیں۔

منافقین کی بارہویں علامت خیانت کرنا:

منافقین کی بارہویں علامت امانت میں خیانت کرنا ہے، اور یاد رکھو! امانت کا مطلب صرف یہ نہیں کہ روپیہ، پیسہ وغیرہ کوئی چیز کسی کے پاس رکھی جائے تو اس کی حفاظت امانت ہے اور حفاظت نہ کرنا خیانت ہے؛ بلکہ اس کے علاوہ بھی اللہ پاک کی ہر نعمت ہمارے پاس امانت ہے، اس کا غلط استعمال خیانت ہے، اسی طرح شریعت کے تمام احکام بھی امانت ہیں، ان کی خلاف ورزی کرنا خیانت ہے، چنانچہ ارشادِ باری ہے:

﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ أَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۝﴾ (الأحزاب : ٧٢)

''ہم نے اس امانت کو آسمان وزمین اور پہاڑوں پر پیش کیا؛ لیکن سب نے انکار کر دیا (کہ ہم امانت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے؛) لیکن انسان نے بارِ امانت اُٹھا لیا، وہ بڑا ظالم وجاہل ہے۔''

مفسرین کے بقول یہاں امانت میں تمام احکامِ شریعت داخل ہیں، حق تعالیٰ نے اگلی آیت میں ان کی پاسداری اور فرماں برداری کرنے والوں کو مؤمن اور اس کا پاس ولحاظ نہ رکھنے والوں کو منافق ومشرک فرمایا ہے:

﴿لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ﴾ (الأحزاب : ٧٣)

معلوم ہوا کہ امانت کی حفاظت مؤمنین کی صفت ہے، جب کہ امانت میں خیانت منافقین کی علامت ہے۔ حدیث پاک میں منافقین کی جو بڑی اور بنیادی علامتیں بیان فرمائیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ "إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ". (مسلم، مشكوٰة : ١٧) کسی بھی

قسم کی امانت میں خیانت ضعف ایمان کی علامت ہے۔ اوراس کی عادت نفاق کی علامت ہے۔ فافہم۔

منافقین کی تیرہویں علامت گالی گلوچ کرنا:

منافقین کی تیرہویں علامت گالی گلوچ کرنا ہے، حدیث میں ہے: "إِذَا خَاصَمَ فَجَرَ". (متفق علیہ، مشکوٰۃ: ۱۷) جب کبھی کسی سے جھگڑے تو گالیاں بولے، یہ گالی گلوچ کرنا منافقین کی پہچان ہے، مؤمن کی شان نہیں؛ کیوں کہ مؤمن تو اس حقیقت سے باخبر ہوتا ہے:

﴿ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظُلِمَ ﴾ (النساء: ۱۴۸)

"برائی کے ساتھ آواز بلند کرنے کو یا کسی کو علانیہ طور پر برا کہنے کو حق تعالیٰ پسند نہیں فرماتے، مگر یہ کہ وہ مظلوم ہو۔"

اس لیے مؤمن ہر طرح کی بدزبانی سے پرہیز کرتا ہے۔ حدیث میں ہے:

"لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ، وَ لَا اللَّعَّانِ، وَ لَا الْفَاحِشِ وَ لَا الْبَذِيْءِ". (ترمذی، مشکوٰۃ: ۴۱۳)

"مؤمن طعن کرنے والا، لعنت کرنے والا، فحش باتیں کرنے والا اور بیہودہ گوئی (گالی گلوچ) کرنے والا نہیں ہوتا۔"

بعض بزرگوں نے فرمایا کہ منھ سے گالی بولنا منھ میں گندگی رکھنے سے زیادہ برا ہے، کیوں کہ گندگی سے منھ ناپاک ہوگا، جب کہ گالی سے منھ اور فضا دونوں ناپاک ہوں گے۔

منافقین کی چودہویں علامت طعنہ زنی:

منافقین کی چودہویں علامت اہل ایمان اور نیک لوگوں کی عزت پر حملہ آور ہونا، زبانِ طعن دراز کرنا اور طعنہ زنی ہے، قرآنِ کریم نے منافقین کی اس علامت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ إِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ط سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ز وَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ۝ ﴾ (التوبة: ۷۹)

"منافقین دل کھول کر خیرات کرنے والے مؤمنین پر طعنہ زنی کرتے ہیں اور ان لوگوں پر بھی جنہیں سوائے اپنی محنت و مزدوری کے کچھ میسر نہیں، پس یہ ان کا مذاق اُڑاتے ہیں، تو اللہ پاک بھی ان سے مذاق کرے گا (انہیں اس مذاق کی سخت سزا دے گا) اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔"

واقعہ یہ پیش آیا کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر مسلمانوں کو مالی تعاون کی سخت ضرورت پیش آئی، تب سرکارِ دو عالم ﷺ نے چندے کی اپیل فرمائی، اس موقع پر حضرت صدیق اکبرؓ اپنے گھر کا سارا مال لے کر حاضر ہوگئے، فاروقِ اعظمؓ آدھا مال لے آئے، عثمان غنیؓ نے کئی سو اونٹ مال سے لدے ہوئے پیش فرمائے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ چار ہزار درہم لائے، بعض صحابہؓ جو نہایت غریب اور مزدور پیشہ تھے انہوں نے بھی اس میں حصہ لینا چاہا، چنانچہ حضرت ابو عقیل انصاریؓ نے رات بھر مزدوری کر کے جو کچھ مزدوری حاصل کی اس میں سے ایک صاع لے کر آئے اور اپنی پوزیشن بتادی، حضور ﷺ نے ان کا حوصلہ بڑھانے کے لیے حکم فرمایا کہ اس کھجور کو تمام صدقات کے مال پر پھیلا دو، غرض تمام مؤمنین مخلصین نے اپنی حیثیت کے بقدر مالی تعاون میں حصہ لیا۔

اس وقت منافقین نے اس کارِ خیر میں حصہ لینے کے بجائے حضراتِ صحابہؓ کی عزت پر حملہ کیا، طعنے دیے اور حوصلہ شکنی کا معاملہ کیا، ان منافقین نے امیر صحابہؓ کے مالِ کثیر پیش کرنے پر طعنہ زنی کرتے ہوئے کہا کہ یہ سب ریا کار ہیں۔ (نعوذ باللہ) اور غریب صحابہؓ کے مالِ قلیل پر طعنہ زنی کرتے ہوئے کہا کہ ان چند کھجوروں کی اللہ تعالیٰ کو کیا ضرورت ہے؟ اس سے کیا ہوگا؟ الغرض امیر و غریب تمام کو انہوں نے اپنے طعنوں کا نشانہ بنایا اور مذاق بھی کیا، اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (بخاری، کتاب التفسیر، باب قولہ الذین یلمزون، عن ابن مسعودؓ)

آج بھی جن لوگوں میں نفاق کی یہ علامت پائی جاتی ہے وہ ساری دنیا کو چھوڑ کر نیک لوگوں کو طعنہ زنی کا نشانہ بناتے ہیں، کبھی ان کی ڈاڑھی کا مذاق، تو کبھی ان کے مسنون لباس پر طعنہ زنی وغیرہ، یہ بدترین برائی انجام کار رتباہی کا ذریعہ ہے۔ العیاذ باللہ۔

منافقین کی پندرہویں علامت

دین کا اور دین داروں کا مذاق اُڑانا:

منافقین کی پندرہویں علامت دین کا اور دین داروں کا مذاق اُڑانا ہے، کیوں کہ دین اور دین داروں سے انہیں دلی دشمنی ہوتی ہے، اس لیے جب کبھی انہیں موقع ملتا ہے تو دین اور دین داروں کو نقصان پہنچاتے ہیں، ان کی اسی علامت بد کے متعلق قرآنِ کریم میں فرمایا گیا:

﴿ وَ إِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَ إِذَا خَلَوْا إِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْٓا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ (البقرة : ۱۴)

''اور وہ جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لے آئے، اور جب اپنے بڑوں کے پاس جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو ان سے صرف مذاق کرتے ہیں۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَ لَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَ نَلْعَبُ ؕ قُلْ أَبِاللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ وَ رَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ (التوبة : ۶۵)

''اور اگر آپ ان سے (دین اور دین داروں کے مذاق کے متعلق) سوال کریں گے تو کہیں گے ہم تو یوں ہی آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے، محبوبم! کہہ دیجیے کہ کیا اللہ تعالیٰ، اس کی آیتیں اور اس کا رسول ہی تمہارے مذاق کے لیے رہ گئے ہیں؟''

معاملہ یہ تھا کہ تبوک کے زمانے میں منافقین اکثر اپنی نجی مجالس میں حضور ﷺ اور حضراتِ صحابہؓ کا مذاق اُڑاتے تھے، روایتوں میں ان کے مختلف اقوال منقول ہیں، مثلاً ایک محفل میں چند منافقین گپ شپ کر رہے تھے، ایک نے کہا: اجی! کیا رومیوں کو بھی تم نے عربوں کی طرح سمجھ رکھا ہے؟ کل دیکھ لینا، یہ سب سورما جولڑنے جا رہے ہیں رسیوں میں بندھے ہوں گے۔

دوسرا بولا: اگر اس کے بعد انہیں سو سو کوڑے لگانے کا حکم بھی ملے تو طبیعت خوش ہو جائے، ایک اور منافق حضور ﷺ کو جنگ کی تیاری میں مشغول دیکھ کر کہنے لگا کہ آپ کو توقع ہے شام کے محلات اور قلعے فتح کرنے کی، ''ایں خیال است ومحال است وجنوں''، کسی نے کہا:

'' مَا رَأَيْتُ مِثْلَ قُرَّاءِ نَا هٰؤُلَاءِ أَرْغَبَ بُطُوْنًا، وَ لَا أَكْذَبَ أَلْسُنًا، وَ أَجْبَنَ عِنْدَ اللِّقَاءِ''. (تفسیر ابن کثیر: ۳۶۸/۲)

''میں نے ان قرآنِ کریم کے قراء سے بڑھ کر بسیار خور، زبان کے جھوٹے اور بزدل نہیں دیکھے۔''

وحی کے ذریعہ حق تعالیٰ نے منافقین کی ان بدتمیزیوں کا پردہ فاش کر دیا، جب حضور ﷺ نے ان سے اس سلسلے میں پوچھا تو صاف مکر گئے اور کہنے لگے: ﴿إِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَ نَلْعَبُ﴾ ہم کوئی سنجیدہ گفتگو نہیں کر رہے تھے، ہم تو بس ویسے ہی ہنسی مذاق اور دل لگی کر رہے تھے، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا تمہارے پاس ہنسی مذاق کے لیے اللہ پاک، اس کی آیات اور اس کے رسول (اور صحابہؓ) ہی رہ گئے؟ واقعۃً یہ لوگ بہانے باز تھے، ورنہ دین اور دین داروں کا بیہودہ مذاق کرنا ان کی عادتِ بد تھی، آج بھی دین داروں کا بیہودہ مذاق اسی فطرت کے لوگ کرتے ہیں۔ (العیاذ باللہ)۔

منافقین کی سولھویں علامت
تنہائی میں بے خوف ہوکر گناہ کرنا:

منافقین کی سولھویں علامت تنہائی میں بے خوف ہوکر گناہ کرنا ہے، کیوں کہ پہلے عرض کیا جا چکا کہ منافقین کی بنیادی اور مرکزی نشانی ظاہر و باطن کا تضاد ہے، ان کا ظاہر کچھ ہوتا ہے، باطن کچھ ہوتا ہے، وہ بظاہر دین دار ہوتے ہیں؛ مگر حقیقت میں بے دین ہوتے ہیں، لوگوں کے سامنے تو برائی سے باز رہتے ہیں؛ لیکن تنہائی میں بے خوف ہوکر گناہ کرتے ہیں، قرآنِ کریم نے ان کی اس برائی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَ لَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللّٰهِ وَ هُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا۝﴾ (النساء : ۱۰۸)

"یہ (منافقین) لوگوں سے تو اپنی حرکاتِ بد اور جرائم چھپا سکتے ہیں؛ مگر اللہ پاک سے نہیں چھپا سکتے، وہ راتوں کی تنہائیوں میں جب اللہ تعالیٰ کی ناپسندیدہ باتوں کے خفیہ مشورے (اور گناہ کے کام) کرتے ہیں تب بھی اللہ پاک (اپنے علم کے ساتھ) ان کے پاس ہوتا ہے، اللہ پاک ان کے تمام اعمال کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔"

تم سب سے چھپ سکتے ہو، رب سے نہیں، تمہارے تنہائی کے جرائم کوئی جانے نہ جانے، وہ ضرور جانتا ہے۔ منافقین کو ان حقائق کا یقین نہیں ہوتا، اس لیے اگر وہ لوگوں کے سامنے اپنی عزت کی حفاظت کے لیے یا کسی اور سبب سے گناہوں سے بچتے بھی ہیں تو تنہائیوں میں گناہوں سے نہیں بچتے، منافقین کی یہ عادتِ بد اگر ضعف ایمانی کے سبب کسی مسلمان میں پائی جائے تو ڈرنا اور بچنا چاہیے، ورنہ تنہائی کے گناہ بڑی بڑی نیکیوں کو "هَبَاءً مَنْثُورًا" (ضائع) کرسکتے ہیں۔

حدیث پاک میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں اپنی اُمت میں سے ایک

ایسی قوم کو جانتا ہوں جو قیامت کے دن تہامہ پہاڑ کے برابر نیکیاں لے کر آئیں گے، لیکن حق تعالیٰ ان کی نیکیوں کو بکھری ہوئی گرد وغبار (مٹی کے ذرات) کی طرح بے حیثیت کر دے گا۔ حدیث پاک کے راوی حضرت ثوبانؓ نے دریافت کیا: حضور! ان کے اوصاف وعلامت بتا دیں، تا کہ ہم بچ سکیں، تب آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ بھی تمہارے بھائی اور تمہاری ہی نسل سے ہیں، وہ بھی راتوں کو تمہاری طرح قیام کرتے ہیں۔

"وَ لٰكِنَّهُمْ أَقْوَامٌ إِذَا خَلَوْا بِمَحَارِمِ اللّٰهِ انْتَهَكُوْا". (ابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر الذنوب)

"لیکن وہ ایسی قوم ہے کہ جب انہیں تنہائی میں موقع ملتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ حدود کو پامال کرتے ہیں۔" تنہائی میں موقع ملتے ہی گناہوں کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ العیاذ باللہ العظیم۔

اس سے حفاظت کے لیے ایک تو دعاؤں کا اہتمام اور تنہائی میں توبہ واستغفار اور ذکر اللہ کا التزام کرنا چاہیے۔ یا اللہ! اپنے فضل وکرم سے ہماری تنہائیوں کو پاک فرما اور اپنی یاد سے آباد فرما۔ آمین۔

منافقین کی سترہویں علامت
باطن کی اصلاح سے بے فکر ہونا:

منافقین کی سترہویں علامت یہ ہے کہ وہ اپنے ظاہر کو سنوارنے کا تو خوب اہتمام کرتے ہیں؛ مگر باطن کی اصلاح سے بے فکر ہوتے ہیں، قرآنِ کریم نے ان کے اس وصف بد کو اس طرح بیان فرمایا:

﴿ وَ إِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ﴾ (المنافقون : ۴)

"اور جب آپ انہیں دیکھیں گے تو ان کا جسم اور ظاہری حلیہ بڑا پرکشش، خوش نما،

شان دار و جان دار نظر آئے گا۔"

کیوں کہ ان کی ساری توجہ ظاہر کو سنوارنے پر ہوتی ہے اور وہ اپنے باطن کی اصلاح سے بے فکر ہوتے ہیں، یعنی جس پر لوگوں کی نظر پڑتی ہے اس کو تو خوب سنوارتے ہیں، اور جس پر لوگوں کے رب کی نظر رہتی ہے اسے سنوارنے کی کوئی فکر نہیں کرتے۔

ہمارے شیخ حضرت شیخ الزمان مولانا محمد قمر الزمان صاحب مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ باطن کی اصلاح فرضِ عین ہے، یہ جنازہ اور تہجد نہیں؛ بلکہ نمازِ فجر کے مانند ہے، اللہ پاک کی نظر ظاہر سے زیادہ باطن پر ہوتی ہے۔

حدیث پاک میں ہے:

"عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلٰى صُوَرِكُمْ وَ أَمْوَالِكُمْ، وَ لٰكِنْ يَنْظُرُ إِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَ أَعْمَالِكُمْ". (رواه مسلم، مشكوٰة: ٤٥٤، باب الرياء و السمعة)

"اللہ پاک تمہاری صورتوں اور اموال پر نظر نہیں فرماتے، یعنی تمہارے ظاہری جبے قبے اور حلیے کو نہیں دیکھتے، نہ اس پر قبولیت اور عدم قبولیت کا فیصلہ فرماتے ہیں؛ بلکہ وہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتے ہیں، تمہارے دلوں اور اعمال کی کیفیات، اخلاص، سچائی اور اچھائی کو دیکھتے اور جانتے ہیں اور اسی پر وہ قبولیت و محبوبیت کا فیصلہ فرماتے ہیں۔ اسی لیے صوفیہ کہتے ہیں:

آدمیت لحم و شحم و پوست نیست   آدمیت جز رضائے دوست نیست

ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ظاہر کو سنوارنے کا کوئی اعتبار نہیں؛ بلکہ مطلب یہ ہے کہ سارا زور ظاہر کو سنوارنے کے لیے خرچ کرنا اور باطن کی اصلاح سے بے فکر رہنا یہ بات غلط ہے، یہ ایک مسلمان کی شان نہیں، منافق کی پہچان ہے۔ العیاذ باللہ۔

منافقین کی اٹھارہویں علامت فہم وفراست کی کمی:

منافقین کی اٹھارہویں علامت اور نشانی فہم وفراست کی کمی ہے، مؤمن کا دل نورِ ایمانی سے منور ہوتا ہے، اس لیے اسے فہم وفراست ایمانی سے نوازا جاتا ہے، ہر ایک کو نورِ ایمانی کے بقدر فراست ایمانی سے نوازا جاتا ہے، اسی لیے فرمایا:

"اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ؛ فَإِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ". (رواه الترمذی)

جب کہ منافق کا دل ایمان سے خالی اور نفاق سے پر ہوتا ہے، اس لیے وہ ایمانی فہم وفراست سے محروم رہتا ہے۔ اس کا تذکرہ قرآنِ کریم نے اس طرح فرمایا:

﴿ وَ لٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ۝﴾ (المنافقون: ۷)

اور منافقین دین کی حقیقی اور صحیح سمجھ بوجھ سے محروم ہوتے ہیں، وہ دنیوی علوم و امور میں بڑے ماہر تو ہو سکتے ہیں؛ لیکن دینی امور وعلوم سے محروم ہوتے ہیں، وہ اس آیت کے مصداق ہوتے ہیں:

﴿ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۖ وَ هُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ۝﴾ (الروم: ۷)

"وہ دنیوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں، حالاں کہ وہ آخرت سے (مکمل طور پر) غافل ہیں۔"

انہیں دینی فہم وفراست کی ہوا بھی نہیں لگتی، کیوں کہ حق تعالیٰ جن کے کفر ونفاق سے ناراض ہوتے ہیں انہیں دین کے فہم سے محروم کر دیتے ہیں۔ اور جن سے راضی ہوتے ہیں اور خیر کثیر سے نوازنا چاہتے ہیں انہیں دین کا فہم عطا فرماتے ہیں۔ حدیث میں ہے:

"مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ". (متفق عليه، مشكوٰة: ۳۲، كتاب العلم)

دینی امور وعلوم کے ساتھ دنیوی امور وعلوم میں مہارت اچھی بات ہے؛ لیکن دینی امور وعلوم سے غفلت کے ساتھ دنیوی امور وعلوم میں مہارت نفاق کی علامت ہے۔ العیاذ باللہ۔

منافقین کی اُنیسویں علامت تقدیر پر اعتراض:

منافقین کی اُنیسویں علامت تقدیر پر اعتراض کرنا ہے، جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا گیا کہ منافقین دینی فہم وفراست سے محروم ہوتے ہیں؛ اس لیے وہ ظاہری تدبیر ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر ان کا ایمان نہیں ہوتا، بلکہ انہیں تقدیر پر اعتراض ہوتا ہے، حالاں کہ اچھی بری تقدیر کا من جانب اللہ ہونا یہ ایمان کا بنیادی حصہ ہے، جیسا کہ حدیث جبرئیل علیہ السلام سے معلوم ہوا۔ (مسلم، مشکوٰۃ: ۱۱)

حق تعالیٰ نے اس حقیقت کو قرآنِ پاک میں بیان فرمایا:

﴿قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ إِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا﴾ (التوبة: ۵۱)

''محبوبم! آپ بتلا دیجیے کہ رب العالمین نے جو کچھ بھی مقدر میں اچھا برا لکھ دیا وہ بہر حال ہو کر رہے گا۔''

کوئی مانے یا نہ مانے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر منافقین کو یقین نہیں ہوتا، اس لیے وہ ''اگر، مگر'' کا سہارا لے کر تقدیر پر اعتراض کرتے ہیں۔ چنانچہ غزوۂ اُحد کے موقع پر جب مسلمان جوش وخروش کے ساتھ نکلنے لگے تو منافقین نے منع کرنے کی کوشش کی، لیکن جن کے دلوں میں اللہ پاک اور اس کے رسول ﷺ کی عظمت و محبت ہوتی ہے وہ ان کے مقابلے میں کسی کے حکم کو نہیں مانتے، حضرات صحابہؓ نے غزوۂ اُحد میں شرکت کی، جس میں تقدیرِ الٰہی سے ستر صحابہؓ شہید ہو گئے، اس پر منافقین نے کہنا شروع کیا کہ ہم نے کہا تھا کہ جنگ میں نہ جاؤ، ورنہ مارے جاؤ گے، قرآنِ کریم نے ان کے اس اعتراض کو اس طرح بیان فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِإِخْوَانِهِمْ وَ قَعَدُوْا لَوْ أَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا﴾ (آل عمران: ۱۶۸)

اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تمہاری تدبیر ہماری تقدیر پر غالب ہے اور تم اپنے دعوے میں سچے ہو کہ جنگ میں شرکت نہ کرنے سے موت سے بچ سکتے ہیں،

تو تم اپنی موت سے بچ کر دِکھاؤ، اپنی تدبیر کے ذریعہ موت کو ٹال کر دِکھاؤ۔

﴿قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ أَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝﴾ (آل عمران: ۱۶۸)

روایتوں میں ہے کہ جس دن یہ آیت نازل ہوئی اس دن ستّر منافقین گھر میں رہتے ہوئے مر گئے اور اپنی جان نہ بچا سکے۔ (روح المعانی)۔

الغرض اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر ایمان رکھنا اور اس پر راضی ہو جانا مؤمن کی شان ہے۔ اور تقدیر کا انکار اور اس پر اعتراض منافق کی پہچان ہے۔

منافقین کی بیسویں علامت
مسلمانوں سے عداوت اور کفار سے محبت:

منافقین کی بیسویں علامت یہ ہے کہ انہیں مسلمانوں سے نفرت اور کفار و فجار سے محبت ہوتی ہے، برتن سے وہی چیز ٹپکتی ہے جو اس میں ہوتی ہے، ان کے دل کے برتن میں کفر ہوتا ہے، اس لیے انہیں محبت بھی کفار ہی سے ہوتی ہے، ان کا دل ایمان سے خالی ہوتا ہے، اس لیے انہیں مؤمنین سے محبت بھی نہیں ہوتی، مؤمنین کی محبت سے ان کا دل خالی ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں منافقین کی اس بدترین عادت کا تذکرہ کرنے سے پہلے انہیں بدترین عذاب کی بشارت دی گئی:

﴿بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِأَنَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيْمًا۝﴾ (النساء: ۱۳۸)

''منافقین کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔''

کیوں؟ تو فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ أَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ۝﴾ (النساء: ۱۳۹)

''اس لیے کہ انہوں نے مؤمنین کو چھوڑ کر کفار کو دوست بنایا۔''

انہیں محبت ہے تو کفار سے، مؤمنین سے نہیں، انہیں عداوت ہے تو مؤمنین سے،

کفار سے نہیں۔ اور یہ فطری بات ہے کہ آدمی کو جس سے محبت ہوتی ہے اس کی راحت سے خوشی اور مشقت سے پریشانی ہوتی ہے، منافقین کا یہی حال ہوتا ہے۔

منافقین کی اکیسویں علامت

مسلمانوں کی راحت سے پریشانی اور مصیبت سے خوشی:

منافقین کی اکیسویں علامت یہ ہے کہ انہیں مؤمنین کی راحت سے پریشانی اور مشقت ومصیبت سے خوشی ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ یہ مؤمنین سے شدید عداوت کی علامت ہے، قرآنِ کریم نے اسے یوں بیان فرمایا:

﴿ إِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَ إِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا﴾ (آل عمران : ۱۲۰)

''تمہاری خوشی سے انہیں پریشانی اور تمہاری پریشانی سے انہیں خوشی ہوتی ہے۔''

یہ نفاق کی نشانی ہے، جب کہ مؤمنین تو جسد واحد کے مانند ہیں، اس لیے دنیا بھر میں کہیں بھی کسی مسلمان کو کوئی کانٹا بھی چبھے تو سارا عالم اسلام پریشان ہوجاتا ہے، یہی ایک اصلی مسلمان کی صحیح پہچان ہے۔

منافقین کی بائیسویں علامت دھوکہ دہی اور چال بازی:

منافقین کی بائیسویں علامت دھوکہ دہی اور چال بازی ہے، حالاں کہ دھوکہ باز انجام کے اعتبار سے خود ہی دھوکے میں ہے اور چال باز اپنے دھوکے کے بچھائے ہوئے جال میں کبھی نہ کبھی ضرور پھنس جاتا ہے، منافقین کی اس عادتِ بد کو قرآنِ کریم نے بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ مَا يَخْدَعُوْنَ إِلَّآ أَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ﴾ (البقرة : ۹)

''وہ اللہ تعالیٰ کو اور ایمان والوں کو دھوکہ دیتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انجام

کے اعتبار سے وہ خود اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں؛ مگر وہ شعور نہیں رکھتے۔''

اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ منافقین بزعم خود یہ سمجھتے ہیں کہ گویا ان کے ایمان سے انحراف اور نفاق کا اللہ تعالیٰ کو علم ہی نہیں ہے، اس طرح جیسے ہم لوگوں کو اپنے ظاہر سے دھوکہ دے رہے ہیں اللہ تعالیٰ کو بھی دھوکہ دے رہے ہیں۔

دوسرا مطلب بعض علماء نے یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینے کا مطلب رسول اللہ ﷺ کو دھوکہ دینے کی کوشش کرنا ہے، جیسے حضور ﷺ کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، تو حضور ﷺ کو دھوکہ دینے کی کوشش بھی اللہ تعالیٰ ہی کو دھوکہ دینے کی کوشش کرنا ہے۔ واللہ اعلم۔

حقیقت یہ ہے کہ دھوکہ باز کسی کو چند روز کے لیے دھوکہ دے سکتا ہے؛ مگر اس کا دھوکہ ہمیشہ نہیں چل سکتا، اسی طرح کسی کو اپنی چال کے جال میں چند دنوں، مہینوں یا سالوں تک پھنسایا جاسکتا ہے، ہمیشہ کے لیے وہ اپنے جال میں پھنسانے میں کامیاب نہیں ہوسکتا، اس کے دھوکوں اور چالوں کا راز یا تو دنیا ہی میں فاش ہوگا، ورنہ آخرت میں تو یقیناً ہوگا اور اس پر سخت سزا بھی دی جائے گی۔ اسی کو دوسرے مقام پر اس طرح فرمایا:

﴿ إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ﴾ (النساء : ۱۴۲)

''بلاشبہ منافقین اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں حالاں کہ وہ انہیں خود دھوکے میں ڈالنے والا ہے۔'' یعنی ان کی دھوکہ بازی اور چال بازی کی سزا دینے والا ہے۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ منافقین کو ان کی دھوکہ بازی اور چال بازی کی سزا قیامت میں اس طرح دی جائے گی کہ مؤمنین کو جو نورِ ایمانی عطا ہوگا اس کی روشنی میں وہ جنت کی راہ لیں گے، اسی روشنی میں منافقین کو بھی کچھ دور تک چلنے دیا جائے گا، جس سے ان کو یہ دھوکہ ہوگا کہ انہیں بھی مسلمانوں کے ساتھ جنت ملے گی؛ مگر آگے جا کر ان سے وہ نور چھین لیا جائے گا، مسلمان تو اپنے نورِ ایمانی میں آگے بڑھ جائیں گے اور یہ منافقین بھٹکتے رہ

جائیں گے اور بالآخر دوزخ میں ڈال دیے جائیں گے۔ اس منظر کو قرآنِ کریم نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

﴿ يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَ ظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۝﴾ (الحديد : ۱۳)

''اس دن منافق مرد و زن اہلِ ایمان سے درخواست کریں گے کہ ہمارا انتظار کرو (ہمیں بھی ساتھ لے چلو) ہم بھی تمہارے نور سے روشنی حاصل کریں، جواب دیا جائے گا کہ تم اپنے پیچھے لوٹ جاؤ، پھر مؤمنین اور منافقین کے مابین ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں دراوزہ بھی ہوگا، اس کے اندرونی حصے میں تو رحمت ہوگی اور بیرونی حصے میں عذاب ہوگا، جس طرف مؤمنین ہوں گے وہاں تو رحمت ہوگی اور جہاں منافقین ہوں گے وہاں عذاب ہوگا۔''

منافقین کی تیئیسویں علامت نماز میں سستی:

منافقین میں تیئیسویں علامت نماز میں کاہلی اور سستی کرنا ہے، یہ لوگ برائی میں تو آگے آگے رہتے ہیں؛ لیکن نماز اور نیکی میں پیچھے رہتے ہیں، قرآنِ کریم نے اس نشانی کو بیان فرمایا:

﴿ وَ اِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ﴾ (النساء : ۱۴۲)

''اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو کاہلی کے ساتھ۔''

صاف نظر آتا ہے کہ نماز اور نیکی کے لیے طبیعت میں بشاشت نہیں؛ لیکن چوں کہ اپنے آپ کو مسلمان بھی ظاہر کرنا ہے، اس لیے بے دلی اور سستی کے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَ لَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَ هُمْ كُسَالٰى ﴾ (التوبة : ۵۴)

''وہ بڑی کاہلی اور سستی ہی سے نماز کو آتے ہیں۔''

نماز کا وقت کیا آ گیا گویا بڑی مصیبت آ گئی، انہیں بادلِ ناخواستہ نماز کے لیے آنا پڑتا ہے، کیوں کہ عہدِ نبوت میں اس وقت تک کوئی شخص مسلمانوں میں شمار نہیں ہوسکتا تھا جب تک کہ وہ نماز باجماعت کا پابند نہ ہو، جس طرح آج دینوی جماعتیں اور مجلسیں اپنے اجتماعات میں کسی ممبر کے بلا عذر شریک نہ ہونے کو اس کی عدمِ دل چسپی پر محمول کرتی ہیں اور مسلسل چند اجتماعات میں غیر حاضری پر اسے ممبرشپ سے محروم اور اپنی جماعت سے خارج کر دیتی ہیں، اسی طرح اسلامی جماعت کے کسی رُکن کا نماز باجماعت سے غیر حاضر رہنا اُس زمانے اس بات کی صریح دلیل سمجھا جاتا تھا کہ اسے اسلام سے کوئی دل چسپی نہیں ہے، اور اگر وہ مسلسل چند مرتبہ غیر حاضر رہتا تو سمجھ لیا جاتا کہ وہ مسلمان نہیں ہے، اس بنا پر منافقین کو بھی اس زمانے میں پانچوں وقت نماز باجماعت کے لیے مسجد میں حاضری دینی پڑتی تھی، کیوں کہ اس کے بغیر وہ مسلمانوں کی جماعت میں شمار ہی نہیں کیے جاسکتے تھے، البتہ اس میں جو چیز منافقین کو مؤمنین سے ممتاز کرتی وہ یہ تھی کہ مؤمنین تو نشاطِ قلبی، دل چسپی اور پورے خشوع کے ساتھ نماز پڑھتے تھے، جب کہ منافقین کاہلی، سستی اور بے دلی کے ساتھ نماز پڑھتے تھے، واقعی یہ نفاق کی بڑی نشانی ہے، اب جو لوگ علانیہ نماز ہی نہیں پڑھتے انہیں بہت ڈرنا چاہیے کہ کہیں ان کا شمار اللہ تعالیٰ کے یہاں منافقین اور کفار میں نہ ہو جائے۔ العیاذ باللہ العظیم۔

منافقین کی چوبیسویں علامت ریا کاری:

منافقین کی چوبیسویں علامت ریاکاری ہے، مؤمن مخلص ہوتا ہے، اس لیے حتی الامکان اپنے عمل میں اخلاص کی کوشش کرتا ہے اور کرنی ہی چاہیے، جب کہ منافق ریاکار رہتا ہے، اس لیے کہ اس کی نیکی، نماز اور عبادات محض ریاکاری اور دِکھلاوے کے لیے ہوتی ہیں، قرآنِ کریم میں فرمایا گیا:

﴿ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَ لَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝﴾ (النساء : ۱۴۲)

نماز بھی دکھلاوے کے لیے پڑھتے ہیں، تاکہ لوگوں کو فریب اور دھوکہ دے سکیں کہ ہم مسلمان اور بڑے دین دار ہیں، لوگوں کے سامنے تو اپنی نماز اور عبادت میں بڑے خشوع و خضوع کا مظاہرہ کرتے ہیں؛ مگر تنہائی میں ٹھونگیں مارتے ہیں۔ العیاذ باللہ العظیم۔

حدیث پاک میں ایسے ریاکار لوگوں کے لیے بڑی سخت وعید آئی ہے:

"عَنْ جُنْدُبٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللّٰهُ بِهٖ، وَ مَنْ يُرَائِيْ يُرَائِيْ اللّٰهُ بِهٖ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٤٥٤، باب الرياء و السمعة)

"جو شخص لوگوں کو سنانے، دکھانے اور شہرت حاصل کرنے کے لیے کوئی عمل کرتا ہے تو قیامت کے دن حق تعالیٰ لوگوں کے سامنے اس کے پوشیدہ عیوب ظاہر فرما دے گا اور اس کو رُسوا کرے گا۔ اور جو شخص لوگوں کو دکھانے کے لیے کوئی عمل کرتا ہے تو اللہ پاک اس کو تمام لوگوں کے سامنے لاکر دکھادے گا کہ اس نے یہ عمل فلاں کے لیے کیا تھا، لہٰذا اب میرے پاس اس کا کوئی اجر نہیں۔"

عمل میں اخلاص اگرچہ مشکل تو ہے؛ لیکن بندۂ مؤمن اللہ پاک سے مانگتا رہے اور کوشش کرتا رہے تو پھر اللہ تعالیٰ آسان فرمادیتے ہیں۔

منافقین کی پچیسویں علامت ذکرِ الٰہی میں کمی:

منافقین کی پچیسوں علامت ذکرِ الٰہی میں کمی و کوتاہی ہے، فرمایا:

﴿ وَ لَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا٥﴾ (النساء : ١٤٢)

"وہ اللہ پاک کا ذکر بہت ہی کم کرتے ہیں۔"

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ وہ نماز ہمیشہ نہایت ہی مختصر پڑھتے ہیں، جس کی وجہ سے انہیں نماز کا اصل مقصد یعنی ذکرِ الٰہی حاصل نہیں ہوتا۔

﴿ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ﴾ (طٰهٰ : ١٤)

یہ مقصد منافقین کو حاصل نہیں ہوتا، گویا منافق کی نماز کا حال یہ ہے کہ تاخیر سے پڑھنا، سستی اور کاہلی کے ساتھ پڑھنا اور نہایت مختصر پڑھنا۔ حدیث پاک میں ہے:

"عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "تِلْكَ صَلٰوةُ الْمُنَافِقِ، يَجْلِسُ يَرْقُبُ الشَّمْسَ، حَتّٰى اِذَا اصْفَرَّتْ، وَ كَانَتْ بَيْنَ قَرْنَيِ الشَّيْطَانِ قَامَ، فَنَقَرَ اَرْبَعًا، لَا يَذْكُرُ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا." (رواه مسلم، مشكوٰة : ٦٠، باب تعجيل الصلوٰة)

"منافق کی نماز یہ ہے کہ بیٹھا ہوا سورج کا انتظار کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ سورج پیلا پڑ جاتا ہے اور شیطان کے دو سینگوں کے درمیان (یعنی چھپنے کے قریب) ہو جاتا ہے تو جلدی سے اُٹھ کر چار ٹھونگیں مار لیتا ہے اور اس میں اللہ پاک کا ذکر بھی قلیل ہی کرتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ جو نماز بوجھ سمجھ کر تاخیر اور سستی کے ساتھ نہایت مختصر پڑھی جائے گی تو پھر وہ خشوع و خضوع اور اطمینانِ قلبی سے خالی ہی ہوگی۔ اسی کو فرمایا کہ

﴿ وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ٥﴾ (البقرة : ٤٥)

یعنی نماز کو اس کے مستحب وقت پر نہایت مستعدی اور اطمینانِ قلبی کے ساتھ ادا کرنا خاشعین (اللہ پاک سے ڈرنے والوں اور مؤمنین کاملین) کے لیے تو آسان ہے، منافقین کے لیے نہیں۔

دوسرا مطلب ﴿وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ کا یہ ہے کہ واقعی منافقین نماز کے علاوہ بھی ذکرِ الٰہی میں بہت کمی اور کوتاہی کرتے ہیں، کیوں کہ دل میں جس کی محبت ہوتی ہے زبان پر اس کا ذکر بہ کثرت ہوتا ہے، مؤمنین کے دل محبتِ الٰہی سے لبریز ہوتے ہیں، اس لیے ان کی زبانیں بحمد اللہ ذکرِ الٰہی سے تر رہتی ہیں، مؤمنین کی جو دس صفات قرآنِ کریم نے بیان فرمائی ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ

﴿ وَ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ﴾ (الأحزاب : ٣٥)

یعنی وہ اللہ پاک کو بہت کثرت سے یاد کرتے ہیں۔ جب کہ منافقین کے قلوب

حبِ الٰہی سے خالی ہوتے ہیں، اس لیے ذکرِ الٰہی سے انہیں کوئی خاص دل چسپی نہیں ہوتی۔

منافقین کی چھبیسویں علامت

برائی کا حکم کرنا اور بھلائی سے روکنا:

منافقین کی چھبیسویں علامت برائی کا حکم کرنا اور بھلائی سے روکنا ہے، معاشرے کی اصلاح کے پیشِ نظر حق تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام کیا جائے اور یہی اہل ایمان کی اصل پہچان ہے، قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ (التوبة : ۷۱)

بھلائیوں کی ترغیب دینا اور برائیوں سے روکنا اہل ایمان کی شان ہے، لیکن منافقین معاشرے کی اصلاح کے نہیں؛ بلکہ فساد کے خواہش مند رہتے ہیں، اس لیے حکمِ الٰہی کے برعکس وہ لوگ امر بالمنکر اور نہی عن المعروف کی پالیسی پر عمل کرتے ہیں، قرآنِ کریم نے اس علامت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ ﴾ (التوبة : ۶۷)

’’منافقین خواہ مرد ہوں یا خواتین، سبھی کا مزاج اور مشن یکساں ہے، انہیں برائیوں سے بہت لگاؤ ہے اور نیکیوں سے کوئی دل چسپی نہیں، وہ یہی چاہتے ہیں کہ دعوتِ دین کا کام ٹھپ ہو جائے، خیر کی قوت کمزور ہو جائے، دینی علم اور مدارس ناپید ہو جائیں، پردہ ختم ہو جائے، منشیات کی منڈیاں عام ہو جائیں، لوگوں میں سے جذبۂ جہاد ختم ہو جائے، جس کے لیے کبھی اظہارِ ہمدردی کے ساتھ نیکیوں سے روکتے ہیں، مثلاً راہِ حق میں کوئی خرچ کرنا چاہتا ہے تو کہیں گے کہ دیکھو! اپنے خون پسینے کی کمائی کو اِدھر اُدھر ضائع مت کرو؛ بلکہ اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے اسے سنبھال کر رکھو، یہ مولوی ملا تو کہتے رہیں گے، ان کی باتوں میں مت

آؤ، ورنہ نقصان میں رہوگے، شریعت کی پابندی پر شدت پسندی کا لیبل لگا کر لوگوں کو ورغلاتے ہیں، یہ ساری باتیں علاماتِ نفاق میں سے ہیں، ان کی ہر بات دین وشریعت کے برعکس ہوتی ہے، جن چیزوں کے لیے لوگوں کو اُبھارنا چاہیے ان سے لوگوں کو روکتے ہیں اور جن چیزوں سے روکنا چاہیے ان کے لیے لوگوں کو ورغلاتے ہیں۔

منافقین کی ستائیسویں علامت کنجوسی:

منافقین کی ستائیسویں علامت کنجوسی ہے، ان کی دولت یا تو تجوریوں کے لیے ہوتی ہے یا پھر حرام کاموں کے لیے، وہ بخیل اور کنجوس ہی رہتے ہیں، چاہے اپنے وقت کے قارون ہی کیوں نہ ہوں؛ مگر نیکی اور بھلائی کی راہوں میں اخلاص کے ساتھ خرچ کرنے کے لیے ان سے زیادہ مفلس کوئی نہیں ہوتا، ان کی یہ نشانی قرآنِ کریم نے بیان فرمائی:

﴿ وَ يَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ﴾ (التوبة : ۶۷)

’’اور وہ اپنی مٹھی بند رکھتے ہیں۔‘‘

مطلب یہ ہے کہ جہاں خرچ کرنا چاہیے وہاں خرچ کرنے سے بخل کرتے ہیں، کنجوسی سے کام لیتے ہیں، اور اگر خرچ کرنے کی نوبت آجائے تو ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ

﴿ وَ لَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَ هُمْ كٰرِهُوْنَ۝ ﴾ (التوبة : ۵۴)

’’وہ نہایت ناگواری کے ساتھ خرچ کرتے ہیں۔‘‘

وہ مؤمن کی طرح خلوص اور خوش دلی سے خرچ نہیں کرتے؛ اس لیے حقیقت یہ ہے کہ مؤمن سخی ہوتا ہے، خواہ وہ غریب ہی کیوں نہ ہو، اور منافق بخیل اور کنجوس ہوتا ہے، خواہ وہ امیر ورئیس ہی کیوں نہ ہو۔ حدیث میں ہے:

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ’’ خَصْلَتَانِ لَا تَجْتَمِعَانِ فِیْ مُؤْمِنٍ، اَلْبُخْلُ وَ سُوْءُ الْخُلُقِ‘‘. (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ : ۱۶۵، باب النفاق و کراھیة الإمساک)

''دو خصلتیں کسی کامل مؤمن میں جمع نہیں ہوسکتیں: (۱) بخیلی (۲) بداخلاقی۔''

اگر ضعف ایمانی کے سبب کسی مؤمن میں یہ برائی ہے تو یہ نفاق کی نشانی ہے، اس کی اصلاح کر لینی چاہیے، ورنہ کہیں نفاقِ عملی کی یہ عادت اس کی طبیعت نہ بن جائے۔

منافقین کی اٹھائیسویں علامت اللہ تعالیٰ سے غفلت:

منافقین کی اٹھائیسویں علامت اللہ پاک سے غفلت ہے، اللہ پاک کو بھلا دینا اور اس سے غافل ہوجانا، وہ رب کے علاوہ سب سے چوکنا رہتے ہیں، رب کے علاوہ سب کو یاد رکھتے ہیں، قرآنِ پاک میں ان کے متعلق فرمایا گیا: ﴿ نَسُوا اللّٰهَ (التوبة : ٦٧) ''وہ اللہ پاک کو بھول گئے۔'' اللہ پاک سے غافل ہوگئے، اس لیے انہیں سب کا خیال ہے؛ مگر رب کا خیال نہیں، ایسا کیوں ہوا؟ تو دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ وَ مَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ٥﴾ (الزخرف: ٣٦)

''جب بندہ اپنے مولیٰ اور اس کے ذکر سے غافل ہوجاتا ہے تو اس پر شیطان مسلط ہوجاتا ہے۔'' منافقین کے ساتھ یہی معاملہ ہوتا ہے۔ اسی کو ایک اور جگہ بیان فرمایا:

﴿ اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَأَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ﴾ (المجادلة : ١٩)

''شیطان نے انہیں گھیر لیا، ان پر قابو اور غلبہ حاصل کر لیا اور انہیں اللہ کا ذکر بھلا دیا۔''

مؤمنین اور منافقین میں فرق یہ ہے کہ شیطان اہل ایمان کو وسوسوں میں مبتلا تو کر سکتا ہے؛ لیکن ان پر مکمل غلبہ حاصل نہیں کر سکتا، شیطان کو غلبہ منافقین پر ہی حاصل ہوتا ہے، جس کے سبب وہ اللہ پاک سے غافل ہوجاتے ہیں۔ اور اللہ پاک سے اور اس کے احکام سے غفلت ہلاکت کا سبب ہے۔ (العیاذ باللہ العظیم)۔

منافقین کی اُنتیسویں علامت فاسق ہونا:

منافقین کی اُنتیسویں علامت فاسق ہونا ہے، یعنی علانیہ کبائر کا مرتکب ہونا ہے،

کبائر کا ارتکاب مؤمن سے بھی ہوتا ہے، لیکن پوشیدہ طور پر، جس پر وہ نادم وشرمندہ بھی ہوتا ہے، جب کہ منافق فاسق ہوتا ہے، اس لیے علانیہ گناہوں کے ارتکاب کے باوجود وہ اس پر نادم اور شرمندہ نہیں ہوتا، قرآنِ کریم نے منافق کو فاسق کہا ہے:

﴿ إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ٥﴾ (التوبة : ٦٧)

''بلاشبہ منافق ہی فاسق ہیں۔'' دوسرے ایک مقام پر فرمایا:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ٥﴾ (المنافقون : ٦)

''اللہ پاک فاسقین (منافقین) کو ہدایت نہیں دیتا۔''

آج جو لوگ مسلمان ہونے کے باوجود علانیہ کبائر کا ارتکاب کرتے ہیں بلاشبہ وہ نفاقِ عملی میں مبتلا ہیں، اگر نفاق کی یہ علامت ان کی عادت ہے تو یہ ان کے لیے ہلاکت کا سبب ہے۔

منافقین کی تیسویں علامت
شرعی عدالت کے بجائے طاغوتی عدالت سے فیصلہ کرانا:

منافقین کی تیسویں علامت یہ ہے کہ وہ شرعی عدالت کے بجائے طاغوتی عدالت سے اپنے معاملات میں فیصلہ کراتے ہیں، حق تعالیٰ نے معاشرے کے پرامن رکھنے اور زندگی کو پرامن طریقے سے گزارنے کے لیے شریعت کی شکل میں اپنا قانونِ رحمت عطا فرمایا ہے اور بندوں کو اس کا پابند کیا ہے، چنانچہ اہل ایمان اپنے امور و معاملات میں قانونِ شریعت کے پابند ہوتے ہیں، جیسے قرآنِ کریم نے اس طرح بیان فرمایا:

﴿ إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذَا دُعُوْا إِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ أَطَعْنَا﴾ (النور : ٥١)

اہل ایمان کی شان یہ ہے کہ جب کبھی انہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (ان کے قانونِ شریعت) کی طرف بلایا جاتا ہے تو وہ ہر فیصلے پر سرِ تسلیم خم کر کے اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں، اس کے برخلاف منافقین کی پہچان یہ ہے کہ

﴿ يُرِيْدُوْنَ أَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا إِلَى الطَّاغُوْتِ﴾ (النساء : ٦٠)

وہ اپنے امور و معاملات میں فیصلہ کرانے کے لیے غیر اللہ یعنی طاغوتی قوانین اور ان کی عدالتوں کا سہارا لیتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ کے بقول یہ آیت کریمہ ایک یہودی اور بشر نامی ایک منافق کے بارے میں نازل ہوئی، جن کے مابین جھگڑا ہوا، تو یہودی یہ چاہتا تھا کہ حضور ﷺ فیصلہ فرمائیں، کیوں کہ اسے یقین تھا کہ آپ ﷺ قانونِ شریعت کے مطابق مکمل انصاف کے ساتھ فیصلہ فرمائیں گے۔ اور ایسا ہی ہوا؛ مگر منافق کو یہ منظور نہ تھا، وہ اپنا مقدمہ کعب بن اشرف کے پاس لے جانا چاہتا تھا، بالآخر نبی کریم ﷺ کے یہودی کے حق میں فیصلہ فرمانے کے بعد وہ منافق اپنا مقدمہ لے کر حضرت عمرؓ کی خدمت میں گیا اور تفصیلات سنا دیں، حضرت عمرؓ نے حضور ﷺ کا فیصلہ نہ ماننے کی وجہ سے اس منافق کی گردن قلم کر دی اور فرمایا: حضور ﷺ کے فیصلے کو نہ ماننے والے کی یہی سزا ہمارے یہاں ہے۔ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (قرطبی، روح المعانی، انوار البیان)

اِس وقت جو لوگ شرعی عدالت کو چھوڑ کر طاغوتی حکومت و عدالت سے فیصلہ کراتے ہیں انہیں سوچ لینا چاہیے کہ وہ کن لوگوں کے زمرے میں آتے ہیں؟ مؤمنین کے یا منافقین کے، قرآنِ کریم نے جس طرح منافق کو فاسق فرمایا اسی طرح اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے قانون (شریعت) کو نہ ماننے والے کو بھی فاسق فرمایا ہے:

﴿ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝﴾ (المائدة : ٤٧)

یاد رکھو! قانونِ شریعت کے بالمقابل طاغوتی عدالت کا قانون بالعموم مکڑی کا وہ جالا ہوتا ہے جس میں کیڑے مکوڑے تو پھنس جاتے ہیں؛ مگر بڑے جانور اسے بآسانی پھاڑ کر نکل جاتے ہیں، اس لیے شرعی عدالتوں میں اپنے نجی معاملات کو لے کر جائیں اور قانونِ شریعت و رحمت کے مطابق عدل و اعتدال والے فیصلے کرائیں، یہی مؤمنین مخلصین کی صفات ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم تمام کو ہمیشہ کے لیے مؤمنین کاملین میں شامل فرمالیں۔ آمین۔

۲۵/ رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ

مطابق: ۱۹/ مئی/ ۲۰۲۰ء

بروز: منگل، بزمِ صدیقی، بڑودا

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيْرًا　　فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيْرًا كَثِيْرًا

(۳۹)

مؤمنین کی صفات
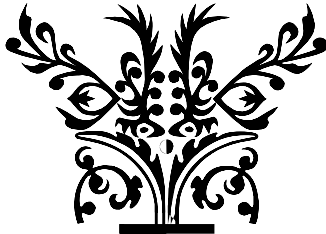
بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ عُمَرَ بۡنِ الۡخَطَّابِ رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم إِذَا أُنۡزِلَ عَلَيۡهِ الۡوَحۡيُ سُمِعَ عِنۡدَ وَجۡهِهٖ دَوِيٌّ كَدَوِيِّ النَّحۡلِ، فَأُنۡزِلَ عَلَيۡهِ يَوۡمًا، فَمَكَثۡنَا سَاعَةً، فَسُرِّيَ عَنۡهُ، فَاسۡتَقۡبَلَ الۡقِبۡلَةَ، وَ رَفَعَ يَدَيۡهِ، وَقَالَ: "اَللّٰهُمَّ زِدۡنَا وَ لَا تَنۡقُصۡنَا، وَ أَكۡرِمۡنَا وَ لَا تُهِنَّا، وَ أَعۡطِنَا وَ لَا تَحۡرِمۡنَا، وَ اٰثِرۡنَا وَ لَا تُؤۡثِرۡ عَلَيۡنَا، وَ أَرۡضِنَا وَ ارۡضَ عَنَّا، ثُمَّ قَالَ: أُنۡزِلَ عَلَيَّ عَشۡرُ اٰيَاتٍ، مَنۡ أَقَامَهُنَّ دَخَلَ الۡجَنَّةَ، ثُمَّ قَرَأَ: قَدۡ أَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ، حَتّٰى خَتَمَ عَشۡرَ اٰيَاتٍ". (رواه أحمد و الترمذي، مشكوٰة: ۲۱۹، باب جامع الدعاء)

’’حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور کے پاس ایسی میٹھی بھینی اور ہلکی سی آواز سنائی دیتی جیسے شہد کی مکھیوں کے اُڑنے کی بھنبھناہٹ ہوتی ہے، ایک مرتبہ یہی کیفیت طاری ہوئی تو ہم کچھ دیر ٹھہرے رہے، جب وحی نازل ہو چکی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر اس طرح دعا مانگی کہ اے اللہ! (ہمیں نعمتوں یا مسلمانوں کی تعداد میں) زیادتی عطا فرما، کمی نہ فرما اور ہمیں (دنیا میں حاجت روائی کے ساتھ اور عقبیٰ میں درجات کی بلندی کے ساتھ) عزت

۳۷۱

عطا فرما، ذلیل نہ فرما۔ اور ہمیں (فلاحِ دارین) عطا فرما، محروم نہ فرما۔ اور ہمیں (اپنی رحمت و عنایت کے ذریعہ) دوسروں پر ترجیح عطا فرما اور ہم پر دوسروں کو (غیروں کو اپنے لطف و کرم کے ذریعہ) ترجیح عطا مت فرما۔ (یا ہمیں اپنے دشمنوں پر غلبہ عطا فرما، دشمنوں کو ہم پر غالب مت فرما) اور (ہمیں اپنی قضا و قدر پر شکر و صبر کی توفیق عطا فرما کر) ہم کو راضی کر لے اور (تو خود اپنے فضل و کرم سے ہماری تھوڑی سی عبادت و اطاعت پر بھی) ہم سے راضی ہو جا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ پر دس ایسی آیات نازل ہوئیں کہ جو بھی ان پر استقامت (و اخلاص) کے ساتھ عمل کر لے گا وہ جنت میں داخل ہو جائے گا، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ مؤمنون کی ابتدائی دس آیتیں تلاوت فرمائیں (جن میں حق تعالیٰ نے جنت الفردوس کے وارثین مؤمنین صادقین کی سات صفات بیان فرمائی ہیں)۔

فلاحِ دارین سے مراد کیا ہے اور اس کا حصول کیسے ہو؟

اللہ رب العزت نے ہر انسان میں فطری طور پر فلاح یعنی حصولِ کامیابی کی طلب پیدا فرمائی ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا کا ہر سلیم الفطرت اور صحیح العقل انسان اپنے چھوٹے بڑے مقاصد میں کامیاب اور بامراد ہونا چاہتا ہے اور اس کے لیے حتی المقدور جد و جہد اور کوشش کرتا ہے، یہ اور بات ہے کہ فلاح و کامیابی کا معیار ہر ایک نے اپنی سوچ اور سمجھ کے مطابق متعین کر رکھا ہے، مثلاً ایک مدرسہ یا اسکول کا اسٹوڈنٹ ہے، اس کی سوچ اور سمجھ میں کامیابی کا معیار یہ ہے کہ میں اپنے امتحان و ایکزام میں کامیابی حاصل کر لوں، وہ اسی کو بڑی کامیابی سمجھتا ہے، پھر جب اس کی یہ مراد پوری ہوتی ہے اور وہ اپنے تمام امتحانات اور ایکزامس میں اعلیٰ نمبرات سے کامیابی حاصل کر لیتا ہے تو اب اس کی سوچ و فکر میں کامیابی کا معیار یہ ہوتا ہے کہ اچھی سے اچھی نوکری اور خوب صورت چھوکری مل جائے، تب وہ اسی کو بڑی کامیابی تصور کرتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی چھوٹی بڑی بیماری یا پریشانی میں مبتلا ہے تو وہ اس سے نجات پانے کو بڑی کامیابی خیال کرتا ہے۔

اس کے علاوہ بھی بہت سی تمنائیں اور آرزوئیں ہر انسان کے دل میں ہوتی ہیں جن کی تکمیل کو وہ اپنے خیال میں عظیم کامیابی سمجھتا ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ فلاح و کامیابی کا یہ تصور اور معیار ناقص ہے، کیوں کہ ''فلاح'' کے لغوی معنیٰ ہیں کامیاب ہونا، من کی مراد کا پورا ہونا، ہر طرح کی تکالیف کا ختم ہو جانا۔ اور شرعی معنیٰ ہیں آخرت کی زندگی میں کامیابی حاصل کر لینا۔

لغوی اعتبار سے دیکھا جائے تو دنیا میں مکمل فلاح و کامیابی تو ممکن ہی نہیں، اس کے لیے حق تعالیٰ نے آخرت میں جنت بنائی ہے، کتاب وسنت میں جن اعمالِ صالحہ پر کامیابی کی خوش خبری بیان کی گئی ہے اس سے مراد اُخروی فلاح ہے، کیوں کہ تمام حاجتیں اور چاہتیں آخرت اور جنت ہی میں پوری ہوں گی، رہی بات دنیا کی تو دنیا ضرورت پوری کرنے کی جگہ ہے، چاہت نہیں، اس لیے دنیا میں ضرورتیں تو فقیروں کی بھی پوری ہو جاتی ہیں؛ لیکن چاہتیں بادشاہوں کی بھی پوری نہیں ہوتیں۔

البتہ شرعی اعتبار سے ہر انسان ایمان اور ایمانی صفات سے متصف ہو کر اُخروی فلاح و کامیابی بالیقین حاصل کر سکتا ہے۔ عاجز کا خیالِ ناقص تو یہ ہے کہ دنیا میں رہ کر اللہ پاک کو ایمان اور ایمانی صفات سے متصف ہو کر راضی کر لینا بھی فلاحِ دارین یعنی دُنیا و آخرت کی کامیابی کا ذریعہ ہے، کیوں کہ ''جس کا رب، اس کا سب'' اور جس سے رب راضی اس سے بالآخر سبھی راضی۔ اللّٰهم اجعلنا منهم.

حق تعالیٰ نے اپنے وفادار، تابعدار اور ایمان والے بندوں کو فلاحِ دارین سے نوازنے کے لیے سات بنیادی صفات سے متصف ہونے کا حکم فرمایا ہے، جن مؤمنین صادقین نے ان سات صفات سے خود کو متصف کر لیا قرآنِ کریم میں حق تعالیٰ نے ان کی فلاح و کامیابی کا اعلان فرما دیا:

﴿ قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝﴾ (المؤمنون : ۱)

''یقیناً (ان) مؤمنین نے کامیابی حاصل کر لی (جن میں بنیادی طور پر سات

صفات ہیں)۔''

عجیب بات تو یہ ہے کہ یہاں ''فلاح'' سے مراد اُخروی فلاح ہے، جس کا تعلق مستقبل سے ہے، لیکن قطعیت کے اظہار کے لیے اسے ماضی سے تعبیر فرمایا۔ وجہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان مؤمنین کے لیے یہ فیصلہ فرما لیا کہ ان سات صفات کے حاملین مؤمنین صادقین جنت الفردوس کے وارثین ہوں گے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا لازمی اور یقینی طور پر ہوگا، جس طرح ماضی میں کسی چیز کا واقع ہونا یقینی ہوتا ہے، حق تعالیٰ کا یہ فیصلہ اس سے بھی زیادہ یقینی ہے، اس لیے ان سات صفات کے حاملین مؤمنین صادقین کی فلاح و کامیابی کو ماضی کے صیغے سے تعبیر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾

پہلی صفت نماز میں خشوع وخضوع اختیار کرنا:

جنت الفردوس کے وارثین مؤمنین صادقین کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ صرف نماز پڑھتے ہی نہیں؛ بلکہ نماز میں خشوع وخضوع اختیار کرتے ہیں، فرمایا:

﴿ اَلَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝﴾ (المؤمنون : ۲)

''جو حضورِ قلبی یعنی دل سے ہمہ تن اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر اور ظاہری اعتبار سے مکمل سکون و اطمینان کی کیفیت کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں، جیسا کہ حضور ﷺ، حضراتِ صحابہؓ اور صلحاء کی نماز ہوا کرتی تھی، خشوع وخضوع کی یہی حقیقت ہے، اسی سے نماز میں جان پیدا ہوتی ہے، جو نماز خشوع وخضوع سے خالی ہو وہ بے جان ہوتی ہے، ایسی نماز سے رضاءِ الٰہی اور فلاحِ اُخروی کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟ بقولِ شاعر

زباں در ذکر و دل در فکر خانہ — چہ حاصل زیں نمازِ پنج گانہ

صاحبو! نماز تو دربارِ الٰہی کی مقدس حاضری کا نام ہے، اس لیے لازم ہے کہ خشوع یعنی قلب سے پوری طرح اللہ پاک کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا کی جائے، واقعہ یہ ہے کہ جب بندہ حضورِ قلبی یعنی ہمہ تن متوجہ ہو کر دل کی حاضری کے ساتھ نماز ادا کرتا ہے تو اس کا اثر

ظاہری اعضاء پر بھی پڑتا ہے، وہ اس طرح کہ حضورِ قلبی کے ساتھ پڑھی جانے والی نماز میں بندہ غیر ضروری خیالات کے علاوہ غیر ضروری حرکات سے بھی حتی الامکان محفوظ رہتا ہے۔ اس کا نقد صلہ یہ ملتا ہے کہ جب بندہ اس کیفیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا کرتا ہے تو خود حق تعالیٰ بھی اس کی طرف توجہ مبذول فرماتے ہیں، حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِيْ ذَرٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَا يَزَالُ اللّٰهُ تَعَالٰى مُقْبِلًا عَلَى الْعَبْدِ، وَ هُوَ فِيْ صَلٰوتِهٖ، مَا لَمْ يَلْتَفِتْ، فَإِذَا الْتَفَتَ انْصَرَفَ عَنْهُ". (رواه أحمد و أبوداود و النسائي و الدارمي، مشكوٰة: ۹۱، باب ما لا يجوز من العمل في الصلوٰة)

جب بندہ نماز میں (ہمہ تن اللہ تعالیٰ کی طرف) ہوتا ہے تو حق تعالیٰ بھی اس (نمازی) کی طرف برابر متوجہ رہتا ہے؛ لیکن جب بندہ از خود اپنی توجہ ہٹالیتا ہے تو حق تعالیٰ بھی اس کی طرف سے اپنی توجہ (اپنی رحمت یا اپنا روئے مبارک کما یلیق بشانہ) پھیر لیتے ہیں، ایسی نماز قبولیت کے قابل نہیں رہ جاتی۔ (العیاذ باللہ)۔

نماز میں خشوع وخضوع پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ نماز سے پہلے ہی دل میں نماز کا انتظار رہے، پھر وقت ہوتے ہی پوری تیاری اور دل چسپی کے ساتھ تمام باطنی اور ظاہری آداب کی رعایت کے ساتھ نماز کا اہتمام کرے۔ باطنی آداب کا مطلب یہ ہے کہ دل کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رکھے، از خود خیالات و وساوس دل میں نہ لائے، بلا ارادہ آجائیں تو فوراً اپنی توجہ نماز کی طرف کرلے، اس کے لیے جو کچھ زبان سے پڑھا جارہا ہے اس کے معانی میں غور کرے، اس سے ان شاء اللہ نماز میں حضورِ قلبی کی کیفیت پیدا ہوگی۔

ظاہری آداب کا مطلب یہ ہے کہ نماز سکون سے پڑھے، جلدی جلدی نہ پڑھے، اِدھر اُدھر توجہ نہ کرے، سر اُٹھا کر اوپر کی طرف نہ دیکھے، خواہ مخواہ نماز میں نہ ہلے، اسی طرح کپڑوں کو بار بار سمیٹنے، ان کو جھاڑنے یا ڈاڑھی وغیرہ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ سے سے بھی احتیاط کرے، نیز حالت قیام میں سجدہ کی جگہ، حالت رکوع میں پاؤں کے ظاہری حصے پر، حالت سجدہ میں ناک کے سرے پر، قعدہ میں گود پر اور سلام پھیرتے وقت کندھوں پر نظر رکھے۔ (شامی)

اس سے بڑی حد تک نماز میں خشوع وخضوع کی کیفیت حاصل ہوگی۔ ہمارے شیخ الزمان مولانا محمد قمر الزمان صاحب مدظلہ کے بہ قول کم از کم اس کوشش کا ثواب تو ضرور ملے گا۔

ایک نصیحت آموز واقعہ:

ہم اگر کوشش بھی کریں گے تو ان شاء اللہ ہمیں محروم نہیں کیا جائے گا، ہمارے بزرگوں نے تو صرف کوشش ہی نہیں کی؛ بلکہ اخلاص واستقامت کے ساتھ عمل بھی کیا، چنانچہ منقول ہے کہ ایک دفعہ حضرت عاصم بن یوسفؒ نے حضرت حاتم بن زیدؒ سے پوچھا کہ حضرت! آپ نماز کس طرح ادا کرتے ہیں؟ تو فرمایا: (انتظارِ نماز کے بعد) جب نماز کا وقت ہوتا ہے تو میں (سنت کی رعایت کے ساتھ ظاہر کا) وضو (پانی سے اور باطن کا وضو توبہ سے) کرتا ہوں، پھر جائے نماز پر نہایت اطمینان سے کھڑا ہوتا ہوں، اس یقین کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ میری طرف متوجہ ہیں اور گویا کعبۃ اللہ میرے سامنے ہے، جنت میری دائیں جانب اور جہنم میری بائیں جانب ہے اور قدم پل صراط پر ہے، ملک الموت میرے پیچھے ہیں اور یہ میری زندگی کی آخری نماز ہے، پھر مکمل باطنی وظاہری آداب کی رعایت کے ساتھ پُرسکون ہو کر نماز کے ہر عمل ورُکن کو اچھی طرح ادا کرتا ہوں، نماز کے بعد حق تعالیٰ کے حضور اُمید و خوف کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ دعا کرتا ہوں۔ الحمد للہ۔ دریافت کیا: حضرت! کتنے عرصے سے اس طرح نماز پڑھتے ہیں؟ فرمایا: تیس سال سے، عاصم بن یوسفؒ سن کر رونے لگے اور کہا: ہائے افسوس! ہمیں تو کبھی ایسی نماز میسر نہ ہوئی۔ (مستفاد از: روح المعانی: ۱/۳۳)

اللہ تعالیٰ نے ان ہی کی شان میں فرمایا ہے:

﴿الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خٰشِعُوْنَ﴾

دوسری صفت لغویات سے اجتناب:

جنت الفردوس کے وارثین مؤمنین صادقین کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ لغویات

اورفضولیات سے احتیاط کرتے ہیں، فرمایا:

﴿ وَ الَّذِيۡنَ هُمۡ عَنِ اللَّغۡوِ مُعۡرِضُوۡنَ۝﴾ (المؤمنون : ۳)

’’جولغویات سے منہ موڑ لیتے ہیں، ان سے احتیاط واجتناب کرتے ہیں۔‘‘

مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ معاصی اور کبائر کا ارتکاب تو درکنار، ان اموراور مشاغل سے بھی اجتناب کرتے ہیں جو دینی اور اُخروی اعتبار سے بے کار، بے فائدہ اور بے مقصد ہوں، وہ با مقصد زندگی گزارتے ہیں، اس لیے فضولیات میں اپنے وقت کا کوئی لمحہ جان بوجھ کر ضائع نہیں کرنا چاہتے، جیسا کہ حضور ﷺ، حضرات صحابہؓ اور صلحاء کا یہی طریقہ تھا۔ اسے قرآنِ پاک میں رحمٰن کے مخصوص بندوں کی پہچان قرار دیتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَ إِذَا مَرُّوۡا بِاللَّغۡوِ مَرُّوۡا كِرَامًا۝﴾ (الفرقان : ۷۲)

’’اور جب وہ لغو (بیہودہ) کاموں کے پاس سے گزرتے ہیں تو شرافت کے ساتھ گزرجاتے ہیں۔‘‘

مطلب یہ ہے کہ اگران مؤمنین صادقین، جنت الفردوس کے وارثین کا اتفاق سے کسی کھیل تماشے اور لغویات سے گزر ہوتا بھی ہے، یا انہیں اس راستے سے گزرنا پڑتا ہے تو وہ اپنا دامن بچا کر بڑے وقار کے ساتھ گزرجاتے ہیں، جس طرح لوگ گندی جگہ سے بچ کر گزرتے ہیں۔ اور ایک مقام پر فرمایا:

﴿ وَ إِذَا سَمِعُوا اللَّغۡوَ أَعۡرَضُوۡا عَنۡهُ وَ قَالُوۡا لَنَآ أَعۡمَالُنَا وَ لَكُمۡ أَعۡمَالُكُمۡ سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ لَا نَبۡتَغِي الۡجَاهِلِيۡنَ۝﴾ (القصص : ۵۵)

’’اور جب ان کے کان میں بیہودہ بات پڑتی ہے تو وہ اس سے کنارہ کرلیتے ہیں (سنی اَن سنی کر دیتے ہیں) اور کہتے ہیں کہ ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے، تم پرسلام ہو، ہم جاہلوں سے اُلجھنا نہیں چاہتے۔‘‘

کسی مسلمان کے کمالِ ایمان کی یہ بنیادی پہچان ہے، جس کو حدیث پاک میں اس

طرح بیان فرمایا گیا:

’’عَنۡ عَلِيِّ بۡنِ الۡحُسَيۡنِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: ’’مِنۡ حُسۡنِ إِسۡلَامِ الۡمَرۡءِ تَرۡكُهٗ مَا لَا يَعۡنِيۡهِ‘‘. (رواه مالك و أحمد و ابن ماجه، مشكوٰة : ۴۱۳)

ہم بھی کوشش کرکے اس پر عمل کرسکتے ہیں، جیسے ہمارے بزرگوں نے کیا ہے۔

ایک نصیحت آموز واقعہ:

مشہور ہے کہ حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ ایک مرتبہ وعظ فرمارہے تھے، اسی دوران ایک بدکردار شخص کھڑا ہوکر کہنے لگا کہ مولوی صاحب! ہم نے سنا ہے کہ تم حرامی ہو، آپؒ نے نہایت متانت سے جواب دیا کہ ’’میاں! تم نے غلط سنا، میرے والدین کے نکاح کے گواہ بڑھانہ، پھلت اور دہلی میں ہنوز موجود ہیں۔‘‘ یہ فرما کر پھر وعظ شروع کردیا۔ (حکایاتِ اولیاء: ۶۹)

واقعی یہ لوگ اس آیت کریمہ کے مصداق تھے۔ اَللّٰھم اجعلنا منھم. آمین.

لغویات سے حفاظت کا آسان طریقہ یہ ہے کہ بندہ اپنے کام میں یک سو رہے اور بلاضرورت لوگوں سے اختلاط نہ رکھے، اسی لیے کسی کہنے والے نے کیا خوب کہا ہے:

لِقَاءُ النَّاسِ لَيۡسَ يُفِيۡدُ شَيۡئًا ۔۔۔ سِوَى الۡهَذَيَانِ مِنۡ قِيۡلٍ وَّ قَالٖ

فَأَقۡلِلۡ مِنۡ لِقَاءِ النَّاسِ إِلَّا ۔۔۔ لِأَخۡذِ الۡعِلۡمِ أَوۡ إِصۡلَاحِ حَالٖ

ترجمہ: لوگوں کی ملاقات کچھ فائدہ نہیں دیتی بہ جز قیل وقال اور بکواس کے، اس لیے لوگوں کی ملاقات کم کر، بہ جز اِس کے کہ علم حاصل کرنے کے واسطے استاذ سے یا اصلاحِ نفس کے واسطے کسی شیخ سے ملاقات ہو۔ (حکایاتِ صحابہ: ۱۳۶)

تیسری صفت زکوٰۃ اور تزکیہ کا اہتمام:

جنت الفردوس کے وارثین مؤمنین صادقین کی تیسری صفت زکوٰۃ اور تزکیہ کا اہتمام ہے۔ فرمایا:

﴿ وَ الَّذِیۡنَ هُمۡ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوۡنَ۝﴾ (المؤمنون : ٤)

''جو زکوٰۃ (اور تزکیہ) کا اہتمام کرنے والے ہیں۔''

لفظ ''زکوٰۃ'' کے لغوی معنیٰ تو پاک وصاف کرنا ہے۔ جب کہ شرعی معنیٰ وہ ڈھائی فی صد مال ہے جو صاحب نصاب اللہ تعالیٰ کے حکم پر اللہ تعالیٰ کی رضا مندی اور خوشنودی کے لیے اس کے وفادار بندوں میں سے مستحقین پر خرچ کرتا ہے۔

اسے ''زکوٰۃ'' اس لیے کہتے ہیں کہ زکوٰۃ کی ادائیگی مال و دل کی پاکیزگی کا ذریعہ ہے، اس سے جہاں بقیہ مال میلا اور ضائع ہونے سے محفوظ اور پاک ہو جاتا ہے وہاں اس سے دل بھی مال کی بے جا محبت اور بخل کے جذبے سے پاک ہو جاتا ہے۔

اس لغوی اور شرعی معنیٰ کے اعتبار سے آیت کریمہ کے دو مطلب بیان کیے گئے ہیں:

(۱) پہلا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اگر صاحب حیثیت اور صاحب نصاب ہیں تو فریضۂ زکوٰۃ کی مکمل ادائیگی کا اہتمام کرتے ہیں، کیوں کہ جس طرح نماز دین کا اہم عمل اور رُکن ہے، اسی طرح زکوٰۃ بھی دین کا اہم عمل اور رُکن ہے، قرآنِ کریم نے جا بہ جا نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا حکم فرمایا ہے، نماز بندے کو خالق سے جوڑتی ہے تو زکوٰۃ بندے کو خالق کے علاوہ بندے سے بھی جوڑتی ہے، اب جو بندہ خالق اور اس کی مخلوق سے صحیح بنیاد پر مربوط ہو جائے درحقیقت وہی فلاحِ دارین کا حق دار ہے۔

(۲) آیت کریمہ کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ ان اعمال کا اہتمام کرتے ہیں جو نفس اور اخلاق کی پاکیزگی کا ذریعہ ہیں، کیوں کہ جس طرح صاحب نصاب شخص کے لیے زکوٰۃ مال کی پاکیزگی کا ذریعہ اور فرض ہے، اسی طرح ہر مسلمان پر نفس اور روح کا تزکیہ بھی فرض ہے، نفس اور روح کو رذائل اور باطن کی گندگی جیسے شرک، نفاق، بغض، عداوت، حسد، کینہ، حب جاہ، حب مال وغیرہ سے پاک رکھنا فرض ہے، اس کے لیے اہل اللہ کی صحبت اور ذکر اللہ کی کثرت نہایت اہم ہے۔ زکوٰۃ اموال کی پاکیزگی کا سبب ہے تو تزکیہ اعمال کی

پاکیزگی کا ذریعہ ہے۔ اب جو لوگ اموال اور اعمال کے تزکیہ کا اہتمام کرتے ہیں یقیناً وہ لوگ اس آیت کے مصداق اور فلاحِ دارین کے حق دار ہیں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَكّٰى۝﴾ (الأعلىٰ : ١٤)

چوتھی صفت شرمگاہوں کی حفاظت:

وارثین جنت الفردوس، مؤمنین صادقین کی چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ فرمایا:

﴿ وَ الَّذِیۡنَ هُمۡ لِفُرُوۡجِهِمۡ حٰفِظُوۡنَ۝﴾ (المؤمنون : ٥)

مفسرین نے اس کے دو مطلب بیان فرمائے ہیں: ایک یہ کہ وہ لوگ اپنے جسم کے قابل شرم حصوں کی حفاظت کے لیے ان کو خوب اچھی طرح چھپاتے ہیں، وہ اپنا ستر کسی غیر کے سامنے نہیں کھولتے، کیوں کہ وہ باحیا ہوتے ہیں، بے حیا اور بے شرم نہیں ہوتے، کہ ہر کسی کے سامنے اپنا ستر ظاہر کر دیں اور عریانی کا مظاہرہ کریں۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی عصمت و عفت اور شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے حرام کاری والا طریقہ اختیار نہیں کرتے۔

﴿ اِلَّا عَلٰۤى اَزۡوَاجِهِمۡ اَوۡ مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُهُمۡ فَاِنَّهُمۡ غَيۡرُ مَلُوۡمِيۡنَ۝﴾ (المؤمنون : ٦)

''وہ اپنی جنسی شہوت اپنی منکوحہ یا مملوکہ سے ہی پوری کرتے ہیں، جس میں کوئی ملامت نہیں، شرعاً اس کی اجازت ہے (لیکن اس زمانے میں مملوکہ کنیزوں کا وجود نہیں، نیز گھروں میں کام کرنے والی ملازمہ کوئی باندی نہیں، اس لیے) اب تکمیل شہوت کا حلال راستہ ایک ہی ہے کہ نکاح کے بعد زوجین اپنی جنسی شہوت پوری کریں، یہ بات تقویٰ اور پرہیزگاری، خدا ترسی اور دین داری کے منافی بھی نہیں۔ جیسا کہ راہبانہ تصورات کے تحت عام طور پر سمجھا جاتا ہے، بلکہ حدیث پاک کے مطابق تکمیل شہوت کا جائز طریقہ اختیار کرنا اجر وثواب کا ذریعہ بھی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

"وَ فِیْ بُضْعِ أَحَدِکُمْ صَدَقَةٌ". (رواہ مسلم، مشکوٰۃ: ١٦٨، باب فضل الصدقة)

حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس طرح ناجائز طریقے سے جنسی خواہش پوری کرنا حرام اور گناہ ہے، اسی طرح جائز طریقے سے جنسی ضرورت پوری کرنا حلال اور ثواب کا سبب ہے، اس سے اس تصور کی بھی نفی ہوگئی جو آج مغربی دنیا میں پایا جاتا ہے کہ انسان اپنی جنسی شہوت کی تکمیل میں مکمل آزاد ہے، وہ جب جس سے جس طرح چاہے آپسی رضامندی سے اپنی جنسی ضرورت پوری کرسکتا ہے، ظاہر ہے کہ پھر تو انسان اور جانور میں کوئی فرق نہ رہ جائے گا، اس لیے اسلام نے دیگر شعبوں کی طرح اس سلسلے میں بھی اعتدال کی تعلیم دی، مکمل راہ نمائی فرمائی اور حد بندی کردی کہ زوجین شرعی حدود میں رہتے ہوئے اپنی شہوت پوری کرسکتے ہیں۔ فرمایا:

﴿ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَأُولٰٓئِکَ هُمُ الْعٰدُوْنَ﴾ (المؤمنون: ٧)

شرعی حدود سے ہٹ کر جنسی خواہش کی تکمیل حرام ہے، ایسا کرنے والے حد سے تجاوز کرنے والے، گنہگار اور بدکار ہیں، نیکوکار کی صفت اور علامت یہ ہے کہ

﴿ وَ الَّذِیْنَ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ﴾

''وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔'' وہ تکمیل شہوت کے ناجائز طریقوں سے محفوظ رہتے ہیں، تو یہی لوگ مؤمنین صالحین اور جنت الفردوس کے وارثین ہیں، حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ تم دو چیزوں کی حفاظت کا اہتمام کرلو، میں تمہارے لیے جنت کی ضمانت لیتا ہوں: (١) حرام گوئی اور حرام خوری سے اپنی حفاظت کرلو۔ (٢) حرام کاری سے اپنی حفاظت کرلو۔ تو میں اپنی ذمہ داری سے تمہیں جنت میں داخل کراؤں گا۔

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ يَضْمَنْ لِیْ مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ، وَ مَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ، أَضْمَنْ لَهُ الْجَنَّةَ". (رواہ البخاری، مشکوٰۃ: ٤١١، باب حفظ اللسان من الغيبة والشتم)

صاحبو! واقعہ یہ ہے کہ حرام سے وہی نہیں بچتا جو بچنا ہی نہیں چاہتا، ورنہ اگر کوئی شخص واقعی صدق دل سے حرام کاری سے بچنا چاہتا ہے تو حق تعالیٰ اس کی مدد فرماتے ہیں اور اس کے بچنے کے اسباب پیدا فرما کر اسے حرام سے بچا لیتے ہیں۔

حضرت سلیمان بن یسارؒ کا عجیب واقعہ:

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ حضرت سلیمان بن یسارؒ تابعین میں سے ہیں، بڑے حسین وجمیل تھے، مدینہ منورہ میں رہتے تھے، فقہاءِ مدینہ میں ان کا شمار ہے۔ ایک مرتبہ حج کے موقع پر اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مدینہ منورہ سے حج کے ارادے سے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے، راستے میں مقامِ ابواء پر ٹھہرے، ان کا ساتھی کھانا خریدنے کے لیے بازار گیا، جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے وہاں ایک پہاڑی تھی جس کی چوٹی پر ایک بدو کا مکان تھا، ایک بدوی عورت نے (جو بڑی حسین وجمیل تھی) اِن کو دیکھا تو اِن پر فریفتہ ہوگئی، جب اس نے دیکھا کہ ان کا ساتھی کہیں گیا ہوا ہے اور یہ اکیلے ہیں، تو وہ پہاڑ سے نیچے اُتر کر آئی اور اِن کے سامنے آکر اُس نے اپنا چہرہ کھول دیا، "کَأَنَّهَا قِطْعَةُ قَمَرٍ"، گویا وہ بالکل چاند کا ٹکڑا تھی، وہ کچھ کہنے لگی، یہ تو اس کو دیکھ کر ہی گھبرا گئے تھے، وہ کچھ بولی تو یہ سمجھے کہ کھانا لینے آئی ہے، انہوں نے کھانا تلاش کرکے دینے کی کوشش کی، اس نے کہا: مجھے کھانا نہیں چاہیے، مجھے تو آپ سے وہ چیز چاہیے جو ایک عورت مرد سے چاہتی ہے، انہوں نے کہا: تجھے شیطان نے میرے پاس بھیجا ہے، اُسی وقت اپنا سر اپنے گھٹنوں پر رکھ کر زور زور سے بے تحاشا رونے لگے، جب انہوں نے اس طرح زور زور سے رونا شروع کیا تو وہ عورت بھی گھبرا گئی کہ کہیں رُسوائی نہ ہوجائے، لہٰذا وہ بھاگ گئی، ان کے ساتھی جو کھانا خریدنے بازار گئے تھے جب آئے تو دیکھا کہ ان کا چہرہ پھولا ہوا ہے، آنکھیں سرخ ہیں اور رو رہے ہیں، پوچھا: کیا بات ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ یہ صورتِ حال ہوئی، یہ سن کر ساتھی بھی رونے لگا، انہوں نے پوچھا: بھائی! تو کیوں روتا ہے؟ ساتھی نے کہا: اللہ تعالیٰ کا شکر واحسان ہے کہ میں یہاں

نہیں تھا، ورنہ اس حالت میں میں تو گناہ میں مبتلا ہی ہو جاتا، میں اس بات پر رورہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے میری حفاظت کر لی۔

پھر جب مکہ مکرمہ پہنچے تو طواف سے فارغ ہونے کے بعد حجرِ اسود اور مقامِ ابراہیم کے بیچ میں چادر لپیٹے ہوئے بیٹھے تھے اور چوں کہ تھکے ہوئے تھے اس لیے اسی حالت میں آنکھ لگ گئی، تو حضرت یوسف علیہ السلام کو خواب میں حسین وجمیل نوجوان کی صورت میں دیکھا، سلیمان بن یسارؒ نے پوچھا: آپ کون ہیں؟ انہوں نے کہا: میں یوسف ہوں، پوچھا: کون؟ یوسف صدیق؟ انہوں نے کہا: جی ہاں، سلیمان بن یسارؒ نے کہا: آپ کا معاملہ زلیخا کے ساتھ بڑا عجیب وغریب ہے، اس کے جواب میں حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: ابواء والی عورت کے ساتھ تمہارا معاملہ اس سے زیادہ عجیب ہے۔ (کیوں کہ تم نے ولی ہو کر نبی والا کام کیا)۔

پانچویں صفت امانتوں کی رعایت:

جنت الفردوس کے وارثین مؤمنین صادقین کی پانچویں صفت امانتوں کی رعایت کرنا ہے۔ فرمایا:

﴿ وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ لِاَمٰنٰتِہِمۡ وَ عَہۡدِہِمۡ رٰعُوۡنَ ۝﴾ (المؤمنون : ۸)

’’جو اپنی امانتوں اور وعدوں کی رعایت کرنے والے ہیں۔‘‘

یہاں پہلی بات تو یہ ہے کہ ’’امانت‘‘ کے بجائے ’’امانات‘‘ جمع کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، یہ لفظ جامع ہے مالی اور قولی امانتوں کے علاوہ ان تمام ذمہ داریوں کے لیے جو رب العالمین نے یا کسی ادارے اور فرد نے کسی شخص کو سپرد کی ہیں۔ مالی امانت تو یہی ہے کہ کسی نے اپنا مال حفاظت کی غرض سے ہمارے پاس رکھوایا، تو یہ امانت ہے، جس کی رعایت اور بروقت اس کی ادائیگی ہماری ذمہ داری ہے اور ایمان کی بنیادی نشانی ہے۔ ارشادِ باری ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَہۡلِہَا ﴾ (النساء : ۵۸)

’’اللہ پاک تمہیں امانتوں کی ادائیگی کا حکم دیتا ہے۔‘‘

قولی امانت سے مراد کسی مخصوص مجلس کی باتیں یا کسی کے راز کی باتیں ہیں، بغیر اذنِ شرعی کے راز کی باتیں ظاہر کرنا خیانت ہے۔ حدیث میں ہے کہ مجلسیں امانت کے ساتھ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مخصوص مجلس کی باتیں امانت ہیں، وہ آگے نہ بڑھائی جائیں۔

عَنۡ جَابِرٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ: " اَلۡمَجَالِسُ بِالۡاَمَانَةِ، اِلَّا ثَلَاثَةَ مَجَالِسَ، سَفۡكُ دَمٍ حَرَامٍ، اَوۡ فَرۡجٌ حَرَامٌ، اَوِ اقۡتِطَاعُ مَالٍ بِغَیۡرِ حَقٍّ ". (رواہ أبو داود، مشکوٰۃ : ۴۳۰، باب الحذر و التأنی فی الأمور)

ہاں، اگر کسی مجلس میں بہ طورِ حرام کسی کا ناحق خون کرنے یا بدکاری کرنے یا کسی کا مال ناحق لوٹنے کے متعلق مشورہ کیا جائے تو اسے آگے بڑھانے کا شرعی حکم ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت ہمارے پاس امانت ہے، جس کا صحیح استعمال اس نعمت کا شکر اور غلط استعمال خیانت ہے، نیز من جانب اللہ جتنے بھی احکام و فرائض شرعاً ہمارے ذمہ ہیں، یا پھر کسی ادارے اور فرد کی جانب سے جو ذمہ داریاں ہمیں سپرد کی جائیں انہیں صحیح طور پر نبھانا امانت ہے اور کمی کوتاہی کرنا خیانت ہے۔

یہاں دوسری بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جنت الفردوس کے وارثین مؤمنین صادقین کی صفات بیان کرتے ہوئے امانتوں کے لیے ’’حافظون‘‘ کے بجائے ’’راعون‘‘ کا لفظ استعمال فرمایا ہے، یہ لفظ ’’راعی‘‘ سے بنا ہے، ’’راعی‘‘ چرواہے کو کہتے ہیں، یہاں لفظ ’’راعون‘‘ کا استعمال فرما کر یہ بتلانا مقصود ہے کہ جس طرح ایک راعی اپنے ریوڑ سے غفلت نہیں برتتا، وہ ہر وقت ان کی نگہبانی ونگرانی کرتا ہے اسی طرح ایک مؤمن کامل بھی اپنے پاس کی امانتوں اور اپنی ذمہ داریوں سے غفلت نہیں برتتا، وہ بھی ہر وقت ان کی ادائیگی کے لیے فکرمند رہتا ہے اور کوتاہی سے ڈرتا رہتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ مدینہ کے باہر جنگل میں گئے،

ایک غلام بھیڑ بکریاں چرا رہا تھا، کھانے کا وقت ہوگیا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ناشتہ دان کھولا اور غلام کو کھانے کی دعوت دی، اس نے کہا: میں روزے سے ہوں، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے آزمانے کے لیے اس سے کہا کہ ایک بکری میرے ہاتھ بیچ دو، قیمت بھی دوں گا اور بکری ذبح کر کے گوشت بھی دوں گا اس سے افطار کر لینا، اس نے کہا: بکریاں میری نہیں ہیں، میرے مالک کی ہیں، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ مالک سے کہہ دینا کہ ایک بکری کو بھیڑیا لے گیا، غلام نے کہا: یہ جواب میں اپنے مالک کو دے دوں گا؛ مگر اپنے خدا کو کیا جواب دوں گا؟ غلام کا جواب سن کر حضرت عبداللہ بن عمرؓ بہت خوش ہوئے، اس کے مالک کے پاس گئے اور غلام کی قیمت ادا کرکیا سے آزاد کردیا، غلام کی امانت داری اس کی آزادی کا ذریعہ بن گئی۔ (درِمنثور، از: فضائل صدقات: ۵۱۲-۵۱۱)

مسلمان کی امانت داری اسے عذابِ جہنم سے نجات دلانے کا ذریعہ بنے گی۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو تاکید فرمائی ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝﴾ (الأنفال: ٢٧)

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جانتے بوجھتے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت نہ کرو، اپنی امانتوں میں غداری کے مرتکب نہ ہو۔“

قرآنِ کریم نے اس صفت کے حاملین مؤمنین صادقین کو جنت الفردوس کا وارثین فرمایا ہے۔ اَللّٰھم اجعلنا منھم. آمین.

چھٹی صفت وعدوں کی رعایت کرنا:

چھٹی صفت جنت الفردوس کے وارثین مؤمنین صادقین کی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں سے کیے ہوئے وعدوں کی رعایت وحفاظت کرتے ہیں۔ فرمایا:

﴿ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ۝﴾ (المؤمنون: ٨)

اس موقع پر دو باتیں سمجھنا ضروری ہے: ایک ہے عہد، دوسرا ہے معاہدہ۔ دونوں میں فرق ہے، عہد ایک طرف سے ہوتا ہے، جب کہ معاہدہ دونوں طرف سے ہوتا ہے، مثلاً کوئی شخص کسی کو کچھ دینے یا کسی کام کے کرنے کا وعدہ کر لے تو اسے عہد کہتے ہیں، اس کا پورا کرنا بھی شرعاً لازم ہے۔ حدیث میں ہے: ”العِدَةُ دَيْنٌ“. (طبرانی، کنز العمال) یعنی وعدہ ایک قسم کا قرض ہے، جیسے قرض کو ادا کرنا واجب ہے، اسی طرح وعدے کو پورا کرنا بھی دیانۃً واجب ولازم ہے، بلاعذرِ شرعی وعدہ خلافی گناہِ کبیرہ ہے۔

معاہدہ اسے کہتے ہیں جو دو طرف سے کسی معاملے کے سلسلے میں لازم قرار دیا جائے، اس کو بھی پورا کرنا فرض اور خلاف کرنا غدر اور دھوکہ ہے، جو حرام ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے بقول دونوں قسموں میں فرق یہ ہے کہ وعدے کی تکمیل کے لیے شرعی عدالت کی جانب سے کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا، جب کہ معاہدے کی تکمیل کے لیے شرعی عدالت سے مجبور کیا جا سکتا ہے۔ (مستفاد از: معارف القرآن)

قرآنِ کریم نے مؤمنین صادقین کی صفات میں یہ بات بیان فرمائی کہ وہ جب وعدوں کی رعایت کرتے ہیں تو معاہدوں کی بدرجہ اولیٰ رعایت کرتے ہیں، بلا کسی شرعی عذر کے خلاف ورزی نہیں کرتے۔ اَللّٰھم اجعلنا منھم.

ایک حیرت انگیز واقعہ:

حضرات صحابہؓ تمام کے تمام مؤمنین صادقین اور بلاشبہ جنت الفردوس کے وارثین ہیں، عہد و معاہدہ کی حفاظت و رعایت میں ان کا کیا حال تھا اس کا اندازہ ایک حیرت انگیز واقعے سے کیا جا سکتا ہے کہ کاتبِ وحی حضرت امیر معاویہؓ کے دور میں رومیوں کے ساتھ ایک متعینہ مدت تک کے لیے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہوگیا، اس دوران حضرت امیر معاویہؓ نے سوچا کہ جیسے ہی معاہدہ کی مدت ختم ہوگی ہم رومیوں پر حملہ کر دیں گے، اس خیال سے آپ رومیوں کی سرحدوں کے قریب اسلامی لشکر کے ساتھ پڑاؤ ڈال کر گشت کرنے لگے، اس کی

اطلاع ایک صحابی رسول حضرت عمرو بن عبسہؓ کو ملی، تو آپ فوراً ایک عربی یا ترکی گھوڑے پر سوار ہوکر جلدی حضرت امیر معاویہؓ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا:

”اَللّٰہُ أَکْبَرُ، اَللّٰہُ أَکْبَرُ، وَفَاءٌ، لَا غَدْرٌ“. (رواہ الترمذی و أبوداود، مشکوٰۃ: ۳۴۷، باب الأمان)

حضرت! اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی تعلیمات اور ہدایات یہ ہیں کہ عہد ومعاہدہ کے متعلق وفاداری سے کام لیا جائے، غداری نہ کی جائے، پھر آپ نے حضرت امیر معاویہؓ کو حدیث پاک کے حوالے سے بتایا کہ آپ کا رومیوں کے ساتھ یہ طرزِ عمل صحیح نہیں، سنتے ہی حضرت امیر معاویہؓ نے اسلامی لشکر کو رومی سرحد سے واپس کردیا، جس کا بہت اچھا اثر ہوا۔

ساتویں صفت نمازوں کی حفاظت:

جنت الفردوس کے وارثین مؤمنین صادقین کی ساتویں صفت نمازوں کی رعایت ہے۔ فرمایا:

﴿وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ﴾ (المؤمنون: ۹)

”جو اپنی نمازوں کی محافظت اور نگرانی کرتے ہیں۔“

اس میں نماز کو خشوع وخضوع اور آداب ومستحبات کی رعایت کے ساتھ ادا کرنا بھی داخل ہے اور نماز کو پابندی سے پڑھنا بھی داخل ہے۔ نماز کی محافظت کا مطلب یہ ہے کہ جنت الفردوس کے وارثین مؤمنین صادقین کی صفت یہ ہے کہ وہ اوقاتِ نماز، آدابِ نماز، ارکانِ نماز، غرض نماز سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کی پوری نگرانی اور محافظت کرتے ہیں، وہ اس کے لیے اپنے جسم اور کپڑوں کو پاک رکھتے ہیں، وہ نماز کے لیے وضو کو سنت کے مطابق مکمل کرتے ہیں، خواہ طبیعت چاہے یا نہ چاہے، پھر حتی الامکان نماز کو اس کے مستحب وقت میں تمام ظاہری اور باطنی آداب کی مکمل رعایت کے ساتھ ادا کرنے کی فکر کرتے ہیں، ایک بوجھ سمجھ کر جلدی سے ادا کرکے بھاگ نہیں جاتے، پھر یہ معاملہ کوئی ایک دو نماز یا مخصوص دنوں

جیسے رمضان وغیرہ تک محدود نہیں رہتا؛ بلکہ ساری زندگی اور زندگی کے ہر دن اور رات میں پانچوں وقت اسی اہتمام اور پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں۔

اوپر والی آیت میں خشوع کے ذکر میں لفظ ”صلوٰۃ“ واحد کے صیغہ سے ذکر فرمایا۔ اور یہاں ”صلوات“ بہ لفظ جمع ذکر فرمایا، کیوں کہ اوپر مطلقاً نماز میں خشوع کی طرف توجہ دلانی تھی۔ اور یہاں تمام نمازوں کی محافظت کی فکر دلانی تھی، اس لیے جمع کے ساتھ بیان کیا گیا۔ نماز کے فضائل وبرکات اسی وقت حاصل ہوسکتے ہیں جب کہ نماز کی محافظت اور نگرانی ہو، جس کی تفصیل گزرچکی۔ حدیث پاک میں ہے کہ نمازوں کی حفاظت مغفرت کا ذریعہ ہے:

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ”خَمْسُ صَلَوَاتٍ افْتَرَضَهُنَّ اللّٰهُ تَعَالٰى، مَنْ أَحْسَنَ وُضُوْءَهُنَّ وَ صَلَّاهُنَّ لِوَقْتِهِنَّ، وَ أَتَمَّ رُكُوْعَهُنَّ، وَ خُشُوْعَهُنَّ، كَانَ لَهُ عَلَى اللّٰهِ عَهْدٌ أَنْ يَغْفِرَ لَهُ، وَ مَنْ لَمْ يَفْعَلْ فَلَيْسَ لَهُ عَلَى اللّٰهِ عَهْدٌ، إِنْ شَاءَ غَفَرَ لَهُ، وَ إِنْ شَاءَ عَذَّبَهُ.“ (رواہ أحمد و أبوداود والنسائی، مشکوٰۃ: ۵۱، کتاب الصلوٰۃ)

پانچ نمازیں جو اللہ تعالیٰ نے فرض کی ہیں، جس نے اچھی طرح وضو کیا اور انہیں بر وقت (مستحب) اچھی طرح ظاہری وباطنی آداب کی رعایت کے ساتھ ادا کیا تو اس کے لیے اللہ پاک نے اپنے فضل وکرم سے یہ پکا وعدہ فرمایا کہ اس کی مغفرت فرمادے گا۔ (اور قرآنِ کریم نے کہا کہ ایسے نمازیوں کو جنت الفردوس کا حق تعالیٰ اپنے فضل خاص سے وارث بنا دے گا) اور جس نے ایسا نہ کیا تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا کوئی وعدہ نہیں، اگر چاہے تو مغفرت فرمادے اور اگر چاہے تو عذاب دے۔ (اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے)۔

حضرت شیخ عبدالحق رحمہ اللہ نے ”لمعات“ میں فرمایا کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز چھوڑنے والا کافر نہیں ہے، مرتکب کبائر ہے، اور بے نمازی کو بھی سزا دینا حق تعالیٰ پر ضروری نہیں، یہ خالص اس کی مرضی پر موقوف ہے۔ (توضیحات شرحِ مشکوٰۃ: ۲/۴۱)

اہتمامِ نماز کا واقعہ:

صاحبو! حضرات علماء کی یہ تحقیقات اپنی جگہ، واقعہ تو یہ ہے کہ مؤمنین صادقین کی یہ شان ہی نہیں کہ وہ بلا کسی شرعی عذر کے جان بوجھ کر نماز چھوڑیں، کیا امیر اور کیا غریب، کیا حاکم اور کیا محکوم، کیا مال دار اور کیا مزدور، جس کے دل میں نورِ ایمانی ہے وہ نماز کا بہر حال اہتمام کرے گا۔

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ ”ہندوستان کے سفر میں عصر کے بعد ہم سلطان ٹیپوؒ کی تعمیر کی ہوئی تاریخی مسجد ”مسجد اعلیٰ“ دیکھنے کے لیے گئے۔ بعض تواریخ میں مذکور ہے کہ جب یہ مسجد تیار ہوئی تو یہ طے کیا گیا تھا کہ اس میں پہلی نماز کی امامت کوئی ایسا شخص کرے گا جو صاحب ترتیب ہو، یعنی اس کے ذمے کوئی نماز قضا نہ ہو، مسجد کے افتتاح کے وقت بہت سے علماء موجود تھے؛ لیکن کوئی اپنے بارے میں یقین سے یہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھا کہ وہ صاحب ترتیب ہے، آخر کار سلطان ٹیپوؒ نے بتایا کہ وہ صاحب ترتیب ہیں، پھر انہوں نے ہی نماز پڑھائی، اس کے بعد سلطان ٹیپوؒ پانچوں وقت کی نمازیں اسی مسجد میں پڑھا کرتے تھے، اور شہادت کے دن بھی فجر کی نماز انہوں نے یہیں ادا کی تھی۔

(ہندوستان کا تازہ سفر، صفحہ:۵۱ تا ۵۳)

ان صفات کے حاملین جنت الفردوس کے وارثین ہیں:

الغرض حق تعالیٰ نے ان سات صفات کو بیان فرما کر ارشاد فرمایا کہ ان صفات کے حاملین مؤمنین صالحین جنت الفردوس کے وارثین ہیں۔ فرمایا:

﴿ أُولَٰئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ○ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ○ ﴾

(المؤمنون: ۱۰-۱۱)

مطلب یہ ہے کہ نفس جنت تو مطلقاً مؤمنین کے لیے ہوگی، لیکن جنت کا جو سب سے اعلیٰ درجہ ہے، جس کی چھت اللہ تعالیٰ کا عرش ہے اور جہاں سے جنت کی چاروں نہریں

جاری ہوتی ہیں اور جس کی حدیث پاک میں دعا مانگنے کی ترغیب دی گئی ہے وہ جنت الفردوس ان سات صفات کے حاملین مؤمنین صادقین کو نصیب ہوگی۔ قرآنِ پاک کی ان آیات میں جن سات صفات کا ذکر ہے یہ صفات حضور ﷺ میں کامل اور مکمل طور پر پائی جاتی تھیں، یہی وجہ ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک مرتبہ حضور ﷺ کے اخلاق و اوصاف کے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا:

”كَانَ خُلُقُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ الْقُرْاٰنَ، ثُمَّ قَالَتْ: تَقْرَأُ سُوْرَةَ الْمُؤْمِنِيْنَ، اِقْرَأْ: قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ، فَقَرَأَ، حَتّٰى بَلَغَ الْعَشْرَ، فَقَالَتْ: هٰكَذَا كَانَ خُلُقُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ.“ (المستدرك على الصحيحين، تفسير سورة المؤمنون، دلائل النبوة للبيهقي، باب ذكر أخبار رويت في شمائله و أخلاقه على طريق الاختصار، الترغيب، فصل في الترهيب من الالتفات في الصلوٰة)

آپ ﷺ کے اخلاق و اوصاف وہی تھے جنہیں قرآنِ کریم نے بیان کیا ہے، اس کے بعد آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: تم سورۂ مؤمنون پڑھتے ہو؟ تم ﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ پڑھو، چنانچہ انہوں نے سورۂ مؤمنون پڑھنا شروع کیا، یہاں تک کہ وہ دسویں آیت پر پہنچے تو آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ یہی حضور ﷺ کے اخلاق و اوصاف تھے۔ (ابن کثیر)

حق تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے ہمیں، ہمارے والدین، ازواج و اولاد اور مقربین، محسنین کو ان صفات کا حامل بنا کر جنت الفردوس کا وارث بنادے۔ آمین۔

مؤرخہ: ۲۸ر رمضان المبارک ر۱۴۴۱ھ

مطابق: ۲۲ر مئی ر۲۰۲۰ء

(بروز جمعہ، بزمِ صدیقی، بڑودا)

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيْرًا　　فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيْرًا كَثِيْرًا

(۴۰)

حسن خاتمہ کے اعمال وعلامات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا وَ قَدْ كُتِبَ مَقْعَدُهٗ مِنَ النَّارِ، وَ مَقْعَدُهٗ مِنَ الْجَنَّةِ، قَالُوْا: " يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَفَلَا نَتَّكِلُ عَلٰى كِتَابِنَا، وَ نَدَعُ الْعَمَلَ؟ قَالَ: اِعْمَلُوْا، فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ، أَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ السَّعَادَةِ فَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ السَّعَادَةِ، وَ أَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الشَّقَاوَةِ فَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ الشَّقَاوَةِ، ثُمَّ قَرَأَ: ﴿ فَأَمَّا مَنْ أَعْطٰى وَ اتَّقٰى وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ﴾ الاية". (متفق عليه، مشكوٰة : ۲۰، باب الإيمان بالقدر)

" حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رحمت عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے ہر شخص کی جگہ اللہ تعالیٰ نے جنت وجہنم میں لکھ دی ہے (یعنی یہ متعین ہو گیا کہ کون جنتی ہے اور کون جہنمی؟) صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! پھر کیا ہم اپنے نوشتۂ تقدیر پر بھروسہ کرلیں اور عمل کرنا چھوڑ دیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم عمل کرو، اس لیے کہ جو جس کے لیے پیدا کیا گیا ہے اسے اس (عمل) میں آسانی کی توفیق دی جاتی ہے، لہٰذا جو شخص سعادت منداور نیک بخت ہوتا ہے حق تعالیٰ اسے (نیکی اور) نیک بختی والے اعمال کی توفیق عطا فرماتے ہیں۔ اور

جو شقاوت پسند اور بد بخت ہوتا ہے وہ بدی اور بد بختی والے اعمال ہی کو پسند کرتا ہے، اس کے بعد آپ ﷺ نے یہ آیتیں پڑھیں: ﴿فَأَمَّا مَنْ أَعْطٰى﴾ (الليل: ۵) الخ "۔

تمہید:

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں رات، دن اور مرد وزن کی قسم کھا کر اس حقیقت کو واضح فرمایا کہ جس طرح رات، دن اور مرد وزن دو مختلف اور متضاد مخلوق ہیں اور دونوں کے خواص بھی جدا جدا ہیں، اسی طرح بندے حق تعالیٰ کی جانب سے دیے ہوئے اختیار کو استعمال کرتے ہوئے جو اعمالِ صالحہ یا سیئہ یعنی اچھے برے اعمال کرتے ہیں ان کے اثرات و ثمرات بھی جدا جدا ہیں۔ فرمایا:

﴿ إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ○﴾ (الليل : ٤)

" تمہاری کوششیں (واعمال) مختلف ہیں۔" تو ان کے نتائج وثمرات بھی مختلف ہیں، مجموعی طور پر ان کی دو قسمیں ہیں: یا تو ایک شخص اچھی کوشش کرے گا یا بری، اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرے گا یا اعمالِ سیئہ کا، خوش نصیب لوگ اعمالِ صالحہ اور بدنصیب لوگ اعمالِ سیئہ کرتے ہیں، اسی اعتبار سے ان کا اچھا یا برا نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ عاجز کے خیالِ ناقص میں اخلاص کے ساتھ اعمالِ صالحہ کا ثمرہ ونتیجہ حیاتِ طیبہ، حسن خاتمہ، اللہ پاک کی رضا اور مقامِ رضا یعنی جنت ہے، جب کہ اعمالِ سیئہ کا ثمرہ ونتیجہ حیاتِ ضیقہ (تنگ زندگی) سوءِ خاتمہ، اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور مقامِ غضب یعنی جہنم ہے۔ العیاذ باللہ العظیم۔

"إنما الأعمال بالخواتيم" پر اشکال:

اب جہاں تک تعلق ہے ان احادیث کا جن میں ارشاد فرمایا:

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " إِنَّ الْعَبْدَ لَيَعْمَلُ عَمَلَ أَهْلِ النَّارِ، وَ إِنَّهٗ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ، وَ يَعْمَلُ عَمَلَ أَهْلِ الْجَنَّةِ، وَ إِنَّهٗ مِنْ أَهْلِ النَّارِ، وَ إِنَّمَا

الْأَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيمِ". (متفق عليه، مشكوٰة : ٢٠)

"بعض اوقات کوئی بندہ دوزخیوں والے اعمال کرتا رہتا ہے، حالاں کہ وہ جنتی ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات کوئی بندہ جنتیوں والے اعمال کرتا ہے، حالاں کہ وہ جہنمی ہوتا ہے، نجات وعذاب کا اعتبار خاتمہ کے عمل پر ہے۔"

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں ہے:

"عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍؓ قَالَ: حَدَّثَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ -وَهُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوقُ- قَالَ: "إِنَّ أَحَدَكُمْ يُجْمَعُ خَلْقُهُ فِي بَطْنِ أُمِّهِ أَرْبَعِينَ يَوْمًا، ثُمَّ يَكُونُ عَلَقَةً مِثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ يَكُونُ مُضْغَةً مِثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ يَبْعَثُ اللّٰهُ مَلَكًا، فَيُؤْمَرُ بِأَرْبَعِ كَلِمَاتٍ، وَيُقَالُ لَهُ: اكْتُبْ عَمَلَهُ، وَرِزْقَهُ، وَأَجَلَهُ، وَشَقِيٌّ أَوْ سَعِيدٌ، ثُمَّ يُنْفَخُ فِيهِ الرُّوحُ، فَوَالَّذِي لَا إِلٰهَ غَيْرُهُ، إِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ، حَتَّى مَا يَكُونُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا إِلَّا ذِرَاعٌ، فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ، فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ، فَيَدْخُلُهَا، وَإِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ، حَتَّى مَا يَكُونُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا إِلَّا ذِرَاعٌ، فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ، فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ، فَيَدْخُلُهَا". (متفق عليه، مشكوٰة : ٢٠)

تم میں سے ہر ایک کی پیدائش اس طرح ہوتی ہے کہ (پہلے) اس کا نطفہ (جس کے ذریعہ اسے پیدا کیا جاتا ہے) ماں کے پیٹ میں چالیس دن جمع رہتا ہے، پھر اتنے ہی دنوں یعنی چالیس دن کے بعد وہ جما ہوا خون بنتا ہے، پھر اتنے ہی دنوں کے بعد وہ لوتھڑا بن جاتا ہے، قرآن کریم نے اسے بیان فرمایا:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِينٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا﴾ (المؤمنون : ١٢-١٣-١٤)

پھر خداوند عالم اس کے پاس ایک فرشتے کو چار باتیں لکھنے کے لیے بھیجتے ہیں، چنانچہ وہ فرشتہ اس کا عمل، اس کی اجل (موت کا وقت) اس کا رزق اور اس کا نیک بخت ہونا

اور بد بخت ہونا لکھ دیتا ہے، حضور ﷺ نے قسم کھا کر فرمایا کہ تم میں سے ایک آدمی جنتیوں والے اعمال کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ تقدیر کا لکھا ہوا آگے آتا ہے اور وہ دوزخیوں والے اعمال کرنے لگتا ہے اور بالآخر دوزخ میں داخل ہوجاتا ہے، اسی طرح تم میں سے ایک شخص دوزخیوں والے اعمال کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ تقدیر کا لکھا ہوا سامنے آتا ہے اور وہ جنتیوں والے اعمال کرنے لگتا ہے اور بالآخر جنت میں داخل ہوجاتا ہے۔

اس میں بھی یہی بتانا مقصود ہے کہ اصل اعتبار خاتمے کا ہے، یعنی مرنے والا زندگی کے آخری وقت میں اچھی یا بری جس حالت میں ہوتا ہے اسی کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی نجات اور عذاب کا فیصلہ ہوتا ہے۔

ان روایات سے یہ اشکال ہوتا ہے کہ پھر زندگی بھر کے اچھے برے اعمال بظاہر بیکار ہیں، ان کوئی مطلب ہی نہیں، بظاہر وہ سب بے اثر ہیں۔

اشکال کا جواب:

یہ اشکال حضرات صحابہؓ کو بھی پیش آیا تھا، جس کا ذکر حدیث مذکورہ میں موجود ہے، جب حضور ﷺ نے فرمایا:

"مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا وَقَدْ كُتِبَ مَقْعَدُهُ مِنَ النَّارِ، وَمَقْعَدُهُ مِنَ الْجَنَّةِ".

"تم میں سے ہر ایک کے جنتی وجہنمی ہونے کا فیصلہ حق تعالیٰ کے یہاں ہوچکا۔"

تب صحابہؓ نے عرض کیا:

"أَفَلَا نَتَّكِلُ عَلٰى كِتَابِنَا، وَنَدَعُ الْعَمَلَ؟"

"حضور! پھر کیوں نہ ہم اپنے نوشتۂ تقدیر پر بھروسہ کرلیں، عمل کی کیا ضرورت ہے؟" جب تقدیر کا لکھا ہوا ہی غالب آتا ہے اور اسی کے مطابق خاتمہ ہوکر انجام ہوتا ہے تو عمل کیوں کیا جائے؟ اس وقت آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ (اخلاصِ نیت اور اتباعِ

سنت کے ساتھ) اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرتے رہو، اس لیے کہ جہاں یہ حقیقت ہے کہ اعتبار خاتمے کا ہے تو اسی سے واضح ہو گیا کہ بندے کو حسن خاتمہ کی فکر کرنی چاہیے اور ان اعمال کا اہتمام کرنا چاہیے جن سے حسن خاتمہ نصیب ہو۔ وہاں یہ بھی حقیقت ہے کہ

"فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ".

''ہر ایک کو ان اعمال کی بآسانی توفیق دی جاتی ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے۔'' جو بندے جنتی ہیں ان کو جنت والے اعمال میں رغبت ہوتی ہے اور جہنم والے اعمال سے انہیں نفرت ہوتی ہے، اس کے برخلاف جو جہنمی ہیں انہیں جہنم والے اعمال سے رغبت اور جنت والے اعمال سے نفرت ہوتی ہے، پھر بہ طورِ دلیل آپ ﷺ نے قرآنِ کریم کی وہ آیاتِ مبارکہ تلاوت فرمائیں جن میں رب العالمین نے جنت اور جہنم میں لے جانے والے تین اعمال کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ فَأَمَّا مَنْ أَعْطٰى وَ اتَّقٰى ○ وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ○ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ○ وَ أَمَّا مَنْ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰى ○ وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ○ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ○﴾ (الليل: ۵-۱۰)

(جو جنتی ہیں، جن کا خاتمہ ایمان پر ہونا ہے وہ زندگی بھر جنت والے اعمال میں مشغول رہتے ہیں، مثلاً) وہ اللہ تعالیٰ کے عطا کیے ہوئے مال میں سے اس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں اور اچھی بات یعنی توحید کی تصدیق کرتے ہیں، تو پھر ہم ان کے لیے حسن خاتمہ اور جنت کا راستہ آسان کر دیتے ہیں (اس کے برخلاف جو جہنمی ہیں اور جن کا خاتمہ برا ہونا ہے، وہ زندگی بھر جہنمیوں والے اعمال ہی میں مشغول رہتے ہیں، مثلاً) وہ اللہ تعالیٰ کے عطا کیے ہوئے مال میں سے اس کی راہ میں خرچ نہیں کرتے اور (اللہ پاک سے ڈرتے نہیں) آخرت کے عذاب سے بے پرواہی کرتے ہیں اور توحید کی تکذیب کرتے ہیں، تو پھر ہم بھی ان کے لیے سوءِ خاتمہ اور جہنم کا راستہ آسان کر دیتے ہیں۔

رہی بات یہ کہ بعض اوقات بندہ زندگی بھر جنت والے اعمال کرتا ہے، حالاں کہ وہ

جہنمی ہوتا ہے، اس لیے بالآخر وہ جہنمیوں والے اعمال اختیار کرتا ہے، پھر اسی پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے۔ تو اس کا مطلب علماءِ محققین نے یہ بیان فرمایا کہ ان اعمال کا اچھا یا برا ہونا لوگوں کے لحاظ سے ہوتا ہے، جب کہ حقیقت کچھ اور ہوتی ہے، جس پر لوگوں کی نظر نہیں ہوتی، حق تعالیٰ کے یہاں معاملہ حقیقت کے لحاظ سے ہوتا ہے، کیوں کہ اس کی شان یہ ہے کہ

﴿ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْأَعْيُنِ وَ مَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ○﴾ (المؤمن: ۱۹)

وہ تو آنکھوں کی خیانت اور دلوں کے راز کو بھی جانتا ہے۔ اور حدیث میں ہے:

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: " إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلٰى صُوَرِكُمْ وَ أَمْوَالِكُمْ، وَ لٰكِنْ يَنْظُرُ إِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَ أَعْمَالِكُمْ". (رواہ مسلم، مشکوٰۃ: ۴۵۴)

لوگوں کی نظر ظاہر پر ہوتی ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ کی نظر باطن پر ہوتی ہے، اس لیے کچھ ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص عند الناس بظاہر زندگی کا بڑا حصہ اچھے کاموں میں گزارتا ہے، لیکن عند اللہ اس کے اعمال میں کوئی فتور و قصور ہوتا ہے، جس پر لوگوں کو اطلاع نہیں ہوتی، مثلاً نیت میں خرابی یا اور کوئی باطنی برائی، جس کی وجہ سے وہ عمل عند اللہ برا اور غیر مقبول ہوتا ہے اور فیصلہ اسی کے مطابق ہوتا ہے، پھر اس کے اعمال کا فتور و قصور ہی سوءِ خاتمہ کا سبب بن جاتا ہے۔ جیسے ابلیس کے متعلق منقول ہے کہ ملعون و مردود ہونے سے قبل اس نے جتنی بھی عبادت کی اس کا مقصد رضاءِ الٰہی نہیں؛ بلکہ خلافت ارضی کا حصول تھا، اس لیے بالآخر مردود ہوا، اس کے برخلاف بعض اوقات ایک بندہ زندگی بھر جہنم والے اعمال کرتا ہے حالاں کہ وہ جنتی ہوتا ہے، اس لیے بالآخر وہ جنت والے اعمال اختیار کرتا ہے، پھر اسی پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے۔ تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ ان اعمالِ بد کے باوجود اس میں کوئی ایسی اچھائی اور خوبی پوشیدہ ہوتی ہے جس کو لوگ نہیں جانتے؛ مگر اللہ تعالیٰ جانتے ہیں، پھر اخیر میں وہی اچھائی اس کے حسن خاتمہ کا سبب بن جاتی ہے۔

ان حقائق سے واضح ہوا کہ اصل اعتبار خاتمے کا ہے، لہٰذا حسن خاتمہ کی فکر لازم

ہے، جس کے لیے بنیادی طور پر تین چیزوں کا التزام واہتمام ضروری ہے۔

اعمالِ صالحہ کا اہتمام:

(۱)حسن خاتمہ کے لیے بنیادی چیز ایمان، اخلاص اور استقامت کے ساتھ ایمانی اعمال اور اعمالِ صالحہ کا زندگی بھر اہتمام کرنا ہے، ارشادِ ربانی:

﴿ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۝﴾ (آل عمران : ۱۰۲)

اس کا مطلب یہی ہے کہ اہل ایمان کو زندگی بھر اسلامی اعمال پر اخلاص کے ساتھ جمے رہنے کی کوشش کرنی چاہیے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ موت بھی ایمان پر ہوگی، یہی ربِ کریم کا کریمانہ قانون ہے اور اسی کا نام حسن خاتمہ ہے۔

حسن خاتمہ کا مطلب یہ نہیں کہ مسجد میں سجدے کی حالت میں موت آئے، حسن خاتمہ کا مطلب یہ نہیں کہ رمضان میں قرآن پڑھتے ہوئے موت آئے، بلکہ حسن خاتمہ کا مطلب ہے خاتمہ بالایمان، یہ انہیں میسر ہوگا جو زندگی بھر اخلاص و استقامت کے ساتھ اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرتے ہیں، ایمان و اعمالِ صالحہ کے یوں تو بہت سے فضائل، برکات اور ثمرات ہیں، ایک بہت بڑا ثمرہ یہ ہے کہ اس کی برکت سے بندے کو حسن خاتمہ کی دولت ملتی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَ حُسْنُ مَاٰبٍ۝﴾ (الرعد: ۲۹)

”جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالحہ کا (اخلاص و استقامت کے ساتھ) اہتمام بھی کیا، تو ان کے لیے خوش خبری اور اچھا مقام و انجام ہے۔“

نیز حدیث پاک میں جن مختلف اور مخصوص اعمالِ صالحہ پر جنت کی بشارت وارد ہوئی ہے مثلاً کھانا کھلانا، سلام پھیلانا، صلہ رحمی کرنا، تہجد پڑھنا وغیرہ، اس قسم کے اعمالِ صالحہ کا اہتمام بھی حسن خاتمہ کا ذریعہ ہے۔

اعمالِ سیئہ سے اجتناب:

(۲)حسن خاتمہ کے لیے جہاں اعمالِ صالحہ کا اہتمام ضروری ہے وہاں ترکِ معاصی کا اہتمام یعنی اعمالِ سیئہ سے اجتناب بھی لازم ہے، خصوصاً ان گناہوں سے جو سوءِ خاتمہ کا سبب ہیں، جیسے وعدہ خلافی، قطع رحمی اور زمین میں فساد یعنی ظلم وزیادتی وغیرہ۔

قرآنِ کریم نے اس قسم کی برائیوں کے ارتکاب پر سوءِ خاتمہ کی وعید بیان فرمائی ہے، جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَ يَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ۝﴾ (الرعد:۲۵)

کیوں کہ اگر اعمالِ صالحہ کا اہتمام تو کیا جائے؛ لیکن اعمالِ سیئہ سے اجتناب نہ کیا جائے تو اس سے عموماً اعمالِ صالحہ کا نور، نفع اور اثر باقی نہیں رہتا، اس لیے ترکِ معاصی یعنی اعمالِ سیئہ سے اجتناب بھی لازم ہے، جس کے لیے تقویٰ ضروری ہے، تقویٰ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور اللہ تعالیٰ ہی کے ڈر سے گناہوں سے بچنے کو، جس قدر تقویٰ ہوگا اسی قدر اعمالِ سیئہ سے اجتناب آسان ہوگا، تقویٰ کا یہی سب سے بڑا فائدہ ہے۔

کتاب وسنت میں تقویٰ پر جہاں اور بہت سارے فوائد وفضائل وارد ہوئے ہیں وہیں ایک بہت بڑی فضیلت اور برکت تقویٰ کی یہ ہے کہ اس سے بندہ حسن خاتمہ کی دولت سے مالا مال کیا جاتا ہے، قرآنِ کریم نے اس مضمون کو کئی مواقع پر بیان فرمایا ہے، ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ

﴿ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ۝﴾ (هود : ٤٩)

”بلا شبہ اچھا انجام تو متقین کے لیے ہی ہے۔“ دنیوی اعتبار سے بھی اور اُخروی اعتبار سے بھی۔ دنیوی اعتبار سے اس طرح کہ متقین کو رب العالمین کفار کے مقابلے میں بالآخر کامیاب اور بامراد کرتے ہیں، قرآنِ کریم نے اسے یوں فرمایا:

﴿ إِنَّ الْأَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۝﴾ (الأعراف : ۱۲۸)

’’بلاشبہ یہ زمین اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اس کا وارث بناتے ہیں، لیکن بڑی کامیابی تو متقین ہی کی ہوگی۔‘‘

اور دنیا میں سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ متقین کا خاتمہ ایمان پر ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں انہیں آخرت میں جنت اور اس کی نعمتوں سے مالا مال کیا جائے گا، تو یہ آخرت کی کامیابی ہے۔ فرمایا:

﴿ إِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ نَعِيْمٍ۝﴾ (الطور : ۱۷)

’’یقیناً متقین باغات اور نعمتوں میں ہوں گے۔‘‘

دعاؤں کا اہتمام:

(۳) حسن خاتمہ کے لیے اعمالِ صالحہ کا اہتمام اور اعمالِ سیئہ سے اجتناب کے ساتھ دعاؤں کا التزام بھی نہایت نافع عمل ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام پیغمبر ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ سے حسن خاتمہ کی دعا فرماتے تھے، قرآنِ کریم نے اس دعا کو نقل فرمایا ہے:

﴿ رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَأْوِيْلِ الْأَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ ۚ أَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ أَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ۝﴾ (یوسف : ۱۰۱)

’’اے میرے رب! تو نے مجھے ملک عطا فرمایا اور تو نے ہی مجھے خواب کی تعبیر بھی سکھائی، اے آسمان وزمین کے پیدا کرنے والے! تو ہی دنیا وآخرت میں میرا ولی (اور دوست) اور کارساز ہے، مجھے اسلام پر وفات (موت) دیجیے اور صالحین میں داخل فرمالیجیے۔‘‘

حضرت یوسف علیہ السلام نے موت کی دعا نہیں مانگی؛ بلکہ موت تک اسلام پر قائم رہنے کی اور حسن خاتمہ کی دعا مانگی ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حسن خاتمہ کی سب سے پہلی دعا حضرت یوسف علیہ السلام ہی نے مانگی۔ ہمیں بھی اس دعا کا یوں اہتمام کرنا چاہیے:

﴿ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ ۚ أَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ أَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ۝﴾

اس کے علاوہ بھی قرآنِ کریم میں حسن خاتمہ کے سلسلے میں ایک اور دعا بھی موجود ہے، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں آنے والے ساحرین نے بفضلہ تعالیٰ ایمان قبول کر کے اس کا اعلان کیا تو بدلے میں فرعون نے سخت سزا کا اعلان کیا، اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے امتیوں نے یہ دعا مانگی:

﴿ رَبَّنَآ أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ۝﴾ (الأعراف : ۱۲۶)

’’اے ہمارے رب! ہمیں صبر کامل عطا فرما اور اسلام ہی کی حالت میں وفات عطا فرما۔‘‘

نیز سرکارِ دوعالم ﷺ خود بھی اہتمام سے حسن خاتمہ کے لیے دعا فرماتے تھے، چنانچہ آپ ﷺ کی مسنون دعاؤں میں یہ منقول ہے:

"اَللّٰهُمَّ أَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِي الْأُمُوْرِ كُلِّهَا، وَ أَجِرْنَا مِنْ خِزْيِ الدُّنْيَا وَ عَذَابِ الْاٰخِرَةِ". (مسند أحمد، المستدرك للحاكم، المعجم الكبير للطبراني)

’’اے اللہ! ہمارے تمام امور میں انجام کو بہتر بنادے اور ہمیں دنیا کی رُسوائی اور عذابِ اُخروی سے محفوظ فرمائیے۔‘‘

حسن خاتمہ کے سلسلے میں کتاب وسنت کی ان دعاؤں سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے اعمالِ صالحہ کا اہتمام، اعمالِ سیئہ سے اجتناب کے بعد حسن خاتمہ کے لیے دعاؤں کا التزام بھی فرماتے ہیں۔ ہمیں بھی ان دعاؤں کا بہت کثرت سے التزام کرنا چاہیے، اس کے علاوہ جن اعمال پر جنت کی بشارت دی گئی ہے ان کا بھی اخلاص کے ساتھ خوب اہتمام کرنا چاہیے، ان شاء اللہ ان اعمال کی برکت سے حق تعالیٰ ہمیں ضرور حسن خاتمہ سے مالا مال فرمائیں گے، کیوں کہ جن کا خاتمہ ایمان پر ہوگا قیامت کے دِن ان ہی کے چہرے روشن اور چمک دار ہوں گے۔

﴿ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ○ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ○ وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ○ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ○ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ○﴾ (المطففين : ۳۸-۴۲)

''اس دن بہت سے چہرے نہایت روشن اور چمک دار ہوں گے، ہنستے ہوئے اور خوش وخرم ہوں گے۔ اور بہت سے چہرے غبار آلود ہوں گے، جن پر سیاہی چڑھی ہوئی ہوگی، وہ یہی کافر وبدکردار لوگ ہوں گے۔''

جن کے چہرے روشن ہوں گے وہ درحقیقت جنتی ہوں گے، جب کہ سیاہ چہرے والے جہنمی ہوں گے۔ العیاذ باللہ۔

کلمۂ خیر پر انتقال ہونا:

اب رہی بات حسن خاتمہ کی علامت، تو یہ حقیقت ہے کہ حسن خاتمہ ایک مخفی اور پوشیدہ چیز ہے، جس پر یا تو اللہ تعالیٰ واقف ہیں یا پھر مرنے والا، البتہ کتاب وسنت میں چند علامات مذکور ہیں، جن سے مرنے والے کے حسن خاتمہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، جن میں ایک بڑی علامت یہ ہے کہ کلمۂ خیر پر انتقال ہو، جیسے کلمۂ طیبہ، کلمۂ شہادت، ذکر اللہ یا کوئی بھی خیر کا کلمہ اخیر میں زبان پر جاری ہو، مثلاً موت سے پہلے کسی کو نیک اعمال کی نصیحت کی یا گناہ چھوڑنے کی تاکید کی وغیرہ، تو یہ حسن خاتمہ کی بڑی علامت ہے، اسی لیے حدیث میں اس بات کی تلقین وارد ہوئی ہے:

عَنْ أَبِیْ سَعِیْدٍ وَ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَا: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَقِّنُوْا مَوْتَاكُمْ : لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ". (رواه مسلم، مشكوٰة : ۱۴۰، باب ما يقول عند من حضره الموت)

''جو لوگ قریب المرگ ہوں (جن پر موت کے آثار ظاہر ہونے لگیں، جیسے پاؤں کا سست ہو جانا، ناک کا بانسہ ٹیڑھا ہو جانا، کنپٹیوں کا مڑ جانا وغیرہ) انہیں ''لا الہ الا اللہ'' کی تلقین کرو۔''

جس کا طریقہ یہ ہے کہ کلمۂ طیبہ یا ذکر اللہ کا کوئی بھی کلمہ اتنی آواز سے پڑھو کہ وہ سن لے، مرنے والے کو صرف سناؤ، حکم نہ کرو، تلقین کا یہی طریقہ ہے، تمہارے اس طرح تلقین کرنے سے اگر اس نے کلمہ خیر کہہ دیا تو یہ اس کے خاتمہ بالخیر کا سبب ہوگا، جس پر جنت کی بشارت ہے، جیسا کہ دوسری حدیث میں ہے:

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ ؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "مَنْ كَانَ اٰخِرُ كَلَامِهٖ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، دَخَلَ الْجَنَّةَ." (رواه أبوداود، مشكوٰة : ۱۴۱)

''جس کا آخری کلمہ ''لا الہ الا اللہ'' ہوگا وہ جنت میں جائے گا۔''

حضرات علماءِ محققین کے بقول یہی حکم مطلقاً ہر کلمۂ خیر کا بھی ہے۔ واللہ اعلم۔

عمل خیر پر انتقال ہونا:

حسن خاتمہ کی دوسری بڑی علامت یہ ہے کہ عمل خیر کی حالت میں انتقال ہو، جیسے نماز پڑھتے ہوئے، تلاوت کرتے ہوئے، تسبیح پڑھتے ہوئے، یا روزہ کی حالت میں، یا احرام کی حالت میں وغیرہ، تو یہ بھی حسن خاتمہ کی بڑی علامت ہے، حدیث میں ہے:

عَنْ أَنَسٍ ؓ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: "إِنَّ اللّٰهَ تَعَالىٰ إِذَا أَرَادَ بِعَبْدٍ خَيْرًا اسْتَعْمَلَهٗ، فَقِيْلَ: كَيْفَ يَسْتَعْمِلُهٗ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ: يُوَفِّقُهٗ لِعَمَلٍ صَالِحٍ قَبْلَ الْمَوْتِ". (رواه الترمذي، مشكوٰة : ۴۵۱، باب استحباب المال)

''جب حق تعالیٰ کسی کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اسے عمل خیر میں مشغول فرما دیتے ہیں۔''

معلوم ہوا کہ عمل خیر کے ساتھ موت کا واقع ہونا حسن خاتمہ کی علامت ہے، اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کی موت عموماً ایسی ہی ہوا کرتی ہے۔

چنانچہ منقول ہے کہ حضرت عامر بن عبداللہ بن زبیر ؒ کا انتقال اس شان سے ہوا کہ آپ ؒ نے حالت نزع میں جب مغرب کے وقت اذان سنی تو بیٹھ گئے اور فرمایا: مجھے مسجد لے

چلو، احباب اور اہل خانہ نے عرض کیا کہ حضرت! آپ تو علیل ہیں، فرمایا: میرا رب مجھے بلائے اور میں نہ جاؤں؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ انہیں کسی طرح مسجد لے جایا گیا، پھر نماز پڑھتے ہوئے مسجد میں آپؒ کا انتقال ہوگیا۔ (سیر اعلام النبلاء: ۹/۳۵۴، از: حسن خاتمہ: ۱۴۱)

اسی طرح حضرت ابراہیم بن ہانی نیساپوریؒ جو بڑے محدث اور ابدالِ زمانہ تھے، ان کی وفات کا حال حضرت ابوبکر نیساپوریؒ بیان کرتے ہیں کہ میں اس وقت ان کی خدمت میں حاضر تھا، آپؒ روزے کی حالت میں تھے، اپنے صاحب زادے سے فرما رہے تھے کہ پردہ ہٹاؤ، پھر فرمایا: مجھے پیاس لگی ہے، صاحب زادے نے پردہ ہٹا کر پانی پیش کیا، تو فرمایا: کیا سورج غروب ہوگیا؟ کہا: نہیں، تو فرمایا: پھر تو رہنے دو، اس کے بعد یہ آیت کریمہ:

﴿ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُوْنَ۝﴾ (الصّٰفّٰت: ٦١)

''اسی جیسی کامیابی کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے۔''

تلاوت کرتے ہوئے روزے کی حالت میں انتقال ہوگیا۔ (تاریخ بغداد: ۶/۲۰۴، مستفاد از: حسن خاتمہ: ۱۴۲، مفتی شعیب اللہ خان)

بوقت انتقال پیشانی پر پسینے کا ہونا:

حسن خاتمہ کی تیسری بڑی علامت یہ ہے کہ موت کے وقت پیشانی پر پسینہ آجائے، تو یہ ایمان پر موت اور حسن خاتمہ کی علامت ہے، حدیث پاک میں ہے:

عَنْ بُرَيْدَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "اَلْمُؤْمِنُ يَمُوْتُ بِعَرَقِ الْجَبِيْنِ". (رواه الترمذی، مشکوٰة: ١٤٠)

''مؤمن پیشانی پر پسینے کے ساتھ مرتا ہے۔''

پسینہ آ گیا مجھ کو گناہوں کی ندامت سے ذرا اے ابرِ رحمت! اپنے دامن کو ہوا دے

حضرات محدثین فرماتے ہیں کہ مؤمن کو موت کے وقت پسینہ اس لیے آتا ہے کہ

اسے موت کی تکلیف بہت ہی کم ہوتی ہے، اس قدر کہ بس پیشانی پر پسینہ آجاتا ہے، یا پھر اس وجہ سے پسینہ آتا ہے کہ وہ موت کے وقت اپنے مولیٰ کے سامنے نادم اور شرمندہ ہوتا ہے، تو یہ پسینہ اسی ندامت کا اثر ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اس کے علاوہ رمضان، جمعہ اور حرمین کی موت بھی مؤمن کے لیے حسن خاتمہ کی علامت ہے۔

حق تعالیٰ اس ماہِ مبارک کی برکت سے ہماری، ہمارے والدین، اَزواج واولاد، اہل خانہ، متعلقین ومحسنین کی تمام امراضِ جسمانی وروحانی اور وبائی سے حفاظت فرما کر اپنے اپنے وقت پر حسن خاتمہ کی نعمت سے مالا مال فرمائیں۔ آمین۔

تم الجزء السادس من دروس الحديث الشريف، ولله الحمد أولا و اخرا و ظاهرا و باطنا، و ما كنا لنهتدي لو لا أن هدانا الله. و ذٰلك فی ثلاثين من رمضان : ١٤٤١هـ الموافق : ٢٤/ مايو/ ٢٠٢٠م يوم الأحد.

بزمِ صدیقی، بڑودا

فَجَاءَ مُحَمَّدٌ سِرَاجًا مُّنِيْرًا فَصَلُّوْا عَلَيْهِ كَثِيْرًا كَثِيْرًا